افادات

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی و مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم بنگلور

و خلیفہ حضرت اقدس مولانا مفتی مظفر حسین صاحب نور اللہ مرقدہ

مرتب

مولوی محمد زبیر قاسمی

فیضان معرفت

جلد اول

افادات

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم
بانی ومہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور
خلیفہ مجاز بیعت
حضرت اقدس مولانا مفتی مظفر حسین صاحب نور اللہ مرقدہ

مرتب
محمد زبیر قاسمی
استاذ جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم

فہرست عناوین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عارفانہ نظم

از: مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب ظرفی دامت برکاتہم

نام حق تعالیٰ جو جم گیا ہے سینے میں
پا رہا ہوں بے شک میں لطف وکیف جینے میں
مست ہو جو فانی میں کیا خبر اسے اس کی
کیا مزہ ہے مخفی اس عشقِ حق کے پینے میں
عشقِ حق میں مرنا ہی ، قرب حق کا رستہ ہے
شوق گر ہو مرنے کا رکھ قدم سفینے میں
گر تجھے محبت کا ذاتِ حق سے ہو دعویٰ
مان لے محمدؐ کی جو ہوئے مدینہ میں
عشقِ حق میں مرنے پر زندگی نئی دے دی
ہر قدم فنا کا اب ہے بقا کے زینے میں
خالق دو جہاں وہ مالک دو عالم وہ
شان کبریا راسخ دل کے ہے نگینے میں

کر سوال حاجت کا تو خدائے برتر سے
ساری دولتیں ہیں جس ذات کے خزینہ میں
شیخ باخدا سے تم معرفت کی راہیں لو
یہ علوم عرفانی ہیں کہاں سفینہ میں
تیرا ہی رہے ظرفی اس لئے خدا یا تو
سوز غم اسے دے دے دل کے آبگینے میں

تمہید

حامدًا و مصلیاً:

اللہ رب العزت اپنی کتاب مبین میں فرماتے ہیں:''قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى'' **ترجمہ**: تحقیق کہ فلاح پا گیا وہ شخص جو تزکیہ حاصل کرلیا)(یعنی جو اپنے قلب وقالب کو عقائد صحیحہ، اخلاق فاضلہ، اور اعمال صالحہ سے مزین کیا وہ کامیاب ہوا) تزکیۂ نفس کا ذکر قرآن کریم میں دیگر مقامات پر بھی مختلف سیاق وسباق میں وارد ہوا ہے، ایک جگہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں بھی باری تعالیٰ نے اس کا ذکر فرمایا ہے، چناں چہ ارشاد باری ہے:'' لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ ''**ترجمہ**: اللہ نے احسان کیا ایمان والوں پر جب کہ انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اللہ کی آیتیں تلاوت کرتا ہے، اوران کے نفوس کا تزکیہ کرتا ہے، الخ۔

ایک اور جگہ تو کامیابی کا معیار ہی تزکیۂ نفس کو قرار دیا گیا ہے:'' قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا'' **ترجمہ** : تحقیق وہ کامیاب ہوا جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا، اور نامراد ہوا وہ جو اس کو ملوث کیا) معلوم ہوا کہ نفس کی اصلاح کرنا، اسے رزائل سے پاک کرنا، اور اعمال صالحہ کا خوگر بنانا، یہ دین اسلام کا بنیادی مقصد اور شریعت کا عین مقتضی ہے۔

اور عادۃ اللہ ہمیشہ یہ رہی ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ رجال اللہ بھی بھیجے گئے اور پھر انبیاء کے بعد ان کے نائبین و وارثین کا سلسلہ قائم و جاری رہا، اور جس طرح دنیا میں کسی بھی علم وفن کی تحصیل کے لئے رہبر واستاذ کی ضرورت پڑتی ہے، اسی طرح اپنے باطن کو بنانے اور دل کو معرفت الٰہیہ کے نور کا مسکن بنانے اور محبت خداوندی سے معمور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہر زمانہ میں امت میں ایسے نفوس پیدا فرمائے ہیں، جو مختلف تدابیر سے امت مسلمہ کی اصلاح میں کوشاں رہتے ہیں، کوئی تدریس سے، کوئی تصنیف وتالیف سے، تو کوئی وعظ ونصیحت سے، انہیں طریقوں میں سے اللہ والوں اور بزرگان دین کی مجالس بھی ہیں، جس کا فائدہ امت کو برابر ہوتا رہا ہے، جس سے ایک خلق کثیر اکتساب فیض کرتی رہی ہے، اور ان مجالسوں سے ایسے لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں، جو اپنے باطن کو آراستہ کر کے ستاروں کے مانند امت کے لئے مشعلِ راہ بنتے ہیں، انہیں مجالس میں سے استاذی ومربی ومخدومی حضرت اقدس مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم کی مجالس بھی ہیں، جو طلبہ کے لئے مدرسہ میں ظہر بعد اور عوام کے لئے ہر اتوار بعد نماز مغرب تا عشاء ہوتی ہیں، زمانہ طالب علمی ہی سے بندہ کے دل میں داعیہ تھا کہ حضرت والا کی مجالس کے بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک لڑی میں پرودوں، مگر تعلیمی مصروفیات مانع بن رہے تھے، اللہ تعالی سے دعا بھی کرتا تھا کہ اے اللہ! اس عاجز سے ان بیانات کو جمع کرنے کا کام لے لے، **الحمد لله**، اللہ تعالیٰ کی توفیق اور نصرت سے اس مجموعہ کو ٹیپ رکارڈ کی مدد سے ان بیانات میں سے اصلاح قلب وتزکیۂ نفوس سے متعلق باتوں کو مختلف عناوین کے تحت جمع کر کے ایک کتابی شکل دینے کی سعادت نصیب ہوئی، چونکہ ان مجالس کا مجموعہ اور مواد زیادہ تھا، اور خدشہ ہوا کہ کہیں کتاب کی طوالت قاری کو اکتا نہ دے، اس لئے اختصار کے پیش نظر اس مجموعہ کو جلدوار لانے کا ارادہ ہے، یہ

پہلی جلد ہے ان شاء اللہ بقیہ جلدیں بھی بہت جلد آئیں گی۔ (**فانتظروا انی معکم من المنتظرین**)

بندہ نے اس مجموعہ کو مرتب کرنے کے بعد حضرت والا کی خدمت میں پیش کیا اور درخواست کی کہ آپ اس پر نظر فرمالیں اور طبع کرانے کی اجازت عطاء فرمائیں، تو حضرت الاستاذ نے بخوشی اجازت دی اور از اول تا آخر نظر ڈالی، اور بعض جگہ جہاں تشنگی محسوس کی اس کی وضاحت فرمائی اور کتاب میں ذکر کردہ احادیث کی تخریج کا حکم دیا اور مفید مشوروں سے نواز کر خاکسار کی ہمت افزائی فرمائی۔

میں ممنون ومشکور ہوں ان تمام حضرات کا جنہوں نے اس کی ترتیب میں میرا تعاون فرمایا، بالخصوص مولانا محمد یاسین خان صاحب قاسمی مدرس جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم جنہوں نے اپنی وہ کاپیاں جن میں انہوں نے ملفوظات جمع کئے تھے عطاء کئے، اور مولانا اسماعیل خان صاحب قاسمی اور حافظ عبد المصور صاحب مسیحی جنہوں نے اس کتاب کی ٹائپنگ میں بھرپور تعاون فرمایا، اللہ پاک جملہ معاونین کو اجر جزیل عطاء فرمائے اور اس مجموعہ سے امت کے ہر خاص وعام کو نفع پہنچائے اور میرے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین۔

محمد زبیر احمد قاسمی

مدرس جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم

۱۸ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی خاتم المرسلین وعلی اٰلہ وأصحابہ أجمعین .

وصول الی اللہ میں تاخیر کی وجہ

فرمایا: اہل اللہ کی صحبت حاصل ہونے کے باوجود جن جولوگوں کو سلوک طے کرنے میں دیر ہورہی ہے اور وصول الی اللہ نصیب نہیں ہورہا ہے، ان کو یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ وہ ضرور کسی نہ کسی گناہ میں مبتلا ہیں، ذکر بھی کرتے ہیں، مگر ذکر سے جہاں نور پیدا ہوا بدنظری کر کے یا کوئی اور گناہ کر کے، اس کو بجھا دیتے ہیں، عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی نیکیاں کرنے کا اہتمام کرتا ہے، لیکن گناہوں سے بچنے کا اہتمام نہیں کرتا، نیکی کرنے سے نور پیدا ہوتا ہے، مگر جب انسان گناہ کرتا ہے، تو وہ نور ختم ہوجاتا ہے، جس طرح کوئی ایک طرف سے آگ جلائے، اور دوسری طرف سے بجھادے، اس طرح یہ آنکھ مچولی جیسا کھیل ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ وہ آدمی جہاں تھا، وہیں رہتا ہے، اور کبھی اس کو وصول نصیب نہیں ہوتا، جیسے ایک برتن ہو، جس میں نیچے سوراخ ہوں، آپ اس میں دودھ ڈال دیں، تو نیچے سے خالی ہوتا رہے گا، اسی طرح نماز پڑھتا ہو، ذکر کرتا ہو، مگر دل میں تکبر ہو، غیبت کرتا ہو، بدنظر میں مبتلا ہو، تو نیکیاں بھی اسی طرح خالی ہوتی رہیں گی، اس لئے سالک کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ گناہ ہرگز نہ کرے، اپنے آپ کو تمام قسم کے گناہوں سے بچانے کی پوری پوری کوشش ہونی چاہئے۔

اگر کوئی ہدایت پانا چاہے

جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دینا چاہتے ہیں، تو عالم اور کائنات کا ہر ذرہ اس کے لئے ہدایت کا ذریعہ بن جاتا ہے، ہر واقعہ سے کوئی نہ کوئی بات وہ نکال لیتا ہے، اور جس آدمی کو ہدایت نہیں ملنی ہے، اس کے سامنے قرآن پیش کیجئے، حدیث پیش کیجئے، دلائل کے انبار جمع کر دیجئے، لیکن اس سے وہ کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھاتا۔

جسے اللہ ہدایت دیتا ہے تو وہ چڑیوں سے بھی ہدایت پالیتا ہے، کتوں سے بھی ہدایت پالیتا ہے، حتی کہ خنزیر سے بھی ہدایت پالیتا ہے، ایک بزرگ نے خنزیر سے متعلق فرمایا کہ مجھے اس سے ہدایت ملی، اور ہدایت یہ ملی کہ یہ جانور جس کو لوگ عام طور پر گندا جانور کہتے ہیں، یہ بالکل صبح صبح اٹھتا ہے اور تمام جانوروں سے پہلے اپنی روزی کی تلاش میں نکل جاتا ہے، فرمایا کہ اس سے بھی ہم کو عبرت حاصل ہوئی اور ہدایت ملی کہ صبح جلدی اٹھنا چاہئے، اور یہ کہ اپنے کام میں لگ جانا چاہئے۔

ایک بزرگ نے فرمایا کہ مجھے بلی سے ہدایت ملی، اور ہدایت یہ ملی کہ بلی کو دیکھا کہ وہ چوہے کو پکڑنے کے لیے ایک ایک گھنٹہ مراقبہ میں بیٹھ جاتی ہے، ایسا مراقبہ کہ نہ ادھر ہوتی ہے اور نہ ادھر ہوتی ہے، چوہے کی فکر میں بیٹھی رہتی ہے، فرمایا کہ اسی طرح ہم کو اللہ کے لیے پورے خشوع وخضوع کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہو جانا چاہئے۔ اگر انسان ہدایت پانا چاہتا ہے تو کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے لیے ہدایت بن جاتا ہے۔

نماز میں دل نہیں لگتا

ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت بہت کوشش کرتا ہوں کہ نماز میں یکسوئی ہو، مگر دل میں طرح طرح کے خیالات ووساوس آتے رہتے ہیں، حضرت نے پہلے خواجہ مجذوب کا شعر سنایا:

دل کیوں نہیں لگتا طاعتوں میں اس فکر کے پاس بھی نہ جانا
دل لگنا کہاں ہے فرض تجھ پر ترا فرض تو ہے دل لگانا

پھر ارشاد فرمایا: پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، کیونکہ جب ہم بالقصد کسی چیز کی طرف دیکھتے ہیں تو بالتبع اُس کے آس پاس کی چیزیں بھی نظر آنے لگتی ہیں، حالانکہ اُنکو دیکھنا ہمارا مقصد نہیں ہوتا، بعینہ اسی طرح نماز میں ہمارا مقصد صرف اللہ تعالی کو یاد کرنا اور اُس کی طرف پوری توجہ کو مبذول کرنا ہوتا ہے، مگر پھر بھی دل میں دوسروں کی یاد اور وساوس آتے جاتے رہیں، تو یہ نماز کے لئے مضر نہیں، اور خشوع کے خلاف بھی نہیں، ہمارا کام تو صرف دل لگانا ہے۔

ہاں اپنے قصد وارادے سے کسی اور طرف توجہ کرنا، اور ادھر اُدھر کی باتیں سوچنا، یہ خلاف خشوع ہے۔

یہ تو تمہارے ماتم کا دن ہوگا

بیشتر مجلسوں میں حضرت نے اپنا واقعہ سنایا کہ میں نے ایک مرتبہ اپنے شیخ ومرشد واستاذ حضرت مسیح الامت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا جس میں میں نے پوچھا کہ حضرت! کتنا ہی خشوع وخضوع ودل جمعی کے ساتھ نماز پڑھتا ہوں، مگر پھر بھی نماز کے بعد دل میں یہ خیال آتا ہے، کہ نماز جیسی پڑھنی تھی ویسی نہیں پڑھ سکا، ابھی کچھ نقص باقی ہے، تو حضرت نے بہت ہی عجیب جواب لکھا جس میں فرمایا: کہ یہ خیال تو ٹھیک ہے، اور جس دن یہ خیال کرلیا کہ آج میں نے نماز کما حقہ اداء کی ہے، وہ تو تمہارے ماتم کا دن ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ آدمی کو کبھی بھی اپنی عبادت وریاضت پر ناز نہ ہونا چاہئے، بلکہ ہر وقت یہی خیال کرنا چاہئے کہ ہم سے اللہ کے شایان شان کچھ نہ ہوسکا، اور اگر

کسی نے یہ سمجھا کہ میں نے بڑی شاندار عبادت کی ہے اور اس پر اترانے لگا، اور بڑائی کرنے لگا، تو یہ اس کے لئے رسوائی کا سبب ہوگا۔

اپنے آپ کو مٹادو

ایک مرتبہ مجلس میں بتی جل رہی تھی، حضرت نے اسے دیکھ کر فرمایا: اس سے عبرت حاصل کرو کہ یہ اپنے وجود کو مٹا کر دوسروں کو نفع پہنچاتی ہے، اسی طرح انسان بھی جب تک اپنے آپ کو مٹا نہیں دے گا، اس وقت تک امت کو فائدہ نہیں پہنچا سکے گا۔

غصہ بقدر ضرورت ہو

ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر نصیحت کی درخواست کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لَا تَغْضَبْ** (غصہ مت کرو)، ان صحابی نے دوبارہ نصیحت کی درخواست کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کہ: **لَا تَغْضَبْ** (غصہ نہ کرو)، وہ صحابی تیسری مرتبہ بھی یہی درخواست کرتے ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پھر بھی یہی فرماتے ہیں: **لاتغضب** (غصہ نہ کرو)

(بخاری شریف: ۵۶۵۱، ترمذی شریف: ۱۹۴۳)

اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پہلوان وہ نہیں جو لوگوں کو پچھاڑ دے، پہلوان تو وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔

(بخاری شریف: ۵۶۴۹، مسلم شریف: ۴۷۳۳)

اس لئے غصہ سے پرہیز کرنا چاہئے، اور اگر ضرورت پڑے تو بقدر ضرورت ہی غصہ ہونا چاہئے، میں اس کی ایک مثال عرض کرتا ہوں، دیکھو پریس (استری) میں ایک

دو تین وغیرہ نمبرات لکھے ہوتے ہیں، جس سے پریس کو بقدر ضرورت گرم اور ٹھنڈی کرتے ہیں، اور یہ الگ الگ قسم کے کپڑوں کے لئے الگ الگ ڈگری استعمال کی جاتی ہے، اور اس کے خلاف کرنے سے نقصان اُٹھانا پڑتا ہے، اگر باریک کپڑے کو پریس کرنے لئے زیادہ گرم کرلیا جائے، تو کپڑا جل جائے گا، اگر موٹے کپڑے کیلئے ہلکا گرم کیا جائے تو پریس کا کوئی اثر نہیں ہوگا، اسی طرح غصہ بھی مغضوب علیہ کی حالت کے اعتبار سے ہونا چاہیئے ، پھر فرمایا: آئے دن طلاق وخلع کے واقعات وغیرہ اسی لئے رونما ہوتے ہیں کہ بے موقعہ شوہر غصہ ہوجاتا ہے یا بیوی غصہ ہوجاتی ہے، اگر غصہ بقدر ضرورت ہوتو یہ سارا فساد ختم ہوگا۔

اس لئے میں کہتا ہوں کہ غصہ کے بارے میں تین باتوں پر غور کرنا ضروری ہے: ایک یہ کہ غصہ کب کیا جائے ، دوسرے یہ کہ کیسا کیا جائے ، اور تیسرے یہ کہ کتنا کیا جائے؟

کب کیا جائے؟ جب شریعت اس کی اجازت دے ، لہذا اگر شریعت کی اجازت کے بغیر غصہ کیا جائے گا تو گناہ لازم آئے گا، کیسا کیا جائے؟ یعنی کس طریقہ پر غصہ کا اظہار کیا جائے؟ گالی گلوچ نہ ہو، عار نہ دلائی جائے ، غصہ میں آکر اول فول نہ بکے، بعض لوگ جب یہ دیکھتے ہیں کہ ضرورت پر غصہ کیا جاسکتا ہے تو اس کا خیال نہیں کرتے کہ غصہ کس طرح کرنا چاہیئے ، اس کے کیا حدود ہیں؟ اور کتنا کیا جائے؟ اس کے بارے میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ جس طرح پریس کرنے میں کپڑوں کی مختلف قسموں کا لحاظ رکھ کر اس کے موافق اس کو گرم کرنا چاہیئے ، اسی طرح کسی کو ایک ڈگری غصہ کی ضرورت ہے تو اسی قدر غصہ کرے اور کسی کے لئے دو ڈگری کی ضرورت ہے تو دو ڈگری استعمال کرے، اس سے زائد غصہ کرے گا تو یہ ناجائز بھی ہوگا اور بے

فائدہ بھی۔

اپنے نفس کے لئے غصہ نہ کرے

پھر فرمایا کہ کوئی بھی اپنے ماتحت لوگوں پر غصہ کرے تو اپنے نفس کے لئے نہ کرے، بلکہ اُسی کے فائدہ کے لئے ہونا چاہئے، جیسے اُستاذ کسی طالب علم کی اصلاح کے لئے غصہ کرتا ہے، یہ طالب علم کے فائدہ کے لئے ہو، اپنے نفس کیلئے نہ ہو، اور اُس کو جانچنے کا طریقہ یہ ہے کہ مثلاً اُستاذ کسی طالب علم پر غصہ ہوا، متصلاً بعد کوئی دوسرا طالب علم اُس اُستاذ کے پاس کسی ضرورت سے جائے تو اُستاذ اُس پر بھی خواہ مخواہ غصہ ہو جائے تو یہ اپنے نفس کے لئے غصہ ہوا، نہ کہ اصلاح کے لئے، غصہ صرف اُسی پر ہونا چاہئے جو غلطی کرے، پھر دوسروں سے بات کرے تو نرمی برتے، پھر فرمایا یہ لوہے کے چنے چبانے سے زیادہ مشکل ہے۔

غصہ کی بھی ضرورت ہے

فرمایا: جب یہ کہا جاتا ہے کہ غصہ نہ کرو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ خلاف شریعت یا خلاف فطرت چیزیں دیکھنے کے بعد بھی بالکل غصہ نہ کیا جائے، بلکہ امام شافعی نے تو یہاں تک فرمایا کہ: برموقعہ جس کو غصہ نہ آئے وہ گدھا ہے، لھذا غصہ فی ذاتہ ممنوع نہیں، بلکہ حد سے زیادہ یا بے موقعہ غصہ ممنوع ہے۔

بدگمانی کا موقعہ دینا بھی غلط ہے

فرمایا: جس طرح کسی کے بارے میں بدگمانی کرنا جائز نہیں، اسی طرح بدگمانی کا موقعہ فراہم کرنا بھی جائز نہیں، مگر آج لوگ صرف بدگمانی کرنے کو غلط سمجھتے

ہیں، حالانکہ بدگمانی کا موقعہ دینا اور زیادہ غلط بات ہے، پھر حضرت والا نے اس بات کو مدلل کرتے ہوئے بخاری شریف کی ایک حدیث بیان فرمائی: آپ ﷺ مسجد میں رمضان کے آخر عشرہ میں اعتکاف میں تھے، آپ کی بیوی حضرت صفیہ بنت حی رضی اللہ عنہا آپ سے ملنے آئیں، کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد جانے لگیں، تو آپ ﷺ ان کو چھوڑنے مسجد کے دروازہ تک آئے، تو دو انصاری آدمی وہاں سے گذرے، اور انہوں نے آپ ﷺ کو سلام کیا، تو آپ نے فرمایا: خبردار! یہ صفیہ ہے، (یعنی یہ گمان نہ کرو کہ کوئی دوسری عورت میرے پاس ہے بلکہ یہ میری ہی بیوی صفیہ ہے) تو ان دونوں نے کہا کہ سبحان اللہ! یا رسول اللہ (یعنی ہم آپ کے بارے میں کیسے بدگمانی کر سکتے ہیں) اور ان پر یہ بات شاق گذری، تو آپ ﷺ نے فرمایا: شیطان انسان میں خون کی طرح دوڑتا ہے، اس لئے مجھے خوف ہوا کہ وہ کہیں تمہارے دل میں بد گمانی نہ پیدا کر دے۔

(بخاری: ۱۸۹۳، مسلم: ۴۰۴۱)

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء کی تفسیر

رمضان میں دورانِ تفسیر حضرت نے فرمایا: یہاں اس آیت میں علماء سے مراد وہ علماء نہیں، جو کسی دینی ادارہ کے سند یافتہ ہونے کی وجہ سے مولوی کہلاتے ہیں، اس لئے کہ نزولِ قرآن کے وقت نہ یہ مدارس تھے، نہ سندیں تھیں، نہ دستاریں تھیں ، نہ دستار بندیاں ہوتی تھیں، اس لئے اس آیت میں علماء سے مراد یہ لوگ نہیں ہیں، بلکہ مراد اللہ کو جاننے والے ہیں جن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اللہ کا خوف اپنے دلوں میں رکھتے ہیں۔

حضرت حسن بصری نے فریا ہے کہ:

إنما الفقيه الزاهد في الدنيا؛ البصير بدينه؛ المداوم على عبادة ربه.

کہ فقیہ یعنی عالم وہ ہے جو دنیا سے زہد اختیار کرے، اور اپنے دین میں بصیرت رکھے اور اپنے رب کی عبادت پر دوام و پابندے رکھے۔

حضرت سفیان بن عیینہؒ کی ایک بات یاد آ گئی، تاریخ بغداد میں آپ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ:

انما العلم ليتقى الله به، ويعمل به لآخرته، ويصرف عن نفسه سوء الدنيا والآخرة ، والا فالعالم كاجاهل اذا لم يتق الله بعلمه۔

(تاریخ بغداد: ۲۱۳/۴)

یعنی فرماتے ہیں کہ علم تو اس لئے ہے کہ اللہ سے ڈرا جائے، اور آخرت کے لئے عمل کیا جائے اور دنیا اور آخرت کے برائی کو دور کیا جائے، ورنہ تو عالم جاہل کے مانند ہے اگر وہ اللہ سے ڈرتا نہیں۔

لہذا جو بھی عالم باللہ ہوگا، اور اللہ کا خوف رکھتا ہوگا، اگر چہ وہ عالم بالکتب نہ ہو، وہ اس آیت کریمہ کا مصداق ہوگا، ہاں اگر کوئی عالم بالکتب ہونے کے ساتھ ساتھ عالم باللہ بھی ہو تو نور علی نور ہے۔

یہ ہے اصطلاح قرآن وسنت میں عالم کی تعریف، صرف مدرسے میں داخل ہوا اور تصدیق وسند لیکر آ گیا تو وہ قرآن وحدیث کی زبان میں عالم نہیں ہو جاتا۔

لفظ مولوی کا معنی

ہمارے حضرت مسیح الامتؒ فرمایا کرتے تھے کہ لفظ مولوی میں یائے نسبتی ہے،

جیسے دہلوی، دہلی والا، بنگلوری، بنگلور والا، کرناٹکی، کرناٹک والا، میں یاء نسبت کی ہے، اب مولوی کے معنی ہوں گے مولیٰ والا، اللہ والا، لہذا جو اللہ والا نہ ہو وہ مولوی ہرگز نہیں ہے۔

عبرت آموز حکایت

مولانا رومی نے ایک حکایت لکھی ہے کہ دو چور ایک گھر میں داخل ہوئے اور انہوں نے یہ طے کیا کہ جب گھر کا مالک روشنی کے لئے چقماق کو رگڑ کر روشنی جلائے گا، تو ان میں سے ایک انگلی رکھ کر اس کو بجھا دے گا، اور یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب کہ بجلی کا کوئی انتظام نہیں تھا، چقماق کے پتھر ہوتے تھے، جن کو ایک دوسرے پر رگڑتے تو آگ پیدا ہو جاتی تھی، تو دو چوروں نے یہ طے کیا کہ ہم لوٹنا شروع کریں گے اور جب گھر والا جاگ کر، بیدار ہو کر، چقماق سے روشنی جلانا چاہے گا، تو ایسی صورت میں ایک چور صرف یہ کام کرے کہ جیسے ہی وہ آگ جلائے، اس پر ہاتھ رکھ دینا، نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ چقماق کا پتھر کبھی جلنے کا نہیں، اور اس وقت تک دوسرا چور سب لوٹ لے گا، چناں چہ ایسا ہی کیا اور گھر کو ان چوروں نے لوٹ لیا۔

مولانا رومیؒ نے کہا کہ شیطان بھی اسی طرح بعض سالکین کے دل پر انگلی رکھ دی ہے، تا کہ نور ختم ہو جائے، سالک اگر کوئی نیکی کر رہا ہے تو یوں سمجھو کہ وہ چقماق کا پتھر رگڑ رہا ہے، اور شیطان اس پر انگلی رکھ دیتا ہے، یہ انگلی وہی معصیت اور گناہ ہے، جب گناہ ہوتا ہے تو وہ نیکی کی روشنی بجھ جاتی ہے، سالک نے اللہ اللہ کی، تلاوت وذکر کیا، شیطان نے فوراً ہی اس کی آنکھوں سے کسی عورت کو دکھا دیا، اور اس کے عشق میں اس کو مبتلا کر دیا، دل میں گندے خیالات پیدا کر دیا، اسی طرح گناہوں

میں عمر گذر گئی، اور یہ شخص صاحب نسبت بن نہ سکا۔

واقعی بڑی عبرت کی بات ہے، ہر سالک کو اس پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے ،بعض سالکین رات دن خانقاہوں میں رہتے ہیں، اولیاء اللہ کی صحبت میں ہیں، ذکر وتلاوت بھی کرتے ہیں، لیکن گناہوں سے نہیں بچتے، اوران کا نور تام نہیں ہوتا اور یہ محروم رہ جاتے ہیں۔

گناہ زہریلا سانپ ہے

جو یہ چاہے کہ وہ اللہ والا بن جائے تو وہ گناہ سے ایسا بچے جیسا کوئی سانپ سے بچتا ہے، سانپ کو دیکھئے بڑا حسین وجمیل لگتا ہے، جو اس کے زہر سے واقف نہیں ہوتا وہ اس پر ہاتھ رکھ دے گا کہ ماشاء اللہ! کتنا اچھا لگ رہا ہے، اس کو لیجا کر پالا کروں گا، اور یہ اس کی جہالت ہے، اور جو اس کے زہر سے واقف ہوتا ہے، وہ یہ کہے گا کہ اس سے بچو دور بھاگو، کیوں کہ یہ دیکھنے میں جتنا خوبصورت ہے اندر سے اتنا ہی زہریلا ہے ، چناں چہ علماء حیوانات نے لکھا ہے کہ جو سانپ جتنا زیادہ خوبصورت ہوتا ہے، وہ اتنا ہی زہریلا ہوتا ہے، اور جو زیادہ خوبصورت نہیں ہوتا، اس میں زہر بھی کم ہوتا ہے، ناگ سانپ کو دیکھ لیجئے کہ اس کا پھن زیادہ خوبصورت ہوتا ہے، مگر اس کا کاٹا ہوا زندہ نہیں بچتا، اس کا ایک ڈسنا انسان کو ہلاک کر دیتا ہے، اسی طرح گناہ کرنے میں بھی بظاہر لذت ملتی ہے، مگر اس کا انجام بڑا خطرناک ہوتا ہے، بزرگوں نے کہا کہ گناہ سے اس لئے بھی بچو کہ گناہ انسان کو اپنے محبوبِ حقیقی اللہ سے دور کر دیتا ہے، جب آدمی گناہ کرتا ہے، تو اس کی وجہ سے دوری پیدا ہو جاتی ہے اور جتنا زیادہ گناہ کرے گا اسی قدر دوری بھی زیادہ ہوگی۔

عبادت میں لذت کیوں نہیں آتی؟

جب آدمی گناہ کرتا ہے تو عبادت کی لذت سے محروم ہو جاتا ہے، عبادات کا مزہ اس کو آتا ہے جس کا دل صحیح سالم ہو، کوئی بیماری کا شکار نہ ہو، اور اس کے مزاج کے اندر کوئی فتور نہ ہو، جیسے صحت مند انسان جب بریانی کھاتا ہے تو بریانی کا مزہ آتا ہے، حلوہ کھاتا ہے تو حلوہ کا مزہ آتا ہے، کھارا کھاتا ہے تو کھارے کا مزہ آتا ہے، میٹھا کھاتا ہے تو میٹھے کا مزہ آتا ہے، لیکن جس کی طبیعت میں فساد پیدا ہو جائے صفراء کی بیماری یا اور کسی بیماری کی وجہ سے، تو اب وہ کھائے گا تو مزہ نہیں آئے گا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو نماز میں مزہ نہیں آتا، اس کی کیا وجہ ہے؟ میں کہتا ہوں کہ بیشک مزہ نہ آنے کی کوئی وجہ ہوگی، کسی آدمی کو بریانی کھانے کے باوجود مزہ نہیں آئے تو کیا وہ ڈاکٹر کو نہیں بتائے گا، اسی طریقہ پر جس آدمی کو ذکر و نماز میں مزہ نہیں آئے، تو اسے یہ سمجھنا چاہئے کہ اس کا دل بیمار ہے، گناہوں کی وجہ سے اس کی طبیعت میں فساد پیدا ہو گیا ہے، اس لئے مزہ نہیں آرہا ہے۔

ہاں ایک بات اور سن لیں کہ مزہ نہ آئے تو اس کا علاج تو کرانا چاہئے مگر عبادت نہیں چھوڑنا چاہئے، بعض لوگ مزہ نہ آنے پر عبادت ہی چھوڑ بیٹھتے ہیں، یہ حماقت کی بات ہے۔ جیسے کسی کو بریانی کھانے میں مزہ نہ آئے تو علاج تو کرانا چاہئے مگر یہ بے وقوفی نہیں کرنا چاہئے کہ کھانا ہی چھوڑ دے، ورنہ مر ہی جائے گا، اسی طرح اب عبادت جو ہو رہی ہے بلا مزہ ہی سہی، ہو تو رہی ہے، اور اس کی وجہ ایمان کی رمق تو باقی ہے، اگر یہ بھی چھوڑ دے گا تو اس کے ایمان کا کیا ہوگا؟

مزہ نہ آئے تو دوا سمجھو

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت مجھے ذکر ونماز میں مزہ نہیں آتا، حضرت نے فرمایا کہ بھائی عبادت میں مزہ آئے تو غذاء سمجھواور مزہ نہ آئے تو دواء سمجھو، اوراس کو کرتے رہو، اگر مزہ نہ آئے تو عبادت چھوڑ نانہیں چاہئے، بلکہ یہ سمجھ کر کرنا چاہئے کہ وہ دواء ہے، جیسے ٹانک پینے سے کیا مزہ آتا ہے؟ گولی کھانے سے کیا مزہ آتا ہے؟ اوراگرانجکشن لینا پڑے تواس میں چرکا لگتا ہے، مزہ تو وہاں نہیں، لیکن بہر حال لگانا ہی پڑتا ہے، اسی طرح اگر عبادات میں مزہ نہ آئے تو چھوڑ نانہیں چاہئے بلکہ اس کو کرتے رہنا ہے۔

لیکن اتنی بات ہے کہ اس کا مزاج ٹھیک نہیں، اس کا کچھ علاج ومعالجہ کرنا چاہئے، پھر ذکر کی حلاوت ایک وقت دل میں اترتی چلی جائے گی، بزرگوں نے کہا کہ آدمی جب گناہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل سے عبادت کی حلاوت کو چھین لیتے ہیں، یہ گناہ کا اثر اوراس کی خرابی ہوتی ہے، معلوم ہوا کہ جن لوگوں کو عبادت میں مزہ نہیں آتا، وہ دراصل گناہوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔

علامہ اقبال نے اسی حقیقت کواس شعر میں بیان کیا ہے:

میں جو سر بسجدہ ہوا کبھی، تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

لہذا آدمی گناہ کو چھوڑے، پھر جا کر نماز پڑھے اور اللہ کو پکارے، اب دیکھو اس سجدہ کی کیا کیفیت ہوتی ہے، گناہ کر کے بھی دیکھ لواور گناہ چھوڑ کے بھی دیکھ لو، فرق خود بخود معلوم ہو جائے گا۔

اللہ کے دوحق ہیں

فرمایا: اللہ کے دوحق ہیں، محبت اور عظمت، محبت اللہ سے رکھنا تو فرض ہے، ساری دنیا کی چیزوں میں سب سے زیادہ محبت اللہ سے ہونی چاہئے، اسی لئے قرآن کریم میں ایک جگہ اللہ اور رسول کو محبت میں مقدم نہ رکھنے والوں پر وعید آئی ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ آبَاءُ كُمْ وَاَبْنَاءُ كُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَاوَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِىْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ

ترجمہ: آپ فرمادیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور کنبہ اور وہ اموال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے نہ چلنے سے تم ڈرتے ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو، تمہیں اللہ اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہوں، تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے)

حکم سے مراد عذاب کا حکم ہے، معلوم ہوا اللہ ورسول کی محبت دنیا و مافیہا سے زیادہ ہونا ضروری ہے، اور اس محبت کا ایک حق ہے اور وہ حق عبادت واطاعت کرنا ہے، کیوں کہ محبوب کی اطاعت کے بغیر محبت کا دعوی بے کار ہے۔

حضرت وراقؒ نے فرمایا ہے کہ:

تَعْصِي الْإِلٰهَ وَأَنْتَ تُظْهِرُ حُبَّهُ ❁ هٰذَا لَعَمْرِى فِي الْقِيَاسِ بَدِيْعُ

لَوْكَانَ حُبُّكَ صَادِقاً لَأَطَعْتَهُ ❁ إِنّ: الْمُحِبَّ لِمَنْ يُّحِبُّ مُطِيْعُ

یعنی فرماتے ہیں کہ تو خدا کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کے ساتھ اس سے

محبت کا دعوی بھی کرتا ہے ،خدا کی قسم یہ تو عجیب ہے ، پھر فرماتے ہیں کہ اگر تیرے دعویٔ محبت میں کوئی صداقت ہوتی تو تو اپنے خدا کی اطاعت وفرمانبرداری کرتا ، کیونکہ اصول یہ ہے کہ کسی کو چاہنے والا اپنے محبوب کا مطیع وفرمانبردار ہوا کرتا ہے۔

لہذا محبت کا حق یہ ہے کہ محبوب کی عبادت واطاعت کی جائے ۔اور اللہ کا دوسرا حق ہے اللہ کی عظمت ،قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:'' وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ'' کہ لوگوں نے اللہ کی اس طرح قدر وعظمت نہیں کی جیسی قدر وعظمت کرنا چاہیئے ،اور فرمایا کہ '' وَ كَبِّرْهُ تَكْبِيْراً ''،یعنی اللہ کی عظمت وبڑائی بیان کرو۔

معلوم ہوا کہ اللہ کی عظمت کرنا اس کا ایک حق ہے اور اس کی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی گناہوں سے بچ جائے ، معصیت سے دور بھاگے ،اس کی ناراضگی لانے والی کوئی بات نہ کرے، یہ اللہ کی عظمت وجلالت کا حق ہے اور جس نے معاصی وگناہ نہیں چھوڑے،اس نے اللہ کی عظمت کا حق ادا نہیں کیا،اس لیے اللہ کے دونوں حق ادا کر کے ولی اللہ بن جاؤ،اللہ کا ولی بننے کا یہ نسخہ ہے،اس کو محفوظ کرلو۔

دنیوی عیش میں سکون نہیں

ارشاد فرمایا کہ مزہ اور چیز ہے،دل کا سکون اور چیز ہے،ایک آدمی مزے اڑا رہا ہے،لیکن ضروری نہیں کہ دل کو سکون بھی ہو،شراب بھی ہے، کباب بھی ہے، شباب بھی ہے، مال ودولت اور دنیا کا عیش بھی ہے،لیکن اس کے دل سے پوچھئے کہ سکون بھی حاصل ہے؟ ابھی میں کرنول گیا تھا ،وہاں پر میرا قیام ایک گھر میں تھا،جب میرے میزبان اس گھر میں لیکر گئے،تو دیکھتا ہوں کہ اتنا بڑا گھر ہے،،بہت لمبا چوڑا ہے، ہر قسم کے راحت وسکون کے اسباب موجود ہیں، خیر اس کے بعد ناشتے کیلے بہت

لمبا چوڑا دسترخوان بچھایا گیا، ناشتے کے بعد انھوں نے اپنی کہانی سنانی شروع کی، اس کا حاصل یہ تھا کہ گھر کا کوئی آدمی رات بھر نہیں سوتا، دن میں چین نہیں، رات میں نیند نہیں، اپنے حالات اور پریشانی کا انھوں نے مجھ سے ذکر کیا جس کو سن کر بڑا افسوس ہوا کہ دیکھئے اسباب کتنے ہیں، مال کی فراوانی ہے، راحت کے سارے سامان بے تحاشا ہیں، لیکن سکون نصیب نہیں، سامنے یہ حالت اور اندرونی یہ حالت، اسی کو میں نے کہا کہ مزہ اور چیز ہے، دل کا سکون اور چیز ہے، منھ میں کباب ہے، دل میں عذاب ہے، جس نے اللہ کو ناراض کر کے منھ میں کباب رکھ لیا، اللہ کے قہر و عذاب سے اس کے دل کا سکون غارت ہو گیا، اس سے بہتر تو یہ ہے کہ منھ میں سوکھی روٹی ہو اور دل میں سکون ہو، یاد رکھو! گناہوں سے سکون نہیں مل سکتا، ہاں تھوڑی دیر کے لیے مزہ مل سکتا ہے، اسی لیے لوگ کہتے ہیں کہ ہم تھوڑی دیر کے لئے مزہ اڑا لیں گے، کیوں کہ وہ بھی جانتے ہیں کہ گناہوں کا مزہ صرف تھوڑی دیر کے لئے ہوتا ہے، لیکن ایک دولت اللہ کے قرب کی ہے کہ جس کو مل جاتی ہے وہ سوتا ہوا بھی چین پاتا ہے اور جاگتا ہوا بھی، بیماری میں بھی اور صحت میں بھی، اس لئے انسان کو اللہ کے قرب اور محبت کی تلاش میں لگ جانا چاہئے، اسی میں قلب کا سکون ہے۔

ایک طالب علم کا تقویٰ

ایک طالب علم کا قصہ سناتا ہوں، ایک جگہ پر ایک مسجد میں ایک طالب علم رہتا تھا، اس علاقہ میں کوئی حادثہ ہو گیا، رات کا وقت تھا، تو ایک عورت اس مسجد میں گھس آئی، وہاں اس عورت نے دیکھا کہ ایک نوجوان مولوی صاحب ایک کونے میں مطالعہ میں مصروف ہیں، اس عورت نے آ کر ان سے کہا کہ حالات باہر بہت

خراب ہیں، امن وامان نہیں ہے، اب میں اپنے مقام پر جانہیں سکتی، اس لئے اب میں یہاں رات گذارنے آئی ہوں، اس لئے رات یہاں گزارنے کی اجازت دیجئے ۔اب وہ کیسے انکار کرسکتے تھے، اجازت دے دی، اب وہ عورت ادھر کو بیٹھ گئی، دوسری طرف یہ مولانا مطالعہ میں مصروف ہوگئے اوران کے سامنے ایک چراغ جل رہا تھا، وہ طالب علم درمیانِ مطالعہ اپنی انگلی کو چراغ میں داخل کرتے اورنکالتے ، پھر کچھ دیر مطالعہ کرتے ،اور پھراپنی انگلی کو چراغ میں داخل کرتے اورنکالتے ، دوسری طرف یہ عورت اس منظرکو دیکھ رہی تھی، کہ کہیں پاگل تونہیں ہوگیا کہ اپنے آپ کو جلارہاہے،آخرکیا قصہ ہے؟ یہاں تک کہ رات ختم ہوکر جب صبح ہوئی،تو وہ طالب علم مسجد کے باہرگئے ،حالات کا مشاہدہ کرکے آئے ،اوراس عورت سے کہا کہ اب نماز کا وقت ہونے والا ہے، نمازی آنے والے ہیں،اس طرح اب تمہارا یہاں رہنا مناسب نہیں کہ لوگوں میں بدگمانی ہوگی، اب باہرکا راستہ صاف ہوگیاہے،آؤتم کو باہرتک چھوڑآؤں،اس نے کہا جب راستہ صاف ہےتو جانے میں کوئی حرج نہیں ،لیکن جانے سے پہلے ایک سوال کا جواب چاہتی ہوں،سوال یہ کہ رات بھرآپ اپنی انگلی کوجلانے کی کوشش کیوں کرتے رہے،اس راز کو جب آپ بتائیں گے،تب میں یہاں سے جاؤں گی ،انھوں نے کہا کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے،اس نے کہا جب تک آپ اس راز کونہیں بتائیں گے، میں یہاں سے جانے کی نہیں ،انھوں نے کہا کہ بات دراصل یہ کہ تم جب یہاں آئیں تو میرے دل میں نفسانی خواہشات ابھرنے لگے،اور مجھے بےچین کرنے لگے، میں نے فوراًاپنے دل کوکہا کہ اگرتو براکام کرے گا،تو تجھے جہنم میں جلنا پڑے گا،اس سے پہلے دنیا کی آگ کا مزہ چکھ لے، میں اسے دنیا کی آگ کا مزہ چکھارہاتھااوراپنے نفس کو کہہ رہاتھا کہ اگرتجھ میں اس کو برداشت

کرنے کی طاقت ہو، تو پھر آگے دیکھا جائے گا، غرض جب بھی میرا نفس گناہ کا تقاضا کرتا، تو میں اپنے نفس کو آگ کا مزہ چکھاتا تھا، اس طرح پوری رات گذری۔

طلباء کرام غور کریں کہ یہ ہے تقوی کی زندگی، اس طرح اپنے آپ کو لذات اور خواہشات سے بچانا چاہیئے۔

ظاہر باطن کا ترجمان ہوتا ہے

میرے طالب علمی کے زمانے میں تھانہ بھون میں ایک بزرگ تھے، ہم لوگ جلال آباد سے تھانہ بھون ان بزرگ سے ملنے جایا کرتے تھے، ان کا نام حضرت مولانا ظہور الحسن صاحب تھا، حضرت تھانوی کی خانقاہ میں وہ رہتے تھے، اب ان کے صاحبزادے مولانا نجم الحسن صاحب رہتے ہیں، تو کبھی کبھی فرصت ہوتی تو ان کی خدمت میں جایا کرتے تھے، ان کے چہرہ کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک نور ہے، جو ٹپک رہا ہے، چاہیں تو پکڑ لیں، اور یہی کیفیت تھی حضرت مسیح الامت نور اللہ مرقدہ کی، دیکھنے میں معلوم ہوتا تھا کہ واقعی نور ٹپک رہا ہے، کوئی چیز لے جاؤ اور پکڑ لو، یہ اللہ والے اپنے باطن کو ہمیشہ گندگیوں سے صاف رکھتے ہیں، جس کی نورانیت چہرہ سے معلوم ہو جاتی ہے اور اسی طرح کوئی چھپ کر گناہ کر کے آتا ہے تو اس کے چہرہ کی بے رونقی سے اس کے دل کی ترجمانی ہو جاتی ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی فراست

ایک دفعہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ایک بازار میں ایک گناہ ہو گیا کہ نامحرم عورت پر نگاہ پڑ گئی، پھر وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئے اور ان کی مجلس میں بیٹھ گئے، حضرت رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا حال

ہے کہ بعض لوگوں کی آنکھوں میں زنا کا اثر ہوتا ہے اور وہ مجلس میں آکر بیٹھ جاتے ہیں، حضرت انس کہنے لگے کہ حضرت! کیا جبرئیل اب بھی وحی لاتے ہیں؟ کیا نبوت ختم نہیں ہوئی؟ جبرئیل کی آمدورفت کیا اب بھی باقی ہے؟ حضرت عثمان غنیؓ نے فرمایا نہیں، نبوت کا دروازہ تو بند ہو گیا، مگر فراست کا دروازہ ابھی کھلا ہوا ہے، مومن کی فراست دیکھ لیتی ہے کہ کس نے کیا گناہ کیا ہے۔ (تفسیر القرطبی: ۱۰/۴۴)

حضرت شاہ ابرارالحقؒ کا ایک ارشاد

ایک بزرگ مدرسہ آئے تھے، انھوں نے ہمارے مرشد حضرت شاہ ابرارالحق صاحبؒ کی ایک بات بتائی کہ جن چیزوں سے نقصان ہوتا ہے، ان چیزوں سے جانور بھی بچتا ہے، مثلاً راستہ میں اگر کوئی کتا یا بلی اور کوئی جانور بیٹھا ہوا ہو، اور اگر گاڑی یا موٹر کار آجائے، تو وہ فوراً اٹھ کر وہاں سے چلا جاتا ہے، کیوں کہ اسے یہ معلوم ہے کہ اگر یوں ہی بیٹھا رہا تو اسے نقصان ہوسکتا ہے۔ لہذا تو فرمایا کہ جب جانور اپنی ذات کو نقصان سے بچاتا ہے تو کیا ایک مسلمان کو اپنے دین کی حفاظت کی خاطر گناہوں سے بچنا نہیں چاہئے؟ دین کی حفاظت کے لئے تو اس سے زیادہ بچنا چاہئے، تاکہ ایمان ضائع نہ ہو جائے، اور اس کے لئے بہت اہتمام سے اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے کی پوری پوری کوشش کرنا چاہئے۔

نفس کی اصلاح، ایک بزرگ کا قصہ

دہلی کی جامع مسجد میں ایک مرتبہ ایک بزرگ فجر کی نماز کے بعد سیڑھیوں پر بیٹھ گئے اور یہ کہنے لگے کہ ''تو میرا خدا نہیں، میں تیرا بندہ نہیں، پھر میں تیری کیوں مانوں؟

دیکھنے والے لوگ کہنے لگے یہ کافر ہوگئے، کسی نے کہا پاگل ہوگئے، جب نماز کا وقت آتا تو یہ بزرگ اندر جا کر نماز پڑھتے اور باہر آکر بیٹھ جاتے، اور پھر یہی بات کہنے لگتے، مغرب کے قریب ایک شخص وہاں سے گذرتا ہوا ان کی بات سنا اور کھڑا ہوگیا، اور پوچھا کہ حضرت! یہ ''تو'' کا مخاطب کون ہے، اور یہ بات آپ کس سے کہہ رہے ہیں؟ اس پران بزرگ کو ہنسی آگئی، اور کہنے لگے ''دہلی جیسے شہر میں ایک ہی عقلمند نظر آیا، کسی نے مجھے پوچھا ہی نہیں کہ میرے اس ''تو'' کا مخاطب کون ہے، اور میں کس سے یہ کہہ رہا ہوں، خود ہی سمجھ لیا کہ میں اپنے اللہ سے یہ بات کہہ رہا ہوں، حالانکہ میں اللہ سے نہیں کہہ رہا ہوں، پھر اس شخص سے کہنے لگے ''تو نے بڑی عقلمندی کا کام کیا کہ مجھ سے پوچھ لیا، دراصل میرا مخاطب میرا نفس ہے اور میں نفس سے مخاطب ہوں کہ اے نفس تو میرا خدا نہیں ہے، میں تیرا بندہ اور غلام نہیں ہوں، اس لئے میں تیری کیوں مانوں؟ میں تو خدا کی مانوں گا۔

اس نے کہا کہ یہ بات آپ کیوں فرما رہے تھے؟ اس پران بزرگ نے کہا: بات یہ ہے کہ آج فجر کی نماز پڑھنے کے بعد مسجد سے نکل رہا تھا، تو نفس نے شدت سے تقاضا کیا کہ آج ناشتہ میں حلوے پراٹھے کھلاؤ، تو میں نے اس سے کہنا شروع کر دیا کہ تو میرا خدا نہیں ہے، اور میں تیرا بندہ نہیں ہوں، اس لئے میں تیری کیوں مانوں؟ میں تو میرے اللہ کی مانوں گا، اور جب بھی وہ مجھ سے یہ مطالبہ کرتا ہے، میں یہی جواب دیتا ہوں

یہ واقعہ بڑا عبرت انگیز ہے اور اصلاح نفس کی فکر کرنے والوں کو ایک عمدہ سبق فراہم کرتا ہے، بزرگان دین کہتے ہیں کہ ناجائز چیزوں میں بالکلیہ پرہیز کرنا چاہئے اور جو جائز چیزیں ہوں، مثلاً کھانے پینے کی حلال چیزیں، ان میں پابندی نہیں ہے، لیکن ان

میں تقلیل اور کمی کرنا چاہئے، کہ کبھی نفس کو دیدو، کبھی کہدو کہ بھائی! اب نہیں تب ملے گا، اس سے نفس کنٹرول میں رہے گا، اگر اس کی ہر جائز وحلال خواہش پوری کی گئی تو وہ سر پر بیٹھ جائے گا۔

نفس کی چالیں

حضرت حکیم اختر صاحب دامت برکاتہم نے ارشاد فرمایا کہ نفس حسینوں سے نظر ملاتا ہے، کبھی شانِ رحمت سے، اور کبھی شان غضب سے، مثلاً کوئی لڑکی مسکین ویتیم ہو، اور وہ رو رہی ہے تو جناب بھی رو رہے ہیں، اشکبار آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، بصورت رحمت یہ بدنظری کا لعنتی کام کر رہا ہے، اسی طرح کبھی غصہ میں بدنظری کا لعنتی کام کرتا ہے، مثلاً ہوائی جہاز میں ائر ہوسٹس سے جوس مانگا، لانے میں دیر کر دی، یا کھانا اچھا نہیں ہے، ڈانٹ رہا ہے، غصہ سے آنکھیں بھی سرخ ہیں، مگر اسے دیکھ بھی رہا ہے، تو یہ غصہ میں بدنظری کر رہا ہے، اللہ سب کی حفاظت فرمائے، غصہ کر رہا ہے مگر بدنظری سے اندر اندر مزے لے رہا ہے، نفس سے ہوشیار رہئے، اس کی چالوں میں نہ آیئے، نفس کی چالوں سے وہی بچ سکتا ہے، جس پر اللہ کی رحمت کا سایہ ہو، اس لئے اللہ کی رحمت مانگتے رہنا چاہئے، اور گناہ سے بچنے کا پورا پورا اہتمام ہو، اللہ ہم سب کو گناہوں سے بچنے کی توفیق نصیب فرمائے۔

حضرت جنید بغدادیؒ کی فراست

حضرت جنید بغدادیؒ کے زمانے میں ایک واقعہ پیش آیا، وہ یہ کہ ایک عیسائی اپنے مذہب کا بہت بڑا عالم تھا، اس نے کہیں یہ حدیث پڑھ لی ”اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ“ کہ مومن کی فراست سے ڈرتے رہو، اس لئے کہ

وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ (ترمذی:۳۰۵۲، طبرانی فی الاوسط:۳۱۲/۳)

تو یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی کہ سب تو آنکھ سے دیکھتے ہیں مومن فراست سے کیسے دیکھتا ہے؟ اور کیسے سمجھ میں آئے گی کہ فراست کیا چیز ہوتی ہے، بعض چیزیں سمجھانے سے سمجھ میں نہیں آتیں، جب تک کہ خود پر نہیں گذرتیں، بس وہاں پر یا تو تقلید کرے اور مان جائے کہ ہاں بھائی ہوتا ہے، یا نہیں تو خود کو حاصل ہو تو وہ بات تو سمجھ میں آجائے، الغرض اس کو اس حدیث کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا، اس نے علماء سے پوچھا کہ اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟ اس کو سمجھایا گیا مگر اس کی سمجھ میں پھر بھی نہیں آیا، تو اس کو کسی نے مشورہ دیا کہ جنید بغدادی کے پاس چلا جا، وہ تجھکو سمجھا دیں گے، چنانچہ وہ مسلمانوں جیسا لباس پہن کر جنید بغدادی کے پاس گیا اور جا کر کہا: السلام علیکم، حضرت نے کہا: ھَدَاکَ اللہ، (اللہ تجھ کو ہدایت دے) اب بس وہیں پر ٹھٹک گیا کہ میں سلام کرتا ہوں تو سب لوگ سلام کے جواب میں " وعلیکم السلام " کہتے ہیں اور یہ حضرت "ھداک اللہ" کہہ رہے ہیں، اس نے کہا کہ حضرت میں نے سلام کیا آپ نے " ھداک اللہ " کہا، سلام کا جواب نہیں دیا، کیا بات ہے؟ حضرت نے کہا کہ (اتقو فراسة المومن فانه ینظر بنور اللہ)، مومن کی فراست سے بچو اس لئے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے، اور کہا کہ تو تو عیسائی ہے، اور مسلمانوں جیسا لباس پہن کر آیا ہے، یہی ہے فراست جس سے میں تجھے دیکھ رہا ہوں، اب اس کی سمجھ میں آیا کہ واقعی ایسا ہوتا ہے۔

نفس کی اصلاح اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کا طریقہ

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے بارے میں بزرگوں سے سنا ہے کہ جب

ان کا نفس کسی چیز کا تقاضا کرتا تو کہتے کہ دو رکعت نماز پڑھ لینا، پھر چائے پی لینا، اس طرح نفس کو جو وہ چاہتا دیتے نہیں تھے، تا کہ نفس ان کے کنٹرول میں رہے، اس طرح نہیں کیا گیا تو پھر وہ ہمارے اوپر سوار ہو جائے گا۔

حضرت رشید احمد گنگوہیؒ کا طریقۂ اصلاح

حضرت رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں ایک آدمی آیا اور بیعت کی درخواست کی، تو حضرت نے اُس کو بیعت کے بعد گناہوں سے توبہ کرائی کہ زنا نہیں کروں گا، چوری نہیں کروں گا، نماز کی پابندی کروں گا وغیرہ، جب بیعت ہوگئی، تو اس نے کہا: حضرت سب چیزوں سے آپ نے توبہ کرادی، مگر افیون سے توبہ نہیں کرائی، حضرت نے کہا: مجھے کیا خبر کہ تم افیون کھاتے ہو، پھر حضرت نے افیون سے بھی توبہ کرادی، پھر حضرت نے اس سے پوچھا کہ دن میں کتنی افیون کھاتے ہو؟ چونکہ حضرت کی عمر کا اخیر زمانہ تھا، نابینا ہو چکے تھے، نظر نہیں آتا تھا، اس لئے اس سے فرمایا کہ میرے ہاتھ پر رکھدو کہ اس کی مقدار معلوم ہو جائے، جب اس نے ایک مقدار آپ کے ہاتھ پر رکھی، تو حضرت نے فرمایا کہ اب اس کی آدھی اتنی کھالینا، یہ اس لئے فرمایا تا کہ نفس بعد میں مشکل میں نہ پڑ جائے، اور لینے کے دینے نہ پڑ جائیں، مگر وہ آدمی بڑا باہمت تھا، اس نے کہا کہ حضرت جب توبہ کرلی، تو اتنی اور اتنی کیا، میں نے سب سے توبہ کرلی، چنانچہ بالکل چھوڑ دیا، ایسے بھی اللہ کے بندے ہوتے ہیں۔

اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شیخ کو اصلاح میں کن کن باتوں کی لحاظ رکھنا پڑتا ہے؟

مولانا روم کی کایا کب پلٹی؟

پیر شمس تبریزیؒ جو حضرت مولانا جلال الدین رومی کے شیخ تھے، اپنے

زمانے کے بہت بڑے اولیاء اللہ میں ان کا شمار ہوتا تھا، بڑے صاحب کرامت بزرگ تھے، ان کی ایک کرامت یہ لکھی ہے کہ کبھی کبھی مچھلی کھالیا کرتے تھے، اور مچھلی پکڑتے اور سورج کے قریب اپنا ہاتھ لے جاتے اور وہ مچھلی سورج کی تپش سے بھنی جاتی اور اس کو کھالیا کرتے، اتنے بڑے صاحب کرامت بزرگ، لیکن ان کی پوری زندگی اس طرح گذری کہ وہ تو اللہ اللہ کرتے رہتے اور لوگ جو ان کو بزرگ مانتے تھے، وہ اس لئے ان کے پاس آتے تھے کہ حضرت! ہمارے لئے دعا کر دیجئے، فلاں مقدمہ چل رہا ہے، تجارت ٹھپ ہوگئی ہے وغیرہ وغیرہ، یعنی صرف دنیا کے لئے آتے، حتی کہ حضرت کی عمر کا آخری زمانہ آ گیا، ایک دن بیٹھ کر آہ کرنے لگے اور کہنے لگے، اے اللہ میرے سینے میں تیرے عشق کی جو آگ بھڑک رہی ہے، کوئی بندہ اسے لینے آج تک میرے پاس آیا نہیں، ایک عجیب جذبہ کے ساتھ تڑپ کر کہا اور کہا: اے اللہ میرے دنیا سے جانے کا وقت شاید قریب آ رہا ہے، اس سے قبل کہ میں دنیا سے جاؤں، کسی ایک کو تو میں تیری یہ محبت دے کر جاؤں، اس کا کوئی انتظام فرما، اللہ نے دعا قبول کی، اس کے بعد وہ ایک مرتبہ دریائے دجلہ کے کنارے ٹہلتے ہوئے جا رہے تھے، اللہ کے ذکر میں زبان لبریز تھی۔

چلتے چلتے جب دوسرے کنارے پر دیکھا تو مولانا روم ٹہلنے کے لئے آئے ہوئے ہیں، ادھر انھوں نے ان کو دیکھا اور ادھر انکو انھوں نے دیکھا، دل دل میں یہ کہا کہ اگر یہ بندہ مجھے مل جائے تو اس بندہ کے دل میں اللہ کی محبت کی آگ منتقل کر دوں، اللہ نے فوراً دعا قبول کی، وہیں سے مولانا روم کے دل میں یہ بات آ گئی کہ ایک اللہ کا ولی یہاں آیا ہو ہے، اس کی خدمت میں جا کر کچھ فیض حاصل کرنا چاہئے، انھوں نے دوسرے کنارے سے اس کنارے آ کر فیض حاصل کرنا چاہا، مولانا روم اس زمانے

کے بہت بڑے عالم تھے،اور وہ اس زمانے کے بادشاہ کےنواسے تھے،مولانا روم خوارزم مملکت کے بادشاہ کےنواسے ہوتے ہیں، جب وہ باہر نکلتے تھے،تو ان کے ساتھ ایک لشکر ہوتا تھا، بڑی شان وشوکت کے ساتھ سوار ہوکر نکلتے تھے، بڑے بڑے علماء ان کی رکاب پکڑ کر چلتے تھے،اور اس زمانے میں انھوں نے اپنے علم کا لوہا منوالیا، ہزاروں مناظرے ومباحثے کئے، بڑی بڑی تقریریں کی،علم کی دنیا میں ان کا نام ایک روشن ستارہ کے مانند مانا جاتا تھا،اب یہ ہوا کہ وہ اللہ کا بندہ اللہ کے عشق کی آگ لینے کے لئے ایک کنارہ سے دوسرے کنارے آیا اور بیعت ہوگیا،مولانا روم کہتے ہیں، جب تک شمس تبریزی کے ہاتھ پر میں نے بیعت نہیں کی اور جب تک ان کی جوتیاں سیدھی نہیں کی، مجھے علم کا چسکہ بھی نہیں معلوم ہوا،آج مجھے معلوم ہوا کہ علم کیا ہوتا ہے؟ اللہ کے عشق اوراس کی معرفت کے بغیر سب کچھ یوں ہی بیکار ضائع ہوتا ہے،نماز روزہ ودیگر عبادات میں وہ لذت نہیں ملتی، جو ان چیزوں سے حاصل ہوتی ہے، مولانا روم کی طبیعت اسی وقت بدلنی شروع ہوگئی، مولانا روم نے مثنوی شریف لکھی،ان کی کوئی کتاب مثنوی کے علاوہ دنیا میں مشہور نہیں ہے، حالانکہ ان کی اور بہت ساری کتابیں ہیں مگر اللہ نے مثنوی کو جو مقام دیا وہ کسی اور کتاب کونہیں دیا ،حتی کہ بعض علماء کہتے ہیں کہ یوں سمجھو کہ یہ مثنوی درحقیقت فارسی کا قرآن ہے، قرآن کے تمام علوم واسرار، معارف ودقائق کواس کے اندر کھول کھول کر بیان کردیا ہے، اتنا عظیم علم جو ان کو اللہ نے دیا ، یہ دراصل شمس تبریزی کی برکت تھی ،ان کی جوتیوں کوسیدھا کرنے کا نتیجہ تھا، بتانا یہ چاہتا ہوں کہ دنیا والے دنیا مانگتے ہیں ،لیکن اللہ والے، اللہ سے اللہ ہی کو مانگتے ہیں ،مولانا روم نے اللہ مانگ لیا، جب اللہ مل گیا

تو ان کی حالت تبدیل ہوگئی۔

آپ متقی کیسے بن سکیں گے

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے سامنے عورتیں آتی ہیں، ہم کیا کریں؟ ہمارے سامنے برائی آتی ہے، ہم کیا کریں؟ میں کہتا ہوں کہ اگر برائی نہ آئے تو آپ متقی کیسے بن سکیں گے، اگر کوئی برائی نہ آنی ہوتی، تو پھر آپ جنت میں بیٹھے ہوتے، اور کوئی جنتی متقی نہیں، ہاں ہر متقی جنتی ہے، جنت کا رہنے والا متقی نہیں ہوسکتا کیونکہ جنت میں متقی بننے کے اسباب ہی نہیں ہیں، ہاں جو دنیا میں رہ کر متقی بنا، وہ ضرور جنتی ہوگا، اسی لئے اللہ تعالے نے حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں بھیجا، اگر وہ جنت میں رہتے تو متقی نہیں بن سکتے تھے، اللہ نے ان کو جنت سے نکالکر دنیا میں بھیجا کہ جاؤ، دنیا میں مصائب و پریشانیاں آئیں گی، کوئی کانٹا دل میں، کوئی کانٹا ہاتھ پر، کوئی پیر میں لگے گا، ان تمام کانٹوں سے بچ کر زندگی گذارنے کا نام تقوی ہے، جو آدمی یہ تقوی کی زندگی گذارے گا، وہ جنتی ہوگا، اگر کوئی اندھا یہ کہے کہ میں نے کبھی کسی عورت کو دیکھا ہی نہیں، تو اس میں اندھے کا کیا کمال ہے؟ اس لئے کہ وہ تو مفقود البصر ہے، دیکھنا چاہے تب بھی نہیں دیکھ سکتا، ہاں، کوئی بینا یہ کہے کہ میں نے کبھی غلط نگاہ نہیں ڈالی، کسی عورت کو نہیں دیکھا، تو یہ کمال ہوگا، جیسے فرشتوں کا گناہوں سے بچنا کمال نہیں، کیونکہ ان میں گناہ کرنے کی صلاحیت ہی نہیں، معلوم ہوا کہ گناہ کی صلاحیت ہونے کے باوجود جو بچ جائے وہ قابل مدح ہے۔

نفس کی اصلاح، اعتدال کے ساتھ ہونی چاہئے

ایک دم نفس پر کنٹرول نہیں کرنا چاہئے، بلکہ اس کو شیخ کی رائے سے روک

تھام کرنا چاہئے، ورنہ نتائج اچھے نہیں نکلتے، اس پر ایک لطیفہ یاد آ گیا، ایک آدمی کے پاس ایک گھوڑا تھا، اس کا مالک جب اس کو سفر میں لیکر نکلتا، تو اس کی ایک بری عادت یہ تھی کہ لید کرنے کے بعد، گھوم کر اس کی بدبو سونگھتا اور پھر آگے بڑھتا، یہ شخص اس کی اس حرکت سے بہت تنگ تھا، ایک دن اس آدمی کو کسی سفر پر جانا تھا، اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر سفر پر نکلا، راستہ میں اس گھوڑے نے اپنی وہی حرکت شروع کر دی، مالک کو بڑی پریشانی ہونے لگی، لمبا سفر تھا، اس طرح یہ کرے گا تو پریشانی ہوگی، چلتے چلتے راستہ میں ایک اور گھوڑ سوار سے ملاقات ہوگئی، دونوں باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے، ایک جگہ اس گھوڑے نے وہی پرانی حرکت کی، تو دوسرے گھوڑے والے نے پوچھا کہ یہ کیا قصہ ہے تمہارے گھوڑے کا؟ کہا کہ میرے گھوڑے میں یہ عادت پیدا ہوگئی ہے، جس سے میں بہت پریشان ہوں، اس نے کہا کہ اس گھوڑے کا علاج میں کرتا ہوں، آپ میرے گھوڑے پر سوار ہو جایئے اور اپنا گھوڑا مجھے دید یجئے، چنانچہ ادل بدل کر کے سفر شروع کر دیا، جب وہ دوبارہ راستہ میں لید کر کے اپنی پرانی حرکت کرنے لگا، تو اس آدمی نے گھوڑے کی اس قدر پٹائی کی کہ گھوڑے کو بھی عقل آ گئی، ایک ہی دفعہ کی پٹائی میں ٹھیک ہوگیا، بہت دور سفر کرنے کے بعد دونوں کی راہ الگ ہو رہی تھی، پھر دونوں نے اپنا اپنا گھوڑا بدل لیا، اور اس دوسرے شخص نے کہا کہ بھائی! اب تمہارا گھوڑا ٹھیک ہوگیا، لیکر جاؤ، یہ کہکر وہ آدمی چلا گیا، دونوں کا راستہ الگ ہوگیا، اور کچھ دیر گزر گئی، جب اس گھوڑے کو خوب یقین ہوگیا کہ وہ دوسرا گھوڑ سوار ہم سے دور چلا، تو وہ گھوڑا وہاں سے مڑا اور پورا راستہ جہاں جہاں لید کیا تھا وہاں وہاں واپس جا کر، ہر جگہ سونگھ آیا۔

اس میں عبرت ہے کہ نفس کو کنٹرول کرنے کے لئے اعتدال کی ضرورت

ہے، اگر ایک دم سیدھا کر دیا جائے، تو فی الوقت تو وہ سدھر جائے گا، مگر جب دوبارہ لوٹے گا، تو ایسا لوٹے گا کہ کفر کی طرف بھی جا سکتا ہے، اللہ حفاظت فرمائے۔

تقویٰ کسے کہتے ہیں؟

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ بتاو، تقوی کسے کہتے ہیں؟ تو انہوں نے عرض کیا کہ امیر المومنین! کیا آپ کا گذر کبھی ایسے راستہ سے ہوا ہے؟ جو تنگ ہو، ادھر اُدھر کانٹے دار جھاڑیاں ہوں، چلنا دشوار ہو؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں ایسی جگہ سے گزر رہوا ہے، تو انہوں نے پوچھا کہ آپ جب اس راستہ پر سے گزر رے تھے تو کیسے گزر رے تھے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں اس طرح گزر را تھا کہ اپنا دامن سمیٹ لیا تھا، اپنے آپ کو بچا کر بہت ہی احتیاط سے گزر را تھا، تو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: بس اسی کا نام تقوی ہے، کیونکہ دنیا بھی کانٹوں بھرا راستہ ہے، کہیں بدنظری کے مواقع ہیں، تو کہیں کانوں سے گانوں کی آواز ٹکرا رہی ہے، کہیں کفر کے کانٹے ہیں، کہیں شرک و نفاق کے کانٹے ہیں، یہ سب روحانی کانٹے ہیں، ان سب سے بچ کر چلنے کا نام تقوی ہے۔

(تفسیر ابن کثیر: ۱/۱/۴۱، قرطبی:)

اسی مفہوم کو عربی شاعر ابن المعتز نے اشعار میں یوں بیان کیا ہے:

خلِّ الذنوب کبیرھا و صغیرھا فھو التقٰی

چھوٹے بڑے سب گناہ چھوڑ دو، یہی تقویٰ ہے۔

واصنع کماشٍ فوق ارضِ الشوک یحذر مایریٰ

اور کانٹوں دار زمین پر چلنے والے کی طرح ہر اس چیز سے احتیاط کرو جو نظر پڑے۔

لا تحقرن صغیرۃ ان الجبال من الحصٰی

چھوٹے گناہ کو بھی حقیر نہ سمجھو، کیونکہ پہاڑ چھوٹی چھوٹی کنکریوں ہی سے بنتا ہے۔

سب سے بڑی چیز اللہ کی معرفت ہے، ایک عجیب قصہ

مولانا رومی نے سلطان محمود غزنوی کا ایک عجیب واقعہ لکھا ہے جو بڑا عبرت خیز وسبق آموز ہے، وہ یہ کہ سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں چوروں کا کچھ زور ہو گیا تھا، اور بادشاہ اس کی وجہ سے پریشان ہوا، اور چوروں کو پکڑنے کے لئے ایک عجیب تدبیر نکالی کہ شاہی لباس اُتار کر چوروں کا سا پھٹا پرانا لباس پہن لیا، اور شہر میں گشت کرنے لگا، ایک جگہ پر دیکھا کہ بہت سے چور اکھٹے بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کررہے ہیں، بادشاہ بھی ان میں بیٹھ گیا، چوروں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ بادشاہ نے کہا کہ میں بھی تم جیسا ہوں، چوروں نے سمجھا کہ یہ بھی کوئی چور ہے، انھوں نے کہا کہ تم اپنا کوئی ہنر بتاؤ، اگر تمہارے اندر کوئی ہنر ہوگا، تو تم کو اپنے ساتھ شریک کرلیں گے، ورنہ نہیں، بادشاہ نے کہا: پہلے آپ لوگ اپنا اپنا ہنر بتاؤ، پھر میں اپنا ہنر بتاؤں گا، ایک چور نے کہا کہ میں اونچی سے اونچی دیوار پھاند کر مکان میں داخل ہو جاتا ہوں، اگر چہ بادشاہ کا قلعہ کیوں ہو، دوسرے نے کہا کہ میری ناک کی یہ خاصیت ہے کہ میرا ہنر یہ ہے کہ کسی جگہ کا مٹی سونگھ کر بتادیتا ہوں کہ یہاں خزانہ ہے یا نہیں؟ تیسرے چور نے کہا کہ میرے بازو میں اتنی طاقت ہے کہ میں گھر میں گھسنے کے لئے اس میں سوراخ کرسکتا ہوں، چوتھے چور نے کہا کہ میں ماہر حساب ہوں، Phd کیا ہوا ہوں، کتنا ہی بڑا خزانہ کیوں نہ ہو، چند لمحوں میں حساب لگا کر تقسیم کردیتا ہوں، پانچویں چور نے کہا کہ میرے کانوں میں ایسی خاصیت ہے کہ میں کتے کی آواز سن کر بتادیتا ہوں کہ کتا کیا کہہ رہا ہے، چھٹے چور نے کہا کہ میری آنکھ میں یہ خاصیت ہے کہ

جس چیز کو رات میں دیکھ لیتا ہوں، دن میں اس کو پہچان لیتا ہوں، اب بادشاہ نے کہا کہ میری داڑھی میں یہ خاصیت ہے کہ جب مجرمین کو پھانسی کے لئے جلاد کے حوالے کیا جاتا ہے، اس وقت اگر میری داڑھی ہل جاتی ہے تو مجرمین پھانسی کے پھندے سے بچ جاتے ہیں، چونکہ وہ بادشاہ تھا، اس نے ایک خاص لطیف انداز سے اپنا ہنر اور کمال بیان کیا، سارے چور یہ بات سن کر خوش ہو گئے، اور کہنے لگے کہ آپ تو چوروں کے قطب ہیں، جب ہم کسی مصیبت میں پھنس جائیں گے، تو آپ ہی کے ذریعہ ہم کو خلاصی مل سکتی ہے۔

پھر سب نے مشورہ کیا اور طے کیا کہ آج بادشاہ کے یہاں چوری کی جائے، اس لئے کہ آج مصیبت سے چھڑانے کے لئے، داڑھی والا بھی موجود ہے، لھذا سب کے سب بادشاہ کے محل کی طرف چل پڑے، راستہ میں کتا بھونکا، تو کتے کی آواز پہچاننے والے نے کہا کہ کتا کہہ رہا ہے کہ بادشاہ تمہارے ساتھ ہے، لیکن چور پھر بھی چوری کے ارادے سے باز نہ آئے، اور بادشاہ کے یہاں چوری کر ڈالی، اور خزانہ لوٹ لیا، اور جنگل کی طرف آئے اور وہاں بیٹھ کر ماہر حساب نے حساب لگا کر چند منٹوں میں سب کو تقسیم کر دیا، بادشاہ نے کہا: سب لوگ اپنا پتہ لکھوا دو، تا کہ آئندہ چوری کرنا ہو تو ہم سب لوگ آسانی سے جمع ہو سکیں، سب کا پتہ نوٹ کر لیا گیا، اور سب نے اپنا اپنا راستہ لیا، اگلے دن بادشاہ نے عدالت لگوائی اور پولس کو حکم دیا کہ سب کو پکڑ کر لاؤ، جب سب چور ہتھکڑیاں ڈالکر حاضر کئے گئے، بادشاہ نے سب کو پھانسی کا حکم دے دیدیا، اور کہا کہ اس مقدمہ میں کسی گواہ کی ضرورت نہیں، کیونکہ سلطان خود وہاں موجود تھا۔

یہاں ایک بات ضمناً عرض کرتا ہوں کہ اسی طرح قیامت کے دن اللہ کو کسی

گواہ کی ضرورت نہیں ہوگی، اس لئے کہ: وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ (تم جہاں بھی ہو، وہ تمہارے ساتھ ہے) اگر تم دو ہو تو تیسرا خدا ہے، چار ہو تو پانچواں خدا ہے، جب تم بدکاریاں کرتے ہو، تو اللہ سب دیکھتا ہے، اللہ کو کسی گواہ کی ضرورت نہیں، اس کے باوجود قیامت کے دن بندوں پر اتمام حجت کرنے کے لئے ہاتھوں اور پیروں کی، فرشتوں کی اور صحیفۂ اعمال کی گواہی ہوگی۔

الغرض جب چھ کے چھ چور پھانسی کے تختہ پر کھڑے ہوگئے، تو وہ چور جو آنکھوں کی خاصیت والا تھا، اس نے بادشاہ پہچان لیا کہ یہ وہی شخص ہے، جو رات ہمارے ساتھ تھا، وہ تختہ دار سے چلّایا کہ حضور کچھ دیر کے لئے امان دی جائے، اور آپ سے تنہائی کا موقعہ دیا جائے، بادشاہ نے کہا ٹھیک ہے، تھوڑی دیر کے لئے پھانسی کو موقوف کردو، اور اس کو میرے پاس بھیج دو، اس نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ ہر یکے خاصیت خود رانمود، ہر ایک نے اپنی خاصیت بتادی، ہر ایک نے اپنا ہنر بتادیا، ہمارے وہ ہنر جن پر ہم کو ناز تھا، انھوں نے ہماری بدبختی کو اور بڑھایا کہ آج ہم تختہ دار پر ہیں، اے بادشاہ! میں نے آپ کو پہچان لیا ہے کہ آپ نے وعدہ فرمایا تھا، جب مجرموں کو تختہ دار پر چڑھایا جاتا ہے، اگر اس وقت میری داڑھی ہل جاتی ہے تو مجرمین پھانسی سے نجات پا جاتے ہیں، لہذا آپ اپنے ہنر کو ظاہر فرمائیں، تاکہ ہماری جان خلاصی پائے، سلطان محمود نے کہا: ''تمہارے ہنروں نے تو تمہیں مبتلائے قہر کردیا ہے، لیکن یہ شخص جو سلطان کا عارف ہے، اس کی چشمِ سلطان شناس کے طفیل میں تم سب کو رِہا کیا جاتا ہے۔

اس عجیب وغریب قصہ کو بیان کر کے مولانا روم کہتے ہیں کہ دنیا میں ہر شخص اپنے ہنر پر ناز کررہا ہے، بڑے بڑے اہل ہنر اپنی بدمستیوں میں مست، اور خدا

سے غافل ہیں، لیکن کل قیامت کے دن، ان کے یہ ہنر کچھ کام نہ آئیں گے، بلکہ یہی دنیوی ہنر ان کو مبتلاءِ قہر و عذاب کر دیں گے، اور اس کے برخلاف جن لوگوں نے اس دنیا کے اندھیرے میں اپنے حقیقی بادشاہ اللہ عزوجل کو پہچان لیا، اور اس کی معرفت اپنے دلوں میں پیدا کر لی، قیامت کے دن یہ خود بھی نجات پائیں گے، اور ان کی سفارش گنہگاروں کے حق میں قبول کی جائے گی۔

یاد رکھو کہ دنیا کے اندھیرے میں اللہ کو پہچاننے کا ہنر سیکھ لیا، تو پھر دوسرے ہنر سیکھنا کچھ مضر نہیں، کیونکہ پھر کوئی بھی ہنر آپ کو اللہ سے غافل نہیں کر سکتا، ڈاکٹر انجینئر بننا منع نہیں ہے، بشرطیکہ آپ اللہ سے غافل نہ ہوں، اس حکایت سے معلوم ہوا کہ چشم سلطان شناس ہی کام آئی، باقی ہنر تختہ دار پر لے گئے، اسی طریقہ پر دنیا کے تمام کاروبار جو اللہ سے غافل ہو کر کئے جاتے ہیں، وہ آخر کار انسان کو تباہی و بربادی میں ڈال دیتے ہیں، لیکن جب کوئی شخص اللہ کی معرفت کا نور حاصل کر لیتا ہے اور وہ اللہ سے غافل ہونے کے بجائے اللہ کا عاقل بن جاتا ہے، تو وہ شخص خود بھی نجات پاتا ہے، دوسروں کو بھی نجات دلانے کا ذریعہ بن جاتا ہے، اس لئے سب سے بڑی چیز اللہ کی معرفت ہے۔

اللہ کے بارے میں باخبر سے پوچھو

اللہ کی ذات کو پہچاننا بہت آسان ہے، اس کی صفات کے ذریعہ، اس کے افعال کے ذریعہ، جو اللہ کی طرف سے ہم کو روزانہ دکھائے جاتے ہیں، مثلاً کبھی بارش ہو رہی ہے، کبھی گرمی پڑ رہی ہے، کبھی سیلاب آ رہا ہے، کہیں عذابات کا سلسلہ جاری ہے، کوئی بیمار ہو رہا ہے، کوئی شفایاب ہو رہا ہے، کسی کی موت ہو رہی ہے اور کسی کی پیدائش ہو رہی ہے، یہ ساری چیزیں اللہ کی معرفت کے ذرائع و وسائل ہیں، آدمی کو

اس میں غور وفکر کے نتیجہ میں اللہ کی معرفت نصیب ہوتی ہے، اللہ سے ہم وہ آنکھ مانگیں، جو اس دنیا کے اندھیرے میں اللہ کو پہچان لے، قیامت کے دن یہی آنکھ باعث نجات ہوگی۔

اللہ کو کس طرح پہچانیں؟ اس کا طریقہ خود اللہ نے ارشاد فرمایا: **اَلرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا** رحمٰن کو جاننے کے لئے ان بندوں کے پاس جاؤ جو رحمٰن سے باخبر ہیں، حضرت تھانویؒ نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ رحمٰن کے بارے میں کسی باخبر سے پوچھو، اگر کسی جاہل سے جا کر پوچھو گے تو وہ کیا بتائے گا، جیسے کسی نے اپنے زمانے کے بادشاہ کے بارے میں کہا تھا کہ ہمارا بادشاہ تو اتنا بڑا ہے، اتنا بڑا ہے کہ دس ہاتھیوں کے برابر ہے، اس بے وقوف کی نظر میں ہاتھی بڑا جانور تھا، اس نے پھر قیاس کیا، اندازہ لگایا ہوگا کہ جب ہاتھی اتنا بڑا ہے تو ہمارا بادشاہ دس ہاتھی کے برابر ہوگا، ورنہ وہ ہاتھی سے چھوٹا رہ جائے گا جو اس کی شان سے گری ہوئی بات ہوگی۔

مگر حقیقت میں یہ تو بے وقوفی ہوئی، اور اس کی بے وقوفی نے بادشاہ کیلئے ایسی بے تکی بات نکلوادی، اس لئے کسی باخبر سے معلوم کرو کہ اللہ کیا ہے؟ خبیراً کی تفسیر علامہ آلوسی نے کی ہے" **المراد فاسئل عارفاً یخبرک**"، خبیراً سے مراد عارفین ہیں، اللہ کو پہچاننے والے اور ان کی صحبت کی برکت ہی اللہ کی معرفت کا ذریعہ بنتی ہے۔

(روح المعانی:۱۹/۳۹)

دنیا کی حقارت، ایک عمدہ مثال

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو شجرۂ ممنوعہ کھانے کی وجہ سے دنیا میں اس لئے بھیج دیا تھا کہ اُس پھل کو کھانے کے بعد قضاء حاجت کی ضرورت پیش آئی اور پیٹ میں ہل چل مچ گئی، بے چینی و بے قراری بڑھ گئی، مگر جنت میں بیت الخلاء نہیں

ہے،اس کی فیسیلیٹی {facility} وہاں نہیں ہے،اس لئے کہ جنت تو پاکیزہ مقام ہے،اوراللہ نے اس کواس طرح بنایا ہے کہ وہاں قضائے حاجت کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی،اور جو بھی کھائیں گے وہ ہضم ہو جائے گا،اللہ نے وہاں کی غذاؤں میں فضلہ نہیں رکھا ہے،الغرض حضرت آدم سے کہا گیا کہ جنت کا بیت الخلاء تو دنیا ہے،اس لئے آپ جنت سے دنیا میں چلے جاؤ،اس سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم کو اوران کی وجہ سے ان کی ذریت کو دنیا میں حاجت پوری کرنے بھیجا گیا تھا کیونکہ جنت میں اس کا انتظام نہیں تھا۔

اس کے بعد حضرت والا نے چند نصیحت آمیز باتیں بیان فرمائیں:

۱- جس جنت کا بیت الخلاء (دنیا) ایسا ہو،جس میں ہرے بھرے باغات بھی ہیں،عمدہ قسم کے محلات بھی ہیں،جس میں بلند پہاڑ بھی ہیں،تو اس جنت کا کیا حال ہوگا،وہاں کے باغات کا کیا عالم ہوگا،وہاں کے محلات کیسے ہونگے،لہذا انسان کو چاہئے کہ وہ اس ناپاک دنیا کے جھگڑوں میں نہ پڑے،بلکہ جنت جیسی حسین چیز کی طلب میں کوشاں رہے۔

۲- بیت الخلاء سے انسان بقدر ضرورت ہی استفادہ کرتا ہے،یعنی جس وقت تقاضہ ہو،اُسی وقت جاتا ہے اور ضرورت پوری ہونے کے فوراً بعد واپس آجاتا ہے،اسی طرح انسان کو دنیا (جو جنت کا بیت الخلاء ہے) کے مال ومتاع،آل واولاد سے انتفاع بھی ضرورتاً اور بقدر ضروت ہی کرنا چاہئے،معلوم ہوا جو انسان دنیاء کی چیزوں میں اس طرح مگن ہو جاتا ہے کہ اسے آخرت کی تیاری کی فکر ہی نہ ہو تو وہ ایسا ہی ہے،جیسے کوئی بیت الخلاء میں جاکر اُسی کو سب کچھ سمجھ لے اور دوسری عمدہ چیزوں سے غافل ہو جائے۔

۳- جتنا وقت انسان کا بیت الخلاء میں قضائے حاجت کے لئے صرف ہوتا ہے یعنی ۵ یا ۱۰ منٹ، انسان کو سمجھنا چاہئے کہ دنیا میں اس کی حیات بھی اسی قدر قلیل ہے۔

۴- بیت الخلاء میں جا کر کوئی بھی انسان وہاں عیش وعشرت کی تمنا نہیں کرتا، بلکہ ضرورت پوری ہونے کے بعد فوراً چلا آتا ہے، اور اگر کوئی یہ خواہش کرنے لگے تو سب اس کو احمق و پاگل کہیں گے، اسی طرح دنیا (جو کہ جنت کا بیت الخلاء ہے) میں بھی عیش وعشرت کی تمنا کرنا، بے وقوفی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

شیطان کی دعاء بھی قبول ہوئی

فرمایا انسان چاہے جتنے بھی گناہ کرلے، مگر ایک بار وہ دربار الٰہی میں آکر سر بسجود ہو کر سچی توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اُس کی بھی سنی جائے گی، پھر فرمایا شیطان نے عجیب وغریب موقعہ پر عجیب دعاء کی، اُس وقت دعاء مانگی، جب کہ اللہ تعالیٰ شیطان کی نافرمانی (یعنی آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کرنے) کی وجہ سے شیطان لعین پر نہایت غضبناک تھے، اور دعا مانگی بھی تو ایسی عجیب کہ کوئی ایسی دعاء نہیں مانگتا، اس نے دعاء یہ کی کہ: ''رَبِّ أَنْظِرْنِیْ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ'' (اے اللہ مجھے قیامت تک مہلت عطاء فرما)

غور کرنے کی بات ہے کہ ایسی دعاء کو بھی تعالیٰ نے ایسے غضبناک ہونے کے باوجود شیطان جیسے نافرمان کے حق میں قبول فرمائی، تو کیا انسانوں میں سے کوئی اس خالق سے مانگے تو شنوائی نہیں ہوگی؟ کیوں نہ ہوگی، ضرور ہوگی، اس لئے اللہ سے ناامید نہیں ہونا چاہئے۔

غیر مستند واعظ سے احتراز کرو

ایک مرتبہ بنگلور میں ڈاکٹر ذاکر نائک کا خطاب تھا، تو ایک صاحب (جو حضرت والا سے اصلاحی تعلق رکھتے ہیں) ان کے خطاب میں شرکت کرنے کی اجازت چاہی، تو حضرت نے پوچھا کہ ان کے خطاب میں کیوں جانا چاہتے ہو؟ تو انہوں نے کہا کہ حضرت! وہ بعض اشکالات جو اسلام پر کئے جاتے ہیں، ان کے جوابات دیتے ہیں، اس پر حضرت والا نے فرمایا: اگر تم وہاں گئے، اور اعتراض وجواب سنے، بالفرض کسی اعتراض کے جواب سے جو انہوں نے دیا ہے، تمہیں تشفی نہ ہوئی، تو تم خواہ مخواہ دل میں اسلام کے خلاف اعتراض لئے رہو گے، اس کی کیا ضرورت ہے، اللہ نے تمہارے دل کو اسلام سے مطمئن رکھا ہے، اس کا شکر کرو۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے اگر کوئی کہے کہ ایک صاحب ہیں جن پر کچھ لوگ پتھراؤ کرتے ہیں اور وہ صاحب اس کا بچاؤ کرتے ہیں، اور بہت سے لوگ اس کو دیکھنے جمع ہوتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ اس بچاؤ کو دیکھنے جانا حماقت ہے، کیونکہ اگر خدانخواستہ کوئی پتھر ان دیکھنے والوں کو لگ گیا جن کو بچاؤ کی یہ تدبیر نہیں آتی تو خواہ مخواہ ہلاکت میں پڑنا ہوا۔ اور یہاں تو جان کی ہلاکت ہے اور ان مجالس میں جانے سے ایمان کی ہلاکت کا ڈر ہے، کہ کوئی شبہ دل میں گھر کر گیا اور ایمان رخصت ہوا۔

اسی لئے اس طرح کی مجالس نہ صحابہ کے زمانے میں ہوتی تھیں اور نہ اس کے بعد کے دوروں میں سلف سے ثابت ہیں، اگر کسی کو اشکال ہو تو اس کا جواب اسی کو دیا جانا چاہئے، نہ یہ کہ جن کو اشکال نہیں ہے ان کو بھی خواہ مخواہ اشکالات سنائے جائیں۔

اللہ کی نعمت کا اندازہ کرو، ایک بزرگ کا قصہ

ایک بادشاہ نے کسی بزرگ سے نصیحت کرنے کی درخواست کی، تو انہوں نے پوچھا کہ اگر تمہیں سخت پیاس لگے اور پانی میسر نہ آئے، جان جانے کا اندیشہ ہو، ایسے وقت میں اگر کوئی کہے کہ ایک گلاس پانی میں دیتا ہوں اور تمہاری آدھی سلطنت اس کے عوض میں دینا پڑے گا، تو تم کیا کرو گے؟ بادشاہ نے کہا کہ آدھی سلطنت دے کر ایک گلاس پانی لے لوں گا، تاکہ جان بچے۔

ان بزرگ نے پھر پوچھا کہ اگر خدانخواستہ اس پانی کے پینے کے بعد تمہارا پیشاب بند ہو جائے، اور اطباء کہیں کہ اس کا علاج ہوسکتا ہے، اگر آدھی سلطنت اس کے عوض میں ہمیں دیدو گے، تو علاج کر کے پیشاب جاری کریں گے، تم کیا کرو گے؟ بادشاہ نے کہا کہ آدھی سلطنت دے دوں گا اور علاج کراوں گا، تاکہ جان بچ جائے، تو اب اُن بزرگ صاحب نے عجیب بات فرمائی کہ اس سے معلوم ہوا کہ تمہاری کل سلطنت کی قیمت صرف ایک گلاس پانی اور ایک کٹورا پیشاب کے برابر ہے، شکر کرو اُس اللہ کا، جو تمہیں روزانہ پچاسوں گلاس پانی مفت پلا رہا ہے، اور غور کرو اس کی قدرت پر جس سے کتنا پیشاب بغیر کسی معاوضہ کے باآسانی نکل جاتا ہے، اگر اللہ بھی اپنی نعمتیں عوضاً دینے لگے، تو انساں کا جینا مشکل ہو جائے۔

ہر شخص روزانہ اللہ کی عطاء کردہ نعمتوں کو سوچا کرے، اور اس کا شکر بجالائے، اس سے ایک طرف اللہ کی معرفت نصیب ہوتی ہے اور دوسری طرف نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

آئینہ چینی شکست

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جو بڑے اولیاء اللہ میں سے ہیں، ان کو کسی نے

چین کا بنا ہوا ایک آئینہ دیا، حضرت نے اس کو لیکر کہا ''**الحمد لله**'' ، پھرانہوں نے اپنے خادم کو دیا کہ اس کو رکھو، جب ضرورت ہوگی لیکراس میں چہرہ دیکھوں گا، اتفاق سے وہ ان کے خادم کے ہاتھ سے ٹوٹ گیا،تو اس نے خدمت میں حاضر ہوکر ڈرتے ڈرتے کہا: ''از قضا آئینہ چینی شکست'' (اللہ کی قضا و فیصلہ سے چینی کا آئینہ ٹوٹ گیا) اوراس کو یہ خیال تھا کہ اس پر مجھے ڈانٹ پڑے گی کہ تم نے اس کو کیوں توڑا؟ مگر حضرت نے اس کے جواب فرمایا کہ ''**ا لحمد لله** کہ آلۂ خود بینی شکست (اللہ کا شکر ہے کہ خود بینی کا آلہ ٹوٹ گیا)، خادم نے کہا کہ حضرت! جب آئینہ آیا تھا تب بھی آپ نے **الحمدلله** کہا، اوراب یہ ٹوٹا تو بھی **الحمدلله** کہا،فرمایا کہ ہاں! یہ اللہ ہی کا ہے، جب وہ دے تو بھی الحمدللہ، اوراس کا شکر ہے اوراگر وہ لے لے تو بھی **الحمدلله**۔

اولیاءاللہ کی نظر اشیاء پرنہیں ہوتی بلکہ خالق اشیاء پر ہوتی ہے،وہ ہر وقت اسی پرنظر جمائے ہوئے ہوتے ہیں۔

اللہ کی نعمتوں کوشمارنہیں کرسکتے

فرمایا: ایک صاحب میرے پاس آکر کہنے لگے کہ حضرت !دعاء کریں، میرے کچھ مسائل اٹکے ہوئے ہیں، میں یہ کرنا چاہتا ہوں مگر یہ کام نہیں ہوتا اور وہ کام کرنا چاہتا ہوں وہ نہیں ہوتا ،اس طرح میرے سب کام ادھورے اورناقص رہ جاتے ہیں، میں بہت پریشان ہوں۔

میں نے ان سے کہا: آپ ان دو چار مسائل کو لیکر شکوہ کرنے لگے،مگرآپ کی نظران ہزاروں مسائل کی طرف نہیں گئی ،جن کا خود آپ کوعلم نہیں، مگراللہ ان کو پورا کررہاہے،آپ کو یوں سوچنا چاہئے ،میرے کتنے کام ایسے ہیں جن کو میں سوچتا ہوں

فوراً ہو جاتے ہیں، پھر میں نے کہا کہ آپ صبح اٹھے ہوں گے، تو آپ نے چاہا ہوگا کہ میں بستر سے اٹھوں اور فوراً اٹھ گئے، اور چلنا چاہا، چلنے لگے، استنجاء کرنا چاہا ہوگا، وہ بآسانی ہو گیا، ایسے ہزاروں مسائل ہیں، جو آپ سوچتے ہی فوراً ہو جاتے ہیں، اور یہ سب بھی اللہ کی مدد سے ہوتے ہیں، مگر ان کی طرف آپ کی نظر نہیں جاتی اور اس کی وجہ سے اللہ سے شکوہ پیدا ہوتا ہے، پھر میں نے کہا کہ یہ بھی سوچئے کہ اگر اللہ آپ کے پیروں کو اکڑ وا دیتا، وہ چلنے سے عاجز ہو جاتے، تو آپ کیا کرتے، ہاتھوں کو بھی ایسا کر دیتا تو کیا کر لیتے؟ خدا کی قسم! آپ دن بھر کی نعمتوں کا اگر اندازہ کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے، پوری زندگی کی نعمتوں کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ خود حق تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کر سکتے)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عام طور پر جن کو اللہ تعالیٰ سے شکوہ ہوتا ہے وہ صرف اس طرف نظر ڈالتے ہیں کہ ہمارا یہ اور وہ کام نہیں ہو رہا ہے، اگر وہ لوگ یہ سوچا کریں کہ ہمارے روزانہ کتنے کام بغیر سوچے اور بغیر کوشش و محنت کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انجام پا رہے ہیں تو ان کا سارا شکوہ ختم ہو جائے اور وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے سامنے سرنگوں ہو جائیں۔

لقمان حکیم کا شکر

لقمان حکیم کسی کے غلام تھے، ایک مرتبہ باغ میں ان کا آقا آیا اور ایک پھل کاٹ کر حضرت لقمانؑ کو دیا، تو وہ مزہ لیکر کھانے لگے، جب ایک ٹکڑا اس نے خود کھایا، تو معلوم ہوا کہ بڑا کڑوا پھل ہے، اس نے تھوک دیا اور کہنے لگا کہ لقمان! تم کو یہ پھل کڑوا نہیں لگ رہا ہے؟ تو حضرت لقمانؑ نے جواب دیا کہ آپ کے ہاتھ سے

میں نے کتنی میٹھی میٹھی چیزیں کھائی ہیں، آج ایک مرتبہ آپ کڑوا پھل کھلا دیں، تو کیا میں شکوہ کروں؟

اللہ اکبر! کیسا عجیب جواب دیا، اگر ہم بھی اللہ کے بارے میں ایسا ہی خیال کریں، تو ہماری کیا حالت ہوگی؟ اللہ کو ناشکری پسند نہیں، اگر شکر کروگے تو نعمت میں اضافہ ہوگا، لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ اگر اللہ مال دیدے تو بھی خوش رہو، اور نہ دے تو بھی خوش رہو اور صحت دے تو بھی راضی رہو، بیماری دے تو بھی خوش رہو۔

نیکیوں کی توفیق سب سے بڑی نعمت ہے، ایک واقعہ

فرمایا: لوگ عموماً نعمت، صرف مال و دولت کو سمجھتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کو طاعت و عبادت کی توفیق مل جائے، تو یہ بہت بڑی دولت ہے، اس سے بڑی نعمت اور کیا ہوسکتی ہے؟ مگر لوگ اسکو نعمت سمجھتے ہی نہیں، اس پر حضرت والا نے ایک واقعہ سنایا کہ ایک بزرگ ایک بستی سے دوسری بستی کو جارہے تھے، جب دوسرے شہر کے قریب ہوئے تو دیکھا کہ شہر پناہ کے دروازے بند ہیں، اور دن کا وقت ہے، ان کو بڑا تعجب ہوا کہ دن میں شہر کا دروازہ کیوں بند ہے؟ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس شہر کے بادشاہ کا ایک پالتو پرندہ باز اُڑ گیا ہے، جس کی تلاش جاری ہے، اور دروازے بند اس لئے ہیں، تاکہ باز شہر کے اندر ہی رہے، اور دروازہ سے کہیں باہر نہ چلا جائے۔ ان بزرگ نے سوچا کہ کتنا بڑا بے وقوف بادشاہ ہے کہ باز تو اُوپر جو کھلی فضاء ہے، وہاں سے بھی جاسکتا ہے، اسے اتنی بھی عقل نہیں اور اس نے شہر پناہ کا دروازہ بند کروادیا ہے۔

پھر وہ بزرگ اللہ کی طرف مخاطب ہوکر کہنے لگے کہ اے اللہ! تو نے حکومت وسلطنت اور مال و دولت اس بے وقوف بادشاہ کو دے دی ہے، جو عقل سے بالکل

عاری ہے، اور مجھ جیسے عاقل کو کچھ نہیں دیا، تو اللہ کی طرف سے الہام ہوا کہ کیا آپ اس پر راضی ہیں کہ اس کی بے وقوفی وحماقت کے ساتھ آپ کو یہ دولت وحشمت اور حکومت وسلطنت اور جاہ وجلال سب کچھ اس بادشاہ سے چھین کر آپ کو دے دی جائے اور آپ کی عقل مندی اور تقوی شعاری، نیکیاں اور طاعتیں سب اُس کو دے دی جائیں؟ تو ان بزرگ کو فوراً احساس ہوا اور اللہ سے معافی مانگی اور کہنے لگے کہ یا اللہ! مجھے تقوی والی دولت زیادہ پسند ہے، اگر چہ غریبی کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو، اور یہ حکومت وسلطنت اس کی بے قوفی و بے ایمانی سمیت لینے سے تو ایمان وعمل کے ساتھ فقر وفاقہ ہی بہتر ہے۔

قلب اللہ کا مکان ہے

اپنے دل کو دنیا اور اس کی محبت اور تمام نفسانی خواہشات سے پاک وصاف رکھنا چاہئے، کیونکہ یہ دل تو اللہ کا گھر ہے، اس کی پاکیزگی دوسرے اعضاء اور دوسری اشیاء کے مقابلہ میں بہت زیادہ ضروری ہے۔ آج لوگ ذرا سے کپڑے میلے ہو جائیں، تو نکال دیتے ہیں مگر دلوں کا حال یہ ہے کہ اس میں نجاست ہی نجاست بھری ہوئی ہے، مگر اس کے صاف کرنے کی کسی کو فکر نہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: تم اپنے گھروں کے صحن کو پاک وصاف رکھو۔ (ترمذی شریف: ۲۷۳۲)

جب نبی اکرم ﷺ گھروں کے صحن کو بھی پاک وصاف رکھنے کا حکم فرما رہے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب گھر کے صحن کو پاک رکھنا ضروری ہے تو گھر کے اندر کا حصہ پاک رکھنا بدرجۂ اولی ضروری ہے، اسی طرح جب ظاہر کے صاف رکھنے کا حکم ہو، تو باطن کو پاک رکھنا کتنا ضروری ہوگا؟

یہاں ایک بات سمجھ لیں ،وہ یہ کہ قلب ایک ایسی شیء ہے، جو دکھائی نہیں دیتی، بلکہ وہ تو ایک روحانی شیء ہے ، اسی لئے قرآن میں فرمایا :اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ کہ جس شخص کا دل ہے،اس کے لئے نصیحت کارگر ہوتی ہے،اب سوال یہ ہے کہ قلب تو کافر کے پاس بھی ہے،ملحد کے پاس بھی ہے ،تو کیا قرآن سب کو کارگر ہے؟اس کا جواب یہ ہے کہ اس قلب سے روحانی قلب مراد ہے ،وہ گوشت کا لوتھڑا مراد نہیں جس میں کافر ومؤمن سب شریک ہیں،اور یہی روحانی قلب رب کا مکان ہے،حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بلاشبہ اللہ کے لئے اہل زمین کے برتن ہیں اور تمہارے رب کے برتن اس کے نیک بندوں کے قلوب ہیں،اوراس کے نزدیک پسندیدہ قلوب وہ ہیں جو نرمی اور رقت والے ہیں۔ (المقاصد الحسنۃ:۴۳۹)

بھائی !اب ذرا غور کرو کہ جب ایک معمولی انسان کسی کے گھر آجائے ،تو گھر کو کتنا پاک وصاف کیا جاتا ہے،اس کو کتنا سجایا جاتا ہے، جب یہ دل خدا کا گھر ہے،تو کیا اس کو گندا و ناپاک رکھا جاسکتا ہے؟ کیا انسان کی قدر ہمارے نزدیک خدا سے بڑھی ہوئی ہے، کہ ہم اپنے گنا ہوں، خطاؤں کے گھر میں اس کو پانا چاہتے ہیں،اس لئے بھائی !اس دل کو سنوارو،سجاؤ،خوبصورت بناؤ،خدا کی محبت سے اپنے دل کو حسین وجمیل بناؤ،اس کے بعد دیکھنا کہ خدا کیسے دل میں آتا ہے۔

حضرت خواجہ مجذوب صاحب کا ایک شعر یاد آگیا:

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

اوراسی مضمون پر میرے بھی دو اشعار ملاحظہ کیجئے:

نقش لیلی ہو چکا ہے پاش پاش عشق مولیٰ اب تو حاصل ہوگیا

ہو گئی ہے ہر تمنا دل سے دور　　　　اب تو یہ دل تیرے قابل ہو گیا

اس میں اشارہ ہے کہ جب تک دل کو غیر اللہ اور دنیوی محبتوں سے خالی نہیں کیا جائے گا اس وقت تک اللہ دل میں نہیں آ سکتا۔ اس لیے دنیوی و فانی لیلیٰ کو مولیٰ کے لیے قربان کر دو۔

جذبۂ شکر پیدا کرنے کا طریقہ: ایک واقعہ

فرمایا: آدمی ہمیشہ ہر دنیوی چیز میں اپنے سے نیچے کے طبقہ والوں کو دیکھے تو شکر کرے گا، اگر اپنے سے اونچے طبقہ والوں کی طرف نظر کرے گا تو ناشکری میں مبتلاء ہو گا، یعنی اگر کوئی متوسط درجہ کا مالدار ہے تو وہ غریبوں کو دیکھے، اور شکر ادا کرے کہ اللہ نے مجھے اس سے اچھا رکھا ہے، اسی طرح کسی کو اللہ نے معمولی سا گھر دیا ہے، تو وہ جھونپڑی میں رہنے والے کی طرف نظر کر کے شکر ادا کرے کہ اللہ نے مجھے مکان تو دیا ہے، اس کے برخلاف اگر متوسط درجہ کا مالدار اپنے سے بڑے مالدار کی طرف نظر کرے گا، تو حرص میں یا حسد میں مبتلا ہو گا، اور ناشکری کرے گا کہ اللہ نے اس کو اتنا مال دیا ہے اور مجھے نہیں دیا۔

اس کے بعد حضرت والا نے شیخ سعدی کا واقعہ سنایا کہ وہ ایک مرتبہ گھر سے نکلے تو پیر میں پہننے کے لئے جوتے نہیں تھے، دل ہی دل میں کہنے لگے کہ اللہ نے مجھے جوتے بھی نہیں دیئے ہیں، پھر پیدل تھوڑی دور گئے، تو دیکھا کہ ایک فقیر بھیک مانگ رہا ہے، جس کے دونوں پیر رانوں تک کٹے ہوئے ہیں، یہ منظر دیکھ کر شیخ سعدی نادم ہوئے، اور اللہ سے کہنے لگے کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ مجھے صرف جوتے نہیں دیئے، اس بیچارہ کو تو پیر ہی نہیں دیئے ہیں، اگر تو مجھے بھی اس جیسا بناتا تو میں کیا کر سکتا تھا؟

دل زنگ آلود ہو جاتا ہے

ایک مرتبہ حضرت والا کے پاس دفتر میں جو فون تھا، اس پر گرد و غبار پڑا ہوا تھا، رومال سے ایک بار جھاڑا گیا، تو وہ صاف ہو گیا، یہ دیکھ کر حضرت اقدس نے فرمایا: دل کی مثال بھی ایسی ہی ہے کہ گناہوں کی وجہ سے اس پر گرد آتا رہتا ہے، اس لئے روزانہ ہم دل کو استغفار کی کثرت، ذکر، تسبیح وغیرہ سے جھاڑتے رہیں گے، تو وہ صاف شفاف آئینہ کی طرح رہے گا، جس کی وجہ سے طاعت میں حلاوت آئیگی، نیکیوں میں جی لگے گا، اور اگر یوں ہی بغیر صفائی کے چھوڑ دیں گے، تو اس دل پر گناہوں کی دھول جمتے جمتے، وہ دل زنگ آلود ہو جائے گا، جیسے قرآن کریم میں ہے: **كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ** (ان کے دلوں پر زنگ آ گیا ہے)۔

(سورۃ التطفیف:۱۴)

پھر جس طرح برتنوں وغیرہ میں زنگ آ جائے، تو اسکی صفائی دشوار ہوتی ہے، اسی طرح دل کی صفائی بھی مشکل ہو گی، اس لئے اس کی صفائی بار بار کرتے رہنا چاہئے۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

"ان هذه القلوب تصدأ كما يصدأ الحديد اذا أصابه الماء، قيل يا رسول الله !وما جلا ئها ؟ قال: كثرة ذكر الموت وتلاوة القرآن"

کہ بلا شبہ ان دلوں پر زنگ آ جاتا ہے، جیسے لوہے پر زنگ آ جاتا ہے جب اسے پانی لگ جاتا ہے، پوچھا گیا: کہ اس زنگ کو صیقل کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ موت کی یاد اور تلاوت قرآن کی کثرت۔

(مشکوۃ شریف:۱۸۹)

جب موت کو یاد کرے گا، تو نرمی پیدا ہوگی، رونا آئے گا، جب روئے گا تو دل کی صفائی ہوگی، کیونکہ آنسوں کا قطرہ جہنم کی آگ کو بجھا سکتا ہے تو دل کے زنگ کو بھی ضرور دور کرسکتا ہے۔

دلوں پر زنگ کیوں آتا ہے؟

مرشدی حضرت شاہ ابرارالحق صاحبؒ نے فرمایا: دلوں پر زنگ آنے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح لوہے کو جب پانی لگتا ہے، تو زنگ آجاتا ہے، کیونکہ پانی اورلوہے میں مناسبت نہیں ہے، دونوں میں جوڑ نہیں ہے، ناجنس کی صحبت کی وجہ سے اس کو زنگ لگتا ہے، اسی طرح سے جب دو بے جوڑ اور ناجنس چیزیں ملتی ہیں تو فتور پیدا ہو جاتا ہے، فرمایا کہ اسی طرح جب دل ناجنس اور بے جوڑ چیز، (یعنی گناہ) سے ملتا ہے، تو زنگ آجاتا ہے۔

بایزید بسطامی کے دودھ کا واقعہ

بایزید بسطامی بڑے اولیاء اللہ میں سے تھے، ان کا انتقال ہوا، تو کسی نے خواب میں ان کو دیکھ کر پوچھا کہ حضرت! اللہ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ تو جواب دیا کہ جب پیشی ہوئی تو اللہ نے پوچھا کہ بایزید! میرے لئے کیا لائے ہو؟ میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا: اے اللہ! کوئی عبادت اس لائق نہیں کہ تیری جناب میں پیش کرسکوں، سب میں عیب وقصور ہے، البتہ تیرے لئے توحید لایا ہوں، کیوں کہ میرا عقیدہ تو مضبوط تھا کہ تو ہی سب کچھ کرنے والا ہے، نفع کا مالک تو، نقصان کا مالک تو، مشکل کشا تو، حاجت روا تو، اس لئے میری جانب سے آپ کے لئے توحید خالص کا تحفہ پیش ہے۔

فرماتے ہیں کہ اللہ نے فرمایا کہ: اچھا، توحید لائے ہو، وہ دودھ کی رات والا قصہ یاد نہیں؟ تو میں نے لاعلمی ظاہر کی، تو اللہ نے خود یاد دہانی فرمائی اور کہا: ایک رات تم نے دودھ پیا تھا، پھر تمہارے پیٹ میں درد ہوگیا، تو تم نے کہا تھا کہ دودھ نے پیٹ میں درد پیدا کر دیا، بتاؤ، درد میں پیدا کرتا ہوں، یا دودھ کرتا ہے؟ کیا یہی تمہاری توحید ہے؟ جس کو تم میرے دربار میں پیش کرنا چاہتے ہو؟ جاؤ اس میں شرک کی آمیزش ہے، حضرت بایزیدؒ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا کہ اے اللہ! میرے پاس تو کچھ نہیں ہے، نہ کوئی عمل و نیکی، نہ ایمان و توحید، جو تیرے شایان شان ہو، اس لئے محض تیرے فضل سے معاف فرمادے۔

کسی شاعر نے قیامت کے میدان کا نقشہ کھینچا ہے، اور اپنے ایک شعر میں یہی مضمون بڑے عجیب انداز سے ادا کیا ہے:

نیکیاں جن کو میں سمجھا، وہ معاصی نکلے کفر ہی کفر تھا، ایمان بڑی مشکل ہے

دین میں ایسی استقامت آجائے

دین پر استقامت بڑی چیز ہے اور یہی آجکل مفقود ہے، نوجوان لوگ دین پر آنا چاہتے ہیں، اور آتے بھی ہیں، مگر یہی استقامت نہ ہونے کی وجہ سے تعبیر بدلنا ہے کھاتے رہتے ہیں، نماز شروع کرتے ہیں، پھر چھوڑ دیتے ہیں، علم دین حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، پھر استقامت میں کمی سے وہ بجھ جاتا ہے۔

میں ایک واقعہ سناتا ہوں، جس سے استقامت کا جذبہ پیدا ہوگا، ہمارے حضرت مسیح الامتؒ نے ایک قصہ سنایا تھا کہ حضرت جنید بغدادیؒ کہیں جارہے تھے، راستہ میں دیکھا کہ ایک چور کو سولی پر چڑھایا جارہا ہے، حضرت جنید نے لوگوں سے پوچھا کہ کس جرم کی پاداش میں اسکو سولی پر لٹکایا جارہا ہے؟ بتایا گیا کہ یہ منع کر

نے کے باوجود چوری کرنے سے باز نہیں آتا، برابر چوری کرتا رہتا تھا، اس نے ایک دفعہ چوری کی تو اس کا ایک ہاتھ کاٹا گیا، دوسری دفعہ چوری کیا تو دوسرا ہاتھ کاٹا گیا، مگر یہ پھر بھی باز نہیں آیا، اس لئے یہ سزا دی جارہی ہے، یہ سن کر حضرت جنید نے فرمایا: میرا دل چاہتا ہے کہ اس کے پیروں کو بوسہ دوں، پوچھا گیا کہ حضرت! آپ اس چور کے پیروں کو بوسہ دیں گے؟ آخر کیوں؟ تو فرمایا: میں اس چور کو نہیں، بلکہ اس کے اندر کی استقامت کے پیروں کو بوسہ دینا چاہتا ہوں، اگر ایسی استقامت ہم دینی کاموں میں پیدا کرلیں تو معلوم نہیں کتنی ترقی کریں گے۔

انسان کو تین چیزیں ہلاک کرتی ہیں

فرمایا: انسان کو تین چیزیں ہلاک کرتی ہیں، اور تینوں کا نام منی ہے:

پہلی منی: جس کو اردو میں منی کہتے ہیں، یعنی نطفۂ ناپاک، یہ انسان کو ہلاک کرنے والا ہے، کیوں کہ دنیا میں جتنے بھی زنا کے واقعات، فحش وعریانی، بے حیائی، جنسی بے راہ روی کے واقعات رونما ہورہے ہیں، یہ اسی نطفہ ناپاک کے غیر محل میں استعمال ہونے کی وجہ سے ہورہے ہیں، اسی لئے ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص مجھے دو چیزوں کی ضمانت دیدے، میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں: ایک وہ جو دو جبڑوں کے درمیان ہے، (یعنی زبان) اور ایک وہ جو دو رانوں کے درمیان میں ہے (یعنی شرمگاہ)۔

(بخاری:۵۹۹۴، ترمذی:۴۳۳۲)

دوسری منی: دوسری منی وہ ہے جو انگریزی کا لفظ ہے (MONEY)، انگریزی میں منی (MONEY) کہتے ہیں روپیہ اور مال کو، یہ روپیہ پیسہ ومال تو سب سے بڑا فتنہ ہے، سب سے بڑا مہلک ہتھیار ہے، ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا

(اِنَّ لِكُلِّ اُمَّةٍ فِتْنَةً وَفِتْنَةُ اُمَّتِي الْمَالُ)

ترجمہ: بلا شبہ ہر امت کے لئے ایک فتنہ ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔

(ترمذی: ۲۲۵۸)

چناں چہ آج دنیا کے سارے جھگڑے اس مال ہی کی وجہ سے رونما ہو رہے ہیں، کوئی دھوکہ دے رہا ہے، کوئی چوری کر رہا ہے، کوئی اس مال کی خاطر سودی کاروبار میں ملوث ہو کر اللہ کی نافرمانی کر رہا ہے، مال کی محبت دل میں ایسی رچ بس گئی ہے کہ حرام وحلال کی تمیز بھی نہیں ہے، یہ سخت فتنہ اور ہلاک کرنے والی چیز ہے۔

مال و دولت کی مثال ایسی ہے جیسے پانی کہ جب تک وہ کشتی کے نیچے رہے تو ٹھیک ہے، اور نفع بخش بھی ہے، لیکن جب پانی کشتی کے اندر داخل ہو جائے گا، تو ساروں کو ہلاک کر دے گا، اسی طرح جب تک مال باہر باہر ہو تو ٹھیک ہے، مگر جب اس کی محبت دل میں داخل ہوگی، تو انسان کو اسی طرح ہلاک کر دے گا، جیسے کشتی میں پانی داخل ہو کر کشتی والوں کو ہلاک کر دیتا ہے۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: (تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَالدِّرْهَمِ) (دینار اور درہم کا بندہ ہلاک ہو گیا) (بخاری: ۲۶۷۳، ابن ماجہ: ۴۱۲۶)

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے پاس بحرین سے خراج کا مال آیا، چونکہ فقر وفاقہ کا دور تھا، بہت سارے صحابہ مال لینے جمع ہو گئے، نماز کے بعد آپ B نے فرمایا: شاید تم لوگ مال لینے جمع ہوئے ہو، پھر فرمایا: خدا کی قسم مجھے اس بات کا ڈر نہیں ہے کہ تم فقر و فاقہ میں مبتلاء ہو جاؤ گے، مجھے تو اس کا ڈر ہے کہ تم پر دنیا وسیع کر دی جائے اور تم اس میں جھگڑنے لگو جس طرح پچھلے لوگوں نے اس میں جھگڑا کیا تھا۔

(بخاری شریف: ۲۹۲۴، مسلم: ۵۲۶۱)

معلوم ہوا کہ یہ منی (MONEY) بھی بڑی خطرناک شیٔ ہے اور ہلاک کرنے والی ہے۔

تیسری منی: فارسی کا لفظ ہے، فارسی میں منی کہتے ہیں، میں پن کو، یعنی انانیت، تکبر کو، تکبر کے معنی اپنے آپکو بڑا سمجھنا اور دوسروں کو حقیر سمجھنا، یہ بڑی خطرناک روحانی بیماری ہے، بعض بزرگوں نے کہا ہے کہ کفر تکبر ہی سے پیدا ہوتا ہے، کیونکہ شیطان نے اسی تکبر کی وجہ سے اللہ کے حکم کو ماننے سے انکار کیا تھا، اس لئے تکبر انسان کو اسی طرح ہلاک کر دیتا ہے، جیسے شیطان کو تکبر نے ہلاک کر دیا، کیونکہ شیطان نے تکبر ہی کی وجہ سے سجدہ نہیں کیا تھا، اور ذلیل وخوار کر کے بارگاہ الٰہی سے نکال دیا گیا تھا۔

معلوم ہوا کہ کفر کی جڑ اصل میں تکبر ہے، اب اندازہ کرنا چاہئے کہ کفر جب سب سے بری چیز ہے تو جس سے کفر نکل کر آ رہا ہے، جو مصدرِ کفر ہے، وہ کتنا برا ہوگا؟

اسی لئے اسلام میں تکبر کی سخت مذمت آئی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”لَایَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِنْ کِبَرٍ“ (جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں نہیں جا سکتا)۔ (مسلم: ۱۳۲، ترمذی: ۱۹۲۱)

اور قرآن کریم میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے: ” وَلَاتَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا“

ترجمہ: تم زمین پر اتراتے ہوئے نہ چلو، کیونکہ تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو، نہ اونچائی میں پہاڑ تک پہنچ سکتے ہو)۔ (بنی اسرائیل: ۳۷)

اور اس کے بالمقابل اللہ والوں کی صفات میں ہے: ”وَعِبَادُالرَّحْمٰنِ

الَّذِیۡنَ یَمۡشُوۡنَ عَلَی الۡاَ رۡضِ ھَوۡناً“

ترجمہ: اور رحمان کے بندے وہ ہیں جو زمین میں تواضع کے ساتھ چلتے ہیں۔ (الفرقان:۶۳)

حضرت مولانا عبدالغنی پھولپوریؒ جو حضرت تھانویؒ کے جلیل القدر خلیفہ تھے انہوں نے ان دو آیات میں ایک نکتہ بیان کیا ہے، فرمایا کہ، پہلی آیت میں تکبر سے چلنے سے منع کیا گیا ہے، دوسری آیت میں اللہ والوں کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ عاجزانہ چال چلتے ہیں، اسمیں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ پہلی آیت میں ”فی الارض“ فرمایا ہے، جب کہ دوسری آیت میں ” علی الارض “کہا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی آیت مقامِ مذمت میں ہے، اس لئے ” فی“ لائے ہیں کہ تم زمین میں پیر مار مار کر نہ چلو کہ زمین ہی میں ہی گھس جاؤ، کیونکہ تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو، نہ اونچائی میں پہاڑ تک پہنچ سکتے ہو، اور دوسری آیت مقام مدح میں ہے، اس لئے وہاں ”علی الارض“ فرمایا ہے، یعنی اللہ والے زمین پر عاجزانہ چال چلتے ہیں، اوپر اوپر چلتے ہیں، زمین پر پیر مار مار کر نہیں چلتے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ عارفانہ تفسیر ہے، مفسرین عالمانہ تفسیر کرتے ہیں، اور اللہ والے عارفانہ تفسیر کرتے ہیں، تو معلوم ہوا رفتار میں تکبر نہ ہونا چاہئے، اسی طرح کردار بھی تکبرانہ نہ ہونا چاہئے۔ ایک بزرگ نے فرمایا: انسان کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ماضی میں نطفہء ناپاک تھا، موجودہ حالت یہ ہے کہ ہمیشہ اپنے پیٹ میں غلاظت لئے ہوئے پھرتا ہے، اور ایک دن آئے گا کہ قبر میں جا کر جیفہء ناپاک ہو جائے گا، تعجب ہے کہ پھر بھی اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے، ڈینگیں مارتا ہے، اللہ تکبر سے ہماری حفاظت فرمائے۔

کبھی کتے سے بھی سبق مل جاتا ہے

امام شاہ ولی اللہ کے والد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب علیہ الرحمۃ ایک مرتبہ ایک راستہ سے گذر رہے تھے، اُسی راستہ میں دوسری طرف سے ایک کتا آرہا تھا اور راستہ اتنا تنگ تھا کہ کوئی ایک ہی اس پر سے گزر سکتا تھا، جب کتا قریب آیا، تو شاہ صاحب نے کہا: ارے کتے! تو نیچے اتر جا، اس لیے کہ میں نیچے اتروں گا، تو میرے کپڑے گندے ہوجائیں گے، اور مجھے نماز پڑھنا ہے، اور تجھے کیا؟ تو تو گندگی ہی میں رہتا ہے، گندا ہوگا، تو پھر صاف بھی ہوجائیگا۔

اللہ تعالیٰ نے کتے کو بولنے کی طاقت دیدی، کتا کہنے لگا، شاہ صاحب! آپ کی یہ بات تو صحیح ہے کہ اگر میں گندے نالے میں اتروں گا تو ناپاک ہوجاؤں گا، پھر پانی میں ایک ڈبکی لگاؤں گا، تو صاف ہوجاؤں گا، مگر آپ کے دل میں میری جو حقارت اور اپنی بڑائی آئے گی، اس سے آپ کے دل میں جو نجاست پیدا ہوگی، وہ سات سمندروں کے پانی سے بھی ختم نہیں ہوسکتی۔

اللہ اکبر! یہ سن کر شاہ صاحب کتے سے معافی مانگنے لگے، اور اللہ کی جناب میں توبہ کی، آج ہم لوگ کتے تو کتے، انسانوں بلکہ اپنے سے بڑے وافضل لوگوں کی بھی تحقیر کرتے ہیں اور اپنے کو سب سے بڑا سمجھتے ہیں، غور کرو کہ ہمارے دلوں کی گندگی کا کیا حال ہوگا۔

اساتذہ کی بے ادبی کا عبرت ناک انجام

ایک واقعہ سناتا ہوں جو خود میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جو میرے طالب علمی کے دور میں پیش آیا ہے، ایک ہمارا ساتھی تھا، اور بہت ذہین تھا، ایک مرتبہ سنتا تو پورا سبق یاد ہوجاتا تھا، بڑا ہی ذہین، بڑا چالاک، اور صلاحیت واستعداد

والا تھا، وہ طلبہ کو تکرار کرایا کرتا تھا، مگر اس میں ناز و تکبر تھا، وہ اپنی تکرار میں یہ کہا کرتا تھا کہ میں اُستاذ سے بھی اچھا پڑھا سکتا ہوں، اور واقعی وہ بہت اچھے طریقہ سے تکرار کراتا تھا اور سارے طلبہ اس کو مانتے تھے، جب سہ ماہی امتحان ہوا تو مدرسہ کے تمام طلبہ میں اول نمبر پر کامیاب ہوا اور امتیازی نمبر حاصل کئے، مگر صرف تین ماہ بعد جب ششماہی امتحان آیا تو وہ بالکل زیرو نمبر آیا اور ناکام ہوگیا، اب یہ سوچنا ہے کہ سہ ماہی اور ششماہی میں کتنے مہینے ہوتے؟ بمشکل تین ماہ، اس کے باوجود اعلی نمبرات سے کامیاب ہونیوالا زیرو نمبر سے فیل کیوں ہوگیا؟

اس کی وجہ یہی ہے کہ اس نے اپنے سے بڑوں کی، اپنے اساتذہ کی تحقیر کی، ان کو اپنے سے بڑا سمجھنے کے بجائے، اپنے سے چھوٹا سمجھا، اور ان کی بے ادبی کی اور یہ سب تکبر کی وجہ سے ہوا، اب معلوم نہیں وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے، کیسا ہے۔

طلبہ کو اس قصہ سے عبرت لینا چاہئے، اور اپنے اساتذہ اور بڑوں کا ادب کرتے رہنا چاہئے، ان کی تحقیر و توہین ہرگز نہ کرنا چاہئے، اسی سے علم آتا ہے، ورنہ اولاً تو علم نہیں آتا اور اگر آ گیا تو وہ علم نفع نہیں دیتا، اللہ تعالی ہم سب کو اساتذہ اور مشائخ کے ادب کی توفیق دے اور بے ادبی سے حفاظت فرمائے۔ (آمین)

کسی کو حقیر نہ سمجھو

اساتذہ کی ہی کی نہیں اسلام میں تو کسی کی بھی توہین و تحقیر جائز نہیں، قرآن میں ہے:

"یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّنْ نِّسَاءٍ عَسٰی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْھُنَّ"

اس میں یہ بتلایا گیا کہ کوئی مرد کسی مرد کو، کوئی عورت کسی عورت کو حقیر نہ سمجھے،

ہوسکتا ہے کہ جسے حقیر سمجھا جائے وہ حقیر سمجھنے والے سے اچھا ہو، اس لئے کہ کسی کے دل کے حالات سوائے اللہ کے کسی کو نہیں معلوم، بسا اوقات کسی کو حقیر سمجھتے ہیں، مگر اس کا تعلق اللہ سے بہت گہرا ہوتا ہے، جو بھی سالک کسی کو حقیر سمجھے گا، وہ کبھی ترقی نہیں کرسکتا، حتی کہ گنہ گار کو بھی حقیر نہ سمجھو، حضرت مسیح اللہ خان صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ: گناہ کو تو حقیر سمجھو، مگر گنہگار کو حقیر نہ سمجھو، پھر حضرت والا نے مثال دی، جیسے بچہ کو اگر پاخانہ لگ جائے، تو ماں اس بچہ کو گندا نہیں سمجھتی، بلکہ اس کی نجاست کو برا سمجھتی ہے، کیا عمدہ مثال دی حضرت نے، پھر فرمایا کہ ماں اس نجاست کو پیار ومحبت سے صاف کرتی ہے، اسی طرح اگر کسی انسان کو گناہ میں مبتلا دیکھو تو پیار ومحبت سے سمجھاؤ، حقارت سے نہیں۔

حقیر سمجھنے کا انجام، ایک عبرتناک حکایت

ابوعبداللہ اندلسیؒ حضرت شبلیؒ کے ساتھیوں میں ہیں، حافظ حدیث تھے، کئی ہزار احادیث یاد تھیں، وہ ایک مرتبہ کہیں جارہے تھے، راستہ میں کچھ لوگ بتوں کی پوجا میں مصروف تھے، ان کو دیکھ کر دل میں ان کی حقارت آ گئی، اور دل میں کہنے لگے، یہ تو جانور سے بدتر ہیں، بس اسی پر اللہ کی پکڑ شروع ہوگئی، آگے بڑھے تو ایک لڑکی پر نظر پڑ گئی، اس پر دل فریفتہ ہوگیا، اس سے جا کر کہا کہ میں تیرے ساتھ رہنا چاہتا ہوں، اس نے کہا کہ میرے والد سے بات کرو، انہوں نے اس لڑکی کے والد سے بات کی، تو اس نے کہا: میں دو شرطوں پر میری لڑکی سے تمہاری شادی کروں گا، ایک شرط یہ کہ تم عیسائی بن جاؤ، دوسری شرط یہ کہ میرے سوّر ہیں، ان کو چرانا ہوگا، چونکہ ان کا دل اس لڑکی کی طرف بہت مائل ہو چکا تھا، اس لئے انہوں نے ان دو شرطوں کو قبول کرلیا اور عیسائی بن گئے، بہت دنوں بعد ان کے پاس شبلی آئے،

دیکھا کہ عیسائی بن گئے ہیں اور خنزیر چرا رہے ہیں، شبلی نے کہا: تم کو کوئی آیت یاد بھی ہے؟ کہنے لگے کہ نہیں، صرف ایک آیت یاد ہے: ''**ومن یتبدل الکفر بالایمان فقد ضل سواء السبیل**'' (جو اپنے سچے دین کو بدل دے وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا) پھر شبلی نے دریافت کیا کہ احادیث میں سے کچھ یاد ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہاں صرف ایک حدیث یاد ہے کہ نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا: (**من بدل دینه فاقتلوه**) جو مرتد ہو جائے اسے قتل کر دو۔

(بخاری: ۲۷۹۴، ترمذی: ۱۳۷۸)

پھر ان پر اللہ کا فضل ہوا اور شبلی نے سمجھایا تو دوبارہ اسلام لائے، اس واقعہ میں آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کو یہ سزا مخلوق کی حقارت کرنے پر ملی، حالانکہ انہوں نے کافروں کو حقیر سمجھا تھا، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کافروں کو بھی حقیر نہیں سمجھنا چاہئے، بلکہ ان کے گناہ کو حقیر سمجھنا چاہئے۔

گناہ کر کے حقیر سمجھنا بہتر ہے

مکتوبات امام ربانی میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مجدد الف ثانیؒ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! میرے اندر دو حالتیں ہیں، ایک یہ کہ عبادت کرتا ہوں، تو تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہوں، دوسری یہ کہ اگر گناہ ہو جائے تو اپنے آپ کو حقیر سمجھتا ہوں، ان دو حالتوں میں سے بہتر کونسی حالت ہے؟

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ان کے جواب میں لکھا کہ: تمہاری دوسری حالت کہ گناہ کر کے اپنے آپ کو حقیر سمجھتے ہیں، یہ ہزاروں درجہ بہتر ہے پہلی حالت سے، جس میں عبادت کر کے فخر میں مبتلا ہو جائے۔ اللہ ہماری حفاظت فرمائیں، آمین۔

واعظین اپنے کو بڑا نہ سمجھیں

فرمایا: آج لوگ وعظ ونصیحت کر کے اپنے آپ کو بڑا اور مخلوق کو حقیر سمجھتے ہیں، یہ بڑی غلط بات ہے، حضرت تھانوی جو اپنے زمانے کے حکیم الامت مانے جاتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ جب میں کسی کو وعظ کہتا ہوں یا نصیحت کرتا ہوں، تو اپنے آپ کو یوں سمجھتا ہوں کہ بادشاہ نے حکم دیا ہے کہ شہزادہ کو یہ بات سنادو، اللہ اکبر!

بہت بڑی بات فرمائی حضرت نے، جو انسان سامعین کو شہزادہ تصور کرے وہ ان کو حقیر کیسے سمجھ سکتا ہے؟ اس لئے کہ بادشاہ کسی خادم کے ذریعہ شہزادہ کو کوئی بات کہلوائے تو خادم شہزادہ سے بڑا نہیں ہو جاتا، مگر افسوس ہے کہ واعظین آج لوگوں کو حقیر سمجھتے ہیں اور ان کے لئے نامناسب القاب استعمال کرتے ہیں، اصلاح کی ضرورت ہے۔

ایک بزرگ کا قصہ

ایک بزرگ کسی بادشاہ کو زور زور سے ڈانٹنے لگے، تو اس نے کہا: حضرت! آپ موسی علیہ السلام سے بڑے نہیں ہیں، اور میں فرعون سے گھٹیا نہیں ہوں، جب اللہ نے موسی جیسے نبی کو فرعون جیسے کافر کے پاس بھیجا تھا تو اس سے بھی نرمی سے بات کرنے کی ہدایت دی تھی: ”فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلاً لَّیناً لَّعَلَّهٗ یَتَذَكَّرُ اَوْیَخْشٰی“ تو آپ مجھے اتنی شدت وسختی سے کیسے کہہ سکتے ہیں، کیا میں فرعون سے بھی گیا گزرا ہوں اور آپ موسیٰ سے بھی فائق ہیں؟

جو دل اللہ سے غافل ہو وہ مردہ ہے، بایزید بسطامی کا واقعہ

ایک مرتبہ ایک شخص حضرت بایزید بسطامی سے ملاقات کے شوق میں اپنے

وطن سے نکلا، سفر کرتا ہوا ایک راستہ میں ایک جگہ درخت کے سایہ میں آرام کرنے لیٹا ،تو دیکھا کہ دو چڑیاں آپس میں بات کر رہی ہیں ،اور یہ شخص چڑیوں کی بولی جانتا تھا، درمیان میں حضرت نے فرمایا: اللہ تعالیٰ بعض بندوں کو چرند پرند کی بولی سکھا دیتے ہیں ، یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے، اور قرآن سے بھی ثابت ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ : وَعُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ حضرت سلیمان نے فرمایا کہ ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے۔

الغرض ان میں سے ایک چڑیا دوسری چڑیا سے کہہ رہی تھی کہ معلوم ہے یہ آدمی جو درخت کہ نیچے ہے، کہاں جا رہا ہے؟ دوسری چڑیا نے کہا: ہاں یہ بایزید بسطامی کے پاس جا رہا ہے،تو اس چڑیا نے کہا: ان کا تو انتقال ہو گیا ، یہ شخص یہ بات سن کر پریشان ہوا، اور واپسی کا ارادہ کرلیا ، پھر سوچا کہ جب نکلا ہی ہوں تو جا کر زیارت کرلوں ، پھر آگے سفر جاری رکھا، اور بایزید بسطامی کے پاس پہنچا،تو دیکھا کہ وہ تو باحیات ہیں، ملاقات کی ، گفت وشنید کے بعد رخصتی کے وقت کہنے لگا کہ حضرت! ایک بات پوچھنا ہے ، پھر چڑیا والا سارا قصہ سنایا، بایزید بسطامی چونکے اور دریافت کیا کہ یہ کس دن اور کس وقت کا واقعہ ہے؟ اس نے بتایا کہ فلاں دن اور فلاں وقت کا واقعہ ہے، حضرت بایزید کہنے لگے کہ ہاں بھائی! چڑیا سچ کہہ رہی تھی ،اس وقت کچھ دیر کے لئے میرا دل اللہ سے غافل ہو گیا تھا، اللہ سے دل کا غافل ہونا ، دل کا مردہ ہونا ہے۔

اللہ اکبر! ہمارا حال کیا ہے، ان کا دل تو کچھ دیر کے لئے مردہ ہوا تھا، ہمارا دل ہمیشہ مردہ رہتا ہے ، ہم اللہ کا ذکر ہی نہیں کرتے ، عجیب اور حیرت انگیز واقعہ ہے، اس واقعہ سے ہمیں عبرت حاصل کرنا چاہئے اور ہمیشہ اللہ کا ذکر کرنا اور اس کا

دھیان رکھنا چاہئے۔

جانور سے بھی اپنے کو افضل نہ سمجھے

فرمایا: میں حضرت مسیح الامت ؒ کی مجلس میں شریک تھا، حضرت نے فرمایا: بچو! تم سب میرے سے افضل ہو، میں تم میں سب سے زیادہ حقیر ہوں، پھر فرمایا: میں تو خنزیر سے بھی حقیر ہوں۔

اللہ اکبر! یہ اللہ والے سب کچھ کرنے کے باوجود اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتے، ہم کچھ کئے بغیر ہی اپنے آپ کو سب کچھ سمجھتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اپنے آپ کو خنزیر سے بھی افضل سمجھنے کی اجازت نہیں۔

ایک بزرگ کے سامنے کسی نے خنزیر کو برا جانور کہا جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے، تو انہوں نے کہا کہ تم غلط کہتے ہو، بُرے تو ہم ہیں، کیونکہ وہ تو اپنی ڈیوٹی پوری کر رہا ہے جس کے لئے اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے، مگر ہم اپنی ڈیوٹی انجام نہیں دے رہے ہیں جس کے لئے اللہ نے ہمیں پیدا کیا، اب بتاؤ! ہم بہتر ہیں یا خنزیر بہتر ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ کی تواضع

ایک مرتبہ کوئی شخص امام اعظم ابوحنیفہؒ سے مسئلہ پوچھنے گیا، امام صاحب اُوپر کی منزل میں اپنے حجرے میں تھے، سائل نے آواز دیکر امام صاحب کو بلایا، امام صاحب جب نیچے اتر کر آئے تو کہنے لگا، حضرت! معاف کرنا، ایک مسئلہ معلوم کرنا تھا مگر میں بھول گیا کہ کیا مسئلہ تھا، امام صاحب کہنے لگے: کوئی بات نہیں، جب یاد آئے تو آکر پوچھ لینا، یہ کہہ کر امام صاحب اپنے کمرے میں اوپر تشریف لے گئے، جیسے ہی امام صاحب اُوپر چڑھے، تو اس شخص نے آواز دی کہ حضرت! یاد آگیا ذرا نیچے

آ یئے ،امام صاحب جب نیچے آئے تو کہنے لگا کہ عجیب بات ہے کہ میں پھر بھول گیا، امام صاحب پھر یہ کہکر تشریف لے گئے کہ یاد آئے تو معلوم کر لینا،مگر اس نے اسی طرح سات مرتبہ امام صاحب کواُوپر چڑھایا اوراتارا، یہ بلاتا اور کہتا کہ حضرت بھول گیا،آخری مرتبہ جب آپ آئے تو کہنے لگا کہ ہاں اب یاد آگیا، یہ مسئلہ پوچھنا ہے کہ پاخانہ میٹھا ہوتا ہے یا پھیکا؟

غور کا موقعہ ہے کہ ایک تواس نے سات دفعہ ان کو چڑھنے اوراُترنے پر مجبور کیا، پھر جو مسئلہ پوچھا تو ایسا بے ہودہ مسئلہ پوچھا،مگر امام ابوحنیفہؒ کی غایت تواضع دیکھئے کہ باوجود اس کے بے ڈھنگے سوال کے بالکل غصہ نہیں ہوئے،اور جواب بھی دیااور فرمایا کہ پاخانہ جب تک تازہ ہوتا ہے،میٹھا ہوتا ہے،اور جب سوکھ جائے تو پھیکا ہوجاتا ہے،اس پر وہ کہنے لگا کہ آپ نے جو کہا ہے اس کی کیا دلیل ہے؟ اللہ تعالے نے امام صاحب کو حیرت انگیز قسم کی ذہانت دی تھی،آپ نے فرمایا کہ اس کی دلیل یہ ہے کہ: جب تک پاخانہ تازہ رہتا ہے،اُس پر مکھیاں بیٹھتی ہیں اور مکھیاں میٹھی چیزوں پر ہی بیٹھتی ہیں،اور جب وہ سوکھ جاتا ہے تو اس پر مکھیاں نہیں بیٹھتیں،جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پھیکا ہوجاتا ہے۔

بوعلی سینا اخلاق ندارد

ابوعلی سینا جو بہت بڑا حکیم گزرا ہے اس کے زمانہ میں ایک بزرگ تھے، اُنہوں نے ایک دفعہ بوعلی سینا کے بارے میں یہ کہدیا کہ بوعلی سینا اخلاق ندارد،یعنی بو علی سینا اخلاق نہیں رکھتا، یہ جملہ جب بوعلی سینا کو معلوم ہوا تو اُس نے اخلاقیات پر ایک بہترین کتاب تصنیف کردی،اوراس میں اخلاق کی تمام تفصیلات جمع کردیا،اخلاق کے اصول وفروع،اخلاق کی اقسام وانواع،اخلاق کے آثار ولوازمات،وغیرہ سب

کچھ لکھ دیا، اور ایک نسخہ اُن بزرگ صاحب کے پاس بھی بھیجا، جنہوں نے یہ کہا تھا کہ بو علی سینا اخلاق ندارد، تو کسی نے ان بزرگ سے عرض کیا کہ حضرت! آپ نے کہا تھا کہ بوعلی سینا اخلاق نہ دارد، اُس نے تو اخلاق پر اتنی زبردست کتاب لکھ کر بتا دیا ہے کہ وہ اخلاق جانتا ہے، حضرت نے کہا کہ میں نے کب یہ کہا تھا کہ بوعلی سینا اخلاق نداند کہ بو علی سینا اخلاق جانتا نہیں، میں نے تو یہ کہا تھا کہ اخلاق ندارد، یعنی وہ اخلاق رکھتا نہیں، جاننا الگ بات ہے، رکھنا الگ بات ہے، کتاب لکھ دینا الگ بات ہے اور اُسے عملی جامہ پہنانا الگ بات ہے۔

❁ کرتے رہے پھر بھی ڈرتے رہے

صید الخاطر میں ابن الجوزیؒ نے لکھا ہے کہ وہ ایک مرتبہ بیان فرما رہے تھے اور سامعین میں دس ہزار کا مجمع تھا، اور ان کا وعظ سن کر پورے کا پورے مجمع رو رہا تھا، سوچو کہ کیا عالی شان خطاب ہوگا، کیا پُرتاثیر بیان ہوگا، ابن الجوزیؒ کہتے ہیں کہ اسی وقت میں نے اللہ سے وعدہ کیا کہ: اے اللہ! میں گنہ گار ہوں، جنت تو مجھے نہیں مل سکتی، میرے اعمال اس لائق نہیں، اور مجھے جہنم میں ہی جانا ہے، اس لئے صرف ایک درخواست یہ کرتا ہوں کہ مجھے ان دس ہزار کے سامنے عذاب نہ دینا، ان سے اوجھل رکھ کر جہنم میں ڈالنا۔

اللہ اکبر! کیا عاجزی ہے، کیا تواضع ہے، میں نے ایک سفر کے دوران ابن الجوزی کی یہ بات پڑھی اور یہ واقعہ پڑھ کر میرا سر کچھ دیر کے لئے چکرانے لگا، واقعی یہ حضرات اپنے غایت تواضع وانتہائی عاجزی سے ہی اس قدر اونچے مراتب پر فائز ہوئے ہیں، میں کہتا ہوں کہ اس طریق کا حاصل یہی ہے کہ نیکی کرتا رہے اور پھر بھی ڈرتا رہے، گناہ کر کے ڈرنا کمال نہیں، نیکیاں کر کے ڈرنا کمال ہے۔

بچوں کو نیک بنانے ماں باپ کا نیک ہونا ضروری ہے

ایک میاں بیوی نے عہد کیا کہ ہم صحیح اور نیک زندگی گزاریں گے،اورکوئی کام خلاف شرع نہیں کریں گے،تا کہ ہمارے بچے پر اچھے اثرات مرتب ہوں، چنانچہ ان دونوں نے صحیح طریقہ پر اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز کیا،اوراحتیاط کی زندگی گذارتے رہے، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ان کے بچہ نے اسکول میں دوسرے بچے کا کچھ سامان چوری کرلیا،تواستاذ نے ماں باپ کو اطلاع دی، ماں باپ گئے اور بچے کو تنبیہ کی، پھر گھر آ کر غور کرنے لگے،کہ ہم نے عہد کیا تھا نیک زندگی گزاریں گے، پھر بچے میں یہ چوری کا اثر کیسے ہوگیا؟ توماں نے کہا کہ اس میں غلطی میری ہے،کیونکہ ہمارے پڑوس کے گھر میں ایک بیر کا درخت ہے،جس کی ایک شاخ ہمارے گھر میں آئی تھی اوراس بچہ کا جب حمل مجھے تھا تو میں نے اس میں سے بغیر اجازت کے کچھ بیر کھالئے تھے،اسی چوری کا اثر بچے پر ہوا ہے۔

سورۃ فاتحہ درخواست ہے

چوں کہ انسان اللہ کے شایانِ شان درخواست پیش نہیں کرسکتا، اس لیے سورہ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے درخواست پیش کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی بھی یونیورسٹی میں، کسی بڑے ادارے میں، جامعہ و مدرسہ میں داخلہ فارم میں پہلے ہی سے درخواست کا مضمون لکھا ہوا ہوتا ہے، طالب علم کوصرف دستخط کرنا ہوتا ہے کہ اس میں جو کچھ لکھا ہوا ہے، مجھے منظور ہے، یہ اسی لیے ہے کہ آنے والا صحیح درخواست پیش نہیں کرسکتا، کچھ نہ کچھ گڑبڑ کر دیتا ہے،اصول وقواعد کونہیں جانتا، اس لئے پہلے سے ہی درخواست کا مضمون لکھ کر رکھ دیا جاتا ہے،اسی طرح سورہ فاتحہ

بھی درخواست ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے ہماری خاطر خود ہی بنا کر ہمیں دیدیا، ورنہ اللہ کے شایانِ شان کون مضمون بنا سکتا تھا؟ پھر جب بندہ نے درخواست پیش کی کہ اے اللہ؛ سیدھا راستہ بتا، تو اللہ نے اس کے جواب میں تیس پارے نازل کیے کہ یہ سارے احکامات ہیں، جن پر چلنے سے سیدھا راستہ ملے گا۔

انسان کی چار حالتیں

حضرات صوفیاء فرماتے ہیں کہ انسان پر چار حالات آتے ہیں: ایک حالتِ نعمت، دوسری حالتِ مصیبت، تیسری حالتِ طاعت اور چوتھی حالتِ معصیت۔ اور ہر وقت ہر انسان ان چار حالتوں میں سے دو حالات میں ضرور مبتلا رہتا ہے، اس لیے کہ انسان پر نعمت یا مصیبت میں سے کوئی ایک حالت ضرور ہوگی، اسی طرح معصیت یا طاعت میں سے کوئی ایک حالت ضرور ہوگی، اس طرح ہر انسان پر ہر وقت دو حالتیں رہیں گی، پھر ان چاروں حالات کے چار حق ہیں: نعمت کا حق شکر ہے، مصیبت کا حق صبر ہے، اور معصیت ہو تو استغفار یعنی توبہ، اور طاعت ہو تو استبشار یعنی خوش ہونا۔ اور حدیث میں اس کی طرف اشارہ ہے، اللہ کے رسول ﷺ اپنی دعاء میں یہ بھی کہا کرتے تھے کہ: "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنَ الَّذِیْنَ اِذَا اَحْسَنُوْا اسْتَبْشَرُوْا وَاِذَا اَسَاءُ وْ ا اسْتَغْفَرُوْا" (اے اللہ! ہمیں ان لوگوں میں سے بنادے جو نیکیاں کرتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں، اور ان سے برائی ہوجاتی ہے تو استغفار کرتے ہیں) (ابن ماجہ: ۳۸۱۰، احمد: ۱۲۲۲۲)

شکر گذار فقیر افضل ہے

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے پوچھا گیا کہ حضرتمت لدار شکر گذار افضل

ہے یا فقیر صابر افضل ہے؟ فرمایا: ان میں سے کوئی بھی افضل نہیں، بلکہ شکر گذار فقیر افضل ہے کہ مصیبت آئی تب بھی شکر کر رہا ہے، میں اس کی مثال دیتا ہوں، جیسے کوئی بیمار ہوا، ڈاکٹر نے کہا آپریشن کرنا ہوگا، اور پیسے بھی دینے پڑیں گے، مریض نے ڈاکٹر سے آپریشن بھی کرایا اور پھر باادب روپئے بھی دیئے، اور اس پر ڈاکٹر کا شکریہ بھی ادا کیا، یہاں کوئی مریض یہ نہیں کہتا کہ ڈاکٹر صاحب! آپ نے میرا جو آپریشن کیا، اس پر میں آپ کا کوئی شکوہ نہیں کرتا، بلکہ اس پر میں صبر کرتا ہوں، بلکہ یہ کہے گا کہ آپ کا شکریہ کہ آپ نے میرا علاج کر دیا اور میرے اوپر آپ نے احسان فرمایا، جب دنیا کا ادنیٰ ڈاکٹر جس کی طرف سے یہ بھی امکان ہے کہ غلط کر ڈالے اور یہ بھی امکان ہے کہ اپنی غرض کے لئے آپریشن کرتا ہو، جب وہ ہمیں تکلیف و مصیبت دے رہا ہے، اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں ہمارا فائدہ اور مصلحت ہے، تو ہم اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں، تو حقیقی ڈاکٹر اللہ تعالیٰ کوئی بیماری ہمارے ہی فائدہ کے لیے دیتا ہے، تو کیا شکر نہیں کیا جا سکتا؟ اور وہ ہماری مصلحت کے لئے کبھی فقر و فاقہ دے تو کیا اس پر اس کا شکر نہیں ہو سکتا؟ بے شک، ہو سکتا ہے، اس لیے فقیرِ شاکر افضل سب سے ہے۔

نرا خوف شیطان کو بھی حاصل تھا

خوفِ خدا سے مقصود یہ ہے کہ آدمی معاصی اور گناہوں سے بچے، اگر خوف کے ذریعہ گناہوں سے نہیں بچتا تو ایسا خوف شیطانی خوف ہے۔ قرآن میں ہے کہ:

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ، فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْءٌ مِّنْكَ اِنِّيْ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ. (سورۂ حشر: ۱۶)

جیسے شیطان انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر اور جب وہ کفر کر لیتا ہے تو کہتا ہے کہ میں تجھ سے بری ہوں اور میں اللہ رب العالمین سے خوف کرتا ہوں۔

دیکھئے شیطان خود کہہ رہا ہے کہ وہ اللہ سے خوف کرتا ہے، مگر کیا یہ خوف اس کا معتبر ہوگا؟ ہرگز نہیں، کیوں کہ اس خوف کے ساتھ گناہ سے بچنا اور پرہیز کرنا نہیں پایا گیا، اس لئے خوف وہ معتبر ہے جو گناہ سے بچائے۔

اس پر مجھے ایک بات یاد آ گئی کہ ایک مرتبہ جناب مقصود علی خان صاحب مرحوم، مدیر اعلی روزنامہ سالار، بنگلور، میرے پاس آئے، اور وقتاً فوقتاً بڑی محبت سے میرے پاس آتے رہتے تھے، اور جب بھی کوئی اشکال پیش آتا تو فون سے یا خود تشریف لاکر معلومات کرتے تھے، اسی طرح ایک بار آئے اور کہا کہ مولانا! قرآن پڑھ رہا تھا، ایک آیت پڑھتے ہوئے ٹھٹک گیا، پھر یہی آیت پڑھی: اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ اور کہنے لگے کہ شیطان کو جب خوفِ خدا حاصل ہے تو اس کی بخشش کیوں نہ ہوگی؟ یہ شبہ دل میں آ گیا، اور پریشان ہوکر آیا ہوں کہ اس کا جواب معلوم کروں، میں نے یہی عرض کیا کہ بخشش جس خوف پر ہے وہ ایسا خوف ہے جو انسان کو معاصی سے روکے، مطلق خوف کی کوئی فضیلت نہیں، اس پر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ یہ بات مجھے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے بہت پریشان تھا، اور طرح طرح کے شبہات دل میں آتے تھے۔

الغرض اس سے یہ بات اور بھی واضح ہوگئی کہ اللہ کا خوف اس لئے مطلوب ہے کہ اس سے گناہوں سے بچنے کی قوت حاصل ہوتی ہے، اور اگر خوف تو ہو اور وہ گناہ سے نہ بچائے تو ایسا خوف اللہ کے نزدیک نہ مطلوب ہے نہ محمود ہے، اسی لئے نبی کریم ﷺ نے ایک دعاء میں فرمایا کہ:

اللّٰھم اقسم لنا من خشیتک ما یحول بیننا و بین معاصیک

کہ اے اللہ! ہمیں تیرے خوف میں سے اتنا حصہ عطا فرما جو ہمارے اور تیرے گناہوں کے درمیان آڑ بن جائے۔ (ترمذی:۳۴۲۴)

معلوم ہوا کہ خوف کی ضرورت اس لئے ہے کہ آدمی اللہ سے ڈر کر گناہوں سے باز آجائے۔

ایک سوال کا جواب

پوچھا گیا کہ حضرت! یہ کیسے معلوم ہو کہ خدا کی محبت ہمارے دل میں پیدا ہو چکی ہے؟ فرمایا: جب انسان انسان سے محبت کرتا ہے تو کیا معلوم نہیں ہوتا؟ معلوم ہوتا ہے کہ دل کا میلان اسکی طرف زیادہ ہے، اسی کی فکر میں لگا ہوا ہے، یہ علامت ہے کہ کسی سے اس کو محبت ہوگئی ہے، اسی طرح جب اللہ سے محبت پیدا ہوگی تو ہمیشہ ذکر میں رہے گا، فکر میں رہے گا، دنیا کے دھندوں سے دور رہے گا، اور اگر دنیا کے دھندوں میں رہے گا تب بھی اس کا دل اللہ کی طرف ہوگا، جیسے قرآن میں ہے:

رِجَالٌ لَّا تُلۡهِيۡهِمۡ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيۡعٌ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ

کہ کچھ لوگ وہ ہیں جن کو اللہ کے ذکر سے نہ تجارت غافل کرتی ہے اور نہ خرید وفروخت غافل کرتی ہے)۔ (سورۃ النور:۳۴)

اور جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: (سات آدمی قیامت کے دن عرش کے سایہ میں ہوں گے، ان میں سے ایک وہ شخص جس کا دل مسجد میں لٹکا رہتا ہے)۔

(بخاری:۶۲۰، ترمذی:۲۳۱۳)

یعنی وہ دنیا کے تمام کام کریگا، مگر اس کا دل اللہ کی طرف ہوگا، ہمیشہ اسی

کا استحضار رہے گا، اذان ہو تو فوراً مسجد کی طرف لپکے گا، ان علامات سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اس کو اللہ سے محبت ہوگئی ہے۔ حضرت خواجہ مجذوبؒ نے اسی کو اس شعر میں کہا ہے:

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی اب تو آ جا اب تو خلوت ہوگئی

اللہ والا بننے کے لئے دنیا چھوڑنا ضروری نہیں

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ والا بننے کے لیے تجارت، بیوی، بچے، سب کچھ چھوڑنا ضروری ہے، یہ غلط بات ہے، شیطانی وسوسہ اور دھوکہ ہے، بلکہ اگر آپ تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ صحابۂ کرام تجارت بھی کرتے تھے، ملازمت بھی کرتے تھے، بیویوں کے حقوق بھی ادا کرتے تھے، بچوں کی دیکھ ریکھ بھی کرتے تھے، پھر بھی سب سے بڑے اللہ والے تھے، ان سے بڑا اللہ والا اور کون ہو سکتا ہے؟ اور مذہب اسلام بھی یہی تعلیم دیتا ہے کہ کاروبار اور تمام کام کرتے ہوئے تم اللہ والے بن کر رہو، اور سب کے حقوق ادا کرو، اور یہی ذریعہ ہے اللہ تک پہنچنے کا، اس کے برخلاف اگر کوئی اپنے اہل وعیال کے، ماں باپ کے پڑوسیوں کے، اور رشتہ داروں کے حقوق ادا نہ کرے تو وہ حقیقی اللہ والا ہی نہیں۔

چناں چہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ کچھ لوگ ﷺ کے گھر آ کر ازواج مطہرات سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے متعلق دریافت کرنے لگے، جب ان کو آپ کی زندگی کا اصول وطریقہ بتایا گیا، کہ آپ نماز بھی پڑھتے ہیں اور کبھی آرام بھی کرتے ہیں، کبھی روزے رکھتے ہیں اور کبھی افطار کرتے ہیں، نیز آپ اپنی بیویوں اور بچوں کے ساتھ رہتے ہیں، تو انہوں نے اس کو بہت کم شمار کیا اور کہنے لگے کہ آپ ﷺ کی بات تو دوسری ہے، اس لئے کہ آپ ﷺ بخشے بخشائے ہیں، پھر ان میں سے

ایک کہنے لگا کہ میں ہمیشہ رات بھر نماز پڑھوں گا، دوسرے نے کہا میں صوم دھر رکھوں گا (بالکل افطار نہیں کروں گا)، تیسرے نے کہا: میں عورتوں سے الگ رہوں گا، شادی نہیں کروں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا: خدا کی قسم میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور تم سے بڑا متقی ہوں، لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں، افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں، سوتا بھی ہوں، شادی بھی کرتا ہوں، پس جو میرے طریقہ سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں ہے۔

(بخاری: ۵۰۶۳، مسلم: ۱۴۰۱)

اس حدیث میں بڑی عبرت ہے، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُس الاولیاء ہونے کے باوجود دنیوی سارے کام انجام دیتے تھے، تمام کے حقوق ادا کرتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ والا بننے کے لئے راہب بننا ضروری نہیں، بلکہ جائز بھی نہیں۔

اسی لئے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ والا بننا دنیا چھوڑنے سے ہی ہوتا ہے، یہ غلط ہے، اصل یہ ہے کہ محنت وکوشش کی جائے احکام الٰہی پر چلنے کی، یہی اللہ والا بننا ہے۔ ورنہ تو بعض لوگ دنیا چھوڑ کر بھی اللہ والے نہیں بنتے، مثلاً بعض لوگ مدرسہ کے ماحول میں جو دینی، اصلاحی ماحول ہوتا ہے، رات دن قال اللہ وقال الرسول ہوتا ہے، اس کے باوجود بعض طلبہ ہیں، جو نماز تک نہیں پڑھتے۔

معلوم ہوا اللہ والا بننے کے لئے اصل فکر وتڑپ ہے، آپ سب کچھ کرتے ہوئے بھی اگر تڑپ وفکر ہو، تو اللہ والے بن سکتے ہیں، دنیا کے جھمیلے ومصروفیات آپ کو اللہ والا بننے سے نہیں روک سکتے۔

ہم تو سنار تھے لوگوں نے لوہار سمجھ لیا

ایک مرتبہ مجلس میں حضرت والا نے فرمایا: میں ایک مرتبہ میرے شیخ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا، ایک آدمی آیا اور تعویذ مانگنے لگا، حضرت نے کہا کہ جاؤ بھائی جان سے لے لو، (بھائی جان سے مراد حضرت والا کے صاحبزادہ ہیں جن کو طلباء اور عوام سب بھائی جان کہتے ہیں)، وہ شخص باہر گیا، پھر تھوڑی دیر بعد آ کر کہنے لگا، حضرت! آپ ہی دیدیجئے، حضرت والاؒ نے پھر فرمایا کہ: بھائی جان سے لے لو، میں تعویذ دیا نہیں کرتا، وہ شخص پھر باہر گیا، اور کچھ دیر کے بعد پھر آ کر اسی طرح کہا کہ حضرت! تعویذ آپ ہی دیدیجئے، حضرت نے پھر وہی جواب دیا، اور بھیج دیا، اور میری طرف دیکھ کر فرمانے لگے: ہم تو سنار تھے، لوگوں نے ہمیں لوہار سمجھ لیا، یعنی کوئی سنار کے پاس لوہے کا کچھ کام بنانے لے جائے تو یہ وضع الشیء فی غیر محلّہ کی قبیل سے ہوگا، اسی طرح آج لوگ اللہ والوں کے پاس بجائے اپنی اصلاح کرانے کے اور معرفت الٰہی حاصل کرنے کے، دینی باتیں معلوم کرنے کے، وصول الی اللہ کے طرق معلوم کرنے کے، تعویذ کے بارے میں پوچھنے جاتے ہیں، دنیا کے بارے میں معلوم کرنے جاتے ہیں کہ حضرت میرا فلاں کام رک گیا ہے، حل کر دیجئے وغیرہ وغیرہ۔

خوفِ خدا کی فضیلت

اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ خوف کے فضائل بیان فرمائے ہیں، اور ایک جگہ اس کی ضرورت اور اس پر مرتب ہونے والے ثمرہ کا ذکر فرمایا ہے، میں پہلے آپ کو وہ آیت سناتا ہوں جو سورۂ نازعات میں اللہ نے ذکر فرمائی ہیں:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى. (النازعات۴۰:)

ترجمہ: جوآدمی اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کھاتا ہے اور اپنے نفس کوگناہوں سے بچاتا ہے تواس کے لئے جنت ٹھکانہ بنادی جاتی ہے)معلوم ہوا کہ خوفِ خداوہ چیز ہے جس پراللہ کی جانب سے جنت کا وعدہ کیا گیا ہے،کیا یہ کوئی معمولی بات ہے کہ آدمی کو جنت مل جائے؟

محترم حضرات! یہ بشارت عظیم ترین بشارت ہے، ہرآدمی کی یہ خواہش ہے کہ وہ جنت میں جائے،کوئی یہ نہیں چاہتا کہ وہ جہنم میں جائے،جہنم انتہائی خطرناک چیز ہے،مومن کی کیا مجال کہ وہ اس بات کی خواہش کرے کہ وہ جہنم رسید کردیا جائے؟ بلکہ ہرمومن اپنے دل میں اس بات کی خواہش رکھتا ہے کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے حتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمنے احادیث کے اندراس بات کی دعا کی ہے:

اللّٰهم انّی أسئلک الجنة وما قرب الیهامن قول أو عمل،و أعوذبک من النار وما قرب الیهامن قول أوعمل .

اے اللہ! میں تجھ سے جنت مانگتا ہوں اوراس چیز کا سوال کرتا ہوں جو مجھے جنت کے قریب کرنے والی ہو،خواہ عمل میں سے ہو یا قول میں سے ہو۔

(ابوداؤد:۱۲۶۵،مسنداحمد:۱۴۰۲)

جوطرز زندگی جنت کے قریب کرنے والی ہو،اللہ سے اس کو مانگا جارہا ہے کہ مجھ کو وہ عمل عطاء فرما،اوراے اللہ! میں دوزخ سے پناہ چاہتا ہوں اوراس کے ساتھ اس چیز سے بھی پناہ مانگتا ہوں جو جہنم کے قریب کرنے والی ہو، جوعقائد، جو اعمال،اور جوطرز زندگی مجھے جہنم کے قریب لے جانے والی ہو،اس سے بھی پناہ مانگتا

ہوں۔

الغرض جنت کی خواہش ہر مومن کے دل کی آواز ہے اور جہنم سے بچنا بھی اس کے دل کی آواز ہے، لیکن اس کا طریقہ کیا ہو؟ طریقہ یہی ہے جو قرآن نے بتایا:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى

اللہ کے سامنے جوابدہی کا خوف کہ مجھ سے پوچھا جائے گا اور سوال کیا جائے گا اور مجھے اس کا جواب دینا ہوگا، جب آدمی کے دل میں اس بات کا خوف آئے گا، وہ گناہوں سے اپنے آپ کو بچائے گا، اور جو ایسا کرے گا اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔

حضرت مولانا اسد اللہ صاحبؒ کی تواضع

ایک واقعہ سناتا ہوں، ہمارے زمانے کے ایک بزرگ ہیں، حضرت مولانا اسد اللہ خان صاحب، جو حضرت تھانویؒ کے خلیفہ تھے، اور ان کے خلیفہ حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ اور حضرت اقدس مفتی مظفر حسین صاحبؒ ہیں، ان کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ وہ عمدہ اور نئے کپڑے پہن کر کہیں جا رہے تھے، راستہ میں ایک جھاڑو دینے والی جھاڑ رہی تھی، حضرت کے اوپر کچھ دھول وغیرہ لگ گئی، اور کپڑے کچھ میلے ہو گئے اور حضرت بھی بڑے نظیف ولطیف مزاج انسان تھے، کئی کئی مرتبہ وضو کرتے تھے، جب پوچھا گیا، تو فرمایا کہ دل کو سکون نہیں ہوتا، چنانچہ اس دھول وغیرہ کی وجہ سے اس جھاڑنے والی کو ڈانٹ دیا، اور کہا کہ تجھے جھاڑو دینا بھی نہیں آتا، میرے کپڑے میلے اور گندے کر دیئے، یہ کہہ کر اپنی جگہ پر آ گئے، جب اپنی جگہ بیٹھے تو دل بے چین ہوتا ہے، بے قراری

پیدا ہوتی ہے، طلبہ کو بلاتے ہیں، خدام کو آواز دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ دیکھو بھائی؛ جھاڑو دینے والی کہاں ہے، اس کو بلا کر لے آؤ، سب خدام ادھر ادھر بکھر گئے اور تلاش کرنے لگے، مگر وہ ملی ہی نہیں، طلبہ نے آ کر کہا کہ حضرت! وہ تو نہیں ملی، تو حضرت بے چین ہو گئے، فوراً اٹھے اور خود اس کو تلاش کرنے لگے، وہ کسی سڑک پر جھاڑو دے رہی تھی، آپ اس کے پاس تشریف لے گئے اور اس سے کہا کہ میں نے تجھے ڈانٹ دیا تھا، مجھے خدا کے لیے معاف کر دینا، مجھے حق نہیں کہ میں تجھے ڈانٹوں۔

امام شافعی کا ایک واقعہ

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ بادشاہ ہارون رشید کا دربار تھا، اس کی مجلس میں مذاکرہ ہو رہا تھا، اور بڑے بڑے علماء وہاں موجود تھے، امام شافعی اس وقت چھوٹی عمر کے تھے، لیکن بڑے شوق کے ساتھ اس مجلس میں جا کر بیٹھ گئے، ہارون رشید نے لوگوں سے سوال کیا کہ تم لوگ جو بڑے علماء ہو، بڑے بڑے مشائخ ہو، قران وحدیث کا علم رکھتے ہو، میرے بارے میں بتاؤ کہ میں جنت میں جاؤں گا یا دوزخ میں جاؤں گا؟ لوگوں نے کہا: اس کا جواب ہم کیسے دے سکتے ہیں؟ قران سے مسئلہ تو بتا سکتے ہیں، لیکن کسی کی قسمت کا فیصلہ نہیں بتا سکتے، ہاں احکام بتائے جا سکتے ہیں، زندگی میں انسان کو کس رنگ سے کس ڈھنگ سے رہنا چاہئے، اللہ تعالیٰ کس چیز سے راضی ہوتا ہے اور کس سے ناراض ہوتا ہے، یہ تو بتا سکتے ہیں، لیکن یہ سوال کہ ایک آدمی جنت میں جائے گا یا دوزخ میں جائے گا؟ یہ تو غیب کی بات ہے، کسی انسان کے بارے میں قران وحدیث کا جاننے والا غیب کی بات کیسے بیان کر سکتا ہے؟

امام شافعی جو ابھی نو عمر تھے، انھوں نے عرض کیا کہ حضور! اگر اجازت ہو تو میں اس کا جواب دے سکتا ہوں، بادشاہ نے کہا کہ ضرور دیجئے، اللہ تعالے نے امام شافعی کو بڑی بصیرت اور فراست سے نوازا تھا، امام شافعی نے کہا کہ حضور! آپ تو سوال کرنے والے ہیں اور میں جواب دینے والا ہوں، آپ اوپر بیٹھے ہیں اور میں نیچے بیٹھا ہوں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس لئے آپ نیچے اتر آیئے اور مجھے اوپر بٹھا دیجئے۔ (یہ اولیاء اللہ جو ہوتے ہیں کسی سے ڈرتے نہیں ہیں، بادشاہ ہو تو کیا ہوا؟ اس لئے کہ جو اَللّٰہُ اَکْبَر کی رٹ دن رات لگاتا ہو، ہر وقت اس کی زبان پر اللّٰہُ اکبر کا نعرہ ہو اور دل میں اس حقیقت کو جما لیا ہو کہ اللہ سے بڑا کوئی نہیں ہے، وہ کسی کو بڑا سمجھ ہی نہیں سکتا) امام شافعی کہنے لگے کہ آپ سائل ہیں اور میں مجیب ہوں، جواب دینے والے کا مقام اونچا ہوتا ہے، سوال کرنے والے کا مقام چھوٹا ہوتا ہے، اس لئے آپ کو نیچے ہونا چاہئے، بادشاہ نے اس چھوٹے سے بچے کی یہ گفتگو سنی اور کہا کہ اس بچے کو اوپر بٹھا دو اور ہمارے لئے نیچے انتظام کردو، امام شافعی کو اوپر تخت پر بٹھا دیا گیا اور بادشاہ نیچے اتر گیا، امام شافعی نے کہا کہ اب آپ اپنا سوال پیش کریں؟ جب سوال پیش کیا تو امام شافعی نے کہا کہ میں ایک سوال آپ سے کرتا ہوں، آپ بتائیں کہ کیا زندگی میں کبھی ایسا ہوا ہے کہ اللہ کے خوف سے آپ گناہوں سے بچ گئے ہوں، اور وہاں گناہ کرنے سے کوئی چیز مانع بھی نہیں رہی ہو، جو جی چاہے آپ کر سکتے ہوں، لیکن محض اللہ کے خوف اور ڈر کی وجہ سے آپ نے گناہ کو چھوڑ دیا ہو، کبھی ایسی نوبت آپ کو آئی ہے؟ بادشاہ نے کہا کہ ہاں بسا اوقات ہوا ہے، کوئی روک ٹوک نہیں تھی، کوئی دیکھنے والا تک نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود میں نے گناہوں سے اپنے آپ کو بچایا ہے کہ

کوئی تو مجھکو نہیں دیکھ رہا ہے، لیکن اللہ مجھ کو دیکھ رہا ہے۔ اس پر امام شافعی نے فرمایا کہ اب میں آپ کے سوال کا جواب دیتا ہوں کہ آپ ان شاء اللہ جنتی ہیں، لوگوں نے کہا کہ آپ یہ بات کس بنیاد پر فرما رہے ہیں اور اس کی کیا دلیل ہے؟ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی آیت تلاوت کی:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى

جو آدمی اللہ کے خوف سے ڈر گیا اور اللہ کے خوف کی وجہ سے گناہوں سے بچ گیا تو جنت میں اس کا ٹھکانہ بنا دیا جاتا ہے۔ امام شافعی نے کہا: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان شاء اللہ جنتی ہیں۔

معلوم ہوا بھائیو! اللہ کا خوف اتنی قیمتی چیز ہے، اتنی بھاری چیز اور عظیم الشان چیز ہے کہ جس آدمی کے دل میں اللہ کا خوف آجاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا فیصلہ لکھ دیتے ہیں۔

ایک عبرت آموز حدیث

خوفِ خدا کی ایک فضیلت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس شخص کی مغفرت کر دی جاتی ہے، جس کے دل میں اللہ کا خوف ہوتا ہے میں آپ کو ایک حدیث سناتا ہوں، جس کو امام منذریؒ نے الترغیب والترہیب میں روایت کیا ہے۔

وہ یہ کہ حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل میں ایک آدمی کفل نام کا تھا، جو ہر قسم کی برائی میں طاق تھا اور ہر برائی کیا کرتا تھا، ایک دن اس کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے اس سے کہا کہ اگر تم مجھے اتنے روپئے دیدو، تو میں اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دوں گی، اور تم کو مجھ سے اپنی خواہش پوری کرنے کا حق

ہوگا، وہ شخص پہلے ہی سے برائی کا عادی تھا، اسے یہ موقعہ غنیمت نظر آیا اوراس نے اس عورت کورقم دینے کا وعدہ کرلیا، اوراس سے اپنی نفسانی خواہش پوری کرنے کے لئے کسی کمرے میں لے گیا، جب برائی کا وقت آیا تو وہ عورت کانپنے لگی اوراس پرخوف و دہشت طاری ہوگئی، اس نے اس عورت سے پوچھا کہ تو کیوں خوف زدہ ہے اور کانپ رہی ہے؟ وہ کہنے لگی کہ میں نے میری پوری زندگی میں کبھی یہ حرکت نہیں کی، اورآج مجھے اس حرام و ناجائز کام کواس لئے کرنا پڑرہا ہے کہ میرے بچے گھر میں بھوکے پیاسے ہیں اوران کا کوئی کفیل نہیں ہے، اور پکانے کا کوئی سامان نہیں، میں انتہائی مجبورہوکرسوچنے لگی کہ کیا کرسکتی ہوں، تو میرے ذہن میں آیا کہ میں اپنے آپ کوکسی کے حوالے کرکے اوراپنی عصمت اوراپنی پاکدامنی کو بیچ کراس سے جو کچھ روپئے حاصل ہوجائیں، اس سے بچوں کی پرورش کروں، تو ان کی ضرورت اوران کے کھانے کا نظام کرنے کے لئے میں نے اس برائی کا ارادہ کیا، مگر مجھے اللہ کا خوف ہورہاہےاوراس لئے مجھ پرکپکپی طاری ہے۔

عورت دل سے کہہ رہی تھی، تو اس کی بات دل پر اثر انداز ہوئی، اورعورت کی یہ داستان سن کراوراس کا اللہ سے یہ خوف دیکھ کر، اس مرد کے دل میں بھی اللہ کا ڈراورخوف پیدا ہوگیا، اور کہنے لگا کہ تو صرف ایک بارگناہ کا صرف ارادہ کرکے، اللہ سے اس قدرخوف کررہی ہے، اورمیرا حال یہ ہے کہ میں نے پوری زندگی اس کی نافرمانی میں اورمعصیت میں گزاری ہے، مجھے اللہ کا تجھ سے زیادہ خوف کرنا چاہیے، اس لئے میں توبہ کرتا ہوں کہ آج سے کبھی گناہ نہیں کروں گا، اورمیں نے جوتجھ سے رقم دینے کا وعدہ کیا ہے، وہ بھی تجھ کودوں گا۔ اب اس نے اس عورت کووہ رقم بھی دےدی اور برائی سے توبہ بھی کرلی، اس عورت کو بڑی

خوشی ہوئی کہ ایک آدمی کو اس کی طرف سے ہدایت ملی ، دیکھئے ایک عورت اگر ہدایت کے راستہ پر لانا چاہے، تو بڑے بڑے بدکاروں کو بھی ہدایت پر لے آئے۔

غرض وہ عورت وہاں سے واپس ہوگئی اور یہ آدمی اس کے جانے کے بعد ندامت کے ساتھ اللہ کے سامنے روکر، گڑگڑا کر، اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا اور اسی حالت میں اسی رات اس کا انتقال ہوگیا، بنی اسرائیل میں اللہ تعالی کی ایک سنت جاری تھی کہ جو آدمی اچھا ہوتا، اس کی اچھائی کا ذکر قدرت سے اس کے دروازہ پر لکھ دیا جاتا اور اگر کوئی برائی کرتا تو اس کے دروازہ پر اس کی برائی کا ذکر کر دیا جاتا تھا اور یہ کفل نامی شخص تو اتنا برا کہ اس کے دروازے پر روزانہ کچھ نہ کچھ اس کی برائی لکھی ہوئی ہوتی تھی کہ آج اس نے زنا کیا ہے، اور آج اس نے شراب پی ہے، یا اور کوئی برائی کی ہے، سارے شہر میں اس کی رسوائی ہوتی اور سب لوگ کہتے تھے کہ یہ کیسا برا آدمی ہے اور لوگ اسی وجہ سے اس سے ڈرتے اور دور رہتے تھے۔

نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ رات کو اس کا انتقال ہوگیا، اور صبح لوگ اٹھکر دیکھتے ہیں کہ اس کے دروازے پر لکھا ہوا ہے کہ " **قد غفر الله للكفل**" اللہ تعالیٰ نے کفل کی مغفرت کردی اور لوگ پڑھتے ہوئے جارہے تھے، گذرنے والے روزانہ دیکھا کرتے تھے کہ اس کے دروازے پر کبھی کچھ برائی تو کبھی کچھ اور برائی لکھی ہوتی تھی، مگر آج عجیب حالت ہے کہ اللہ نے کفل کی مغفرت کردی، لوگ کہنے لگے کہ آج اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوا کہ اتنا بُرا آدمی، اتنا شریر و فاسق آدمی، اور اللہ نے اس کی مغفرت کردی! جب لوگوں نے تحقیق کی تو اس عورت کا واقعہ معلوم ہوا، خود عورت نے آکر بتایا کہ رات ایسا ایسا واقعہ ہوا تھا، تب لوگوں کو سمجھ میں آیا کہ اللہ نے اسی لئے اس

کی مغفرت کر دی۔ (الترغیب والترھیب:۲۵۸/۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک خوف اور ڈر اور اس کی بنا پر گناہوں سے پرہیز بڑی مبارک چیز ہے۔

ایک عظیم علم اور نکتہ

یہاں ایک بات سمجھ لیں کہ اللہ تعالے نے خوف کے بارے میں فرمایا ہے:

”وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى“

جو اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کرے اور اس کے نتیجہ میں نفسانی خواہشات سے رک جائے۔

اس میں ایک عظیم علم اور نکتہ ہے، وہ یہ کہ اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اللہ کے سامنے جانے کا، اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کا، اللہ کے سامنے جا کر بیان دینے کا اور اپنے گناہوں کے سلسلہ میں جو سوال ہوگا، اس کے جواب دینے کے بارے میں جو آدمی اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ تعالی اس کو جنت میں ٹھکانہ عطاء فرماتے ہیں، اس لئے آدمی کو ایک طرف اپنے گناہوں کا خیال کرنا چاہئے کہ مجھ سے گناہ تو نہیں ہو رہے ہیں؟ اگر ہو رہے ہیں تو سب سے پہلا کام یہ ہے کہ معافی طلب کرے، اور دوسرے نمبر پر یہ کہ اللہ کا ڈر اپنے دل کے اندر پیدا کر کے اس سے بچنے کی پوری کوشش کرے۔ جو شخص اللہ کے ڈر کے مارے گناہوں سے بچے گا، اللہ اس کو ضرور جنت میں داخل کرے گا۔

آج اللہ کا ڈر لوگوں کے قلوب سے نکل گیا، اس کی وجہ سے بے تحاشا گناہ کرتے چلے جا رہے ہیں، ان کو خیال تک نہیں آتا کہ اللہ کے سامنے جانا ہے اور حاضری دینا ہے، اور وہاں سوال و جواب ہوگا، بغیر کسی پردے کے، بغیر کسی

درمیانی چیز کے،اللہ تعالی براہ راست سوال کرے گا،اور ہمیں وہاں اس کا جواب دینا ہوگا، یہ نہیں کہ درمیان میں کوئی فرشتہ ہوتا ہو،اورادھر سے اللہ پوچھتا ہواورادھر سے جواب لے کر کوئی فرشتہ اللہ کو بتا تا ہو، بلکہ حدیث پاک میں آتا کہ اللہ کے نبیصلی اللہ علیہ وسلمنے فرمایا: اللہ قیامت کے دن بغیر کسی ترجمان کے براہ راست سوال کرے گا۔

(بخاری شریف:۱۳۲۴،مسند احمد:۱۷۵۳۵)

ذرااندازہ کرو، اگر کسی بادشاہ کا محل ہو، وہاں پر اس کی فوج موجود ہواور وہ پورے کرّ وفر کے ساتھ وہاں بیٹھا ہو، لاؤ لشکراور ساری طاقت وہاں پر موجود ہواور ہم کو مجرم بنا کر اس کے دربار میں لے جایا جائے ،تو اس وقت ہماری کیا حالت ہوگی ، اور کیا کیفیت ہوگی؟ ایک طرف شرم وحیاء، دوسری طرف ڈروخوف پیدا ہوگا، جس کی وجہ سے ہمارا دل کانپ جائے گا، نینداڑ جائے گی، چین ختم ہوجائے گا اور ہم یہ چاہیں گے کہ ہمیں زندہ رہ جانے کے بجائے موت آجائے تو کتنا اچھا ہو، اس لئے کہ اس قدر ذلت ورسوائی بادشاہ کے دربار میں مجرم بنا کر لے جایا گیا ہے، یہ کیسے برداشت ہوگی؟

بھائیو! جب دنیا کے بادشاہوں کا یہ حال ہے،تو سوچو کہ اللہ کے دربار کا کیا حال ہوگا؟ اس کے دربار میں، قیامت کے میدان میں دنیا کے پہلے انسان سے لیکر دنیا کے آخری انسان تک سب جمع ہوں گے اور اللہ کے فرشتے بھی وہاں جمع ہوں گے، دیگر مخلوقات بھی وہاں ہوں گی اور علی الاعلان حساب لیا جائے گا، ڈھانک کر اور چھپا کر نہیں لیا جائے گا، اور حساب پوری مخلوق کے سامنے آجائے گا۔

اب بتاؤ کہ کیا حال ہوگا؟ ایسے موقع پر اگر ہمارے سے سوال ہواور جواب کا مطالبہ ہو،تو ہمارے پاس اس سوال کا کیا جواب ہوگا؟ اس لئے سب سے پہلے

آدمی کو ڈرنا چاہئے اللہ کے سامنے کھڑے ہونے سے، ''وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ '' کا مطلب یہی ہے کہ مجھے اللہ کے سامنے جانا ہے، کھڑا ہونا ہے، ایک ایک چیز کا حساب دینا ہے، اس کا خیال ہو۔

خوف اور محبت کی ایک عجیب مثال

یہاں ایک بات مزید عرض کرتا ہوں ، وہ یہ کہ کاروں ، بسوں اور دیگر سواریوں میں دو قسم کی طاقت ہوتی ہے، ایک سے کار کو آگے بڑھایا جاتا ہے، اور دوسری سے اس کو روکا جاتا ہے، اور یہ دونوں طاقتیں کار اور بس وغیرہ سب کے لئے ضروری ہیں، تاکہ یہ اپنی منزل تک پہنچ سکیں ، اگر آگے لے جانے والی قوت نہ ہوتو یہ سواریاں چل نہ سکیں گی اور اگر روکنے کی قوت نہ ہوتو یہ سواریاں ہر وقت خطرہ کا شکار ہوتی رہیں گی ، اسی روکنے کی قوت کو بریک کہا جاتا ہے، اب سمجھئے کہ اسی طرح انسان کو بھی اپنے روحانی و ایمانی سفر کے لئے اور اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے دو قسم کی قوت چاہئے ، ایک نیکیوں کی راہ پر چلانے والی قوت اور دوسری گناہوں کے خطرات سے بچانے والی قوت ، نیکی پر چلانے کی قوت کا نام ہے محبت الٰہیہ ، اس طاقت سے انسان اپنے کو نیکی کی راہ پر چلا سکتا ہے، اللہ کی محبت وہ عجیب شئ ہے کہ ہزار تکالیف ہوں ، مگر انسان اللہ کی محبت میں نیکی اور اطاعت کی راہ پر چلنے لگتا ہے۔

''از محبت تلخہا شیریں شود''

اور گناہوں کے خطرات سے بچانے والی قوت کا نام ہے خوف خداوندی ، یہ اللہ کا خوف انسان کو گناہوں سے بچاتا ہے، اس لئے میں کہتا ہوں کہ خوف کی مثال ایسی ہے جیسے کار اور بس میں بریک ہوتا ہے کہ جب کوئی خطرہ کی بات سامنے آئے تو اس کا استعمال کیا جاتا ہے، کسی انسان کے سامنے کوئی گناہ کی بات آئے اور اس کو

اپیل کرے تو اس قوت کو استعمال کر کے ان ایمانی و روحانی خطرات سے بچنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

خوف کی دو قسمیں

ایک اہم نکتہ سن لیجئے، وہ یہ کہ علماء نے لکھا ہے کہ خوفِ خدا دو قسم کا ہوتا ہے، ایک یہ کہ بندے کے دل میں اللہ کی جلالت وعظمت کی طرف نظر کرتے ہوئے خوف پیدا ہو، اور دوسرا یہ کہ اللہ کی سزاؤں اور عذابوں اور اس کی طرف سے گناہوں پر بیان کی ہوئی وعیدوں پر نظر کرتے ہوئے خوف ہو۔

اگر چہ یہ دونوں قسم کے خوف معتبر ہیں اور ان دونوں پر اللہ کی طرف سے فضیلت ملے گی، مگر جو خوف صرف اللہ کی جلالت وعظمت کے پیشِ نظر ہو، اس کا درجہ بہت اونچا ہے، کیوں کہ یہ خوف کسی اپنی غرض کی بنا پرنہیں ہے بلکہ صرف اور صرف اللہ کی بڑائی وبزرگی کی وجہ سے ہے اور عارفین کا خوف اسی قسم کا ہوتا ہے۔

امام غزالی فرماتے ہیں کہ یہ اللہ کی عظمت وجلالت کی وجہ سے خوف کا ہونا، ایک بلند ترین مقام ہے اور یہ خالص موحدین وصدیقین کا مقام ہے۔

الغرض کوئی اللہ کا خوف اس لئے کرتا ہے کہ اللہ تعالے گناہ کی وجہ سے جہنم میں ڈالے گا اور سزا دیگا، تو یہ خوف بھی ٹھیک ہے اور اس پر بھی ثواب ہے، مگر اعلی و افضل مقام یہ ہے کہ اللہ کا خوف وڈر اس کی جلالت وعظمت اور اس کی صفات کا خیال کرتے ہوئے ہو اور اس سے بھی اعلی مقام یہ ہے کہ دونوں قسم کا خوف ہو، حضرات انبیاء اور صحابہ کرام واولیاء اللہ سے دونوں قسم کے خوف کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ حضرات ایک طرف اللہ کی جلالت وعظمت کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا خوف کرتے تھے، تو دوسری طرف اس لئے بھی اللہ کا خوف کرتے تھے کہ اس کا عذاب اور اس کی سزا بھی

بڑی اور شدید ہے جس کا تحمل نہیں کیا جا سکتا۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا خوف

حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ کو اللہ کا اس قدر ڈر و خوف تھا کہ بسا اوقات تیز و تند ہوا چلتی یا کوئی سیلاب کی شکل ہو جاتی یا زور زور سے بارش آنے لگتی یا بجلیاں چمکتیں اور کڑکتیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلمکے دل پر اس کی وجہ سے ایک کیفیت طاری ہو جاتی، خدا کا ڈر اور خوف غالب آجاتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوڑ کر مسجد کی طرف جاتے اور اللہ کی عبادت میں لگ جاتے، بعض صحابہ کرام نے پوچھا کہ یا رسولصلی اللہ علیہ وسلم آپ اس قدر گھبراتے کیوں ہیں؟ اللہ کے نبیصلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے ڈر رہے کہ کہیں قیامت برپا نہ ہو جائے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، کیا بات ہے کہ آسمان پر جب بادل آجاتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ بدل جاتا ہے اور جب بارش ہو جاتی ہے تو آپ کی یہ کیفیت بدل جاتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عائشہ! مجھے یہ خوف ہوتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ قوم عاد کی طرح اللہ تعالی عذاب نازل فرمادیں کہ قوم عاد پر عذاب بادل کی شکل میں آیا تھا، انھوں نے یہ سمجھا کہ اب بارش ہونے والی ہے اور کہنے لگے" **هذا عارض ممطرنا** " کہ اب یہ بادل بارش برسائے گا، مگر اللہ نے اس کے ذریعہ ان پر پتھر برسا کر ان کو ہلاک کر دیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب بارش ہو جاتی ہے تو مجھے اطمینان ہو جاتا ہے کہ بارش ہو رہی ہے، اللہ کا عذاب نازل نہیں ہو رہا ہے۔

(بخاری: ۲۹۶۷، ابوداؤد: ۴۴۳۴)

ہماری بے خوفی وغفلت

حضرات! آج سخت ہواؤں کے جھکڑ چلتے ہوں،خوب بارش ہوتی ہو، سیلاب اورطوفان ہو یا سونا می جیسا کوئی واقعہ پیش آتا ہو،مختلف حوادثات پیش آتے ہوں،لیکن ہمارے دلوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا،یعنی ہم بے حس ہو گئے ہیں،گویا ہم کو اطمینان ہو گیا ہے کہ ہمارے ساتھ کوئی معاملہ ہونے کا نہیں۔

یہ بے خوفی خطرناک ہے،قران کریم نے فرمایا کہ ذرا سوچو اور دیکھو کہیں ایسا تو نہیں کہ تم کو اطمینان ہو اور اللہ تمہارے اوپر پتھروں کی بارش نازل کردیں۔

أَمْ أَمِنتُم مَّنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ، أَمْ أَمِنتُم مَّنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ، فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرُ. (الملک:۱۷)

حضرات! غور کیجئے کہ اللہ کے برگزیدہ نبی کو ہوا اور بادل کی وجہ سے اللہ کا خوف ہو رہا ہے اور ہم کو کوئی خوف نہیں ہوتا،گناہ بھی جاری اور اطمینان بھی جاری ہے،گناہ بھی جاری ہے اور کھانا بھی جاری ہے،گناہ بھی جاری ہے اور سونا بھی جاری ہے،گناہ بھی جاری ہے اور تجارت بھی جاری ہے۔

خوف خدا بھی مانگنا چاہئے

اسی لئے اللہ سے اس کا خوف بھی مانگنا چاہئے،نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ سے خوف مانگتے تھے،ایک حدیث میں آپ کی یہ دعاء آئی ہے:

”اَللّٰھُم اقسم لنا من خشیتک ما تحول به بيننا وبين معاصیک“

اے اللہ! ہم کو اپنے خوف میں سے اتنا حصہ عطاء فرما جو ہمارے اور تیری نافرمانیوں کے درمیان آڑ بن جائے اور ہم گناہ نہ کرنے پائیں اور ایک حدیث میں فرمایا:

" اللھم اجعل حبّک احبّ الاشیاء الیّ واجعل خشیتک اخوف الاشیاء عندی " (الحزب الاعظم : لملا علی القاری)

اے اللہ! تو اپنی محبت میرے نزدیک تمام چیزوں سے زیادہ محبوب بنادے اور اپنا خوف وڈر تمام چیزوں سے زیادہ خوفناک بنادے۔

معلوم ہوا کہ اللہ سے اس کی بھی دعاء کرنا چاہئے کہ ہمیں اپنا خوف عطا فرمائے، کیونکہ جب آدمی کے دل میں اللہ کی جلالت وعظمت کی وجہ سے اس کا ڈر اور خوف آجاتا ہے یا وہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ میری حرکتوں پر اللہ کے یہاں پکڑ ہوگی تو اس کی وجہ سے وہ گناہوں سے ضرور بچے گا۔

آنحضرت ﷺ کا خوفِ خدا

ہمارے اسلاف کی سیرت کا اس لحاظ سے مطالعہ کریں کہ وہ کیسا خوف رکھتے تھے، اور آقائے نامدار تاجدار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کریں، حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن شخیر ؓ نے فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کے سینہ میں رونے کی وجہ سے ایک آواز تھی، جیسے ہانڈی پکنے کی آواز ہوتی ہے، اور ایک روایت میں ہے کہ ایسی آواز تھی، جیسے چکی کی آواز ہوتی ہے۔

(نسائی:۱۱۹۹، ابوداؤد:۷۶۹، مسند احمد:۱۵۷۲۲)

یہ آواز دراصل خوف وخشیت کی بنا پر رونے کی وجہ سے تھی اور عام طور پر یہ

بات اس وقت ہوتی تھی جب کہ آپ نماز میں ہوتے تھے۔

حضور ﷺ پر خوفِ آخرت

حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ اللہ کے نبی ﷺ بہت بھوکے ہو گئے، کئی دن کا فاقہ تھا، یہاں تک کہ حضور ﷺ کو اس بے چینی اور اضطراب کی کیفیت نے گھر کے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا، اس وقت اللہ کے نبی ﷺ کی کیا کیفیت ہوگی؟ کیا حالت ہوگی؟ آج ہم لوگ کتنا کھاتے ہیں، کیسی کیسی نعمتیں ہم کو دی جاتی ہیں اور صرف کھانا ہی نہیں کھاتے، بلکہ پھل پھلاریاں اور مختلف چیزوں کا انتظام بھی ہوتا ہے، یہ ساری کیا اللہ کی نعمتیں نہیں ہیں؟ یہاں حضور ﷺ کا یہ معاملہ ہے کہ کئی دن گذر جاتے ہیں، کھانے کو کوئی چیز میسر نہیں، گھر کے اندر چولھا تک نہیں جلتا، جو کچھ کھجور وغیرہ اس طرح کی چیز مل جاتی، اسی کو کھا لیتے ہیں، پکانے کے لئے کوئی چیز میسر نہیں ہوتی تھی، الغرض حضور ﷺ بے چین و بے تاب ہوئے، دوپہر کا وقت تھا، ایک راستہ سے گذر رہے تھے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوگئی، حضور ﷺ نے ان سے پوچھا کہ دوپہری کے وقت باہر کیسے آنا ہوا؟ ابوبکر! کیا بات ہے، یہ وقت تو آرام کرنے کا ہے، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ بھوک برداشت نہیں کر سکا، اس لئے مجبور ہو کر باہر نکل آیا ہوں، حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس چیز نے تم کو باہر نکالا ہے، اسی چیز نے مجھے بھی باہر نکالا ہے، اب یہ دونوں حضرات مل کر آگے بڑھے، کچھ فاصلہ پر جانے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی، حضور ﷺ نے پوچھا: عمر! کیا بات ہے، دوپہر کی اس سخت گرمی میں باہر کیسے آنا ہوا؟ یہ تو آرام کا وقت ہے، حضرت عمرؓ نے کہا کہ یارسول اللہ ﷺ کئی دن کا فاقہ ہے، آج بھوک برداشت نہیں ہوئی، اس

لئے باہر نکل آیا ہوں، یہ دونوں حضرات کہنے لگے کہ عمر! جس چیز نے تم کو باہر نکالا ہے،اسی نے ہم کو بھی باہر نکالا ہے، پھر یہ تینوں مقدس حضرات جن میں ایک تمام انبیاء کے امام تھے اور یہ دونوں صحابہ جن کی عظمتِ شان تمام لوگوں کو معلوم ہے، یہ تینوں حضرات ایک صحابی کے یہاں گئے ،ان کا نام حضرت ابوالہیثم رضی اللہ عنہ تھا،حضرت ابوالہیثم رضی اللہ عنہ اس وقت وہاں موجود نہیں تھے،آپ نے ان کے بارے میں پوچھا،اسی درمیان وہ بھی آگئے اور ان کی تو عید ہوگئی کہ ان کے یہاں آج اللہ کے نبی تشریف رکھے ہیں،آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک جگہ بٹھایا اور جلدی جلدی کچھ انگور اور کچھ کھجور کے خوشے توڑ کر لائے اور آپ کے سامنے رکھ دیا،اور بکری ذبح کرنے چاقو اُٹھائی تو آپ نے فرمایا کہ دودھ والی کو ذبح نہ کرو، چناں چہ ایک بکری ذبح کی اور جلدی سے کچھ روٹیاں تیار کروائیں،اور سالن گوشت اور روٹی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لاکر رکھ دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان دونوں حضرات نے کھایا اور کھانے کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن تم ان نعمتوں کے بارے میں سوال کئے جاؤ گے، پھر سورہء تکاثر کی آیت تلاوت فرمائی:" **ثم لتسئلن یو مئذٍ عن النعیم**" کہ قیامت کے دن ان نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ کیا کیا کھائے تھے،کیا کیا مزے لوٹے تھے، ہم نے کیا کیا نعمتیں دی تھیں۔ (مسلم شریف:۳۷۹۹،ترمذی شریف:۲۲۹۲)

ایک اور موقعہ پر اسی طرح کا واقعہ پیش آیا اس میں آپ اور یہ دونوں حضرات،حضرت ابوایوب کے گھر تشریف لے گئے،انھوں نے کھانے کا انتظام کیا، آپ نے کھایا، پھر آپ کو رونا آ گیا،حتی کہ ہچکیاں آنے لگیں،اس منظر کو دیکھ کر صحابہ کو بھی رونا آ گیا،اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یاد رکھو! جو کچھ کہ ہم نے کھایا ہے، اللہ کے سامنے قیامت کے دن اس کا حساب دینا ہوگا۔ (الدرالمنثور:۶۵۱/۸)

اس کو کہتے ہیں اللہ کا ڈر اور اللہ کی خشیت ،آج ہم کتنے اطمینان کے ساتھ اس کی نافرمانیاں کرتے ہیں جب کہ اللہ کے نبی ﷺ کی ذات وہ مقدس ترین ذات ہے، جن سے کسی گناہ کا صدور ناممکن ہے، محال ہے، آپ روتے ہیں اور گھبراتے ہیں۔

اس لئے نعمت استعمال کرنے کے بعد سوچو کہ اس کے بارے میں سوال ہوگا کہ اس کا استعمال تم نے کیسے کیا، حلال طریقہ سے کیا تھا یا حرام طریقہ سے کیا تھا؟ اور یہ کہ ہماری فرمانبرداری کے ساتھ کیا تھا یا نافرمانی کے ساتھ کیا تھا؟ اس سوال کا جواب جب تک نہ دیا جائے گا کوئی شخص اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتا، یہ تھا اللہ کے نبی کا خوف۔

حضرات صحابہ کا خوف

صحابہ کرام میں سے حضرت ابو بکر صدیقؓ وعمر بن خطابؓ یہ دونوں حضرات اپنے اندر بہت زیادہ اللہ کا خوف وڈر رکھتے تھے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو کوئی پرندہ نظر پڑتا تو خوف کی وجہ سے فرماتے:

لیتنی مثلک یا طائر ولم اخلق بشرا.

کہ اے پرندے! کاش میں تجھ جیسا ہوتا، اور انسان بنا کر نہ پیدا کیا جاتا۔

اسی طرح حضرت ابوذر غفاریؓ سے مروی ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اے کاش میں ایک درخت ہوتا کہ کاٹ دیا جاتا اور حضرت عثمانؓ فرمایا کرتے تھے کہ اے کاش میں مرنے کے بعد دوبارہ نہ اُٹھایا جاتا۔

حضرت ابن ابی ملیکہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے تیس صحابہ کو پایا ہے جو سب کے سب اپنے اوپر نفاق کا اندیشہ کیا کرتے تھے۔ (صحیح بخاری: کتاب الایمان)

اسی طرح حضرت عمرؓ کو اللہ کا اس قدر خوف تھا کہ اپنے اوپر نفاق کا شبہ کیا کرتے تھے اور فرماتے کہ کہیں میں منافق تو نہیں ہو گیا ہوں۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ انھوں نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو بلایا، یہ حضرت حذیفہ کون تھے؟ وہ صحابیٔ رسول جن کو اللہ کے نبی ﷺ نے کچھ ایسی باتیں بتائی تھیں، جو کسی اور صحابی کو نہیں بتائی تھیں، اس لئے ان کو راز دار رسول کہا جاتا ہے، ایک دفعہ حضرت عمرؓ بن خطاب نے اپنے دور خلافت میں ان کو بلایا اور کہا کہ حذیفہ! تم سے ایک بات پوچھتا ہوں کہ حضورؐ نے تم کو کچھ باتیں بتائی تھی اور ان میں یہ بھی بتایا تھا کہ منافقین کون کون ہیں، کہیں میرا نام تو حضور ﷺ نے نہیں لیا تھا؟ اللہ اکبر! حضرت عمرؓ کو حضور ﷺ سے کیسی محبت تھی؟ کیسا تعلق تھا؟ اس کے باوجود ڈرتے ہیں، گھبراتے ہیں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ مجھ سے ناراض رہے ہوں اور حضور ﷺ نے میرا نام منافقوں میں شمار کرادیا ہو۔

حضرت عمرؓ کی فضیلت

حضرت عمرؓ کو یہ خوف ان فضائل کے باوجود تھا جو آپ کے بارے میں حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمائے ہیں، خود حضرت حذیفہؓ نے ایک موقعہ پر یہ بتایا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو دروازہ فرمایا تھا، کہ جب تک یہ دروازہ باقی رہے گا، امت کے اندر فتنوں کے آنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی، یہ دروازہ فتنوں کو روکے گا، تاکہ کوئی فتنہ امت میں نہ آنے پائے، لیکن جب یہ دروازہ وہاں سے ہٹ جائے گا تو پھر اس کے ذریعہ فتنے آنے شروع ہو جائیں گے، حضرت عمرؓ نے کہا کہ ایک بات بتادو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا تھا میں دروازہ ہوں، کیا وہ دروازہ توڑا جائے گا یا کھولا جائے گا؟ حضرت حذیفہؓ نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا کہ

اس دروازہ کوتوڑ دیا جائے گا۔ (بخاری:۳۳۲۱،مسلم:۲۰۸)

مطلب یہ کہ شہادت ہوگی، ایک تو ہے دروازہ کھولنا، جو دروازہ کھلتا ہے وہ بند بھی ہوگا، لیکن جو دروازہ ٹوٹ جاتا ہے وہ ٹوٹ ہی جاتا ہے، اس کے بننے کا سوال ہی نہیں ہوتا، مطلب یہ کہ جب اس دروازہ کو توڑ دیا جائے گا تو امت میں فتنوں کا دور شروع ہوجائے گا، چناں چہ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد امت میں فتنوں کا دور شروع ہوگیا، جن کا سلسلہ آج تک برابر جاری ہے۔

بھائیو! یہ ڈر، یہ اللہ تعالیٰ سے خوف انسان کو راہ ہدایت پر لاتا ہے، حضرات اولیاء خاص طور پر اللہ کا ڈر اپنے دلوں کے اندر رکھتے تھے، اسی ڈر کی وجہ سے گناہوں سے بچتے تھے، ان کو ہر وقت یہ ڈر و خوف لگا رہتا تھا کہ نہ معلوم موت کب آجائے، اللہ کے سامنے حاضری ہوجائے، نہ معلوم میرے گناہوں کے بارے میں میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے، کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھ کو جہنم میں پھینک دیا جائے۔

امام ابن مبارکؒ کا حال

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا نام آپ نے سنا ہوگا، بہت بڑے محدث اور فقیہ تھے اور بڑے بزرگ بھی تھے، جب ان کا آخری وقت آیا، اس وقت وہ اپنے پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے، بیقراری تھی، شاگرد جمع تھے، عبداللہ بن مبارکؒ نے فرمایا کہ مجھے اٹھا کر زمین پر لٹادو، شاگردوں نے کہا کہ حضرت! زمین پر کیوں لیٹنا چاہتے ہیں، اوپر تو ذرا آرام ہے، نیچے رہنے پر آپ کو تکلیف ہوگی۔ عبداللہ بن مبارکؒ نے فرمایا: نہیں، مجھکو اٹھاؤ اور زمین پر ڈالدو۔ خیر حکم تھا، تو شاگردوں نے ان کو اوپر سے اٹھایا اور زمین پر ڈالدیا، ڈالتے ہی ان کی عجیب حالت ہوئی، چہرہ کو اور گالوں کو زمین پر رگڑنے لگے اور اللہ سے خطاب کر کے کہنے لگے کہ اے اللہ! کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھ

بوڑھے کو آپ جہنم میں ڈالدیں، اس بوڑھے پر رحم فرما، اس بوڑھے پر رحم فرما، بار بار یہی فرماتے چلے جارہے ہیں۔

یہی تو اللہ کا ڈر ہے جو بندہ ءمومن کے قلب کے اندر ہمیشہ جاگزیں ہونا چاہئے جو اس کو صحیح سمت اور صحیح راستہ بتائے گا۔

ایک پتھر کا خوفِ خدا میں رونا

بھائیو! آج ہمارے دلوں کے اندر سے اللہ کا خوف نکل گیا، حالانکہ یہ خوف وہ چیز ہے کہ اللہ کی وہ مخلوق جس کو ہم بے جان سمجھتے ہیں اس کو بھی حاصل ہے۔امام غزالی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک دفعہ جارہے تھے، اور ان کو جانا تھا کوہ طور پر اللہ سے ملاقات کے لئے، وہ کلیم اللہ تھے، اللہ سے گفتگو ہوتی تھی، اللہ سے ملاقات ہوتی تھی، جاتے جاتے راستہ میں ایک جگہ ان کو نظر آیا کہ ایک پتھر بہت زور سے رورہا ہے۔آپ کہیں گے کہ پتھر کس طرح روسکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس کو ہم بے جان اور بے شعور مخلوق سمجھتے ہیں وہ حقیقت میں نہ بے جان ہے اور نہ بے شعور، بلکہ یہ سب چیزیں جاندار ہیں۔

عشق نبی میں ایک لکڑی کا رونا

خود ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعہ بخاری میں موجود ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک منبر لکڑی کا تھا، جو ویسا ہی معمولی سا بنا ہوا تھا، کوئی مستقل منبر نہ تھا، نبی اکرم ﷺ اس پر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے، کچھ لوگوں کو توجہ ہوئی تو انھوں نے مسجد کے اندر مستقل ایک منبر تعمیر کر کے وہاں نصب کر دیا اور لکڑی کا عارضی منبر جو وہاں پر موجود تھا، اس کو وہاں سے ہٹادیا، اس کے بعد حسبِ معمول اللہ کے نبی

ﷺ جمعہ میں خطبہ ارشاد فرمانے تشریف لائے اور منبر پر کھڑے ہوئے، تو دیکھا کہ کسی کے بلک بلک کر رونے کی آواز آرہی ہے، سب پریشان کہ یہ کون رورہا ہے، صحابہ ادھر ادھر پریشان ہوکر دیکھنے لگے، پھر کسی نے بتایا کہ یارسول اللہصلی اللہ علیہ وسلم ادھر وہ منبر رورہا ہے جس کے اوپر آپ اب تک کھڑے ہوکر خطبہ ارشاد فرماتے تھے، آپ ﷺ خطبہ چھوڑ کر اس کی طرف تشریف لے گئے اور جاکر اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے، کیوں رورہا ہے؟ منبر جواب دینے لگا کہ یارسول اللہ ﷺ! اب تک آپ کی قربت مجھے نصیب تھی، نئے منبر کے بننے کے بعد مجھے ایک کونے میں ڈالدیا گیا، میں آپ کی جدائی برداشت نہیں کرسکتا۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے اس کو سینہ سے لگایا، اور اس کو تسلی دی تو وہ خاموش ہوگیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”والذی نفس محمدٍ بیده لو لم التزمه مازال باكياً حطباً حتي يوم القيامة، حزناً علي فراق رسول الله صلي الله عليه وسلم“

اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر میں اس کو اپنے سینہ سے نہ لگاتا تو یہ میری جدائی کے صدمے میں قیامت تک روتا رہتا، اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ جاؤ اس کو دفن کردو)۔

(بخاری:۳۳۱۹، ابن ماجہ:۱۴۰۷، سنن الدارمی:۴۱)

۞ ہر چیز میں حیات وشعور ہے

بھائیو! ہم سمجھتے ہیں کہ ہم ہی ذی روح ہیں، ہم ہی ذی شعور ہیں، خدا کی قسم زمین بھی، آسمان بھی، چاندوسورج بھی، پتھر بھی، لکڑیاں بھی، پتے بھی اور یہ ذرّے

بھی، ان سب کے اندر حیات و جان بھی ہے اور ہم سے زیادہ احساس بھی موجود ہے۔مولانا رومی نے کہا ہے کہ:

خاک و باد وآب وآتش بندہ اند ۞ با من وتو مردہ با حق زندہ اند

کہ مٹی و ہوااور آگ و پانی ہمارے تمہارے لحاظ سے تو مردہ ہیں لیکن اللہ کے لحاظ سے زندہ ہیں۔ چناں چہ قرآن میں ہے:

مَا مِنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّاتَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ.

(بنی اسرائیل:)

اسی طرح ان سب میں شعور بھی ہے اور سب سے زیادہ بے حس و بے شعور تو انسان ہے، جس کو دعوی ہے عقل کا، جس کو دعوی ہے شعور کا، سب سے زیادہ بے عقل تو یہی ہے۔

غرض حضرت موسی علیہ السلام گذر رہے تھے، ان کو آواز آئی پتھر سے رونے کی، تو اس سے پوچھا کہ تو کیوں رو رہا ہے؟ پتھر کہنے لگا کہ مجھے اللہ کا ڈر ہے کہ کہیں قیامت میں اللہ تعالیٰ مجھے بھی جہنم میں نہ ڈال دیں، میں کہتا ہوں کہ اس پتھر کو یہ خدشہ اس لئے ہوا ہوگا کہ قرآن میں ہے:" وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ"(تحریم:) (کہ جہنم کا ایندھن انسان اور پتھر ہے) لہذا اس نے کہا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اللہ تعالے مجھکو بھی جہنم میں ڈال دیں، اگر میں بھی ان جہنمی پتھروں میں رہا، تو میرا حشر بھی برا ہوگا، اس بات کو یاد کر کے میں رو رہا ہوں، اور کہنے لگا کہ آپ اللہ کے پیغمبر ہیں اور کوہ طور پر اللہ سے ملاقات و مناجات کے لئے جا رہے ہیں، آپ میرے حق میں سفارش کر دیجئے۔

حضرت موسی علیہ السلام نے اسے تسلی دی اور کہا کہ میں اسوقت اللہ کے

دربار میں جارہا ہوں ،اللہ سے دعاء کرکے تیری بخشش کرادوں گا،حضرت موسی علیہ السلام کوہِ طور پر پہنچے،اللہ سے باتیں کرنے لگے،ان باتوں کے درمیان حضرت موسی علیہ السلام اس پتھر کو بھول گئے ،اب دیکھئے اللہ کی رحمت اوراس پر قربان جایئے کہ جب واپس ہونے لگے تو اللہ نے کہا کہ موسی ! تم اس پتھر کو بھول گئے ؟ کیا تم نے اس سے سفارش کا وعدہ نہیں کیا تھا ؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے اللہ ! واقعی میں بھول گیا ،آپ سب کچھ جانتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے کہا کہ جاؤ ،اس سے کہہ دو کہ ہم نے اس کی مغفرت کردی اوراس کو بخش دیا،اوردیگر پتھروں کے ساتھ اس کوجہنم میں داخل نہیں کروں گا،حضرت موسی علیہ السلام خوشی خوشی واپس آئے ،اس کوخوشخبری سنادی اور چلے گئے ، پھرکچھ دنوں کے بعدحضرت موسی علیہ السلام کوکوہِ طور پر جانا تھا،اسی راستہ سے جارہے تھے ،دیکھا کہ وہ پتھر پھربھی رورہا ہے، کہنے لگے کہ میں نے تو تجھ کوخوشخبری سنادی تھی اوراللہ کا پیغام بتایا تھا کہ اللہ تجھ کوجہنم میں داخل نہیں کریگا، پھراب رونے کی کیا بات ہے؟ کہنے لگا کہ اے موسی ! اُس وقت اللہ کے خوف وڈرکی وجہ سے رورہا تھااوراب اللہ کی محبت میں رورہا ہوں، کہ جس خدانے مجھے ایسی نعمت عطاء کی کیااس کی محبت میں مجھے نہیں رونا نہیں چاہئے ؟

(مکاشفة القلوب للغزالی)

اللہ اکبر ! ہم کتنی نعمتیں کھاتے ہیں ،لیکن کیا اللہ کی محبت دلوں میں سمائی ہے؟ اللہ کے حکم کے مطابق زندگی گزارنے کا کوئی جذبہ پیدا ہوا؟ جانوراللہ سے ڈریں اورپتھر میں اللہ کا خوف ہو،لیکن انسان بےخوف ہوکرزندگی گذاریں؟ کس قدرتعجب کی بات ہے۔

قرآن سے دلیل

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ پتھر کے رونے کی یہ بات کیا صحیح ہے اور اس کی کوئی دلیل ہے؟ تو میں عرض کروں گا کہ ہاں اس کی دلیل قرآن میں ملتی ہے۔ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ، وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ، وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهَارُ .(البقرة: ۷۴)

اور بے شک پتھروں میں ایسے بھی ہیں جن سے پانی نکلتا ہے،اور بعض وہ ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جن سے نہریں پھوٹتی ہیں۔

حضرت مجاہد اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ جو بھی پتھر ایسے ہوتے ہیں جن سے پانی نکلتا ہے، یا وہ اوپر لڑھک کر گر جاتے ہیں، یا جن سے نہریں اور چشمے اُبلتے ہیں، وہ دراصل اللہ کے خوف کا نتیجہ ہوتا ہے۔

معلوم ہوا کہ پتھر کا خوف کھانا اور اس کی وجہ سے رونا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔

خوفِ خدا سے رونے کی فضیلت

حضرات! اللہ کے ڈر سے رونے کی بڑی فضیلت ہے،ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ ایک موقع پر سورۂ نجم تلاوت کررہے تھے، جب اس آیت پر پہنچے:

﴿أَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ، وَتَضْحَكُوْنَ ، وَلَا تَبْكُوْنَ﴾

اللہ تعالیٰ نے کافروں سے کہا کہ تم اللہ کے اس کلام سے انکار کرتے ہوئے

تعجب کرتے ہو کہ کیسے نازل ہو گیا؟ اور اللہ کے کلام کا مذاق اڑاتے ہو، اور روتے نہیں ہو؟) (سوارۃ النجم:٦٠)

جب اللہ کے نبی ﷺ نے یہ آیتیں پڑھیں تو صحابہ کرام کو رونا آ گیا، پھر اللہ کے نبی ﷺ کو بھی رونا آ گیا، اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ خوشخبری سن لو! کہ جو آنکھ اللہ کے خوف اور ڈر کی وجہ سے روئے وہ آنکھ جہنم میں داخل نہ ہوگی۔

(الدر المنثور:٧/٦٦٧)

یاد رکھو کہ جن آنکھوں سے اللہ کے ڈر کی وجہ سے آنسوں نکلتے ہیں، چاہے وہ مچھر کے پر کے برابر ہوں، مکھی کے پر کے برابر ہوں، اللہ تعالی اس کی بخشش فرما دیتے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ دو آنکھیں ایسی ہیں کہ جن پر اللہ نے جہنم کو حرام کر دیا ہے، بلکہ جہنم کی آگ چھو بھی نہیں سکتی۔

عینٌ بکتْ من خشیة اللّٰہ، وعینٌ تَحْرُسُ فی سبیل اللّٰہ

ایک وہ آنکھ جو اللہ کے ڈر و خوف سے روتی رہتی ہے اور ایک وہ آنکھ جو اللہ کے راستہ میں جاگتی رہتی ہے اور مسلمانوں کی حفاظت کا فریضہ انجام دیتی ہے۔

(ترمذی:١٥٦٣)

یعنی کچھ لوگ جہاد میں نکلے ہیں اور کچھ لوگ اللہ کے راستہ میں نکلے ہیں، کچھ لوگ دینی خدمت میں لگے ہیں، ان سب کی حفاظت کرنے کے لئے ایک آنکھ جو سوتی نہیں، جاگتی رہتی ہے، تا کہ ان کی حفاظت ہو سکے، ان کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے، اس آنکھ پر بھی اللہ جہنم کو حرام کر دیتے ہیں۔

دنیا میں رونا سیکھو

بھائیو! قیامت کے دن کے رونے سے بچنے کے لئے، اس دنیا میں کچھ ندامت کے آنسو بہالو، رات میں اٹھ کر رویا کرو، اپنے گناہوں کو یاد کر کر کے رویا کرو اوراس سے مانگا کرو، کہ اے اللہ! میں گنہ گار بندہ ہوں، مجھے معاف فرما، جب یہاں روئے گا، وہاں اس کی آنکھ محفوظ ہوگی، یہاں سوتا پڑا رہا، عیش کرتا رہا، اللہ اس کو کبھی یادنہیں آیا، گناہوں کی گندگی میں زندگی کوملوث کرتا رہا، ایک آنسو اللہ کے لئے کبھی نہیں بہایا، یوں ہی اس کی زندگی ہوگئی، قیامت کے میدان میں جاکر "کل عین باکیة" (ہرآنکھ روتی رہے گی) اس کو بھی روتے رہنا ہوگا، اور یادرکھو! یہاں کا رونا ختم ہوجائے گا، قیامت کا رونا کبھی ختم نہ ہوگا، جیسے جہنم کبھی ختم نہ ہوگی، وہاں کی تکلیفیں بھی ختم نہ ہوں گی، اس لئے اس سے پہلے کہ وہ دن آئے، دنیا میں کچھ رولیا کرو، کبھی اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈے دل سے غور کرلیا کرو، اورساتھ ساتھ سوچو کہ ہم نے کیا کیا گناہ کئے، اللہ کے سامنے کیا منھ لیکر ہم جائیں گے، پھر جو آنسو نکلے گا وہ دل کوصاف کردے گا، وہ دل کو پاک کردے گا۔

اللہ کو رونا بہت پسند ہے، ایک واقعہ

فرمایا: ایک بزرگ تھے، جو بہت مقروض تھے، جب قرض خواہوں کا مطالبہ زیادہ ہونے لگا، تو ایک دن تمام قرض خواہوں کو بلایا کہ فلاں دن آجانا، قرض ادا کردوں گا، تو سب جمع ہو گئے، انتظار کرتے رہے، مگر ان کے پاس کچھ تھا ہی نہیں، کیا دیتے، لوگوں سے کہہ دیا کہ بیٹھ جاؤ، اللہ دیگا تو دیدوں گا۔

لوگ ٹھان کر آئے تھے کہ آج تو لیکر ہی جانا ہے، اس سے پہلے ٹلنا نہیں ہے، لہذا سب انتظار میں بیٹھ گئے، کچھ دیر بعد ایک بچہ مٹھائی بیچتا ہوا وہاں سے گزرا،

توان بزرگ نے اپنے خادم سے کہا کہ دیکھو کیا آواز ہے؟ خادم نے بتایا کہ ایک لڑکا مٹھائی حلوا بیچ رہا ہے اور آواز لگاتا جارہا ہے، ان بزرگ نے کہا کہ بھائی! اس کو بلاؤ، اور ان مہمانوں کو حلوا لیکر کھلاؤ، چناں چہ اسے بلایا اور ساری مٹھائی خرید کر سب کو کھلا دی، جب سب لوگ کھا چکے تو اس بچہ نے مٹھائی کی رقم مانگی، وہ بزرگ کہنے لگے کہ اگر پیسے ہوتے تو یہ سب کیوں بیٹھے ہوتے؟ تو بھی ان کے ساتھ بیٹھ جا، جب اللہ دینگے تو دے دوں گا، اس پر وہ خوب رونے لگا، اور چیخ چیخ کر رونے لگا، پوچھا کہ کیوں روتا ہے؟ کہا کہ میری ماں مارے گی، اگر میں اس مٹھائی کی رقم نہ لیجاؤں، اسی درمیاں میں کچھ دیر بعد اللہ نے رقم کا انتظام فرما دیا، ایک صاحب نے ان بزرگ کے دروازے پر دستک دی، اور ایک تھیلی میں اشرفیاں لاکر حضرت کی خدمت میں پیش کردیں، بزرگ نے خادم کو گننے کا حکم دیا کہ دیکھیں کتنی ہیں؟ جب گنی گئیں تو وہ اشرفیاں اتنی تھیں کہ قرض خواہوں کے قرض اور مٹھائی کی قیمت کے لئے کافی ہوگئیں، اور اس سے قرض بھی ادا کردیا گیا، اور اس مٹھائی والے بچہ کو اس کی قیمت بھی دیدی گئی، سب چلے گئے، اس کے بعد یہ بزرگ اللہ تعالی سے کہنے لگے کہ اے اللہ! تو نے انتظام تو کردیا، مگر رسوا کر کے دیا، جلدی نہیں دیا، اس کی کیا حکمت ہے؟ اللہ کی طرف سے الہام ہوا کہ ہماری طرف سے تاخیر اس لئے ہوئی کہ یہاں مانگنے والے تو سب تھے، مگر ان میں کوئی رونے والا نہیں تھا، جب ایک بچہ رونے والا آگیا تو میں نے دے دیا۔

معلوم ہوا کہ اللہ کو رونا بہت پسند ہے، اس لئے اس کی جناب عالی میں رونے اور گریہ وزاری کی عادت ڈالنا چاہئے۔

آنکھ کو حرام لذت سے بچاؤ

بعض رویات میں ہے ”کُلُّ عَیۡنٍ بَاکِیَۃٌ“ ہر آنکھ قیامت کے دن روتی

رہے گی، سب پریشان حال خوف کے مارے روتے ہوں گے، لیکن تین آنکھیں اس دن رونے سے محفوظ رہیں گی، ایک وہ جو اللہ کے ڈر اور خوف کی وجہ سے روتی ہو ،دوسری وہ جو اللہ کے راستہ کی حفاظت کی خاطر جاگنے والی ہو، وہ قیامت میں محفوظ رہے گی ، تیسرے ''**عین کفت عن محارم الله**' وہ آنکھ جو اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے اپنے آپ کو بچائے ، یہ وہ آنکھیں ہیں کہ قیامت کے دن سب آنکھیں دہشت و وحشت کے مارے روتی ہوں گی ، مگر یہ تین قسم کی آنکھیں خوشی کے آنسوں بہائیں گی۔

اس حدیث میں جو تیسری آنکھ کا ذکر ہے، اس پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے، وہ کیا؟ اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے پرہیز کرنے والی آنکھ، وہ آنکھ جو اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے رک جائے ، وہ آنکھ یہ سوچتی ہے کہ میں ایک غیر محرم کو دیکھ سکتی ہوں یا نہیں؟ ایک لڑکی کو میں دیکھ سکتی ہوں یا نہیں ؟ اس پوسٹر کو دیکھ سکتی ہوں یا نہیں ؟ انٹرنیٹ کے اندر ہزاروں خرافات ہوتے ہیں، اس کو میں دیکھ سکتی ہوں یا نہیں؟ اور اگر یہ دیکھنے کے لائق نہیں ہیں، تو وہ اللہ کے ڈر اور خوف سے اس کو لات ماردیتی ہے، ایسا آدمی اپنی آنکھ کو بند کر لیتا ہے، اگر چہ دل اندر سے مجبور کرتا ہے، لیکن وہ کہتا ہے کہ جس سے میرا خدا ناراض ہو، میں وہاں آنکھ نہیں اٹھاتا میں یہاں اندھا بن جاؤں گا ، ایسی کوئی چیز نہیں دیکھوں گا اور حرام لذات کو اختیار نہیں کروں گا ، میں کہتا ہوں کہ آج کے دور کا بڑا گناہ اور عام گناہ بدنظری کا گناہ ہے، یہ بہت سارے گناہوں کا ذریعہ بنتا ہے، وہ مومن کامیاب ہے، جو چلتا ہے، گھومتا ہے، مگر اس کی آنکھیں اور دل کسی سے ٹکراتے نہیں، جیسے کوئی کار ڈرائیور باوجود یہ کہ راستہ میں بہت ساری گاڑیاں چلتی ہیں، پھر بھی بچتے بچاتے چلاتا ہے، یہ کامیاب ڈرائیور ہے۔

حضرت مرشدی مولانا ابرار الحق صاحبؒ ایک مرتبہ بنگلور تشریف لائے اور جامعہ مسیح العلوم، بیدواڑی میں حضرت والا کی مجالس بعد عصر ہوا کرتی تھیں، ایک دن بیان کے بعد کار میں بیٹھ کر قیام گاہ روانہ ہوئے اور میں بھی کار میں بیٹھا تھا، اور راستوں پر خوب ٹرافک تھی، اور حضرت کے ڈرائیور کار کو کبھی ادھر کبھی اُدھر گھماتے تاکہ اور گاڑیوں سے ٹکرا نہ جائے، اس کو دیکھکر حضرت نے ارشاد فرمایا کہ: دیکھو تقوی اسی کو کہتے ہیں کہ اپنے آپ کو ہر خطرہ سے بچاتے ہوئے چلے، جیسے ڈرائیور صاحب کار کو خطرات سے بچاتے ہوئے چلا رہے ہیں، پھر فرمایا کہ وہی ڈرائیور کامیاب ہے جو کسی کو ٹکر نہ لگائے اور خود بھی کسی کی ٹکر نہ کھائے، اسی طرح جو نگاہ اس دنیا میں شریعت کے راستہ پر اس طرح چلے کہ کسی ناجائز چیز سے ٹکر نہ لے اور گناہ کا ارتکاب نہ کرے وہ کامیاب ہے۔

بھائیو! یہ بڑی عمدہ مثال ہے اس کو ذہن نشین کرلو، اور سمجھو کہ جس نے اپنی نگاہوں کی حفاظت کرلی، وہ کامیاب ہے، ایک حدیث میں آپ نے فرمایا:

النظر سهم من سهام ابليس مسموم. (حاکم: ۴/ ۳۴۹)

نظر شیطان کا زہریلا تیر ہے، جو نظر کی حفاظت کرتا ہے، تو عبادت میں حلاوت آتی ہے، الادب المفرد میں امام بخاریؒ نے لکھا ہے کہ فضول نظر سے بھی بچنا چاہئے، میں کہتا ہوں جب فضول نظر سے بھی بچنا چاہئے تو نظر بد سے بچنا بدرجہ اولی ضروری ہے۔

نوجوانو! اگر تم کو قیامت میں ہنسنا ہے اور رونا نہیں ہے تو اپنی آنکھوں کو حرام لذتوں سے بچاؤ، اور اس سے اندھے بن جاؤ۔

سید احمد شہید بریلویؒ کا ایک واقعہ

میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں جو عبرت انگیز ہے، اور یہ واقعہ میں نے حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک وعظ میں سنا ہے، اور یہ واقعہ ہے حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کا، حضرت سید احمد شہید بریلویؒ ہندوستان کے ایک مشہور بزرگ اور بڑے اللہ والے تھے، اور انہوں نے ہندوستان کے اندر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے فتوی پر جہاد کی مہم کا آغاز کیا تھا، انہی جہادی مہموں کا نتیجہ ہے کہ آگے چل کر یہ ملک آزاد ہوا، اور اگرچہ بظاہر یہ تحریکات ناکام ہوئیں، مگر در حقیقت بعد کی تمام تحریکات کے لئے یہی تحریکات پیش خیمہ تھیں، انگریزوں کے یہاں سے بھاگنے کا ذریعہ ان ہی علماء کرام کا طفیل ہے، بعض جاہل کہتے ہیں کہ صوفیاء نے جہاد نہیں کیا، حضرت سید احمد شہید بریلویؒ مایۂ ناز صوفی ہونے کے ساتھ مایۂ ناز مجاہد بھی تھے، انھوں نے سب سے پہلے آزادی کی جنگ لڑی ہے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے فرمان پر وہ کئی جہادی مہموں پر گئے، بلکہ وہی سپہ سالار بھی تھے اور اسی میں ان کی شہادت واقع ہوئی، بعض جاہلوں نے صوفیاء کرام کے بارے میں یہ بات پھیلا رکھی ہے کہ صوفیاء صرف تسبیح گھونٹتے رہتے ہیں، دیکھو اگر تمہاری آنکھ ہو اور اگر تمہارے پاس دل و دماغ صحیح موجود ہو تو صوفیاء کرام کے کارناموں کو دیکھو، اور یہ کتنا بڑا صوفی ہے، جن کا نام سید احمد شہید بریلویؒ ہے، جو سب سے پہلے جہاد کی مہم کا آغاز کرنے والا تھا۔

الغرض سید احمد شہیدؒ ایک جہاد کی مہم پر گئے، پنجاب کا علاقہ تھا، وہاں پر پنجابی عورتیں باہر آتی اور جاتی تھیں، گھومنے اور پھرنے آتی تھیں، بازاروں میں بھی آتی جاتی تھیں، ایسے علاقہ میں حضرت کا اور تمام مجاہدین کا قیام تھا، ایک دن ایک پنجابی آدمی

حضرت کی خدمت میں آیا اور کہا کہ مولانا! میں ایک بات پوچھنے آیا ہوں کہ آپ ان اندھوں کولیکر یہاں کیوں آئے ہیں؟ اور کیا بستی کے لوگوں میں آپ کو کوئی صحت مند لوگ نہیں ملے کہ آپ اندھوں کو لے کر آ گئے؟ آپ تو کچھ دیکھتے ہوئے نظر آتے ہیں، مگر اتنے سارے یہ اندھے جو کچھ دیکھتے ہی نہیں، ان کا کیا کام ہے؟ حضرت نے کہا کہ میرے پاس تو کوئی اندھا نہیں ہے، سب آنکھ والے ہیں، اچھی طرح دیکھتے ہیں، پھر پوچھا کہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ یہ سب اندھے ہیں؟ اس نے کہا: میں ان سب کو اندھا اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں دیکھتا ہوں کہ ہماری عورتیں یہاں آتی اور جاتی ہیں، بازاروں میں بھی گھومتی پھرتی ہیں، حسین وجمیل ہیں، لیکن آپ کے ساتھیوں میں کا کوئی ایک آدمی بھی کسی عورت پر نگاہ نہیں ڈالتا، ان کو آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا، اس سے میں نے سمجھا کہ یہ سب اندھے ہوں گے، حسن وجمال کا کیا نظارہ کریں گے، حضرت سید احمد شہیدؒ نے فرمایا کہ بھائی! تم نے صحیح دیکھا، اس لئے کہ ہمارا کوئی آدمی کسی عورت کو نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتا، اس لئے کہ ہمارے قران کا حکم ہے:

"قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ"

ترجمہ: اے نبی! آپ مومنوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچا رکھا کریں۔

یہ عفت اور پاکدامنی کا تقاضا ہے، ہمارے یہ مجاہدین کسی عورت پر نگاہ نہیں ڈالتے، وہ شخص کہنے لگا کہ میں نے تو ان کو اندھا سمجھ لیا تھا، دراصل میں ہی اندھا تھا اور آج آپ نے مجھے بینا بنا دیا۔

حضرات! جو قران نہ پڑھتا ہو وہ سب سے بڑا اندھا ہے، جو حدیث نہ پڑھتا ہو وہ سب سے بڑا اندھا ہے، یہ اندھے نہیں ہیں، جو نیچے دیکھ رہے ہیں، وہ تو اللہ کے حکم کو دیکھ رہے ہیں۔

غرض یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین قسم کی آنکھ قیامت کے دن رونے سے محفوظ رہے گی، اللہ کے ڈر سے رونے والی آنکھ، اور اللہ کے راستے میں جاگنے والی آنکھ اور تیسرے ''کفت عن محارم الله'' وہ آنکھ جو اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے اپنے آپ کو بچائے۔

اصل حسن یہ ہے-ایک واقعہ

ایک مرید خانقاہ میں تھا، اسے کھانا پہنچانے ایک لڑکی مقرر کی گئی تھی، جب جب بھی وہ لڑکی کھانا دینے کے لئے آتی، تو وہ مرید اس لڑکی پر نظر بد ڈالتا تھا اور اس کو گھور گھور کر دیکھنے لگتا، شیخ کو معلوم ہوا تو انہوں نے اس لڑکی کو دست آور گولیاں دیں، جس کی وجہ سے اس کو دست شروع ہو گئے اور شیخ نے اس کی غلاظت ایک جگہ کسی چیز میں جمع کرنے کا حکم دیا، ان کے خدام اس کی غلاظت کو جمع کرتے رہے، دستوں کی وجہ سے وہ لڑکی نہایت ضعیف ونحیف ہوگئی، اس کی طبیعت نڈھال ہوگئی، چہرہ پھیکا پڑ گیا اور مرجھا گیا، اب شیخ نے اس لڑکی کو اس مرید کے سامنے بلایا، مگر اب وہ مرید اسے دیکھتا ہی نہیں، اس کی طرف کوئی التفات ہی نہیں، شیخ نے اپنے خدام سے فرمایا کہ وہ جمع شدہ غلاظت اُٹھا کر لاؤ، جب وہ لائی گئی تو شیخ نے اس مرید سے کہا کہ تم درحقیقت اس لڑکی پر اور اس کے حسن پر فریفتہ نہیں تھے، بلکہ اس کے اندر کی غلاظت پر فریفتہ تھے، اس لئے جب تک یہ غلاظت اس کے اندر تھی، تم اس کو گھور گھور کر دیکھتے رہے اور جب وہ باہر نکل گئی تو اب دیکھنے کو تیار نہیں ہو۔

واقعی عجیب طرح دنیا کی مادی و فانی محبتوں کا علاج کیا ہے، اگر یہ نسخہ یاد ہو گیا تو پھر کبھی بھی انسان دنیا کی ان فانی محبتوں کے پیچھے نہیں جائے گا۔

ایک حیرت ناک واقعہ

بزرگانِ محترم! یہ آنکھوں کے آنسوں بڑے قیمتی ہوتے ہیں، اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی آنکھ پر جہنم حرام ہوجاتی ہے، اوراس کے آنسوں جہنم کی آگ کو بھی بجھادیتے ہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے زمانہ میں ایک عجیب قصہ پیش آیا، وہ یہ کہ لکھنو کا رہنے والا ایک آدمی تھا، کام دھام نہ ملنے کی وجہ سے پریشان تھا، ایک دفعہ اسے کسی نے مشورہ دیا کہ تو کسی اور شہراور علاقہ میں چلا جا، ہوسکتا ہے کہ وہاں کچھ کام لگ جائے، وہ آدمی ایک سواری پرسوار ہوکر دوسری بستی کے لئے نکلا، راستہ میں ایک بستی پر سے گذر رہوا، اور بھوک تیز لگ رہی تھی، وہاں اُترا اور کچھ کھایا پیا اور آگے بڑھ گیا، ایک دوسرے مقام پر جانا تھا، وہاں گیا اور خوب کمایا، اس کی لڑکی کی شادی طے ہوگئی، اس نے کہا: اب شادی کرنے جانا ہے، روپئے پیسے جمع کر کے تھیلی باندھ کر، سوار ہوکر، پھر واپس آرہا تھا کہ راستہ میں ایک جگہ پر کھانے پینے کی ضرورت پڑ گئی، وہاں پر اُترا تو لوگوں نے بتایا کہ یہاں پر ایک شخص کا انتقال ہوگیا ہے، اس لئے جنازہ میں شریک ہوجاؤ، تو وہ شخص جنازہ میں شریک ہوگیا اور وہ خود تدفین میں شریک رہا، فراغت کے بعد جب وہاں سے نکلنا چاہا، تو دیکھتا ہے کہ پیسوں کی تھیلی غائب، جس میں ہزاروں روپئے موجود تھے اور وہ اسی رقم سے اپنی بچی کی شادی کرنا چاہتا تھا، وہ سوچنے لگا کہ پیسے غائب ہو گئے ہیں، تو اپنے گاؤں جا کر کیا کروں گا، لوگ تھوتھو کریں گے، برا بھلا کہیں گے، اتنے سال غائب رہا، اب بچی کی شادی کا نمبر آیا، اب بھی کچھ لیکر نہیں آیا، گھر والوں کو کیا جواب دوں گا؟ پریشان ہوکر بیٹھا تھا کہ ایک آدمی نے اس سے پوچھا کہ کیا ہوا؟ اس نے کہا میری

تھیلی غائب ہوگئی ہے، پوچھا کیسے غائب ہوئی؟ اس نے کہا میں یہاں آیا ہوا تھا اور اس آدمی کی تدفین میں شریک رہا، جب باہر آ کر دیکھتا ہوں تو یہ حال اور نوبت کہ پیسے غائب ہیں، اس نے کہا ہوسکتا ہے کہ کہیں قبر میں گر گئے ہوں، ذرا قبر کھود کر دیکھ لو۔ اس نے کہا ٹھیک ہے، اب یہ آدمی قبر کھودنے لگا، ابھی ذرا سی کھودا تھی کہ کیا دیکھتا ہے کہ اس کے اندر سے آگ کی لپٹیں آرہی ہیں، اور اس کی وجہ سے اس کے ہاتھ بھی جل گئے۔

اور وہ چیخیں مارتا ہوا بھاگا اور قبر سے باہر آیا، اور جو باہر آیا تو دیکھا کہ سب کچھ بدلا ہوا ہے، پورا ماحول بدلا ہوا ہے، نہ وہاں بازار ہے، نہ ویسی دکانیں ہیں، لوگ جیسے پہلے وہاں پہچان کے تھے، ویسا کوئی آدمی وہاں پر نظر نہیں آتا، بڑا عظیم الشان شہر وہاں پر آباد ہوگیا ہے، جبکہ اتنا بڑا وہاں کوئی شہر نہیں تھا، پہلے وہاں ایک گاؤں قریہ کی طرح تھا، اور چند دکانیں تھی، اب وہ گاؤں کہاں گیا؟ وہ پرانی آبادی کہاں گئی؟ یہاں تو پورا ماحول بدلا ہوا ہے، لوگوں سے اپنے وطن کے بارے میں پوچھا کہ فلاں نام کی بستی کو جانتے ہو، لوگ کہنے لگے وہ بستی اس وقت دنیا میں نہیں ہے، ہم سنتے تھے کہ کوئی بہت پرانی بستی تھی، لیکن اب نہیں ہے، یہ آدمی کہنے لگا یہ تبدیلی کیسے ہوگئی، ابھی دس پانچ منٹ پہلے کی تو بات ہے کہ میں یہاں تھا اور جانے کے لئے نکلا تھا، لوگوں نے کہا تم بے وقوف آدمی ہو، تھوڑی دیر کی بات کیسے ہوسکتی ہے، ہم اپنے باپ دادا سے سنا کرتے تھے کہ کسی زمانہ میں اس نام کی بستی تھی، لوگوں نے کہا کہ اب وہ بستی تو ہے نہیں، خیر اس نے کھانے کے لئے جو اپنے پاس تھوڑی بہت رقم تھی وہ نکالکر دکان میں دی کہ اس سے سالن روٹی دیدو، دکاندار نے کہا بھائی! یہ پیسہ آپ کونسے زمانہ کا اُٹھا کر لائے ہیں، یہ تو تین چار سو سال پہلے کے معلوم ہوتے

ہیں، اس نے کہا کہ تین چار سو سال کے کیسے ہو گئے؟ ابھی کچھ ہی دیر کی تو بات ہے، دکاندار نے کہا کہ اب یہ پیسے چلنے کے نہیں، حکومتیں بدل گئی ہیں، اور سب کچھ بدل گیا ہے، ایک طرف تو یہ حال، دوسری طرف قبر کی آگ کی تپش کی وجہ سے ہاتھ میں جلن اور درد و تکلیف محسوس ہو رہی تھی، جو وہاں پر ڈاکٹر وغیرہ تھے، ان سے اس کا علاج کرایا، لیکن تکلیف بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے، یہاں تک کہ بعض لوگوں نے اس کو مشورہ دیا کہ اس زمانہ میں تمہاری بستی نہیں ہے اور یہ کہ تم وہاں جاؤ تو کوئی فائدہ نہیں، اس لئے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان میں بہت بڑے عالم و محدث ہیں، جن کا نام حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ ہے، ان کی خدمت میں چلے جاؤ، ان کی خدمت میں تمہارا پورا واقعہ سناؤ، ہوسکتا ہے کہ وہ تم کو کوئی مشورہ دیں، لوگوں نے اس کو کچھ رقم دی اور اس کو دہلی کا راستہ بتا دیا، اب وہ دہلی پہنچ کر سیدھے حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ زمانہ حضرت شاہ صاحب کا بہت ہی عروج کا زمانہ تھا، ان کی عظمت کا سکہ سارے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا، ہر جگہ ان کو جاننے والے لوگ تھے اور ان کی فنِ حدیث میں بصیرت و مہارت ساری دنیا میں مشہور تھی، وہ شاہ صاحب سے ملا، اور کہا کہ میرے ساتھ ایسا ایک واقعہ پیش آیا اور میری تکلیف انتہائی شدید ہوگئی ہے، مجھے اس کا علاج بھی بتائیے اور یہ راز بھی بتائیے کہ یہ میرے ساتھ کیا واقعہ ہوا، شاہ صاحب نے اس کی گفتگو پوری تفصیل کے ساتھ سنی، پھر کہا کہ تمہاری بات سچی ہے، اس لئے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آخرت اور دنیا کے زمانہ میں بڑا فرق ہے کہ وہاں ذرا سی دیر تم جا کے آئے اور یہاں سالہا سال گذر گئے، چنانچہ حدیث میں اللہ کے نبیصلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو نیک بندہ قبر میں چلا جاتا ہے، اسے قیامت تک کا زمانہ صرف اتنا معلوم ہوگا، جیسے ظہر سے عصر تک کا زمانہ، ظہر

سے عصر تک کا زمانہ دو تین گھنٹے کا ہوتا ہے، قبر میں جانے کے بعد نیک آدمی جب قیامت میں اٹھے گا تو وہ کہے گا کہ الحمد للہ ! میں ظہر میں سویا تھا ،عصر میں اٹھ رہا ہوں، مگر یہاں دنیا میں نہ معلوم کتنی صدیاں گزر جائیں گی۔

یہ راز اللہ والے جانتے ہیں، دنیا والے نہیں جانتے، یہ وہ علوم ہے جو صرف انبیاء کے ذریعہ آتے ہیں، کوئی سائنسدان نہیں بتا سکتا، سائنسدانوں کا علم اوران کی عقل اس دنیا کی سطح پر گھومتی ہے، اور یہ علوم دینے والے حضرات انبیاء ہوتے ہیں، یاان کی وراثت پانے والے علماء کرام ہوتے ہیں۔

بہر حال شاہ صاحبؒ نے کہا کہ تمہاری بات سچی ہے، تم چونکہ قبر میں اُترے تھے، جو تم نے دیکھا تھا، وہ قبر اور دوسرے عالم سے تعلق رکھنے والی چیز تھی، جو ذرا سا لمحہ وہاں گذر گیا، تو یہاں زمانہ بدل گیا، حکومتیں بدل گئیں، خاندان تباہ ہو گئے اور معلوم نہیں کہ تمہارے خاندان کا کیا حال ہوا ہوگا؟ اب رہا یہ کہ تمہارا ہاتھ جل گیا، یہ دنیا کی آگ سے نہیں جلا ہے بلکہ یہ دوزخ کی آگ سے جلا ہے، قبر کی آگ دوزخ کی آگ ہے، دنیا کی آگ نہیں ہے، اگر دنیا کی آگ ہوتی تو ڈاکٹر کا علاج کافی ہوسکتا تھا، جہنم کی آگ کے لئے ڈاکٹر کا علاج کافی نہیں، دنیا کی آگ سے جل جائے تو ڈاکٹروں سے علاج کراتے ہیں، مگر یہ تو جہنم کی آگ ہے جس کا کوئی ڈاکٹر علاج نہیں کرسکتا، اس کا ایک ہی ایک علاج میرے ذہن میں ہے اور وہ یہ کہ تم جاؤ کسی مسجد کے کونے میں بیٹھو اور اپنے گناہوں کو یاد کر کے رویا کرو اور جو آنسوں نکلیں ،اس کو تکلیف کی جگہ پر لگایا کرو، یہی ایک چیز دوزخ کی آگ کو بجھا دینے والی یعنی اپنے گناہوں پر یاد کر کے رونا ، اللہ کے ڈر سے رونا ،فرمایا جو آدمی اللہ کے ڈر سے اپنے گناہوں کو یاد کر کے روتا ہے، دوزخ کی آگ کو اس سے بجھایا

جاسکتا ہے، اس لئے اب اس کا ایک ہی علاج ہے کہ تم یاد کرو اپنے گناہوں کو اور روتے رہا کرو۔

بھائیو! یہ واقعہ بڑا عجیب وغریب واقعہ ہے، ہمارے لئے عبرت کا سامان ہے، اللہ کے سامنے روؤاور گڑگڑاؤ، جو آنکھ روتی ہے، جہنم اس پر حرام ہے، جو آنکھ کہ اپنے گناہوں پر اللہ کے خوف میں روتی ہے، وہ ضرور جنت میں داخل ہوگی اور جب خود جنت میں جائے گی تو پورے جسم کو لے کر جائے گی، تنہا آنکھ تو جانے کی نہیں۔

کبھی کبھی قبر کے احوال کھل جاتے ہیں

اللہ تعالیٰ بعض مرتبہ اس دنیا کے اندر برزخ کے حالات کو ظاہر کر دیتا ہے، لوگ کہتے ہیں کہ قبر میں کیا ہوتا ہے؟ اور بعض جاہل کہتے ہیں کہ ہم نے بعض قبروں کو کھود کر دیکھا مگر کچھ نہ نکلا۔ لیکن بھائیو! جب اللہ دکھانا چاہتا ہے، تب ہی ہم دیکھ سکتے ہیں، جب اللہ دکھانا نہیں چاہتا، آپ لاکھ کوشش کریں، نہیں دکھائی دے گا، کیونکہ ان چیزوں کا دکھانا اور نا دکھانا یہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ مگر ہم کو اللہ نہ دکھائے تو اس کا انکار کرنا درست نہیں، کیونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن سے زیادہ روئے زمین پر سچا کوئی نہیں، اور نہ آئندہ کوئی ان سے زیادہ سچا انسان ہوسکتا ہے، انھوں نے ہم کو خبر دی کہ قبر میں حالات پیش آتے ہیں، اچھے بھی اور برے بھی، عذاب قبر بھی ہوتا ہے، ثواب قبر بھی ہوتا ہے، اچھوں کے لئے اچھے معاملات ہوتے ہیں، بروں کے لئے برے معاملات ہوتے ہیں، جب نبی اکرم ﷺ جیسے سچے انسان نے سچی روایات میں، صحیح احادیث میں ہم کو بتا دیا ہے، تو اس پر یقین کرنا ہمارا فرض ہے اور صرف اس بات پر ان باتوں کا جھٹلانا کہ ہم کو نظر نہیں آتا ہے، خلاف عقل ہے۔ آپ کیا کیا جھٹلائیں گے، اگر آپ کو نظر نہیں آتا

ہے؟ خدا بھی تو نظر نہیں آتا، کیا خدا کو بھی جھٹلاؤ گے؟ جنت بھی تو نظر نہیں آتی، کیا جنت کا بھی انکار کرو گے؟ دوزخ بھی نظر نہیں آتی، کیا دوزخ کو بھی جھٹلاؤ گے؟ فرشتے بھی نظر نہیں آتے، کیا ان کا بھی انکار کرو گے؟ نہ معلوم کیا کیا چیزیں ہیں جو ہم کو نظر نہیں آتی؟ لیکن ان سب کو ماننا اس لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث صحیحہ اس سلسلہ میں مروی ہیں، تو بہر حال عذاب قبر ہوتا ہے۔

عذابِ قبر کا ثبوت

حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم گذر رہے تھے، دو قبریں تھی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان دو قبر والوں پر عذاب قبر ہو رہا ہے، ایک پر اس لئے کہ وہ پیشاب کے قطروں اور چھینٹوں سے حفاظت نہیں کرتا تھا، اور دوسرے پر اس لئے کہ وہ چغلی کھایا کرتا تھا۔ (بخاری:۲۰۹، مسلم:۳۴۹)

آج لوگ کھڑے کھڑے پیشاب کر دیتے ہیں، فیشن بن گیا ہے، حفاظت نہیں کرتے، پاکی صفائی کا اہتمام نہیں کرتے، اسلام کے اندر سب سے اہم پاکی اور صفائی ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"الطهور شطر الايمان"

پاکی آدھا ایمان ہے۔ (مسلم:۳۲۸، ترمذی:۳۴۳۹)

اور باقی آدھا ایمان دوسری چیزوں میں رکھا ہے، آپ پاک وصاف نہیں تو نماز نہیں پڑھ سکتے، آپ پاک وصاف نہیں تو خدا سے تعلق نہیں پیدا کر سکتے، اللہ سے تعلق کے لئے سب سے پہلے پاکی اور صفائی کی ضرورت ہے۔

کسی بھی نیکی کو حقیر نہ جانو

بھائیو! کسی بھی نیکی کو حقیر نہ سمجھو، حدیث میں ہے: **كل معروف صدقة**
کہ ہر نیکی صدقہ ہے۔ (بخاری:۵۵۶۲،ترمذی:۱۸۹۳)

اللہ کے نبی ﷺ نے یہ قید نہیں لگائی ہے کہ نیکی بڑی ہو تو صدقہ ہے، اونچی ہو تو صدقہ ہے، اس کی قید اللہ کے نبی ﷺ نے نہیں لگائی، کیونکہ کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی نیکی بھی کام آجاتی ہے اور جنت کا ذریعہ بنجاتی ہے، اور ایک حدیث میں ہے:

لا تحقرن من المعروف شياً، ولو أن تلقى أخاك بوجه طليق

کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے، اور وہ بھی ''نون تاکید'' کے ساتھ فرمایا کہ تم کسی بھی نیکی کو ہرگز حقیر نہ سمجھو، اگر چہ وہ یہی ہو کہ تم اپنے بھائی سے ہنس مکھ چہرے سے ملاقات کرو۔ (مسلم:۴۷۶۰،ترمذی:۱۷۵۶)

دیکھا کہ اللہ کے نبی ﷺ اس کو بھی حقیر نہ جاننے کا حکم دے رہے ہیں کہ کسی اپنے بھائی سے خوش دلی سے مل لیا جائے، اسکی کیا وجہ ہے؟ دراصل بات یہ ہے کہ آدمی عموماً چھوٹی نیکیوں کو نظر انداز کر دیتا ہے اور چھوٹی سمجھ کر اسکو ترک کر دیتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی ایک نیکی کو چھوٹی سمجھ کر چھوڑ دیتا ہے، آگے چل کر وہ بڑی بڑی نیکیوں سے غفلت برتنے لگتا ہے، واجبات میں کوتاہی ہو جاتی ہے، سنتوں کو ترک کر دیتا ہے، فرائض میں بے توجہی ہوتی ہے، ماں باپ کے حقوق صحیح طرح سے ادا نہیں کرتا ہے، ان کی خدمت سے اعراض کرتا ہے، غرض یہ کہ وہ کئی بڑی بڑی عبادتوں اور نیکیوں سے غفلت برتنے لگتا ہے، اس کی نوبت اس لئے پیش آئی، کیوں کہ وہ چھوٹی چھوٹی نیکیوں کو چھوڑتا چلا گیا، ان کو حقیر و ناقص سمجھ کر، انکو کمتر اور گھٹیا سمجھ کر، حالانکہ بعض اوقات بڑی بڑی عبادتوں کو وہ درجہ نہیں ملتا، جو چھوٹی چھوٹی

عبادتیں پالیتی ہیں ، کیونکہ چھوٹی عبادات میں اخلاص ہوتا ہے اور بڑی میں اخلاص نہیں ہوتا ، اور یہ بھی کیا معلوم کہ اللہ کو کب ، کہاں ، کونسی عبادت پسند آجائے اور اس کی بنا پر اس کی مغفرت ہوجائے۔

تہجد کے دو رکعت ہی کام آئے

ایک مرتبہ کسی بزرگ نے اپنے خواب میں حضرت جنید بغدادی کو دیکھا اور انہوں نے ان سے پوچھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا ؟ حضرت جنید بغدادی نے فرمایا کہ مجھے اللہ کے دربار میں پیش کیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: جاؤ ہم نے تمہاری مغفرت کردی ، پوچھنے والے نے دریافت کیا کہ آپ کی بخشش کس بنیاد پر ہوئی ؟ جنید بغدادی نے فرمایا کہ:

طاحت تلک الاشارات، وغابت تلک العبارات،
وفنيت تلک العلوم، و نفدت تلک الرسوم ، و ما
نفعنا الا رکیعات کنا نرکعها بالاسحار.

(صفوۃالصفوۃ: ۲/۴۲۴،حلیۃ الاولیاء: ۱۰/۲۵۰)

کہ ساری کی ساری عبارتیں ختم ہوگئیں، وہ رموز ونکات ضائع ہوگئے، وہ علوم فنا کے گھاٹ اتر گئے ،بس ہمارے حق میں سودمند ثابت ہوئیں تو وہ الٹی پلٹی ، ٹیڑھی میڑھی، غلط سلط ، دو رکعتیں ثابت ہویں جو ہم راتوں میں اُٹھکر پڑھ لیتے تھے۔

دیکھو ! جنید بغدادی جنہوں نے احادیث کو سمجھا اور اس پر عمل کیا، جنہوں نے قرآن وحدیث کو سمجھا اور اس پر عمل کیا، نکات کو واضح کیا ، جو سید الاولیاء کا لقب پانے والے بزرگ ہیں، جنہوں نے اللہ کی خاطر ساری دنیا سے بغض وعداوت مول

لی، جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا، جنہوں نے اللہ کی محبت کی طلب میں رات دن عبادتوں پر عبادتیں کیں، وہ بزرگ کہتے ہیں کہ نہ وہ فرائض و واجبات کام آئے، نہ وہ رموز و اسرار کام آئے، نہ وہ تصوف و سلوک کے حقائق و معارف کام آئے، کام آئے تو وہ دو رکعت نفل جو رات میں اٹھ کر پڑھے تھے وہ کام آئے، اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کبھی کبھی چھوٹی نیکی میں بھی جنت رکھ دیتا ہے، بندہ جب اسکو کرتا ہے، تو وہ اس جنت کو پالیتا ہے۔

عمل پر نہیں رحمت پر بھروسہ ہو

آدمی صرف نیکیوں پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائے، اللہ کی رحمت سے اپنے آپ کو الگ کر لے اور سمجھے کہ مجھے اللہ کی رحمت اور اس کے فضل کی کوئی ضرورت نہیں، یہ انتہائی نا معقول بات ہے، حدیث میں فرمایا: آپ ﷺ نے کہ کوئی بھی آدمی اپنی نیکیوں کے سبب جنت میں نہیں جائے گا، بلکہ اللہ کی رحمت سے ہی جنت میں جائے گا۔ (بخاری:۵۲۴۱، مسلم:۵۰۴۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس پر کہنے لگیں کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ بھی؟ فرمایا کہ ہاں میں بھی اللہ کی رحمت سے ہی جاوں گا، اس پر غور کرو کتنی بڑی بات خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں بھی اللہ کی رحمت سے جنت میں جاؤ ں گا، تو ہم اور آپ کس کھیت کی مولی ہیں، ہم کیسے اپنے اعمال پر بھروسہ کر سکتے ہیں، ہرگز نہیں کر سکتے، ہم ہر وقت، ہر آن، ہر گھڑی اللہ کے محتاج ہیں، اسکی رحمت کے بھکاری ہیں۔

ایک علمی نکتہ

یہاں ایک علمی نکتہ بھی سن لیجیئے، وہ یہ کہ قرآن کی بعض آیات سے پتہ چلتا

ہے کہ اللہ تعالیٰ جنت میں انسانوں کو عبادت و نیکیوں کی بنا پر بھیجتا ہے، مثلاً قرآن میں ہے:

اُدۡخُلُوۡا الۡجَنَّۃَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ۝ [النحل : ۳۲]

تم جنت میں داخل ہو جاؤ بسبب ان اعمال کے جو تم کیا کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخلہ اعمال کے سبب ہو رہا ہے، اور یہ حدیث کہہ رہی ہے کہ کوئی بھی اپنی نیکیوں سے جنت میں نہیں جائے گا، اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں دو چیزیں ہیں، ایک عمل کا سببِ جنت ہونا اور دوسرے عمل کا عوضِ جنت ہونا، پہلی بات ثابت ہے اور دوسری بات منفی، لہذا قرآن میں جو یہ کہا کہ عمل کے سبب جنت میں داخل ہو جاؤ، اس میں عمل کو سببِ جنت کہا گیا ہے، اور حدیث میں جو یہ فرمایا گیا کہ عمل سے جنت نہیں ملتی اس کا مطلب یہ ہے کہ عمل جنت کا عوض نہیں، لہذا دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے، کہ ایک بادشاہ نے اعلان کیا کہ ہمارے خدام میں سے جو شخص فلاں کام انجام دے گا، ہم اس کو ایک لاکھ روپیہ انعام دیں گے، اور ایک وزیر نے وہ کام کر دیا اور بادشاہ نے اس کو وہ مجوزہ انعام دیدیا، اس مثال میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ وزیر کو جو انعام ملا، وہ اس کے کام انجام دیدینے کے عوض میں ملا ہے، بلکہ یہ تو سراسر انعام ہے، عوض کہاں کا ہو گیا؟ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کو جو انعام ملا وہ اس کام کو انجام دینے کے سبب سے ملا، اسی طرح جنت ہماری نیکیوں کے عوض میں نہیں ملتی بلکہ وہ تو اللہ کا انعام ہے، جو ہمارے اعمال کے سبب سے ہمیں ملتی ہے۔

بنی اسرائیل کے ایک عابد کا واقعہ

حدیث میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک عابد رہا کرتا تھا، جو بڑی بڑی عبادتیں کرتا تھا، بہت بڑا زاہد تھا، جو ہمیشہ اللہ کی یاد میں مصروف رہتا تھا، پانچ سو برس تک اس نے عبادت کی، اور اللہ نے اس کے لئے ایک چشمہ پانی پینے کے لئے جاری فرمایا تھا اور روزانہ ایک انار کھانے کے لئے اس کو دیا جاتا تھا، جب اس کا انتقال ہوا اور اس کو اللہ کے دربار میں پیش کیا گیا، تو اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا کہ جاؤ ہم اپنی رحمت سے جنت میں داخل کرتے ہیں، اس پر اس نے کہا کہ یا اللہ! وہ جو میں نے پانچ سو برس عبادت کی تھی، وہ کیا ہوئی؟ اللہ نے دو فرشتوں سے کہا کہ میری نعمتوں کا اس کی عبادت سے حساب لگاؤ، فرشتوں نے حساب لگایا تو پانچ سو برس کی عبادت کے بدلے میں صرف ایک آنکھ کی نعمت آئی تو اللہ تعالی نے فرشتوں سے کہا کہ اس کو جہنم میں ڈالدو اس لئے کہ اس کے پاس جنت میں جانے کا کوئی سامان ہی نہیں ہے۔

جب اس کو جہنم میں ڈال دیا گیا تو وہ اللہ کو پکار کر کہنے لگا کہ اے اللہ! اپنی رحمت سے مجھے بخش دے، الغرض اس کو جہنم سے نکال کر لایا گیا اور اللہ نے اسے اپنی نعمتیں یاد دلائیں اور فرمایا کہ بتا اب میری رحمت سے تو جنت میں جائے گا یا اپنی عبادت سے؟ اللہ فرماتے ہیں کہ اے میرے بندے تو نے دنیا میں کتنے ہزار لوٹے پانی پئے ہوں گے، ان کا بدلہ کون دیگا؟ کیا اب بھی تم اپنے اعمال کے بدلے جنت میں جانا چاہتے ہو، وہ فوراً سجدہ میں گر جاتا ہے اور روتا ہوا کہتا ہے کہ اے اللہ! میں نادان تھا، اپنی نادانی کی وجہ سے غلطی کر بیٹھا، مجھے معاف فرما دیجئے، اللہ اس کو معاف

کر دیتے ہیں اور جنت میں داخل کر دیتے ہیں۔اب بتاؤ بھائی! کوئی اپنے اعمال پر اعتماد کرسکتا ہے؟ اللہ ہم پر اپنا فضل فرمائے۔

(حاکم:۴/۴۷۸،شعب الایمان:۴/۱۵۱)

عبداللہ ابن مبارک کی عاجزی

امام عبداللہ ابن مبارکؒ ایک مرتبہ مجلس میں بڑے بے چین تھے،مضطرب تھے، پوچھا گیا کہ حضرت کیا بات ہے، کیوں پریشان ہیں؟ تو فرمایا کہ میں نے آج ایک جرأت کا کام کرلیا ہے،جس کی وجہ سے افسوس ہورہا ہے،اور پریشانی ہورہی ہے کہ میں نے کتنی بڑی جرأت کی ہے،لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیا کام کر دیا ہے؟ تو فرمایا کہ آج میں نے اللہ سے دعاء کرتے ہوئے جنت مانگ لی ، میں کہاں اس کا حقدار ہوں کہ میں نے اس کی مانگ کی ہے۔

حضرت تھانوی کی عاجزی

حضرت تھانویؒ کہتے تھے کہ اے اللہ ! مجھ جیسا گنہ گار جنت نہیں مانگ سکتا،اتنی درخواست کرتا ہوں کہ جنتیوں کی جوتیوں میں جگہ عطاء فرما دے،اور فرماتے کہ یہ جنتیوں کی جوتیوں میں رکھنے کا سوال بھی اس لیے کرتا ہوں کہ دوزخ کو برداشت کرنے کی سکت نہیں ہے، ورنہ تو میں دوزخ کا حقدار تھا۔

یہ حضرات بھی عجیب تھے ،علم وعمل ،تقوی وطہارت ،عبادت و ریاضت ، سب ہے مگر عاجزی کا یہ عالم ،اورایک ہم ہیں کہ کرتے تو کچھ نہیں ،مگر جنت سے کم پر راضی ہی نہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اس کے پوری طرح مستحق ہیں۔

حاجی امداداللہ صاحبؒ کی تواضع

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ ، اتنے بڑے آدمی تھے، شیخ المشائخ تھے ہزاروں علماء وصوفیاء کے رہبر تھے، پھر بھی دعاء میں رات میں اُٹھکر یوں کہتے کہ اے اللہ! میرے پاس کچھ نہیں ہے، بالکل خالی ہوں ،مگر تیرے بہت سے نیک بندے مجھے اچھا سمجھتے ہیں،ان کے نیک گمان اوران کے طفیل سے میری مغفرت فرمادے،سوچئے اتنے بڑے بڑے لوگ جن کا علم وعمل ،اورتقویٰ وزہد، بےنظیرتھا، وہ بھی اپنے آپ کوکچھ نہیں سمجھتے تھے۔

شانِ عبدیت

اللہ تعالیٰ کوعبدیت وعاجزی بہت پسند ہے،اسی لئے قرآن میں ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی شان کواُجاگرکیا گیا ہے،مثلاًقرآن کریم فرمایا گیاہے:’’سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ‘‘ (پاک ہےوہ ذات جس نے راتو ں رات اپنے بندہ کوسیر کرائی) یہ معراج کے واقعہ کا تذکرہ ہے،اور یہاں آپصلی اللہ علیہ وسلم کوعبد یعنی بندہ فرمایا ہے،اگراللہ تعالے چاہتے تویوں بھی فرماسکتے تھے کہ’’پاک ہےوہ ذات جس نے راتوں رات اپنے نبی کوسیر کرائی،یااپنے محبوب کوسیر کرایا‘‘ مگراس کے بجائے عبد کہہ کر یہ بتادیا کہ دراصل اتنابڑامقام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوعبدیت (غلامی) ہی کی وجہ سے ملا ہے،معلوم ہوا کہ اللہ کے نزدیک سب سے بڑا مقام مقام عبدیت ہے،اوراسی سے ساری عظمتیں اور بلندیاں نصیب ہوتی ہیں،اور جہاں عبدیت ختم ہوجاتی ہے، وہاں شرافت وعظمت بھی ختم ہوجاتی ہے،اس لئے عاجزی وتواضع نہایت ضروری ہے سالک کے لئے ، اس لئے ہمیشہ عبادت کرنے کے بعد یوں کہے کہ اے اللہ! میں تیرے شایانِ شان کچھ

نہیں کر سکا، میں آپ کا کوئی حق ادا نہیں کر سکا، میں اپنی کمزوریوں و عیبوں کا اعتراف کرتا ہوں، حدیث میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلمفرمایا کرتے تھے کہ:

" لا اُحصِیُ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنتَ کَمَا اَثْنَیتَ عَلٰی نَفسِکَ"

اے اللہ! میں تیری شایان شان تعریف نہیں کر سکتا، آپ کی ذت ایسی ہے جیسا کہ آپ نے خود اپنی تعریف کی ہے۔ (مسلم:۵۱۷ترمذی:۳۴۱۵)

جب اللہ کے شایان شان تعریف بھی نہیں کی جا سکتی تو اللہ کے شایان شان عبادت کیسے کی جا سکتی ہے۔اور جب سرور عالم یہ فرماتے ہیں تو ہما شما کا کیا کہنا؟

مرید صادق کی تعریف

ایک مجلس میں فرمایا: میں نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات میں حضرت مجدد صاحب کی ایک عجیب بات پڑھی، اور پڑھ کر کچھ دیر تک میرا سر چکرانے لگا اور میں حیرت میں ڈوب گیا، حضرت نے پہلے تو یہ نقل کیا کہ ایک بزرگ نے فرمایا کہ مرید صادق تو وہ ہے جس سے بیس (۲۰) سال تک کوئی گناہ صادر نہ ہوا ہو، اور بیس (۲۰) سال تک اس کے بائیں ہاتھ کا فرشتہ کچھ بھی نہ لکھ سکے، اسکو لکھنے کے بعد فرماتے ہیں کہ: لیکن میرا خیال تو اپنے بارے میں یہ ہے کہ شاید میرے دائیں ہاتھ کا فرشتہ بیس (۲۰) سال سے کچھ بھی نہ لکھا ہوگا، کیوں کہ میں نے کوئی نیکی ہی نہیں کی، اور میرے بائیں ہاتھ کے فرشتہ کو لکھنے سے فرصت ہی نہ ملتی ہوگی۔

بھائیو! دیکھا آپ نے کہ اتنے بڑے مجدد، اتنے بڑے مجتہد، اتنے بڑے صوفی و بزرگ، جنھوں نے الحادِ اکبری کو ختم کرنے سب سے پہلے قدم اُٹھایا، اور اکبر نے جو رسوم و رواج جاری کیئے تھے، ان کو ختم کرنے کے لیئے ننگی تلوار بن کر کھڑے ہو

گئے تھے، اور جنہوں نے دین کی حفاظت وصیانت کی خاطر اپنے آپ کو داؤ پر لگا دیا تھا، وہ بھی یہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے اپنے اعمال پر بھروسہ نہیں ہے، بلکہ اپنی نیکوں کو نیکی بھی سمجھنے کی ہمت نہیں کررہے ہیں، اور اپنے آپ کو گنہ گا خیال کررہے ہیں، اور کہتے ہیں کہ داہنی طرف کا فرشتہ تو بیکار بیٹھا ہوگا اور بائیں طرف کا فرشتہ بدی و برائی لکھنے میں ایسا مصروف ہوگا کہ اسے فرصت ہی نہ ہوگی۔

جب یہ حضرات یہ کہتے ہیں تو ہمارا اور آپ کا کیا ہوگا؟ کیا ہمیں اپنے عمل پر بھروسہ کرلینے کی اجازت ہوگی؟

استغفار بھی استغفار کے قابل

حضرت رابعہ بصریہ جو بہت بڑی زاہدہ عابدہ خاتون تھیں، وہ فرماتی ہیں کہ ہمارا استغفار بھی استغفار کے قابل ہے، یعنی جب ہم استغفار کرتے ہیں تو وہ اللہ کے شایانِ شان نہیں ہوتا اور اس میں بھی ہم سے گستاخی ہوجاتی ہے، اس کے آداب کا لحاظ نہیں رکھا جاتا، اس لیے اس استغفار پر پھر استغفار کرنا چاہئے۔

عاجز گنہ گار متکبر عابد سے بہتر ہے

فرمایا: کہ آدمی گناہ کرکے اپنے کو عاجز سمجھے، یہ بہتر ہے اس سے کہ نیکی کر کے اپنے کو بڑا سمجھے، کیونکہ نیکی کرکے بڑائی میں مبتلا ہوگا تو ساری عبادت بے کار گئی، اس سے کیا فائدہ ہوا کہ آدمی محنت مجاہدہ کیا مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ ملا؟ اس کے برخلاف ایک آدمی گنہ کرکے شرمندہ و پشیمان ہوا اور اس کی وجہ سے اس میں عاجزی وانکساری پیدا ہوجائے تو یہ عاجزی اس کے کام آئے گی۔

اللہ سے اللہ ہی کو مانگو

اللہ سے ہمیں کیا مانگنا چاہئے؟ دنیا والے تو اللہ سے دنیا مانگتے ہیں مگر سالکین کو چاہئے کہ

وہ اللہ سے اللہ ہی کو مانگیں۔

حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکیؒ دعاء میں کہا کرتے تھے کہ:

تو کر بے خبر ساری خبروں سے مجھ کو ❁ الٰہی رہوں اک خبردار تیرا

کوئی تجھ سے کچھ، کوئی کچھ مانگتا ہے الٰہی میں تجھ سے طلبگار تیرا

فرماتے ہیں کہ دنیا والے لوگ کچھ کچھ مانگتے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ مجھے مال چاہئے، کوئی کہتا ہے کہ ڈگری چاہئے، کوئی کہتا ہے کہ بنگلہ چاہئے، مگر میں اللہ سے اللہ ہی کو مانگتا ہوں۔

❁ ایک حکایت

جیسے ایک قصہ ہے کہ سلطان محمود کا ایک غلام تھا، اس کا ایاز نام تھا، بادشاہ اُس سے بہت محبت کرتا تھا، دیگر درباریوں کو اسی بنا پر ایاز سے حسد ہوگیا کہ بادشاہ اس کو کیوں اتنا چاہتا ہے؟ بادشاہ نے اس کو بھانپ لیا، اور لوگوں کو یہ بتانا چاہا کہ میں کیوں ایاز سے اتنی محبت کرتا ہوں، ایک دن بھرا ہوا دربار تھا، اور یہ غلام ایاز بادشاہ کی پشت پر کھڑا اس کو پنکھا جھیل رہا تھا، اِسی درمیان بادشاہ نے کہا: میرے دربار کی جو چیز جس کو پسند ہو، میری طرف سے اس کو اجازت ہے کہ اس چیز پر وہ ہاتھ رکھ دے، وہ چیز اس کو دے دی جائے گی، سارے ارکانِ دولت ومشیران سلطنت اُٹھے اور انہوں نے اپنی اپنی پسندیدہ چیزوں پر ہاتھ رکھ دیا اور بادشاہ کی اجازت سے اس کو اُٹھالیا، مگر ایاز خاموش اپنی جگہ کھڑا تھا، اس نے نہ کسی چیز پر ہاتھ رکھا نہ اس کو اُٹھانے کی کوشش کی، یہ دیکھ کر لوگ ایاز کو تکنے لگے کہ کتنا بڑا بے وقوف ہے کہ ایسی قیمتی چیزیں میسر آرہی ہیں مگر یہ نہ اپنی جگہ سے اُٹھتا ہے، نہ کسی چیز کو اُٹھاتا ہے، بادشاہ بھی یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا، اس نے کہا: ایاز! کیا تم کو ہمارے دربار کی

کوئی چیز پسند نہیں آئی؟ تم نے کسی چیز کو کیوں پسند نہ کیا؟ تو ایاز نے بڑا عجیب و بصیرت افروز جواب دیا، اس نے کہا کہ حضور! میں نے تو آپ کو پسند کرلیا ہے، اور جب آپ میرے ہو گئے تو سارا دربار میرا ہو گیا، اب مجھے کسی اور چیز کو پسند کرنے اور اُٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟

میرے دوستو! ایک مخلوق کا غلام جب اپنے آقا کی محبت میں اس مقام کو پہنچ سکتا ہے تو کیا اللہ کی ذات اس سے گئی گزری ہے؟ لہذا اللہ سے اللہ ہی کو طلب کرو، جب اللہ مل جائے گا تو سب مل جائے گا، جیسے اُس غلام ایاز نے بادشاہ ہی کو مانگ لیا تھا، اگر کوئی چیز مانگتا، تو صرف وہ چیز اس کو ملتی، بادشاہ کی محبت نہ ملتی، اسی طرح اللہ سے دنیا مانگو گے تو دنیا ملے گی، دنیا والے دنیا مانگتے ہیں، مگر عقلمند لوگ اللہ سے اللہ ہی کو مانگتے ہیں، جب اللہ کو مانگ لیا تو اللہ اُس کا ہو گیا، جس کا اللہ ہو گیا سب کچھ اُس کا ہو گیا، جیسے کہتے ہیں کہ: ''من کان للہ کان اللہ لہ'' کہ جس کا اللہ ہو گیا سب اس کا ہو گیا۔

خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحبؒ حضرت تھانوی کے جلیل القدر خلیفہ تھے، انہوں نے اپنے اشعار میں اس مضمون کو اس طرح ادا کیا:

تصور عرش پر ہے، وقفِ سجدہ ہے جبیں میری
مرا اب پوچھنا کیا، آسماں میرا زمیں میری
اگر اک تو نہیں میرا، تو کوئی شیٔ نہیں میری
جو تو میرا تو سب میرا، فلک میرا زمیں میری

عوام ہماری قدر نہیں کرتی

فرمایا: آج بعض علماء شکایت کرتے ہیں کہ عوام ہماری قدر نہیں کرتی، ہماری

توہین کرتی ہے، میں کہتا ہوں لوگ اُنہیں علماء کی قدر نہیں کرتے، جو اللہ سے نہیں ڈرتے، بلکہ اُلٹی سیدھی کرتے رہتے ہیں، اور جو علماء اللہ سے ڈر کر زندگی گزارتے ہیں، تقوی شعار ہوتے ہیں، تو ایسے علماء کی عزت آج بھی لوگ کرتے ہیں، ایک مثال سے اس کو سمجھا جاسکتا ہے، جیسے بنگلور کے شیخ کباب کہ اگر ان کو صرف مسالہ لگا کر بغیر پکائے لوگوں کو دیا جائے تو کوئی نہیں کھائے گا، بلکہ منہ میں رکھتے ہی سب تھوک دیں گے، حالانکہ اس میں گوشت بھی ہوتا ہے، مرچ اور نمک اور دیگر مسالہ جات بھی ہوتے ہیں، مگر اسے آگ میں تپائے بغیر منھ میں رکھیں گے تو فوراً تھوک دیں گے، لیکن جب ان کو آگ میں تپایا جائے اور اس کے بعد اس کو کھانے کو دیں، تو سب مزے لے لے کر کھائیں گے۔بعینہ اسی طرح علماء اگر صرف علم حاصل کریں، مدرسہ سے فارغ ہو جائیں، مگر اپنے آپ کو کسی بزرگ کے حوالہ کر کے اصلاح کی آگ میں نہ تپائیں، اور مجاھدات کی بھٹی میں نہ جلائیں، تو یہ کچے علماء ہیں، لوگ ان کو اسی طرح تھوک دیں گے، جس طرح کچے گوشت کو تھوک دیتے ہیں، ہاں اگر یہ مجاہدہ میں پک جائیں تو پھر کوئی بے قدری نہیں ہوگی، اور اگر کوئی اپنی بد ذاتی سے کرے گا تو اس کا اثر خود اسی پر ہوگا، عالم کو اس کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔اس لئے علماء کو چاہئے کہ وہ عالم بالکتاب ہونے پر اکتفاء نہ کریں، بلکہ عالم باللہ بنیں، عارف باللہ بنیں، متقی و پرہیز گار بنیں۔

حضرت شاہ ابرار الحق صاحبؒ کا ارشاد

ایک مجلس میں حضرت والا نے فرمایا: ایک مرتبہ مرشدی حضرت شاہ ابرار الحق صاحبؒ کہیں تشریف لے جارہے تھے، کار میں سوار تھے، راستہ میں جاتے ہوئے پیٹرول ڈلوانے کے لئے پیٹرول بنک پر کار روکی گئی، تو دیکھا کہ وہاں پیٹرول

ڈلوانے ایک پیٹرول کا ٹینکر بھی کھڑا ہے، جس پر ہزاروں گیلن پیٹرول لدا ہوا ہے، حضرت والاؒ نے یہ دیکھ کر فرمایا: یہ ٹرک باوجود اس کے اوپر ہزاروں گیلن پیٹرول لدا ہوا ہے، پھر بھی یہ ٹرک خود چلنے کے لئے پیٹرول کا محتاج اس لئے ہے کہ اوپر والا پیٹرول اس کے اندر گھسا ہوا نہیں ہے، صرف اوپر اوپر ہے، اگر یہ پیٹرول اس کے اندر جاتا تو یہ پیٹرول بنک کے پیٹرول کا محتاج نہ ہوتا، اسی طرح علماء اگر علم تو حاصل کرلیں، لیکن وہ اوپر اوپر ہی رہے، زبان زبان پر رہے، دل کے اندر نہ جائے تو اس علم کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، اور اس سے دین کی گاڑی چل نہیں سکتی، جس طرح اس ٹرک کو اپنے پیٹرول کا کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے، علم اندر جانے کا مطلب یہ ہے کہ اس علم پر عمل کرے۔

بغیر تمرین کے صرف تدریس بیکار ہے

مدرسہ میں حضرت والا کی مجلس طلباء کے لئے ظہر بعد کچھ دیر کے لئے ہوتی ہے، ایک دن اُس مجلس میں فرمایا کہ آج میں ظہر میں بعض طلباء کو دیکھ رہا تھا، کسی کا رکوع صحیح نہیں، کسی کا سجدہ صحیح نہیں، کوئی سجدہ میں کہنیوں کو زمین پر رکھ رہا ہے، جو کہ سنت کے خلاف ہے، پھر فرمایا بڑی افسوس ناک بات ہے کہ مدرسہ میں تدریس ہو رہی ہے، تحقیق ہو رہی ہے، تصنیف وتالیف ہو رہی ہے، مگر دین پر چلنے کی تمرین نہیں ہو رہی ہے، حالانکہ درس میں نماز کے مسائل پر مالہ وماعلیہ کے ساتھ بحث ہوتی ہے، اُن مسائل کی احادیث کی تخریج ہوتی ہے، راویوں پر جرح قدح ہوتی ہے، سند پر زبردست کلام ہوتا ہے، یہ سب کچھ ہو، مگر رکوع ہی صحیح نہ ہو، سجدہ ہی صحیح نہ ہو، تو ایسی تدریس کا کیا فائدہ؟ اگر طلباء یہ مسائل تو جان لیں، مگر نماز صحیح نہ ہو، تو مدرسہ پر جو کچھ خرچ ہو رہا ہے وہ سب بیکار ہے۔

عبادت وریاضت اللہ کا فضل ہے، ایک واقعہ

فرمایا: جو بھی بندہ کچھ نیکیاں کرتا ہے، وہ محض اللہ کا فضل ہے، بندہ کے عمل کو اس میں دخل نہیں، صحابہ اکرام کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا﴿ فَضْلاً مِّنَ اللّٰہِ وَنِعْمَۃً﴾ (کہ ان کا ایمان وعمل نتیجہ ہے اللہ کے فضل وکرم کا) تو بدرجہ اولی ہماری عبا دتیں اللہ کے فضل سے ہوں گی، مولانا رومی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک آقا اور اس کا ایک غلام بازار کچھ خریدنے گئے، راستہ میں نماز کا وقت آگیا، تو غلام نے کہا آقا! میں مسجد میں نماز پڑھنے جانا چاہتا ہوں، آقا نے اجازت دے دی اور خود باہر کھڑا ہوگیا، انتظار کرتا رہا، نماز کے بعد سب نمازی چلے گئے، مگر یہ غلام نہیں آیا، آقا نے باہر ہی سے آواز دی کہ اے فلاں سب چلے گئے تو کیوں نہیں آتا؟ تو غلام نے کہا کہ مجھے آنے نہیں دیتے، یہ کہکر پھر رکعت باندھ کر نماز پڑھنا شروع کردیا، پھر کچھ دیر بعد آقا نے آواز دی، غلام نے پھر وہی جواب دیا کہ مجھے آنے نہیں دیتے، اور یہ کہہ کر پھر رکعت باندھ لی، پھر آقا نے انتظار کیا اور کچھ دیر بعد آواز دی اور کہا کہ کون آنے نہیں دیتا؟ غلام نے کہا کہ جو آپ کو اندر آنے نہیں دیتا، وہ مجھے باہر نکلنے نہیں دیتا، اس جواب پر جی چاہتا ہے کہ قربان ہوجاؤں، معلوم ہوا مسجد میں جانا اللہ ہی کی توفیق سے ہے، ہمارا کوئی کمال نہیں۔

ایک دن منزل ضرور ملے گی

فرمایا: جب آپ صحیح اللہ والا تلاش کرلیں گے، تو ایک دن ضرور اللہ تک رسائی حاصل کرلیں گے، اس لئے کہ اللہ کے راستہ میں قدم رکھنے والا کبھی محروم نہیں ہوسکتا، آج نہیں تو کل، کبھی تو پہنچے گا، جیسے ایک آدمی کمزور بصارت والا چلتا ہے، آگے جاکر ایک جگہ ٹھوکر لگ کر گر جاتا ہے، پھر اُٹھتا ہے، ہمت کر کے چلتا ہے، تو وہ ایک دن ضرور

منزل تک پہنچ جائے گا، اسی طرح ایک گنہ گار بندہ کسی اللہ والے کی اتباع کرلے، اُس کے پیچھے چلتا رہے، اگر چہ گناہوں نے اُس کو گرادیا ہو، شیطان نے زخمی کردیا ہو، کوئی مضائقہ نہیں، وہ کبھی نہ کبھی ضرور خدا تک رسائی پالے گا۔

لہذا اُٹھو! توبہ کرواور اللہ سے کہو، اے اللہ! ضعیف بندہ ہوں، کمزور بندہ ہوں، طاقت نہیں ہے، لیاقت نہیں ہے، صلاحیت نہیں ہے، لیکن تیرے راستہ میں چلنا ضرور چاہتا ہوں، میں تو میری نااہلی و ضعیفی سے گرتا رہوں گا، تو میرا ہاتھ ضرور پکڑے رہنا، میں زخموں سے کہیں چور چور ہو جاوں گا، تو میرے زخموں کی مرھم پٹی کرتے رہنا، جیسے کسی بزرگ نے کہا:

ہم نے طے کیں اس طرح سے منزلیں
گر پڑے، گر کر اٹھے، اٹھکر چلے

اس شعر میں میں نے ذراسی ترمیم کردی ہے کہ:

ہم نے پائیں اس طرح سے رفعتیں
گر پڑے، گر کر اٹھے، اٹھ کر اُڑے

اس میں اشارہ ہے کہ جو سالک کبھی نفس و شیطان کی چالوں وشرارتوں کا شکار ہوگیا، اور گناہ کا ارتکاب کر بیٹھا، مگر فوراً اللہ کی طرف رجوع کیا، اور نفس و شیطان کا مقابلہ کرنے کے لئے کھڑا ہو گیا، تو پھر وہ اللہ کی مدد سے نہ صرف یہ کہ منزلیں طے کرتا ہے بلکہ رفعتیں اور بلندیاں پالیتا ہے اور چل کر نہیں اڑ کے جاتا ہے، لہذا سالکین کبھی مایوس نہ ہوں، بلکہ عمل کے میدان میں برابر چلتے رہیں، اگر چہ گرتے پڑتے ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت مسیح اللہ خان صاحبؒ کے اعلیٰ ترین اخلاق

فرمایا میرے استاذ حضرت مفتی نصیر احمد صاحبؒ نے کہ حضرت مسیح اللہ خان صاحبؒ کو جو خطوط آتے، میں ہی حضرت والا کو پڑھ کر سناتا تھا، ایک مرتبہ کچھ لوگوں کی طرف سے حضرت والا کو خطوط آئے جس میں گالیوں کی بھرمار تھی، گستاخانہ الفاظ تھے، تو میں ایسے خطوط پڑھے بغیر ایک طرف رکھ دیتا، تو حضرت والا کہتے کہ ان کو کیوں نہیں پڑھتے؟ ان کو بھی پڑھو، میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ خطوط پڑھنے کے قابل نہیں ہیں، کیوں کہ ان میں گالیاں اور دھمکیاں لکھی ہیں، ان کو کیا پڑھوں؟ اس پر حضرت والا نے فرمایا کہ یہ دراصل اللہ کی طرف سے ہماری اصلاح کا انتظام ہے، کیونکہ لوگ ہمیں حضرت حضرت کہکر ہمارے دماغ کو عرش معلیٰ پر پہونچا دیتے ہیں، اس سے بڑائی و عجب پیدا ہوسکتا ہے، اس لئے اللہ تعالے ان لوگوں سے ہماری اصلاح فرماتے ہیں، یہی لوگ تو ہیں جو ہماری اصلاح کرتے ہیں، ہمارے اندر بڑائی آنے نہیں دیتے، یہ تو ہمارے مصلح ہیں، اللہ اکبر! کیا ظرف تھا ان حضرات کا، ایک تو یہ ہے کہ آدمی اخلاق جانے، بیان کرے، یہ تو بہت سے لوگ کر لیتے ہیں، مگر ان اخلاق کو عملی جامہ پہنانا، یہ بڑا کام ہے، سب کے بس کی بات نہیں ہے۔

شیخ کو احوال کی اطلاع دینا ضروری ہے

ایک مرتبہ احقر مرتب نے حضرت والا سے سوال کیا کہ اصلاحی تعلق قائم کرنے کے بعد حسب ہدایت احوال لکھ کر دکھانا چاہتا ہوں، مگر دل میں یہ خیال آتا ہے کہ احوال میں دو چیزیں ہوتی ہے، یا تو سالک اپنے اندر خوبیاں پاتا ہے یا خامیاں، خامیوں کی اطلاع شیخ کو کرنے کی کیا ضرورت ہے، وہ تو توبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف فرمادیں گے، اور خوبیاں بھی شیخ کو بتانے کی ضرورت نہیں،

اس لئے کہ بندہ کا اپنی خوبیوں کوخوبیاں سمجھنا ہی غلط ہے، کیوں نکہ انسان کی کوئی بھی نیکی اللہ کے شایان شان نہیں ہوسکتی۔

تو حضرت نے فرمایا کہ یہ خیال غلط ہے، کیونکہ گناہ کے بعد صرف توبہ کافی نہیں ہوتی، بلکہ توبہ کے بعد اصلاح بھی ضروری ہوتی ہے، اسی لئے اللہ تعالی قرآن کریم میں فرماتے ہیں:﴿ اِلَّا مَنْ تَابَ وَ آمَنَ وَأَصْلَحَ ﴾ معلوم ہوا کہ توبہ کے بعد اصلاح بھی ضروری ہے ،اور اصلاح اطلاعِ احوال کے بغیر کیسے ہوسکتی ہے؟ کیوں کہ شیخ کا صاحبِ کشف وصاحبِ الہام ہونا ضروری نہیں، پھر فرمایا کہ جب تک ڈاکٹر کو مریض اپنا مرض نہیں بتائے گا، صحیح علاج نہیں ہوگا، جب تشخیص صحیح ہوگی تو تجویز بھی صحیح ہوگی ،اس لئے اپنی خامیاں جو جانتا ہو، وہ شیخ کے سامنے بیان کرے ،تا کہ صحیح اصلاح ہو، رہا مسئلہ خوبیوں کا تو وہ بھی بتائے اور فرمایا کہ انسان کا یہ سمجھنا کہ میں فلان فلاں نیکی کرتا ہوں یہ غلط نہیں، بلکہ نیکیاں کر کے اپنے آپ کو باکمال سمجھنا غلط ہے۔

فطرت بدل نہیں سکتی

ایک مجلس میں فرمایا: انسان کے اندر ایک عادت ہوتی ہے، ایک فطرت ہوتی ہے، عادت بدل سکتی ہے، مگر فطرت بدل نہیں سکتی، اسی لئے ایک حدیث میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کہ:

اذا سمعتم بجبل زال عن مكانه فصدقوه واذا سمعتم برجل زال عن خلقه فلا تصدقوه. (مسند احمد: ۶/۴۴۳)

یعنی فرمایا کہ اگر تم کسی پہاڑ کے بارے میں سنو کہ وہ اپنی جگہ سے ٹل گیا تو اس کی تصدیق کرلو، اور اگر کسی آدمی کے بارے میں سنو کہ اس کی فطرت بدل گئی تو

اس کی تصدیق نہ کرو۔

معلوم ہوا کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل سکتا ہے، مگر کسی کی فطرت بدل نہیں سکتی، لہذا کسی کی فطرت ہی میں برائی ہو، تو چونکہ فطرت نہیں بدل سکتی، اس لئے اُس فطرت کا رُخ بدل دے، اور یہ ہوسکتا ہے، پھر فرمایا: دیکھو حالت کفر میں حضرت عمرؓ کی فطرت میں سختی اور غصہ تھا، اور وہ اسلام لانے کے بعد بھی باقی رہا، مگر پہلے اسلام کے خلاف یہ غیظ وغضب وشدت تھی، اور ایمان لانے کے بعد یہی شدت وغیظ وغضب کفر کے خلاف برتنے لگے، فطرت تو باقی رہی، مگر رُخ بدل گیا۔

اس پر اہل مجلس میں سے کسی نے سوال کیا کہ کسی کی فطرت میں ریا کاری ہو تو اُس کا رُخ کیسے بدلے، تو فرمایا: پہلے لوگوں کو دکھانے کے لئے کرتا تھا، اب اللہ کو دکھانے کے لئے کرے، اسی کو اخلاص کہتے ہیں، جو ریا کاری ایک گناہ کا کام تھا، وہ رُخ بدلنے سے ثواب کا کام ہوجائے گا۔ کیونکہ بعض لوگوں میں کسی بھی کام کو دکھا کر کرنے کی فطرت ہوتی ہے، اس دکھاوے کا رخ اگر مخلوق کی طرف ہو تو بُرا ہے اور اللہ کی طرف ہو تو اچھا ہے۔

خوابوں کی حقیقت

آج کل لوگوں کو خواب بہت نظر آتے ہیں، اور ان پر کلی بھروسہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں، اور اپنی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں لاتے، حضرت تھانویؒ نے اس سلسلہ میں ایک بڑی قیمتی بات فرمائی ہے، کہ اگر انسان کی جاگنے کی حالت درست ہو تو کتنا بھی بُرا خواب دیکھے، کچھ فرق نہیں پڑے گا، اگر جاگنے کی حالت درست نہ ہو تو کتنا ہی عمدہ خواب دیکھ لے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

مثلاً ایک آدمی نماز نہیں پڑھتا، روزہ نہیں رکھتا، ڈاڑھی نہیں رکھتا، اللہ سے

نہیں ڈرتا، ایسا انسان خواب میں یہ دیکھے کہ وہ خود جبرئیل بن گیا ہے، یا عرش پر پہنچ گیا ہے، تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، اس کے برخلاف کوئی نمازی ہو، اللہ سے ڈر کر زندگی گزارتا ہو، اوامر بجالاتا ہو، نواہی سے اجتناب کرتا ہو، اگر ایسا انسان خواب میں یہ دیکھے کہ وہ شیطان بن گیا ہے، کوئی ڈرنے کی بات نہیں، اسلئے کہ اللہ قیامت میں اچھا خواب دیکھنے کی وجہ سے نہیں چھوڑ دیں گے کہ بھائی تم دنیا میں بڑے اچھے خواب دیکھتے تھے، اس لئے جنت میں چلے جاؤ، اور ایسا بھی نہیں کہ جو برے خواب دیکھے اُسے یوں کہہ دیں کہ تم نمازی تو تھے، پرہیزگار تو تھے مگر برے خواب دیکھتے تھے، اس لئے جہنم میں چلے جاؤ، ایسا نہیں ہوگا، وہاں تو اعمال کا اعتبار رہے، خواب کچھ بھی ہو، کیا عجیب اُصول حضرت تھانویؒ نے فرمایا، اسی لئے تو حکیم الامت کا لقب دیا گیا ہے۔

ہاں اس کا مطلب یہ نہیں کہ خواب کی کوئی حقیقت نہیں، بلکہ خواب کی حقیقت ہے اور اس کو حدیث میں نبوت کا چھیالیسواں حصہ قرار دیا گیا ہے۔ مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ سب کے خواب اور ہر وقت کے خواب معتبر نہیں ہوتے، بلکہ خواب کی تین قسمیں ہیں: ایک خیالی خواب، ایک شیطانی خواب، اور ایک الہامی خواب، اس لئے خواب پر کلی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، بلکہ دیکھا جائے گا کہ کس قسم کا خواب ہے۔

حدیث میں ہے کہ ایک صاحب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میرا سر کٹ گیا ہے، اس پر آپ ﷺ کو ہنسی آ گئی آپ نے ہنس کر فرمایا کہ:

اذا لعب الشیطان بأحدکم فی منامه فلا یحدث به الناس

شیطان تم میں سے کسی کے ساتھ خواب میں کھلواڑ کرے تو یہ خواب لوگوں کو

بتاتے نہ پھرو۔ (مسلم:۴۲۱۳،مسند احمد:۱۳۸۶۴)

دیکھئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود فرما رہے ہیں کہ اس طرح کے بے تکے خواب بیان نہ کرو، اگر ہر خواب کوئی حقیقت رکھتا تو آپ یہ کیوں فرماتے۔

اللہ سے دین مانگو

مولانا حفظ الکبیر صاحبؒ جامعہ مفتاح العلوم، جلال آباد میں بحیثیت مبلغ مقرر تھے، اور حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ، مہتمم دارالعلوم دیوبند کے خلیفہ تھے، ہماری طالبِ علمی کے دور میں جلال آباد میں حضرت مسیح الامتؒ جہاں نماز پڑھتے تھے، اسی مسجد میں وہ جمعہ سے پہلے وعظ کہا کرتے تھے، ان کی باتیں بڑی دلچسپ بھی ہوتی تھیں اور بڑی کام کی بھی، وہ اپنے وعظ میں کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص اللہ سے دین مانگتا ہے تو اللہ اسے دین بھی دیتا ہے اور دنیا بھی دیتا ہے، اور اگر کوئی اللہ سے دنیا مانگتا ہے تو صرف دنیا دی جاتی ہے، دین نہیں دیا جاتا، یہ کہہ کر مولانا ایک بڑی عمدہ مثال دیتے کہ جیسے آپ اگر کسی سے پانی مانگو گے تو صرف پانی نہیں، بلکہ گلاس بھی ساتھ میں آئے گا، اسی طرح دودھ، چائے، کھانا وغیرہ مانگو گے تو مظروف کے ساتھ ظرف بھی آئے گا، اس کے برخلاف اگر آپ نے کسی سے کہا کہ گلاس لاؤ، یا پلیٹ لاؤ، یا کٹورا لاؤ، تو لانے والا صرف گلاس یا پلیٹ یا کٹورا ہی لائے گا، اس کے ساتھ مشروب یا ماکول نہیں آئے گا، وہ فرماتے تھے کہ اسی طرح اللہ سے اللہ مانگو گے، دین مانگو گے، تو اللہ دنیا کے کٹورے یا پلیٹ میں رکھ کر دین کی دولت دیں گے، چناں چہ جو اولیا اللہ ہوتے ہیں، وہ دنیا سے محروم نہیں ہوتے حالاں کہ وہ دنیا نہیں مانگتے، وہ اللہ سے دین مانگتے ہیں، مگر اللہ تعالے ساتھ میں دنیا بھی دیتے ہیں، اور ایسا سکون

دیتے ہیں کہ وہ اسباب کے پیچھے نہیں پڑتے۔اوراگر دنیا مانگو گے تو صرف دنیا دی جائے گی،دین نہیں دیا جائے گا،جیسے پلیٹ وگلاس مانگنے والے کوصرف پلیٹ وگلاس دئے جاتے ہیں،اس میں کھانا پانی رکھ کرنہیں دیا جاتا۔

محبت میں اعتدال ہو

اسلام ہر چیز میں اعتدال سکھاتا ہے،حتی کہ دین پر چلنے میں بھی اسی کی تعلیم دی گئی ہے،سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالے کی محبت بڑی چیز ہے مگر اس میں بھی اعتدال مطلوب ہے،ایک نوجوان نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اللہ سے دعاء کر دیجئے کہ مجھے اللہ سے بے پناہ محبت ہوجائے،اولاً تو عیسیٰ علیہ السلام نے انکار کیا،مگر جب اس نے بہت اصرار کیا تو اُنہوں نے دعاء کر دی،دعا قبول ہوگئی،اور اسے بے پناہ محبتِ الٰہیہ دیدی گئی،مگر نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کے ہوش اُڑ گئے۔

اور ایسا ہوسکتا ہے،ارے بھائی!جب اس فانی دنیا کے عشق میں کوئی گرفتار ہوکر پاگل ہوسکتا ہے تو اللہ سے محبت کرنے والا پاگل کیوں نہیں ہوسکتا،مولانا روم نے ایک جگہ لکھا ہے:

عشق مولیٰ کئے کم بود از عشق لیلیٰ

مولیٰ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کیسے کم ہوسکتا ہے،چناں چہ مجنوں لیلیٰ کے عشق میں ہمیشہ مدہوش رہتا تھا،کچھ خبر نہیں رہتی تھی،ایک جگہ جارہا تھا،ایک صاحب نماز میں کھڑے ہوئے تھے،مجنون سامنے سے گزر گیا،نمازی صاحب کو بڑا غصہ آیا،جلدی سے نماز ختم کی اور جا کر اُسکو پکڑا،اور ڈانٹنے لگے،سمجھ نہیں ہے تجھے؟ دیکھا نہیں؟اندھے کی طرح جارہا ہے؟تو وہ کہنے لگا کہ ایک دنیا کی لیلیٰ کی وجہ سے میرا یہ حال ہے کہ آپ وہاں کھڑے تھے یا نہیں،مجھے وہ بھی ہوش نہیں ہے،تم کیسے

خدا کے عاشق ہو کہ نماز میں کھڑے ہو کر مجھے دیکھ رہے تھے، چاہئے تو یہی تھا کہ اللہ کے عشق میں پاگل ہو جاتے، مگر اسلام ایک معتدل مذہب ہے، اسلام یہ نہیں چاہتا کہ لوگ پاگل ہو جائیں، بلکہ شریعت چاہتی ہے کہ دنیا کا نظام بھی چلتا رہے، بیوی کے حقوق بھی ادا کرنا ہے، تجارت بھی کرنا ہے، کیوں کہ اسلام ایک معقول مذہب ہے، اگر کوئی شخص بیوی کا حق ادا نہیں کرتا تو اللہ خوش نہیں ہوتا، اگر کوئی شخص والدین کی عظمت نہیں کرتا تو اللہ خوش نہیں ہوتا، اگر کوئی شخص بچوں کا حق ادا نہیں کرتا تو اللہ خوش نہیں ہوتا، پڑوسیوں کے ساتھ احسان وسلوک کا معاملہ نہ کرے تو اللہ خوش نہیں ہوتا، جیسے انسان کے اندر چار چیزیں ہوتی ہیں، خون، بلغم، سودا، صفرا، انکو اخلاطِ اربعہ کہتے ہیں، ان کو اللہ نے ایک خاص توازن {LEVEL} کے ساتھ ہمارے اندر رکھا ہے، جب یہ اعتدال پر ہوں تو ہماری طبیعت ٹھیک رہتی ہے، جب ان میں افراط تفریط پیدا ہو جائے تو ہماری طبیعت بگڑ جاتی ہے، اسی طرح روحانی سلسلہ میں بھی ہے کہ ہر چیز اپنے اپنے حد کے اندر رہے کمی بیشی نہ ہو، اللہ کا خوف اپنی حد میں رہے، اور اللہ کی محبت ہے تو وہ اپنی حد میں رہے۔

سات آدمی عرش کے سایہ میں

حدیث میں ہے کہ امام عادل، انصاف پسند حاکم قیامت کے دن عرش کے سایہ میں ہوگا، اب سوال یہ ہے کہ ہر آدمی تو حاکم نہیں بن سکتا، ایک حاکم ہوگا تو لاکھوں محکوم ہوں گے، تو کیا یہ فضیلت صرف حاکم کے لیے ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ امام عادل سے اگر چہ حاکم و بادشاہ مراد ہے مگر اس کے عموم میں ہر وہ شخص داخل ہے جس کو اللہ نے چھوٹی بڑی کسی بھی قسم کی حکومت دی ہو۔

مثلاً ہر آدمی کو اللہ نے کسی نہ کسی قسم کی حکومت دی ہے کسی کو بیوی پر کسی کو

بچوں پر کسی کو شاگردوں پر کسی کو مریدوں پر کسی کو ماتحت کام کرنے والے نوکروں پر، لہذا جو بھی اپنے ماتحت کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ کرے گا وہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اس عموم میں داخل ہوکراس فضیلت میں حصہ دار بنے گا۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ گھر کا ہر بڑا اپنے گھر کا حاکم ہوتا ہے، چنانچہ قرآن کریم میں ہے: ﴿ الرِّجَا لُ قَوَّا مُوْنَ عَلَى النِّسَا ءِ ﴾ (مردعورتوں پر حاکم ہو تے ہیں)۔ (النساء:۳۴)

اگرکسی کے بچے ہیں یااور خدام وغیرہ ہیں، تو وہ آدمی اُن سب کا بادشاہ و حاکم ہے، اس طریقہ پرآدمی اپنی بیوی، بچوں اور خدام اور دیگر ماتحت لوگوں کے سا تھ انصاف وحسن سلوک کا معاملہ کریگا، تو وہ بھی امام عادل کے ساتھ شامل ہوجائیگا۔

ایک قرآنی دعاء کی تفسیر

قرآن میں ہے ﴿وَجَعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَا ماً﴾ (الفرقان: ۷۴) اس میں دعاء سکھائی گئی ہے کہ اے اللہ! ہمیں متقیوں کا امام بنادے، حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ یہاں متقیوں کی امامت مقصود نہیں، بلکہ یہ کہنا ہے کہ اے اللہ! میں گھر کا امام تو ہوں، اگر ہمارے گھر والے فاسق رہیں گے، تو میں امام الفاسقین ہوجاؤں گا، آپ ہمارے گھر والوں کو نیک ومتقی بنادیں، تاکہ میں امام المتقین ہوجاؤں، اسی لئے اللہ نے یہ دعا سکھلائی، کہ بیوی متقی ہوتو یہ متقیہ کا امام ہوگا، بچے متقی ہوں تو متقی اولاد کا امام ہوگا، اگر خدانخواستہ بچے فاسق ہوں، بیوی فاسقہ ہو، تو یہ فاسقوں کا امام ہوگا، بہت سے لوگ پریشان ہوکر کہتے ہیں کہ ہمارے بچے بگڑ چکے ہیں، ایسے لوگوں کو یہ دعا اہتمام سے مانگنا چاہیے، اس طرح انسان امام عادل کی فضیلت میں داخل ہو جائے گا۔

حاکم کی دوسری شرح

حضرت حکیم اختر صاحب دامت فیوضھم نے امام عادل کی ایک عجیب شرح کی ہے وہ یہ کہ ہر انسان کی دو گز کی مملکت ہے، وہ ہے انسان کی باڈی (جسم) جس میں صوبے بھی ہیں، آنکھ ایک صوبہ ہے، کان ایک صوبہ ہے، دماغ ایک صوبہ ہے، پیٹ ایک صوبہ ہے اور ان کا دارلسلطنت دل ہے، یہ سب ملا کر ایک سلطنت قائم ہوگئی، لہذا جو بھی اپنی اس مملکت پر عدل وانصاف قائم کریگا، وہ بھی امام عادل میں شامل ہے، یہ عاشقانہ تشریح ہے۔

عدل کیا ہے

اس حدیث میں امام کے ساتھ عادل کی صفت بھی لگی ہوئی ہے، لہذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عدل کی کیا تعریف ہے؟ اس کا جواب عدل کی ضد کو سمجھنے سے معلوم ہوگا، کیونکہ اشیاء تو اضداد ہی سے پہچانی جاتی ہیں، جیسے کہتے ہیں کہ: (**تعرف الاشیاء باضداھا**) اگر آپ کو دن سمجھنا ہو تو رات کو سمجھئے، اگر یہ سمجھنا ہے کہ کالا کسے کہتے ہیں، تو گورے کو سمجھئے، اگر آپ کو یہ سمجھنا ہے کہ حسین کسے کہتے ہیں، تو قبیح کو سمجھئے، اگر دنیا میں سارے کے سارے حسین ہوتے، تو حسینوں کی اہمیت نہ ہوتی، بدشکلوں نے حسینوں کا مرتبہ بڑھا دیا، ورنہ ان کو کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا، اسی طرح عدل کی پہچان ظلم سے ہوتی ہے، اس لئے عدل کی ضد کو جاننا چاہئے، اور عدل کی ضد ہے ظلم، اور ظلم کہتے ہیں ہر اس کام کو جو اللہ کی مرضی کے خلاف ہو، قرآن میں اللہ نے گناہ گاروں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے: ﴿**ظَلَمُوْا أَنْفُسَهُمْ**﴾ کہ انہوں نے گناہ کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا، معلوم ہوا نافرمانی کرنا ظلم ہے، لہذا جو اپنی نظر کی حفاظت نہیں کرتا اور اس کو نافرمانی سے نہیں بچاتا، وہ ظالم ہے عادل نہیں، جو اپنے کانوں کو نافرمانی سے نہیں

بچاتا، وہ ظالم ہے عادل نہیں، جو زبان کو غلط استعمال کرنے سے نہیں بچاتا، وہ ظالم ہے عادل نہیں، جو اپنے دل کو گندے خیالات سے نہیں بچاتا، وہ ظالم ہے عادل نہیں، اس لیے امام عادل بننا ہو تو اپنی اس مملکت میں ظلم کو در آنے کا موقعہ نہ دیں۔

ہمارا بدن اللہ کا باغ ہے

یاد رکھو کہ ہمارا بدن اللہ کا بنایا ہوا باغ ہے، اس کی پرورش اور دیکھ بھال مالکِ باغ کی مرضی کے مطابق ہونی چاہئے، ہم صرف اس باغ کے مالی ہیں، مالک نہیں، اس لیے اس باغ میں ہم صرف وہی کام کر سکتے ہیں جو اللہ کی مرضی کے مطابق ہو، لہذا ہمیں زبان کو غلط استعمال کرنے کی اجازت نہیں، اور اسی لیے غیبت حرام ہے، جھوٹ حرام ہے، بہتان طرازی حرام ہے، چغل خواری حرام ہے، کیونکہ مالک نے زبان کو ان چیزوں میں استعمال کی اجازت نہیں دی ہے، اسی طرح ڈاڑھی کٹانے کی اجازت نہیں، اور ٹخنے ڈھانکنے کی اجازت نہیں، کیونکہ مالک نے اس کی اجازت نہیں دی ہے، جس طرح دنیا میں بھی باغ ہوتے ہیں، وہاں آپ مالک کی اجازت کے بغیر ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے، کوئی تصرف تو دور کی بات ہے، اسی طرح اللہ کے اس باغ میں بھی ہم اپنی مرضی سے تصرف نہیں کر سکتے، سارے اعضاء اس کی مرضی کے مطابق چلیں گے۔

اس سے یہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ جو آدمی اس بدن میں اپنی مرضی سے تصرف کرتا ہے، اور حرام کاموں کا ارتکاب کرتا ہے، وہ اللہ کے اس باغ کو مالک کی مرضی کے بغیر تصرف میں لانے والا خائن ہے، جس کے بارے میں پوچھ ہوگی اور اس کو جواب دینا ہوگا۔

ایک لطیفہ

ایک جنٹل مین ایک مولانا سے کہنے لگے کہ مولویوں کو کیا ہو گیا کہ وہ ڈاڑھی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، تو مولانا نے جواب دیا کہ ہم کہاں پڑے ہوئے ہیں، ڈاڑھی کے پیچھے تو آپ لوگ پڑے ہوئے ہیں، کہ ذراسی بڑھی، اور کاٹ دی، ذراسی بڑھی پھر کاٹ دی، اور ہم تو ڈاڑھی چھوڑے ہوئے ہیں۔

ڈاڑھی رکھنا فطرت ہے، ایک لطیفہ

ایک صاحب حضرت مولانا سید اسماعیل شہیدؒ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ڈاڑھی رکھنا فطرت کے خلاف ہے، کیونکہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے، تو ڈاڑھی نہیں ہوتی، حضرت نے فرمایا: پھر تو آپ اپنے دانت بھی توڑ لیجئے، کیونکہ وہ بھی فطرت کے خلاف ہیں، اس لئے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے، تو دانت بھی نہیں ہوتے، قریب میں مولانا عبدالحی صاحب بڑھانویؒ بیٹھے ہوئے تھے، وہ کہنے لگے، واہ، کیا دنداں شکن جواب دیا۔

جس کا خدا ایسا ہو، ایک واقعہ

فرمایا حضرت جنید بغدادیؒ کے پاس ایک عورت اپنے شوہر کی شکایت لیکر آئی اور کہنے لگی، حضرت! میں اتنی حسین ہوں، پھر بھی میرا شوہر دوسری عورتوں کی طرف نظر کرتا ہے، اور غیر عورتوں کے پاس جاتا ہے، اور میری طرف کوئی التفات نہیں کرتا، پھر کہنے لگی کہ اگر شریعت میں پردہ کا حکم نہ ہوتا تو میں اپنا چہرہ آپ کے سامنے کھول کر بتاتی کہ مجھے اللہ نے کیسا حسین بنایا ہے، یہ سن کر حضرت جنیدؒ بے ہوش ہو گئے، ہوش آنے کے بعد مریدین نے پوچھا کہ حضرت! کیا بات تھی، کیوں آپ پر

غشی طاری ہوگئی، حضرت نے فرمایا کہ تم نے اس عورت کی بات سنی نہیں، وہ کیا کہہ رہی تھی کہ میرے جیسی حسین عورت کے ہوتے ہوئے بھی میرا شوہر دوسروں کی طرف نظر کرتا ہے، یہ سن کر مجھے ایک حدیث قدسی یاد آگئی، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ فرماتا ہے کہ: جس کا خدا میرے جیسا ہو، کیا وہ بندہ مجھے چھوڑ کر دوسروں کی طرف نظر کرسکتا ہے؟ سورج کو دیکھو، چاند کو دیکھو، کتنے حسین ہیں، تو ان کو بنانے والا کیسا حسین ہوگا، جو مٹھاس کو پیدا کرنے والا ہے، اس میں کیسی مٹھاس ہوگی، ماں کے دل میں محبت پیدا کرنے والا خدا، بندوں سے کتنی محبت کرتا ہوگا، ایسے خدا کو چھوڑ کر ہم کہاں بھٹک رہے ہیں۔(فانی تؤفکون)

مقتدیٰ کا معیار لوگوں کے نزدیک

قرآن کریم میں اللہ تعالے فرماتے ہیں:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ○

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور صادقین کے ساتھ رہو۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے صادقین کی معیت اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے، اب سوال یہ ہے کہ ہم کس کی اتباع کریں، کس کے پیچھے چلیں، یہ ایک گھمبیر مسئلہ ہے، کیوں کہ ہر ایک آج یہی چاہتا ہے کہ لوگ میری اتباع کریں، آج لوگ مختلف معیار متعین کر رکھے ہیں، کوئی خاص منصب کو معیار قرار دیتا ہے، کوئی شہرت کو معیار قرار دیتا ہے، کوئی مالداری کو معیار قرار دیتا ہے تو کوئی عہدوں کو معیار مانتا ہے، مگر یہ لوگوں کے اُصول وضابطے قرآن وحدیث کے اُصول وضابطوں سے میل نہیں کھاتے۔

مقتدیٰ کا معیار قرآن کی نظر میں

میں کہتا ہوں کہ ہمیں معیار متعین کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، کیونکہ جب قرآن کریم کسی کی اتباع میں زندگی گزارنے کا حکم دے رہا ہے، تو مقتدیٰ کی تعیین اور نشاندہی بھی قرآن کریم کی ذمہ داری ہے، چنانچہ قرآن کریم نے اس مسئلہ کو صاف کر دیا ہے، ایک جگہ قرآن مجید میں ہے: ﴿وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ أَنَابَ اِلَيَّ﴾ اللہ تعالے نے فرمایا کہ ایسے شخص کی اتباع کرو جو میری طرف متوجہ ہے، قرآن نے کیا عجیب اصول بیان کیا ہے مقتدیٰ کے انتخاب کا! فرمایا کہ جو میری یعنی اللہ کی طرف متوجہ ہو اُس کی اتباع کرو، جس پر اللہ کے عشق کا رنگ چڑھا ہوا ہو، ذکر کا رنگ چڑھا ہوا ہو، اس کی اتباع کرو، یہ نہیں فرمایا کہ: جس کا علم زیادہ ہو اُس کی اتباع کرو، جس کی شہرت زیادہ ہو، اُس کی اتباع کرو، جو عہدے والا ہو اُس کی اتباع کرو، بلکہ یہ فرمایا کہ جو اللہ کی طرف نظریں جمائے ہوئے ہو، جسے ہر آن اس کی رضا کا فکر ہو، اس کی خوشنودی کی جستجو ہو، اُس کی اتباع کرو۔

اسی طرح قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہے: ''فَاسْئَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ'' (اگر تمہیں علم نہ ہو تو اہلِ ذکر سے پوچھو) یہ آیت بڑی قابل لحاظ ہے، اس میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ موقعہ ایسا تھا کہ یہاں ''فَاسْئَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ'' کی جگہ '' فَاسْئَلُوْا أَهْلَ الْعِلْمِ'' کہنا چاہئے تھا، کیونکہ یہاں علم نہ رکھنے والوں کو علم حاصل کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے، لہذا اہلِ علم سے علم حاصل کرنے کا حکم دینا چاہئے تھا، کیونکہ علم نہ ہو تو علم والوں سے ہی پوچھتے ہیں، نہ کہ جہلاء سے، جیسے مال نہ ہو تو مالدار سے مانگا جاتا ہے نہ کہ فقیر سے، اسی طرح علم نہ ہو تو اہل علم سے پوچھا جاتا ہے، نہ کہ اہل ذکر سے، مگر اہل ذکر سے پوچھنے کا حکم دے کر اللہ

تعالیٰ نے یہ بتا دیا کہ علم اُسی وقت سودمند ونافع ہوتا ہے، جب علم کے ساتھ اللہ کا ذ کر بھی ہوتا ہو، جس علم کے ساتھ اللہ اور رسول کی اتباع ہوتی ہو، آپصلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا:

الا انبئکم بخیارکم ؟ قالوا بلی یا رسول اللّٰہ، قال خیارکم الذین اذا رُؤوا ذُکِرَاللّٰہ عز وجل) **(ابن ماجہ: ۴۱۰۹)**

یعنی اللہ والے وہ ہیں جنہیں دیکھ کر اللہ یاد آجائے، یہ ہے اصل معیار اللہ وا لے کا جسے مقتدیٰ بنایا جا سکتا ہے۔ ورنہ ہر جبہ قبہ والا، اللہ والا نہیں ہوسکتا، جیسا کہ ہر سفید چیز چاندی نہیں ہوتی، اور ہر پیلی چیز سونا نہیں ہوتی، اسی طرح ہر علم والا اور ہر تقریر کرنے والا، قابلِ اتباع اور مقتدیٰ نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس علم کے ساتھ ذکر و انابت، تقویٰ وطہارت، زہد وقناعت، عبادت وریاضت جیسی صفات کا ہونا بھی لازم ہے۔

ایک سوال کا جواب

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلمنے تو ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ ''امیر جیسا بھی ہو اُسکی اتباع کرو''۔ ایک حدیث میں فرمایا کہ اگر چہ حبشی غلام کو امیر بنا دیا جائے اس کی بھی اتباع کرو۔ **(مسلم: ۳۴۲۰)**

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر امیر کی اتباع کرنا ضروری ہے، بظاہر یہ آیت قرآن سے متعارض معلوم ہوتی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث مطلق نہیں مقید ہے، یعنی ہر امیر کی اتباع کرو اس کے دائرہ میں، مطلب یہ ہے کہ کوئی امیر ہو، کوئی عہدہ دار ہو، کوئی صدر ہو، کسی مدرسہ کا ذمہ دار ہو، کسی کالج کا ذمہ دار ہو، تو ان کی امارت اُن کی انجمن تک، اُن کی صدارت اُن کے مدرسہ تک، یا مسجد تک یا اسکول

وکالج تک محدود ہوگی ،اور یہ بھی ضروری ہے،اس لئے کہ اگران کی اتباع نہ کی گئی تو سارانظام درہم برہم ہوجائیگا، نہ کوئی ادارہ چل پائے گا، نہ کوئی انجمن ترقی کرے گی، نہ کوئی مدرسہ یا اسکول یا کالج چل سکیں گے۔

مگراس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی کالج یا اسکول کا ذمہ دار ہو، یا کسی ادارہ کا بانی وسرپرست ہو یا کسی جامعہ کا استاذ ہو،تو قرآن وحدیث کے سلسلہ میں بھی اُسی کی اتباع کی جائے گی ،اوراس کو مقتدائیت حاصل ہو جائے گی ، ہرگز نہیں، بلکہ اس کا معیار تو وہ ہے جو ابھی عرض کیا گیا کہ جو اہل ذکر واہلِ انابت میں سے ہو وہی اس کا حق رکھتا ہے کہ وہ مقتدیٰ بنے۔

گویا قرآن جس اتباع کی بات کررہا ہے، وہ اللہ کے اور دین کے راستہ میں چلنے کے سلسلہ میں اتباع ہے، خدا تک رسائی پانے کے سلسلہ میں اتباع ہے، وہ اتباع جس سے خدا مل جائے ، جنت مل جائے ، اُسکے لئے جب تک اللہ والے کی اتباع نہ ہوگی، خدا کبھی نہیں مل سکتا ،اور حدیث جس اتباع کا ذکر کررہی ہے اس سے مراد مختلف انتظامی امور میں اتباع ،لہذا کوئی تعارض نہیں۔

دنیادار کی اتباع سے بچو،ایک واقعہ

مقتدائیت کا یہ معیار سامنے نہ ہونے کی وجہ سے آج ہرکسی کی لوگ اتباع کر لیتے ہیں اور بعض وقت اسی کی وجہ سے گمراہی میں پڑ جاتے ہیں،حتی کہ دنیادار قسم کے لوگوں کی بھی اتباع کرلیتے ہیں،اس پر ایک قصہ یاد آیا کہ ایک مرید نے ایک عجیب خواب دیکھا اوراپنے شیخ سے جا کر بتایا تا کہ اس کی تعبیر معلوم ہوجائے،اس نے کہا کہ حضرت! میں نے آج خواب میں دیکھا کہ میرے سامنے دو برتن ہیں،اور ایک برتن میں شہد ہے،اور ایک برتن میں نجاست ہے، پھر دیکھا کہ آپ کے ہاتھ شہد

والے برتن میں ڈوبے ہوئے ہیں، اور میرے ہاتھ نجاست والے برتن میں پڑے ہوئے ہیں، یہ سن کر وہ شیخ صاحب کہنے لگے کہ اس کی تعبیر تو واضح ہے کہ ہمارے ہاتھ شہد میں ہیں یعنی دین میں ڈوبے ہوئے ہیں اس میں ہمارے دیندار ہونے کی طرف اشارہ ہے، اور تمہارے ہاتھ نجاست میں ڈوبے ہوئے تھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تم دنیا دار ہو، دنیا کی مثال پاخانہ کی طرح ہے، اس لئے تمہارے ہاتھ پاخانہ میں ڈوبے ہوئے نظر آئے تھے، اور ہمارے ہاتھ شہد میں ڈوبے ہوئے نظر آئے تھے، اس مرید نے کہا حضرت! آپ کی تعبیر تو صحیح ہے، مگر ابھی خواب پورا نہیں ہوا، پورا خواب سن لیجئے، کہ میں نے آگے خواب میں یہ بھی دیکھا کہ آپ کی شہد میں ڈوبی ہوئی اُنگلیاں میں چاٹ رہا ہوں اور میری نجاست میں ڈوبی ہوئی انگلیاں آپ چاٹ رہے ہیں، یہ سن کر وہ شیخ غصہ میں آگیا اور اُس کو بھگا دیا، حضرت تھانویؒ کہتے ہیں: خواب کے اس آخری حصہ کی تعبیر میں دیتا ہوں، وہ یہ کہ اُس مرید کے ہاتھ واقعی دنیا میں ڈوبے تھے، مگر وہ دین لینے کیلئے شیخ کے پاس آیا تھا، اس لئے شیخ کے ہاتھ سے شہد چاٹ رہا تھا مگر وہ پیر مرید کو دین پہونچانے کے بجائے، اُس سے دنیا حاصل کرتا تھا، اس لئے وہ اس مرید کی نجاست سے آلودہ اُنگلیاں چاٹ رہا تھا۔

افسوس کہ یہ حال ہے آج، مقتداؤوں کا، اس لئے دنیا داروں سے بچنا چاہئے، اس لئے کہ دنیا دار کی اتباع سے دنیا ملتی ہے، دیندار کی اتباع سے اللہ ملتا ہے۔

کیا آج اللہ والے نہیں ہیں

فرمایا: آج کل لوگ یوں کہتے ہیں کہ اللہ والے آج کہاں ہیں؟ جنید بغدادیؒ کہاں سے آئیں گے شبلی اور بایزید بسطامی کہاں سے آئیں گے، کہ ہم ان

سے فیض حاصل کریں؟ فرمایا: یہ شیطانی دھوکہ ہے، بلکہ ایسا کہنے والا ایک آیت کا در پردہ منکر ہے، اللہ نے فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ٥

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور صادقین کی صحبت اختیار کرو۔

اس آیت میں لوگوں کو صادقین کے ساتھ رہنے کا حکم دیا گیا ہے، اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ ہر زمانے میں نیک ومتقی لوگ رہیں گے، یہ ایسا ہی ہے، جیسے باپ اپنے بچوں سے یوں کہے کہ بچو! روزانہ دودھ پیا کرو، اب اگر باپ بچوں کو دودھ کا انتظام نہ کرے تو وہ باپ ظالم ہوگا، اسی طرح اللہ تعالے یہ کہہ رہے ہیں کہ متقیوں کے ساتھ رہو، تو ہر زمانے میں متقیوں کو، اللہ والوں کو پیدا کرنا اس کا کام ہے، اب اگر کوئی یہ کہے کہ آج اللہ والے نہیں ہیں، تو گویا وہ یہ کہہ رہا ہے کہ آج قرآن کی اس آیت پر عمل نہیں ہوسکتا، اس لئے ایسا آدمی قرآن کی ایک آیت کا گویا منکر ہے، لہذا ایسا سوچنا غلط ہے، بلکہ آج بھی اللہ والے ہیں، ان کو تلاش کر کے اپنی اصلاح کریں، یہ الگ بات ہے کہ ہر زمانے کے اعتبار سے اللہ والے الگ الگ صلاحیتوں کو لیکر آتے ہیں، جوان کے زمانے کی ضرورت ہوتی ہے، کسی زمانے میں حضرت ابوبکر وعمر بن الخطاب وعثمان وعلی وعمر بن عبد العزیز کی ضرورت تھی، تو کسی زمانے میں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام ابن ابی لیلی وامام اوزاعی جیسے حضرات کی ضرورت تھی، کسی زمانے میں امام بخاری، امام مسلم، امام عبد الرزاق، امام ترمذی، امام ابوداؤد، ابن الجوزی، ابن الصلاح، ابن حجر جیسوں کی ضرورت تھی، کسی زمانے میں حسن بصری، شیخ عبد القادر الجیلانی، حضرت جنید وحضرت شبلی، بایزید بسطامی وغیرہ کی

ضرورت تھی، کسی زمانے میں رازی وغزالی وابن رشد کی ضرورت تھی، تو کسی وقت میں قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوہی، خلیل احمد سہارنپوری، اشرف علی تھانوی کی ضرورت تھی تو ان کو پیدا کیا۔

اللہ والے کہاں ملیں گے

ایک اہم بات سن لو کہ بہت سے اللہ والے ہمارے بغل میں ہی رہتے ہیں، مگر ہم اُنکو نہیں پہچانتے، ہمارے ساتھ ہوتے ہیں، ہم نہیں جانتے، آپ نے سنا ہوگا کہ ہندوستان کے مغل بادشاہ شاہ جہاں کا جب آخری وقت آیا تو اُن کی اولاد میں حکومت وسلطنت کے بارے میں اختلاف ہوا، ان کی اولاد میں ایک تو دارا شکوہ تھا، دوسرے اورنگ زیب تھے، دونوں حکومت چاہتے تھے، اورنگ زیب نیک انسان تھے، وہ حکومت سے دین کو تقویت دینا چاہتے تھے، اور دارا شکوہ غلط کار صوفیوں میں رہنے کی وجہ آزاد منش ہوگیا تھا، ایک مرتبہ دہلی میں ایک بزرگ آئے، اوران کی شہرت ہوئی کہ ایک مستجاب الدعوات بزرگ تشریف لائے ہیں، ان سے حکومت کے لیے دعاء کروانے پہلے دارہ شکوہ گئے، اوران بزرگ صاحب سے ملاقات کی، اُنہوں نے شاہزادے کا استقبال کیا اور کہا کہ میری گدّی پر بیٹھ جاؤ، مگر دارہ شکوہ نے براہِ ادب انکار کر دیا، اوران کے سامنے بیٹھ گیا، اور باتیں ہوتی رہیں، پھر رخصت کے وقت دارہ شکوہ نے کہا کہ حضرت! دعاء کیجئے کہ میرے باپ کی حکومت مجھے مل جائے، وہ بزرگ کہنے لگے کہ ہم نے تو اپنی گدّی پر بٹھا کر آپ کو حکومت دینی چاہی، مگر آپ نے انکار کر دیا، اب حکومت نہیں ملے گی، وہ افسوس کرتے ہوئے واپس ہو گئے، کچھ دیر بعد اورنگ زیب بھی ان سے دعاء کرانے حاضر ہوئے، بزرگ صاحب نے اُن کو بھی گدی پر بیٹھنے کا حکم فرمایا، پہلے

تو اورنگ زیب نے بھی براہِ ادب انکار کیا، پھر جب ان بزرگ نے حکم دیا تو ان کی گدی پر یہ کہتے ہوئے بیٹھ گئے کہ '' الامر فوق الادب ''، پھر اورنگ زیب بھی مختلف امور پر گفتگو فرماتے رہے، پھر آخر میں عرض کیا کہ حضرت! دعاء کیجئے کہ میرے باپ کا تخت وتاج مجھے مل جائے، انہوں نے کہا کہ تخت پر تو ہم نے اللہ کے حکم سے آپ کو بٹھا دیا، مگر تاج میں نہیں دے سکتا، بلکہ آپ کا غلام جو آپ کو روزانہ وضو کراتا ہے، وہ اگر آپ کے سر پر عمامہ رکھ دے، تو تاج بھی مل جائے گا، اورنگ زیب نے تعجب سے کہا: میرا غلام جو میری جوتیاں سیدھی کرتا ہے، کیا وہ اتنا بڑا اللہ والا ہے، گھر گئے اور وضو کے بعد غلام کو حکم دیا کہ عمامہ پہنا دو، غلام نے کہا: حضور میں آپ کے سر پر کیسے رکھ سکتا ہوں، گستاخی ہوگی، اورنگ زیب نے کہا: میرا حکم ہے رکھ دو، اُس نے رکھ تو دیا مگر سمجھ گیا کہ میرا راز فاش ہوگیا ہے، اُس کے بعد وہ وہاں سے غائب ہوگیا، دیکھئے! جسے غلام اور نوکر سمجھا جاتا رہا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا کتنا بڑا مقام تھا، لہذا آج بھی اللہ والے موجود ہیں، مگر پہچاننے والی آنکھ چاہئے۔

اوصاف اہل اللہ

فرمایا کہ آج لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک کرامت کا ظہور نہ ہو، وہ اللہ والا نہیں ہوسکتا، اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ وہ سنتوں کا کتنا پابند ہے، اللہ سے کتنا ڈرتا ہے، اگرچہ کرامت ظاہر نہ ہو، اُس کی شہرت نہ ہو، ایک واقعہ لکھا ہے کہ کسی بزرگؒ کو معلوم ہوا کہ ان کے شہر میں ایک بزرگ آئے ہوئے ہیں، وہ بزرگ ملاقات و زیارت کے لئے تشریف لے گئے، جا کر دیکھا تو وہ مہمان بزرگ وضو کر رہے تھے، کچھ دیر وہ کھڑے ہو کر ان کا وضو دیکھتے رہے، پھر واپس آگئے، ملاقات نہیں کی،

شاگردوں نے پوچھا کہ حضرت! آپ ان بزرگ سے ملنے گئے تھے، مگر ملاقات کئے بغیر واپس آ گئے، کیا بات ہے؟ فرمایا: میں اُن کے وضو کے طریقہ کو دیکھ رہا تھا، جو سنت کے خلاف تھا، جسے وضو کی سنتیں ہی معلوم نہ ہوں، وہ اللہ والا کیسے ہوسکتا ہے۔

اگر ہدایت نہ پانا چاہے

کوئی ہدایت نہ پانا چاہے تو نبی کا معجزہ بھی کام نہ آئے گا، جیسا کہ مولانا رومی نے مثنوی میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ابوجہل، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہا کہ میرے ہاتھ میں کیا ہے؟ اگر آپ بتادیں گے تو میں ایمان لے آؤں گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں بتاؤں کہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ تیرے ہاتھ کی چیز خود بتادے کہ میں کون ہوں، اس کے بعد فرمایا کہ اپنے ہاتھ کو اپنے کان کے قریب لے جاؤ، وہ جب اپنے کانوں کے قریب لے گیا، تو ہاتھ کی کنکریوں سے آواز آرہی تھی (**لا اله الا الله محمد الرسول الله**) لیکن اس پر بھی اسے ہدایت نہیں ملی، اس نے ہاتھ کی کنکریوں کو پھینک دیا، اور کہنے لگا کہ محمد ﷺ کا جادو انسانوں ہی پر نہیں، کنکریوں پر بھی چلتا ہے۔

نوٹ: مثنوی شریف کے علاوہ کہیں کتب حدیث میں اس واقعہ کا ذکر نہیں ہے۔

دیکھئے ابوجہل ہدایت پانا نہیں چاہتا تھا، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ بھی اس کے کام نہ آیا۔

ایمان کی ٹھنڈک کیسے حاصل ہو

فرمایا: مجھے ایک واقعہ یاد آیا کہ حضرت مولانا شاہ ابرارالحق صاحب جدہ میں کہیں جانے کے لیے ایک مرتبہ کار میں بیٹھے، خوب گرمی تھی اور لُو چل رہی تھی،

حضرت نے فرمایا کہ ایرکنڈیشن چلا دو،اے ،سی (AC) چلا دیا گیا،لیکن کار میں ٹھنڈک نہیں آئی،تو حضرت نے فرمایا کہ کیا وجہ ہے تمہارا ایرکنڈیشن کچھ ناقص ہے؟ ٹھنڈک کیوں نہیں آرہی ہے،تو ڈرئیور نے کہا کہ شاید کار کا کوئی شیشہ کھلا ہوا ہے، جس سے باہر کی گرمی اندر آرہی ہے، دیکھا تو ایک طرف کا شیشہ کھلا ہوا تھا،جلدی سے شیشہ بند کردیا گیا اور تھوڑی ہی دیر میں پوری کار ٹھنڈی ہوگئی، گرمی اور لو سے حفاظت ہوگئی،اس پر حضرت والاؒ نے ایک عجیب بات فرمائی جو قابل وجد ہے،فرمایا کہ اے،سی،چالو ہونے کے باوجود کار میں ٹھنڈک اس لئے نہیں آئی کہ اس کا ایک شیشہ ذرا سا کھلا ہوا تھا،اسی طرح اگر آنکھ کان،زبان وغیرہ کا شیشہ کھلا ہوا ہو،تو دل میں ایمان کی ٹھنڈک داخل نہیں ہوسکتی،اس لئے اگر ایمان کی ٹھنڈک چاہتے ہو،تو آنکھ کان وغیرہ پر پابندی لگانا ہوگا اور ان کو بند رکھنا ہوگا۔

طہارت کیا ہے

حدیث میں ہے"الطھور شطر الایمان"پاکی آدھا ایمان ہے

(مسلم:۳۲۸،ترمذی:۳۴۳۹)

اور ایک حدیث میں ہے کہ "لاتقبل صلوۃ بغیر طھور"(ترمذی:۱) کہ بغیر پاکی صفائی کے نماز قبول نہیں ہوتی،اب سوال یہ ہے کہ طہارت کیا ہے؟ سب سے پہلے یہ سمجھو کہ طہارت کے متعلق جو فرمایا کہ طہارت نصف ایمان ہے، دراصل اس میں جو لفظِ شطر آیا ہے اس میں علماء میں اختلاف ہے کہ شطر کے کیا معنی ہیں؟ بعض کہتے ہیں کہ شطر کے معنی آدھا اور نصف کے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ شطر کے معنی حصہ کے ہیں،اور یہ دونوں معنے صحیح ہیں،اگر شطر کو حصہ کے معنی میں لیا جائے تو اس حدیث کا معنی ہوگا کہ پاکی صفائی ایمان کا ایک حصہ ہے اور ایک جزو ہے جو بہت ہی اہم اور

عظیم ہے، اور اگر اس کو نصف کے معنی میں لیا جائے تو اب اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پا کی صفائی آدھا ایمان ہے، یعنی اس کا اتنا بڑا مقام ہے کہ نماز، روزہ، زکوۃ، حج، ذکر، درس وتدریس سب ایک طرف اور پا کی صفائی دوسری طرف، یعنی ایمان کے دوحصوں میں سے ایک حصہ میں ساری عبادات اور تمام احکامات ہیں، اور اس میں وہ سب کچھ ہے جو کہ اسلام کا مقتضی ہے، اور دوسرے حصہ میں صرف پا کی صفائی، تنظیف وتطہیر ہے، اتنا بڑا مقام ہے طہارت کا۔

طہارت کے چار اقسام ہیں

اس پر بظاہر ایک شبہ ہوتا ہے کہ یہ بات کس طرح درست ہوسکتی ہے کہ تمام عبادات وسارے احکامات ایک طرف ہوں اور صرف پا کی وطہارت ایک طرف؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شبہ اس لیے ہوتا ہے کہ ہم طہارت کا بہت ادنیٰ ومحدود مفہوم مراد لیتے ہیں، اور اگر اس کا وہ وسیع مفہوم مراد لیا جائے جو اسلام پیش کرتا ہے تو یہ شبہ خود کافور ہو جائے گا، علماء فرماتے ہیں کہ پا کی وطہارت کی چار قسمیں ہیں:

۱- اپنے ظاہر کو پاک کرنا، جس میں کپڑے بدن وغیرہ کی پا کی داخل ہے یہ سب سے ادنیٰ درجہ کی پا کی ہے۔

۲- اپنے ظاہری اعضاء کو گناہوں سے پاک کرنا، کیونکہ گناہ بھی ایک نجاست ہے، جیسے آنکھ، کان، زبان، ہاتھ، پیر، وغیرہ کو ان سے ہونے والے گناہوں سے بچایا جائے۔

۳- اپنے باطن اور دل کو باطنی گناہوں سے پاک کرنا، جیسے حسد، بغض، تکبر، انانیت، کینہ، وغیرہ سے پا کی حاصل کرنا۔

۴- اور یہ سب سے اعلی وارفع ہے، وہ یہ کہ اپنے دل کو ماسوی اللہ سے

پاک وصاف رکھے اور اپنے دل سے تمام فانی چیزوں کی محبت کو نکال دے، اور اس دل کو صرف اللہ کی محبت سے مزین رکھے۔

اس تفصیل کو سامنے رکھ کر سوچو کہ کیا یہ سب مل کر آدھا ایمان نہیں ہو گیا؟ اور کیا ان سب پر آدھے ایمان ہونے کی بات صادق نہیں آتی؟ اشکال اس لیے ہوتا ہے کہ ہم لوگ عام طور پر پاکی کو صرف جسم اور کپڑوں اور بعض ظاہری چیزوں کی پاکی تک محدود سمجھتے ہیں، حالانکہ اس کی اور بھی تین قسمیں ہیں۔

سوءِ حافظہ کا علاج

امام شافعیؒ ایک مرتبہ اپنے استاد امام وکیعؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، امام وکیع امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں سے ہیں اور امام بخاریؒ کے استاد ہیں، بہر حال امام شافعیؒ نے امام وکیع سے شکایت کی کہ بعض دفعہ کوئی چیز یاد کرتا ہوں تو یاد نہیں رہتی، بھول جاتا ہوں، اس کا کوئی علاج بتائیے، امام وکیعؒ نے فرمایا کہ گناہ چھوڑ دو، علم الٰہی تمہیں حاصل ہو جائے گا کیوں کہ علم دین دراصل علم الٰہی ہے اور علمِ الٰہی گناہ گار کو نہیں دیا جاتا۔

اس واقعہ کو امام شافعیؒ نے اپنے اشعار میں اس طرح بیان کیا ہے:

شکوت الی وکیع سوء حفظی ❁ فاوصانی الی ترک المعاصی

فان العلم نور من الٰہی ❁ و نور اللہ لا یعطی لعاصی

میں آپ طلباء کرام کو دعوتِ فکر دیتا ہوں، آپ لوگ سوچیں، ذرا غور کریں کہ امام شافعیؒ جیسے جلیل القدر امام سے بھی کوئی گناہ ہوتا تھا؟ کیا وہ گناہ کیا کرتے تھے؟ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ معصوم تھے، یہ عصمت تو انبیاء کی شان ہے، اور بڑے سے بڑا امام بھی گناہ کر سکتا ہے، مگر ان کے جلیل القدر مقام کو دیکھکر دل یہ کہتا

ہے کہ وہ اگر چہ معصوم نہیں تھے، کبھی کبھی ہوسکتا ہے کہ گناہ صادر ہوجائے لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ گناہ گار اور دن رات گناہوں میں ملوث تھے، اس کے باوجود امام وکیع نے ان کو یہ نصیحت کی کہ گناہ چھوڑ دو، سوال یہ ہے کہ جب امام شافعی گناہ گار نہیں تھے تو پھر امام وکیع نے ان کو یہ نصیحت کیوں کی؟ اس کا جواب یہ کہ امام وکیع کی اس تلقین سے مراد یہ نہیں کہ گناہ چھوڑ دو، کیونکہ وہ تو پہلے سے چھوڑے ہوئے ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ خلافِ اولی کام بھی نہ کرو، جب امام وکیع یہ کہہ رہے ہیں کہ خلافِ اولی کام بھی ترک کردو، تو ذرا اندازہ لگائیے کہ گناہ کا کام کرنے والے کو کس طرح علم حاصل ہوسکتا ہے؟ اس لئے بھائیو! گناہ سے بچنا اور اس سے پرہیز کرنا چاہئے، تاکہ علم الٰہی دل میں اُتر جائے، ورنہ اگر نور الٰہی دل میں پیدا نہ ہو تو جینے کا کیا مزہ؟ اس سے تو موت کئی گناہ بہتر ہے، دعاء ہے کہ اللہ ہم سب کو اپنا غلام بنائے، آمین۔

مسیح الامت کا تعلیمی دور

ہمارے حضرت مسیح الامت مولانا شاہ مسیح اللہ خان صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ دارالعلوم دیوبند میں میرے ساتھ کمرے میں دو ساتھی اور تھے، اور ایک ہی کمرے میں رہتے تھے، اور دو سال تک ہم سب ایک ہی کمرے میں تھے، مگر میں نے کبھی بھی ان سے مل کر بات چیت اور غپ شپ نہیں کی، حتیٰ کہ مجھے اس طویل عرصہ میں ان کا نام تک معلوم کرنے کا موقعہ نہیں ملا، اور فرمایا کرتے تھے کہ میں اس دور میں درس گاہ، حجرہ اور مسجد کے علاوہ کسی جگہ نہیں گیا، حتیٰ کہ دفتر بھی نہیں گیا۔

بھائیو! سنا آپ نے کہ کس قدر عقل کو حیران کرنے والا واقعہ ہے کہ دو سال ایک ہی کمرے میں رہتے ہوئے گزر گئے، مگر حضرت والاؒ کو اپنے کمرے کے ساتھیوں کا نام تک معلوم نہ ہوسکا، ان سے بات چیت اور ایران و توران کی گفتگو تو دور کی بات

ہے،بس حضرت کا معمول یہ تھا کہ کمرے سے نکلے،تو درسگاہ پہنچے، پھر درسگاہ سے کمرہ پہنچ گئے اور مطالعہ شروع کر دیا،اور اسباق کی فکر میں لگ گئے،اور جب نماز کا وقت ہو اتو مسجد چلے گئے،کسی سے بات چیت نہیں ، یہ درحقیقت طالب علم کے طالب علم ہونے کی شان ہے،تب جا کر علم اپنا تھوڑا سا حصہ دیتا ہے۔اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ سے اللہ نے دنیا میں ایک بڑا فیض کا سلسلہ جاری فرما دیا اور آپ کے خوشہ چینوں میں ہزاروں علماء وصوفیاء آج بھی علم کا دریا بہا رہے ہیں۔

❁ زبان تو ذکر کے لئے ہے

ایک بزرگ نے بڑی عبرت خیز بات فرمائی ہے کہ جب بچہ رحم مادر میں ہوتا ہے تو اللہ تعالےٰ اس کی پرورش کرتے ہیں،اسے رزق پہنچاتے ہیں،کس طرح ؟اس طرح کہ عورت کو جو ماہانہ خون آتا ہے،اسی خون کو اللہ تعالےاس کی غذا بنا دیتے ہیں لیکن بچہ کو یہ رزق اس کے منہ کے ذریعہ نہیں بلکہ اس کی ناف سے دیا جاتا ہے،سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ایسا انتظام کیوں کیا ہے؟ جبکہ اس کے پاس منہ بھی ہوتا ہے،مگر منہ کے بجائے ناف سے کیوں اس کو غذا پہنچائی جاتی ہے؟

ان بزرگ نے فرمایا کہ بچہ کو ناف کے ذریعہ رزق پہنچانا اور زبان سے نہ پہنچانا ،اس میں یہ حکمت رکھی ہے کہ بچہ کو جو غذا وہاں دی جاتی ہے وہ دراصل وہ خون ہے جو عورت کو ماہوار نکلتا ہے،اب رحم میں بچہ آنے کے بعد اللہ تعالیٰ اسی خون کو اپنی قدرت کاملہ سے اس کی غذا بنا دیتے ہیں،اور یہ سب کو معلوم ہے کہ خون ناپاک اور گندہ ہوتا ہے،اگر اس کو وہ خون منہ سے دیا جاتا تو زبان ناپاک اور گندی ہو جاتی،اور زبان کو اللہ نے اپنے ذکر کے لیے بنایا ہے،تو پہلے ہی سے اللہ نے اس کی اس طرح حفاظت فرمائی کہ اس کو رحمِ مادر میں بھی ناپاک خون سے محفوظ رکھا۔اس وجہ سے جس

زبان سے اللہ کا ذکر ہو، اللہ کا نام لیا جاتا ہو وہ زبان گندی نہ ہو جائے، وہ فرماتے ہیں کہ اس لئے اللہ نے اس کے رزق کا انتظام زبان کے بجائے دوسری جگہ یعنی ناف سے کیا۔

میں کہتا ہوں کہ اب ذرا غور کیجئے کہ آج زبان کو کتنا گندہ کیا جاتا ہے، ایک طرف اس سے گالیاں دی جاتی ہے، اور دوسری طرف اسی زبان سے قرآن پڑھا جاتا ہے، ایک طرف اس سے چغلی کھائی جاتی ہے، اور دوسری جانب اسی سے حدیثِ پاک پڑھی جاتی ہے، ایک طرف اس سے غیبتیں کی جاتی ہیں پھر اسی زبان سے اللہ کو یاد کیا جاتا ہے، یہ کتنی بے ادبی کی بات ہے، اللہ تعالے نے تو رحمِ مادر میں بھی ہماری زبان کی ناپاک خون سے حفاظت کی اور ہم یہاں آکر اس کو ہر طرح کی گندگی سے آلودہ کر لیتے ہیں۔

ایک بزرگ نے فرمایا کہ اگر میں سو بار بھی اپنی زبان کو مشک وعنبر سے دھوؤں، تب بھی اس زبان سے اللہ کا نام لینا کمالِ بے ادبی ہے، دیکھا بھائی! اللہ کے نام کا کتنا احترام ہے ان کے نزدیک، اور ایک ہم ہیں کہ اپنی زبانوں کو گندہ کرتے رہتے ہیں، پھر اسی زبان سے اللہ کا نام بھی لیتے ہیں، کیا اللہ کا نام اتنا آسان ہے کہ ہم اپنی گندی زبان سے اس کو لیں، اللہ جیسا پاکیزہ نام، اور یہ بے ادبی؟ جب ادنی سے ادنی کا نام احترام سے لیا جاتا ہے تو پھر اللہ کے نام کا کتنا اور کیسا احترام ہونا چاہئے تھا؟

ماءِ مستعمل ناپاک کیوں ہے؟

حدیث میں آتا ہے کہ جب آدمی وضو کرتا ہے اور پورے آداب کی رعایت کے ساتھ کرتا ہے، تو اس کے تمام اعضاء سے حتی کہ ان کے ناخنوں کے پوروں سے

بھی گناہ جھڑتے اور نکل جاتے ہیں۔ (ترمذی شریف:۲)

معلوم ہوا کہ وضو کے اعضاء سے وضو کرنے والے کے گناہ جھڑتے ہیں اور یہ اس پانی کے ساتھ نکلتے ہیں جو وہ وضو میں استعمال کرتا ہے، یہ کتنی بڑی فضیلت ہے وضو کی، اور مومن کے لیے کس قدر سامانِ تسلی ہے اس میں!

اب یہیں سے ایک فقہی مسئلہ بھی حل کرتے چلیں، وہ یہ کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے ماء مستعمل کو اپنی ایک روایت میں ناپاک قرار دیا ہے، اس حدیث سے اس مسئلہ کی تائید ہوتی ہے کیونکہ گناہ ایک باطنی گندگی ہے، جب وہ گندگی وضو کے پانی کے ساتھ مل جاتی ہے تو اس پانی کو بھی ناپاک کر دیتی ہے۔

ایک بہت بڑے عالم علامہ عبدالوھاب شعرانیؒ جو کہ شافعی تھے، وہ فرماتے ہیں کہ امام اعظم کو لوگوں کے حالات منکشف ہو جایا کرتے تھے، اور جب لوگ وضو کرتے تو ان کے اعضاء سے نکلا ہوا پانی جب گرتا تھا تو اس میں امام صاحب کو گناہ کے جراثیم نظر آ جاتے تھے، اس لئے امام صاحب نے اس مستعمل پانی کو نجاست غلیظہ کہا، اور امام صاحب سے ایک اور روایت یہ ہے کہ یہ مستعمل پانی نجاستِ خفیفہ ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ وضو کا جو پانی اعضاء سے نکلتا ہے گویا کہ وہ ناپاک ہے۔

اس فقہی مسئلہ سے ایک سلوک کا مسئلہ عرض کرتا ہوں کہ جب امام صاحبؒ گناہ سے ملے ہوئے پانی کو ناپاک قرار دے رہے ہیں تو اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ امام صاحب کے نزدیک گناہ بڑی ناپاک چیز ہے، اور اس کے ناپاک ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حدیث میں ہے کہ جب کوئی جھوٹ بولتا ہے تو اس کے پاس سے فرشتے بھاگ جاتے ہیں کیونکہ اس کے جھوٹ سے ان کو بدبو آتی ہے۔

(ترمذی شریف:۱۸۹۵)

بھائیو! اس لئے گناہوں سے بے انتہاء اجتناب ضروری ہے، تاکہ ہم گندگی وآلودگی سے محفوظ رہیں۔

سالک کا کام کیا ہونا چاہیے؟

مولانا روم علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ راہ سلوک کے مسافر کو تین کاموں میں سے ایک کام ضرور کرنا چاہئے، پہلا اور سب سے اہم کام یہ کہ اخلاق رذیلہ کو یکسر اپنے قلب سے اُکھاڑ پھینکے، جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے درِخیبر کو اُکھاڑ کر پھینک دیا تھا، جس سے خیبر کا زبردست قلعہ فتح ہوگیا تھا، اسی طرح باطنی فتوحات کے لئے ضروری ہے کہ رذائل اخلاق کو دل سے بیک وقت ختم کر کے رکھ دے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ باطنی فتوحات کے لیے قلب کا اخلاق رذیلہ سے پاک کرنا ضروری ہے۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی سالک پست ہمتی کی وجہ سے یہ کام نہ کر سکے تو دوسرا کام سالک کا یہ ہے کہ وہ رذائل کو ختم کرنے کی کوشش میں لگ جائے، یہ کوشش میں لگنا ہی فتوحات باطنیہ قرار پائے گا، جیسے خیبر کے موقعہ پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ وعمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کیا کہ ان کے ہاتھ سے درِخیبر اُکھڑ نہ سکا، مگر وہ برابر اس کے اُکھاڑنے کی کوشش میں تھے، اور اسی لیے ان کو شریکِ جہاد مانا گیا۔ اسی طرح جو رذائل اخلاق کے اُکھاڑنے اور ان کو ختم کرنے میں کوشاں ہوگا، وہ باطنی جہاد میں شامل اور فتح میں شریک قرار دیا جائے گا، یہاں مراد جہاد اکبر ہے، جیسے غزوہ جہاد اصغر ہے۔

مولانا رومؒ نے فرمایا کہ جو سالک اتنا کمزور وضعیف ہو اور پست ہمت ہو کہ یہ کام بھی نہ کر سکے تو ایسے سالک کے لئے ایک تیسرا کام ہے، مولانا رومی نے ضعیف

و پست ہمت سالکین کے لیے یہ کام تجویز فرما کر ان کو بھی جہاد میں حصہ دار بنا دیا، وہ یہ کہ کسی کامل کی صحبت وخدمت میں رہنے کی زحمت گوارا کرے، مولانا نے اس کو عجیب تمثیل سے واضح کیا ہے کہ جیسے کانٹا کہ اس کو اگر الگ نہ کیا جا سکتا ہو، تو اسکو پھولوں کے ساتھ ملائے رکھتے ہیں، اور یہ کانٹا بھی محبوب ہو جاتا ہے، اور جب پھول چننے والے، اور پھول کو آنکھوں اور دل سے لگانے والے، پھول چنتے اور لیتے ہیں تو اس کانٹے کو بھی لیتے ہیں اور آنکھوں اور دل سے لگاتے ہیں، فرمایا کہ اسی طرح جو سالک اپنے رذائل کو ختم نہ کر سکے اور نہ اس اسکی کوشش ہی کر سکے تو کم از کم کسی کامل ومحبوب کی صحبت وخدمت میں رہ جائے، جس سے اتنا فائدہ تو ہوگا کہ محبوب کے ساتھ یہ بھی محبوب ہو جائے گا، اگر چہ کہ مراتب میں فرق وتفاوت ہوگا اور ہونا بھی چاہیے، تاہم یہ بھی فائدہ عظیمہ ہے۔

جیسی زندگی ویسی موت

فرمایا کہ اللہ کا قانون یہی ہے کہ جیسی زندگی ہوتی ہے ویسی ہی موت آتی ہے، اسی لئے ایک جگہ اللہ تعالی نے فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ٥

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ ڈرنا چاہئے اور ہرگز نہ مرو، مگر مسلمان ہو کر۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرنے کی حالت تو ہمارے اختیار میں نہیں ہے، پھر کیوں کر اسلام کی حالت میں مرنے کا حکم دیا جا رہا ہے؟ مفسرین نے اس کا جواب دیا ہے کہ اسلام پر مرنا تو ہمارے اختیار میں نہیں ہے، مگر اسلام پر جینا تو ہمارے اختیار میں ہے، جو اسلام پر جیتا رہے گا، وہ اسلام پر مرے گا، جو ذکر پر جیئے گا، وہ ذکر پر

مریگا، جو دنیا پر جیئے گا، وہ دنیا پر ہی مرے گا۔

حضرت مسیح الامتؒ کی وفات کا واقعہ

فرمایا کہ مرشدی حضرت مسیح الامت شاہ مسیح اللہ خان صاحبؒ کی وفات کا عجیب واقعہ ہے، حضرت کی وفات سے ایک ماہ پہلے بندہ ملاقات واستفادہ کے لئے گیا تھا، اور کچھ ایام حضرت والاؒ کی خدمت میں گزار کر آیا تھا، اس وقت حضرت کو نہایت ہی ضعف ونقاہت تھی، مصافحہ کیلئے ہاتھ اُٹھانے کی بھی طاقت نہیں تھی، میرے واپس آنے کے پندرہ دن بعد حضرت والاؒ کا انتقال ہو گیا، ہوا یہ کہ جس رات حضرت والا کا انتقال ہوا، اُس وقت وہاں میرے ساتھی مولانا عنایت اللہ لندنی موجود تھے، وہی حضرت کے خادم بھی تھے، مجھے اُن کی یہ روایت پہنچی کہ رات وہ سو چکے تھے، حضرت والاؒ بھی سو چکے تھے، وہ فرماتے ہیں کہ رات میں مجھے اچانک محسوس ہوا کہ ذکر کی آواز آرہی ہے، اُٹھ کر دیکھا تو حضرت خود بخود اُٹھکر بیٹھے ہیں، ذکر بالجہر میں مشغول ہیں، جبکہ ہاتھ اُٹھانا بھی مشکل تھا، خود اُٹھ کر بیٹھنا تو خارج از سوال تھا، یہ حضرات پریشان ہو کر حضرت کو پکارنے لگے اور اپنی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی مگر متوجہ نہ ہوئے، گویا اِدھر کا خیال ہی نہیں تھا، تقریباً ایک گھنٹہ اسی طرح ذکر جاری رہا، اور اسی حالت میں ذکر کرتے کرتے ہی وصال ہو گیا۔

بھائیو! جیسی زندگی ہوتی ہے ویسی ہی موت آتی ہے، جس کی اللہ کی یاد میں زندگی گزرتی ہے، اس کی موت بھی اسی کی یاد میں آتی ہے، یہ اللہ والے ہمیشہ اللہ کی یاد میں ہوتے ہیں تو موت بھی اللہ ہی کی یاد میں آتی ہے۔

ایک بزرگ کی موت کا واقعہ

اسی پر ایک اور واقعہ یاد آیا، حضرت اقدس مولانا شاہ ابرارالحق صاحبؒ کے ایک خلیفہ قادر معظم صاحب جو فیض العلوم ، حیدرآباد میں مدرس تھے، ان کی موت کا واقعہ عجیب ہے، وہ یہ کہ ایک مرتبہ ان کے علاقہ کے حالات خراب تھے، کرفیو تھا، دو چار دن بعد کرفیو میں ڈھیل دی گئی ،تو قادر معظم صاحب طلبہ کو دیکھنے مدرسہ جا رہے تھے، درمیان میں کچھ غنڈوں نے گھیر لیا اور قتل کرنے کے در پے ہو گئے ،تو حضرت نے فوراً رومال بچھا کر نماز پڑھنا شروع کر دیا، جب سجدہ میں گئے تو دشمنوں نے قتل کر دیا اور روح قبض ہو گئی۔

دیکھئے موت کے وقت اللہ کی یاد آجانا دلیل ہے کہ زندگی بھی اللہ کی یاد میں گزری ہے، اگر اللہ کی یاد میں زندگی نہ گزاری ہوتی تو موت بھی اللہ کی یاد میں نہ آتی۔

شقاوت و بدبختی کی علامت

علامہ قشیری نے ''الرسالہ'' میں محمد بن الفضل البلخیؒ سے نقل کیا ہے کہ ان سے ابوعثمان الحیری نے پوچھا کہ بدبختی کی علامت کیا ہے؟ تو فرمایا کہ تین باتیں شقاوت و بدبختی کی علامت ہیں، ایک یہ کہ علم دیا جائے مگر عمل سے محروم کر دیا جائے ، دوسرے یہ کہ عمل کی توفیق دی جائے مگر اخلاص نصیب نہ ہو، تیسرے یہ کہ اولیاء وصالحین کی صحبت ملے مگر ان کا احترام نصیب نہ ہو۔

میں کہتا ہوں کہ سالک کو مذکورہ بات ذہن نشین رکھنا چاہئے ،اور علماء حضرات کو بھی اس پر غور کرنا چاہئے ، کوئی عالم ہو جائے مگر عمل نہ کرے یہ بھی بدبختی

ہے، اور کوئی عمل تو کرے مگر مقصد و نیت غیر خدا ہو، اخلاص حاصل نہ ہو، تو یہ بھی بدبختی ہے، اور صالحین کی صحبت و معیت نصیب ہو اور ان کی قدر کر کے، ان سے کچھ حاصل نہ کرے تو یہ بھی بڑی ہی محرومی اور بدبختی کی علامت ہے، سالکین کو شیطان جن ذرائع سے بہکاتا ہے اور محرومی و بدبختی میں مبتلا کرتا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ صحبت کاملین کے باوجود، ان کی ناقدری میں مبتلاء کر دیتا ہے، اور یہ فیض سے محروم کر دینے والی بات ہے۔

ایک بزرگ کا استحضارِ موت، ایک واقعہ

استحضار موت کا ذکر چل رہا تھا، اس پر یہ فرمایا کہ ایک بزرگ جنگل میں رہتے تھے، ان کے پاس ایک بادشاہ ملاقات کے لیے گیا، دیکھا کہ وہاں کھانے پینے کا کوئی سامان نہیں ہے، گفتگو ہوئی، واپسی کے وقت بادشاہ نے پوچھا کہ حضرت! آپ کے کھانے کا کیا نظام ہے، آپ اس جنگل میں کیا کھاتے ہیں؟

حضرت نے فرمایا کہ میرے پاس کچھ گولیاں ہیں، جن کو کھا لیتا ہوں، جو مجھے کافی ہو جاتی ہیں، چاہو تو تم بھی لے جاؤ، یہ کہہ کر چند گولیاں بادشاہ کو بھی دیدیں، جب بادشاہ نے یہ گولیاں کھائیں، تو ایسا محسوس ہوا کہ جسمانی اور باہی طاقت و قوت میں اضافہ ہو گیا ہے، عورتیں ناکافی ہو رہی ہیں، ایک رات میں کئی کئی عورتوں سے ملاقات کرنے کی ضرورت پڑ رہی ہے، بادشاہ کے دل میں یہ خیال آیا کہ ان گولیوں سے اتنی قوت آجاتی ہے کہ مجھے میری عورتیں ناکافی ہو رہی ہیں، تو ان بزرگ کا کیا حال ہوگا جو صرف یہی گولیاں کھاتے ہیں، ان کے پاس کتنی عورتیں آتی ہونگیں؟ دماغ میں ایک وسوسہ آیا، پھر وہ بادشاہ دوبارہ ان بزرگ صاحب کے پاس ملنے کے لیے گیا، کبھی اللہ کی طرف سے اللہ والوں کو لوگوں کے خیالات و وساوس کی

اطلاع دیدی جاتی ہے، توان بزرگ کوبھی بادشاہ کے خیال پر مطلع کردیا گیا، چنانچہ انہوں نے اس بادشاہ سے پوچھا کہ کیا آپ نے وہ گولیاں کھالی تھیں؟ کیا حال رہا؟ کہا کہ حضرت واقعی بہت عجیب وغریب گولیاں ہیں، کھانا پینا سب اُسی میں ہے، بزرگ نے کہا کہ جی چاہتا ہے کہ اور کچھ گولیاں دوں، یہ لے جایئے، مگر یاد رہے کہ چالیس دن میں آپ کا انتقال ہوجائے گا، بس یہ سنتے ہی اُس کی حالت خراب وخستہ ہوگئی، وہیں سے لوگوں کو اسے اُٹھا کرلانا پڑا، اور جوں جوں دن گزرتے جارہے تھے، حالت ابتر ہوتی جارہی تھی، دماغ ٹھکانے پر نہیں ہے، ہاتھ پیر کام نہیں کررہے ہیں، سارے درباری اور گھر والے پریشان ہیں، وہ گولیاں بھی کھالیا کہ کچھ حالت بحال ہومگراب کسی غیرعورت کا تو کیا خیال آتا، اپنی بیویوں کا بھی خیال نہیں آرہا ہے، اور جب چالیسواں دن آیا تو مت پوچھو کہ کیا حال ہوا، موت کا انتظار ہورہا ہے کہ نہ معلوم عزرائیل کس وقت اور کہاں سے آجائیں، بڑی مشکل سے دن کٹا، مگر موت نہیں آئی، اور نہ فرشتہ نظر آیا، پھر دوچار دن اور انتظار کرنے کے بعد بھی موت نہیں آئی، تب اس کی حالت میں کچھ کچھ سدھار آیا اور بادشاہ پھران بزرگ سے ملنے کے لیے گیا، کہ پوچھوں کہ قصہ کیا ہے؟ بزرگ نے بادشاہ کو دیکھ کر خیریت دریافت کی، اس نے کہا کہ حال کیا پوچھتے ہو؟ میں تو بے حال ہوں، مراتو نہیں، مگر حالت مرنے سے زیادہ خراب ہوگئی، بزرگ نے فرمایا کہ بھائی! آپ کو تو چالیس دن کی مہلت بتائی تھی، آپ کو ان چالیس دنوں میں ان گولیوں کے کھانے کے باوجود اِدھراُدھر کا خیال نہیں آیا، اور ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہروقت ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اب موت آئے گی، اب اللہ کا فرشتہ آئے گا، تو کیا ہمارا خیال کسی ایرے غیرے کی طرف جائے گا؟ ہم تو اللہ کے پاس جانے تیار بیٹھے ہیں، تو ہم کو غلط خیال کیسے آسکتا ہے؟

اس سے معلوم ہوا کہ استحضار موت اگر کسی کو نصیب ہو تو اس سے خود بخود گناہ چھوٹ جاتے ہیں۔اس لیے اس کا اہتمام کرنا چاہیئے کہ موت کا استحضار پیدا ہو جائے۔

آخرت کے عمل میں نیت کی کمزوری

آج ہم لوگ آخرت کے اعمال تو بجا لا رہے ہیں ،مگر عمل میں نیت کی کمزوری ہے، یعنی اخلاص کا فقدان ہے ، جس کی وجہ سے سارے اعمال ضائع ہو رہے ہیں، ایک بزرگ تھے وہ تکبیر اولی کا بڑا اہتمام کرتے تھے، ایک مرتبہ ان کی ایک رکعت چھوٹ گئی ،تو وہ امام کے سلام کے بعد اپنی نماز پڑھ رہے تھے، سارے لوگ ان کو دیکھنے لگے کہ ان کی آج ایک رکعت چھوٹ گئی ،تو لوگوں کے دیکھنے کی وجہ سے ان کو شرم آئی ، پھر وہ بزرگ ساری زندگی کی نمازیں دھرانے لگے ، پوچھا گیا تو فرمایا کہ لوگوں کے دیکھنے سے مجھے شرم آئی ،معلوم ہوا کہ میری توجہ خالق کی طرف نہیں ، بلکہ مخلوق کی طرف ہے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے اب تک بھی جو نمازیں پڑھی ہیں ، وہ مخلوق کے لئے پڑھی ہیں ، اللہ کے لئے نہیں پڑھی ،اس لئے ساری نمازیں دھرا رہا ہوں۔

غور کیجئے کہ یہ بزرگ تیس سال کی نمازیں دھرا رہے ہیں ، یہ سمجھکر کہ میری نیت میں کمزوری ہے، اس طرح کبھی نیت میں فتور پیدا ہو جاتا ہے ، اس لئے اپنی نیتوں کو خالص بنانے کی فکر کرنا چاہیئے ، ورنہ سب کچھ کیا کرایا پانی میں چلا جاتا ہے۔

استحضارِ موت کے لیے مراقبہ

فرمایا: اللہ والے فرماتے ہیں کہ روزانہ کچھ وقت مقرر کر کے موت کا مراقبہ

کرنا چاہئے ،اس سے موت کا استحضار پیدا ہوگا اور یہ گناہوں سے بچنے کی آسان تدبیر ہے،خلوت میں بیٹھ کر یہ سوچے کہ میں بھی ایک دن مرجاؤں گا، مجھے بھی غسل دیا جائے گا،کفن پہنایا جائے گا، پھر قبرستان لے جایا جائے گا، پھر لوگ مجھے قبر میں اتاریں گے، میرے اوپر مٹی ڈالیں گے، مجھے تن تنہا قبر کی اندھیریوں میں چھوڑ کر آجائیں گے، پھر مجھ سے سوالات ہوں گے، مجھے ہر ہر چیز کا حساب دینا ہوگا،اللہ کے سامنے پیشی ہوگی ، نہ معلوم میرا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا،یا بائیں ہاتھ میں،سالک ایسا مراقبہ روزانہ کرے تو ہمیشہ موت کا استحضار رہے گا۔

ایام خالیۃ کی دو تفسیریں

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ﴾ (مزے لیکر کھاؤ اور پیو گذرے ہوئے دنوں میں جو کچھ نیک اعمال کئے ہیں ان کے بدلے میں) علماء نے ایام خالیۃ کی دو تفسیریں کی ہیں: خالیۃ کے ایک معنی ماضیۃ (یعنی گذرے ہوئے) کے ہیں،یعنی دنیا میں تم نے ہمارے حکم کے مطابق جو دن گذارے ہیں اس کے بدلے میں کھاؤ اور پیو،دوسری تفسیر یہ ہے کہ دنیا میں کچھ ایام تم نے خالی خالی گذارے ہیں، شہوات سے خالی، لذات سے خالی ،تمناوں سے خالی ،نفسانی خواہشات سے خالی،تمہاری مرضی کی زندگی تم نے نہیں گذاری،اس لئے جنت میں کھاؤاور پیو۔

لہذا جو یہاں دنیا میں اپنے ایام نفسانی خواہشات سے خالی گزارے گا،اور دنیا کی فانی نعمتوں کو اللہ کے لیے قربان کردے گا،اس کو وہاں کی عظیم اور فنا نہ ہونے والی نعمتیں عطا کی جائیں گی۔

ایک دلہن سے عبرت

فرمایا کہ ایک لڑکی کی شادی ہونے والی تھی، چنانچہ اس کو سجایا گیا، کپڑے پہنائے گئے، زیور پہنایا گیا، اور سارے لوگ، رشتہ دار، سہیلیاں، دوست احباب اسے دیکھ کر خوش ہونے لگے، اور کہنے لگے کہ ما شاء اللہ! کتنی اچھی لگ رہی ہے، کیا خوبصورت لگ رہی ہے۔ سب اس کے حسن و جمال کی تعریف کرنے لگے، اور سب رشتہ دار و دوست احباب خوشی کا اظہار کر رہے تھے، مگر اس لڑکی کے چہرہ پر اُداسی چھائی ہوئی تھی، وہ غمزدہ تھی، اس سے پوچھا گیا کہ کیا بات ہے کہ تو خوش نہیں ہے؟ تو اس لڑکی نے عجیب جواب دیا، کہنے لگی کہ تم سب تو مجھ سے خوش ہو اور میرے حسن و جمال کی تعریف کر رہے ہو، مجھے پسند کر رہے ہو، مگر میں اس فکر میں ہوں کہ جس کے لئے مجھے سنوارا جا رہا ہے، یعنی میرا شوہر، اگر وہ مجھے پسند نہ کرے تو میرا کیا ہوگا؟ مجھے یہ فکر دامنگیر ہے، جس کی وجہ سے میں غمزدہ ہوں، ایک بزرگ نے یہ واقعہ سنا کر کہا کہ اس لڑکی کو جس قدر احساس تھا ہمیں وہ اللہ کے بارے میں حاصل ہو جائے تو ہماری آخرت سنور جائے، ہم یہ سوچیں کہ ہم سے ہمارا خالق و مالک راضی ہو، ہم دوسروں کے خوش ہونے پر خوش ہو جاتے ہیں، یہ نہیں دیکھتے کہ ہم سے اللہ تعالےٰ بھی خوش ہیں کہ نہیں؟ لہذا ہم کو یہ خیال کرنا چاہیئے کہ اگر ساری دنیا ہماری عبادت سے خوش ہو جائے، ہمارے علم سے خوش ہو جائے، ہمارے کسی کردار سے خوش ہو جائے، مگر خدا تعالیٰ ہماری عبادت و ریاضت کو پسند نہ کرے اور کہدے کہ تیری عبادت مجھے پسند نہیں تو کیا ہوگا؟ اس لئے دنیا والوں کی تعریف پر خوش نہیں ہونا چاہیئے، ہمیں تو اللہ کو خوش کرنا ہے، اللہ خوش ہو جائے تو پھر ساری دنیا ناراض ہو تو بھی کوئی حرج نہیں۔

دنیا دار کون ہے؟

ایک مجلس میں فرمایا کہ آج لوگ سمجھتے ہیں کہ جس کے پاس مال ہے وہ دنیادار ہے، یہ بات غلط ہے،اس لئے کہ اسی مال کو اللہ کے راستہ میں خرچ کر کے انسان بڑا اللہ والا بن سکتا ہے،اسی لئے ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ ''چیست دنیا''؟ دنیا کسے کہتے ہیں،تو انہوں نے جواب دیا کہ ''از خدا غافل بودن''،یعنی دنیا اللہ سے غافل ہونے کو کہتے ہیں، یہ نہیں کہا کہ دنیا مال کا نام ہے، کپڑے کا نام ہے، بلڈنگ کا نام ہے، زیور کا نام ہے،سونے چاندی کا نام ہے، بلکہ فرمایا کہ اللہ سے غافل ہونے کا نام دنیا ہے،معلوم ہوا کہ ایک آدمی کروڑ پتی ہے،مگر وہ اللہ سے غافل نہیں، اللہ کے احکام پر اس کی زندگی ہے،اس کے اعضاء اطاعت و بندگی میں لگے ہوئے ہیں،اس کا مال اللہ کے راستہ میں خرچ ہو رہا ہے،تو وہ کروڑ پتی ہونے کے باوجود دنیا دار نہیں،اور ایک آدمی کے پاس بالکل مال نہیں، بھکاری ہے،فقیر ہے،نہ کپڑے ہیں، نہ کھانا ہے،لیکن اس کے باوجود دنیا کی محبت دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے،اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری نہیں کرتا، بلکہ اللہ کے احکام کو دن رات پامال کرتا رہتا ہے،تو یہ فقیر بہت بڑا دنیا دار ہے۔

معلوم ہوا مال ہونے یا نہ ہونے سے دنیا داری کا کوئی تعلق نہیں ،ایک آدمی کروڑ پتی ہونے کے باوجود دیندار ہوسکتا ہے،اور ایک آدمی فقیر ہونے کے باوجود دنیا دار ہوسکتا ہے۔

نیم شب کی دولت

فرمایا کہ راتوں میں اُٹھ کر اللہ کی عبادت کا جو لطف و مزہ ہے وہ کچھ اور ہی ہوتا

ہے، اور اس کا کیف ولذت عجیب ہوتی ہے، اور جن کو یہ دولتِ نیم شبی مل جاتی ہے، ان کی نظر میں دنیا ہیچ در ہیچ ہو جاتی ہے، اسی لیے اولیاء اللہ کو دنیا ہیچ نظر آتی ہے، اس پر ایک واقعہ یاد آیا کہ حضرت شیخ المشائخ عبدالقادر جیلانی نوراللہ مرقدہٗ کے زمانہ کا جو بادشاہ تھا، اُسکو معلوم ہوا کہ حضرت کے دستر خوان پر روزانہ ایک ہزار آدمی کھانا کھاتے ہیں، مہمانوں کی بھرمار ہوتی ہے، لوگ اُن کے پاس اللہ کی معرفت ومحبت لینے آتے ہیں، ذکر سیکھنے آتے ہیں، تو اُس نے سوچا کہ حضرت اتنی بڑی خدمت کرتے ہیں، تو اُن کیلئے میری حکومت کا آدھے حصہ کا خراج دیدینا چاہئے، تاکہ اُس کی آمدنی سے یہ لوگوں کی خدمت کریں، چنانچہ حضرت کو اس نے خط لکھا، اس میں لکھا کہ حضرت! میں آپ کے لئے میری نیم روز حکومت کا آدھا حصہ وقف کرنا چاہتا ہوں، اس کو قبول کیجئے، حضرت عبدالقادر جیلانیؒ نے اس خط کی پشت پر جواب لکھ کر بھیج دیا کہ اللہ نے جب سے نیم شب کی دولت دی ہے، نیم روز کی کوئی ہوس نہیں رہی، نیم شب کیا ہے؟ رات میں اُٹھکر اللہ کو یاد کرنا، اس کے سامنے گڑگڑانا، اس کی لذت جسے مل جاتی ہے، اسے ہفت اقلیم کی سلطنت بھی بیکار نظر آتی ہے۔

گناہ ظلمت ہے

ایک مجلس میں حضرت والا نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام کو اللہ نے جنت میں ہر چیز کے کھانے کی اجازت دی، مگر ایک درخت کے قریب جانے سے منع کیا، لیکن آدم علیہ السلام شیطان کے بہکاوے میں آکر شجر ممنوعہ کھا بیٹھے، تو ان کے بدن سے جنت کا نورانی لباس اتار لیا گیا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جہاں نور رہوتا ہے وہاں ظلمت نہیں ہوتی، جہاں ظلمت ہو وہاں نور نہیں رہ سکتا، فرمایا کہ جب اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام سے صرف ایک گناہ سے نورانی لباس نکال لیا تو سوچو کہ جو لوگ گناہ پر گناہ کرتے ہیں تو

ان کے پاس نور کہاں رہے گا، جو نور نماز، روزہ، ذکر سے آیا تھا وہ گناہ کرنے سے ختم ہوجاتا ہے۔

نیک جذبہ مہمان ہے

حضرت اسماعیل شہیدؒ نے فرمایا کہ مومن کے دل میں نیکی کا جذبہ آئے تو یوں سمجھو کہ مہمان آیا ہے، اس کی عزت، خاطر مدارت اور استقبال کرنا چاہئے، جیسے کسی مہمان کے آنے پر کرتے ہیں، اگر گھر میں آنے والے مہمان کی تعظیم وتکریم نہ کی گئی تو وہ پھر کبھی نہیں آئے گا، اسی طرح اگر کوئی اس مہمان کی مہمان نوازی نہیں کرے گا، تو وہ پھر کبھی نہ آئے گا، اگر آپ اس کی عزت کریں گے تو وہ مہمان آتا رہے گا، جتنا اس کی مہمان نوازی کروگے اتنا ہی وہ آپ کے پاس آتا رہے گا۔

اس اللہ کے مہمان کی خاطر مدارات وعزت کیا ہے؟ یہ ہے کہ اس نیک جذبہ پر عمل شروع کردیا جائے۔مثلاً نماز کا جذبہ آیا تو فوراً نماز پڑھنا شروع کردے، ذکر کا جذبہ آیا تو ذکر شروع کردے، صدقہ کا جذبہ آیا تو صدقہ دیدے۔

گنہ گاروں کے لئے سامان تسلّی

انسان گناہ کرنے سے ناپاک ونجس ہوجاتا ہے اور اس نجاست کو پاک کرنے کا طریقہ توبہ وہ استغفار ہے، حدیث میں ہے: ''**التائب من الذنب کمن لا ذنب له**'' (توبہ کرنے والے والا ایسا ہے، جیسا کہ اس نے گناہ کیا ہی نہ ہو) مگر بعض جاہل لوگ توبہ واستغفار کرنے سے گھبراتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اتنے ناپاک ونجس ہیں، اللہ تعالی کی محترم ومقدس جناب میں کس طرح جائیں؟ یہی خیال ان کو توبہ سے محروم کردیتا ہے یہ بڑی سخت بات ہے، مولانا روم نے ایک تمثیلی حکایت

لکھی ہے کہ ایک آلودہ نجاست کپڑے سے پانی نے کہا کہ تو ناپاک ونجس ہو گیا ہے، جلدی سے میرے اندر آجا، میں تجھ کو پاک وصاف کردوں گا، اس پر ناپاک ونجس کپڑے نے کہا کہ مجھے پانی سے شرم آتی ہے کہ پانی تو ایسا صاف وپاک اور میں اس قدر گندہ وناپاک، چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک، بھلا میں کس منھ سے پانی میں جاؤں؟ اس پر پانی نے کہا اور واقعی بالکل سچ کہا کہ اگر تو مجھ سے شرم کر کے میرے پاس نہ آیا تو تیرے پاک ہونے کی کوئی صورت نہیں بغیر مجھ سے ملے نجاست کے زائل ہونے کا کوئی مطلب نہیں، واقعی نجاست کے دور کرنے اور پاک کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ پانی میں غوطہ لگائے، کوئی شخص شرم کرتا ہوا پانی کے پاس نہ گیا تو وہ کبھی نجاست سے چھٹکارہ نہیں پاسکتا، بالکل اسی طرح باطنی نجاست وگندگی سے رہائی وصفائی کا طریقہ یہی ہے کہ اللہ کی طرف لپکے اور اس کے دریائے رحمت کے پاک و صاف پانی میں غوطہ لگائے اور اس سے توبہ واستغفار کرے۔ اللہ سے شرم کر کے اس کی جناب میں نہ جانا اور توبہ واستغفار نہ کرنا بڑی حماقت ہے، جیسے نجاست آلودہ کا پانی سے شرم کرنا حماقت ہے، مولانا روم فرماتے ہیں:

آب گفت آلودہ را در من شتاب

گفت آلودہ کہ دارم شرم از آب

پانی نے آلودۂ نجاست سے کہا کہ جلدی سے میرے پاس آجا، تو وہ آلودۂ نجاست کہنے لگا کہ پانی سے مجھے شرم آتی ہے۔

گفت آب این شرم بے من کے رود

بے من آلودہ زائل کے شود

پانی نے اس کے جواب میں کہا کہ میرے پاس آئے بغیر تیری یہ شرم کیسے ختم

ہوسکتی ہے؟اور میرے بغیر یہ آلودگی کیسے زائل ہوسکتی ہے؟

آگے فرماتے ہیں:

از آب ہر آلودہ گر پنہاں شود

الحیاء یمنع الایمان بود

یعنی اگر ہر آلودہ نجاست اسی طرح پانی سے شرم کرتے ہوئے چھپتا رہے گا تو یہ شرم بجائے ''الحیاء من الایمان'' ہونے کے ''الحیاء یمنع الایمان'' ہوجائے گی، معلوم ہوا کہ ایسی شرم وحیا مذموم ہے، جس سے ایمان کو بھی خطرہ ہے، یہاں تو بے شرم ہوکر خدا کے دربار میں حاضر ہوجانا اور معافی مانگنا چاہئے۔

معرفت کی حقیقت

تخلیق انسان کا مقصد قرآن نے عبادت کو بتایا ہے، چنانچہ فرمایا کہ: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّالِيَعْبُدُوْنَ﴾ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس جگہ عبادت کی تفسیر معرفت سے کی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ تخلیق انسان کا اصل مقصد معرفت خداوندی ہے اور ایک حدیث قدسی سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے (كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًّا فَأَرَدْتُ أَنْ أُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ) اس حدیث کے متعلق صوفیا نے فرمایا ہے کہ صحیح ہے، اور محدثین نے فرمایا کہ یہ الفاظ ثابت نہیں، ہاں اس کا معنیٰ صحیح ہے، جیسا کہ ملا علی قاری نے فرمایا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی تخلیق کا اصل مقصد معرفت ہے اور معرفت کے لفظی معنیٰ ہیں جاننا پہچاننا، اور مرادی معنیٰ یہ ہیں کہ اللہ کی ذات وصفات اور افعال کو اس طرح جاننا کہ ان اوصاف وافعال کا اثر بندے کے احوال وافعال واخلاق

پر ظاہر ہو۔

مثلاً اللہ کے جمال وکمال اور عطا ونوال کو دیکھ کر اللہ سے محبت ہو جائے، کیونکہ یہ اوصاف محبت کی مقتضی ہیں، چنانچہ دنیا میں بھی محبت، انہی اوصاف پر مرتب ہوتی ہے، جب خداوند تعالیٰ کے جمال وکمال کو جان و پہچان لیا تو اس کا اثر (محبت) ہونا بھی ضروری ہے، اسی طرح اللہ کی صفتِ رحیمیت ورحمانیت کو جان کر اللہ سے اُمید ورجاء کا ہونا فطری بات ہے، اسی طرح اللہ کی صفتِ جلال وقہر کو معلوم کرکے، اس سے خوف کھانا ضروری ہے، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کو جاننے کے بعد اس پر توکل واعتماد کا حاصل ہونا لابدی ہے، وعلی ہذا القیاس دیگر اوصاف کا حال ہے، الغرض خدا کے اوصاف وافعال کو اس طرح جان لینا کہ اس کا اثر جاننے والے پر ظاہر ہو، اس کو معرفت کہتے ہیں۔

اگر محض اللہ کے اوصاف وکمالات کو جاننا ہوا تو یہ لغوی معرفت ہے، اصطلاحی معرفت نہیں، جو مطلوب ہے، اسی سے محض عالم اور ایک عارف باللہ کے درمیان فرق معلوم ہو جاتا ہے کہ محض عالم، قرآن وحدیث کے علم کی وجہ سے اللہ کے اوصاف وکمالات کو پورے دلائل کے ساتھ جانتا ہے، مگر اس کا اثر اس میں ظاہر نہیں ہوتا، کیونکہ وہ عارف نہیں، اور عارف ان اوصاف کے اثرات سے متاثر ہوتا ہے، اور اس میں محبت وخشیت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ عارف محض عالم نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنے علم کے آثار واثرات کا حامل اور ان پر عامل بھی ہوتا ہے۔

ایک حدیث پر شبہ کا جواب

فرمایا کہ حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عادات میں آیا ہے (كَانَ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ أَحْيَانِهٖ) کہ آپ ہمہ وقت اللہ کا ذکر کرتے رہتے

تھے۔(مسلم:۳۷۳،سنن ترمذی:۳۳۸۴،صحیح ابن خزیمہ: ۱۰۴/۱،صحیح ابن حبان:۸۱/۳،مسند ابوعوانہ:۱۸۴/۱)

اس پر علمانے کلام کیا ہے کہ یہاں ذکر سے کونسا ذکر مراد ہے؟ علماء نے فرمایا کہ اس سے مراد ذکر قلبی ہے، نہ کہ ذکر لسانی ،اور حضرات علماء کو دراصل پریشانی یہ پیش آئی کہ بیت الخلاء جانے کے موقعہ پر اور بعض ضروریات وحاجات کے موقعہ پر ذکر لسانی ممنوع ہے کیوں کہ یہ اسم الٰہی کی اہانت کا موجب ہے، پھر آپ ہمہ وقت ذکر لسانی کیسے کر سکتے ہیں؟ لھذا علماء نے ذکر قلبی مراد لیا تا کہ یہ اشکال ختم ہو جائے۔

اس نا کارے کے ذہن میں ایک دوسری بات آتی ہے، وہ یہ کہ یہاں حدیث میں ذکر سے مراد قلبی کے ساتھ لسانی بھی ہے، یعنی صرف قلبی نہیں، بلکہ قلبی ولسانی دونوں مراد ہیں،اور مذکورہ شبہ کا حل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جمہور علماء اور خصوصا ائمہ اربعہ کا مسلک یہ ہے کہ آپ کا فضلہ پاک ہے، جیسا کہ اپنی جگہ اس کے دلائل مذکور ہیں، اس بناء پر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیت الخلاء والی حالت نجاست سے ملوث نہیں ،لہذا اس موقعہ پر بھی آپ کے لئے ذکر لسانی ممنوع نہ تھا،اور دوسروں کے لئے ممنوع ہے، کیونکہ باقی سب لوگ اس موقعہ پر نجاست سے ملوث وآلودہ ہوتے ہیں،اور ذکر لسانی کے اس موقعہ پر ممنوع ہونے کی علت دراصل یہی تلوّث بالنجاسۃ ہے،بس جہاں یہ مفقود ہے وہاں ذکر لسانی ممنوع بھی نہیں ہے۔

پھر غور کرنے کی بات ہے:’’کان یذکر اللہ ‘‘ والا جملہ صحابہ کا قول ہے، اس میں ذکر سے ذکر لسانی ہی مراد ہونا چاہئے ، کیونکہ ذکر قلبی تو کسی کے علم میں نہیں آسکتا، جب علم میں نہیں آسکتا تو اس کی خبر وہ کیوں کر کر دے سکتے ہیں؟ معلوم

ہوا کہ یہاں وہ ذکر مراد ہے جس کا علم ہوسکتا ہے، اور وہ لسانی ہے نہ کہ قلبی، البتہ اس پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ بیت الخلاء والی حالت بھی تو صحابہ سے مخفی ہوتی تھی، تو اس کا جواب آسان ہے وہ یہ کہ بیت الخلاء میں آپ کا ذکر باللسان کرنا صحابہ کو معلوم ہوسکتا تھا، اس طرح کہ صحابہ اس موقعہ پر باہر جو انتظار میں رہتے تھے انہوں نے سنا ہو، اور صحابہ کے حالات اور ان کے شوق علم سے یہ بعید از قیاس نہیں، لہذا یہ بات ممکن ہے کہ مخفی ہونے کے باوجود ذکر لسانی معلوم ہو جائے۔

ہاں اس پر ایک قوی شبہ اس حدیث سے ہوسکتا ہے جس میں ہے کہ آپ نے ایک صحابی حضرت مہاجر بن قنفذؓ کے سلام کا جواب استنجاء سے فراغت کے بعد اس لیے نہیں دیا کہ آپ لفظ سلام جو کہ اللہ کا نام ہے اس حالت میں لینا نہیں چاہتے تھے۔

(مستدرک حاکم: ۱/۲/۲۷، صحیح ابن خزیمہ: ۱/۱۰۳، صحیح ابن حبان: ۳/۸۲، ابوداؤد: ۱۷)

اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ذکر لسانی سے اس حالت میں احتراز فرماتے تھے۔ مگر اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا آپ نے کبھی کبھی کیا ہے تاکہ افضلیت پر عمل ہو، ورنہ خود آپ سے اس کے خلاف بھی ثابت ہے، چنانچہ بخاری و مسلم وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک بار وہ اپنی خالہ حضرت میمونہؓ جو ازواج مطہرات میں سے ہیں ان کے گھر رسول اللہ کے ساتھ سو گئے، آدھی رات میں آپ بیدار ہوئے اور بیٹھ کر سورۂ آل عمران کی آخری دس آیات پڑھیں، پھر وضو فرمایا۔ (بخاری: ۱۳۷، مسلم: ۷۶۳) اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ آپ نے بغیر وضو اللہ کا کلام پڑھا اور اس میں اللہ کا نام تو ہے ہی۔

ہماری دعاء قبول نہ ہونے کا سبب

ایک شخص نے حضرت ابراھیم بن ادہمؒ سے عرض کیا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: أُدْعُوْنِیْ أَسْتَجِبْ لَکُمْ (مجھے پکارو میں جواب دوں گا) لیکن ہم دعا کرتے ہیں تو قبول نہیں ہوتی، اس کی کیا وجہ ہے؟ حضرت ابراھیم بن ادہمؒ نے فرمایا کہ اس کی وجہ پانچ باتیں ہیں:

۱-تم نے خدا کو پہچانا لیکن اس کا حق ادا نہیں کیا۔
۲-تم نے قرآن تو پڑھا مگر اس پر عمل نہیں کیا۔
۳-اور تم نے محبت رسول کا دعوی کیا لیکن ان کی سنت کو ترک کر دیا۔
۴-تم نے زبان سے ابلیس پر لعنت کی، لیکن عمل میں اس کی اطاعت کی۔
۵-تم نے اپنے عیوب کو چھوڑ دیا اور لوگوں کی برائیاں پکڑنے میں مشغول ہو گئے۔

دنیوی عیش باعثِ شرمندگی ہوگا، ایک واقعہ

فرمایا کہ ہندوستان کے مشہور شاعر اکبر الہ آبادی مرحوم، جو کہ انگریزی دور حکومت میں چیف جسٹس کے عہدے پر فائز تھے، ایک بار ان کے گھر پر ایک میٹنگ کے لیے بڑے بڑے لوگ جمع تھے اور ان کے والد بھی باحیات تھے، بوڑھے تھے، درمیان مشورہ ان کے والد اس کمرے میں جہاں میٹنگ ہو رہی تھی، آئے اور سلام کیا، اور اپنے ہاتھ میں غبارہ (جس کو ہمارے علاقہ میں عوام الناس انڈا کہتے ہیں) جو کھلونہ ہے، لے کر آئے اور اپنے صاحبزادے اکبر الہ آبادی کے ہاتھ میں دیکر کہا کہ تم اس کو بچپن میں بہت پسند کرتے تھے اور اس سے کھیلتے تھے، اس لیے یہ تمہارے لیے لایا ہوں۔ یہ سن کر اور دیکھ کر وہ بہت شرمندہ ہوئے، کیونکہ ان کے

سامنے بڑے بڑے لوگ بیٹھے ہوئے تھے، خیال کیا ہوگا کہ یہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچیں گے کہ اس مقام پر پہنچ کر بھی یہ غبارہ کا شوقین ہے؟ الغرض ان کا چہرہ شرمندگی کی وجہ سے بدل گیا، اور لال پیلا ہونے لگا۔ جب ان کے والد نے چہرہ دیکھ کر پہچان لیا کہ وہ شرمندہ ہیں، اور اس کی وجہ سے لال پیلے ہو رہے ہیں، تو کہنے لگے کہ بیٹا دیکھو! یہ چیز جو تم کو میں نے دیا ہے، اس کو تم بچپن میں ضد کر کے حاصل کرتے تھے، اور آج اسی چیز کے پیش کرنے سے تم کو شرم آرہی ہے، یہ خیال ہو رہا ہے کہ میں اتنا بڑا آدمی ہوں اور مجھے یہ حقیر و بے حقیقت چیز دی جا رہی ہے، یاد رکھو کہ اسی طرح کل قیامت کے دن، دنیا کی یہ باغ و بہار، یہاں کی یہ آرام و آسائش کی چیزیں، یہ دنیوی عہدے و مناصب بھی تم کو شرمندہ کر دیں گے۔ لہذا ان پر ہی مت ریجھو اور اس پر فخر نہ کرو۔

صاحبو! کیسی عجیب بات کہی ہے انہوں نے، یہ ہم سب کے لیے عبرت کی بات ہے، آج ہر آدمی کو ڈگری ملنے پر، یا کوئی عہدہ ملنے پر خوشی ہوتی ہے، کوئی بلڈنگ بناتا ہے تو اسے خوشی ہوتی ہے، اور خوشی کے ساتھ وہ فخر و غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے، دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے مگر یہ نہیں سوچتا کہ کہیں یہی چیزیں میرے لیے آخرت میں شرمندگی کا باعث تو نہیں بن جائیں گے؟ لہذا دنیا میں ایسے کام کرنا چاہئے جن پر آخرت میں شرمندہ ہونا نہ پڑے۔

ایک سوال کا جواب

فرمایا کہ ایک سالک نے پوچھا کہ کسی اچھی صورت کو دیکھ کر متاثر ہونا اور اسکا قرب پا کر خیالات میں تلاطم برپا ہونا تو فطری بات ہے، اور ہونا بھی چاہئے، ورنہ تو صحت مندی کے خلاف ہوگا، پھر اس میں خرابی و برائی کیا ہے؟

میں نے عرض کیا کہ بلا شبہ اچھی صورت کو دیکھ کر متاثر ہونا اور قرب پا کر جذبات میں ہیجان وتلاطم بپا ہونا عین فطرت ہے اور بلا شبہ صحت مندی کی علامت ہے، لیکن صورت کو دیکھنا اور اسکا قرب حاصل کرنے کی فکر کرنا اور قرب حاصل کرنا حماقت ہے، جہالت ہے، بلکہ شرارت ہے اور خباثت ہے۔

میں نے کہا کہ اس کی ایک مثال سمجھئے کہ ایک آدمی آگ میں ہاتھ ڈالتا ہے اور اس کی گرمی کا احساس کرتا ہے، تو بیشک یہ احساس علامت صحت مندی ہے، ورنہ سمجھا جائے گا کہ آدمی بیمار ہے جس کہ وجہ سے اس کو آگ کا احساس نہیں ہو رہا ہے، گرمی کا احساس نہیں ہو رہا ہے، اور کہا جائے گا کہ یہ بے حس ہے، لیکن کیا یہ سمجھنا صحیح ہوگا کہ آگ میں ہاتھ ڈالنا بھی صحت مندی ہے؟ یا یہ کہیں گے کہ آگ میں ہاتھ ڈالنے پر گرمی کا احساس تو علامت صحت مندی ہے، مگر آگ میں ہاتھ ڈالنا بے وقوفی بلکہ حماقت وجنون ہے، جیسے کوئی بے وقوف اپنی صحت مندی کا ٹسٹ کرنے کے لیے آگ میں ہاتھ ڈالدے تو کیا یہ بے وقوفی کی معراج نہیں کہالائے گی؟ لھذا صورتوں کے فتنہ سے متاثر ہونا تو صحت مندی ہے اور فطری بات ہے، لیکن اس فتنہ میں پڑنا بے حد بے عقلی وحماقت ہے۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ بعض جاہل و بے دین صوفی جو یہ کہتے ہیں کہ ہم اَمردوں اور عورتوں سے متاثر نہیں ہوتے، ان کی یہ بات دو حال سے خالی نہیں، یا تو کذب وجھوٹ پر مبنی ہے، یا صداقت پر مبنی ہے، اگر جھوٹ ہے تو اس کا نا قابل اعتبا رہونا واضح ہے، اگر صداقت پر مبنی ہے تو یہ بات ان جاہلوں اور بے دینوں کی طبعیتوں میں بے اعتدالی کی علامت ہے، اور فطرت کے خلاف ہونے کی دلیل ہے، جو کسی صورت میں بھی کمال نہیں بلکہ خلافِ کمال ہے، اگر کسی غلبہ حال کی بنا پر یہ کیفیت ہے

تو صاحب حال گو جاہل و بے دین نہ ہو، بلکہ دیندار ہو، مگر پھر بھی یہ کمال نہیں، بلکہ زیادہ سے زیادہ اس کو معذور قرار دیا جا سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استحضارِ موت

حدیث میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ بیت الخلاء تشریف لے جاتے، اور آپ ﷺ قضاء حاجت کے بعد باہر نکل کر تیمّم کرنے لگتے، تو ابن عباسؓ فرماتے کہ یارسول اللہ ﷺ! ذرا اور آگے تشریف لے چلیں وہاں پانی ہے وضو فرمالیں، تو آپ ﷺ فرماتے کہ ابن عباس! ''**لا أدري لعلّي لا أبلغهٗ**'' کیا اُمید ہے کہ وہاں جانے تک زندہ رہوں گا؟

(مسند احمد: ۱/۲۸۸، معجم کبیر طبرانی: ۱۲/۲۳۸، الزھد لابن المبارک: ۱/۹۹)

دیکھیے! آپ ﷺ کو کتنا موت کا استحضار تھا، حالانکہ انبیاء کی موت اُن کی اجازت کی بغیر نہیں آتی، پھر آپؐ نے یہ جو فرمایا کہ کیا خبر میں وہاں تک پہنچ کر وضو کرلوں گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو تو معلوم تھا کہ فرشتہ میری اجازت کے بغیر روح قبض نہیں کرے گا، مگر آپ اُمتیوں کو اپنے عمل سے استحضارِ موت کی تعلیم دینا چاہتے تھے کہ ایسا استحضار رکھو۔

زہد و عبادت کا غرور زہر قاتل

فرمایا کہ حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ سے ایک شیخ نے اپنے احوال لکھ کر علاج دریافت کیا، سوال کا حاصل یہ تھا کہ ''میں اگر ریاضت و عبادت کرتا ہوں تو نفس میں فخر و غرور پیدا ہوتا ہے، اور یہ خیال آتا ہے کہ میرے جیسا کوئی نیک نہیں ہے، میں بہت بڑا اور نیک ہوں، اور اگر مجھ سے کوئی گناہ ہو جاتا ہے، اور خلاف شرع

کوئی کام کر بیٹھتا ہوں، تو اپنے آپ کو ذلیل وخوار اور بدترین خلائق تصور کرتا ہوں، اس حالت کا علاج بتایا جائے؟

اس خط کے جواب میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی نے جو جواب تحریر فرمایا، وہ ہر ایک کے لئے عموماً اور سالکین راہِ طریقت کے لئے خصوصاً آب حیات سے کم نہیں، جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ گناہ کرنے کے بعد جو عاجزی وخواری، انکساری ومسکنت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، یہ دراصل گناہ پر ندامت وافسوس کا نتیجہ ہے، جوکہ اللہ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے، اور بہت اچھی حالت ہے، کیوں کہ گناہ کے بعد ندامت بھی پیدا نہ ہونا اور گناہ سے لذت گیر ہونا، گناہ پر اصرار کے مترادف ہے، اور اگر چھوٹے گناہ پر اصرار ہو تو وہ کبیرہ گناہ ہو جاتا ہے، اور کبیرہ گناہ پر اصرار کفر کی دہلیز ہے، لہذا آپ کو گناہ کے بعد جو ندامت ہوتی ہے، اس نعمت پر شکر ادا کرنا چاہئے۔

امام ربانی نے فرمایا کہ نیکی کرنے کے بعد جو غرور وتکبر پیدا ہوتا ہے، یہ زہر قاتل ہے اور لا علاج ومہلک مرض ہے، جو نیک اعمال کو اسی طرح نیست ونابود کر دیتا ہے جس طرح خشک لکڑیوں کو آتش جلا کر تباہ کر دیتی ہے، فرمایا کہ اس حالت کے مقابلہ میں پہلی حالت کہ گناہ کر کے شرمندہ ہو، بہت بہتر اور عمدہ حالت ہے۔

مجدد صاحب فرماتے ہیں کہ یہ غرور اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ عمل کرنے والے کی نگاہ میں اپنے اعمال نہایت خوش نما معلوم ہوتے ہیں اور وہ ان کو اچھا سمجھتا ہے، اس لئے اس کا علاج اس کی ضد سے کرنا چاہئے، لہذا اپنی نیکیوں کو ناقص ونا خالص سمجھے اور ان کے پوشیدہ عیبوں کو نگاہ میں رکھے، اور اپنے کو قاصر سمجھے۔

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں یہ کبھی خیال نہ کرنا چاہئے کہ اپنی نیکیوں میں کوئی عیب وکمی نہیں ہے، اگر تھوڑی بھی توجہ کرے گا تو اللہ کی توفیق سے اپنی نیکیوں میں سرتا

پا عیب دیکھے گا اور حسن کا شائبہ بھی محسوس نہ ہوگا، پھر غرور کیسا اور نخوت کیسی، بلکہ اپنے اعمال میں قصور ونقصان ہونے کا اتنا غلبہ ہو کہ نیکی کرنے کے بعد شرمندہ و نادم ہو، نہ کہ مغرور و بے پرواہ۔ (مکتوب نمبر:۵۳)

عبادت کا کفارہ سیئات ہونا صغیرہ کے ساتھ مختص ہونے کی حکمت

مختلف عبادات کے بارے میں احادیث سے ثابت ہے کہ وہ کفارۂ سیئات ہوتے ہیں، علماء نے ان احادیث کو صغیرہ گناہوں پر محمول کیا ہے اس لیے کہ کبیرہ تو صرف توبہ سے معاف ہوتے ہیں، بندہ کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ شاید اس کی حکمت یہ ہے کہ کبیرہ وصغیرہ ہر گناہ میں اصل تو یہی ہونا چاہئے کہ آدمی توبہ کرے، اور بغیر توبہ کے کوئی گناہ بھی معاف نہ ہو، نہ چھوٹا نہ بڑا، مگر اس میں دشواری یہ تھی کہ بہت سے گناہ صغیرہ آدمی سے چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، آسانی کے ساتھ اس طرح سرزد ہوجاتے ہیں کہ اس کو احساس تک نہیں ہوتا کہ میں نے کوئی گناہ کیا ہے، اور وہ بے خبری اور بے شعوری میں ان میں ملوث ہوجاتا ہے، اگر ان کو توبہ پر موقوف رکھا جاتا تو شاید ہی ہم کبھی ان سے بری ہوتے اور توبہ کرکے ان سے پاک ہوتے، اس لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے محض رحمت و شفقت کی بناء پر مختلف عبادات ونیکیوں کو ہمارے صغیرہ گناہوں کا کفارہ بنادیا گیا، اس کے برخلاف کبیرہ گناہ چندایک ہیں، اور ان کا معلوم ہونا اور احساس ہونا بعید از قیاس نہیں، لہذا وہاں شرط توبہ برقرار رکھی گئی۔

الدنیا سجن المومن کی عجیب تشریح

حدیث میں آتا ہے کہ (الدنیا سجن المومن و جنة الکافر) کہ دنیا

مومن کے لئے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت۔

(مسلم:۲۹۵۶،ترمذی:۲۳۲۴، ابن ماجہ: ۴۱۱۳،صحیح ابن حبان:۴۶۳/۲،مستدرک حاکم:۶۹۹/۳،مسند احمد:۳۲۳/۲)

اس کی مختلف توجیہات حضرات علماء نے بیان فرمائی ہیں،مگر ایک تفسیر صوفیا کرام نے بیان فرمائی ہے،وہ نہایت لذیذ بھی ہے اور بہت عجیب بھی، وہ یہ کہ یہاں حدیث میں قید سے مراد وہ قید نہیں،جس سے ایذاء وتکلیف مقصود ہوتی ہے، بلکہ یہ قید ایسی ہے، جیسے طوطے اور بلبل کو قید کرتے ہیں کہ ان کی میٹھی بولی اور لطیف آواز کو سنا کریں گے، اوران سے لطف لیں گے،اس کے برخلاف کوّے کو کوئی قید نہیں کرتا، بلکہ قید میں آئے بھی تو اس کو آزاد کردیتا ہے،اسی طرح اللہ تعالی مومن کی فریادونالہ کو سن کر خوش ہوتے ہیں اوراس نالہ کو بار بار سننے کے لئے اس کی حاجات کو وہ فوری طور پر پوری نہیں کرتے ، بلکہ اس کو اپنی قید میں مقید کردیتے ہیں،تا کہ یہ اپنی میٹھی آواز سے اللہ کو بار بار پکارے،اور اللہ تعالے اس کی آواز کو سنیں،اس کے برخلاف کفار کی پکار خدا کو پسند نہیں ہے اور اللہ کے نزدیک اس کی آواز نہایت بھونڈی معلوم ہوتی ہے، جیسے کوے کی آواز بھونڈی ہوتی ہے اور کوئی اس کو سننا بھی پسند نہیں کرتا،اسی طرح اللہ تعالے کفار کی بھونڈی آواز سننا پسند نہیں کرتے ،لہذا جب وہ اللہ کو اپنی حاجات میں پکارتے ہیں تو فوری طور پر ان کی حاجات کو پورا کردیتے ہیں تا کہ یہ اپنی بھونڈی آواز بند کردیں اور یہاں سے دفع ہوجائیں۔

مولانا روم فرماتے ہیں کہ اگر کسی عاشق مزاج کے پاس دوعورتیں مانگنے آئیں، ایک ہو بوڑھی اور بدصورت و بھونڈی،اوردوسری جوان وخوبصورت،تو وہ بوڑھی کو جلدی سے کچھ دے کر بھگادیگا،مگر خوبصورت عورت سے کہے گا کہ ابھی بیٹھو

، پھر دیں گے، روٹی پک رہی ہے، اسی طرح ہزار بہانے کرے گا تاکہ اس سے لطف اندوز ہو، فرماتے ہیں کہ اسی طرح اللہ تعالی مومن کو قید کرتے ہیں کہ اس سے وہ خوش ہیں۔ اور کافر کو جلدی دیکر بھگا دیتے ہیں کہ اس کو ناپسند کرتے ہیں۔

واقعی عجیب تفسیر ہے، اور اس سے بڑی ڈھارس بندھتی ہے کہ ہماری دعائیں جو دیر سے قبول ہوتی ہیں، یہ بھی اللہ تعالے کی عنایت وشفقت ومہربانی ہے کہ وہ ہماری پکار کو سننا چاہتے ہیں، اس لیے ذرا دیر سے عطاء فرماتے ہیں۔

درجات قرب، ایک اہم تنبیہ

فرمایا کہ بادشاہ کے دربار میں حاضر باش، وزیروں اور کارندوں اور ارباب دانش وبینش واصحاب فضل وکمال لوگوں کو بادشاہ کا جو قرب اور رضا حاصل ہوتی ہے، وہ بالکل عیاں ہے، اب اگر بادشاہ ذی جاہ کسی وزیر ومشیر کو کسی کام پر مقرر کر کے دور کسی مقام پر روانہ کردے تو یہ بظاہر بادشاہ سے دوری ہے، لیکن درحقیقت یہ دوری نہیں، بلکہ قرب ہی کا ایک درجہ ہے، اور اس ظاہری دوری کے وقت بھی بادشاہ کی رضا اس شخص کو حاصل ہے، البتہ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ پہلی صورت بلاواسطہ قرب کی ہے اور دوسری صورت بالواسطہ قرب کی ہے۔

بعینہ اسی طرح اللہ تعالے سے قرب کے دو درجے ہیں، ایک قرب بلا واسطہ، دوسرا قرب بالواسطہ، قرب بلا واسطہ مثال کے طور پر یہ ہے کہ کوئی شخص نماز میں اللہ کے حضور کھڑا ہو، یا تلاوت یا ذکر میں مشغول ہو، یا اور کسی عبادت مقصودہ میں منہمک ہو، ان تمام صورتوں میں اس کو اللہ تعالے کا قرب بلا واسطہ حاصل ہوتا ہے، لیکن کبھی اس حکیم مطلق کی حکمت تقاضا کرتی ہے کہ اس شخص کو کسی کام پر مقرر کیا جائے، اور حکم ہوتا ہے کہ ماں باپ کی خدمت کرو، بیوی بچوں کے نفقہ کا انتظام کرو،

رشتہ داروں سے ملاقات کرو، مہمانوں کی خدمت کرو، تجارت یا ملازمت کے لئے جاؤ، یا دینی کام کے لئے نکلو، مثلا درس وتدریس کا کام کرو، دعوت وتبلیغ کے لئے لوگوں سے ملو، وغیرہ، پس جو شخص حکم شرع کے مطابق ان کاموں میں لگتا ہے، بظاہر تو وہ عبادات سے دور ہوا، لیکن فی الواقع یہ بھی قرب خداوندی کا بالواسطہ درجہ ہے، اگر بادشاہ کا وزیر یا مشیر دربار سے دور ہو کر دور نہیں، بلکہ بادشاہ سے قریب اور اس کی رضا کا مستحق ہے، تو یہ اللہ کے حکم کے مطابق مختلف خدمتوں میں لگا ہوا آدمی بھی ان تمام خدمتوں میں لگ کر خدا سے دور نہیں ہوا، بلکہ قرب ورضاء خداوندی کی دولت سے بالواسطہ طور پر مشرف ومالامال ہے۔

مگر میں یہاں ایک اہم بات پر تنبیہ کرنا چاہتا ہوں، اور بالخصوص سالکین کے لیے اس کو سمجھنا لازمی بات ہے، وہ یہ کہ قرب بالواسطہ میں بھی اللہ کی رضا وقرب حاصل ہونے کے باوجود یہ بات بدیہی طور پر معلوم ہوتی ہے کہ بلا واسطہ قرب ہی اصل ہے، اور بالواسطہ قرب اصل نہیں ہے، نیز یہ بھی واضح ہے کہ بلا واسطہ قرب کو علی الاطلاق فضیلت حاصل ہے، جب کہ بالواسطہ قرب کو علی الاطلاق فضیلت حاصل نہیں، بلکہ یہ بعض حالات وبعض اشخاص کے لئے بعض حِکَم اور مصالح کے پیش نظر افضل ہو جاتا ہے، جیسے بادشاہ کے دربار کی حاضری تو ہر صورت میں افضل ہے، لیکن دربار چھوڑ کر کسی اور کام پر جانا اور لگنا ہر صورت میں فضیلت نہیں رکھتا، بلکہ خاص حالات وبعض اشخاص کے لحاظ سے اس میں فضیلت پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً بادشاہ کو کسی مصلحت سے اپنے وزیر کو کسی دوسرے ملک کا سفیر بنا کر بھیجنا پڑا، تو اب اس وزیر کے حق میں اس حکم کی تعمیل میں بادشاہ سے دور ہو کر دوسرے ملک کو جانا، اور اس کام کو انجام دینا افضل ہے، اور اس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے۔ الغرض یہ قرب کی دوسری

صورت نہ علی الاطلاق افضل ہے اور نہ سب کے لیے افضل ہے۔

لہٰذا دونوں قسم کے قرب کا درجہ ایک نہیں ہوسکتا، جب یہ معلوم ہو گیا تو اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قرب بالواسطہ کی جتنی راہیں اور سبیلیں ہیں ان کو ان کے حکم اور مصالح کے پیش نظر اختیار کرنے کے بعد فوری طور پر پھر قرب بلا واسطہ کی راہ تلاش کرنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ صرف اسی قرب بالواسطہ کی صورت پر اکتفاء کر کے بیٹھ جائے۔

اس کے لئے ایک مثال عرض کرتا ہوں کہ ایک عالم وفاضل دین وعلم کی خدمت کے لئے درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کرتا ہے، اور بلا شبہ عالم وفاضل کے لئے یہ کام انتہائی اہم اور ضروری اور درحقیقت اس کا فرض منصبی ہے، لیکن یہ قرب بالواسطہ کی ایک سبیل وصورت ہے، لہٰذا صرف اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اس سے فراغت کے بعد قرب بلا واسطہ کی راہ تلاش کرنا چاہیے، مثلاً ذکر ونماز، تلاوت وغیرہ عباداتِ مقصودہ کا ذوق پیدا کرنا چاہیے۔

چناں چہ حضرت نبی کریم ﷺ کو بھی اس کا حکم دیا گیا ہے: ﴿فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ، وَ إِلٰى رَبِّکَ فَارْغَبْ﴾ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ: (إذا فَرَغتَ مِنَ الفَرَائِضِ فَانْصَبْ فِيْ قِيَامِ اللَّيْلِ) کہ جب آپ فرائض سے فارغ ہو جائیں تو رات کی نماز (تہجد) میں مشغول ہو جایئے، لیکن بہت سے مفسرین جن میں حضرت حسن بصری، حضرت قتادہ، حضرت مجاہد وغیرہ ہیں، فرماتے ہیں کہ جب آپ تبلیغ کے کام سے، یا جہاد یا قتال سے اور مخلوق کی خدمات سے فارغ ہو جائیں تو رب کی عبادت میں مصروف ہو جائیں۔

(قرطبی ۲۰/۱۰۹، معالم التفسیر: ۴۶۶، درمنثور: ۸/۵۵۲)

حضرت جنید بغدادی نے فرمایا کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ'' **اذا فرغت من امر الخلق فاجتھد فی عبادۃ الحق** ''یعنی جب آپ خلق کے کام سے (جس میں تبلیغ ودعوت ، درس ووعظ ، نیز ملی وسیاسی امورسب داخل ہیں) فارغ ہوجائیں تواللہ کی عبادت میں لگ جائیں۔ (قرطبی:۱۰۹/۲۰)

آج عام طور پر علماء میں یہ کوتاہی مشاہد ہے (الا ماشاءاللہ) کہ صرف قرب بالواسطہ پر اکتفاء کئے ہوئے ہیں ، اوراصل قرب کی طرف توجہ نہیں ہے۔کوئی درس و تدریس میں لگا ہے تو بس اسی پر اکتفاء کئے ہوئے ہے اورکوئی وعظ وتقریر میں لگا ہے تو وہ اسی پر بس کئے ہوئے ہے،کوئی تحقیقی کام میں لگا ہے تو وہ اسی کو اپنی معراج سمجھا ہوا ہے۔

پھر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ درس وتدریس ، وعظ وارشاد، قضاء وافتاء وغیرہ مناصب بھی قرب بالواسطہ ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ یہ سب کام محض رضائے الٰہی کے لئے ہوں ، ورنہ یہ سب کام بجائے قرب کے، ذریعۂ بعد ہونگے ، لہذا اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ تمام اُمور کی انجام دہی کی فکر کرنا چاہیے۔

یحیٰ بن معین کا استحضار موت

فرمایا کہ محدث محمد بن فضل اور محدث یحییٰ بن معین دونوں اپنے زمانے میں فن حدیث کے بڑے ائمہ مانے جاتے ہیں ،ایک بار یحیٰ بن معین کو محمد بن فضل سے ایک حدیث لینی تھی ، چنانچہ یحیٰ بن معین ، محمد بن فضل کے پاس پہنچے اور حدیث سنانے کی گذارش کی ، تو وہ سنانے لگے ،اورسند بیان فرمائی کہ'' **حدثنا حماد بن سلمۃ** '' (کہ مجھ سے حماد بن سلمہ نے حدیث بیان کی) تو یحیٰ بن معین نے کہا کہ حضرت ! میں زبانی نہیں ، بلکہ آپ کی کاپی سے سننا چاہتا ہوں ، تو محمد بن فضل کہنے

لگے میری کاپی اندر کمرہ میں رکھی ہے، لاتا ہوں، یہ کہہ کر اندر جانے لگے، تو یحییٰ بن معین نے ان کے کپڑے پکڑ لئے اور کہا کہ حضرت! پہلے آپ زبانی ہی سنا دیجئے، کیا خبر کہ آپ کے اندر سے کاپی لانے تک زندہ بھی رہوں گا یا نہیں، اس لئے پہلے زبانی ہی سنا دیجئے، پھر اگر اللہ نے زندگی دی تو کاپی سے بھی سن لوں گا۔ اس واقعہ کو شمائل ترمذی میں امام ترمذی نے رسول اللہ ﷺ کے لباس کے سلسلہ کی ایک حدیث کے درمیان میں ضمناً ذکر کیا ہے۔ (شمائل ترمذی: ص: ۵)

اس طرح موت کا استحضار ہوگا تو زندگی میں انقلاب پیدا ہو جائے گا، اس لئے کہ موت کا استحضار نہیں ہوتا تو انسان یہ سمجھتا ہے کہ کل توبہ کرلوں گا، آئندہ توبہ کرلوں گا، اس طرح ٹالتا رہتا ہے، اگر موت کا استحضار ہو تو ایسا نہیں ہوگا۔

آج دنیا میں بڑے اللہ والے کیوں نہیں؟

ایک مرتبہ احقر (مرتب) نے حضرت والا سے عرض کیا کہ حضرت! آج دنیا میں حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب جیسے بڑے بڑے اللہ والے کیوں نہیں ہیں؟ تو حضرت نے فرمایا کہ آج بھی ایسے اللہ والے موجود ہیں، مگر لوگ غلطی یہ کرتے ہیں کہ اللہ والے جب آخری عمر میں پہنچ کر ساری دنیا میں چمکتے ہیں، شہرت پا لیتے ہیں، تب ان کو جانتے یا مانتے ہیں اور ان کی طرف رجوع کرتے ہیں، شروع سے ان کو عام طور پر لوگ نہیں پہچانتے، خود حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب علیہ الرحمۃ اور حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب دامت برکاتہم کو ان کی جوانی میں کون جانتا پہچانتا تھا، حالانکہ وہ اس وقت بھی بڑے اللہ والے تھے، یہی کیا ان کے بھی اکابر حضرت گنگوہی، حضرت تھانوی و حضرت نانوتوی سب کے ساتھ لوگوں نے ایسا ہی کیا ہے، ہاں جن کی

آنکھیں ہوتی ہیں وہ اسی وقت ان کو پہچان لیتے ہیں اوراسی وقت رجوع کرتے ہیں اورمنزل مقصودکوپہنچ جاتے ہیں، پھرفرمایا کہ شہرت حاصل ہوجانے کے بعد پہچاننا اوراصلاح کے لئے رجوع کرنا کوئی خاص بات نہیں،اس وقت تو سب کرتے ہیں، کمال تو یہ ہے کہ شہرت سے پہلے ہی اللہ والوں کو پہچانا جائے اوران کی طرف رجوع ہوکراپنی اصلاح کرائی جائے،اس سے اخلاص کا پتہ چلتا ہے،اورشہرت کی بنیاد پر کسی کی طرف رجوع کرنے میں ہوسکتا ہے کہ نفس کا کوئی کید پوشیدہ ہو،اورجوان اغراض فاسدہ کودل میں لئے ہوئے اولیاءاللہ سے رجوع کرتے ہیں،وہ کامیاب نہیں ہوتے، بہت سے لوگ اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بغیراصلاح کے یوں ہی زندگی گذاردیتے ہیں۔

تمت بالخير

نظم

تحفة السالکین

از: محمد شعیب اللہ خان

اصلاح کی ہو خواہش تو تم یہ کام کرلو
اول قدم میں خود کو رب کا غلام کرلو
تم ذکر وفکر رب میں تن من سبھی لگادو
غفلت کی زندگی کو خود پر حرام کرلو
مخفی رہے نہ تم سے، راز حیاتِ قلبی
بچنے کا تم گناہوں سے اہتمام کرلو
اخلاق کو سنو اور، عادات کو بنالو
اس کے لئے صحیح و محکم نظام کرلو
شیطان کی وجہ سے رستہ یہ پر خطر ہے
چلنے کو ایک رہبر کا انتظام کرلو
خواہش اگر ہو تم کو محبوب رب بنو تم
جاری زباں پہ اپنی مالک کا نام کرلو
حاصل ہو نیک صحبت اس کا دھیان رکھنا
صحبت کی تم بروں کی ایکدم سلام کرلو
سالک بغیر تقویٰ رہتا نہیں ہے زندہ
یہ بات دل میں رکھ کر اصلاح تام کرلو

اللہ سے تعلق اس راہ کا ہے مقصد
اس کے حصول میں تم کوشش تمام کرلو
ملتی نہیں ہے یوں ہی اللہ کی محبت
اس کے لئے ریاضت تم صبح وشام کرلو
ناکام ہے یہاں پر لذّات کا پجاری
خود پر حرام تم ہی مینا وجام کرلو
پاتا نہیں خدا کو جو نفس کا ہو تابع
نفس شریر وسرکش کی روک تھام کرلو
یہ عرض مخلصانہ ظفرؔ نے پیش کی ہے
اس کا نصیحتوں میں تم انضمام کرلو

فیضانِ معرفت

حصہ دوم

افادات

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی و مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

وخلیفہ حضرت اقدس مولانا مفتی مظفر حسین صاحب نور اللہ مرقدہ

مرتب

مولوی محمد زبیر قاسمی

فیضان معرفت

جلد دوم

افادات

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم
بانی و مہتمم جامعہ جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم
وخلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ
ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

مرتب
محمد زبیر احمد قاسمی
(خادم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم)

ناشر:
اعتقاد پبلشنگ ھاؤس (رجسٹرڈ)

فہرست مضامین

عناوین **صفحہ**

دنیا ہمارے لئے اور ہم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں

حقیقتِ طہارت

محبت الٰہیہ اور اس کے آثار ولوازم

عشق رسولؐ اور اس کے تقاضے

محبت وخشیت کے آنسو

اللہ تک پہنچنے دنیا چھوڑنا ضروری نہیں

ملنے کا پتہ

مکتبہ مسیح الامت

۸۴ر آرمسٹرانگ روڈ، بیدواڑی، بنگلور

فون: 9242163441

دعاء

از: محمد شعیب اللہ خان ظرؔفی

الٰہی میں تجھ سے دعا مانگتا ہوں ☆ سبھی کے لئے بھلا مانگتا ہوں

گنہ گار ہوں میں سیاہ کار ہوں میں ☆ ترا فضل بے انتہاء مانگتا ہوں

کرم پر جو تیرے بھروسہ ہے مجھکو ☆ خطا کر کے پھر بھی عطاء مانگتا ہوں

تو ناراض ہو گر جیوں گا میں کیونکر ☆ خدایا میں تیری رضاء مانگتا ہوں

بھلا دوں سبھی کو میں خاطر سے اپنے ☆ فقط یک غمِ دلرباء مانگتا ہوں

میں نظروں سے اپنے گرا دوں سبھی کو ☆ میں توفیق ایسی بجا مانگتا ہوں

مجھے یاد تیری میسّر ہو ہر دم ☆ میں ایسی ہی خلوت سرا مانگتا ہوں

میں دنیا سے بیزار ہوں یا الٰہی ☆ بکھیڑوں سے ان سب رہا مانگتا ہوں

خودی اور انا کو مٹانے اے ظرؔفی ☆ خدا سے دوائے فناء مانگتا ہوں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

الحمد لأ هله و الصلوة لأهلها:

اللہ تعالیٰ نے حضرت والا کی مجالس کے مجموعہ ''فیضان معرفت'' کی جلد اول کو بے پناہ مقبولیت عطاء فرمائی، قلیل مدت میں پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا، جلد اول شائع ہو کر تقریباً دوسال کا عرصہ ہوگیا تھا، بہت سارے لوگ دوسری جلد کے منتظر تھے، لیکن درمیان میں حضرت والا کے تصنیف کردہ رسالوں کے مجموعہ ''جواہر شریعت'' کی ترتیب میں مصروف ہونے کی وجہ سے دوسری جلد کے آنے میں تاخیر ہوگئی۔

اب اللہ تعالیٰ نے جلد دوم کو ترتیب دینے کی سعادت نصیب فرمائی، جلد اول کے مقابلہ میں جلد دوم کی ترتیب کچھ بدل دی گئی ہے، جلد اول میں ایک ہی جگہ ایک مجلس کی تمام باتوں کو ایک موضوع کے تحت جمع نہیں کیا گیا تھا، بلکہ مجالس میں ہونے والی مختلف باتوں کو مختلف عناوین کے تحت منتشر طور پر جمع کیا گیا تھا، لیکن حضرت والا کے مشورہ سے اس جلد میں مجلس وار ایک موضوع سے متعلق تمام بیانات کو یکجا کردیا گیا ہے، نیز اس جلد میں حضرت والا کے تحریر کردہ بعض اہم اصلاحی مضامین کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ مثلاً ''محبت الٰہیہ''، ''محبت وخشیت کے آنسوں'' وغیرہ

ان مجالس کے مجموعہ کی ایک خوبی یہ ہے کہ حضرت والا نے اس پر از اول تا آخر نظر فرمائی ہے، اور نہایت مفید اضافے فرما کر ترتیب کی خامی سے پیدا شدہ

مضامین کی تشنگی کو دور فرما دیا ہے۔

نیز اپنے قیمتی مشوروں سے نواز کر احقر کی ہمت افزائی فرماتے ہیں، اسی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے کہ مجالس کی ترتیب کا سلسلہ آگے بڑھ رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ پہلی جلد کی طرح دوسری جلد کو بھی مقبولیت عطاء فرمائے، اور ان مجالس کی ترتیب کے سلسلہ کو مزید آگے بڑھانے کی توفیق عطاء فرمائے اور امت کو نفع پہنچائے اور میرے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے۔

محمد زبیر احمد قاسمی
خادم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم
۵؍ربیع الاول ۱۴۲۹ھ

باسمہ تعالیٰ

ہم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں

الحمدللّٰہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین الطفیٰ ـ امابعد
فقد قال النبی ﷺ "إِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَإِنَّكُمْ خُلِقْتُمْ لِلْآخِرَةِ" (أو کما قال علیه الصلاة و السلام)

یہ ایک مختصر حدیث ہے اور یہ حدیث عام طور پر جمعہ کے خطبوں میں بھی پڑھی جاتی ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ''دنیا تمہارے لیے بنائی گئی ہے اور تم آخرت کے لیے بنائے گئے ہو''۔ (شعب الایمان: ۳۶۰/۷)

دنیا ہمارے لئے اور ہم آخرت کے لئے:

دنیا تو ہمارے لیے ہے، لیکن ہم آخرت کے لیے ہیں، اگر یہ مضمون ہم سب کو یاد ہو جائے تو اس مضمون کی روشنی میں زندگی گزارنا آسان ہو جائے گا، آج لوگ بہت پریشان رہتے ہیں اور بار بار اس پریشانی کے نتیجہ میں کہیں اِدھر، کہیں اُدھر بھٹکتے ہی رہتے ہیں۔ اور یہ سب اس لیے ہے کہ دنیا ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، جو آدمی یہ کہہ کر آزاد ہو گیا کہ دنیا میرے لیے ہے اور میں خود آخرت کے لیے ہوں تو وہ آدمی

بھٹک نہیں سکتا اور اس کے لیے زندگی گزارنے میں بڑی آسانیاں ہیں۔

دنیا میں ہمیشہ رہنے کا خیال نہیں ہونا چاہئے، جو آدمی ہمیشہ دنیا میں رہنے کے خیال میں رہتا ہے، بڑی بڑی بلڈنگیں بناتا ہے، بے ضرورت چیزوں میں دل لگاتا ہے اور دنیا کا سامان جمع کرتا رہتا ہے، اور اسے یاد ہی نہیں رہتا کہ مجھے یہ سب کچھ چھوڑ کر جانا ہے تو اسے سکون کی زندگی مل ہی نہیں سکتی۔ چند دن پہلے ایک صاحب کے یہاں جانا ہوا، انہوں نے ایک عالیشان گھر بنایا ہے، میں نے کہا کہ بھائی جیسا بھی گھر بنائیں، لیکن جائیں گے کہاں؟ قبر ہی کے اندر، جیسا بھی گھر بنالو، جیسی بھی بلڈنگ بنالو، کتنی ہی عظیم الشان بنالو، ہر قسم کی راحت کا انتظام کرلو اور عیش وراحت کی سب چیزیں جمع کرلو، لیکن جب مریں گے تو بادشاہ بھی وہیں جائے گا اور فقیر بھی وہیں جائے گا۔ وہاں فقیر یا بادشاہ کا کوئی فرق نہیں ہوگا۔

اور بعض لوگوں نے فرق کرنے کی کوشش کی تھی تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسے عجیب اور انتہائی عبرت ناک واقعات دکھادیے کہ لوگوں نے ہمیشہ کے لیے سیکھ لیا۔

ایک جگہ پر ایک بزرگ کی مزار کے پاس ایک پیر رہتا تھا، اور عام طور پر لوگ اس کے ساتھ ان مقامات کو ''شریف'' کہتے ہیں، جیسے ''کلیر شریف'' گلبرگہ شریف، ''اجمیر شریف'' وغیرہ، اور بعض لوگوں میں ''شریف'' لگانے کی یہ عادت بیماری کی حد تک ہوتی ہے کہ ہر چیز میں شریف لگادیتے ہیں۔

۞ بھوک شریف اور ایک لطیفہ:

اس پر ایک لطیفہ یاد آگیا کہ مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمود صاحب گنگوہی علیہ الرحمہ ایک سفر کے دوران ایک جگہ گئے، وہاں کسی بزرگ کا مزار تھا اور کچھ مجاورین

رہتے تھے تو وہاں کے لوگ ہر چیز میں شریف لگا رہے تھے، حضرت! لیجئے لوٹا شریف، یہ کیجئے وضوء شریف، ادھر ہے بیت الخلاء شریف، سب جگہ شریف شریف۔

حضرت کو ہنسی بھی آ رہی تھی لیکن ہنسی روک کر اپنا کام کرتے رہے، جب نماز وغیرہ سے فارغ ہو گئے، پھر ان بزرگ کے مزار پر جا کر وہاں فاتحہ پڑھی، اس کے بعد واپس آئے تو ان لوگوں نے کہا کہ حضرت! کھانا شریف تیار ہے، اس لیے روٹی شریف کھا لیجئے، تو حضرت نے کہا کہ بھائی بھوک شریف نہیں ہے۔ تو بعض جگہ شریف شریف کا استعمال بہت ہوتا ہے۔

ایک جھوٹے پیر کی قبر کی حالت:

میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک ایسی ہی جگہ ایک صاحب مجاور تھے اور ان کے بہت سارے مرید تھے، اور جو اس قسم کے ڈھکوسلے لوگ ہوتے ہیں، وہ لوگوں کو حقائق سے آگاہ نہیں کرتے، بلکہ گمراہ کرتے رہتے ہیں، تو ان صاحب نے اپنے مریدین کو یوں گمراہ کر رکھا تھا کہ میں کبھی نہیں مروں گا، ہاں تھوڑی دیر کے لیے مجھے موت آئے گی، ظاہری موت، لیکن جب مجھے قبر میں آپ لوگ دفنا دیں گے تو پھر میری وہاں زندگی شروع ہو جائے گی اور اس پیر نے کہا کہ جب میں مر جاؤں گا تو چالیس دن کے بعد پھر واپس آؤں گا، تو ان کے مریدین نے کہا کہ حضرت! آپ کے لیے جو قبر شریف بنے گی وہ قبر شریف کیسی بنی چاہئے۔ تو انہوں نے کہا کہ اس میں ایسے ٹائلس لگاؤ اور یوں اس میں پینٹ لگاؤ، یوں زیب و زینت کرو اور اسی کے ساتھ اس میں ''اے سی'' بھی فٹ کرو۔ مریدین نے کہا کہ ہاں! ہم اسی طرح تیار کریں گے، چنانچہ وہ صاحب ابھی موجود ہی تھے، زندہ ہی تھے، اسی وقت ان

کے لیے قبر تیار کی گئی، سارے انتظامات کر دیے گئے، اور عالی شان قبر تیار ہو گئی، ٹائلس اور پھول و بوٹے سب لگائے و بنائے گئے، باہر سے تار کھینچ کر اس میں ''اے سی'' فٹ کی گئی۔

دیکھئے! اس کے مریدین کس قدر پکے تھے، اگر چہ شیخ کچا تھا، عام طور پر ایسا دیکھنے میں آیا کہ سچے پیروں کے مرید بڑے کچے ہوتے ہیں، اور کچے پیروں کے مرید بڑے پکے ہوتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا کیا راز ہے، لیکن عام طور پر آجکل دیکھا ایسے ہی گیا ہے۔

اس کے بعد بہر حال وہ وقت جو سب کو آنا ہے، اس کو بھی وہ وقت آ گیا، یعنی موت کا وقت، جب وہ مر گیا تو اس کے مریدین نے اس کو نہلایا، دُھلایا، اور لے جا کر دفن کر دیا، دفن کرنے کے بعد ''اے سی'' بھی چالو کر دیا؛ تاکہ اندر حضرت کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگے۔ اس کے بعد انتظار شروع کر دیا کہ حضرت تشریف لائیں گے، لیکن وہ تشریف کب لاتے؟

بہت دن ہو گئے تو اس کے بعد ان لوگوں نے آپس میں کہا کہ بھائی! پیر صاحب نے چالیس دن میں واپس آنے کا وعدہ کیا تھا، مگر چالیس دن ہو چکے ہیں، ابھی تک نہیں آئے، کیا بات ہے، ذرا خبر تو لے لیں۔ مشورہ کیا گیا اور قبر کو کھولنے کی بات تجویز کی گئی۔ پیر صاحب کی وہ قبر ایسی بنائی گئی تھی کہ قبر کے اوپر ایک دروازہ بنایا گیا تھا تاکہ آسانی سے کھولا جا سکے، گویا کہ گھر ہی بنا دیا تھا۔ اب جب اس کو کھولا تو عجیب وغریب تماشا نظر آیا، عذاب کی کیفیت نظر آئی، اور جو ''اے، سی'' انہوں نے فٹ کی تھی، جو کچھ ٹیلس وغیرہ لگائے تھے، اس کا تو اس میں نام ونشان نہیں تھا، وہاں تو کچھ اور ہی کیفیت اور حالت تھی، بس جناب عبرت ہوتی ہے۔

ایمان وعمل سے قبر کو بناؤ:

الغرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ کیسا بھی آدمی دنیا میں آئے، جانا ہی ہے اور قبر کے گڑھے میں ہی رہنا ہے، کسی کے لئے کوئی عالی شان مکان نہیں بنایا جاتا، پھر جب وہاں پر جائے گا تو اس کے ایمان و اعمال کے مطابق حساب و کتاب ہوگا۔ ہاں! اچھے لوگ ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے قبر کو بڑی بہترین جگہ بنادے گا، وہاں ان کے لیے ہر قسم کی راحت ہوگی۔ قبر کو مال کے ذریعہ بہترین ٹائکس اور پینٹ اور رنگ و روغن اور اے سی و فرنیچر سے بنایا نہیں جاتا، بلکہ قبر کو ایمان و اعمال سے بنایا جاتا ہے۔

اگر یہ پیر اللہ پر یقین رکھنے والا ہوتا، واقعی آخرت کا اس کو یقین ہوتا اور اللہ کی طرف سے ہونے والے سوالات پر اس کو یقین ہوتا، وہاں کی نعمتوں پر ایمان ہوتا تو وہ آدمی کبھی یہ نہ کہتا کہ آپ لوگ میرے لیے ان ان چیزوں کا انتظام کرو، اس لیے کہ اگر اسے آخرت کی چیزوں پر یقین ہوتا تو وہ کہتا کہ دنیا کی چیزیں کیا ہیں؟ اصل اے سی وہاں ہوگی، یہ دنیا کی اے سی کیا ہے؟ اصل نعمتیں تو وہاں ہوں گی، یہاں کی کیا نعمتیں ہیں؟ وہ ایسی ایسی نعمتیں ہیں کہ جن کو کسی انسان نے آج تک دیکھا نہیں ہے، اور کسی انسان کے دل پر ان کا خطرہ بھی نہیں گزرا۔

ایسی ایسی چیزیں اللہ نے مسلمانوں کے لیے، مومنوں کے لیے تیار کی ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا:

﴿ لَاتَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴾ [السجدة : ١٧]

(نیک لوگوں کے لیے بطور جزاء ایسی ایسی چیزیں تیار رکھی گئی ہیں کہ کسی نفس کو اس کی خبر تک نہیں ہے)

تو جسے اس آیت پر یقین ہوگا وہ کہے گا کہ یہاں کی کوئی چیز مجھے نہیں چاہئے، مجھے تو ہاں کی چیز چاہئے۔

آخرت کی فکر و تیاری:

بہر حال یہ قصہ تو درمیان میں یاد آ گیا، بتا یہ رہا تھا کہ ہر آدمی مرنے کے بعد جاتا ہے قبر میں اور وہاں بادشاہ و امیر ہو، یا غریب و فقیر ہو، سب کے لیے یکساں نظام ہے، اسی مٹی میں سب کو جا کر سونا ہے، اس لیے ہمیں آخرت کے لیے ابھی سے محمد رسول اللہ ﷺ نے متوجہ کیا اور فرمایا کہ "اِنَّکُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ" (تم تو پیدا ہی کئے گئے ہو آخرت کے لیے) ہاں "اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ" (دنیا تمہارے لیے بنائی گئی ہے) لہٰذا تم ضرورت کے لیے اس دنیا میں سے کھاؤ، پیو، اس میں رہو، سہو اور اس کو استعمال کرو، لیکن اصل چیز جس پر توجہ دینی ہے وہ یہ ہے کہ میری ساری زندگی، میرا کھانا اور پینا اور میری ساری راحتیں سب کچھ اللہ کے لیے ہونا چاہئے اور آخرت کی تیاری کے لیے ہونا چاہئے۔

مولانا حکیم اختر صاحب کہتے ہیں کہ بھائی ہم چاہے لندن میں ہوں یا پاکستان میں یا ہندوستان میں ہوں، زمین کے جس گوشے میں ہوں اور چاہے ہم کو کسی ملک کی نیشنلٹی مل جائے، لیکن دنیا کے ہم نیشنل نہیں ہیں، ہماری سٹیزن شپ تو جنت کی ہے، اور لوگ کہتے ہیں کہ یہاں کی نیشنلٹی مل جائے، وہاں کسی کی نیشنلٹی مل جائے اور اس کے لیے پریشان ہو رہے ہیں، تگ و دو ہو رہی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے تو ہم کو وہاں کی نیشنلٹی دے کر بھیج دیا ہے، اس لیے ہم کو تو وہاں کی تیاری کرنی ہے، اور ہم

وہاں کے باشندے بنے رہیں، اس کی فکر زیادہ ہونا چاہئے۔ایک دن ہم کو دنیا سے ضرور جانا ہے، خواہ ہماری بلڈنگ دو ہزار گز کی ہو، بعض رئیس ہمارے یہاں ایسے ہیں کہ دو دو ہزار گز کی بلڈنگ میں رہتے ہیں، مگر آخر میں ان کو زمین کے نیچے دو گز کی قبر ملتی ہے، البتہ جو نیک لوگ ہیں اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو تا حد نظر جہاں تک کہ ان کی نظر جا سکتی ہے وہاں تک کشادہ فرما دیں گے۔

قبر میں فرشتوں کے سوالات:

حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب بندے کو دفن کیا جاتا ہے، دو فرشتے جن میں سے ایک کا نام منکر اور دوسرے کا نام نکیر ہوگا اللہ کی طرف سے آتے ہیں، ان فرشتوں کی حالت بڑی خطرناک قسم کی ہوتی ہے، ان کی شکلیں اور صورتیں آدمی دیکھے تو گھبرا جائے، کالی رنگت اور آنکھیں نیلی، کس قدر ڈراؤنی شکل ہوگی؟ آواز ان کی بڑی گرج دار ہوتی ہے، ہاتھ میں ان کے گرز ہوتے ہیں، وہ ان کو لے کر آتے ہیں اور آدمی سے سوال کرتے ہیں۔

وہ سوال کیا ہوتا ہے ”مَنْ رَّبُّكَ“ (تیرا رب کون ہے؟) دوسرا سوال یہ ہوگا ”مَا دِيْنُكَ“ (تیرا دین کیا ہے) اور تیسرا سوال ہوگا ”مَنْ هٰذَا الرَّجُلُ الَّذِىْ بُعِثَ فِيْكُمْ“ (یہ آدمی کون ہے جو تم میں بھیجا گیا تھا)، ان کو پہچانتے بھی ہو یا نہیں۔ مؤمن اس کو صحیح صحیح جواب دے دیگا، فرشتے کہیں گے کہ ہم جانتے تھے تو تو ایسا ہی جواب دیگا، پھر آسمان سے ایک منادی آواز دیگا کہ میرے بندے نے سچ کہا، اس کے لئے جنت کا بچھونا لگاؤ اور جنت کا اس کو لباس پہناؤ، اور جنت کی جانب دروازہ کھول دو نیز اس کے لئے تا حد نظر قبر کو وسیع کر دیا جائے گا، جب اس کے لئے یہ سب انتظامات ہوں گے تو وہ آدمی خوشی میں کہہ اُٹھے گا کہ میں اپنے گھر والوں کے

پاس جا کر ان کو ان باتوں کی خبر دینا چاہتا ہوں، مگر فرشتے اس سے یہ کہیں گے کہ "نَمْ کَنَوْمَةِ الْعَرُوْسِ" (کہ دلہے یا دلہن کی طرح سو جا) اب تجھے اللہ کے سوا کوئی نہیں جگائے گا، اور اگر وہ مرنے والا کافر یا منافق ہوگا تو جواب میں ہاہ ہاہ کہے گا اور کہے گا کہ میں کچھ نہیں جانتا، لوگ جو کہتے تھے میں بھی وہی الٹی سیدھی کہہ دیا کرتا تھا، آسمان سے آواز آئے گی کہ اس نے جھوٹ کہا ہے اس کو جہنم کا لباس پہناؤ اور آگ کا بچھونا لگا دو اور دوزخ کی طرف دروازہ کھول دو، نیز اس کے لئے قبر کو اس قدر تنگ کر دیا جائے گا کہ اس کی ایک جانب کی پسلیاں دوسری جانب کی پسلیوں میں گھس جائیں گی۔ (مسند احمد: ۲۶۷/۴، مصنف ابن ابی شیبہ: ۵۴/۳)

غور کرو کہ قبر کی منزل کس قدر قابل عبرت ہے؟ اگر ایمان و عمل ہوگا تو اس کے لئے قبر جنت ہے ورنہ قبر جہنم ہے۔

رابعہ بصریہؒ کا فرشتوں سے مناظرہ:

ہاں اللہ کے نیک بندوں کے لئے وہاں کوئی پریشانی و گھبراہٹ نہ ہوگی، جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ مؤمن کو جب قبر میں بٹھایا جائے گا تو "یجلس غیر فزع و مشغوب" (وہ اٹھ بیٹھے گا اس حال میں کہ وہ نہ خوف کھائے گا اور نہ پریشان ہوگا)، اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا کہ حضرت رابعہ بصریہؒ کا جب انتقال ہو گیا، کسی کے خواب میں وہ آئیں، خواب دیکھنے والے نے پوچھا کہ آپ کا انتقال ہو گیا تھا، اللہ کے پاس کیسے گزری، تو کہا کہ جب مجھے دفن کیا گیا، تو فرشتے آئے پوچھنے اور سوال کرنے کے لیے، انہوں نے مجھ سے پوچھا "مَنْ رَّبُّكَ" تو میں نے کہا کہ تم کون ہو؟ کہا کہ ہم اللہ کے فرشتے ہیں، میں نے پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو؟ کہا کہ آسمان سے آئے ہیں، میں نے پوچھا کہ آسمان یہاں سے کتنی دوری اور فاصلہ

پر ہے؟ تو کہا کہ پانچ سو برس کا فاصلہ ہے، آدمی کی رفتار سے یہاں کوئی چلے تو پانچ سو برس میں آسمان اول پر پہنچے گا۔ ہاں فرشتہ کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے، اس لئے وہ وہاں سے ایک لمحہ میں آجاتا ہے، وہ تو اس کو اللہ نے قدرت دی ہے، تو انہوں نے کہا کہ یہاں سے پانچ سو برس کا فاصلہ ہے، تو میں نے کہا کہ اچھا تم کو معلوم ہے کہ تمہارا رب کون ہے؟ کہا کہ ہاں ہم کو معلوم ہے، میں نے کہا کہ جب پانچ سو برس کے فاصلہ کو طے کر کے تم خدا کو نہیں بھولے تو میں دوگز زمین سے نیچے آ کر اپنے رب کو کیسے بھول جاؤں گی۔

دیکھئے! اللہ کے نیک بندوں کا کچھ مقام بھی ہوتا ہے، وہ اللہ کے فرشتوں کو بھی ایسا جواب دے دیتے ہیں جو ''لا جواب'' ہوتا ہے۔

ایک نحوی عالم کا لطیفہ:

مجھے ایک اور لطیفہ یاد آگیا، عربی جاننے والوں کے لیے یہ لطیفہ سناتا ہوں، ہاں جو عربی نہیں جانتے ہیں ان کو مزہ نہیں آئے گا، مزہ کیا، سمجھ میں بھی نہیں آئے گا، لیکن یہاں اہل علم حضرات بھی ہیں اور طلبۂ کرام بھی ہیں، اس لیے عرض کرتا ہوں، وہ یہ کہ مظاہر علوم سہارنپور میں ایک استاذ بزرگ تھے، اور وہ نحوی تھے، فن نحو میں ان کو بڑی مہارت تھی، وہ ہر بات میں نحو کو سامنے رکھ کر کلام کرتے تھے، جب ان کا انتقال ہوا تو طلبہ آپس میں کہنے لگے کہ حضرت کے پاس فرشتے آئے ہوں گے منکر نکیر اور انہوں نے حضرت سے پوچھا ہوگا ''مَنْ رَبُّكَ'' (تیرا رب کون ہے؟) تو انہوں نے جواب میں کہا ہوگا ''مَنْ رَبُّكَ'' (وہ جو تیرا رب ہے)

یعنی فرشتوں کے سوال میں '' من '' استفہامیہ ہے اور جواب کے اندر ''من'' موصولہ ہے۔ تو بظاہر سوال بھی وہی جواب بھی وہی، مگر معنی بالکل الگ، زندگی میں

ان کا جوطریقہ تھا اس کو سامنے رکھ کر طلبہ آپس میں یہ کہہ رہے تھے۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ اللہ کے منکر نکیر فرشتے آتے ہیں، سوال وجواب ہوتا ہے۔ جب نیک بندہ جواب دے دیتا ہے، اس کی قبر کو تا حد نظر وسیع کر دیا جاتا ہے۔ اور جب آدمی برا ہوتا ہے تو اس کی قبر کو تنگ کر دیا جاتا ہے۔

حضرت عثمان کا قبر کے خوف سے رونا:

اسی لئے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کسی قبر کو جب دیکھتے، قبر پر کھڑے ہوتے تو بہت رویا کرتے تھے، حتی کہ آپ کی ڈاڑھی تر ہو جاتی، لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آپ جنت و دوزخ کے ذکر پر اس قدر نہیں روتے جتنا کہ قبر کو دیکھ کر روتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں! اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ قبر آخرت کی پہلی منزل ہے جو یہاں کامیاب ہو گیا اس کے لئے اگلی منزلیں اس سے زیادہ آسان ہوں گی اور جو اس سے نجات نہیں پایا اس کے لئے اس کے بعد کی منزلیں اور زیادہ مشکل ہوں گی، نیز فرمایا کہ: ما رأيتُ منظراً قطُّ إلّا والقبر أفظع منه" (میں نے قبر سے زیادہ بھیانک کوئی منظر نہیں دیکھا)۔

(ترمذی: ۲۳۰۸، ابن ماجہ: ۴۲۶۷، مسند احمد: ۴۵۴، مستدرک حاکم: ۱/۵۳۶)

بہر حال قبر ایک بھیانک جگہ ہے اگر اس کو ایمان و عمل سے تیار نہ کیا گیا، اسی تیاری کے لئے ہمیں یہ دنیا دی گئی ہے، دنیا عیش وعشرت کے لئے نہیں ہے، بلکہ ایک عبرت کا مقام ہے، اور یہ حقیقت قبر میں جا کر کھلے گی، مولانا حکیم اختر صاحب دامت برکاتہم نے اپنے ایک شعر میں دنیا کی حقیقت بیان کی ہے، ان کا شعر ہے ؎

یوں تو دنیا دیکھنے میں کس قدر خوش رنگ تھی

قبر میں جاتے ہی دنیا کی حقیقت کھل گئی

یہاں سے لوگ جب جائیں گے تو معلوم ہوجائے گا کہ دنیا کی حقیقت کیا ہے دنیا خاک نظر آئے گی۔

افلاطون کی حضرت موسیٰؑ سے ملاقات:

مجھے اس پر ایک قصہ یاد آ گیا، بڑا عجیب وغریب قصہ ہے اور یہ حضرت تھانویؒ نے بیان فرمایا ہے کہ افلاطون جو بہت بڑا حکیم اور اپنے زمانہ کے بڑے عقلمند لوگوں میں شمار ہوتا ہے اور وقت کا بہت بڑا فلسفی تھا اور اس کی تحقیقات دنیا میں آج بھی معتبر و مستند مانی جاتی ہیں، کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا تھا، اس کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ جنگل میں ایک معمولی جھونپڑے میں رہتا تھا، لوگوں سے میل ملاپ نہیں رکھتا تھا، اگر کسی کو اس سے ملنا ہوتا تو پہلے سے اجازت لینی پڑتی تھی، وہ اللہ کو تو مانتا تھا، مگر رسولوں کو نہیں مانتا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک دفعہ اس کی ملاقات بھی ہوئی تھی، حضرت موسیٰ نے اس سے کہا کہ میں اللہ کا نبی ہوں، میرے اوپر ایمان لاؤ۔ تو اس نے کہا کہ میرا ایک سوال ہے، وہ یہ کہ فرض کیجئے کہ اللہ تعالیٰ تیر پھینک رہا ہے اور بندوں کی جانب پھینک رہا ہے، اور بندے اس کا نشانہ ہیں، اور اللہ کے تیر یہ مصیبتیں اور پریشانیاں، بیماریاں و حادثات ہیں، اگر بندے اللہ تعالیٰ کے ان تیروں سے بچنا چاہیں تو کیا طریقہ ہے؟ حضرت موسیٰ نے اس کے سوال پر فی البدیہ جواب دیا کہ تیر پھینکنے والے کی بغل میں بیٹھ جاؤ، اس لیے کہ تیر پھینکنے والا تو سامنے تیر پھینکے گا، اپنی بغل میں نہیں پھینکے گا۔ مطلب یہ تھا کہ اللہ کے قریب ہوجاؤ، جو اللہ کے قریب ہوجائے گا اُسے تیر کیسے لگے گا؟ اور جو دور رہے

گا ظاہر ہے کہ اسے تیر لگے گا۔ جب یہ جواب حضرت موسیٰ نے دیا تو وہ خوشی سے اچھل پڑا اور کہنے لگا کہ ایسا فی البد یہ جواب تو شاید دنیا میں کوئی دے نہ سکے، اور کہا کہ واقعی آپ اللہ کے نبی ہیں، میں مانتا ہوں، لیکن آپ جاہلوں کے لیے ہیں، آپ کی مجھے ضرورت نہیں، کیونکہ میں تو بڑا عقلمند اور فلسفی ہوں۔

دنیا کی حقیقت، افلاطون کی نظر میں:

الغرض ایک مرتبہ اس زمانے کا بادشاہ اپنے کچھ لوگوں کے ساتھ اس سے ملنے جنگل گیا، ملاقات ہوگئی اور بادشاہ نے سوال کیا کہ آپ یہاں جنگل میں رہتے ہیں مگر یہاں آپ کے پاس کھانے اور پینے کی کوئی چیز بھی بظاہر نظر نہیں آتی، یہ کہتے ہوئے بادشاہ نے کچھ جملے ایسے استعمال کیے جس سے ایسا لگتا تھا کہ وہ اس کی حقارت کر رہا ہے۔ افلاطون کو یہ بات ناگوار گزری کہ دنیا کو یہ بہت کچھ سمجھتا ہے اور ہماری یہ حالت دیکھ کر ہم کو حقیر سمجھ رہا ہے، اس لئے افلاطون نے بادشاہ کو کچھ سبق پڑھانا چاہا، اس لئے افلاطون نے بادشاہ کے رخصت ہونے کے موقعہ پر اس سے کہا کہ جناب! میری ایک گزارش ہے، وہ یہ کہ فلاں وقت آپ ہمارے یہاں تشریف لائیں، میں آپ کی دعوت کرنا چاہتا ہوں، اور صرف آپ کی نہیں، آپ کے تمام وزراء کی، ارکان دولت کی اور آپ کے مشیروں کی، اور آپ کے فوجیوں کی، سب کی دعوت ہے۔

اس کی بات کا بادشاہ انکار بھی نہیں کر سکتا تھا، اس لئے اس نے افلاطون کی دعوت قبول کر لیا۔ اب جب وہ دعوت کا وقت آیا تو اپنے پورے لشکریوں کے ساتھ، اپنے وزراء کے ساتھ، ارکان دولت کے ساتھ بادشاہ اس جنگل کی طرف چلنے لگا،

جنگل کے قریب پہنچے تو دور ہی سے سب کو نظر آ رہا تھا کہ یہاں سے وہاں تک عظیم الشان قسم کی بلڈنگیں ہیں، راستے بنے نظر آ رہے ہیں، بہترین انتظامات نظر آ رہے ہیں، جنگل میں منگل ہو گیا ہے، یہ دیکھ کر سب لوگ حیران رہ گئے کہ چند دنوں کے اندر اتنی بلڈنگیں یہاں کس نے بنادی ہیں، یہ راستے کس نے بنا دیے ہیں، اتنا بہترین انتظام کس نے یہاں کر دیا ہے۔ خیر! اب جو وہاں پہنچے، تو افلاطون کے لوگ وہاں استقبال کے لیے موجود تھے، لوگوں نے ان کا استقبال کیا اور لے جا کر ہر ایک کو اپنے اپنے مقام پر پہنچا دیا، دیکھا تو بادشاہ کے لیے مخصوص عمارت تھی، وزیروں اور مشیروں کے لئے الگ انتظام تھا، جب کھانے کا وقت آیا تو بہترین قسم کے کھانے پیش کئے گئے، سب نے کھانا کھایا، اور خوب سیراب ہوئے، اور جب رات کا وقت آیا تو سب لوگ آرام کرنے اپنی اپنی بلڈنگوں میں پہنچ گئے اور سو گئے، لیکن صبح اٹھے تو دیکھتے ہیں کہ جنگل میں نہ کوئی بلڈنگ ہے، نہ کوئی راستہ ہے، اور نہ کوئی بچھونا ہے نہ اوڑھنا، کچھ بھی نہیں ہے، بالکل صاف جنگل ہے، سب کے سب جنگل میں نیچے پڑے ہوئے ہیں، اُدھر بادشاہ بھی نیچے پڑا ہوا ہے، اور اس کے وزیر بھی نیچے پڑے ہوئے ہیں، یہ دیکھ کر سب پریشان بھی ہوئے اور غصہ بھی ہوئے۔

افلاطون نے کہا کہ جو کچھ تم نے دیکھا تھا وہ دراصل میرے خیال کا نتیجہ تھا، قوت خیالیہ کا کرشمہ تھا، قوت خیالیہ سے آپ کے ذہنوں میں میں نے یہ بلڈنگیں ڈال دیں، یہ عجیب وغریب تماشہ آپ کو دکھا دیا، حقیقت میں کچھ نہیں تھا، میں نے تم کو یہ بتانا چاہا کہ جب تم آخرت میں جاؤ گے تو یہ دنیا کی زیب وزینت، بلڈنگیں و عمارتیں جسے تم سب کچھ سمجھتے ہو، اسی طرح محض ایک خیالی صورتیں نظر آئیں گی۔

قوتِ خیالیہ کی حقیقت:

یہ قوتِ خیالیہ بڑی عجیب وغریب چیز ہے، ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا ہو، اس لئے سن لیں کہ آج کی دنیا میں مسمریزم کے نام سے یہ ایک فن چل رہا ہے، اسے ''ہپناٹزم'' بھی کہتے ہیں، اس کے ذریعہ ایسے بہت سارے کام انجام دیے جاتے ہیں، اس کو عربی میں ''عمل تنویم'' کہتے ہیں۔

ایک انگریز مصنف نے لکھا ہے کہ ہم ہپناٹزم کے ذریعہ ایسا کر سکتے ہیں کہ ایک آدمی کو پانی دیں اور اس کے خیال میں یہ ڈالیں کہ تو شراب پی رہا ہے، اور وہ یہ پانی پیئے گا تو اسے نشہ آئے گا، حالانکہ وہ پانی پی رہا ہے، نشہ کیسے آسکتا ہے؟ یہ دراصل قوتِ خیالیہ کا کرشمہ ہے اور قوت خیالیہ تمام انسانوں میں ہوتی ہے، لیکن بعض لوگ اس کو قوت دیتے ہیں، ترقی دیتے ہیں، پروان چڑھاتے ہیں تو بہت آگے تک پہنچ جاتی ہے اور ایسے لوگ کچھ عجیب وغریب چیزیں دکھانے لگتے ہیں، اسی کو تصرف بھی کہا جاتا ہے۔

قوت خیالیہ اور عاملوں کا دھوکہ:

اور یہ عاملین کے یہاں بھی چلتا ہے، عاملین فال دیکھتے ہیں انجن کے نام سے، یہ بھی دراصل قوت خیالیہ کا اثر ہوتا ہے، لوگ اسے سمجھتے ہیں کہ کوئی حضرت والا تشریف لاکر غیب کی باتیں بیان فرمارہے ہیں، وہ ایسے ہی حضرت ہیں، جیسے کہ وہاں افلاطون کے پاس لوگوں کو بلڈنگیں نظر آئی تھیں، کیا ان کی کوئی حقیقت تھی؟ نہیں محض خیالات کا کرشمہ تھا، عامل لوگ معصوم بچوں اور بچیوں کے ذہن پر یہ ڈالتے ہیں کہ اس کو ''کاغذ'' پر یا ''پان'' پر کچھ صورتیں نظر آرہی ہیں اور یہ موکل ہیں جو غیب کی باتیں جانتے ہیں، حالانکہ یہ سب غلط اور جھوٹ ہے، یہ سب دراصل باہر کچھ نہیں ہوتا، بلکہ اس کے دماغ میں نظر آتا ہے۔

اب بچہ عامل کی اس وقت کے زیراثر جب دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ ہاں! مجھے ایک ڈاڑھی والے حضرت نظر آرہے ہیں، ایسا لباس پہنے ہیں، کچھ بول رہے ہیں، اب وہ عامل اس سے سن کر لوگوں کو سنا دیتا ہے کہ بات ایسی ایسی ہے۔

یہ سب کا سب محض ایک دھوکہ ہے، حقیقت کچھ نہیں، کیونکہ ذرا غور کرو کہ اگر ان حضرت کو آکر کچھ بولنا ہی تھا تو بچے سے ہی کیوں بولتے ہیں؟ خود اسی عامل سے کیوں نہیں بتا دیتے؟ اور یہ حضرت عامل کو کیوں نظر نہیں آتے، صرف بچہ ہی کو کیوں نظر آتے ہیں، ذرا سوچ کر تو دیکھئے، بات یہ ہے کہ یہ عاملین بچوں سے یہ کام اس لیے لیتے ہیں کہ بچے کا ذہن بہت کمزور ہوتا ہے، کچا ہوتا ہے، قوت خیالیہ فوراً اس پر اٹیک کرتی ہے، اور اس کے برخلاف بڑے آدمی پر اثر ڈالنے کے لئے بڑی قوت چاہئے، اور یہ آسان نہیں ہے، اس کے لئے افلاطون جیسے لوگوں کی قوت درکار ہوتی ہے، اتنی بڑی قوت ان عاملین بیچاروں کے پاس کہاں ہوگی؟ اس لیے چھوٹے چھوٹے بچوں کو استعمال کر کے لوگوں کو بہکاتے ہیں کہ حضرت آرہے ہیں اور موکل آرہے ہیں، فلاں یوں فرمارہے ہیں، اور عوام لوگ ان کے پاس جا کر ان کی باتوں سے بہک جاتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں کہ ہاں ضرور کوئی بات ہے۔

❁ قوت خیالیہ کی ایک مثال سے وضاحت:

قوت خیالیہ کو سمجھنے کے لئے ایک موٹی سی مثال دیتا ہوں، جو میں نے میرے حضرت شاہ مسیح الامت نوراللہ مرقدہ سے سنی ہے، حضرت فرماتے تھے کہ قوت خیالیہ ہر ایک میں ہوتی ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ کبھی آپ آنکھ بند کر کے آنکھوں کو رگڑتے رہئے اور خیال جماتے رہئے تو آپ کے خیال میں عجیب عجیب تماشے

نظر آئیں گے، عجیب عجیب شکلیں نظر آئیں گی، تعجب انگیز رنگتیں سامنے آئیں گی، اور ایسی چیزیں دکھائی دیں گی کہ باہر ان کا کوئی وجود بھی نہ ہوگا، یہ ظاہر ہے کہ حقیقت میں کچھ نہیں ہے بلکہ قوت خیالیہ ان چیزوں کو ہمارے ذہن میں بناتی ہے، اور جب یہی قوت بڑھتی ہے تو دوسری طرف بھی یہ اثر انداز ہوجاتی ہے۔

اس کی ایک دوسری مثال یہ کہ ایک دریا ہے، دریا کے بیچ میں یا کنارے پر ایک دیوار ہے، بہت اونچی دیوار ہے اور دیوار کے دونوں طرف کو نیچے سے پانی بہہ رہا ہے، اور دیوار پر چلنے کے لئے اچھا خاصا دو تین فیٹ کا راستہ بھی ہے، اگر اس راستہ پر آپ کو چلنے چھوڑ دیا جائے تو آپ اس پر آسانی سے چل سکتے ہیں یا ڈگمگانے لگتے ہیں؟ آپ سے اس پر آسانی سے چلا نہیں جا سکے گا، حالانکہ وہاں راستہ تو ہے، جتنا آپ کو نیچے چلنے کے لیے راستہ چاہئے، اس سے کچھ بڑا ہی راستہ وہاں موجود ہے، لیکن آپ پریشان ہوتے رہیں گے اور ایسی حالت ہوگی کہ گرنے لگیں گے، بڑا سنبھل کر چلنا پڑے گا، اور کبھی چکر آجائے گا، بہت سارے لوگ تو چل ہی نہیں سکتے۔

اب یہاں سوال یہ ہے کہ آخر یہاں ایسا ہوتا کیوں ہے؟ یہ چکر کیوں آرہا ہے؟ اور چلنے میں دشواری کیوں ہورہی ہے؟ جبکہ پیروں میں پوری طاقت و قوت موجود ہے۔ ہمارے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ دراصل یہ قوت خیالیہ کی وجہ سے ہوتا ہے، قوت خیالیہ بار بار اندر سے کہتی ہے کہ تو گر جائے گا، تو گر جائے گا، یہ خیال بڑی مضبوطی سے دل پر دماغ پر سوار ہوجائے گا اس لیے گرنے لگتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ قوت خیالیہ بڑی عجیب چیز ہے۔

الغرض دنیا کی حقیقت سمجھانے کے لئے افلاطون کا واقعہ بیان کیا تھا کہ اس نے بادشاہ کو اپنی قوتِ خیالیہ سے بلڈنگیں اور زیب وزینت کی چیزیں دکھا کر یہ بتا دیا کہ دنیا کی حقیقت کچھ نہیں، محض ایک خواب ہے۔

پھر جب قوتِ خیالیہ کا ذکر آ گیا تو چونکہ لوگ اسے جانتے نہیں، اس لئے تھوڑی وضاحت کرنی پڑی۔

آخرت کتنی قریب ہے:

فرمایا کہ آج لوگ یہ خیال کر کے کہ آخرت تو بہت دور ہے، بے جھجک گناہ کرتے رہتے ہیں، اور دنیا سے ایسا دل لگا لیتے ہیں گویا انہیں مرنا ہی نہیں ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے یہاں آئے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے، دنیا میں کسی کو قرار نہیں ہے، دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لئے نہ کوئی آیا ہے نہ ہی آئیگا، دراصل قیامت کو دور تصور کرنے کی وجہ سے انسان غفلت کی زندگی گذارتا ہے، حالانکہ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ: "بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ "(میں اور قیامت اس طرح بھیجے گئے ہیں، یہ کہہ کر آپ نے شہادت کی اور بیچ کی انگلی سے اشارہ کیا۔(بخاری:۴۶۵۲، مسلم:۲۹۵۱، ترمذی:۲۲۴۱وغیرہ)

اس حدیث میں آپ ﷺ نے قیامت کو اتنا قریب بتایا ہے جتنا کہ دو انگلیاں آپس میں ایک دوسرے کے قریب ہوتی ہیں، کہ جتنا فاصلہ بیچ کی اور شہادت کی ان دو انگلیوں کے درمیان ہے اتنا ہی میرے اور قیامت کے درمیان ہے۔

ایک اور حدیث یاد آ گئی حضرت انس روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا

کہ ”مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ“ (جو آدمی مرجاتا ہے اس کی قیامت شروع ہوجاتی ہے)(حلیۃ الاولیاء:۲۶۷/۶)

اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ آخرت اگرچہ دور ہو لیکن انسان کے مرتے ہی اس کی قیامت شروع ہوجاتی ہے، کیونکہ قبر آخرت کی پہلی منزل ہے، اس اعتبار سے بھی آخرت بہت قریب ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے پاس صرف بصارت ہے ،اس لئے ہمیں آخرت دور نظر آتی ہے ،انبیاء کے پاس بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی ہوتی ہے، اس لئے ان کو آخرت قریب نظر آتی ہے، ہمیں بھی اگر بصیرت حاصل ہوجائے اور وہ ایمانی وروحانی آنکھیں مل جائیں تو ہمیں بھی آخرت کی منزل قریب نظر آنے لگے۔

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے کچھ صحابہ کرام کو دیکھا کہ وہ جھونپڑے کی مرمت واصلاح میں مشغول ہیں، یہ دیکھ کر آپ نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ عرض کیا کہ ہم اس جھونپڑے کی مرمت واصلاح کر رہے ہیں، آپ نے فرمایا کہ ” وأما أن الأمر أعجل من ذلك“ آخرت تو اس سے بھی زیادہ قریب ہے۔(مسند احمد:۱۶۱/۲)

سلیمان التیمی کا واقعہ:

حضرت سلیمان التیمی ایک بڑے درجے کے محدث اور بزرگ گزرے ہیں، ان کے صاحبزادے حضرت معتمر بن سلیمان کہتے ہیں کہ ہمارے والد کا ایک مکان تھا، جس میں وہ رہا کرتے تھے، وہ بوسیدہ ہونے کی وجہ سے گر گیا تو انہوں نے ایک

خیمہ گاڑ لیا اور مرتے دم تک اسی میں رہے، لوگوں نے ان سے کہا کہ حضرت! آپ اس مکان کو کیوں نہیں بنا لیتے! تو فرمایا کہ معاملہ تو اس سے بھی زیادہ قریب ہے کہ موت آ جائے۔(حلیۃ الاولیاء:۳۰/۳)

ادھر آنکھ بند ہوتے ہی نظر آ جائے گا کہ جنت ہے، جہنم ہے، عذابات کا سلسلہ ہے، فرشتے ہیں وغیرہ، تو آنکھ بند ہونے میں کتنی دیر ہے بھائی! ایک سیکنڈ لگے گا، تو سمجھ لو کہ آخرت بھی اتنی ہی قریب ہے۔

ایک بات یہ بھی سمجھ لو کہ قیامت کو دور تصور کرنا دراصل کافروں کا نظریہ ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ﴿ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْداً وَنَرَاهُ قَرِيْباً ﴾ [المعارج:٦-٧] (بلاشبہ وہ (کفار) قیامت کو دور سمجھ رہے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں)

قرآن کریم میں اس معنی کی اور بھی آیتیں دیگر مقامات پر موجود ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کو دور سمجھنا کفار کا نظریہ ہے، اسی لئے کفار دنیا میں عیش کر رہے ہیں، ان کو کوئی رکاوٹ نہیں ہے، لیکن مؤمن کی شان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ آخرت کو قریب تصور کر کے زندگی گذارتا ہے، اللہ سے ملاقات کا متمنی ہوتا ہے، جہنم کے خوف ناک مناظر اور جنت کے حسین مناظر ہر وقت اس کے پیش نظر ہوتے ہیں۔

اللہ سے ملاقات کا یقین نفس مطمئنہ کی صفت:

آپ ﷺ سے ایک دعاء منقول ہے، جس میں آپ نے اللہ سے نفس مطمئنہ کا سوال کیا ہے، فرماتے ہیں: "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ أَسْئَلُكَ نَفْساً بِكَ مُطْمَئِنَّةً تُؤْمِنُ بِلِقَائِكَ وَتَرْضٰی بِقَضَائِكَ وَتَقْنَعُ بِعَطَائِكَ "(اے اللہ! میں آپ سے

نفس مطمئنہ کا سوال کرتا ہوں جو تیرے سے ملاقات کا یقین رکھتا ہو اور تیرے فیصلہ پر راضی ہو اور تیری عطاء پر قناعت کرے)

اس دعاء میں نبی کریم ﷺ نے نفس مطمئنہ کی تین صفتوں میں سے ایک صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ اللہ سے ملاقات کا یقین رکھتا ہو، معلوم ہوا کہ جو آدمی اللہ تعالی سے ملاقات کا پکا یقین نہیں رکھتا، اسے نفس مطمئنہ حاصل نہیں ہے۔ یقین کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک پکا یقین اور ایک کچا یقین، کچا یقین تو ہر مؤمن کو حاصل ہے کیونکہ ہر کوئی جانتا ہے کہ ایک دن مرنا ہے، اللہ سے ملاقات کرنا ہے، لیکن ایسا کچا یقین ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا، جیسا تھا ویسا ہی ہے، اسی لئے امام غزالی اپنی کتاب احیاء العلوم میں جہاں آخرت کا بیان ہے، لکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں بھی بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کے دل کے اندر آخرت کا یقین گھس گیا ہو۔ (احیاء العلوم: ۵۱۱/۴)

کچا یقین تو سب کو ہے، لیکن یہاں پکے یقین کا سوال ہے، اس لئے کہ جسے اللہ سے ملاقات کا پکا یقین ہوتا ہے، اس کی زندگی کا نقشہ الگ ہوتا ہے، وہ کبھی حرام کاموں میں مبتلا نہیں ہوگا، وہ کبھی فرائض کو پامال نہیں کرے گا، گناہوں کے قریب بھی نہیں جائے گا، اور پکا یقین اسی وقت تسلیم بھی کیا جائے گا جبکہ وہ اوامر کو بجا لاتا ہو، نمازوں کا اہتمام کرتا ہو، اور نواہی وممنوعات سے اپنے آپ کو بچاتا ہو۔ اگر یہ چیزیں اس کی زندگی میں نہ ہوں تو اسے اللہ سے ملاقات کا پکا یقین نہیں ہے، اس لئے کہ آثار ہی سے نظریات وعقائد کا پتہ چلتا ہے، مثال کے طور پر اگر ایک بیٹا اپنے باپ کی نافرمانی کرے تو آپ اس سے کہتے ہیں کہ ارے! وہ تو تمہارا باپ ہے باپ

، یہ اس لڑکے سے کیوں کہتے ہیں، حالانکہ آپ سے زیادہ وہ لڑکا جانتا ہے کہ وہ اس کا باپ ہے، لیکن آثار نہ ہونے کی وجہ سے آپ اس سے کہتے ہیں کہ وہ تمہارا باپ ہے، اس لئے کہ وہ جاننا بھی کیا جاننا جس میں جاننے کے آثار ولوازمات نہ ہوں۔

اسی طریقے پر سمجھئے کہ اللہ سے ملاقات کا پکا یقین ہوگا تو خود بخود زندگی کا نقشہ بدل جائے گا، حلال وحرام کی تمیز پیدا ہو جائے گی، اچھے اور برے کا فرق کرے گا۔

ایک صحابی کا عجیب واقعہ:

الغرض مؤمن کو اللہ سے ملاقات کا ایسا پکا یقین ہوتا ہے کہ وہ آخرت کے مناظر کا دنیا ہی میں مشاہدہ کرتا ہے، جیسے ایک صحابی حضرت عمیر بن الحمام رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے، جب رسول اللہ ﷺ نے جنگ بدر میں مشرکین کو قریب ہوتا دیکھا تو فرمایا کہ اس جنت کی طرف لپکو جس کی چوڑائی زمین وآسمان کے برابر ہے، حضرت عمیر نے کہا کہ ''بخ بخ''یعنی واہ واہ، آپ نے پوچھا کہ تم نے واہ واہ کیوں کہا؟ تو عرض کرنے لگے کہ میں بھی ان لوگوں میں داخل ہونے کی امید وآرزو رکھتا ہوں جو اس میں جانے والے ہیں، آپ نے فرمایا کہ تم بھی ان لوگوں میں ہو، پھر وہ اپنی تھیلی سے کھجوریں نکال کر کھانے لگے، پھر کہا کہ : لَئِنْ أَنَا حَيِيتُ حَتّٰى آكُلَ تَمَرَاتِيْ هٰذِهِ إِنَّهَا لَحَيَاةٌ طَوِيْلَةٌ ''(اگر میں ان میرے کھجوروں کو کھانے تک زندہ رہوں تو یہ بڑی لمبی زندگی ہے) یہ کہہ کر گئے اور لڑ کر شہید ہو گئے۔ (مسلم: ۱۹۰۱، سنن بیہقی: ۹/۴۳، مسند احمد: ۳/۱۳۶، طبقات ابن سعد: ۳/۴۲۵، الاصابہ: ۴/۵۹۴)

مطلب یہ کہ آخرت کا ایسا یقین تھا کہ کھجوروں کے کھانے تک کا وقت بھی ان کو اس دنیا میں زیادہ اور طویل لگ رہا تھا، اور اس کے مقابلے میں ان کو جنت بالکل سامنے نظر آرہی تھی، گویا کہ وہ آنکھوں سے اسے دیکھ رہے ہوں۔

﴿۞﴾ اللہ سے ملاقات کا یقین رکھنے والوں کا حال:

قرآن کریم میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے: ﴿ فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَيَقُولُ هَاؤُمُ اقْرَؤُوا كِتَابِيَهْ إِنِّي ظَنَنْتُ أَنِّي مُلَاقٍ حِسَابِيَهْ ﴾[الحاقۃ:۲۰] (جس کا نامۂ عمل اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا آو میرا نامہ عمل پڑھ کر دیکھو کیسا ہے، مجھے پہلے ہی سے یقین تھا کہ میں اس حساب و کتاب کے مرحلے میں آکر اپنے پروردگار سے ملاقات کروں گا)

مطلب یہ ہوا کہ مجھے پہلے ہی سے ملاقات کا پکا یقین تھا، اسی لئے میں ویسے اعمال بھی تیار کیا تھا، معلوم ہوا کہ پکا یقین رکھنے والے کے احوال واعمال بھی اچھے اور خوب ہوتے ہیں۔

عربی زبان میں ''ظن'' کے کئی معنی آتے ہیں، اور یہاں لفظ ''ظن'' بمعنی یقین ہے، اور ایک معنی ظن کے بدگمانی کے بھی آتے ہیں، اور قرآن میں ظن کی مذمت اسی معنی کے لحاظ سے آئی ہے: ﴿ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ ﴾ (بعض گمان گناہ بھی ہوتے ہیں) [الحجرات:۱۲]

ظن کو یقین کے معنے میں قرآن کریم میں ایک اور جگہ بھی استعمال کیا گیا ہے:
﴿وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ، الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ [البقرة:٤٥]

(اور بلا شبہ وہ (نماز) عام طور پر لوگوں کے لئے بڑی مشکل اور بوجھل چیز ہے مگر خشوع وخضوع والوں کے لئے (بڑی آسان ہے) اور خاشعین وہ لوگ ہیں جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں، اور وہ اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں)

دیکھئے یہاں بھی اللہ سے ملاقات کا یقین رکھنے والوں کو خاشعین کہا گیا ہے، معلوم ہوا کہ جسے یقین ہوتا ہے وہ نمازوں کا اہتمام کرتا ہے، اور نماز میں خشوع وخضوع پیدا کرتا ہے اور جو نمازوں کو خشوع وخضوع سے پڑھنے کا اہتمام نہیں کرتا، گویا وہ اللہ تعالے سے ملاقات کا یقین رکھنے والا نہیں ہے۔

اس آیت کی دو تفسیریں کی گئی ہیں: ایک یہ کہ ملاقات سے مراد نماز میں اللہ سے ملاقات، کیونکہ نماز بھی اللہ تعالی سے ایک ملاقات اور اس سے مناجات ہی ہے، دوسری تفسیر یہ ہے کہ ملاقات سے مراد آخرت میں قیامت کے دن اللہ سے ملاقات۔ میں کہتا ہوں کہ دونوں مراد ہیں، دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، جو لوگ خشوع خضوع والے ہوتے ہیں، انہیں یہ یقین بھی ہوتا ہے کہ ہم نماز پڑھ رہے ہیں تو نماز میں اللہ سے ملاقات ہو رہی ہے، اور اسی کے ساتھ یہ ایمان ویقین تو ہے ہی کہ قیامت میں بھی اللہ سے ملاقات ہونے والی ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں اللہ سے ملاقات کا یقین پیدا کرنے کے لئے نماز سب سے اعظم چیز ہے، اس لئے جسے ابھی ایسا یقین پیدا نہیں ہوا، اسے چاہئے کہ نمازوں کا اہتمام کرلے، وہ یقین خود بخود پیدا ہو جائے گا، اور جب یقین پیدا ہو جائے گا تو وہ ہر کام میں سوچے گا کہ مجھے ایک دن اللہ سے ملنا ہے

، ہر چیز کا جواب دینا ہے، کھانے میں حلال چیزوں کا اہتمام کرے گا، مکان بنائے گا تو سوچے گا کہ ضرورت کے لئے بنا رہا ہوں، اس میں ہمیشہ نہیں رہنا ہے، اس سے پہلے معلوم نہیں یہاں کون تھا، اس کے بعد معلوم نہیں کون رہے گا، میں بھی کبھی اپنے دفتر میں بیٹھ کر سوچتا ہوں کہ معلوم نہیں میرے بعد یہاں کون بیٹھے گا، دنیا میں تو یہی نقشہ ہے۔

❁ دنیا مسافر خانہ ہے، ابراھیم بن ادھم کا واقعہ:

حضرت ابراھیم بن ادھمؒ جو اپنے زمانے میں ایک بڑے بادشاہ تھے، ایک بار ان کا دربار لگا ہوا تھا، سارے ارکان دولت و وزیر لوگ موجود ہیں، اور بہت سارے دوسرے لوگ بھی بیٹھے ہوئے ہیں، اسی دوران ایک آدمی ان کے محل کے اندر آیا اور دربار میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کو دربانوں نے روکنا چاہا تو اس نے کہا کہ میں یہاں اپنا سامان رکھ کر کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ دربانوں نے اس سے کہا کہ تو بے وقوف ہے، پاگل ہے، تجھے معلوم نہیں کہ یہ بادشاہ کا دربار ہے، محل ہے۔ اس نے کہا کہ دربار ہے؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ تو سرائے ہے، مسافر خانہ ہے، اس لئے میں کچھ دیر یہاں رکنا اور آرام کرنا چاہتا ہوں۔ یہ حجت و بحث ہو رہی تھی کہ بادشاہ کی نظر اس پر پڑ گئی، ابراھیم بن ادھم نے حکم دیا کہ کیا بحث ہو رہی ہے، اس کو بلا کر لاؤ۔ اب اس آدمی کو پکڑ کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا اور بتایا گیا کہ یہ آدمی محل میں آرام کرنا چاہتا ہے، اور کہتا ہے کہ یہ سرائے و مسافر خانہ ہے۔ بادشاہ نے اس سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ کیا قصہ ہے؟ تو اس آدمی نے کہا کہ یہ سرائے ہے، اس میں میرا بھی حق ہے، جیسا کہ آپ کا حق ہے، آپ یہاں رہ سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں رہ

سکتا؟ میں مسافر ہوں، آرام کرنا چاہتا ہوں۔

بادشاہ نے کہا کہ یہ سرائے نہیں ہے، مسافر خانہ نہیں ہے، میرا محل ہے، اس آدمی نے بادشاہ سے پوچھا کہ آپ سے پہلے یہاں کون تھا؟ بادشاہ نے کہا کہ میرا باپ تھا، اس آدمی نے پھر پوچھا کہ ان سے پہلے کون تھا؟ بادشاہ نے کہا کہ میرا دادا تھا، اس نے پوچھا کہ اس سے پہلے کون تھا؟ بادشاہ نے کہا کہ میرا پردادا تھا، یہ تو پیڑی در پیڑی ہمارے خاندان میں حکومت چلی آرہی ہے۔ اس آدمی نے کہا کہ میں یہی تو کہنا چاہتا ہوں کہ کبھی تو یہاں آپ کا پردادا تھا، کبھی آپ کا دادا تھا، کبھی آپ کا باپ تھا، اب آپ ہیں، کل آپ بھی نہیں رہیں گے، کوئی اور اس جگہ آجائے گا، کوئی آتا ہے تو کوئی جاتا ہے، اسی کا نام تو سرائے ہے، مسافر خانہ ہے۔ یہ کہکر وہ آدمی غائب ہو گیا، یہ دراصل اللہ کا فرشتہ تھا، جو بادشاہ کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اب بادشاہ پریشان ہو گیا، اس کی باتوں پر غور کرنے لگا کہ واقعی یہ دنیا ہے، مجھ سے بھی چھوٹ جائے گی، جیسے میرے باپ سے چھوٹ گئی، جیسے میرے دادا سے چھوٹ گئی، سب چھوڑ کر چلے گئے، کیسے کیسے بادشاہ آئے مگر سب چھوڑ کر چلے گئے، ایسے ہی ایک دن میں بھی چھوڑ کر چلا جاوں گا۔ اب جو رات ہوئی تو یہ باتیں سوچ سوچ کر بادشاہ کو نیند نہیں آئی، بالآخر یہ فیصلہ کر لیا کہ اس سے پہلے کہ دنیا مجھے چھوڑ دے، مجھے دنیا کو چھوڑ دینا چاہئے، انہوں نے حکومت چھوڑ دی اور حضرت فضیل بن عیاض کی خدمت میں چلے گئے۔

۞ تارک الدنیا بن جاو:

بزرگوں نے کہا ہے کہ ایک ہے ''تارک الدنیا'' ہونا، ایک ہے'' متروک

الدنیا'' ہونا، تارک الدنیا ہونا کمال ہے، متروک الدنیا ہونا کوئی کمال نہیں، متروک الدنیا کا مطلب یہ ہے کہ دنیا خود ہم کو چھوڑ دے، تارک الدنیا یہ ہے کہ ہم دنیا کو لات ماردیں، اگر دنیا ہی ہم سے روٹھ گئی، چھوٹ گئی، جیسے موت آ گئی تو دنیا خود ہم سے چھوٹ جائے گی، ہم لاکھ چاہیں بھی تو دنیا ہمارے پاس نہیں رہے گی، یہ متروک الدنیا ہونا ہے، متروک الدنیا ہونے سے پہلے تارک الدنیا بن جاو، یعنی دنیا کو خود لات ماردو، جیسا کہ ابراھیم بن ادھم نے دنیا کو لات ماردی اور یہی کمال ہے، اس لئے کہ ایک دن تو متروک الدنیا ہرآدمی ہوجائے گا، جب موت آئے گی تو کیا دنیا ہم سے دور نہیں ہوجائے گی؟ دنیا لات مار کر کہے گی چل یہاں سے، یہاں تو رہنے کا بھی تجھے حق نہیں ہے، گڑ جا زمین میں، مٹ جا، اب میں تیری نہیں ہوں، اب میں تیری بیوی کی ہوں، تیرے بچوں کی ہوں، تیرے خاندان کی ہوں۔ اب یہ آدمی کہے کہ میں نے تجھے کتنی محنت سے کمایا تھا، تیرے لئے کیسی کیسی قربانیاں دی تھیں، میں نے تیرے لئے خون پسینا ایک کیا تھا، تو دنیا کہے گی کہ میرا سب کے ساتھ یہی برتاو ہے، میں سب کو اسی طرح لات مارتی ہوں، ہاں کوئی اللہ کا بندہ مجھے لات ماردے تو میں اس کے قدموں میں گرجاتی ہوں اور جو مجھے سر پے بٹھاتے ہیں میں انہیں لات مارتی ہوں، یہ دنیا کا قانون ہے، اس لئے تارک الدنیا بن جاؤ۔

۞ اللہ سے ملاقات کے آداب:

فرمایا کہ ایک آدمی اپنے ایک محبوب سے یا کسی محترم معظم شخصیت سے ملاقات کا ارادہ کرے تو کیا وہ اس بات کا اہتمام نہیں کرے گا کہ اس کا انداز، اس کی حالت،

اس کا طور طریقہ سب کچھ ایسا ہو جو محبوب کو پسند آ جائے؟ وہ ضرور اس بات کی کوشش کرے گا کہ میرا ظاہر اور باطن، میرا لباس و پوشاک، میری ہر ادا ایسی ہو جو اُن کو پسند آ جائے۔ اس لئے وہ نہائے گا، دھوئے گا، اپنے آپ کو معطر کرے گا، سنوارے گا، بنائے گا، زیب و زینت کی سب چیزیں اختیا کرے گا، ورنہ اگر یوں ہی بے ڈھنگے طریقہ پر ملنے چلا گیا تو ایسا آدمی محبوب کی ملاقات کے قابل نہیں کہلائے گا۔

اسی طریقہ پر اللہ سے ملاقات کا جب مؤمن کو یقین ہو تو اس کی ہر ادا میں اس بات کا لحاظ ہونا چاہئے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ میرے خدا کو پسند آ جائے، چلنا، پھرنا، اٹھنا، بیٹھنا، بولنا، اسی طرح میرا لباس و پوشاک، طور و طریقہ، میری نماز، میرا حج، میری زکوۃ، میرا روزہ اور جو کچھ بھی میں کر رہا ہوں وہ اللہ کو پسند آ جائے، ایسا نہ ہو کہ اللہ ناراض ہو جائے۔ جب دنیا میں آدمی اپنے فانی اور ادنی قسم کے محبوب سے ملاقات کے لئے اپنے آپ کو اتنا بناتا اور سنوارتا ہے، تو یہ کیسا بندہ ہے جو اپنے محبوب حقیقی اور ہمیشہ باقی رہنے والے خدا سے ملاقات کے لئے کچھ بھی تیاری نہیں کرنا چاہتا، اپنے ظاہر و باطن کو بنانے اور سنوارنے کی فکر نہیں کرتا، یہ کیسا ملاقات کا متمنی ہے جو رات رات بھر سو کے گذارتا ہے، لہٰذا یہ کوشش کریں کہ میرا چہرہ اللہ کو پسند آنے والا ہو، میرا لباس اللہ کو پسند آنے والا ہو، میری ادائیں اللہ کو پسند آنے والی ہوں۔

اللہ کی پسند کیا ہے؟

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں کیا خبر کہ اللہ کو کیا پسند ہے؟ اللہ کو کونسا لباس پسند، کونسا چہرہ پسند، کونسا طور و طریقہ پسند، جب ملاقات ہوگی تب پوچھ لیں گے،

ہمیں کیا معلوم؟

اگر کوئی بے وقوف یہ سوال کرے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسی لئے تو محمد رسول اللہ ﷺ کو اللہ نے بھیجا ہے کہ میرے بندوں کو آپ بتا دیجئے کہ مجھے کیا پسند ہے اور کیا نا پسند، میں کیسے کو پسند کرتا ہوں، کیسے کو پسند نہیں کرتا، لباس میں مجھے کیا پسند، وضع قطع میں کیسی پسند کرتا ہوں، چہرہ کیسا پسند کرتا ہوں، اسی طرح دیکھنے میں مجھے کیا پسند، اور کیا نا پسند، سننے میں مجھے کیا پسند، کیا نا پسند، بولنے میں مجھے کیا پسند، اور کیا نا پسند، چلنے، اٹھنے، بیٹھنے میں مجھے کیا پسند، اور کیا نا پسند، اسی طرح نماز میں کیسی پسند کرتا ہوں، روزہ میں کیسا پسند کرتا ہوں، حج میں کیسا پسند کرتا ہوں، یہی بتانے تو محمد رسول اللہ ﷺ کو دنیا میں بھیجا گیا۔

معلوم ہوا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کرنا مؤمن کے لئے ضروری ہے، اسی لئے قبر میں یہ سوال بھی کیا جائیگا کہ "من هذا الرجل الذی بعث فیکم" (یہ کون آدمی ہیں جن کو تم میں مبعوث کیا گیا) دنیا میں جب آپ کو جانیں گے نہیں تو وہاں کیا بتا سکتے ہیں، اور اللہ کی پسندیدہ چیزوں کا ہمیں علم کیسے ہوگا؟

ایک بزرگ کو اللہ سے ملاقات کی خوشی:

فرمایا کہ جب کوئی اللہ کا بندہ اس طرح دنیا میں آپ ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کر کے اللہ تعالی کی مرضیات و نا مرضیات کو جان کر اس کے مطابق زندگی گذارتا ہے، اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ سے ملاقات کے شوق میں موت کی تمنا کرتا ہے، اور سفر آخرت کا انتظار کرتا ہے، اور ہنستے ہنستے دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔

ہمارے بزرگوں کے بہت سے ایسے واقعات ملتے ہیں، ایک واقعہ یاد آ گیا

کہ بھوپال میں ایک بزرگ حضرت مولانا یعقوب صاحب مجددی گذرے ہیں، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب علیہ الرحمہ ان کی مجلس میں جا کر بیٹھا کرتے تھے، اور ان کے ملفوظات بھی جمع فرمائے ہیں، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ جب ان کا انتقال کا وقت آیا تو جمعہ کا دن تھا، صبح کے وقت اٹھ کر جلدی سے انہوں نے غسل کیا، اور عمدہ کپڑے پہنے، بڑے حشاش بشاش نظر آرہے تھے، اور چہرے پر مسکراہٹ ہی مسکراہٹ تھی، لوگوں نے کہا کہ حضرت آپ کا کوئی سفر ہے کیا؟ بہت جلد تیار ہو گئے ہیں، کہا کہ ہاں سفر ہے، لوگ سمجھے کہ کہیں قریب کا سفر ہوگا، لیکن حضرت گئے ہی نہیں، نماز جمعہ کا وقت قریب آنے لگا، تو خادموں سے کہا کہ تکیہ لاؤ، تکیہ لایا گیا، پھر حضرت لیٹ گئے، اور کلمہ پڑھا اور روح قبض ہو گئی، تب لوگوں کو سمجھ میں آیا کہ یہ پوری تیاری دراصل آخرت کے سفر کے لئے تھی، دیکھئے اللہ سے ملاقات کی کیسی خوشی تھی ان کو۔

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کو موت کی تمنا:

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بعض کتابوں میں پڑھا ہے کہ ایک دفعہ آپ بیٹھے ہوئے تھے، ایک صاحب سامنے سے دوڑتے ہوئے جا رہے تھے، حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ نے ان کو ٹھیرا کر پوچھا کہ بھاگ بھاگ کر کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ حضرت بازار جا رہا ہوں، تو حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ارے بھائی! بازار میں کہیں موت بکتی ہو تو ایک عدد میرے لئے خرید کر لانا۔ اللہ اکبر! دیکھئے موت کا کس قدر انتظار لگا ہوا ہے۔

ارے جس ذات سے ملاقات کے لئے اتنی تیاری کیا ہو، کیا وہ اس سے

ملاقات کی خواہش نہیں کرے گا؟ ایک مثال دیتا ہوں کہ کوئی محترم و معظم مہمان آپ کے گھر میں آنے والا تھا، آپ نے اس کے لئے بہترین کھانے پکائے، اپنے گھر کو سجایا، اس کے لئے بیٹھک بنائی، راحت کا انتظام کیا، سب کچھ کیا، یہ سب کچھ کرنے کے بعد کیا آپ کو ہر لمحہ ان کے آنے کا انتظار نہیں ہوگا؟ ضرور ہوگا، اگر عین اس موقعہ پر کوئی آکر خبر دے کہ وہ نہیں آئیں گے، تو آپ کے دل پر اس وقت کیا گذرے گی۔

اسی طریقہ پر جب مؤمن بندہ اپنے آپ کو اللہ کے لئے تیار کر لے گا اور اللہ سے ملاقات کے قابل اپنے آپ کو بنا لے گا، تو وہ انتظار کریگا کہ کب آئے گا فرشتہ لے جانے، کب روح قبض ہوگی، اور میں کب اللہ سے ملاقات کروں گا۔

کیا موت کی تمنا کرنا جائز ہے؟

یہاں ایک مسئلہ بھی سمجھ لیجئے کہ موت کی تمنا کرنا دنیا کے مسائل سے تنگ آکر حرام ہے، اور اللہ سے ملاقات کے لئے تمنا کرنا عین مطلوب ہے، اور اولیاء اللہ کی صفت ہے، اسی لئے یہودیوں نے جب یہ کہا: ﴿نَحۡنُ أَبۡنَاءُ اللّٰهِ وَأَحِبَّاۗئُهٗ﴾ [المائدۃ:۱۸] (ہم اللہ کے بیٹے اور رشتہ دار ہیں) تو اللہ نے جواب میں فرمایا کہ اگر واقعی اللہ کے دوست ہوتو: ﴿فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ﴾ [الجمعہ:۶] (اگر تم سچے ہوتو موت کی تمنا کر کے دکھاو)

اس لئے کہ بیٹا باپ سے ملنے کی تمنا کرتا ہے، رشتہ دار رشتہ دار سے ملنے کی خواہش کرتا ہے، اگر تم اللہ کے بیٹے ہو، اللہ کے رشتہ دار ہوتو موت کی تمنا کر کے دکھاؤ گے، اللہ نے خود ہی چیلنج کر دیا کہ ﴿وَلَا يَتَمَنَّوۡنَهٗ اَبَدًا﴾ [الجمعہ:۷] (کہ یہ قیامت کی صبح تک موت کی تمنا نہیں کر سکتے)

چنانچہ دنیا میں آج تک پوری تاریخ میں کوئی یہودی پیدا نہیں ہوا جو قرآن کے اس چیلنج کو چیلنج کردے، کسی نے موت کی تمنا نہیں کی، اس لئے کہ وہ اللہ کے نہ بیٹے تھے، نہ رشتہ دار تھے، نہ اللہ کے دوست ولاڈلے، لیکن اسلام کی تاریخ پڑھئے، شروع سے آخر تک ہزاروں اولیاء اللہ ملیں گے جنہوں نے موت کی تمنا کی ہے۔

قبر میں ساتھ کون آئے گا:

فرمایا کہ قبر میں کون ساتھ آئے گا؟ نہ باپ آئے گا، نہ بیٹا آئے گا، سارے لوگ قبر پرآکر دفن کر کے چلے جائیں گے، دنیا میں بہت چاہنے والے تھے، بہت دوست تھے، لیکن وہاں اپنی دوستی کا اظہار کرتے ہوئے کوئی نہیں کہے گا کہ میرا دوست مر کے قبر میں جا رہا ہے، میں بھی اس کے ساتھ جا کر سو جاؤں گا، بیوی شوہر کے ساتھ نہیں جائے گی، شوہر بیوی کے ساتھ نہیں جائے گا، ماں بہت محبت کرتی تھی، لیکن مرنے کے بعد بچے کو ہاتھ بھی نہیں لگاتی ہے، ڈر کے بھاگ جاتی ہے، اس طرح ماں باپ تک دور ہو جاتے ہیں، کوئی قبر میں ساتھ نہیں آتا، جیسے ایرپورٹ پر بھی ہوتا ہے کہ پہنچانے والے آتے ہیں تو بس وہیں سے رخصت ہو جاتے ہیں، اندر کون جائے گا؟ کوئی نہیں، سب باہر باہر سے رخصت ہو جاتے ہیں، اب اکیلے ہی چلے جانا ہے، اندر جو بھی حالات پیش آجائیں، اس کو سنبھال لینا ہے، اور رخصت ہونے والا بزبان حال یہ شعر پڑھتا ہے ؎

شکریہ اے قبر تک پہنچانے والو ! شکریہ
اب اکیلے ہی چلے جائیں گے اس منزل سے ہم

اللہ اکبر! کیا عجیب شعر ہے! قبر میں جانے والا بول رہا ہے، پہنچانے والوں کو،

جو اٹھا کر لائے ہیں، دفن کر چکے ہیں، اب ان سے کہتا ہے کہ اب آگے کسی کے آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کسی کو الاؤ (Allow) نہیں ہے، ہم اکیلے چلے جائیں گے۔

قبر کی آواز:

اس لیے قبر میں جانے کے لیے اپنے آپ کو خود ہی تیار کرنا ہے، کہ تنہا مجھے جانا ہے، اس کے لیے ساری تیاریاں ابھی سے کرنی ہیں۔

ایک حدیث یاد آ گئی کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے نماز کے لئے تشریف لائے تو بعض صحابہ کو دیکھا کہ وہ ہنسی مذاق کر رہے ہیں تو آپ نے ان سے فرمایا کہ اگر تم کثرت کے ساتھ ہاذم اللذات یعنی لذتوں کو ختم کر دینے والی چیز موت کو یاد کرو تو وہ تم کو اس حرکت سے باز رکھے گی۔ پھر فرمایا کہ قبر روزانہ یہ کہتی ہے کہ: میں اجنبیت کا مکان ہوں، میں تنہائی کا مقام ہوں، میں مٹی کا مکان ہوں، میں کیڑوں کا مکان ہوں۔ (ترمذی: ۲۴۶۹)

ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ ایک جنازے میں شریک ہوئے، صحابہ بھی آپ کے ساتھ تھے، آپ قبر کے پاس بیٹھ گئے اور فرمایا کہ قبر روزانہ چیخ چیخ کر کہتی ہے کہ اے ابن آدم! تو نے مجھے کیسے بھلا دیا، کیا تو نہیں جانتا کہ مین تنہائی کا مکان ہوں، اجنبیت کا مکان ہوں، وحشت کا مکان ہوں، کیڑوں کا مکان ہوں اور تنگی کا مکان ہوں۔ (معجم اوسط طبرانی: ۸/۲۷۲)

بزرگو اور بھائیو! اس تنہائی اور وحشت و دہشت کے گھر میں اور کیڑوں، مکوڑوں، سانپوں، بچھوؤں کے گھر میں ایک نہ ایک دن ہمیں جانا ہے، اور وہیں سونا

ہے، معلوم نہیں کہ ہمارے ساتھ کیا کیا پیش آئے گا؟

نظیر آبادی ایک شاعر گزرے ہیں، انہوں نے ایک نقشہ کھینچا ہے ۔

کئی بار ہم نے یہ دیکھا کہ جن کا ☆ مشین بدن تھا، مبیض کفن تھا

جو قبرِ کہن ان کی اکھڑی تو دیکھا ☆ نہ عضو بدن تھا نہ تارِ کفن تھا

کیا عجیب اور جاندار شعر ہے! اللہ اکبر! اس لیے کچھ نہ کچھ موت کی فکر کرو، آخرت کی تیاری کرو، یہی آخرت کی تیاری ہمارے لیے اصل ہے۔

تین بھائیوں کا قصہ:

حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''کہ ایک آدمی کے تین بھائی تھے، ایک بڑا بھائی، ایک درمیانی اور ایک اس سے چھوٹا۔ جب اس شخص کا انتقال ہونے لگا تو اس نے اپنے بڑے بھائی کو بلایا اور کہا کہ آپ میرے بڑے بھائی ہیں اور میری موت کا وقت آ گیا ہے، میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ ساتھ رہیں، میری قبر میں بھی آپ تشریف لائیں، اور مجھ سے کبھی جدا نہ ہوں۔ وہ بڑا بھائی کہہ دے گا کہ میں تو یہ کام نہیں کر سکتا، البتہ اتنا کر سکتا ہوں کہ جب تک تیری جان میں جان ہے، تیرے پاس بیٹھا رہوں گا، لیکن جوں ہی تیری جان نکل جائے گی، پھر میرا اور تیرا کوئی رشتہ نہیں۔

وہ مرنے والا مایوس ہو کر اپنے دوسرے بھائی کو بلائے گا اور کہے گا کہ بھائی دیکھو! آپ بھی میرے بھائی ہیں، آپ کا ہمارا دوستانہ رہا، ہم میں پیار محبت رہی اور ہم ایک دوسرے کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرتے رہے، اب میری موت کا وقت آ گیا ہے، بہتر یہ ہے کہ آپ میرے ساتھ میری قبر میں بھی آ جائیں تا کہ وہاں بھی

ساتھ ساتھ رہیں جیسے یہاں ساتھ ساتھ رہے۔

وہ کہے گا کہ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ میں تیرے ساتھ آ جاؤں، ہاں اتنا کرسکتا ہوں کہ جب تک تیری جان میں جان ہے، تیرے پاس رہوں گا، جان نکل جائے تو تجھے نہلاؤں گا، دھلاؤں گا اور پھر اس کے بعد تجھ کو اٹھا کر لے جاؤں گا، قبر میں تجھ کو پہنچا کر اس کے بعد واپس آ جاؤں گا۔

وہ مایوس ہو کر تیسرے چھوٹے بھائی کو بلا کر کہے گا کہ میں نے تجھے مارا ہے، پیٹا ہے، تجھ پر چھوٹا ہونے کی وجہ سے ظلم بھی کیا ہے، لیکن اب میرا بڑا خراب وقت آ گیا ہے، میں مرنے جا رہا ہوں، میرا کوئی سہارا نہیں، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تو میرے ساتھ ساتھ رہے اور تو میری قبر میں بھی میرے ساتھ آ جائے۔

تو یہ تیسرا بھائی کہے گا کہ ہاں جب تک کہ روح تیری موجود ہے، دم میں دم موجود ہے تب تک بھی میں تیرے ساتھ ہوں، اور جب تو مر جائے گا تو نہلانے دھلانے میں، سب میں شریک رہوں گا، اور جب قبر میں تجھے دفن کیا جائے گا تو وہاں بھی تیرے ساتھ ساتھ آ جاؤں گا۔

حضرت نبی اکرم ﷺ نے یہ سنا کر صحابہؓ سے پوچھا کیا تم کو سمجھ میں آیا کہ یہ تین بھائی کون تھے؟ صحابہ نے کہا: "اللّٰہ ورسوله اعلم" (اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں)۔ آپ نے فرمایا کہ آدمی کا پہلا بھائی اس سے مال و دولت مراد ہے، جب آدمی اس سے کہے گا کہ میرے ساتھ قبر میں چل، تو مال دولت یہ کہے گی کہ نہیں، نہیں، میں تو تیرے ساتھ نہیں آ سکتی، ہاں جب تک تیری جان میں جان ہے، میں تیری ہوں اور جب جان نکل گئی تو تیرا ہمارا کوئی رشتہ نہیں، روح نکلتے ہی مال تو کسی اور کا ہو جاتا ہے، دوسرے لوگ ہڑپ کرنے کو تیار بیٹھے رہتے ہیں، بلکہ ایسے

واقعات بھی آج کل پیش آرہے ہیں کہ ادھر روح قبض ہوئی اور ادھر مال کے بارے میں جھگڑا شروع ہوگیا کہ مجھے ملے، تجھے ملے، تو یہ بڑا بھائی مال ہے۔

اور فرمایا کہ دوسرے بھائی سے مراد دراصل رشتہ دار ہیں، دوست احباب ہیں، یہ آدمی کے ساتھ اس وقت تک رہتے ہیں، جب تک کہ قبر میں اس کو دفن کیا جاتا ہے، لیکن قبر میں دفن ہوتے ہی سب کے سب واپس آجاتے ہیں۔ اور تیسرا چھوٹا بھائی کون ہے؟ فرمایا کہ تیسرے بھائی سے مراد اس کے اچھے یا برے اعمال ہیں۔ (کتاب الامثال للمحدث رامہرمزی:)

ایک حدیث میں اسی مضمون کو اس طرح مختصر کر کے بیان فرمایا کہ: میت کے ساتھ تین چیزیں جاتی ہیں، دو واپس لوٹ جاتی ہیں اور ایک اسی کے ساتھ باقی رہ جاتی ہے، اس کے اہل وعیال، اس کا مال اور اس کا عمل تین جاتے ہیں، اہل وعیال اور مال واپس چلے آتے ہیں اور عمل اس کے ساتھ رہ جاتا ہے۔ (ترمذی:۲۳۷۹)

الغرض قبر میں صرف اعمال ہی ہمارے ساتھ جائیں گے، اور کوئی چیز ساتھ نہیں جائے گی، اس لیے قبر کے حالات ہمیشہ ہمارے سامنے ہونا چاہئے۔

۞ موت کا مراقبہ ہونا چاہئے:

اس لئے روزانہ تھوڑی دیر کے لیے موت کا مراقبہ کیا جائے، مراقبہ کس طرح کریں؟ علماء نے لکھا ہے کہ مراقبہ اس طرح کرو کہ دس منٹ یا پندرہ منٹ کے لیے بیٹھ جاؤ سکون کے ساتھ اور خیال کرو کہ میں مرگیا ہوں، میری روح نکل چکی ہے، اور مجھے لٹایا گیا ہے، سارے رشتہ دار میرے اردگرد جمع ہوگئے ہیں، رونے والے رورہے ہیں، ہنسنے والے ہنس رہے ہیں، میری موت پر خوشی منانے والے خوشی

منارہے ہیں، بہت سوں کو دکھ و درد ہورہا ہے تو وہ چیخ پکار کررہے ہیں، اور پھر مجھے نہلانے کو لے جایا جارہا ہے، میرے کپڑے اتارے جارہے ہیں، کفن پہنایا جارہا ہے، جنازہ کی نماز پڑھی جاری ہے، میرا جنازہ اٹھا کر لوگ مجھے قبرستان لے جا رہے ہیں، پھر مجھے تن تنہا اندھیری قبر میں اُتار کر واپس چلے جارہے ہیں، پھر قبر میں سوال ہورہا ہے، پھر اللہ کے حضور میں پیشی ہورہی ہے، حساب و کتاب ہورہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب ہوتا ہے کہ نہیں ہوتا؟ جی ہاں! یہ سب کچھ ہوتا ہے، اس کا مراقبہ کرتے رہنا چاہئے۔

فرمایا کہ ان چیزوں کا مراقبہ آدمی روزانہ کرے، یا کم از کم دو چار دن کے بعد کرتا رہے، مگر بہت سارے لوگ موت کا مراقبہ کرنے سے ڈرتے ہیں، موت کے مراقبے سے کیا ڈر ہے؟ اس سے موت کی فکر، موت کی یاد پیدا ہوجائے گی اور آدمی اپنے آپ کو سنبھالنے، بنانے اور سدھارنے میں آسانی محسوس کرے گا، اور انشاء اللہ آدمی کے اندر ایک انقلاب پیدا ہوجائیگا اور وہ اپنی آخرت کی فکر و تیاری کرنے لگے گا۔

۞ عقل مند کی پہچان:

اور یہی دراصل آدمی کے عقل مند ہونے کی نشانی و پہچان ہے، لوگ عقل مند اس کو سمجھتے ہیں جو دنیا کی فکر میں لگا رہے اور خوب کمائے اور خوب کھائے، حلال و حرام کی کوئی تمیز کے بغیر مال و دولت جمع کرے، لیکن آیئے میں آپ کو بتا تا ہوں کہ اسلام نے عقل مند کس کو کہا ہے؟

حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ ایک انصاری صحابی حاضر ہوئے، سلام پیش کیا اور

عرض کیا کہ یارسول اللہ! أيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ أَفْضَلُ؟ (مؤمنین میں سب سے افضل کون ہے؟) آپ نے فرمایا کہ " أَحْسَنُهُمْ خُلُقاً "(جو اخلاق میں سب سے اچھا ہو) انہوں نے پوچھا کہ " أَيُّ الْمُسْلِمِيْنَ أَكْيَسُ ؟"(کون مسلمان سب سے زیادہ عقل مند ہے) آپ نے فرمایا کہ :" أَكْثَرُهُمْ لِلْمَوْتِ ذِكْراً وَ أَحْسَنُهُمْ لِمَا بَعْدَهُمْ اسْتِعْدَاداً ، أُوْلٰئِكَ الْأَكْيَاسُ "(ان میں سے جو لوگ سب سے زیادہ موت کو یاد کرتے ہیں اور بعد کی زندگی کے لئے سب سے اچھی تیاری کرنے والے ہیں، یہی لوگ عقل مند ہیں) (ابن ماجہ:۴۲۵۹،مستدرک:۵۸۲/۴،تذکرہ للامام قرطبی:۸/۱)

معلوم ہوا کہ اصل میں عقل مند وہی ہے جو موت کو یاد کرتا ہو اور موت کے بعد کی زندگی کے لئے تیاری کرتا ہو۔

دنیا جمع کرنے والا بے عقل ہے:

اور اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ صرف دنیا کے پیچھے پڑنے والا اور اسی کی دھن و خیال میں رہنے والا اور اس کو جمع کر کر کے دنیا ہی کے لئے رکھنے والا بے وقوف و بے عقل ہے، اگر چہ کہ لوگ اس کو بڑا عقل مند سمجھتے ہیں، چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ :" اَلدُّنْيَا دَارُ مَنْ لَا دَارَ لَهٗ وَ مَالُ مَنْ لَا مَالَ لَهٗ وَ يَجْمَعُ لَهٗ مَنْ لَا عَقْلَ لَهٗ "(دنیا اس کا گھر ہے جس کا کوئی اور گھر نہ ہو، اور اس کا مال ہے جس کا کوئی اور مال نہ ہو اور اس کے لئے وہی جمع کرتا ہے جس کو عقل نہ ہو)۔(مشکاۃ المصابیح:۵۲۱۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص صرف دنیا کی خاطر دنیا کو جمع کرتا ہے وہ بے

عقل ہے، بے وقوف ہے، کیونکہ اس کو یہیں چھوڑ کر جب جانا ہے تو اس کی خاطر کیوں جمع کرتا ہے، ہاں! کوئی دنیا کو آخرت کے لئے جمع کرتا ہے تو یہ عقل مند ہے، مثلا دنیا کو جمع کرتا ہے تا کہ اللہ کے راستے میں خرچ کروں گا، مسکین و بیواؤں کو، بے کس ومحتاج لوگوں کی امداد کر کے اللہ کی خوشنودی حاصل کروں گا تو یہ شخص بڑا عقل مند ہے کہ دنیا کو آخرت کا وسیلہ بنالیا ہے۔

حساب یسیر کی تفسیر:

معلوم نہیں کہ وہاں ہمارا حساب کیسا ہوگا، آسان یا مشکل؟ کیا اس کٹھن مرحلے کو سوچ کر اس کی فکر نہیں ہونا چاہئے؟ اور کیا یہ خبر بھی ہے کہ آسان حساب کیا ہے اور مشکل کیا؟ قرآن کریم میں ایک آیت ہے جس میں آسان حساب کا ذکر ہے:
﴿فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِيْنِهِ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَاباً يَّسِيْراً﴾ [الانشقاق:۸] (وہ شخص جس کے نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دئے جائیں تو اس کا آسان حساب لیا جائے گا)

اس آیت کے متعلق ایک دفعہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا، یارسول اللہ! آسان حساب کا مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ بعض لوگوں کا حساب آسان ہوگا، بعض لوگوں کا حساب مشکل ہوگا۔ تو اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا" لَيْسَ أَحَدٌ يُحَاسَبُ إِلَّا هَلَكَ "(جس سے بھی سوال کیا جائے گا اس کی ہلاکت ہے)۔(بخاری:۴۶۵۵)

یعنی یہاں حساب یسیر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سوال ہی نہ کرے، اور جنت کو بھیج دے، یہ حساب یسیر ہے، اور اگر اللہ تعالی پوچھ لے کہ تم نے یہ کیوں کیا، یہ کیوں نہیں

کیا تو بس پوچھ لینا ہی دراصل پکڑ لینا ہے، سوال کر لینا ہی اس کی ہلاکت ہے، اس لیے کہ اللہ سوال کرے اور بندہ اس کا جواب دیدے، یہ ممکن ہی نہیں ہے۔

ارے بھائی! دنیا میں جب ہم کسی بادشاہ کو جواب نہیں دے سکتے، کسی پڑھے لکھے عقلمند کے پاس آپ پہنچ جائیں اور وہ سوالات کرنے لگے، کوئی بڑا جج سوال کرنے لگے تو اس کے سوالات کا جواب ہم نہ دے پائیں، تو پھر اللہ کو کون جواب دے سکتا ہے، جو احکم الحاکمین ہے، جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے؟ کسی سے اللہ تعالیٰ پوچھ لیں تو سمجھ لو کہ جائے گا جہنم میں، اور بغیر پوچھے چھوڑ دیں تو سمجھ جاؤ کہ یہ بچ گیا۔

❁ موت کو یاد کرنے کا فائدہ و فضیلت:

الغرض موت کی یاد اور آخرت جس کے لئے ہم بنائے گئے ہیں اس کی تیاری ضروری ہے، اور آخرت کی فکر موت کی یاد سے پیدا ہوگی، اسی لئے موت کو یاد کرنے کی فضیلت بھی آئی ہے اور اس کا فائدہ بھی بتایا گیا ہے۔

امام قرطبی نے اپنی کتاب ''تذکرہ'' میں یہ حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "كَفٰى بِالْمَوْتِ وَاعِظاً" (نصیحت کے لئے موت ہی کافی ہے) اور ایک حدیث میں فرمایا کہ :" أَكْثِرُوْا ذِكْرَ الْمَوْتِ فَإِنَّهٗ يُمَحِّصُ الذُّنُوْبَ وَ يُزَهِّدُ فِي الدُّنْيَا"(موت کو کثرت کے ساتھ یاد کرو، کیونکہ وہ گناہوں کو پاک کرتا اور دنیا سے بے نیاز کرتا ہے)۔(تذکرہ للقرطبی:۱/۸)

اس سے موت کو یاد کرنے کا بڑا عظیم فائدہ معلوم ہوتا ہے کہ موت کی یاد آدمی کو گناہوں سے بچاتی ہے، آدمی سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ جب مجھے مرنا ہے تو خدا کے حضور بھی پیش ہونا ہے اور گناہ کروں گا تو اس کا جواب بھی دینا پڑے گا، میں کیا جواب

دوں گا؟ یہ سوچ کر وہ گناہ چھوڑ دیتا ہے، اور گناہوں کا چھوڑنا اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے، اس طرح موت کی یاد آدمی کو گناہوں سے دور کرتی ہے، اسی لئے اس کو واعظ کہا گیا ہے کہ موت خود ایک بہترین واعظ ونصیحت کرنے والا ہے، آدمی کو کوئی اور نصیحت کرنے والا نہ ہوتو ایک عقل مند آدمی اسی کو یاد کرکر کے نصیحت پکڑ لے گا۔

اور اس میں دوسری بات یہ بتائی کہ موت کی یاد آدمی کو دنیا سے زاہد و بے نیاز بنا دیتی ہے، کیونکہ وہ سوچتا ہے کہ اس دنیا کو ایک نہ ایک دن چھوڑنا ہے اور قبر میں جانا ہے اور آخرت کے مراحل سے گزرنا ہے، میں اس کو لیکر اور پال کر کیا کروں گا؟ لہذا وہ صرف ضرورت کی حد تک اس دنیا سے لیتا ہے اور اس کی حرص میں مبتلا نہیں ہوتا۔ یہ دو فائدہ جو بہت واضح ہیں اللہ کے نبی ﷺ نے موت کی یاد کے بتائے ہیں۔

اور اس کی فضیلت یہ ہے کہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا شہیدوں کے ساتھ کوئی اُٹھایا جائے گا؟ یعنی قیامت میں ان کے ساتھ کسی کو محشور کیا جائے گا؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں! جو آدمی رات دن میں بیس مرتبہ موت کو یاد کرے گا اس کو ان کے ساتھ اُٹھایا جائے گا۔(تذکرہ:۱/۸)

میرے بھائیو! کس قدر بڑی فضیلت ہے اس کی جو موت کو یاد کرتا ہے کہ اس کو شہیدوں کے ساتھ قیامت میں اُٹھایا جائے گا۔

موت کو یاد کرنے والا شہیدوں کے برابر کیوں؟

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ شہید کا مقام بہت اونچا ہے، کیونکہ وہ اللہ کے راستے میں اپنی جان لٹا دیتا ہے، تو موت کو روزانہ بیس مرتبہ یاد کرنے والے کو اس کے برابر کا درجہ کیوں دیا گیا؟ اس کا جواب میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ جس طرح

شہید اللہ کے لئے اپنی جان دیتا ہے، اسی طرح موت کو یاد کرنے والا اللہ کے لئے اپنے نفس اور نفسانی خواہشات کی قربانی دیتا ہے اور موت کی یاد اس کو گناہوں سے باز رکھتی ہے۔ اور یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے، یہ بھی بہت بڑا کام ہے کہ آدمی اپنے نفس کی اور نفسانی خواہشات ولذات کی قربانی پیش کرے۔ اسی لئے ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ :" اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ " (مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے) (ترمذی:۱۶۲۱، مسند احمد: ۲۴۰۱۱، صحیح ابن حبان: ۴۸۴/۱۰)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اصل مجاہد وہی ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرتا ہے لہٰذا ایک شخص اگر موت کو کثرت سے یاد کرنے کی وجہ سے اپنے نفس کے خلاف مجاہدہ وجہاد کرنے لگا تو یہ واقعی مجاہد ہے اور اللہ کے راستے میں اس نے اپنے نفس کی قربانی دی ہے، اس لئے اس کو قیامت کے دن شہیدوں میں اُٹھایا جائے گا۔

حکیم الامت کا استحضارِ موت کا طریق:

فرمایا کہ حضرت حکیم الامت مجدد ملت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ بڑے بڑے علماء اور مشائخ کے مرشد تھے، انہوں نے اپنے حجرہ میں دو شعر لکھوا کر دیوار پر لگا رکھے تھے۔ حضرت تھانویؒ کی جو خانقاہ ہے، ان کا کمرہ قبر سے کم نہیں ہے، آج بھی موجود ہے، ایک طرف ان کے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا کمرہ ہے، دوسری طرف ایک اور کمرہ ہے جس میں پہلے حافظ ضامن شہیدؒ رہتے تھے، پھر اس کے بعد حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ رہتے تھے، دونوں کمرے بازو بازو ہیں، اور اتنے چھوٹے اور ایسے اندھیرے ہیں کہ وہاں پر جانے کے بعد قبر تو ضرور یاد آجاتی ہے۔

تو وہ دو شعر پیش کرر ہا ہوں جو حکیم الامتؒ کے حجرے میں آویزاں ہیں اور حضرت اس کو پڑھا کرتے تھے، اس سے ان کے استحضار موت کا پتہ چلتا ہے۔

یہ حضرت مجذوب صاحب کے اشعار ہیں، حضرت خواجہ مجذوب، عزیز الحسن حضرت تھانویؒ کے جلیل القدر خلیفہ گزرے ہیں، بہت بڑے شاعر بھی تھے، ان کے اشعار ہیں ؎

رہ کے دنیا میں بشر کو نہیں زیبا غفلت
موت کا دھیان بھی لازم ہے کہ ہر آن رہے
جو بشر آتا ہے دنیا میں یہ کہتی ہے قضا
میں بھی پیچھے چلی آتی ہوں ذرا دھیان رہے

اب دعاء کیجئے کہ اللہ ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے اور آخرت کی فکر، آخرت کی طلب اور تیاری کا جذبہ، اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے توفیقِ مزید عطا فرمائے۔

باسمہ تعالیٰ

حقیقتِ طہارت

یعنی اسلام میں پاکی صفائی کی حقیقت

الحمد للّٰہ رب العا لمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین أما بعد فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم:أَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْإِيْمَانِ (طہارت آدھا ایمان ہے)(مسلم:۲۲۳،مسند احمد:۲۲۹۵۳،دارمی:۱/۱۷۴)

یہ حدیث بہت مشہور ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت سے بچوں کو یاد بھی ہوگی، اس حدیث میں حضرت رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ طہارت ایمان کا آدھا حصہ ہے،طہارت کے معنی ہیں پاکی وصفائی۔

حدیث پر ایک اشکال:

اس حدیث پر بظاہر ایک سخت اشکال ہوتا ہے، وہ یہ کہ اس میں ایمان کے ایک جزء طہارت کو ایمان کا شطر کہا گیا ہے، اور عربی میں شطر کے دو معنی ہیں: ایک معنی کسی چیز کا آدھا اور ایک معنی کسی چیز کا ایک جزء، اگر اس کے معنی جزء کے لئے جائیں تب تو کوئی اشکال نہیں کیونکہ طہارت ایمان کا ایک حصہ و جزء تو ہے ہی، اس میں کیا شبہ ہے؟ لیکن اگر اس کے معنی نصف و آدھے کے لئے جائیں تو اشکال ہوگا کہ ایمان کے تو بہت سے شعبے اور ابواب ہیں، اجزاء و حصے ہیں، اور خود حدیث کے مطابق ستر سے اوپر اس کے شعبے ہیں، تو اس حدیث میں صرف طہارت کو نصف ایمان کیسے فرمادیا گیا؟ کیا نماز، روزہ، زکاۃ و حج، اور دیگر تمام امورِ دین ایک طرف اور صرف

طہارت ایک جانب اوران سب کے برابر؟ یہ بات بظاہر عجیب بھی لگتی ہے اور قابل اشکال بھی معلوم ہوتی ہے۔مگر جب ہم اسلام میں طہارت کی حقیقت کیا ہے اس کو سمجھ لیں گےتو یہ اشکال ختم ہو جائے گا اور معلوم ہوگا کہ واقعی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ طہارت ایمان کا آدھا حصہ ہے،آج میں اسی کو تفصیل کے ساتھ بیان کروں گا۔

اشکال کا جواب:

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں طہارت سے مراد صرف ظاہری طہارت نہیں ہے بلکہ ظاہری و باطنی تمام قسم کی طہارتیں اس سے مراد ہیں،اسی لئے اس کی تشریح میں علماء نے کہا ہے کہ پاکی اور طہارت چار قسم کی ہوتی ہے۔ہم لوگ عام طوپر ایک طہارت و پاکی کو جانتے ہیں، تین پاکیوں کو نہیں جانتے ،حالانکہ وہ ساری پاکیاں مراد ہیں، جب وہ ساری پاکیاں مل ملاکر ہمارے اندر پیدا ہوں جائیں گی تو ہمارا آدھا ایمان مکمل ہوجائے گا اور اگر صرف ایک پاکی ہمارے اندر پیدا ہوئی تو آدھا ایمان مکمل نہیں ہوگا۔اس طرح اس کو آدھا ایمان قرار دینا ان سب قسموں کے پیش نظر ہے،اس لئے اس میں کوئی اشکال کی بات نہیں ہے۔اب رہا یہ سوال کہ وہ چار پاکیاں کیا ہیں؟اب میں اسی کی تفصیل عرض کروں گا۔

طہارت کی پہلی قسم:

علماء فرماتے ہیں کہ ایک پاکی ظاہری جسم کی یا ظاہری چیزوں کی ہے، جیسے کپڑے پاک ہوں،جگہ پاک ہو،گھر پاک ہو،ایسے ہی ہمارا جسم پاک ہو۔

اسی لیے حکم دیا گیا ہے کہ ہر جمعہ کو غسل کرو، اور اگر اس سے جلدی کریں تو بہت اچھا ہے، روزانہ ہی کریں تو اور اچھا ہے،اور غسل میں بھی اچھی طرح پاکی

حاصل کرنے کا حکم ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُباً فَاطَّهَّرُوْا﴾[المائدۃ:] (اور اگر تم نا پاک ہو تو اچھی طرح پاکی حاصل کرو)"فَاطَّهَّرُوْا" کا ترجمہ ہے"پوری پوری طرح پاکی حاصل کرو"اس لئے کہ عربی کا قاعدہ ہے کہ الفاظ بڑھتے ہیں تو معنی بھی بڑھتے ہیں، لہٰذا "فَاطَّهَّرُوْا" میں لفظ "ط" اور "ہ" پر تشدید ہونے کی وجہ سے وہ دو دو لفظ شمار ہونگے، لہٰذا ان دو لفظوں کی زیادتی کی وجہ سے یہ معنی پیدا ہو گئے کہ پوری پوری طرح پاکی حاصل کرو، اس میں پورے مبالغہ کے ساتھ دھونے کا حکم دیا جا رہا ہے۔

ایسے ہی ہر چیز پاک صاف اور مجلیٰ مصفّٰی ہونی چاہئے اور اسی لیے یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ اپنے جسم کے اندر جو زائد بال اُگ آتے ہیں، ہفتہ میں یا پندرہ دن میں یا کم از کم چالیس دن میں ایک مرتبہ ان کی صفائی کر دینا چاہئے، ناخنوں کی پاکی صفائی کا حکم ہے کہ ان کو برابر کاٹتے رہو، حتی کہ براجم (یعنی انگلیوں کے جوڑوں) کی صفائی کا حکم ہے۔

بالوں کو ٹھیک ٹھاک رکھنے کا بھی حکم ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک صحابی کو نبی کریم ﷺ نے دیکھا کہ ان کے بال بکھرے ہوئے، گرد آلود تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ان کے پاس کوئی ایسی چیز (تیل اور کنگھا) نہیں ہے جس سے وہ اپنے بالوں کو ٹھیک ٹھاک کر لیتے ؟ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ نے ایک شخص کو دیکھا جن کے کپڑے میلے کچیلے تھے تو فرمایا کہ کیا ان کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے وہ اپنے کپڑوں کو دھو لیتے۔(ابو داؤد: ۴۰۶۲، نسائی: ۵۲۳۶، مسند احمد: ۳/ ۳۵۷)

اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کپڑوں کی پاکی و صفائی بہت ضروری ہے۔ اور

قرآن میں بھی اللہ تعالی نے فرمایا ہے:﴿ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾[المدثر:۴](اپنے کپڑوں کو پاک رکھا کرو)۔

دیکھئے! قرآن کتنی اہم ترین کتاب ہے،آسمانوں سے نازل ہوئی ہے،لیکن اس عظیم کتاب میں کپڑوں کو پاک رکھنے کا حکم بھی ہے،اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالی نے اپنی بڑائی بیان کرنے کا حکم دیا ہے ۔چنانچہ فرمایا:﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾[المدثر:۳](اپنے رب کی بڑائی بیان کرو)

معلوم ہوا کہ رب کی بڑائی بیان کرنے کے لئے کپڑوں کی پاکی وصفائی ضروری ہے،ورنہ پھر غور کیجئے کہ دونوں میں کیا تعلق؟ جب اللہ کے دربار میں حاضری ہوتو خوب پاک صاف ہونا چاہئے ۔اسی لئے وضو میں مسواک کرنے کا حکم دیا گیا ہے،تاکہ منھ میں بدبو نہ رہے،اگر منھ میں بدبو رکھ کر اللہ کا نام لے گا تو کیا مزہ آئیگا؟

کتنا سستا سودا ہے:

حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مسواک کے سلسلہ میں فرمایا کہ یہ: ”مَطْهَرَةٌ لِّلْفَمِ وَمَرْضَاةٌ لِّلرَّبِّ “ ہے۔(بخاری:۱۸۳۱)

مسواک کے دو فائدے بتائے: ایک یہ کہ مسواک منھ کو پاک وصاف کرنے والی ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ مسواک رب کو راضی کرنے والی ہے، دیکھئے! مسواک کی کتنی بڑی فضیلت ہے،اس لئے کہ رب کی رضا سے بڑھ کر اور کیا چیز ہوسکتی ہے؟ اگر صرف منھ میں مسواک پھرا کر خدا کی مرضی مل رہی ہو تو آپ بتائیے کہ کتنا سستا سودا ہے اور پھر بھی آدمی غفلت کر رہا ہے۔

میں بار بار سنایا کرتا ہوں کہ کسی بزرگ نے اللہ سے کہا کہ اے اللہ! آپ کی

قیمت کیا ہے؟ اللہ تعالی نے کہا کہ دونوں عالم میری قیمت ہے۔ یہ سن کر ان کو وجد آ گیا، اور کہنے لگے ؎

قیمت خود ہر دو عالم گفتہ ☆ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

اے اللہ! آپ نے اپنی قیمت دونوں عالم کو قرار دیا ہے لیکن یہ قیمت آپ کی بہت کم ہے اس لئے اپنی قیمت اور بڑھا دیجئے، یہ تو بڑا استا سودا ہے، اتنے سستے آپ نہیں ہو سکتے۔

اسی طرح یہ مسواک بھی ایک چھوٹی سی چیز ہے، مگر اس سے آپ اللہ کی رضا حاصل کر سکتے ہیں، اتنی بڑی فضیلت ہونے کے باوجود بہت سارے لوگ مسواک کا اہتمام نہیں کرتے۔

بیڑی سگریٹ سے بچو:

بعض لوگ بیڑی سگریٹ پینے کے عادی ہوتے ہیں، جس سے منھ میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے، اسی بدبو کے ساتھ مسجد میں آتے ہیں، ایسے لوگ کبھی نماز میں بازو آ کے کھڑے ہو جاتے ہیں تو ان کے منھ کی بدبو کی وجہ سے نماز پڑھنا دشوار ہو جاتا ہے، کتنی غلط بات ہے؟ آج عصر کی نماز میں ایک صاحب میرے بازو نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے، میں سچ کہتا ہوں میرا دل بار بار کہہ رہا تھا کہ میں نماز توڑ کے بھاگ جاؤں، ایسی بدبو آ رہی تھی ان کے پاس اور اس کی وجہ سے مجھے اُبکائی سی آنے لگی، بار بار جی چاہ رہا تھا کہ نماز توڑ کے بھاگ جاؤں۔

اللہ کے نبی ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا کہ: ”مَنْ أَكَلَ الْبصَلَ وَالثُّوْمَ وَالْكُرَّاثَ فَلاَ يَقْرَبَنَّ مَسْجِدَنَا فَاِنّ الْمَلاَ ئِكَةَ تَتَأَذّٰى مِمَّا يَتَأَذّٰى

مِنهُ بَنُوْ آدَمَ "۔(الترغیب والترہیب:۱/۲۲۳)

(جوشخص پیاز لہسن یا کراث (جوایک قسم کی بد بودارتر کاری ہوتی ہے) کھائے وہ ہماری مسجدوں کے قریب نہ آئے ، کیونکہ فرشتے ان چیزوں سے تکلیف محسوس کرتے ہیں جن سے بنی آدم تکلیف محسوس کرتے ہیں)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بیڑی سگریٹ اور اس جیسی بدبو دار چیزوں کا استعمال کرنے کے بعد مسجد کو بغیر منہ کی صفائی کے آنا منع ہے،اور یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ بات اذیت ناک ہےاور غیرانسانی کام ہے۔نیز بیڑی سگریٹ ویسے بھی نقصان دہ ہےاس لئے بھی ان سے بچنا چاہئے۔

شریعت انسان بننا سکھاتی ہے:

ان ساری باتوں سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے جوشریعت پیش کی ہے، اس شریعت کے اندر یہ بھی ہے کہ انسان بنکر رہو، جانور بنکر نہیں رہنا ہے،اس کی تمام تعلیمات ہمیں انسان بناتی ہیں ،انسانیت کا سبق دیتی ہیں ،لہذا یہ پاکی صفائی کی جتنی تعلیمات ہیں وہ سب انسانیت کی تعلیمات ہیں،آپ نے کبھی دیکھا ہے کہ جنگل کا شیر دانتوں کی صفائی کرتا ہو، برش استعمال کرتا ہو، یا مسواک کرتا ہو، صابون لگا تا ہو، منھ دھوتا ہو،نہیں کیوں؟ اس لئے کہ وہ جانور ہے،اگر انسان بھی ایسا ہی رہےتو اس میں اور جانور میں کیا فرق رہے گا؟

الغرض یہ سب ظاہری پاکی صفائیاں ہیں،اور یہ پاکی کا پہلا اور ایک درجہ ہے، اس کی بھی بڑی ضرورت ہے، بڑی اہمیت ہےاور اس کو تو ہم سب جانتے ہی ہیں۔

مسلمانوں کی پاکی صفائی میں کوتاہی:

مگر اس کو جاننے کے باوجود اس میں کوتاہی سب سے زیادہ مسلمان کرتے ہیں،

جن کے نبی کی شریعت میں پاکی وصفائی کی اس قدر اہمیت وضرورت بیان کی گئی ہے۔

آج اکثر عام مسلمان اور بعض دیندار لوگ بھی پاکی صفائی کی کوئی پرواہ نہیں کرتے، جو باعث شرم بات ہے، اس کے مقابلے میں غیر مسلم لوگوں میں اس کا اہتمام نظر آتا ہے، ان کے محلے ہمارے محلوں کے لحاظ سے صاف ستھرے رہتے ہیں، ان کے مکانات ہمارے مکانات کے مقابلے میں صاف وپاک نظر آتے ہیں، ان کے ہسپتال وادارے ہمارے اداروں اور ہسپتالوں کے لحاظ سے صاف وپاک دکھائی دیتے ہیں، ان کے کپڑے اور چیزیں ہمارے مقابلے میں زیادہ صاف ستھرے معلوم ہوتے ہیں، حالانکہ معاملہ اس کے خلاف ہونا چاہئے تھا، کہ ہم صفائی وپاکی کا زیادہ اہتمام کرتے، مگر ایسا نہیں ہوتا بلکہ بعض جاہلوں نے تو حد ہی کر رکھی ہے کہ وہ صفائی ستھرائی کے نظام کو غیروں کا طریقہ سمجھتے ہیں اور اس کے اہتمام کو غلط و تکلف خیال کرتے ہیں، یہ دین اسلام سے انتہائی جہالت کی بات ہے۔

اسی قسم کے ایک شخص کا واقعہ سنا تھا کہ ایک نومسلم صاحب جو پہلے انگریز تھے اسلام میں آنے کے بعد نماز کے لئے مسجد آئے تو وہاں دیکھا کہ حوض کی نالی میں کسی نے پان کھا کر اس کی پیک اس طرح تھوکی ہے کہ اس کے اطراف واکناف میں پھیل گئی ہے، ان نومسلم نے یہ دیکھ کر کہا کہ اس کی صفائی کرنا چاہئے، یہ کسی نے غلط کام کیا ہے۔ اس پر وہاں کے مؤذن نے کہا کہ یہ دیکھو، مسلمان تو ہوگیا ہے مگر ابھی تک اس میں سے انگریزیت نہیں گئی۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ، گویا اس بے وقوف کے نزدیک اسلام ایک گندہ مذہب ہے اور انگریزوں کا مذہب صفائی وپاکی کا مذہب ہے۔

بہر حال اسلام میں پاکی وصفائی کی پہلی قسم یہ ہے کہ جسم کی گھر کی کپڑوں کی مکان کی اور دیگر ظاہری چیزوں کی پاکی وصفائی کی جائے۔

طہارت کی دوسری قسم:

اس کے بعد دوسرے نمبر کی پاکی صفائی ہے، وہ کیا ہے؟ امام غزالی لکھتے ہیں: ''اپنے ظاہری اعضاء کو ظاہری گناہوں سے صاف و پاک کر لینا''، یہ ہے دوسرے قسم کی طہارت۔

ظاہری اعضاء کیا ہیں؟ جیسے آنکھ، کان، ناک، زبان، ہاتھ اور پیر وغیرہ، یہ سب ظاہری اعضاء ہیں، ان ظاہری اعضاء سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو، تب ہمارے یہ اعضاء پاک ہیں، صاف ہیں، اور اگر ان اعضاء سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو وہ اعضاء گناہ گار ہو کر ناپاک ہو جاتے ہیں۔

بہت سے لوگوں کو پاکی صفائی سے اس کا تعلق ہی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا، ہم پاکی صفائی اس کو سمجھتے ہیں کہ اسنو {SNOW} لگالیا جائے، پوڈر {POWDER} لگایا جائے، عمدہ کپڑے پہن لئے جائیں، بس یہ ہے پاکی وصفائی، لوگ نہا دھو کر یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم پاک ہو گئے، صاف ہو گئے، لیکن زبان سے غلط باتیں بول رہے ہیں، جھوٹ بک رہے ہیں، گالی دے رہے ہیں، اور آنکھیں غلط دیکھ رہی ہیں، حرام و ناجائز چیزوں سے انتفاع کر رہی ہیں، اور کان غلط استعمال کیے جا رہے ہیں، ان سے غیبتیں اور چغلیاں اور جھوٹ سن رہے ہیں، تو ظاہر میں تو یہ آدمی پاک و صاف ہے اور اس کا ظاہر بہت اچھا ہے، مگر آنکھیں اس کی بڑی گندی ہیں، کان ناپاک ہیں، زبان ناپاک ہے، یہ ساری گندگیاں انسان کے اعضاء سے دل کے اندر پہنچتی رہتی ہیں۔

اب بتاؤ! کہ جو آدمی کپڑے تو ماشاء اللہ بہت اچھے پہنا ہوا ہے، اور اسی کے ساتھ استری بھی پڑی ہوئی ہے، اس کے اندر ذرا سی بھی ٹیڑھ نہیں ہے، سب ٹھیک

ٹھاک ہے ،لیکن اسی کے ساتھ ساتھ کان سے غلط چیزیں سن رہا ہے،غیبتیں سن رہا ہے، گانے بجانے سن رہا ہے، جب گانے سنیں گے تو گندگی پیدا ہوگی۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا"ألغناء ینبت النفاق" (یعنی گانا بجانا نفاق کو پیدا کرتا ہے)(ابوداود:۴۹۲۷)

کتنی سخت بات ہے؟ نفاق کفر کا ہی نام ہے، یعنی کفر جو دل میں چھپا رہتا ہے اس کا نام نفاق ہے ،اور اگر وہ اُگل دیا جائے تو اس کا نام کفر ہے ،اندر رہے تو اس کا نام نفاق ، باہر آجائے تو اس کا نام کفر، چیز ایک ہی ہے صرف اندر اور باہر کا فرق ہے۔ الماری کے اندر رکھیں یا الماری کے باہر رکھیں ، چیز میں کوئی فرق آئے گا؟ نہیں، چیز ایک ہی رہے گی۔

اب ان کانوں کے ذریعہ گندگی اور نفاق دل کے اندر پہنچ رہا ہے، اب یہ آدمی لوگوں کی نظر میں بہت پاک صاف ہے، اسی طرح آنکھوں اور ہاتھوں پیروں وغیرہ سے کوئی حرام و ناجائز کام کیا تو وہ انسان ناپاک ہو جاتا ہے، اور اللہ کی نظر میں بڑا گندہ ہو جاتا ہے، کیوں؟ اس لیے کہ ظاہری اعضاء گناہوں میں ملوث ہیں۔

انگریزوں کی پاکی کا حال:

انگریزوں کے بارے میں سنا ہوگا کہ انگریز لوگ پاخانہ کر کے دھوتے نہیں، صرف پونچھ لیتے ہیں، لیکن ظاہر میں بڑے اچھے رہتے ہیں، گورے بھی ہوتے ہیں، اور اسی کے ساتھ ساتھ لباس اور پوشاک بھی بہت قیمتی اور اچھا ہوتا ہے، استری ڈال ڈال کر پہنتے ہیں، ظاہر کی صفائی کا بڑا اہتمام کرتے ہیں، مگر اس ظاہری صفائی کے باوجود ناپاک کے ناپاک ہی رہتے ہیں۔

ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی کو گھر صاف کرنا تھا تو اس نے ایک کپڑے

کو پیشاب میں ڈبو کر پورے گھر کو اس کپڑے سے صاف کیا۔ بتاؤ! گھر پاک ہوا یا مزید ناپاک ہوگیا؟ یہی حال ان انگریزوں کا ہے کہ ظاہر میں تو بہت صاف، لیکن اندر دیکھیں تو بالکل ناپاک۔

اسی طریقہ پر جو آدمی عمدہ و پاک کپڑے پہنتا ہے، جسم اپنا پاک کر لیتا ہے، لیکن اس کے اعضاء گناہوں سے پاک نہیں ہوتے تو وہ اللہ اور اس کے فرشتوں کی نظر میں گندہ رہتا ہے۔

❁ گناہ ایک باطنی نجاست:

یہاں سے ایک بات سمجھ میں آگئی کہ گناہ فی الواقع ایک باطنی گندگی و نجاست ہے، اس سے انسان گندہ و نجس ہو جاتا ہے، لوگ اس کو ناپاک و نجس نہیں سمجھتے، اس لئے اس سے بچنے کا اہتمام بھی نہیں کرتے، بلکہ گناہ پر گناہ کر کے بھی اپنے کو سب سے زیادہ صاف و پاک خیال کرتے ہیں۔

اب میں قرآن وحدیث سے کچھ دلائل عرض کروں گا، جس سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ گناہ بھی ایک نجاست ہے، اور اس کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ ظاہری اعضاء سے جب گناہوں کا صدور ہوگا تو وہ اعضاء اللہ اور اس کے رسول اور فرشتوں کی نظر میں گندے شمار ہوں گے۔

❁ گناہ نجس ہے- پہلی دلیل:

اب لیجئے پہلی دلیل، قرآن کریم میں آیا ہے: ﴿ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾[سورۃ المائدۃ:٩٠]

(اے ایمان والو! بلاشبہ شراب اور جُوا اور بت (یعنی بتوں کی پرستش جسے کفر کہتے ہیں) اور قسمت جاننے کے لئے جو تیر پھینکے جاتے ہیں، یہ سب ناپاکی اور نجاست ہے، شیطان کے کاموں میں سے ہے، لہٰذا تم اس سے بچو، شاید تم کامیاب ہو جاوگے)

دیکھئے! اس آیت میں اللہ تعالی نے شراب کو، جوے کو، شرک کو، اور قسمت کے تیروں کو ''رِجْسٌ'' (ناپاک) کہا ہے، معلوم ہوا کہ آدمی جب شراب پیتا ہے تو شراب نہیں پیتا، بلکہ گندگی و نجاست پیتا ہے، اسی طرح جب جوا کھیلتا ہے تو اس کے سارے اعضاء میں گندگی لگ جاتی ہے اور جب بتوں کی پرستش کرتا ہے، کافرانہ حرکت کرتا ہے، اس کی وجہ سے بھی اس میں گندگی پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح ''ازلام'' یہ ''زلم'' کی جمع ہے، تیر کو کہتے ہیں، زمانہ جاہلیت میں لوگ تیروں کے ذریعہ فال کھولتے تھے، قسمت جاننے کی کوشش کرتے تھے، یہ ایک خواہ مخواہ کی بات تھی، قسمت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، کوئی کیا بتا سکتا ہے، اس میں اس کو بھی نجاست کہا گیا ہے، لہذا جو لوگ فال کھولتے ہیں یہ بھی گندگی و ناپاکی سے ملوث ہوتے ہیں۔

اب یہ سب ظاہری اعضاء سے ہونے والے گناہ ہیں، کوئی ہاتھ سے، کوئی منھ سے، کوئی دیگر اعضاء سے، اللہ نے ان کو رجس اور گندگی فرمایا، ان ظاہری اعضاء سے رجس و گندگی کو جب آدمی پاک کریگا تو طاہر بنے گا، یعنی جب ان گناہوں کو چھوڑے گا تب وہ پاک ہوگا، معلوم ہوا کہ گناہ گندگی کا نجاست کا نام ہے۔

❁ دوسری دلیل:

دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالی نے قرآن میں نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کو چند احکام دئے ہیں: ایک گھروں میں رہنے کا، ایک جاہلی انداز سے بے حیائی و

بے پردگی سے بچنے کا، ایک نماز کو قائم کرنے کا اور ایک زکاۃ دینے کا، پھر فرمایا کہ ”إِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا“ [الاحزاب:۳۳] (یہ احکام اس لئے دئے گئے کہ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ تم اہل بیت سے گندگی کو دور کردے اور تم کو پاک کردے)

غور کیجئے کہ اس میں چند احکام دینے کے بعد اللہ تعالیٰ ان احکام کو لاگو کرنے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ تم کو اللہ تعالیٰ گندگی سے پاک کرنا چاہتے ہیں، یہ کیا گندگی تھی، کوئی ظاہری گندگی یا باطنی؟ ظاہر ہے کہ یہاں گندگی سے مراد ان احکام کے بجانہ لانے کی صورت میں گناہوں کی وجہ سے جو گندگی پیدا ہوتی ہے اس سے پاک و صاف کرنا مراد ہے، معلوم ہوا کہ گناہ و معصیت ایک نجاست و گندگی ہے۔

۞ تیسری دلیل

تیسری دلیل یہ ہے کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ” إِذَا كَذَبَ الْعَبْدُ تَبَاعَدَ عَنْهُ الْمَلَكُ مِيلاً مِنْ نَتْنِ مَاجَاءَ بِهِ“ (جب آدمی جھوٹ بولتا ہے تو اللہ کے فرشتے جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے اس سے بہت دور بھاگ جاتے ہیں) (مشکوۃ:۴۱۳)

کیوں بھاگ جاتے ہیں؟ اس کا جواب خود حدیث دے رہی ہے کہ اس جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے وہ اللہ کے فرشتے اس سے دور ہوجاتے ہیں۔

اب بتاؤ! کہ بدبو گندی چیز سے نکلتی ہے یا اچھی و پاک چیز سے نکلتی ہے؟ ناپاک و گندی چیز سے نکلتی ہے، معلوم ہوا کہ جھوٹ ایک گندگی ہے اور اس گندگی سے ایک بدبو بھی پیدا ہوتی ہے اور وہ اتنی خطرناک ہوتی ہے کہ اللہ کے فرشتے آدمی سے دور بھاگ جاتے ہیں۔

حدیث کی عجیب منطقانہ تشریح:

بھائیو! یہاں اس کی ذراسی تشریح کر دوں، دنیا میں دو قسم کی چیزیں ہیں: ایک کو جوہر کہتے ہیں اور ایک کو عرض، مثلاً کتاب جوہر ہے اور اس پر جو رنگ چڑھا ہوا ہے وہ عرض ہے، عرض کہتے ہیں اس چیز کو جو کسی کے تابع بن کر پایا جاتا ہے، بذات خود مستقل طور پر وہ نہیں پایا جاتا، اور جوہر وہ ہے جو بذات خود پایا جاتا ہے، مثلاً رنگ چونکہ وہ عرض ہے اس لئے وہ خود کہیں نہیں پایا جاتا، بلکہ کسی جوہر کے تابع بن کر پایا جاتا ہے، جیسے کسی کتاب پر ہوگا، کسی دیوار پر ہوگا، کسی کپڑے پر ہوگا، کسی المار پر ہوگا، جوہر سے الگ صرف رنگ کا وجود کہیں ہوسکتا ہے؟ نہیں ہوسکتا، اسی طرح انسانوں میں بھی مختلف رنگ ہوتے ہیں، کوئی کالا ہوتا ہے، کوئی گورا ہوتا ہے، کوئی لال ہوتا ہے، اللہ تعالی نے رنگتیں الگ الگ بنائیں ہیں، یہ رنگ انسان کے جسم پر پایا جاتا ہے، الگ سے کہیں نہیں مل سکتا۔

جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب یہ سمجھئے کہ اسی طرح بد بو اور خوشبو بھی عرض ہیں، اور یہ بھی کسی نہ کسی جوہر کے تابع بن کر پائے جائیں گے، الگ سے نہیں، مثلاً پاخانہ رکھا ہوا ہے اس سے بد بو آ رہی ہے، عطر رکھا ہوا ہے، اس سے خوشبو آ رہی ہے، اگر کوئی نجاست نہ ہو تو بد بو کے آنے کا کوئی سوال نہیں، اور اگر کوئی خوشبودار چیز نہ ہو تو خوشبو کے پائے جانے کا کوئی سوال نہیں، نجاست نہ ہو اور بد بو آ جائے، کیسے ہو سکے گا؟ عطر نہ ہو خوشبو آ جائے، کیسے ہو سکے گا؟ ممکن نہیں۔

اب حدیث کو سمجھئے کہ اللہ کے نبی ﷺ فرما رہے ہیں کہ: ''جب آدمی جھوٹ بولتا ہے تو اللہ کے فرشتے جھوٹ کی بد بو کی وجہ سے اس سے بہت دور بھاگ جاتے ہیں'' دیکھئے! جھوٹ کی وجہ سے بد بو آ رہی ہے اور بد بو عرض ہے، وہ خود نہیں پائی

جاسکتی، اس کے وجود کے لئے جوہر کی ضرورت ہے، لہذا بدبوآنے کے لئے بدبودار چیز وجوہر کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ جب تک بدبودار چیز نہ ہو، بدبونہیں آسکتی، جیسے خوشبودار چیز نہ ہوتو خوشبونہیں آسکتی، اور جب تک کتاب یا اور کوئی جوہر نہ ہوتو رنگت نہیں مل سکتی۔

معلوم ہوا کہ جب آدمی جھوٹ بولتا ہے تو پہلے نجاست اس کے منھ میں پیدا ہو جاتی ہے، پھراس سے بدبوآتی ہے، وہ بدبو جب اللہ کے فرشتے سونگھتے ہیں تو بھاگ جاتے ہیں، یہ نکتہ ہے جس کو میں سمجھانا چاہتا ہوں۔

معلوم ہوا کہ جھوٹ ایک نجاست ہے، گندگی ہے، لیکن ہم لوگ اس جھوٹ کو نجاستوں میں شمار نہیں کرتے۔اسی طرح قیاس کیجئے تمام گناہوں کو، آدمی جوبھی گناہ کرتا ہے وہ سب گندگیاں اور نجاستیں ہیں۔

❁ چوتھی دلیل:

گناہ کے نجاست ہونے کی تیسری دلیل یہ ہے کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضرت صفیہ جو آپ ﷺ کی زوجۂ مطہرہ ہیں، ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ کے سامنے فرمایا کہ وہ ایسی ہیں، یہ کہکر انگوٹھے سے اشارہ کیا (یعنی وہ پست قد ہیں) تو آپ نے ارشادفرمایا کہ ''عائشہ تونے جوان کی غیبت کی ہے، وہ ایسی گندی ہے کہ اس گندگی کو سمندر میں بھی ڈالدو تو سمندر بھی گندا ہوجائے۔(ترمذی:۲۵۰۲، ابوداؤد:۴۸۷۵، مسند احمد:۱۸۹/۶)

اب یہاں دیکھئے کہ غیبت کو حضور اقدس ﷺ نجاست ٹھہرا رہے ہیں۔معلوم ہوا کہ غیبت بھی نجاست ہے اور گندگی کا نام ہے۔

توان دلیلوں سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی

نظر میں گناہ ناپاکی ونجاست کا نام ہے۔ ہم اگر ظاہری اعضاء سے ظاہری گناہوں کو پاک وصاف نہ کریں تو ہم نہا کر، دھو کر، خوشبو لگا کر، ظاہری اعتبار سے معطر ہونے کے باوجود اللہ اور اس کے رسول اور فرشتوں کی نظر میں گندے شمار کئے جائیں گے۔

معلوم ہوا کہ ظاہری اعضاء سے ظاہری گناہوں کو صاف و پاک کرنا دوسرے نمبر کی طہارت ہے۔

ظاہری گناہوں سے کیسے بچیں؟

اس طہارت کو حاصل کرنے کی بھی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح پہلی طہارت کی ضرورت ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ ضرورت ہے۔

قرآن میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿ وَذَرُوا ظٰهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَیُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا یَقْتَرِفُوْنَ ﴾ [**الأنعام**:] (ظاہری اور باطنی دونوں قسم کے گناہ چھوڑ دو، بے شبہ جو لوگ گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں ان کو ان کے کئے کا بدلہ عنقریب دیا جائے گا)

بھائیو! اس آیت میں ظاہری و باطنی دونوں قسم کے گناہوں کو چھوڑ دینے کا حکم سنایا گیا ہے، لہذا ان سے پرہیز کرنا چاہئے، اور ان کی گندگی سے بچنا چاہئے۔

مگر ان سے کیسے بچیں؟ انسان جب گناہ کا عادی ہو جاتا ہے تو اس سے اس کا چھوٹنا مشکل ہو جاتا ہے، وہ بار بار کوشش کرتا ہے مگر اس سے بچنے میں کامیاب نہیں ہوتا، اس لئے پریشان ہو جاتا ہے، مگر میں آپ کو بتاتا ہوں کہ گناہوں سے بچنے کے لئے اور ان کی عادت نکالنے کے لئے کچھ تدبیریں اختیار کرنا پڑتا ہے، اور اس کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

پہلی تدبیر - عزم وہمت:

ان تدبیروں میں سے ایک یہ ہے کہ اپنے اندر ترکِ گناہ کی ہمت اور اس کا عزم پیدا کرے، کیونکہ دین ودنیا کا کوئی بھی کام عزم وہمت کے بغیر پورا نہیں ہوتا، معمولی سے معمولی کام بھی عزم وہمت پر موقوف ہے، آپ کھانا کھانا چاہتے ہیں تو اس کے لئے بھی ہمت چاہئے، ورنہ آدمی کھانا بھی کھانے سے رہ جاتا ہے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ ''ہمت مرداں مدد خدا' یعنی جب مرد لوگ ہمت کرتے ہیں تو اللہ کی مدد آتی ہے اور ان کا کام بنا دیا جاتا ہے، اسلئے یہ ہرگز نہ سوچئے کہ میں گناہ نہیں چھوڑ سکوں گا، یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا، بلکہ ہمت کر کے یہ عزم کر لیجئے کہ میں ضرور گناہ پر قابو پالوں گا، ان شاء اللہ ایک نہ ایک دن آپ اس میں کامیاب ہو جائیں گے۔

دوسری تدبیر - توفیق کی دعاء

دوسری تدبیر یہ ہے کہ اللہ تعالی سے گناہ چھوڑنے کی توفیق مانگے، کیونکہ اللہ کی توفیق ہی سے ہم اس میں کامیاب ہو سکتے ہیں، اگر وہاں سے توفیق نہ ملی تو کچھ نہ ہو سکے گا، اس لئے اس کا اہتمام کرنا چاہئے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی دعاؤں میں گناہ سے بچنے کی توفیق کا بھی سوال کرتے تھے۔

ایک دعاء آپ کی یاد آئی کہ آپ نے فرمایا: " اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْئَلُكَ فِعَلَ الْخَيْرَاتِ وَ تَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ وَحُبَّ الْمَسَاكِيْنِ الخ (اے اللہ! میں تجھ سے نیک کاموں کے کرنے کی اور برے کاموں کو چھوڑنے کی اور مساکین سے محبت رکھنے کی توفیق مانگتا ہوں)

ایک اور لمبی دعاء میں یہ فرمایا ہے کہ :"اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْئَلُكَ رَحْمَةً مِّنْ

عِنْدِكَ تَعْصِمُنِيُ بِهَا مِنْ كُلِّ سُوْءٍ "(اے اللہ! میں تجھ سے تیری خاص رحمت مانگتا ہوں جس سے تو مجھے ہر برائی یا ہر گناہ سے محفوظ فرمادے)

ان دعاؤں میں اللہ کے رسول ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے ترک گناہ کے لئے اس کی توفیق کا سوال کیا ہے، اسی طرح ہمیں بھی اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر مانگنا چاہئے کہ اے اللہ! تیری ہی توفیق سے ہم گناہ سے بچ سکتے ہیں، اس لئے تو ہی توفیق عطاء فرما۔

تیسری تدبیر۔صحبت کاملین:

ایک اہم تدبیر یہ ہے کہ اللہ والوں کی صحبت اختیار کی جائے، یہ کیمیا ہے اور انتہائی مجرب نسخہ، کیونکہ صحبت کی تاثیر تو ایک مسلم حقیقت ہے، اس سے تو کوئی انکار ہی نہیں کرسکتا اور اہل اللہ کی صحبت میں تاثیر بھی زبردست ہوتی ہے، شرابی کبابی اور بڑے بڑے بدمعاش ان کی صحبت سے بڑے بڑے اولیاء اللہ بن گئے ہیں، یہ کوئی فرضی بات نہیں، بلکہ ایک مشاہداتی چیز ہے، جس کا لوگوں نے بارہا تجربہ کیا ہے۔لہذا گناہ سے بچنا ہو تو اس کو بھی ایک تدبیر کے طور پر اختیار کرو اور دیکھو کہ کیا اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔

اور ان کی صحبت کا مؤثر ہونا اس طرح بھی ہوتا ہے کہ ان سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ہم کس طرح گناہوں کو چھوڑ سکتے ہیں، اس کی کیا تدبیر ہے؟ پھر اس پر عمل کرنے سے ان شاء اللہ فائدہ ہوگا۔

حضرت حکیم الامت کی انوکھی تدبیر اصلاح:

اس پر مجھے ایک بات یاد آ گئی، اس کو بھی سن لیجئے، حضرت تھانوی کے ایک مرید تھے، انہوں نے ایک دفعہ آپ کو خط لکھا کہ میری آنکھیں بے اختیار غلط چیز یعنی

نامحرموں کی طرف اٹھ جاتی ہیں، لہذا کوئی علاج بتائیں۔حضرت تھانوی نے جواب لکھا کہ اگر بے اختیار اٹھ جاتی ہیں تو آپ کوفکر کی کیا ضرورت ہے، آپ پریشان کیوں ہیں؟ اٹھنے دیجئے، کیونکہ غیر اختیاری کام پر کوئی گناہ لازم نہیں آتا۔

اس جواب سے ان کو احساس ہوا کہ میں نے غلط بیانی کی ہے، بے اختیار آنکھیں نہیں اُٹھتیں بلکہ اختیار سے ہی اُٹھتی ہیں، لہذا دوسرا خط لکھا کہ حضرت! بے اختیار تو نہیں، اختیار سے ہی اٹھتی ہیں، لیکن نگاہ اٹھنے کے بعد نیچی کرنے کی طاقت نہیں پاتا۔اس کا جواب حضرت نے لکھا کہ یہ بات بھی تمہاری غلط ہے، اس لیے کہ فلسفہ کا یہ مانا ہوا اصول ہے کہ کسی بھی چیز کا اختیار دونوں طرف سے متعلق ہوتا ہے، طرفین سے متعلق ہوتا ہے، یعنی آدمی اگر کوئی کام کرسکتا ہے تو وہ اس کام کو نہ کرنے کی بھی طاقت رکھتا ہے، ایسا نہیں کہ کرتو سکے، لیکن نہ کرنے کی طاقت نہ رہے، ایسا نہیں ہوسکتا، میں یہ چیز اٹھا رہا ہوں، اگر چاہوں تو نہ اٹھاؤں، دونوں باتیں اختیار میں ہوتی ہیں، یہ کیسے کہ نگاہ اٹھ تو گئی، اب نیچی نہیں کرسکتا۔

اس پر ان صاحب کو پھر اپنی غلطی کا احساس ہوا اور تیسرا خط حضرت کو لکھا، اس میں انہوں نے لکھا کہ حضرت! معافی چاہتا ہوں، پھر غلطی ہوئی، نگاہ کو بچانے کی طاقت تو ہوتی ہے، لیکن ہمت نہیں ہوتی ہے۔

حضرت نے کہا کہ ہاں یہ صحیح ہے، بہت سے لوگوں کو طاقت تو ہوتی ہے، لیکن ہمت نہیں کرتے اور ہمت ہی سے تو سب کچھ ہوتا ہے، آدمی ہمت کرے تو پہاڑ کو ریزہ ریزہ کردے، اگر آدمی کوشش کرے اور ہمت کرے تو معلوم نہیں کہاں سے کہاں پہنچ جائے، یہ ہمت ہی تو ہے کہ آج پوری دنیا کہاں سے کہاں پہونچی ہوئی ہے، اگر ہمت نہ کرتے تو یہ دنیا یہاں تک کیسے پہنچتی، اور اس کے اندر اتنی تبدیلی

کہاں سے آتی، تو ہمت سے بہت کچھ ہوتا ہے۔

الغرض حضرت نے ان کو لکھا کہ آپ کی اصل بیماری ہمت میں کمی ہے، اچھا ٹھیک ہے، لیکن یہ فرمایئے کہ اگر میں بھی اس وقت تمہارے ساتھ ساتھ چل رہا ہوں تب بھی ایسا ہی ہوگا؟ کہ غیر محرموں کو دیکھتے رہو گے اور یہ کہو گے کہ بچنے کی ہمت نہیں ہوتی، نگاہ نیچے کرنے کی ہمت نہیں ہوتی؟

اس پر ان صاحب کا خط آیا کہ حضرت !اگر آپ ساتھ ہوں تو ایسا نہیں ہوگا، بلکہ پھر تو نگاہیں نیچی ہو جائیں گی۔ پھر حضرت نے ان کو جواب لکھا کہ جب میرے ساتھ ہونے کے خیال سے تمہاری نگاہیں نیچی ہوسکتی ہیں، تو خالق دو جہاں کے ساتھ ہونے کے تصور سے نگاہ کیوں نیچی نہیں ہوسکتی؟

یہ ہے اصلاح کا طریقہ، عجیب وغریب طریقہ سے اصلاح ہوتی ہے، اگرچہ کئی کئی خطوط کا تبادلہ ہوتا تھا، لیکن بات دل میں اچھی طرح پیوست ہوجاتی تھی، تو بتانے کی بات یہ ہے کہ اہل اللہ کی صحبت کا ایک فائدہ یہ ہے کہ ان سے اصلاح کے نسخے معلوم ہوں گے اور ہم اپنی اصلاح کرنے میں اور گناہوں سے بچنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

۞ ایک سالک کا عبرت خیز واقعہ:

ایک بات اور یاد آ گئی کہ ایک سالک نے مجھے سنایا کہ جب مجھ سے پہلے پہلے کہا جاتا تھا کہ اپنی نگاہوں کو پست رکھو اور نامحرموں کو نہ دیکھو تو میرے دل میں یہ آتا تھا کہ یہ مجھ سے کہا تو جا رہا ہے لیکن کیا یہ کہنے والے بھی اس پر عمل کرتے ہیں؟ یا بس ویسے ہی کہہ دیا کرتے ہیں؟ وہ کہنے لگے کہ میں سمجھتا تھا کہ یہ کہنے والے بھی شاید اس پر عمل نہ کرتے ہوں، کیونکہ مجھے یہ بات بہت ہی ناقابل عمل معلوم ہوتی تھے کہ ایک

حسین وجمیل عورت سامنے ہواوراس کو نہ دیکھوں، مگر میں نے یہ سوچ لیا کہ مجھ سے جو کہا جارہا ہے اس پر مجھے عمل کرتے رہنا چاہئے تا کہ دیکھوں کہ کیا نتیجہ نکلتا ہے، وہ سالک کہہ رہے تھے کہ میں برابر عمل کرتا رہا، اوراب میری حالت یہ ہے کہ الحمد للہ! میری آنکھیں نامحرم کے سامنے آتے ہی خود شرم سے جھک جاتی ہیں، اور اللہ کے خوف کی وجہ سے اس کو دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی، کہنے لگے کہ اب مجھے سمجھ میں آیا کہ مجھے نامحرموں سے نگاہ بچانے کا حکم دینے والے بھی ضرور اس پر عمل کرتے ہوں گے، اس لئے کہ اب مجھے خود بھی اس کی عادت وہمت ہو چکی ہے۔

میرے بھائیو! صحبت اہل اللہ کا یہ اثر دیکھئے اور عبرت حاصل کیجئے، اور اس سے یہ بھی سمجھ لیجئے کہ جب تک آدمی عمل نہیں کرتا اور شیخ کی بات پر مقلد محض بن کر نہیں چلتا اسے ساری بات سمجھ میں نہیں آتی، دیکھوان صاحب کو شیخ کی بات پہلے تو سمجھ میں ہی نہیں آئی کہ کیسے عورت سے نگاہ بچائیں، اور کیا یہ ممکن بھی ہے یا نہیں؟ لیکن جب شیخ کی بات پر بلا سمجھے ہی عمل شروع کر دیا تو پھر بات سمجھ میں بھی آ گئی اور پتہ چل گیا کہ وہ پہلے کس قدر جہالت میں تھے۔

❁ طہارت کی تیسری قسم:

اب آیئے آگے چلیں، طہارت کی تیسری قسم یہ ہے کہ باطنی اعضاء کو باطنی گناہوں سے پاک کیا جائے۔ باطنی اعضاء کیا ہیں؟ دل ودماغ، ان سے جو گناہ ہوتے ہیں، ان گناہوں سے اپنے آپ کو پاک وصاف کر لینا تیسرے نمبر کی طہارت ہے۔

❁ دل کی بیماریاں کیا ہیں؟

دل میں بھی بہت سے گناہ پیدا ہوتے ہیں، تکبر پیدا ہوتا ہے، عجب پیدا ہوتا

ہے، ریا کاری پیدا ہوتی ہے، حسد پیدا ہوتا ہے، بغض پیدا ہوتا ہے، جلن پیدا ہوتی ہے، حب دنیا، حب مال و دولت، یہ سارے گناہ دل سے ہوتے ہیں، دل کے گناہوں سے اگر آدمی اپنے آپ کو نہیں بچاے گا تو وہ بھی اللہ کی نظر میں گندہ ہے، اوراس کا دل بھی گندہ اور ناپاک ہے، لہٰذا اسے پاک کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

آج ہم لوگ پوری محنت ظاہر پر صرف کرتے ہیں، اسی کے اوپر پوری توجہ صرف کرتے ہیں کہ ہمارا ظاہر پاک ہوجائے۔ اگر ہمارے چہرہ پر داغ آجائیں، تو ہم پریشان ہوجاتے ہیں، اوران کو نکالنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں، لیکن دل کے اوپر کتنی بھی گندگی آجائے، ناپاکی لگ جائے، داغ ودھبے لگ جائیں، تواس کا ہمیں کوئی احساس نہیں ہوتا۔ حالانکہ دل کی صفائی کا خاص الخاص اہتمام کرنا چاہئے تھا۔

❁ زنگ آلود دل:

کیونکہ دل پر ہمارے گناہوں کا اثر ہوتا ہے اور وہ کالا اور زنگ آلود ہو جاتا ہے، حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب آدمی ایک گناہ کرتا ہے تو اس کے دل کے اوپر ایک دھبہ لگتا ہے، اگر وہ توبہ کرتا ہے سچے پکے دل کے ساتھ، تو وہ صاف ہوجاتا ہے، لیکن اگر اس نے توبہ نہیں کی اور گناہ پر گناہ کرتا رہا تو اس کے وہ داغ، دھبے بڑھتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ پورا دل کالا ہوجاتا ہے۔ یہ فرما کر آپ نے کہا کہ قرآن میں اللہ نے اسی کا ذکر اس آیت میں کیا ہے: ﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ (ہرگز نہیں، ان کے دلوں پر زنگ لگ گیا ہے)۔ (ترمذی: ابن ماجہ: ، مسند احمد:)

دیکھئے، اس حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ نے صاف بتایا ہے کہ دل پر گناہ کا اثر ہوتا ہے کہ وہ زنگ کی وجہ سے کالا ہوجاتا ہے۔ اگر فوراً توبہ کرلیا تو وہ زنگ دور ہوجاتا

ہے ورنہ وہ بڑھتے بڑھتے سارے دل کو کالا وزنگ آلود کر دیتا ہے۔

دل کا زنگ کیسے پاک ہوگا؟

یہ دل کا زنگ اور کالک کیسے دور ہوگی؟ اس کا جواب ایک حدیث میں وارد ہوا ہے، وہ یہ کہ ایک موقعہ پر آپ ﷺ نے فرمایا: "إِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ تَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الْحَدِيْدُ إِذَا أَصَابَهُ الْمَاءُ" (بلاشبہ ان دلوں پر زنگ آجاتا ہے جیسے لوہے پر زنگ آجاتا ہے جب اسے پانی لگ جاتا ہے) صحابہ نے پوچھا: "وَمَا جِلَاءُهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ" (کہ اس زنگ کو صیقل کس طرح کیا جاسکتا ہے؟) تو آپ نے فرمایا: "كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ" (موت کی یاد اور تلاوت قرآن کی کثرت)۔(مشکوۃ:۱۸۹)

لہٰذا دل کے زنگ کو اس طرح دور کرنا چاہئے کہ موت کو یاد کیا کریں اور قرآن کی کثرت کے ساتھ تلاوت کیا کریں۔

حضرت مسیح الامت کی ایک تقریر کا خلاصہ:

مجھے میرے حضرت مسیح الامت نوراللہ مرقدہ' کی ایک تقریر یاد آ گئی، وہ یہ کہ آپ نے ایک دفعہ ایک حدیث پڑھی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اپنے گھروں کو صاف کرنے کے بعد یہودیوں کی طرح اپنے صحن کو ناپاک نہ رکھو، اس لیے کہ یہودی ایسے ہی کرتے ہیں"۔(مشکوۃ:۳۵۸)

یہ حدیث سنا کر حضرت نے فرمایا کہ جب رسول اللہ ﷺ گھر کے باہر کے حصے کو بھی ناپاک اور گندہ رکھنے کی اجازت نہیں دیتے اور اس کو بھی صاف کرنے کا حکم دیتے ہیں تو گھر کی صفائی کرنے کا تو بدرجۂ اولیٰ حکم ہوگا، اور جب گھر کی صفائی کا حکم

ہے تو ہمارے کپڑوں کو صاف کرنے کا تو اس سے زیادہ حکم ہوگا، اس لیے کہ گھر تو ہم کو لگا ہوا نہیں رہتا، کپڑے تو ہمارے جسم سے لگے ہوئے ہوتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ جب کپڑوں کی صفائی کا حکم ہے تو وہ جسم جس کے لیے کپڑے ہیں وہ کیوں پاک نہیں ہونے چاہئیں؟ وہ تو اس سے زیادہ پاک ہونے چاہئیں اور جب ظاہری جسم کو پاک کرنے کا حکم ہے تو اس جسم کا جو اصل ہے یعنی اندورن و باطن جس کو قلب کہتے ہیں، اس کی صفائی تو سب سے زیادہ ہونا چاہئے، اس لیے کہ قلب اصل ہے، ظاہری جسم اس کی سواری کی طرح ہے تو جب ظاہری جسم ہی کو دھونے کا حکم دیا گیا ہے تو اندر والے کو کیوں حکم نہیں ہوگا کہ وہ پاک وصاف رہے۔

جیسے کار کو دھونے کا حکم ہو تو اندر کار میں بیٹھنے والے صاحب کیا پاخانہ سے ملوث رہیں گے؟ بھائیو! جب ہم کار کے بارے میں چاہتے ہیں کہ اس کی ویل بھی پاک ہو اور اس کا اوپر والا حصہ بھی صاف ہو، پیچھے کیچڑ نہ لگا ہو، سامنے کچھ نہ لگا ہو، دھول نہ لگی ہو تو کیا ہم کار کے اندر ایسے شخص کو بٹھانا گوارا کریں گے جو ایک گندے نالے میں ڈوبا ہوا ہو؟ کیا کوئی اس کو سیدھے لاکر سیٹ پر بٹھا دے تو ہم گوارا کریں گے؟ نہیں، اسی طرح جسم تو ہو صاف مگر دل ہو گندہ تو اللہ کو یہ کیسے پسند آئے گا؟

جب اوپر کے حصہ کو اتنا صاف کر رہے ہیں تو اندر بیٹھنے والا تو سب سے زیادہ صاف ہونا چاہئے۔ جب ہمارے جسم کو ہم صاف کر رہے ہیں جو کہ کار کے مانند ہے تو اندر جو کار میں بیٹھنے والا ہے، یعنی دل وہ تو اس سے زیادہ پاک وصاف ہونا چاہئے۔

❁ تکبر دل کی سب سے بڑی بیماری:

دل کی بہت سے گندگیاں اور بیماریاں ہیں، جن سے دل کو پاک کرنا ضروری

ہے، میں مثال کے طور پر بعض اہم بیماریوں کا تذکرہ کرتا ہوں، ان بیماریوں میں تکبر سرفہرست ہے، یعنی اپنے آپ کو کسی دینی یا دنیوی کمال میں بڑا سمجھنا اور دوسرں کو حقیر سمجھنا۔ اور تکبر عربی لفظ ہے، اور باب تفعل سے ہے، اور اس باب کی ایک خاصیت تکلف ہے، مطلب یہ ہے کہ آدمی حقیقت میں تو بڑا نہیں ہوتا، مگر اپنے آپ کو بڑا بنا کر پیش کرتا ہے، اور بڑا سمجھتا ہے ۔تکبر کی وجہ سے آدمی کا دل ناپاک ہو جاتا ہے، شیطان شیطان اسی لیے بنا کہ اس کے اندر تکبر تھا، ورنہ تو وہ بڑا عابد تھا، بڑا زاہد تھا، عالم تھا، لیکن تکبر نے اسکو خاک کر دیا، یہاں تک کہ اس کو آسمانوں سے اُتار کر دنیا میں بھیج دیا بلکہ پھینک دیا گیا۔

اب یہاں یہ بھی سمجھتے چلئے کہ تکبر سب سے بڑی بیماری کیوں؟ علماء نے لکھا ہے کہ تکبر کی حقیقت دو چیزیں ہیں : ایک ہے اپنے آپ کو بڑا سمجھنا، اور دوسرا دوسروں کو حقیر سجھنا۔ ان دو چیزیں سے تکبر پیدا ہوتا ہے، اور اگر ان دو میں سے صرف ایک چیز آپ کو بڑا سمجھنے کی بات پائی جائے تو اس کا نام عُجب ہے، وہ بھی ایک براخلق اور بڑی بیماری ہے، اور دل کی بیماریوں میں سے ایک خطرناک بیماری ہے، اگر صرف دوسرے کو حقیر سمجھتا ہے، اپنے کو بڑا نہیں سمجھتا تو یہ دوسرے آدمی کی توہین وتذلیل ہے، یہ بھی اسلام میں ناجائز ہے۔

اور اگر دونوں باتیں ہوں کہ خود کو سب سے اچھا اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے تو اس کا نام تکبر ہے، معلوم ہوا تکبر کے دو جز ہیں، دونوں جمع ہوں تو بھی خراب، اور اگر الگ الگ پائے جائیں تو بھی خراب، ظاہر ہے کہ جب ان دو میں سے ہر بیماری خطرہ ہے تو دونوں کسی میں جمع ہو جائیں تو کیا اس کا خطرہ اور بڑھ نہیں جائے گا؟ اسی لئے اس کو سب سے زیادہ خطرناک بیماری کہا گیا ہے، اورام الامراض نام دیا گیا ہے۔

بڑائی اللہ ہی کو سزاوار ہے:

اس کے ساتھ ایک اور وجہ بھی ہے، وہ یہ کہ بڑائی تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو سزاوار ہے ، وہی اس کا مستحق ہے کہ وہ بڑائی جتائے اور تکبر کرے، کسی بندے کو کیا حق ہے کہ وہ تکبر کرے؟ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "الكبرياء ردائي والعظمة إزاري، فمن نازعني واحدا منهما قذفته في النار" (کبریائی میری چادر ہے، اور عظمت میری ازار ہے، پس جو شخص ان میں سے کسی میں بھی میرے سے جھگڑے گا تو میں اس کو دوزخ کا عذاب چکھاؤں گا''۔ (ابو داود: ۴۰۹۰، واللفظ لہ، ابن ماجہ: ۴۱۷۴، مسند احمد: ۲/۴۱۴، صحیح ابن حبان: ۲/۳۵)

مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی کی شان ہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھے، اس لئے کہ ساری کائنات کا ہر ذرہ اس کا محتاج ہے اور وہ کسی کا محتاج نہیں اور ساری کائنات بے قدر و بے حقیقت ہے اور اللہ ہر چیز کا مالک اور ہر چیز پر قادر ہے، اسلئے تکبر اس کی صفت ہے اور جو اس کی صفت میں شریک ہونا چاہے، گویا وہ اللہ کی صفت میں اپنے کو شریک کر کے شرک کرنا چاہتا ہے، اس لئے اللہ اس کو عذاب دیتے ہیں، اس لئے کہ اس کے برابر کوئی نہیں نہ ذات میں نہ ہی صفات میں۔

تکبر کا ایک علاج:

تکبر میں آج ہر آدمی مبتلا ہے، جوان ہو یا بوڑھا، عرت ہو یا مرد، امیر ہو یا غریب۔ ایک نو جوان متکبر کا قصہ یاد آیا کہ ایک بزرگ نے اس کو غلط کام کرنے کی وجہ سے ٹوکا تو وہ غصہ میں آ گیا اور کہنے لگا کہ اچھا مجھے آپ نصیحت کرتے ہیں؟ معلوم

ہے میں کون ہوں؟

یہ جملہ آج لوگوں کے درمیان ایک فیشن بنا ہوا ہے، ہر شخص کہتا ہے کہ جانتے ہو، میں کون ہوں؟ جب آدمی میں تکبر ہوتا ہے تو یہ جملے کہتا ہے، یعنی اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے۔

اس پران بزرگ نے کہا کہ ہاں ہاں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تو ایک زمانہ نطفۂ ناپاک تھا، گندہ پانی، منی کا ناپاک قطرہ تھا، اور ایک زمانہ پھر ایسا آئے گا کہ تو مر جائے گا تو جیفۂ ناپاک ہو جائے گا مردار بنا پڑا ہوگا، اور فی الحال تیری حالت یہ ہے کہ پانچ سات کلو پاخانہ اپنے پیٹ میں لیے پھر رہا ہے۔ یہ ہے تیری حالت جو میں جانتا ہوں۔

حضرت نے اس سے پوری حقیقت واضح کر دی، اور اس کا سارا تکبر توڑ دیا اور دماغ کا سارا خناس نکال دیا۔

اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ قرآن میں فرمایا ہے: ﴿ أَوَلَمْ يَرَالإِنْسَانُ أَنَّاخَلَقْنَاهُ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَاهُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴾ [یٰس:] (کیا آدمی یہ نہیں دیکھتا، غور وفکر نہیں کرتا کہ ہم نے اس کو ناپاک قطرہ سے بنایا اور بڑا ہو کر یہ ہم سے ہی جھگڑتا ہے)

یہ کمال تو اللہ کا ہے، تیرا کیا کمال ہے؟ تیری حقیقت تو نطفہ ناپاک ہے، پتہ نہیں کہاں پڑا ہوا تھا گندگی میں، اللہ نے نکال کر تیرے اندر یہ صلاحیت وخوبی بخشی، ماں کے رحم میں داخل کیا، ماں کے رحم میں بنایا، پھر ماں کے رحم سے باہر نکالا، اور دن بدن پروان چڑھایا اور تربیت کی، یہاں تک کہ تیرے اندر بہت ساری چیزیں ودیعت فرما کر ایک بہترین انسان بنا دیا، اور یہ انسان جب بڑا ہو جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ ہی سے جھگڑتا ہے اور کہتا ہے کہ کہاں ہے اللہ بتاؤ؟ واہ میاں واہ! پیدا کیا، بنایا،

کھلایا، پلایا، صلاحیت وخوبیاں بخشیں، اتنا سب کچھ دیکھ کر کہتا ہے کہاں ہے اللہ؟

تو یہ تکبر جب آجاتا ہے آدمی کے اندر تو اس طرح کی بیماریاں اس کے اندر پنپنے لگتی ہیں، پھلنے پھولنے لگتی ہیں، اور آگے چل کر وہی خطرناک صورت اختیار کرلیتی ہیں جس کی وجہ سے وہ دوزخ میں بھیجا جاتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ:

"لا يدخل الجنة أحد في قلبه مثقال حبّة من خردل"

(جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہو وہ جنت میں نہیں جائے گا۔(ابن ماجہ:۴۱۶۳، مسلم:۱۳۱، ترمذی:۱۹۹۹، ابوداود:۴۰۹۱)

جنت میں داخل نہیں ہوگا تو پھر کیا ہوگا؟ ظاہر بات ہے جہنم میں داخل ہوگا، وہاں اس کی صفائی ہوگی۔

جہنم باطنی بیماریوں کا ہسپتال ہے:

یہ بھی اللہ نے مسلمانوں کے لیے کرم فرمایا ہے کہ ان کی صفائی کا وہاں ایک مرکز جہنم کی شکل میں قائم کردیا ہے، گویا کہ بیماریوں کو صاف کرنے کے لیے ایک ہسپتال بنادیا ہے، جہنم بیک وقت دو کام کرتی ہے، کافروں کے لیے قید خانہ ہے اور مؤمنوں کے لیے ہسپتال، جیسے ہسپتال میں آدمی کو داخل کریں تو کیا ہوتا ہے؟ صفائی ہوتی ہے اور اس کی بیماریوں کو دھوکر صاف کرکے اسے ٹھیک ٹھاک بناکر پھر بڑے اعزاز کے ساتھ ڈاکٹر صاحبان اسے ایمبولنس میں بٹھا کر گھر بھیجتے ہیں۔

اسی طریقہ پر اللہ تعالیٰ مومن بندے کو جہنم میں داخل کرکے اسے اچھی طرح پاک وصاف کرتے ہیں، جب پاک وصاف ہوجاتا ہے تو پھر اسے جنت میں بھیج دیا جاتا ہے، لیکن جب تک ٹھیک نہیں ہوتا اس وقت تک تو جہنم میں رہنا پڑے گا۔

یہاں ایک اور بات ذہن میں آتی ہے، وہ یہ کہ اللہ نے دو ہسپتال بنائے ہیں، ایک اختیاری ہسپتال، ایک اضطراری ہسپتال، دنیا اختیاری ہسپتال ہے، آپ یا تو دنیا ہی کو اپنا ہسپتال بنالیں اختیاری ہسپتال، چاہے تو خود ہی دنیا میں کسی کو اپنا شیخ و رہبر بنا کر اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے دل کی، دماغ کی، اپنے ظاہر کی، باطن کی اصلاح کر کے صاف پاک ہو جایئے، جب اس طرح یہیں پاک وصاف ہو جائیں گے، تو اللہ کے فرشتے موت کے وقت آ کر کہیں گے ﴿ یٰۤاَیَّتُهَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّةُ ارۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرۡضِیَّةً فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبَادِیۡ وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ﴾ (اے نفس مطمئنہ! لوٹ جا اپنے پروردگار کی طرف، اس حال میں کہ اللہ تیرے سے راضی اور تو اللہ سے راضی ہو، میرے نیک بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا)

کیونکہ اب یہ نفس اصلاح پا کر، پاک وصاف ہو کر نفسِ مطمئن ہو گیا، پوری طرح صاف و پاک، بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گیا ہے لہٰذا یہ نفس مطمئنہ ہے، لیکن جس نے یہ کام دنیا میں نہیں کیا، تو اضطراری ہسپتال میں وہاں داخل کیا جائے گا، ہم مانیں تو بھی جانا پڑے گا، نہ مانیں تو بھی جانا پڑے گا۔ یہاں جس نے اپنی غفلت اور لاپرواہی سے اپنا علاج نہیں کرایا ہوگا، اللہ کا آرڈر ہوتا ہے کہ ہمارے گورنمنٹ ہسپتال بھی تو موجود ہے، یہ پرائیویٹ ہسپتال میں علاج کو نہیں گیا تھا تو گورنمنٹ ہسپتال میں داخل کریں گے اور وہاں کے فرشتے اس کا علاج کریں گے، گندگیوں اور نجاستوں کو صاف و پاک کر کے، ٹھیک ٹھاک کر دیں گے، پھر اسے کہا جائے گا کہ چلو اب اپنے اصلی مقام پر چلو، اور جنت میں رہو۔

ایک علمی نکتہ:

ابھی میں نے عرض کیا کہ موت کے وقت نفس مطمئنہ سے اللہ کے فرشتے کہیں گے: ﴿ اِرۡجِعِیۡ اِلٰی رَبِّكِ ﴾ کہ تو لوٹ جا اپنے رب کی طرف، اس میں بھی ایک نکتہ ہے، وہ یہ کہ نفس مطمئنہ سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ " اذهبي إلى ربك " کہ تم اپنے رب کی طرف جاؤ، بلکہ یہ کہا کہ ''لوٹ جاؤ اپنے رب کی طرف''، اس لئے کہ ہم وہیں سے یہاں دنیا میں آئے ہوئے ہیں، ہم یہاں کے رہنے والے نہیں، بلکہ جنت ہی کے رہنے والے ہیں، اس لئے کہا جائے گا کہ واپس اپنی مقام و وطن کو چلو۔

یہ دیکھئے یہ حافظ احمد وحید صاحب بنگلور کے مدرسہ سے آئے ہیں، اب ان کو ہم جاؤ نہیں کہیں گے، بلکہ یہ کہیں گے کہ ''لوٹ جاؤ'' اس لیے کہ وہیں سے آئے ہیں، اب وہیں چلے جاؤ، واپس ہو جاؤ۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہیں سے ہم سب آئے تھے، اور وہاں سے یہاں کچھ ترقی کے لئے آئے تھے، کچھ ڈگریاں پاس کر کے جانے کے لئے آئے تھے، جب یہاں ٹھیک ٹھاک ہو گئے اور ان کو حاصل کر لیا تو اب کہا جا رہا ہے کہ ''اپنے رب کی طرف لوٹ جایئے، اس حالت میں کہ اللہ تم سے راضی ہے اور تم اللہ سے راضی ہو، پہلے آیا تھا تو یہ صفت حاصل نہیں تھی، اب اس صفت کے ساتھ متصف ہو کر لوٹ جا۔

یہ کب ہوگا؟ جب دنیا کی اختیاری ہسپتال میں رہ کر اس نے کسی رہبر کو رہبر بنا کر اپنے آپ کو پاک وصاف کر کے نفس امارہ کو نفس مطمئنہ بنا لیا ہوگا، تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اللہ کا فرشتہ یہ اعلان کرے گا، اور تسلی دے کر یہاں سے روح قبض کر کے لے جائے گا۔

ایمان جنت کا ویزہ ہے:

ایمان جنت کا ویزہ ہے، جنت کا ویزہ آپ نے لے رکھا ہے، لیکن جنت کا ویزہ لے کر آپ جنت میں جانے کے لیے پہنچیں گے تو وہاں پہلے ٹیسٹنگ ہوگی، جیسے ویزہ آنے کے بعد انڈیا سے سعودی عرب جانا چاہیں، تو آپ کو کہا جائے گا کہ ڈاکٹر سے میڈیکل سرٹیفکیٹ لاؤ، پھر ڈاکٹر لکھ کر دے گا کہ ہاں ان کو کوئی خطرناک بیماری نہیں ہے، تب وہ ویزہ اُو کے (ok) کر کے آپ کو اندر جانے کی اجازت دے گا، لیکن اگر بیماری ہے تو کہہ دیا جائے گا کہ نہیں جناب! ہمارے پاس بالکل ٹھیک ہو کر آیئے، ورنہ نہیں آسکتے، آپ کو یہ بیماری ہے، جب تک وہ بیماری آپ کی صاف نہیں ہوگی، آپ ٹھیک نہیں ہوں گے، ہمارے ملک میں داخلہ نہیں ہوسکتا۔

اسی طریقہ پر جب یہاں سے آدمی چلا جائے گا، ایمان کا ویزہ لے کر جنت میں جانا چاہے گا تو اسے روک دیا جائے گا کہ جناب! آپ ابھی اس قابل نہیں ہیں، پہلے ذرا ہسپتال یعنی جہنم کی ہوا کھایئے، آپ وہاں پاک وصاف ہو جایئے، جب پاک وصاف ہو جائیں گے تب اس میں داخلہ ملے گا۔

الغرض آپ کے پاس ایمان جو کہ جنت کا ویزہ ہے وہ تو ہے ہی، اسے او کے (ok) بعد میں کیا جائے گا، اسے پہلے جہنم کی ہوا کھلائی جائے گی اور وہاں فرشتے اسے پاک وصاف کریں گے، اگر یہیں دنیا میں یہ پاکی و طہارت کا کام کر لیتا تو بہت اچھا ہوتا، لیکن جب یہاں دنیا میں صفائی نہیں کرایا تو وہاں فرشتے ڈنڈے مار مار کر اس کی صفائی کریں گے، جہنم کی سختیوں کے ساتھ، مصائب و پریشانیوں کے ساتھ، سارے عذابات کے ساتھ وہاں صاف کیا جائے گا، اس لیے کہ اس نے اختیاری مجاہدہ نہیں کیا تھا، اس لئے اب اضطراری مجاہدہ کرنا پڑے گا۔

جب وہاں وہ پاک وصاف ہوجائے گا تو جنت میں داخلہ ملے گا۔

جہنم بھی اہل ایمان کے حق میں نعمت ہے:

تو اب بتاؤ بھائی! جہنم اہل ایمان کے حق میں کتنی بڑی نعمت ہوئی؟ ظاہری بیماریوں کو پاک وصاف کرنے والی ہسپتال کو تو ہم نعمت سمجھتے ہیں، لیکن باطنی بیما ریوں کو صاف کرنے والی جہنم کو نعمت نہیں سمجھتے، جو ہماری بیماریوں کا علاج کر کے ہمیں جنت میں جانے کے لائق بناتی ہے، یہ بھی اللہ کی نعمت ہی تو ہے، اس لیے میں نے کہا کہ جہنم بھی مؤمن کے لیے نعمت ہے۔

ایک حدیث بھی آپ کو سنا دیتا ہوں، جو بڑی عجیب ہے، وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ'' کافر لوگ جو کہ اہل دوزخ ہیں وہ جہنم میں نہ تو مریں گے اور نہ زندہ ہی رہیں گے اور رہے وہ لوگ جو اپنے گناہوں کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے یعنی گنہ گار مومن تو ان کو اللہ تعالی ایک قسم کی موت دیدیگا حتی کہ جب وہ جل کر کوئلہ ہوجائیں گے تو ان کے حق میں شفاعت کی اجازت دیگا، تو ان کو جماعت در جماعت جنت کی نہروں پر لایا جائے گا اور جنتیوں سے کہا جائے گا کہ ان پر پانی بہاؤ۔

یہ صحیح حدیث ہے، جس کو امام مسلم وغیرہ محدثین نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ (مسلم: ۱۸۵، ابن ماجہ: ۴۳۰۹، مسند احمد: ۱۱/۳، مسند ابو یعلی: ۵۱۸/۲، شعب الایمان: ۲۹۲/۱)

دیکھئے! جہنم کتنی بڑی نعمت ہے کہ ایک بیمار کا علاج کر کے اسے جنت میں جانے کے لائق بناتی ہے اور تکلیف کا احساس نہ ہو اس کے لئے یہ خدائی انتظام کہ ان گنہ گار مسلمانوں پر ایک قسم کی موت طاری کر دی جاتی ہے، جیسے آپریشن کے وقت ڈاکٹر حضرات مریض کو کلوروفارم دیکر بے ہوش کر دیتے ہیں، یہ بھی ایک رحمت

وشفقت کی بات ہے اسی طرح اللہ کے یہاں بھی ایسا ہی انتظام ہوگا۔

اللہ اکبر! تو معلوم ہوا کہ جہنم بھی نعمت ہے، جب جہنم ایک نعمت ہے، تو اس سے ایک آیت کی تفسیر بھی سمجھ لیں۔

ایک آیت کی تفسیر:

قرآن پاک میں سورۂ رحمٰن میں جگہ جگہ ایک آیت دہرائی گئی ہے: ﴿ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴾ (اے جنات اور انسانوں کے گروہ! تم اللہ کی کون کونسی نعمتوں کو ٹھکراؤ گے)

یہ آیت مختلف قسم کے مضامین کے بعد لائی گئی ہے اور سورۂ رحمٰن میں بعض جگہ ایسی آیتیں بھی ہیں، جن میں جہنم کے دردناک عذاب کا تذکرہ ہے، اور اس کے بعد بھی یہ آیت لائی گئی ہے، مثلاً ارشاد باری ہے:

﴿ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّن نَّارٍ وَنُحَاسٌ فَلَا تَنتَصِرَانِ ﴾ (آگ کے شعلے اور دھواں تم پر چھوڑا جائے گا، پس تم مدد نہ کئے جاؤ گے) اس آیت کے متصلاً بعد وہی آیت دہرائی گئی ہے: ﴿ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴾ (اے جنات اور انسانوں کے گروہ! تم اللہ کی کون کونسی نعمتوں کو ٹھکراؤ گے)

اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ آیت میں عذاب کی دھمکی دی جارہی ہے، وعید سنائی جارہی ہے، پھر اس کے بعد نعمتوں کی یاددہانی اور ذکر کا کیا موقعہ ہے؟

ابھی جو مسلم شریف کی حدیث سنائی گئی ہے، اس سے آپ کو جواب آسانی سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ مؤمن کو جہنم میں کوئی خاص تکلیف نہ ہوگی، اور اس پر ایک قسم کی موت طاری ہوگی، جب اس کو کوئی تکلیف نہیں، بلکہ یہ جہنم مؤمن کے لئے ایک ہسپتال کی طرح ہے جہاں بیماریاں صاف ہوتی ہیں، اور یہ اس کے حق میں یقیناً

راحت ونعمت ہے،اس لئے اس موقعہ پرنعمتوں کی یاددہانی بےموقعہ نہیں۔

الغرض جنت تو نعمت ہے ہی اللہ کی،جہنم بھی مؤمن کے حق میں نعمت ہوگی اور ان آیتوں کی اس سے تفسیر بھی ہوگئی،یہ نکتہ آج ہی سمجھ میں آیا،اس سے پہلے سمجھ میں نہیں آیا تھا،اللہ نے آپ حضرات کی برکت سے یہ بات فہم میں ڈال دی،اور علم عظیم عطاءفرمادیا۔

ریاکاری دل کی دوسری بیماری:

اسی طریقہ پردل کی بیماریوں میں سے ایک بیماری ریاکاری ہے،یعنی اللہ کی اطاعت دوسروں کودکھانے اور خوش کرنے کے لیے کرنا،مثلاً آدمی نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے،تلاوت کرتا ہے،لیکن ان ساری عبادتوں کے اندر یہ جزبہ پیدا ہوجائے کہ لوگ مجھے دیکھا کریں اور مجھے واہ واہ کہیں،لوگ میرے سے خوش ہوجائیں،میری تعریف کریں،یہ نیت دل میں رکھ کرعبادت کرنے کا نام ریاکاری ہے۔

اللہ کی نظر میں اس عبادت کا کوئی اعتبار نہیں جوغیراللہ کے لیے کی جائے،بلکہ حدیث میں اسے شرک خفی کہا گیا ہے،ایک تو شرک جلی ہے،بتوں کی پوجا کرنا،اللہ کے ساتھ غیراللہ کوشریک کرنا،ذات میں یا صفات میں یا اس کے افعال میں،یہ کھلا ہوا شرک ہے،اور ریاکاری شرک خفی ہے،کتنی خطرناک بیماری ہے کہ اللہ کے نبی نے اسے شرک خفی قراردیا ہے؛ کیونکہ یہ دیکھنے میں تو خدا کی عبادت ہے،لیکن دل میں غیراللہ کی خوشنودی مقصود ہے،اس لیے یہ شرک خفی ہے۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

''قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ اگلے پچھلے تمام بندوں کوجمع کرے گا تو ایک منادی ندا دیگا کہ جس نے اللہ کی عبادت میں دوسرے کوشرک کیا تھا وہ انہیں کے

پاس جائے جن کو دکھانے کے لیے نیک کام اور عبادت کرتا تھا۔

(ترمذی:۳۱۵۴،ابن ماجہ:۴۲۰۳ ، مسند احمد:۴۶۶/۳،صحیح ابن حبان: ۱۳۰/۲،معجم کبیر:۳۰۷/۲۲)

مطلب یہ ہے کہ ریا کاروں سے یہ کہا جائے گا کہ تمہاری عبادت و نیکی کا ثواب بھی ان لوگوں سے لے لو اور طاعت کا صلہ بھی انہیں سے لے لو اور دیکھو کیا دیتے ہیں؟

نیز ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ''قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ بندوں کا حساب و کتاب لیں گے تو عابد، عالم اور سخی کو اللہ کے دربار میں پیش کیا جائیگا، اور تینوں اپنے اپنے اعمال کا اظہار کریں گے، ارشاد ہوگا کہ یہ سب اعمال تم نے اس لئے کئے ہیں تا کہ لوگ تمہیں کہیں کہ فلاں شخص مجاہد ہے، فلاں شخص بڑا عالم ہے، فلاں آدمی بڑا سخی ہے اور یہ باتیں تم کو دنیا میں حاصل ہوگئیں، جس مقصد کے لیے نیک اعمال کیے تھے، وہ حاصل ہو چکا۔لہٰذا اب یہاں کیا چاہتے ہو، جاؤ جہنم میں، اور ان کو فرشتے اوندھے منہ جہنم میں ڈال دیں گے۔(مسلم: ۱۹۰۵، نسائی: ۳۱۳۷، مستدرک: ۱۸۹/۱)

معلوم ہوا کہ ریا کاری سے کیا ہوا کام اللہ کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا، اس لیے کوئی بھی کام کرنے سے پہلے نیت کو خالص اللہ کے لیے کرنا چاہئے۔

﴿۞﴾ اخلاص کا فقدان دین میں بہت بڑا شگاف ہے:

مرتب عرض کرتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت والا کا ایک مدرسہ جانا ہوا، احقر (مرتب) بھی ساتھ تھا، وہاں کے ذمہ داروں نے حضرت والا سے درخواست کی کہ

مدرسۂ ھذا کے مدرسین کے مابین کچھ اختلافات ہیں، اس لئے اساتذہ کو کچھ نصیحت فرمادیں، تو حضرت والا نے کچھ قیمتی باتیں ان سے فرمائیں، جس میں اخلاص کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ دین کی خدمت کرنے والوں میں اخلاص کا ہونا بہت ضروری ہے، اخلاص کا فقدان دین کے کاموں میں، مدارس میں، مساجد میں، دینی اداروں میں بہت بڑا شگاف ہے، جس سے شیطان کا حملہ بہت آسانی کے ساتھ ہو جاتا ہے اور وہ ہمارے ایمان واعمال پر حملے میں کامیاب ہو جاتا ہے، جیسے حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ کے واقعات میں لکھا ہے کہ ٹیپو سلطان شہیدؒ نے جوسری رنگا پٹنم میں انتہائی مضبوط قلعہ بنایا تھا تاکہ دشمن حملہ نہ کر سکے، اسی قلعے میں دشمن اسلام انگریز ایک شگاف بنا کر قلعہ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے، ہوا یہ کہ ان کے ایک وزیر میر صادق نے حضرت ٹیپو سلطان سے غداری کی، اور انگریزوں سے اس نے ساز باز کر لی، اسی کے اشارے سے انگریزی فوج نے اس قلعے میں ایک جگہ شگاف ڈال دیا اور اس سے اندر جانے میں کامیاب ہو گئے، یہاں تک کہ اسی کے بعد جنگ میں ٹیپو سلطان شہیدؒ کی شہادت کا روح فرسا اور انتہائی دردناک والم انگیز واقعہ پیش آیا۔

حضرت والا نے فرمایا کہ میں کہتا ہوں کہ ٹیپو سلطان شہیدؒ کے قلعہ میں شگاف پڑ جانے سے بھی کہیں زیادہ بھاری نقصان دینی خدام میں اخلاص کے نہ ہونے کی وجہ سے جو شگاف پڑتا ہے اس سے ہوتا ہے، جس کی تلافی بھی نہ ہو سکے گی، وہاں تو صرف ٹیپو سلطان شہید ہو گئے اور ان کی قلعے کی عمارت منہدم ہوگئی اور حضرت ٹیپو کی حکومت ختم ہوگئی تھی، لیکن یہاں دین وایمان کی عمارت منہدم ہو جائے گی اور ظاہر ہے کہ دین کا نقصان سب سے بھاری نقصان ہوتا ہے، اور اخلاص کے فقدان کا

شگاف ایسا خطرناک ہوتا ہے، جس سے بہت سارے فتنوں کو در آنے کا موقعہ ملتا ہے، بہت سارے مدارس ذمہ داروں اور مدرسین میں اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے تباہی و بربادی کا شکار ہو چکے ہیں، بڑے بڑے مدارس میں تالا لگ چکا ہے، وجہ صرف یہ ہے کہ مقصود اللہ کی رضا نہ ہونے کی وجہ سے آپس میں اختلافات پیدا ہو گئے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ مدارس بند ہو گئے یا دو ٹکڑے ہو گئے، اس کے برخلاف جن میں اخلاص ہوتا ہے ان کا انداز ہی نرالا ہوتا ہے، مخلصین و غیر مخلصین میں بین فرق ہوتا ہے، اور اللہ کی رضا کے لئے کام کرنے والا ہر کام میں یہ سوچتا ہے کہ میرے کام سے اللہ خوش ہو جائے اور جو یہ سوچ کر کام کرے وہ کہاں دنیا کے جھگڑوں میں پڑے گا، وہ کہاں اختلاف کرتا پھرے گا۔

پھر فرمایا کہ پانچ باتیں ہیں، جن پر عمل کرنے سے مدارس ترقی کریں گے، (۱) سب سے پہلے تو اخلاص ہو جیسا کہ عرض کر چکا ہوں (۲) دوسرے یہ کہ مدرسہ میں جو بھی اصول و نظام بنایا جائے اس پر عمل کریں، مثلاً اوقات جو طے کر دئے جائیں اس کی مکمل پابندی کی جائے، اسی طرح جو ذمہ داریاں متعین کی جائیں ان کو پورا پورا نبھانے کی کوشش کرے۔ جب تک اصول کی پابندی نہیں ہوگی کوئی کام صحیح نہیں ہوگا۔ (۳) تیسرے یہ کہ مدرسہ میں رہنے والوں میں بھائی چارگی ہو، ہر ایک دوسرے کو اپنا بھائی خیال کرے، سب ایک دوسرے کو اپنا معاون سمجھیں، اور اسی طرح آپسی معاملہ کریں (۴) چوتھے یہ کہ بچوں کے ساتھ محبت و شفقت کا برتاو کیا جائے، کیونکہ ہم خدام مدارس ہی ان کے دراصل باپ و ماں اور بھائی بہن سب کچھ ہیں، ان کی ضروریات کا لحاظ رکھا جائے، ان کی طبیعت کی فکر کی جائے وغیرہ۔ (۵) پانچویں بات یہ ہے کہ اپنی منزل اور مقصود پر ہمیشہ نظر رہے کہ مجھے

کہاں تک پہنچنا ہے، جیسے ایک بلڈنگ بنانے والا پہلے متعین کر لیتا ہے کہ مجھے کیسی اور کتنی منزل والی عمارت بنانا ہے، یا کوئی اور کام کرنے والا اپنا ٹارگیٹ مقرر کرتا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ اور مقصود اس کام سے کیا ہے، پھر سب کام وخدمات اسی کے مطابق انجام دیتا رہے۔

دنیا کی محبت دل کی تیسری مہلک بیماری:

تیسری چیز جو دل کی بیماریوں میں سے ایک بڑی بیماری ہے، وہ ہے دنیا کی محبت، دل دنیا کی محبت میں گرفتار ہو جائے، مال کی محبت، مکان کی محبت، دکان کی محبت، ہر وقت انہی کی فکر میں لگا ہوا ہو، اور اللہ کو یاد ہی نہ کرتا ہو، اللہ کی محبت دل میں بسانے کے بجائے دنیا کی محبت سمائی ہوئی ہو، یہ بھی بڑی خطرناک قسم کی بیماری ہے، بلکہ حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "حُبُّ الدُّنیَا رَأْسُ کُلِّ خَطِیْئَۃٍ" (دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے) (شعب الایمان: ۳۳۸/۷)

اس لیے کہ جب دنیا کی محبت آتی ہے تو آدمی تمام برائیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، حلال بھی نہیں دیکھتا، حرام بھی نہیں دیکھتا، اچھا بھی نہیں دیکھتا، برا بھی نہیں دیکھتا، کسی کا کوئی پاس ولحاظ بھی نہیں، بلکہ ظلم وزیادتی سے بھی کمائی کر لیتا ہے، اور وہ کسی چیز کی تمیز نہیں کرتا، اس لیے کہ دنیا کی محبت نے اسے مجبور کر دیا ہے کہ اس کے لئے ہر قسم کا کام کر کے اس کو حاصل کرے۔

ایک دل میں خدا اور دنیا کی محبت جمع نہیں ہو سکتی:

میرے بھائیو! یاد رکھو کہ دنیا کی محبت جس کے دل میں ہو، اللہ کی محبت کبھی اس کے دل میں نہیں آسکتی۔ حدیث میں آتا ہے اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ: " مَنْ

أَحَبَّ دُنْیَاہُ أَضَرَّ بِآخِرَتِہٖ وَ مَنْ أَحَبَّ آخِرَتَہٗ أَضَرَّ بِدُنْیَاہُ ، فَآثِرُوْا مَا یَبْقٰی عَلٰی مَا یَفْنٰی"(جس نے اپنی دنیا سے جی لگا لیا اس نے اپنی آخرت کا نقصان کیا اور جس نے اپنی آخرت سے جی لگا لیا اس نے اپنی دنیا کا نقصان کیا، لہٰذا تم باقی رہنے والی چیز کو فنا ہونے والی چیز پر ترجیح دو)(مسند احمد: ۴/۴۱۲، مستدرک: ۴/۳۴۳، شعب الایمان: ۷/۲۸۸)

علماء کہتے ہیں کہ دنیا اور آخرت یہ دونوں ایسے ہیں جیسے دو سوکنیں ہوتی ہیں، اور دو سوکنیں ایک جگہ کبھی خوشی کے ساتھ جمع ہو سکتی ہیں؟ کبھی نہیں ہو سکتیں، دونوں کے اندر ہمیشہ جھگڑا رہے گا، اس کو خوش کرو تو یہ ناراض اور دوسری کو خوش کرو تو پہلی ناراض، اللہ کے نبی ﷺ کہتے ہیں کہ اسی طریقہ پر دنیا کو پانا چاہو گے تو آخرت تم سے چھوٹ جائے گی اور آخرت کو حاصل کرو گے تو ضرور دنیا تم سے دور ہو جائے گی، لہٰذا اگر خدا کو ناراض کرو گے تو دنیا مل سکتی ہے، دنیا کو ناراض کرو تو پھر اللہ مل سکتا ہے، لیکن یہ کہ بیک وقت دونوں کو راضی کر کے رکھیں، اللہ کے نبی کہتے ہیں کہ یہ ممکن نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی محبت کو دل سے نکالنے کی ضرورت ہے، تا کہ اللہ کی محبت ہمارے اندر آئے۔

❁ دنیا کی محبت کا نشہ شراب کے نشہ سے بڑھا ہوا ہے:

فرمایا کہ آدمی جب شراب پی لیتا ہے تو اسے نشہ آتا ہے اور جب نشہ آتا ہے تو اس کے نتیجہ میں وہ بہت سارے برے کام کر بیٹھتا ہے، یعنی شراب پینا ایک ایسا خبیث کام ہے جس کی وجہ سے بہت سارے خبائث وجود میں آتے ہیں، جیسے ایک واقعہ ہے کہ ایک آدمی کو مجبور کیا گیا کہ تین چیزوں میں سے ایک کو اختیار کرے، یا زنا کر لے، یا ایک آدمی کو قتل کر دے، یا شراب پی لے، تو اس نے سوچا کہ زنا اور قتل تو

بڑے گناہ ہیں، اس لئے چلو شراب پی لیتے ہیں، تو اس نے شراب پی لی، جب شراب پیا تو نشہ میں زنا بھی کرلیا اور قتل بھی کر بیٹھا، تو اس طرح شراب دیگر گناہوں کے لئے دروازہ بنتا ہے۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ شراب کے نشہ سے بھی زیادہ دنیا کی محبت کا نشہ ہے کہ جس پر اس کا نشہ سوار ہو جاتا ہے، وہ نہ حلال کی تمیز کرتا ہے، نہ حرام کی تمیز کرتا ہے، اور نہ اپنے کو دیکھتا ہے نہ پرائے کو دیکھتا ہے۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اوپر سے نیچے تک ہمارے بادشاہوں میں چند کو مستثنیٰ کر کے اکثر میں عیاشی تھی، قتل وقتال ان کا مشغلہ بن گیا تھا، ظلم و زیادتی ان کی عادت بن گئی تھی، روزانہ بے گناہوں کا قتل ہو رہا ہے، نا انصافیوں کا ایک طویل وعریض سلسلہ ہے، حق و باطل میں کوئی تمیز قائم نہیں ہے، بلکہ باپ بیٹے کو یا بیٹا باپ کو قتل کرا رہا ہے۔

حجاج بن یوسف کے بارے میں لکھا ہے کہ جب تک روزانہ کم از کم ایک قتل کا حکم صادر نہیں کر دیتا تھا، اسے چین نہیں آتا تھا، بے شمار علماء وصلحاء بلکہ بعض صحابہ کو بھی اس نے قتل کیا ہے، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو بھی اسی نے قتل کیا تھا اور ان کا سر نکال کر کعبہ پر لٹکا دیا تھا، تاریخ ایسے بادشاہوں کے واقعات سے بھری پڑی ہے، اسی طرح اسلامی تاریخ میں غداروں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی، جن کے مکر وسازش کی وجہ سے اسلام کو اور ملک کو بڑا نقصان ہوا ہے۔

اس کے اسباب پر جب آپ غور کریں گے تو اکثر واقعات میں دنیا کی محبت ہی سامنے آئے گی، اس لئے کہ جس کے دل میں دنیا کی محبت پیدا ہو جاتی ہے، اسے اندھا، بہرا بنا دیتی ہے، جس کی وجہ سے تمام برائیاں وجود میں آتی ہیں۔

ایک عبرت خیز حدیث:

یہیں سے وہ حدیث بھی سمجھ میں آجاتی ہے جس کو اللہ کے نبی ﷺ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:" مَا ذِئْبَان جَائِعَان أُرْسِلاَ فِي الْغَنَمِ بِأَفْسَدَ لَهَا مِنْ حِرْصِ الْمَرْءِ عَلَى الْمَالِ وَ الشَّرَفِ لِدِيْنِهِ "(دو بھوکے بھیڑئے جن کو بکریوں میں چھوڑ دیا گیا ہو وہ اس قدر ان بکریوں کو نقصان نہیں دیتے جتنا کہ آدمی کے اندر مال و جاہ کی حرص اس کے دین کو نقصان دیتے ہیں)(ترمذی:۲۳۷۶،مسند احمد:۳/۴۵۶،دارمی:۲/۳۹۴،صحیح ابن حبان:۸/۲۴)

اللہ اکبر! دنیا کی محبت وحرص اس قدر نقصان دہ ہے دین کے لئے کہ بھوکے بھیڑئے بھی بکریوں کے ریوڑ کو اس قدر نقصان نہیں پہنچا سکتے ،اور ظاہر ہے کہ یہ مختلف قسم اور مختلف انداز کے دینی نقصانات ہیں جو محبت دنیا کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

دنیا کا استعمال ضرورت کے لئے ہو:

لیکن یہاں ایک بات یاد رکھیں، وہ یہ کہ ایک ہے دنیا کا ضرورت کے لیے استعمال ، اور ایک ہے دنیا کی محبت میں گرفتار ہونا، ان دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ایک یہ ہے کہ آدمی ضرورت کے لیے دنیا کو استعمال کرتا ہے، کھانے کے لیے، پینے کے لیے، پہننے اور رہنے کے لئے ،ان چیزوں کے لیے دنیا کو ضرورت کی خاطر استعمال کرتا ہے اور پھر اللہ کے حکم کے ماتحت استعمال کرتا ہے تو اس کا نام دنیا نہیں ہے، یہ دنیا کی محبت نہیں ہے، یہ دنیا کا استعمال ہے، اللہ نے دنیا اسی لیے تو دی ہے کہ ضرورت میں اس کو استعمال کرو۔

دیکھئے قرآن میں اللہ تعالی نے فرمایا:

﴿ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ أَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ ﴾ [الاعراف:۳۲] (اے نبی ﷺ ذرا پوچھئے کہ کس نے حرام کیا ہے اللہ کی زینت کو جس کو اللہ نے اپنے خاص بندوں کے لیے پیدا کیا ہے، اور رزق میں سے عمدہ چیزیں)

یہاں اللہ تعالی نے یہ فرمایا کہ "أخرج لعبادہ" یعنی دنیا کی زینت کو اللہ نے اپنے خاص بندوں ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ نے کافروں کے لیے پیدا نہیں کیا ہے، لہذا نیک بندوں کے علاوہ جو لوگ دنیا کو استعمال کرتے ہیں وہ دراصل غاصب ہیں، غصب کر کے اس کو استعمال میں لاتے ہیں، یہ نیک بندے اسے ضرورتاً استعمال کرتے ہیں اور دوسرے لوگ اسے دل سے لگا لیتے ہیں، اور یہی دل سے لگانا غلط ہے، اور ضرورت کے لیے استعمال کر لینا جائز ہے، جیسے ہم استنجاء کے لئے ڈھیلے لیتے ہیں، یہ ایک ضرورت ہے لہذا یہ جائز ہے، لیکن اگر کوئی ان ڈھیلوں کو مقصود زندگی بنا لے اور ہر وقت اسی کی دھن وفکر میں لگا رہے تو یہ غلط بھی ہے اور بے وقوفی کی حرکت بھی۔

اسی لیے ساری دنیا کو ملعون قرار دیا گیا ہے، سوائے اس کے کہ اس دنیا کو دین کے لئے اختیار کیا جائے۔ ایک حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:

"اَلدُّنْيَا مَلْعُوْنَةٌ وَمَلْعُوْنٌ مَا فِيْهَا اِلَّا ذِكْرُاللّٰهِ وَمَا وَالَاهُ وَعَالِمٌ وَمُتعلم" (دنیا ملعون ہے اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی ملعون ہے، سوائے اللہ کے ذکر کے اور اس کے جو اللہ کے ذکر سے تعلق رکھنے والی ہو، اور عالم اور طالب علم کے)(ترمذی:۲۳۲۲)

جو اللہ والا ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ میرے دل میں یہ ملعون چیز کیوں رہے۔ چاہے

وہ جائز ہی کیوں نہ ہو،اور ذکراللہ سے تعلق رکھنے والی چیزیں جیسے قرآن ہے حدیث ہے ،علوم شرعیہ ہیں، مدارس ہیں، مساجد ہیں ، مساجد سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں،علماء ہیں،طالب علم ہیں اوردینی خدام ہیں، یہ سب اس لعنت سے محفوظ ہیں۔

الغرض اپنی دینی ودنیوی ضرورتوں میں تو دنیا کا استعمال درست ہے،لیکن اسی کومقصود بنالیانا جائزنہیں،قابل ملامت کام ہےاورانسان کولے ڈوبتا ہے۔

دنیا کی مثال:

یادرکھو کہ دنیا کومقصود بنانے کے لئےنہیں،اس سے محبت کرنے کے لئےنہیں بلکہ ہماری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بنایا گیااورہمیں دیا گیاہے،کیونکہ دنیا کے بغیر بھی تو ہم جی نہیں سکتے ،نماز روزہ بھی نہیں کرسکتے ،نیک کاموں میں خرچ کرنا چاہیں تواس کے لئے بھی ہمیں دنیا کی ضرورت ہے،لہذا دنیا تو ضروت ہے،ہاں دنیا کی محبت خطرہ ہے۔

مثنوی شریف میں مولانا رومیؒ نے اس کی ایک مثال دی ہے،فرمایا جیسے کشتی ہوتی ہے کہ کشتی بغیر پانی کے کبھی چل نہیں سکتی، نیچے پانی ہونا ضروری ہے،لیکن وہ پانی جو کشتی چلانے کے لیےضروری ہے،اگروہ کشتی کے اندرآجائے تو کشتی کوڈبوکر رکھ دے گا،فرمایا کہ اسی طریقہ پر دنیاضروری ہےآپ کے دین کی کشتی کو چلانے کے لیے،مثلاً آپ زکوۃ کیسے ادا کریں گے ؟مال ہے تبھی تو ہے زکوۃ، اسی طرح نماز پڑھنے کے لیے کپڑوں کی ضرورت ہے،نماز پڑھنے کے لیے مسجد کی ضرورت ہے،مسجد بنانے کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے، پیسےنہیں ہوں گےتو یہ سب چیزیں کیسے بنائیں گے، مدرسہ قائم کرنا چاہتے ہیں دین کی حفاظت واشاعت کے لیے تواس کے لیے بھی پیسوں کی ضرورت ہے،غریبوں یتیموں کی امداد کیسے کریں گے؟

اس کے لئے بھی مال کی ضرورت ہے، تو دیکھئے دنیا کا ہونا دین کی کشتی کو چلانے کے لئے ضروری ہوا کہ نہیں؟ لیکن جب تک یہ مال پیسہ باہر باہر رہیگا، یہ دنیا ہاتھوں میں رہے گی، اس وقت تک دین کی یہ کشتی چلتی رہے گی، اور جس دن یہ مال کی محبت دل میں گھس جائے گی تو انسان کو اسی طرح ہلاک کر دے گی جیسے پانی کشتی میں داخل ہو کر کشتی والوں کو ڈبو کر ہلاک کر دیتا ہے، اس لئے اسے دل میں مت جماؤ، یہ بہت خطرناک چیز ہے۔

ایک بزرگ نے فرمایا کہ دنیا کو ایسا سمجھو جیسے استنجاء کے ڈھیلے کہ بڑے ضروری ہوتے ہیں، اسے ضرورت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اگر کوئی صاحب ان ڈھیلوں کو جمع کر کر کے الماری میں رکھا کریں، صندوق میں رکھا کریں تو آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ کہیں گے کہ اسے مینٹل (دماغی) ہسپتال میں داخل کرنا چاہئے، کیوں کہ ایک غیر ضروری چیز کو ضروری سمجھ کر استعمال کرنا بے وقوفی ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک غیر ضروری چیز کو ضروری چیز جیسا درجہ دیا جائے تو اس کا نام ہے پاگل پن۔

اس مثال کو سامنے رکھ کر ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ دنیا کے معاملے میں ہم نے اگر یہ کام کیا تو ہم بھی پاگل ہیں، خدا کی نظر میں اور رسول اللہ ﷺ کی نظر میں ان چیزوں کی حیثیت ان ڈھیلوں جیسی ہے۔

دنیا کی حقیقت، اکبرالہ آبادی کا واقعہ:

اکبرالہ آبادی کا ایک واقعہ یاد آ گیا کہ وہ ہندوستانی عدالت کے جسٹس تھے، ایک دفعہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ جو بہت پڑھے لکھے لوگ تھے، کسی خاص مسئلہ پر ایک کمرے میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے، اتنے میں ان کے والد جو بوڑھے تھے وہ کمرے میں داخل ہوئے اور ان کے ہاتھ میں ایک بیلون تھا، جسے غبارہ کہتے

ہیں، بچے ان میں پھونک مارتے اور ان سے کھیلتے اور ان کو پھوڑتے ہیں، وہ اندر آئے اور کہنے لگے بیٹا اکبر! یہ دیکھو تمہارے لیے کیا لایا ہوں؟ تم بچپن میں اسے بہت پسند کرتے تھے، اور رُو رُو کر اسے مانگا کرتے تھے۔ لہٰذا یہ غبارہ تمہارے لئے لایا ہوں۔

بس جناب یہ سننا تھا کہ اکبرالہ آبادی کے اوپر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ اسے بیان نہیں کیا جاسکتا، نہایت شرمندہ ہوگئے کہ ایک چیف جسٹس اور ان کے ساتھ بڑے بڑے لوگ بیٹھے ہیں، ان کے سامنے والد صاحب غبارہ لاکر دے رہے ہیں کھیلنے کے لیے، کتنی شرم کی بات ہے، وہ بہت ہی شرمند ہوگئے۔ اکبرالہ آبادی کے چہرہ پر شرمندگی کے آثار جو نمایاں تھے، اسے دیکھ کر ان کے والد نے کہا کہ بیٹا! مجھے احساس ہے کہ غبارہ کے دیکھنے سے اس وقت تمہیں شرمندگی محسوس ہورہی ہے، لیکن میں تم کو اور تمہارے ان ساتھیوں کو ایک بات سمجھانے کے لیے آیا ہوں۔ وہ یہ کہ تم جو آج ان عہدوں اور دولت کی چیزوں پر فخر کررہے ہو، اور ان کو حاصل کرنے کی فکر کرتے ہو، کل قیامت کے دن وہی چیز تم کو دی جائے گی تو وہاں بھی تم کو اسی طرح شرم آئے گی، جیسے آج تمہارے بچپن کی خواہشات و مطالبات پر شرم آرہی ہے۔

اللہ اکبر! کتنا بڑا سبق پڑھا دیا اس معمولی سے واقعہ سے! یہ بلڈنگ آج ہمیں اچھی لگتی ہیں، دنیا کا پیسہ بہت اچھا لگتا ہے، بلکہ آدمی اسے دوسروں سے چھیننا چاہتا ہے، اس کو جمع کرنا چاہتا ہے، اس کو بڑھانا چاہتا ہے، بڑی فکریں اس کے لیے کرتا ہے، اپنی نیند قربان کرتا ہے، اپنی جان قربان کرتا ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جب انسان کو یہ دولت دیں گے تو اسے وہاں شرم آئے گی، اس لئے کہ وہاں اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہوگی۔

زمین اپنے خزانے اگل ڈالے گی:

آخرت میں کیا، دنیا ہی میں ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ زمین اپنے خزانے اگل ڈالے گی مگر اسے کوئی لینے والا نہیں ہوگا۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ" زمین اپنے جگر کے ٹکڑے یعنی سونا وچاندی کے خزانے اگل ڈالے گی، اس واقعہ سے پہلے ایسا ہوا ہوگا کہ اسی مال کی خاطر ایک بھائی نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا ہوگا، کسی نے اسی کے لئے اپنے رشتے ناتے توڑے ہوں گے، کسی نے اس کی خاطر چوری کی ہوگی اور اس کے ہاتھ کاٹے گئے ہوں گے، اب لوگ اس مال کو لات مارتے ہوئے جائیں گے، کوئی اس کو اٹھانے والا نہیں ہوگا، تو وہ قاتل کہے گا کہ " فِيْ هذا قَتَلْتُ "(اسی کے لئے میں نے قتل کیا تھا)، اور رشتہ توڑنے ولا آئے گا اور کہے گا" فِيْ هذا قَطَعْتُ "(اسی کی خاطر میں نے رشتہ توڑا تھا، اور چور آئے گا اور کہے گا " فِيْ هذا قُطِعَتْ يَدِي " (اسی کی وجہ سے میرے ہاتھ کاٹے گئے) مگر یہ لوگ اس میں سے کوئی چیز نہیں لیں گے)۔ (مسلم:۱۰۱۳، ترمذی:۲۲۰۸، صحیح ابن حبان:۱۵/۹۰، مسند ابویعلی:۱۱/۳۲)

قرآن میں بھی اس کا ذکر موجود ہے:

﴿ إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا﴾ [الزلزال:۱-۲] (جب زمین کو زلزلہ آئے گا، اور زمین اپنے خزانے اگل ڈالے گی)

اس میں قیامت کے زلزلہ کا ذکر ہے اور اس وقت زمین کے خزانے اُگلنے کا تذکرہ کیا گیا ہے اور حدیث میں اس سے بھی پہلے ہونے والے واقعہ کا ذکر ہے۔

۞ دنیا کی حقیقت پر ایک عجیب قطعہ:

حیدرآباد میں ایک شاعر امجد حیدآبادی گزرے ہیں، ان کے اشعار بہت پر مغز وحقیقت نما ہوتے ہیں، دنیا کی حقیقت پر ان کا قطعہ یاد آ گیا:

دنیا والوں ثبات دنیا میں نہیں ☆ یک لحظہ قرار موج دریا میں نہیں
عالم کا وجود صورت ''لا'' سمجھو ☆ لفظاً موجود معنی میں نہیں

یعنی یہ کہتے ہیں کہ جیسے دریا میں ہر وقت تحریک رہتی ہے، ادھر سے ادھر وہ موجیں مارتا رہتا ہے، اسی طرح پوری دنیا میں یہی حال ہے، کسی چیز کو قرار نہیں، کوئی مر رہا ہے، کوئی جی رہا ہے، ادھر دیکھو تو خوشیاں ہیں، ادھر دیکھو تو غمیاں ہیں، کوئی صحت مند ہو رہا ہے، کوئی مریض ہو رہا ہے ،کوئی مالدار ہو رہا ہے ،کوئی غریب ہو رہا ہے۔ یہ ہے دنیا کا نقشہ، پھر شاعر نے اس بے ثباتی سے اس کی بے حقیقتی پر استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ دیکھو ''لا'' لکھتے اور بولتے ہیں، لا کے معنی ہیں ''نہیں''، جیسے کہتے ہیں ''لا الہ'' (نہیں ہے کوئی معبود) یہ ''لا'' لفظاً تو موجود ہے، لکھا جاتا ہے، بولا جاتا ہے، پڑھا جاتا ہے، پڑھایا جاتا ہے،، لیکن اس کے معنی ہیں ''نہیں''، یہ صورت میں تو موجود ہے معنی میں نہیں، اسی طرح یہ پورا عالم دیکھنے میں تو ہے ،معنی میں کیا ہے؟ کچھ نہیں۔ کیا عجیب مثال دی، دیکھنے میں سورج بھی نظر آ رہا ہے، چاند بھی نظر آ رہا ہے، بظاہر سب کچھ موجود ہے، حقیقت میں کچھ نہیں۔

الغرض دنیا کی بے حقیقتی و بے ثباتی سے عبرت لیتے ہوئے انسان کو چاہئے کہ وہ اس سے کنارہ کش ہو اور اس کے پیچھے نہ پڑے اور ہر وقت اسی کی دھن وفکر میں نہ رہے اور اسی کے لئے جینے اور مرنے کا نظریہ چھوڑ دے۔

طہارت کی چوتھی قسم:

اب لیجئے چوتھی قسم کی طہارت کو، یہ طہارت بڑی عجیب وغریب ہے، کمال درجہ کی طہارت ہے اور اس کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے، سب سے اونچا درجہ ہے، اور یہ مخصوص بندوں اور اللہ کے مقرب بندوں کا حصہ ہے، اللہ کسی پر فضل کرے تو اس کو وہ دولت مل سکتی ہے، حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کو اور پھر اس کے بعد انہیں کی تبعیت اور انہیں کی وراثت اور طفیل میں اولیاء اللہ کو اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے۔

یہ عظیم الشان طہارت کیا ہے؟ وہ ہے اپنے دل کو اللہ کے ماسوا تمام چیزوں سے خالی اور پاک کر لینا، اس لیے کہ جو کچھ دنیا کی چیزیں ہم کو نظر آتی ہیں، یہ حقیقت میں گندگی ہیں، اللہ پاک ہے اور اللہ کی پاکی کے سامنے دنیا کی ہر چیز بالکل ناپاک ہے، اس لئے دنیا کی ان تمام چیزوں سے اپنے دل کو پاک وصاف کر کے اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی محبت کو سمالینا، اللہ کے عشق کو بسالینا، دل میں کچھ نہ رہے صرف اللہ رہے اور ساری چیزیں نکل جائیں، یہ سب سے اعلی درجے کی پاکی وطہات ہے۔

اب جو اچھی چیزیں ہیں، جو جائز چیزیں ہیں، وہ بھی اس کے دل میں نہیں رہیں گی، دنیا کی کوئی خواہش، دنیا کی کوئی تمنا، دنیا کی کوئی آرزو، دنیا کی جائز خواہشیں سب اس سے نکل جائیں گی، صرف دل میں اللہ ہی اللہ رہے گا۔

خواجہ مجذوب صاحب کا ایک شعر:

حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحبؒ نے اپنے ایک شعر میں طہارت کے اسی مقام کا ذکر کیا ہے کہ ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

خواجہ صاحب نے اس میں اللہ سے خطاب کیا ہے کہ اے میرے مالک! اب دل میں کوئی تمنا نہیں ہے، کوئی خواہش نہیں ہے، کوئی آرزو نہیں ہے، اب دل خالی ہو چکا ہے، خلوت کے معنی ہیں سب چیزوں سے دل خالی ہو گیا، حرص سے ہوس سے دل خالی ہو گیا، لہٰذا اب یہ دل تیرے قابل بنا چکا ہوں، اب اس میں صرف تیری ہی جلوہ نمائی ہو سکتی ہے، اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی۔

ہمارے حضرت مسیح الامتؒ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ نے تمام اعضاء دو دو دیے ہیں، دو ہاتھ ہیں، دو پیر ہیں، دو آنکھ ہیں، لیکن بھائی اللہ نے دل ایک دیا ہے اور زبان ایک دی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس ایک دل کے اندر صرف میری گنجائش ہونی چاہئے اور کسی کی نہیں، اور اس زبان میں صرف میرا ذکر ہو اور کسی کا نہیں، زبان میں میرا ذکر ہو دل میں میری یاد ہو۔

۞ مقصدِ تخلیق معرفت و محبت حق ہے:

کیونکہ ہماری تخلیق کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہم اللہ کی معرفت و محبت اپنے اندر پیدا کریں، ایک حدیث قدسی میں آیا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "كُنْتُ كَنْزاً مَخْفِيّاً فَأَحْبَبْتُ أَنْ أُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ" (میں ایک مخفی خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ میری معرفت ہو، میری پہچان ہو تو میں نے مخلوق کو پیدا کیا)

یہ حدیث محدثین کے نزدیک لفظاً ثابت نہیں ہے لیکن وہ حضرات کہتے ہیں کہ

اس کا معنی ومفہوم دیگر احادیث ودلائل سے ثابت ہے۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی اللہ تعالی کو جاننے والا نہیں تھا، نہ یہ آسمان موجود تھا، نہ یہ زمین موجود تھی، نہ یہ ستارے موجود تھے، نہ یہ انسان موجود تھا، سب کی سب چیزیں معدوم تھیں، کوئی چیز موجود نہیں تھی، صرف اللہ کی ذات موجود تھی، اس مخلوق کو پیدا کر کے اللہ نے کیا چاہا؟ اللہ کو پہچانو، اللہ سے محبت کرو، اللہ میں غور کرو، یہ جتنی مخلوقات ہیں ان کو دیکھ کر مخلوق کو نہیں، بلکہ دراصل خالق کو پہچانو، مخلوقات تو ذرائع ہیں، وسائل ہیں، اسباب ہیں، لیکن ان سب چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا ہے، زمین کو دیکھ کر، آسمان کو دیکھ کر، سورج کو دیکھ کر، چاند کو دیکھ کر، انسان کو دیکھ کر، انسان کے اندر کی چیزوں کو دیکھ کر، اس کے اندر کی خصوصیات وکمالات کو دیکھ کر، ان سب چیزوں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اللہ تعالیٰ کی محبت اپنے قلب کے اندر پیدا کرنا مقصود ہے۔

اس کے لیے اللہ نے اس کائنات کو اور اس کے ذرے ذرے کو پیدا کیا، معلوم ہوا کہ انسان کو پیدا کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان اللہ تعالی کی معرفت حاصل کرے، اللہ سے محبت کرے، اس کے علاوہ کوئی اور مقصد نہیں ہے، لیکن انسان دنیا میں آنے کے بعد دنیا کی حقیر اور فانی چیزوں سے دل لگا لیتا ہے، اور انہی کو اپنا مقصود وقبلہ سمجھتا ہے۔

تو بھائیو! بتانا یہ چاہتا ہوں کہ دل کو پاک وصاف کرنے کے بعد مقصود یہ ہے کہ اس دل کے اندر خدا کی محبت سمائی اور بسائی جائے۔

۞ چاروں طہارتیں مل کر آدھا ایمان کیوں ہیں؟

الغرض اسلام میں طہارت و پاکی کا جو تصور ہے وہ ان سب امور واقسام کے

لحاظ کے ساتھ میں ہے، جب ہم اس کو اس طرح سمجھیں گے تو اس حدیث پر کوئی اشکال و اعتراض نہیں ہوگا کہ اللہ کے نبی ﷺ نے صرف طہارت کو کیسے آدھا ایمان قرار دیدیا؟ ظاہر ہے کہ جب اس تفصیل کے ساتھ طہارت کو سمجھا جائے گا اور اس کی ان قسموں کو ملحوظ رکھا جائے گا تو کیا اشکال کی گنجائش ہے؟

اب رہا یہ سوال کہ یہ چاروں طہارتیں مل کر آدھا ایمان کیوں ہیں؟ میرے ذہن میں اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ ایمان کی تکمیل کے لیے دو چیزیں چاہئیں: ایک اوامر یعنی جن چیزوں کو کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جیسے نماز ہے، روزہ ہے، حج ہے، قربانی ہے، زکوۃ ہے وغیرہ، ان کی بجا آوری و تعمیل، اور ایک نواہی یعنی جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے، ان سے دوری و پرہیز، اب غور کریں کہ پاکی وطہارت میں وہ تمام چیزیں داخل ہیں جن سے پرہیز کا حکم ہے اور وہ تمام قسم کی برائیاں ہیں، ظاہری بھی اور باطنی بھی، لہذا تمام حرام و ناجائز اور بری باتوں سے بچنا ہی پاکی وطہارت ہے، تو یہ آدھا ایمان ہوگیا اور باقی آدھا ایمان اوامر و نیکیوں کی بجا آوری میں ہے، اس طرح طہارت آدھا ایمان قرار پاتا ہے۔

تو مامورات کو پورا کرنا آدھا ایمان، اور ممنوعات سے بچنا آدھا ایمان، دونوں کو ملائیں تو مکمل ایمان ہوگیا۔

❁ پہلے تخلیہ پھر تحلیہ:

اب ایک اور نکتہ سنئے، وہ یہ کہ اسلام میں پاکی کو تمام عبادات پر مقدم رکھا گیا ہے، ظاہری پاکی بھی مقدم ہے اس کے بعد نماز و عبادت ہے، اگر کوئی بے وقوف پہلے نماز پڑھ لے اور بعد میں پاکی حاصل کرے تو یہ غلط اور حماقت ہے، اسی طرح نیکیاں وخوبیاں اپنے اندر پیدا کرنے سے پہلے اپنے اندر سے برائیوں و ظاہری

وباطنی گندگیوں کو دور کرنا بھی ضروری ہے۔حضور ﷺ نے پہلے یہ فرما کر کہ طہارت آدھا ایمان ہے، ہمیں پہلے ممنوعات و گناہوں سے بچنے کا حکم دیدیا، اس لیے کہ جب انسان کسی جگہ پر بلڈنگ بنانا چاہتا تو سب سے پہلے وہاں کے جھاڑ جھنکار پاک وصاف کرتا ہے، گندگی ہوتو اسے ہٹاتا ہے،زمین ہموار کرتا ہے ، پھراس کے بعد وہاں تعمیر کرتا ہے۔اسی طرح ایمان کی عمارت تعمیر کرنے کے لیے گناہوں اورنواہی کے جھاڑ جھنکاراور گندگی وآلودگی کو پہلے صاف کرنا پڑے گا،جب دل کی جگہ پاک وصاف ہوجائے گی تو پھرایمان کی عمارت تعمیر ہوگی،پھرنماز کے ذریعہ، ذکر کے ذریعہ، تلاوت کے ذریعہ، دیگرعبادات کے ذریعہ ایمان کی عمارت تعمیر ہوگی، اگرپاکی وصفائی کے بغیر عمارت تعمیر کردی گئی تو عمارت تو بن جائے گی،لیکن اس کے اندر نقص وکھوٹ رہ جائے گا۔

اسی کوحضرات صوفیاءکرام تخلیہ وتحلیہ سے تعبیر کرتے ہیں،وہ کہتے ہیں کہ پہلے تخلیہ یعنی صفائی وپاکی ہوگی،اس کے بعد پھرتحلیہ یعنی اس کوآراستہ پیراستہ کیا جائے گا اورسنوارا جائے گا۔

چوتھادرجہ بطورانعام دیاجاتاہے:

میرے بھائیو!جب بندہ پاکی کے پہلے تین درجات کوحاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اوراس کے اندراسے کامیابی مل جاتی ہے تو چوتھادرجہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطورانعام دیاجاتا ہے۔

جیسے بچہ تعلیم میں محنت کرتا ہے تواس سے کہا جاتا ہے کہ اگرتم نے اتنی محنت کی تو تم پاس ہوجاؤگے،لیکن بچہ جب پاس ہوجاتا ہے تواسے انعام دیاجاتا ہے۔پاس ہونا تواس کی محنت کانتیجہ ہے، انعام کا دیاجانادراصل استاذوں کی طرف سے

بطورتحفہ اورعنایت کے ہوتا ہے۔اسی طریقہ پر جب بندہ اپنے ظاہر و باطن کی صفائی کے لئے محنت کرتا ہے،کوشش کرتا ہےتو یہ تین درجے اس کی محنت کے نتیجے میں اس کو دیے جاتے ہیں اور کامیابی کا رستہ اس کے لیے کھول دیا جاتا ہے اور چوتھا درجہ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل سے،اپنے کرم سے،اپنے احسان سے عطاءفرماتے ہیں۔

لہٰذا آدمی کو چاہیے کہ ان تین درجات کی تحصیل کے لیے خوب کوشش کرے، اتنی کوشش، لگن اور محنت ہو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے چوتھی چیز بطورعنایت اور بطورتحفہ اس کو دے دی جائے۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو محض اپنے فضل وکرم سے تمام قسم کی پاکیوں اور طہارتوں سے مالا مال فرمائے اور اپنی رحمت ومغفرت کا حصہ عطاءفرمادے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محبت الٰہیہ اور اس کے آثار ولوازم

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین،أما بعد فأعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمن الرحیم:

﴿وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا أَشَدُّ حُبّاً لِلّٰہِ﴾

تمام عرفانی مقامات میں سب سے بلند وعظیم مقام ''محبت الٰہیہ'' کا ہے، اس کے اول وآخر جو کچھ ہے وہ یا تو اس کا مقدمہ ہے یا نتیجہ وثمرہ ہے۔ جیسے توبہ، صبر اور زہد، توکل، وغیرہ مقامات ''محبت الٰہیہ'' کا مقدمہ ہیں کہ اس کی تحصیل ان پر موقوف ہے۔ اور شوق، انس، رضا وغیرہ مقاماتِ عرفانی اسی محبت الٰہیہ کا ثمرہ اور نتیجہ ہیں، کہ جس کسی کو بھی محبت الٰہیہ کا ادراک ہوگا وہ ضرور ان مقامات کو بھی حاصل کرے گا۔

غرض یہ کہ ''محبت الٰہیہ'' وہ بلندترین وعظیم الشان روحانی وعرفانی مقام ہے کہ اس سے بلند وعظیم کوئی مقام نہیں اور معرفتِ الٰہیہ جو کہ مقصدِ تخلیقِ انسان ہے، اس کے بغیر ممکن نہیں۔

اللہ تعالیٰ ہی محبوب حقیقی ہے:

غرض یہ کہ ایمان کے لیے اللہ تعالیٰ سے محبت لازم ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارا محبوب حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اور جو دنیوی محبتیں ہیں وہ محض فانی ہیں اور مجازی ہیں کیوں کہ جن جن خوبیوں اور کمالات کی وجہ سے انسان دوسرے انسانوں سے اور چیزوں سے محبت کرتا ہے وہ ساری خوبیاں اور کمالات ان انسانوں اور

چیزوں میں ان کے ذاتی اور خانہ ساز نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے ہیں، پھر یہ ساری دنیوی خوبیاں اور کمالات فنا کے گھاٹ اتر جانے والے ہیں، اس لیے ان سے کیا محبت کی جاسکتی ہے۔

ہاں حقیقی معنی میں محبت تو صرف اللہ تعالیٰ سے ہوسکتی ہے، یا ان ہستیوں سے جن کا اللہ تعالیٰ سے تعلق ہو۔ جیسے انبیاء علیہم السلام و اولیاء کرام اور علماء عظام جن کے ذریعہ ہمیں اللہ کی معرفت و محبت نصیب ہوتی ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے سارے کمالات اس کے اپنے ذاتی ہیں اور وہ ان کمالات سے ہمیشہ سے متصف ہے اور ہمیشہ متصف رہے گا۔

کائنات فانی ہے، حضرت ابراہیم کا واقعہ:

اور دنیا کی چیزوں کو اس لیے بھی دل سے نکالنا ہے کہ ان کے اندر اگر کوئی عیب نہیں ہے تو ایک عیب ضرور ہے، وہ یہ ہے کہ وہ فانی ہیں۔ چلیے مان لیا کہ سورج ماشاء اللہ بہت بہترین ہے اور نہایت حیرت انگیز ہے، لیکن سب کچھ ہونے کے باوجود بھی فانی ہے، ختم ہوجانے والا ہے، ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے لوگوں کی اصلاح کے لیے ایک دفعہ ایسا کیا کہ آپ باہر تشریف لائے اور اس وقت آسمان پر ستارے نکلے ہوئے تھے، اوپر دیکھا ستاروں کی طرف کہ ماشاء اللہ ٹمٹما رہے ہیں،— دیکھنے میں تو ٹمٹما رہے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ بہت بڑے بڑے ہیں، بہت دوری پر ہونے کی وجہ سے وہ ہمیں ایسے نظر آتے ہیں گویا ٹمٹما رہے ہیں— تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو دیکھ کر کہا "هٰذَا رَبِّیْ" کہ یہ میرا رب ہے، یہ حضرت ابراہیم نے لوگوں کو سمجھانے کے لیے کہا تھا، ایسا نہیں کہ وہ نعوذ باللہ ان کو رب مان رہے تھے، نبی

تو کوئی گناہ بھی نہیں کرسکتا، شرک کیسے کرسکتا ہے، کیونکہ جمہور علماء کا مذہب ہے کہ انبیاء قبل از نبوت اور بعد از نبوت معصوم ہوتے ہیں۔

خیر کچھ دیر کے بعد جب ستارے چھپنے لگے، غائب ہونے لگے، تو ابراہیم علیہ السلام نے لوگوں کی عقلوں کے مطابق ان کو سمجھانے کے لیے فرمایا کہ "اِنِّیْ لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ" کہ یہ ختم ہوجانے والوں، غروب ہوجانے والوں، غائب ہوجانے والوں کو میں پسند نہیں کرتا، ان کو خدا کیسے بنالوں، خدا تو وہ ہوتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا دنیا کو اور دنیا کی ان چیزوں کو ثبات کہاں ہے؟ ثبات تو صرف اللہ کو ہے۔

پھر کسی موقعہ پر حضرت ابراہیم باہر نکلے تو دیکھا کہ چاند نکلا ہوا ہے، بہت خوب اس کی روشنی پھیلی ہوئی ہے، کہنے لگے "ھٰذَا رَبِّیْ" کہ یہ میرا رب ہے، ارے وہ ستارے تو خدا نہیں ہوسکتے تھے، کیونکہ وہ غروب ہو گئے، مگر یہ تو ہے خدا، یہ تو بہت چمک دار ہے، بڑا حسین ہے، بڑا جمیل ہے، دنیا بھر کو روشنی دے رہا ہے۔ اس کے بعد وہ بھی غروب ہوگیا، تو کہنے لگے، یہ بھی میرا خدا نہیں ہوسکتا۔

پھر سورج کو دیکھ کر کہنے لگے کہ یہ میرا خدا ہے، اور سب سے بڑا بھی ہے، دیکھو وہ سارے عالم کو اس طرح منور کیے ہوئے ہے کہ ذرہ ذرہ اس سے روشن ہے۔ کہنے لگے "ھٰذَا رَبِّیْ ھٰذَآ اَکْبَرُ" کہ یہ میرا رب ہے، یہ بہت بڑا ہے، لیکن ظاہر بات ہے کہ صبح میں نکلا ہوا سورج شام میں غروب تو ہوتا ہی ہے، جب وہ بھی شام میں غروب ہو گیا تو حضرت ابراہیم نے لوگوں کو سمجھانے کے لیے فرمایا کہ دیکھو یہ بھی خدا نہیں ہے جو ختم ہونے والا ہے، دنیا کی چیزوں پر حالات طاری ہوتے ہیں، حوادث پیش آتے ہیں، اس لیے یہ خدا نہیں ہوسکتے، خدا تو باقی رہنے والا ہے۔ تو یہ

حضرت ابراہیم کی ایک تدبیر تھی مشرکین کو سمجھانے کے لیے کہ ایک اللہ کی عبادت کرو، اسی سے دل لگاؤ۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ عیب فنا ہونے کا تو سب مخلوقات کے اندر ہے کہ سب کے سب فنا کے گھاٹ اترنے والے ہیں۔ مثلاً انسان ہے، کتنے دن جیئے گا؟ آخر کار ختم ہو جائے گا، عورت ہے، کتنے دن جیئے گی، ایک نہ ایک دن مر جائے گی، حسن ہے کب تک رہے گا، کبھی نہ کبھی ختم ہو جائے گا۔

❁ فنا سب سے بڑا عیب، سلیمان بن عبدالملک کا واقعہ:

اس پر ایک واقعہ یاد آ گیا، سلیمان بن عبدالملک کا نام آپ نے سنا ہوگا، بہت بڑا بادشاہ تھا، امیر المؤمنین تھا، جوانی میں اللہ نے اس کو بادشاہت دیدی تھی، بڑا ذی وجاہت بھی تھا اور حسین وجمیل بھی تھا، ایک دن اس نے اپنے آپ کو خوب اچھی طرح سنورا، بنایا، بہترین کپڑے پہنے، عمامہ زیب تن کیا، خوشبوئیں لگایا، بہت ساری چیزوں سے اپنے آپ کو آراستہ پیراستہ کیا، اور خدا کی نوازش سے حسین و خوبصورت بھی تھا۔

اس کے بعد اپنے دربار میں رونق افروز ہوا، اور اپنے آپ پروہ پھولے نہیں سما رہا تھا، سب لوگ دیکھ کر اس کی تعریف کرنے لگے، اتنے میں اس کی ایک باندی آئی جب باندی آئی تو اس نے باندی کو دیکھکر مسکرایا اور پھر اس کے بعد کہا کہ میں کیسا لگ رہا ہوں، تو باندی نے اس کے جواب میں فی البدیہہ عربی میں دو شعر کہے ؎

أَنْتَ نِعْمَ الْمَتَاعُ لَوْ كُنْتَ تَبْقٰى
غَيْرَ أَنْ لَّا بَقَاءَ لِلْاِنْسَانِ

أَنْتَ خِلْوٌ مِّنَ الْعُيُوْبِ وَ مِمَّا
يَكْرَهُ النَّاسُ غَيْرَأَنَّكَ فَانِ

عجیب اشعار کہے اس نے، ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ اس نے بادشاہ سے کہا کہ اے کاش کہ اگر آپ باقی رہنے والے ہوتے تو آپ بہت ہی بہترین چیز تھے، لیکن کیا کروں کہ کسی بھی انسان کو بقاو دوام ہے ہی نہیں، سب فنا ہونے والے ہیں، آپ کے اندر کوئی عیب نہیں ہے، سارے ان عیبوں سے آپ پاک ہیں، خالی ہیں، اور ان سب باتوں سے بھی پاک ہیں جن سے لوگ نفرت کرتے ہیں اور برا سمجھتے ہیں، لیکن ایک عیب ہے آپ کے اندر، وہ یہ کہ آپ فانی ہیں)

دیکھئے! اس باندی نے حقیقت کو سمجھا اور حقیقت کو اس کے سامنے بیان کر دیا کہ آپ میں بڑے کمالات وخوبیاں ہیں مگر یہ کیا کم عیب ہے کہ آپ مرجانے والے ہیں، اگر باقی رہتے تو واقعی عشق کے قابل تھے، دل لگانے کے قابل تھے، محبت کرنے کے قابل تھے، تعلق کرنے کے قابل تھے، لیکن آپ کے اندر فنا کا ایک عیب ایسا ہے جس نے ساری خوبیوں پر پانی پھیر دیا، بس یہ کہنا تھا کہ اس کے اوپر عجیب کیفیت طاری ہوگئی، اسکے بعد اس نے مجلس برخواست کردی، اور باندی کو اپنے کمرہ میں بلایا، اور بلا کر کہا کہ تو نے میرے بارے میں یہ کیوں کہا؟ تو اس نے معذرت کی اور کہا کہ مجھے جو حقیقت سمجھ میں آئی اس کو میں نے بیان کر دیا، اس کے بعد اس نے اس کو انعام بھی دیا اور کہا کہ میری آنکھیں تو نے کھول دیں۔ اسی کے چند دن کے بعد اس کا انتقال ہوگیا، جوان ہی تھا جوانی ہی میں اس کی وفات ہوگئی۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہ دنیا کیسی ہی خوبیوں کی مالک کیوں نہ ہو، لیکن اس کے اندر یہ عیب تو ہے ہی کہ یہ تو فنا ہونے والی ہے۔ سورج سے کیا دل لگانا، چاند سے

کیا دل لگانا، آسمان سے کیا دل لگانا، زمین سے کیا دل لگانا، عورت سے کیا دل لگانا۔ یہ تو دل لگانے کے قابل نہیں، بلکہ دل سے نکالنے کے قابل ہیں، دل لگانے کے قابل اور محبت کرنے کے قابل تو صرف اللہ کی ذات ہے، جس کو کبھی فنا نہیں ہے، جس میں کوئی عیب نہیں ہے، جو "المستجمع لجميع صفات الكمال" (ساری خوبیوں کا جامع) ہے۔

اللہ کی اور غیر اللہ کی محبت کا اجتماع ناممکن، سمنون محبؒ کا واقعہ:

یاد رکھئے کہ جب تک دنیا کی محبت اس دل میں گھسی رہے گی، اللہ تعالیٰ کی محبت بالکل نہیں آسکتی، دو چیزوں میں تضاد ہے، اللہ کی محبت اور غیر اللہ کی محبت میں۔

حضرت سمنون محبؒ بہت بڑے اللہ کے ولی گزرے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک عورت سے نکاح کیا، اس شرط پر کہ وہ دین پر قائم رہے گی، شریعت کے اوپر چلتی رہے گی، نکاح ہو گیا، اس سے مجھے ایک بچی پیدا ہوئی، بچی بڑی پیاری تھی، اس لیے میرا دل اس بچی میں لگ گیا، میں بار بار اس کی طرف دیکھتا اور اسی میں مشغول رہنے لگا، اس بچی کی محبت نے میرے اوپر غلبہ پالیا اور جو اللہ تعالیٰ کی محبت کی کیفیت دل میں پاتا تھا اس میں کمی ہونے لگی، پہلے تو اللہ کی محبت ایسی گھسی ہوئی اور بسی ہوئی تھی کہ جس کی کوئی انتہاء نہیں۔

حضرت سمنون فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ! میں دل کے اندر محسوس کرتا ہوں کہ تیری محبت میں کمی ہورہی ہے، مجھے بتادے کہ یہ کیوں ہورہی ہے۔ کہتے ہیں کہ رات سویا تو خواب کے اندر دیکھا کہ ایک ابر کا سایہ ہے، اس کے اندر بڑی ٹھنڈک معلوم ہورہی ہے اور ایک نورانیت ہے، بہت سارے لوگ اس کے اندر جمع بیٹھے ہیں، میں نے خواب ہی میں کسی سے پوچھا کہ لوگ کیوں بیٹھے

ہیں،اور یہ کون لوگ ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ یہ عشاقِ خداوندی ہیں،عاشقان الٰہی ہیں،اللہ تعالیٰ کی محبت میں چوراور سرشارلوگ ہیں، یہ یہاں پر جمع ہیں، کہتے ہیں کہ میں بھی جا کران لوگوں میں بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا ،تو ایک آدمی آیااور میرا ہاتھ پکڑ کراس نے مجھے باہر کردیا، میں نے کہا کہ بھائی !میں بھی ان لوگوں میں شامل ہوں، میں بھی اللہ سے محبت کرتا ہوں، میں بھی اللہ کی محبت میں سرشار رہتا ہوں، مجھے بھی ان میں بیٹھنے دے،تو وہ کہنے لگا کہ نہیں،تو ان میں داخل نہیں ہے،اس لیے کہ تیرے دل میں تو تیری بچی کی محبت ہے، کہتے ہیں کہ میں نے خواب ہی میں پھر اللہ تعالیٰ سے دعامانگی۔

دعا یہ کی کہ اے اللہ! اگر اس لڑکی کی محبت نے تیری محبت کو میرے دل سے قطع کر دیا ہے تو اس کی مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے،اس لیے اے اللہ! تیری محبت دے کر اس کی محبت کو نکال دے۔ کہتے ہیں کہ میں نے یہ دعا کی خواب ہی میں،تو خواب ہی میں میں دیکھ رہا ہوں کہ عورتوں کے رونے کی آواز آرہی ہے۔اتنے میں میری آنکھ کھل گئی،آنکھ کھلی تو دیکھا کہ واقعی عورتیں رو رہی ہیں، میں نے پوچھا کہ کیا بات ہوگئی؟ تو کہا کہ بچی اوپر چڑھی تھی،ابھی گر کر مرگئی۔

اللہ اکبر! بڑا عبرت ناک واقعہ ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے ایسے عشاق تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے کہا:﴿ وَالَّذِيْنَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾(ایمان والے اللہ سے شدید محبت کرتے ہیں)اس میں ذراسی کمی انہوں نے محسوس کی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ التجاء کی۔

آج ہم لوگ غور کریں کہ ہمارے دل میں کتنے لوگوں کی محبت ہے، بے شمار چیزوں کی محبت ہے،اورصرف محبتیں نہیں ہیں، بلکہ غالب محبتیں ہیں،اللہ کی محبت

کہیں ایک کونے میں پڑی ہوئی ہے،اوراس کا کوئی احساس بھی ہم کونہیں ہورہا ہے،اوراس احساس کے نہ ہونے کی وجہ سے اسکے کوئی آثار بھی ہمارے اوپرمرتب ہوتے دکھائی نہیں دیتے ،اور یہ حضرات ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں چور ہیں، سرشار ہیں،اوراس کے اندرذراسی کمی محسوس ہورہی ہے تواللہ تعالیٰ سے درخواست ہورہی ہے کہ اے اللہ ایسا کیوں؟ اللہ تعالیٰ نے اس کی وجہ بتائی۔

دعاء محبت کی تشریح:

نبی اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے بہت ساری دعائیں مانگی ہیں،ان میں سے ایک دعاء یہ ہے کہ آپ ﷺ دعاء میں فرماتے ہیں ”اَللّٰھُمَّ اجعَلُ حُبَّکَ أَحَبَّ إِلَیَّ مِنُ نَفُسِیُ وَ أَھلِیُ وَمِنَ الُمَاءِ الُبَارِدِ“(اے اللہ! مجھے آپ کی محبت میرے نفس سے بھی زیادہ عطافرما،اورمیرے اہل وعیال سے بھی زیادہ عطافرما،اورٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ محبت عطافرما)(ترمذی:۳۴۹۰)

یہ دعاء ودرخوست محبت ہے، کہ اللہ تعالی سے نبی کریم ﷺ محبت کا سوال کررہے ہیں،مگرسوال کا انداز دیکھئے کہ کس قدرنرالا ہے؟ ہرآدمی کواپنی جان بڑی محبوب ہوتی ہے،اسی لیے اپنی جان کی حفاظت کرتا ہے،اوراپنی جان کے ساتھ بڑااچھا سلوک کرتا ہے، جو جی میں آتا ہےاس کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کواپنی جان محبوب ہے۔اللہ کے نبی ﷺ کہتے ہیں کہ اے اللہ! مجھے میری جان سے بھی زیادہ آپ کی محبت دے دیجئے ،اللہ کے رسول ﷺ کا یہ سوال اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کے نزدیک یہ مطلوب ہے،اوررسول اللہ ﷺ کے نزدیک یہ مطلوب ہے کہ اللہ کی محبت اپنی جان سے بھی زیادہ ہو۔

ظاہر ہے کہ اگر یہ مطلوب نہ ہوتا تو سوال میں اللہ کے نبی ﷺ اس کو کیوں پیش کرتے؟ یہ طلب دلیلِ مطلوبیت ہے۔ لہٰذا اپنی جان سے زیادہ اللہ کی محبت اپنے دل میں سمانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

اس دعاء میں دوسری بات یہ فرمائی: "و أھلی" کہ آپ مجھے اپنی محبت میرے اہل وعیال سے بھی زیادہ دیجئے۔ جیسے جان سے محبت فطری ہے، ایسے ہی اہل وعیال کی محبت بھی فطری ہے، بچوں سے محبت ہوتی ہے، اسی طریقہ پر بیوی سے محبت ہوتی ہے، رشتہ داروں سے محبت ہوتی ہے، اہل خاندان سے محبت ہوتی ہے، ماں باپ سے محبت ہوتی ہے، ان سب لوگوں سے محبت ایک فطری چیز ہے، لیکن ان سب سے زیادہ اللہ کی محبت ہونی چاہئے، دوسروں سے بھی محبت تو ہو، لیکن غلبہ اللہ کی محبت کو ہونا چاہئے۔

اور تیسری بات فرمائی" و من الماء البارد" کہ آپ کی محبت ٹھنڈے پانی کی محبت سے زیادہ دید یجئے، ٹھنڈا پانی بھی اچھا لگتا ہے، ہر آدمی چاہتا ہے کہ ٹھنڈا پانی پئے، موسم سخت ہو گرمی کا ہو، لو چل رہی ہو، دوپہر کا وقت ہو، پسینہ نکل رہا ہو، حلق میں کانٹے پڑ رہے ہوں، ایسے وقت آدمی چاہتا ہے کہ ٹھنڈے سے ٹھنڈا پانی مل جائے۔ اور جب ٹھنڈا پانی پیتا ہے، تو انگ انگ سے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا ہوتا ہے، دل سے اللہ کا شکریہ ادا ہوتا ہے۔

اور رسول اللہ ﷺ کو بھی میٹھا اور ٹھنڈا پانی نہایت مرغوب و پسند تھا، اس لئے آپ کے لئے اس کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ (مشکوۃ: ۱۲۳۳-۱۲۳۴)

یہ اس لیے کہ ٹھنڈا پانی پینے سے اللہ تعالیٰ کا شکر دل سے ادا ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ ٹھنڈا پانی بہت محبوب ہوتا ہے، تو اللہ کے نبی ﷺ کہتے ہیں کہ ٹھنڈے پانی سے

زیادہ اللہ تیری محبت مجھے چاہئے۔اس دعاء سے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ نبی اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی محبت مانگی ہے۔

اس بارے میں اور بھی دعائیں ہیں،ایک دعاء میں یہ الفاظ فرمائے:" اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّکَ أَحَبَّ الْأَشْیَاءِ إِلَیَّ"(اے اللہ! اپنی محبت تمام چیزوں کی محبت سے زیادہ مجھ کو عطا فرما)(حلیۃ الاولیاء:۲۸۲/۸،الحزب الاعظم)

اس میں تمام چیزوں سے زیادہ اللہ کی محبت مانگی ہے، یہاں سب کی سب چیزوں کا ذکر کر دیا، اس میں کچھ بھی نہیں چھوٹا، نہ بیوی، نہ بچے نہ کوئی اور چیز،سب چیزیں اس کے اندر آ گئیں،تو معلوم ہوا کہ اس کی کوشش ہونی چاہئے کہ ہمارے دل میں اللہ کی محبت کو بسالیں اور ساری دنیا اور اس کی چیزوں سے اللہ کی محبت غالب ہو۔

۞ جمال خداوندی:

اللہ تعالیٰ ہی سے سب سے زیادہ محبت کیوں ہو؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کی ذات میں اسباب محبت سب کے سب جمع ہیں اور سب سے زیادہ اس میں پائے جاتے ہیں،وہ اسباب کیا ہیں؟

عام طور پر محبت کا باعث وسبب حسن و جمال ہوا کرتا ہے،لوگ حسن کو دیکھ کر دیوانے ہوجاتے ہیں،جبکہ یہ دنیا کی مختلف چیزوں اور انسانوں کا حسن و جمال ذاتی و خانہ ساز نہیں ہے ،اور نہ تو پائیدار اور باقی رہنے والا ہے ،جب اس حسن فانی و ناپائیدار پر لوگ فدا ہوجاتے ہیں تو اب سوچئے کہ اللہ جل جلالہ کا جمال ذاتی بھی ہے اور باقی بھی،اعلیٰ بھی ہے اور اول بھی،تو کیا اس کے حسن پر فدا نہ ہونا چاہئے؟

بھائیو!اس لیے وہی اس قابل ہے کہ اس سے محبت کی جائے،اس پر اپنی جان

قربان کی جائے۔مولانا حکیم اختر صاحب مدظلہ نے اسی کو اپنے اشعار میں فرمایا ؎

ہزاروں حسن کے پیکر لحد میں دفن ہوتے ہیں
مگر عشاق ناداں مبتلا ہیں خوش گمانی میں
نہ کھا دھوکہ کسی رنگینئ عالم سے اے اختر
محبت خالق عالم سے رکھ اس دار فانی میں

غرض یہ کہ دنیوی چیزوں کا حسن و جمال ختم ہوجانے والا ہے، ناپائیدار ہے، اور اللہ تعالیٰ کا جمال حقیقی بھی ہے، ذاتی بھی ہے اور باقی بھی، لہٰذا دل لگانے اور محبت کرنے کے قابل صرف اللہ کی ذات ہے۔

اللہ تعالیٰ کا جمال کیسا ہوگا؟ اس کا کون اندازہ کرسکتا ہے، پھر وہ جمال بھی بے کیف جمال ہے، جس کا ادراک یہاں ممکن نہیں، البتہ احادیث میں اس کا جو ذکر آیا ہے اس کو پڑھنے سے فی الجملہ اس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

❁ جنت میں دیدار خداوندی:

چنانچہ امام ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث نقل کی ہے، اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب اہل جنت، جنت میں داخل ہوجائیں گے، تو ان کو ایک ہفتہ کی مقدار پر اللہ تعالیٰ کی زیارت کی اجازت ہوگی، اور وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی زیارت کریں گے، اللہ کا عرش ان پر ظاہر ہوگا اور جنت کے باغات میں سے ایک باغ ان کے لیے ظاہر کیا جائے گا، اور اس میں نور کے، لؤلؤ کے، یاقوت کے، زبرجد کے اور سونے اور چاندی کے ممبر رکھے جائیں گے، اور ان میں سے جو سب سے کمتر درجہ کا ہوگا وہ مشک و کافور کے ٹیلہ پر بٹھایا جائے گا۔

اس روایت کے آخر میں ہے کہ جب یہ جنتی مرد اس مجلس سے واپس ہوں گے اور اپنی جنتوں میں اپنی بیویوں سے ملیں گے تو وہ کہیں گی کہ مرحبا، مرحبا، تم پر آج ایک ایسا جمال ہے کہ جب تم یہاں سے گئے تھے تو وہ جمال نہیں تھا، یہ کیا بات ہے؟ مرد جواب دیں گے کہ آج ہم اپنے رب کی زیارت کر آئے ہیں، اس لیے ہم ایسے حسین وجمیل ہو گئے۔(ترمذی:۸۱/۲)

بعض احادیث میں آیا کہ جب اہل جنت جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے پوچھیں گے کہ کیا تم مزید کچھ چاہتے ہو؟ وہ عرض کریں گے کہ اے اللہ! آپ نے ہمارے چہروں کو رونق بخشا، اور ہمیں جنت میں داخل کیا اور نجات عطا فرمائی، پھر اور کیا ہم چاہیں؟ اس پر اللہ تعالیٰ ان کی نظروں سے پردہ ہٹا دیں گے اور وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے، اللہ کے نبی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جنتیوں کو اللہ کے دیدار سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہ ہوگی۔(مسلم:۲۹۷، ترمذی:۲۵۵۲)

ان روایات سے کچھ کچھ اندازہ، اللہ کے جمال کا ہوسکتا ہے کہ وہ کیسا ہوگا کہ جنت کے جنتی، اس جمال کی زیارت سے مشرف ہوں گے تو ان چہروں پر بھی مزید جمال پیدا ہو جائے گا، اور یہ کہ جنت کی ساری محبوب و پسندیدہ چیزیں اپنی جگہ، مگر اللہ کے جمال کی زیارت کا لطف ولذت ہی کچھ اور ہوگا اور سب سے زیادہ محبوب یہی دیدار الٰہی ہوگا۔

❁ کمال خداوندی:

دوسری وجہ کسی سے محبت کی یہ ہوتی ہے کہ اس میں کوئی کمال ہوتا ہے، جیسے اپنے شیخ واستاذ سے لوگ محبت کرتے ہیں کیونکہ ان میں علمی وعملی کمال پایا جاتا ہے۔ اسی

طرح دنیا کے علوم وفنون میں جو ماہر ہوتے ہیں ان سے محبت ان کے کمال ہی کی وجہ سے ہوتی ہے، مگر یہ ظاہر ہے کہ ان تمام کے کمالات فانی اور ناقص ہیں، اس کے باوجود ہمیں اپنے اساتذہ ومشائخ اور دیگر اہل علم وفن سے محبت ہوتی، تو کیا اللہ سے محبت نہ ہونا چاہئے جس کی ذات میں جو کمالات ہیں وہ ذاتی اور باقی ہیں، اور اعلیٰ و اکمل ہیں، وہ کون سا کمال ہے جو خدا تعالیٰ میں نہیں ہے؟ وہ تمام صفاتِ کمالیہ کا جامع ہے، چنانچہ علماء نے اللہ کی تعریف ہی یہ بیان فرمائی ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو تمام صفاتِ کمالیہ کی جامع ہے''، اور اس کا ہر کمال، کمال کو پہنچا ہوا ہے، اس میں کوئی نقص نہیں، کوئی کمی نہیں، کوئی عیب نہیں۔

اس کے علم کو دیکھو، تو وہ غیب وشہادت سب کو برابر حاوی ہے، کوئی ذرہ بھی اس کے علم سے خارج نہیں، اس کی قدرت کو دیکھو کہ تمام ممکنات اس کے زیر تصرف، کوئی چیز اس کے احاطۂ قدرت سے باہر نہیں، ایسی قدرت کا مالک کہ جب کسی شی کو منصۂ شہود پر جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہے تو صرف ''کن'' کہنے سے وہ شی موجود ہو جاتی ہے، اس کی حکمت کو دیکھو کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس سے مستفید ہے، اس لیے ہر چیز کا ایک نظام ہے، ایک قاعدہ واصول ہے، ایک طریق عمل مقرر ہے، زمین وآسمان، شمس وقمر، انسان وحیوان، ہوا و پانی، آگ ومٹی، شجر وحجر، جن وملائک، وغیرہ وغیرہ لاتعداد مخلوقات اس کی قدرتِ قاہرہ اور حکمتِ بالغہ کی آیات ونشانیاں ہیں، کیا کوئی اور ہے جس میں ایسی قدرت ہو، ایسی حکمت ہو، اور ایسا علم اس میں پایا جاتا ہو؟ نہیں، ہرگز نہیں، تو پھر جب ہم معمولی علم وفن اور کمال کی وجہ سے دوسروں سے محبت کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ سے تو سب سے زیادہ محبت ہونی چاہئے ؛ کیوں کہ اس کا کمال ذاتی وباقی ہے، اور اس کا کمال تمام مخلوقات کے کمالات کا منبع ومخزن ہے، اس

لیے وہی حقیقی معنی میں محبوب بننے کے قابل ہے۔

اللہ تعالیٰ کے بے مثال کمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت حکیم سنائی اپنے فارسی قصیدے میں کہتے ہیں ؎

نتواں وصف تو گفتن کہ تو در وصف نہ گنجی
نتواں شرحِ تو کردن کہ تو در شرح نیائی

یعنی تیری تعریف کرنا ممکن نہیں کیونکہ تو کسی کی تعریف کے پیمانے میں سما نہیں سکتا اور تیرے کمالات کی شرح بھی نہیں کی جاسکتی کیونکہ تیرے کمالات کسی کی شرح میں نہیں آسکتے۔

عطا و نوال خداوندی:

یہ ہوئی دوسری وجہ جس کی بنا پر لوگ کسی سے محبت کرتے ہیں، اور یہ وجہ بھی اللہ میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ اب لیجئے تیسری وجہ کہ کسی سے محبت کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ عطاء وبخشش کا معاملہ کرتا ہے، جود وسخاوت سے پیش آتا ہے۔ چنانچہ غلام کو اپنے آقا سے محبت اسی عطا ونوال کی وجہ سے ہوتی ہے، اسی طرح ماں باپ اور محسنین سے محبت اسی وجہ سے ہوتی کہ وہ احسان کرتے ہیں، عطاء وبخشش کرتے ہیں، نوازتے ہیں۔

اب ذرا سوچئے کہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر رحم وکرم کرنے والا، عطا وبخشش کے دریا بہانے والا اور کون ہوسکتا ہے؟ مخلوق کے عطا ونوال اور رحم وکرم کا حال تو یہ ہے کہ جب تک اس کی تابعداری وفرمانبرداری کی جائے، اور اس کی ہمنوائی وہم آہنگی باقی ہو، تب تک یہ سلسلہ بھی جاری رہتا ہے اور جونہی اس کے خلاف کوئی بات صادر و ظاہر ہوتی ہے اس کی داد ودہش کے دروازے بند ہوجاتے ہیں اور اپنے دروازوں

سے دھتکار دیتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت وکرم پر قربان جایئے کہ بندے ہزاروں نافرمانیاں اور سرکشیاں کرتے ہیں، پھر بھی وہ اپنی عطاء وبخشش کے دروازے بند نہیں کرتا، کفار ومشرکین اس کی گستاخیاں کرکے، مزے لیتے ہیں، اس کی تکذیب وتردید کرتے ہیں اور اس کے احکام وقوانین کا مذاق اڑاتے ہیں، مگر ان پر نہ کھانا بند کیا جاتا ہے نہ پانی، نہ ہوا روکی جاتی ہے، نہ روشنی۔ جب کفار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی داد ودہش اور عطا ونوال کا یہ حال ہے تو ماننے والوں پر کیا کچھ اس کی نوازشات وکرم فرمائیاں نہ ہوں گی۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے متعدد جگہ فرمایا ہے کہ اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو ممکن نہیں کہ تم شمار کرلو، ہر آن اس کی نعمتوں کی بارش ہم پر ہو رہی ہے، بلکہ ہمارا وجود خود اس کی عظیم نعمت ہے، غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو اعضاء عطا فرمائے ہیں اور ان میں جو قوتیں ودیعت فرمائی ہیں، کیا کوئی اور یہ دے سکتا ہے؟ ایک گردہ فیل ہو جائے تو تمام ڈاکٹر اور دنیا کی تمام توانائیاں اور قوتیں مل کر بھی ایک گردہ انسان کو فراہم نہیں کر سکتے، اگر کوئی دے گا بھی تو وہ خود اللہ کا بنایا ہوا ہی ہوگا، یا انسان نقل اتارے گا تو وہ بھی اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں کے سہارے اور واسطے سے بنائے گا۔

ایک ایک عضو پر غور کیجئے کہ وہ کیسی قیمتی نعمتیں ہیں، اور بے بدل عطایا ہیں، پھر روزانہ کی ضروریات وحاجات کا کس طرح انتظام فرمایا ہے، اور کتنی اور کیسی نعمتیں عطا فرمائی ہیں؟ کیا اس لحاظ سے بھی کوئی اور اس کا ہمرتبہ وہم پلّہ ہوسکتا ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں تو پھر کیا وہی اس بات کا مستحق نہیں ہوگا کہ اسی سے محبت کی جائے اور وہی ہمارا حقیقی محبوب ہو؟

غرض یہ کہ ہر لحاظ سے اللہ تعالیٰ ہی کی ذات اس لائق ہے کہ اس سے محبت کی جائے، اور سب سے زیادہ محبت کی جائے۔

محبت الٰہیہ کا ثمرہ ایمانی حلاوت:

بزرگو اور دوستو! جب اللہ و رسول کی محبت دل میں جاگزیں ہوتی ہے اور دنیا کی تمام محبتوں پر وہ غالب ہوتی ہے تو اس کے صلہ وثمرہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایمانی حلاوت نصیب ہوتی ہے۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول علیہ السلام نے فرمایا کہ:

''تین باتیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں وہ پائی جائیں وہ ایمان کی حلاوت (چاشنی) پائے گا: ایک یہ کہ اس کو تمام چیزوں سے زیادہ اللہ و رسول محبوب ہوں، دوسرے یہ کہ کسی بندے سے محبت صرف اللہ کے لیے کرے اور تیسرے یہ کہ کفر کی طرف لوٹنا اس کو اس قدر ناگوار ہو جیسے کہ آگ میں ڈالا جانا ناگوار ہوتا ہے۔ (مشکوۃ:۱۲)

حضرت نبی عربی محمد مدنی علیہ الصلوۃ والتسلیم کا ارشاد ہے کہ تین باتیں ایسی ہیں کہ جس کسی میں وہ پائی جائیں اس کو حلاوت ایمانی نصیب ہوگی، ان تین میں سے ایک بات یہ فرماتے ہیں کہ اللہ و رسول کی محبت تمام چیزوں کی محبت پر غالب ہو، جس کو یہ دولت حاصل ہو جائے اس کو ایمان کی حلاوت نصیب ہوگی یہ اللہ و رسول کی محبت کا صلہ وثمرہ ہے۔ حلاوت مٹھاس کو کہتے ہیں اور عام علماء نے فرمایا کہ اس سے روحانی ومعنوی مٹھاس مراد ہے۔

یہاں مجھے ایک بات اس کی تشریح میں یاد آ گئی کہ علامہ ابن حجر عسقلانیؒ جو بہت

بڑے محدث گزرے ہیں انہوں نے شیخ محی الدینؒ سے نقل کیا ہے کہ حلاوتِ ایمان سے مراد تین باتیں ہیں: ایک یہ کہ نیکی وعبادت سے لذت پائے، دوسرے یہ کہ دین کی خاطر مشقت وتکلیف کا برداشت کرے، اور تیسرے یہ کہ دین کو دنیوی سازو سامان کے مقابلے میں ترجیح دے۔(فتح الباری:۶۱/۱)

شیخ محی الدینؒ نے حلاوت کی جو تفسیر وتشریح کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کو ظاہری مٹھاس پر نہیں، بلکہ معنوی وروحانی مٹھاس پر محمول فرمایا ہے چنانچہ مشاہدہ بھی ہے کہ اولیاء اللہ جو اللہ ورسول کی محبت میں سرشار ہوتے ہیں، وہ عبادت وطاعت میں ایک کیف وسرور پاتے ہیں اور دین کے لیے ہزار ہا قسم کے مصائب وشدائد برداشت کرتے ہیں اور اس میں بھی ان کو ایک لذت محسوس ہوتی ہے نیز وہ دنیوی ومادی سازوسامان اور نفسانی خواہشات پر دین کو ترجیح دیتے اور دین کی خاطر ہر خواہش ولذت کو اور دنیوی آسائش وراحت کو قربان کر دیتے ہیں اور اس میں بھی ان کو حلاوت محسوس ہوتی ہے۔

طاعت کی لذت-ایک صحابی کا واقعہ

اللہ ورسول کی محبت جن لوگوں کو حاصل ہوتی ہے، ان کو نیکی وطاعت میں کیسا لطف وکیف محسوس ہوتا ہے اور وہ اس سے کیسے سرشار ہوتے ہیں، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے کہ ایک دفعہ غزوہ ذات الرقاع میں رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ نکلے، راستے میں ایک جگہ آپ نے پڑاؤ ڈالا اور حضرات صحابہ سے پوچھا کہ کون آدمی ہمیں پہرہ دے گا؟ اس کے جواب میں دو حضرات نے اپنا نام پیش کیا، ایک انصاری صحابی تھے جن کا نام عباد بن بشر تھا اور دوسرے مہاجر صحابی تھے جن کا نام عمار بن یاسر تھا، سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا کہ تم دونوں وادی کے اوپر والے حصے

پر رہنا، چنانچہ یہ دونوں صحابہ وہاں پہنچے، پھر مہاجر صحابی تو لیٹ گئے اور انصاری صحابی عباد نے اللہ تعالیٰ کے سامنے راز و نیاز شروع کر دیا اور نماز میں مشغول ہو گئے، غالباً ان حضرات نے یہ طے کر لیا ہوگا کہ آدھی رات ایک شخص پہرہ دے اور پھر آدھی رات دوسرا پہرہ داری کرے۔ جب حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ نماز میں اللہ تعالی سے سرگوشی و مناجات میں مشغول ہو گئے تو ایک مشرک آدمی آیا اور چھپ کر ان پر تیر برسانے لگا، یہ صحابی برابر نماز میں مشغول رہے، اس مشرک نے تین تیران پر چلائے ،ان صحابی نے تیر تو نکال کر پھینک دیا، مگر نماز نہیں توڑی ، برابر نماز میں رہے اور رکوع وسجدہ کر کے جب نماز سے فارغ ہوئے تو ان صحابی کو بیدار کیا جو بازو لیٹے ہوئے تھے، انہوں نے اٹھ کر دیکھا تو یہ لہولہان ہیں، عرض کیا کہ سبحان اللہ! تم نے مجھے پہلے ہی کیوں نہ جگا دیا، فرمایا کہ میں ایک سورت پڑھ رہا تھا، میں نے نہیں چاہا کہ اس کو ادھورا چھوڑ دوں ۔بعض روایت میں ہے کہ ان صحابی نے فرمایا کہ خدا کی قسم اگر رسول اللہ ﷺ نے مجھے حفاظت و نگرانی کی ذمہ داری نہ دی ہوتی تو میں قتل ہو جاتا، مگر اس سورت شریفہ کو ادھورا نہ چھوڑتا۔(ابوداود:۱۹۸،مسند احمد:۳۴۳/۳، صحیح ابن حبان:۳۷۵/۳، صحیح ابن خزیمہ:۲۴/۱، مستدرک:۲۵۸/۱)

اللہ اکبر! کیا لذت ولطف تھا جو ان صحابی کو تلاوت کلام اللہ اور نماز میں محسوس ہو رہا تھا جس کی بنا پر وہ اپنے آپ کو ہلاک کر لینے پر بھی راضی ہیں، مگر تلاوت و نماز کو قطع کرنے پر راضی نہیں۔ یہ حلاوت ایمانی ہے جو اللہ و رسول کی محبت کا صلہ وثمرہ ہے۔

حضرت عمارؓ اور شوقِ شہادت:

حضرت عمار بن یاسر مشہور صحابی ہیں، جنگِ صفین میں ان کی شہادت ہوئی۔ شہادت سے قبل نہایت بے چینی سے شہادت کا انتظار کر رہے تھے اور فرما رہے تھے

کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے بتایا تھا کہ میں اسی دن شہید ہوں گا، مگر کیا بات ہے کہ میں اب تک زندہ ہوں؟ نیز فرمارہے تھے کہ آج میں جبار یعنی اللہ تعالیٰ سے ملوں گا، اور حور عین سے شادی کروں گا اور میرے محبوب لوگوں حضرت محمد ﷺ اور ان کی جماعت سے ملوں گا پھر لڑتے لڑتے شہید ہوگئے۔ (حیاۃ الصحابہ:۶۸۴/۱)

غور کیجئے کہ حضرت عمار کو شہادت کی طلب اور جستجو اور اس کا انتظار اللہ ورسول کی محبت ہی کی وجہ سے ہوا اور اسی محبت خداوندی ومحبت رسول نے موت کو ان کے لیے لذیذ ولطف آمیز چیز بنادیا تھا۔

غرض یہ کہ اس حدیث میں مراد لذت وحلاوت روحانی ہے جو اللہ ورسول کی محبت غالبہ وشدیدہ کے صلہ میں ایک مومن کو نصیب ہوتی ہے۔

حلاوتِ ایمانی کی دوسری تفسیر:

مگر بعض علماء نے فرمایا کہ روحانی ومعنوی لذت وحلاوت تو ملتی ہی ہے، اس کے ساتھ حسی حلاوت ومٹھاس بھی ملتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے کہ حلوہ وشکر ومٹھائی کھانے سے انسان کو حسی طور پر اس کی حلاوت ومٹھاس معلوم ہوتی ہے۔

چنانچہ علامہ علی القاریؒ شرح مشکوۃ میں ایک دوسری حدیث پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ابن حجرؒ نے کہا کہ ایمان کی لذت ومزہ سے مراد حسی ومعنوی دونوں طرح کی لذت ومزہ ہے۔ (مرقات:۷۶/۱)

معلوم ہوا کہ بعض حضرات اس جگہ مٹھاس ولذت سے حسی ومعنوی دونوں طرح کی حلاوت ولذت مراد لیتے ہیں۔ واقعی جو عشق محبت الٰہی سے چور ہوتا ہے اس کو کبھی حسی طور پر بھی اللہ ورسول کے نام میں حلاوت معلوم ہوتی ہے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ ایسے ہی اولیاء اللہ میں سے تھے، چنانچہ خود ہی فرماتے ہیں ۔

اللہ اللہ ایں چہ شیریں است نام
شیرو شکر می شود جانم تمام

(یعنی یہ فرماتے ہیں کہ یہ ''اللہ اللہ'' کس قدر میٹھا نام ہے کہ اس نام سے میری پوری جان ہی دودھ اور شکر ہو جاتی ہے)

یعنی میں دودھ اور شکر کی سی مٹھاس اپنے اندر پاتا ہوں۔ایک اور مقام پر مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ۔

نامِ اُو چوں برزبانم می رود ہر بنِ موازعسل جوئے شود

(یعنی جب اللہ پاک کا نام میری زبان پر جاری ہوتا ہے تو میرے بال بال سے شہد کی نہریں جاری ہو جاتی ہیں)

یہ حلاوت وشیرینی جو اللہ پاک کے نام پاک سے محسوس ہو رہی ہے اللہ کی محبت کا نتیجہ ہے۔غرض یہ کہ جب بندہ اللہ ورسول کی محبت میں سرشار ہوتا ہے تو اس کو حلاوت ایمانی کی عظیم دولت حاصل ہوتی ہے۔

ایک صحابی کی اللہ تعالیٰ سے محبت:

ایک صحابی کا واقعہ ہے کہ چند صحابہ کو ایک علاقہ میں جانا پڑا تو وہاں کے بادشاہ نے ان کو گرفتا کرنے کا حکم دیا، اس کے فوجیوں نے پکڑ کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا، بادشاہ عیسائی تھا، اس نے کہا کہ تم عیسائی بن جاؤ، انہوں نے کہا کہ ہم عیسائی نہیں بنتے ، ہم تو مسلمان ہیں، ایک اللہ کو ماننے والے ہیں، ہم اسی ایک اللہ کا سبق ساری دنیا کو سکھانے کے لیے نکلے ہیں۔

اس نے کہا کہ یا تو تمہیں میری بات ماننی ہوگی یا نہیں تو میں تمہارے ساتھ سخت سلوک کروں گا۔ انہوں نے کہا کہ آپ کی مرضی جو چاہیں آپ کریں، لیکن ہم تو اپنے دین سے اور اپنے اللہ سے پھرنے والے نہیں۔

قرآن کریم میں ایک جگہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَه الخ﴾ (اے مسلمانو! تم میں سے کوئی اگر دین سے پھر جائے تو اللہ دوسری قوم کو پیدا کر دے گا، جو اللہ سے محبت رکھے گی، اللہ ان سے محبت رکھے گا)

معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کو ایسی قوم پسند ہے، ایسے مسلمان پسند ہیں جو اللہ کی محبت میں چور ہوں، سرشار ہوں، اس لیے اس کا ذکر کیا کہ تم پھرنا چاہو تو پھر جاؤ، ہمیں کوئی پرواہ نہیں، ہم دوسری قوم کو پیدا کریں گے جو ہم سے محبت کرنے والی ہوگی، اور پھر اس کے نتیجے میں ہم بھی اس سے محبت کریں گے۔

تو وہ صحابہ کرام کہنے لگے کہ تو جو چاہے کر، ہم تو پھرنے والے نہیں، تو اس نے اپنے خادموں کو حکم دیا کہ ایک کڑھائی میں تیل ڈالو اور نیچے سے آگ جلاؤ۔

چنانچہ بہت بڑی کڑھائی میں تیل ڈالا گیا، اور نیچے سے آگ جلائی گئی اور خوب زبردست طریقہ پر اس تیل کو پکایا گیا، جب وہ بالکل پک گیا اور کھولنے لگا تو اس نے ان دو حضرات میں سے پہلے ایک صحابی کو اٹھا کر اس میں ڈالنے کا حکم دیا۔ جب ان صحابی کو اٹھا کر اس میں ڈالا گیا تو وہ کباب کی طرح اس میں جل بھن گئے، کھولتا ہوا تیل تھا اور تپ رہا تھا اور پکا ہوا تھا، بس یوں ڈالا اور ان کی جان نکل گئی، ختم ہو گئے۔

اس کو دیکھ کر جو دوسرے صحابی تھے وہ رونے لگے، بادشاہ نے یہ سمجھا کہ شاید ان کا دل کچھ نرم ہوگیا ہے، اب یہ میری بات مان لیں گے، لہذا ان سے کہا کہ دیکھو تمہارا بھی یہی حشر ہوگا، اگر تم نے میری بات نہیں مانی، اس لیے میری بات مان لو اور رونے کے بجائے میری بات مان کر اپنی جان کی تم بچالو۔ وہ صحابی کہنے لگے کہ تجھے دھوکا ہو رہا ہے، میں اس لیے نہیں رو رہا ہوں کہ میں ان کی جان کو یوں نکلتے ہوئے رہا ہوں، یہاں مجھے کوئی خوف اور کوئی دہشت اور کوئی وحشت نہیں ہو رہی ہے، بلکہ میں تو اس لیے رو رہا ہوں کہ میں نے دیکھا کہ جوں ہی ان صحابی کو اس تیل میں ڈالا گیا ذرا سی دیر میں ان کی جان نکل گئی، تو میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے بھی تو اس میں ڈالے گا تو میری بھی اسی طرح جان نکل جائے گی، پھر میرے پاس اللہ کی محبت میں قربانی دینے کے لئے کوئی دوسری جان نہیں ہوگی، اس لیے میں رو رہا ہوں کہ ایک ہی جان ہے اور کہنے لگے کہ اگر میرے پاس سو جانیں ہوں تو میں یہ خواہش کروں گا کہ بار بار میری جان کو اس میں ڈالا جائے، اور میں سو مرتبہ اللہ کی محبت میں قربان ہو جاوں۔ (حیاۃ الصحابۃ: ۱/۲۴۷)

اللہ اکبر! کیا محبت تھی اللہ سے، کیسا عشق تھا صحابہ کا، کیا دنیا کا کوئی عاشق محبت کی ایسی مثال اور نظیر پیش کر سکتا ہے؟ حدیث میں بھی آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، میں یہ چاہتا ہوں کہ اللہ کے راستے میں مجھے قتل کیا جائے، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاوں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاوں، پھر زندہ کیا جاؤں''۔ (بخاری: ۲۶۴۴، معجم اوسط: ۸/۳۳۳، مصنف عبد الرزاق: ۵/۲۵۴)

یہ اللہ کے راستے میں مرنا اللہ کی محبت میں مرنا ہے، جب یہ محبت غالب ہوتی

ہے تو اس کا یہ حال ہوتا ہے۔

بلکہ جو اس راہ میں آتا ہے اس کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے راستے میں مروں اور شہید ہو جاؤں، میں نے اپنی ایک نظم میں یہ شعر کہا ہے جو اسی حقیقت کی غمازی کرتا ہے:

عشق حق میں مرنا ہی قرب حق کا رستہ ہے
شوق گر ہو مرنے کا، رکھ قدم سفینے میں

جی ہاں! جس کو اللہ کے راستے میں مرنا ہے وہی اس راہ میں قدم رکھے گا، جس کو جینا ہو، عیش وراحت میں رہنا ہو اس کو اس راہ سے کوئی تعلق نہیں۔

حضرت ابراھیم علیہ السلام کی اللہ تعالی سے محبت:

میں نے حضرت مولانا ذوالفقار احمد صاحب دامت برکاتہم کی بعض کتابوں میں پڑھا ہے کہ حضرت ابراھیم خلیل اللہ علیہ السلام ایک مرتبہ بکریاں چرا رہے تھے، راستہ میں ایک آدمی اللہ تعالی کی محبت میں یہ تسبیح پڑھتا ہوا جا رہا تھا: "سبحن الملك القدوس سبحن ذى العزة والهيبة والكبرياء والجبروت" حضرت ابراھیمؑ کو یہ جملے بڑے اچھے لگے، اور ظاہر بات ہے کہ جس سے محبت ہوتی ہے، اس کے ذکر سے دل کو لذت ملتی ہے، اور دل اس کے لئے بے قرار ہو جاتا ہے۔

لہٰذا حضرت ابراھیمؑ نے اس آدمی سے درخواست کی کہ وہ اللہ کی تعریف کے یہ جملے ایک بار دہرائے تو اس نے کہا کہ میں دوبارہ پڑھوں گا تو آپ کیا دینگے؟ حضرت ابراھیمؑ نے فرمایا کہ آدھی بکریاں دیدوں گا، اس نے وہ تسبیح دوبارہ پڑھ دی اور آپ نے اپنی آدھی بکریاں اس کو دیدیں، مگر جب آپ نے ان جملوں کو سنا تو محبت خداوندی سے اور زیادہ بے قرار ہو گئے اور اس سے ایک بار پھر پڑھنے کی درخواست کی، تو اس

نے پوچھا کہ اب کے پڑھوں تو کیا دو گے؟ حضرت ابراھیمؑ نے فرمایا کہ بقیہ آدھی بکریاں بھی دیدوں گا، تو اس نے پھر ان جملوں کو پڑھ دیا اور آپ نے باقی بکریاں بھی اس کو دیدیں، مگر ابراھیمؑ کی پیاس نہیں بجھی، آپ نے اس سے پھر پڑھنے کے لئے فرمایا، تو اس نے کہا کہ اب تو آپ کی ساری بکریاں ختم ہو گئی ہیں، اب پڑھوں گا تو کیا دو گے؟ حضرت ابراھیمؑ نے فرمایا کہ جی ہاں! بکریاں تو ختم ہو گئیں اور کوئی چیز میرے پاس دینے کو نہیں ہے، مگر خود میری ذات تو موجود ہے، اور آپ کو بھی کوئی بکری چرانے والا چاہیئے، اس لئے ایک بار اور پڑھ دیجئے اور اس کے بدلے میں میں آپ کا غلام بن جاوں گا، آپ مجھ سے ان بکریوں کو چرانے کا کام لے لیں۔

یہ سنکر اس آدمی نے کہا کہ دراصل میں اللہ کا فرشتہ ہوں، تمہارا امتحان لینے آیا تھا کہ آپ کو اللہ سے محبت کتنی ہے؟ یہ میں دیکھنا چاہتا تھا، آپ کامیاب ہو گئے، یہ لیجئے آپ کی بکریاں۔

اللہ اکبر! کیا عجیب محبت تھی! کیسا عشق تھا! کہ ایک بار اللہ کا نام لینے اور اس کی تسبیح بیان کرنے پر پہلے تو ساری بکریاں دیدیں، پھر خود اپنی ذات کو غلامی کے لئے پیش کر دیا۔

❁ محبت کا معاملہ غیرت سے متعلق ہے:

الغرض اللہ سے محبت ایک عظیم دولت ہے، اور اسلام میں اس کو مختلف پیرایوں میں واضح کیا گیا ہے، ہاں! مگر ایک بات یاد رکھئے کہ اللہ تعالی سے محبت رکھنا فرض ہے، اس کے باوجود اللہ تعالی نے محبت کرنے کا ہمیں کہیں حکم نہیں دیا ہے، قرآن میں آپ کہیں بھی نہیں دکھا سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہو کہ اے میرے بندو! مجھ

سے محبت کرو، جس طرح اللہ تعالیٰ نے دوسری باتوں کا حکم قرآن پاک میں دیا اس طرح اللہ سے محبت کرنے کا حکم کہیں نہیں دیا ہے:

مثلاً قرآن میں تقویٰ کا حکم ہے: ﴿ یاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوااللّٰہَ ﴾ (اے مومن بندو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو)۔

اسی طرح نماز کا حکم ہے: ﴿اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ ﴾ (نماز قائم کرو)، کہیں زکاۃ کا حکم فرمایا: ﴿اٰتُوا الزَّکٰوۃَ ﴾ (زکوۃ ادا کرو) وغیرہ۔

لیکن کہیں یہ نہیں فرمایا کہ اے میرے بندو! مجھ سے محبت کرو۔ وجہ یہ ہے کہ محبت کا معاملہ غیرت سے متعلق ہے، محبت کے ساتھ غیرت لازم ہے، اور جہاں یہ مسئلہ ہوتا ہے وہاں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تم میرے سے محبت کرو۔ دنیا میں کسی معشوق کو دیکھا آپ نے کہ وہ کہتا ہو کہ میں اس قابل ہوں کہ تم میرے سے محبت کرو، کوئی نہیں کہتا، جب دنیا کا ادنی معشوق بھی خود سے محبت کرنے کسی کو نہیں کہتا اور اس کو اس بات سے غیرت آتی ہے تو اللہ تعالیٰ تو سب سے بڑے غیور ہیں، وہ کیسے حکم دے سکتے ہیں؟ اس لئے اللہ نے کہیں حکم نہیں دیا کہ تم مجھ سے محبت کرو، بلکہ جہاں بھی فرمایا وہاں ایک خبر کی حیثیت سے فرمایا، جیسے ایک جگہ ہے:

﴿ وَالَّذِیْنَ آمَنُوْاْ أَشَدُّ حُبّاً لِّلّٰہِ ﴾ (جو لوگ ایمان والے ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے شدید محبت کرتے ہیں)

لہٰذا تم بھی ایمان والے ہو تو مجھ سے محبت کرو، میں نہیں کہتا کہ تم میرے سے محبت کرو، بلکہ جو ایمان والے ہوتے ہیں وہ محبت کرتے ہیں، امر کا صیغہ نہیں فرمایا، بلکہ جملہ خبریہ سے خبر دی کہ جو ایسے ہوتے ہیں وہ ایسا کرتے ہیں، اب اگر تم بھی ایسے ہو تو تم بھی ایسا ہی کرو، اگر تم ایسے نہیں ہو تو ایسا نہ کرو، تمہاری مرضی کی بات

ہے،اس لیے فرمایا کہ جو ایمان والے ہوتے ہیں وہ اللہ تعالی سے محبت کرتے ہیں۔

محبت الٰہیہ کے آثار:

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ اللہ تعالی سے محبت کرنا اسلام میں مقصود ہے بلکہ مقصود اعظم ہے تو اب یہ بھی دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے آثاراوراس کے لوازمات کیا ہیں؟ اللہ کی محبت کی علامتیں کیا ہیں؟ تاکہ اس کی روشنی میں ہم یہ طے کریں کہ ہمارے دلوں میں اللہ کی محبت ہے یا نہیں ہے؟

کیونکہ محبت کا دعوی تو سب کرتے ہیں مگر جب اس دعوے کی دلیل کا مطالبہ ہوتا ہے تو بہت کم لوگ اس میں کامیاب ہوتے ہیں،اور اکثر تو اس دعوے میں جھوٹے ہی نکلتے ہیں۔آج کے دور میں بالخصوص غلط قسم کے پیروں اور جھوٹے شیوخ کا ایک سلسلہ دیکھائی دیتا ہے، جو محبت الٰہیہ کا دم بھرتے ہیں،مگر ان کی حالت یہ ہے کہ اللہ کے احکام کو مسلسل توڑتے رہتے ہیں،اور گناہوں میں ملوث رہتے ہیں،اور عوام الناس کو دھوکہ دینے کے لئے یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم پہنچے ہوئے ہیں،اس لئے ہمارے سے احکام معاف ہوگئے۔لہذا یہ بات اچھی طرح یادرکھو کہ کوئی بھی شخص اللہ و رسول کی محبت کا دعوی کرے تو اس کو اس کے آثار ولوازمات سے پہچاننا چاہئے۔

پہلی علامت اطاعت خداوندی:

اب سنو کہ محبت حق کے آثار کیا ہیں؟ سب سے بڑی اورسب سے بھاری علامت اللہ تعالیٰ کی محبت کی اطاعت ہے،اگرآدمی خدا کا مطیع نہیں ہے، فرمانبردار نہیں ہے،اللہ کے احکام پر نہیں چلتا ہے،من مانی زندگی گزارتا ہے تو اللہ تعالی کی محبت کبھی اس کے دل میں پیدا نہیں ہوسکتی۔

اور یاد رکھئے کہ اللہ کی اطاعت اور اس کے احکام کی فرمانبرداری کے دو حصے ہیں: ایک حصہ اوامر پر چلنے کا اور دوسرا حصہ معاصی سے بچنے کا یعنی ایک تو وہ احکامات ہیں جن کا اللہ نے ہمیں آرڈر دیا ہے، جن کا حکم دیا کہ تمہیں یہ کام کرنا ہے، جیسے نماز پڑھنا ہے، روزہ رکھنا ہے، زکوۃ دینا ہے، حج کرنا ہے، فلاں کام کرنا ہے، یہ کہلاتے ہیں اوامر۔ان سارے اوامر کو مان کر زندگی گزارنا ایک حصہ ہے اللہ کی اطاعت کا۔

اور دوسرا حصہ ہے اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ جتنے کام ہیں ان سب کاموں سے اپنے آپ کو بچائے، اس کو کہتے ہیں اجتناب عن المعاصی یعنی معصیتوں سے بچنا۔ یہ بھی اللہ کی اطاعت میں داخل ہے، اس لیے کہ اللہ کی اطاعت اگر ہم صرف یوں کرلیں کہ نماز کا وقت آیا تو نماز پڑھ لیا، لیکن جب گناہ سے بچنے کا وقت آیا تو بچنے کے لیے تیار نہیں تو اللہ کی پوری اطاعت نہیں ہوگی۔

بلکہ ایک بزرگ کی بات سناتا ہوں، انہوں نے فرمایا کہ گناہوں سے بچنا اصل طاعت ہے، اصل ولایت ہے، اس لیے کہ نیکی کرلینا تو نیک و بد سب کے یہاں مشترک ہے، فاسق وفاجر بھی کرلیتے ہیں، نیکی اچھے بھی کرلیتے ہیں اور برے بھی کرلیتے ہیں، نماز تو شرابی بھی پڑھ لیتا ہے، زناکار بھی پڑھ لیتا ہے، الٹا سیدھا کرنے والا بھی پڑھ لیتا ہے۔تو یہ نیکی کا کرنا اچھائی وخوبی تو بہرحال ہے، لیکن معیارِ ولایت نہیں ہے، لیکن معیارِ ولایت کیا ہے؟ معیارِ ولایت ہے گناہوں سے بچنا، جس کا نام ہے تقویٰ۔اسی لیے قرآن کریم نے فرمایا:

﴿ اِنْ اَوْلِیَاءُہٗ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ ﴾ (بچنے والے ہی دراصل اللہ کے ولی ہیں)

لہٰذا جو اللہ کا ولی بننا چاہے، جو ولایت کا درجہ پانا چاہے، تو اس کے لیے ضروری

ہے کہ گناہوں سے بچے۔ ہاں اس کے ساتھ اطاعت بھی یعنی نیکی بھی کرنا ہے۔ اس طرح دونوں کا جوڑ ہے، آپس میں گہرا ربط ہے، ایک آدمی نماز تو پڑھ لیتا ہے روزہ تو رکھ لیتا ہے، زکوۃ تو دیدیتا ہے، اورنیکیاں کرلیتا ہے، لیکن جہاں گناہ سے بچنے کا نمبر آتا ہے نہیں بچتا تو یہ اللہ کا ولی قیامت تک نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ جو بھی اللہ کا ولی ہوگا وہ اطاعت بھی کرے گا اور گناہوں سے بھی بچے گا۔

❁ اللہ کے ولی کو کیسے پہچانیں: ایک واقعہ:

کسی آدمی کے بارے میں آپ کو جانچ کرنا ہے کہ یہ اللہ کا ولی ہے یا نہیں؟ تو دیکھئے کہ اطاعت اس کے اندر ہے تو وہ اللہ کا ولی ہے، اگر اطاعت اس کے اندر نہیں ہے تو وہ اللہ کا ولی کبھی نہیں ہوسکتا۔ بہت سارے لوگ ہوتے ہیں، جن کو لوگ پیر سمجھ کر ان سے بیعت بھی ہوجاتے ہیں اوران کے ایسا حلقہ بگوش ہوجاتے ہیں کہ اللہ کو بھی بھول جاتے ہیں، رسول کو بھی بھول جاتے ہیں، لہذا اس معیار کو سامنے رکھ کر ایسے لوگوں کو آپ جانچ سکتے ہیں کہ یہ اللہ کے ولی ہوسکتے ہیں یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ جب محبت خداوندی کی یہ پہلی علامت ہی ان میں نہیں ہے تو یہ اللہ کے ولی کیسے ہو سکتے ہیں؟

ہاں شیطان کے ولی ودوست ہو سکتے ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جیسے اولیاء اللہ کا ذکر کیا ہے اولیاء الشیطان کا بھی ذکر کیا ہے۔

معلوم ہوا کہ ولی دوقسم کے ہوتے ہیں: ایک ولی اللہ ہوتے ہیں، ایک ولی الشیطان ہوتے ہیں، جو اللہ کا ولی ہوتا ہے وہ اطاعت گزار ہوتا ہے، اور جو اللہ کا ولی نہیں ہوتا وہ شیطان کا ولی ہے، وہ شیطان کو خوش کرنے کے لیے خدا کی نافرمانی کرتا رہتا ہے۔

ایک بزرگؒ کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ان کے شہر میں ایک بزرگ کے آنے کی خبر پھیلی، لوگ ان سے ملنے جا رہے تھے تو وہ بزرگ بھی اپنے شاگردوں کے ساتھ ان سے ملنے کے لئے نکلے، جب وہاں پہنچے تو وہ صاحب وضو کر رہے تھے، جانے والے بزرگ دور ہی سے کھڑے ہو کر ان کو دیکھ رہے تھے، جب وہ وضو سے فارغ ہو گئے تو یہ بغیر ملاقات ہی واپس جانے لگے، ملاقات نہیں کی، شاگردوں نے پوچھا حضرت! آپ ملاقات کرنے آئے تھے اور بغیر ملاقات کے جا رہے ہیں، کیا بات ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ میں ان کے وضو کے طریقہ کو دیکھ رہا تھا جو خلاف سنت تھا، جسے وضو کی سنتیں معلوم نہ ہوں وہ اللہ کا ولی کیسے ہو سکتا ہے؟

دیکھئے صرف خلاف سنت وضو کرنے کی وجہ سے اللہ والا ماننے تیار نہیں، اور ہم ہیں کہ گناہگاروں کو بھی پیر سمجھتے ہیں۔

سب سے بڑی کرامت، ایک واقعہ:

اسی لئے بزرگوں نے فرمایا کہ سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ احکام خداوندی اور سنت نبوی کا اہتمام کیا جائے، اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا جو میں نے مرشدی حضرت اقدس شاہ مسیح اللہ خان صاحبؒ سے بارہا سنا ہے کہ ایک شخص نے حضرت جنید بغدادیؒ کی شہرت سنی تو ان کی خدمت میں پہنچا اور ان کی خانقاہ میں دس سال رہا، ایک دن آ کر حضرت سے کہا کہ حضرت میں واپس جانا چاہتا ہوں، حضرت نے فرمایا کہ تم دس سال تک جو یہاں رہے، اس کا کیا مقصد تھا اور کیا وہ مقصد تم کو حاصل ہو گیا؟ اس نے کہا کہ میں اس لئے آیا تھا کہ میں نے لوگوں سے آپ کا ذکر سنا تھا کہ آپ ولی اللہ ہیں، تو میں نے یہ سوچا کہ آپ سے بڑی بڑی کرامتیں ہوتی ہوں گی،

لہٰذا آپ کی خدمت میں رہنے آیا تا کہ آپ کی کرامت دیکھوں، مگر اب اس لئے جارہاہوں کہ میں نے آپ سے اس عرصہ میں ایک کرامت بھی نہیں دیکھی۔

یہ سن کر حضرت جنید بغدادیؒ کو جوش آ گیا اور فرمایا کہ اچھا بتاؤ، تم نے دس سال کے عرصہ میں مجھے کبھی خلاف سنت کوئی کام کرتے دیکھا ہے؟ اس نے اب غور کیا اور کچھ دیر کے بعد کہا کہ نہیں، آپ سے کبھی بھی خلاف سنت کوئی کام ہوتے نہیں دیکھا۔ حضرت نے فرمایا کہ جنید کی اس سے بڑی کرامت کیا دیکھنا چاہتے ہو کہ اس نے دس سال میں ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے خدا کو ناراض نہیں کیا، کیوں کہ کوئی کام خلاف سنت نہیں کیا۔

اللہ اکبر! دیکھئے اللہ والے ایسے ہوتے ہیں، جن سے گناہ تو درکنار سنت بھی کبھی ترک نہیں ہوتی، اور یہی اصل کرامت ہے۔

۞ محبت ومخالفت جمع نہیں ہوسکتے:

لہٰذا ولی اللہ وہی ہے جو اللہ کی اور رسول اللہ کی اطاعت کرتا ہو، اور اگر اطاعت نہیں کرتا تو یہ جھوٹا ہے، جیسا کہ حضرت رابعہ بصریہؒ نے فرمایا ہے ؎

تَعۡصِی الۡإِلٰـهَ وَأَنۡتَ تُظۡهِرُ حُبَّهٗ   هٰذا لَعُمۡرِیۡ فِی الۡقِیَاسِ بَدِیۡعٌ
لَوۡ کَانَ حُبُّكَ صَادِقاً لَأَطَعۡتَهٗ   إِنَّ الۡمُحِبَّ لِمَنۡ یُحِبُّ مُطِیۡعٌ

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ تو اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اور اللہ کی محبت کا دعویٰ بھی کرتا ہے یہ بات نہایت عجیب ہے۔ اگر تیری محبت سچی ہوتی تو تو اس کی اطاعت کرتا کیونکہ چاہنے عاشق اپنے محبوب کا مطیع وفرماں بردار ہوتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ جسے کسی سے محبت ہوتی ہے وہ اسکی مخالفت نہیں کرتا کیوں کہ

محبت کے ساتھ معصیت ومخالفت جمع نہیں ہوسکتی، بلکہ اطاعت شعاری وفرمانبرداری ، محبت کے لوازمات میں سے ہے۔اسی لیے قرآن کریم نے فرمایا کہ:

﴿ قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾[آل عمران:۳۱]

(آپ (اے نبی) کہد یجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہوتو میری اتباع کرو، پس اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمائیں گے)

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے اس کی اطاعت وفرمانبرداری ضروری ہے،مگر چوں کہ رسول کی اتباع میں اللہ کی اطاعت مضمر ہے، اس لیے فرمایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرو۔اسی وجہ سے بعض حضرات سلف نے محبت کی تعریف ہی اطاعت سے فرمائی ہے۔

چنانچہ امام زہریؒ نے فرمایا کہ اللہ سے اور رسول سے محبت یہ ہے کہ اللہ ورسول کی اطاعت اور ان کے احکام کی اتباع کی جائے۔(تفسیر قرطبی:۶۰/۴)

اور ابن حجرؒ نے شیخ محی الدینؒ سے نقل کیا کہ اللہ سے محبت، اس کی اطاعت اور ترک مخالفت سے حاصل ہوتی ہے۔(فتح الباری:۶۱/۱)

غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ سے اگر بندہ کو محبت ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ اس کی مخالفت اور معصیت نہ کرے، یہ اصل عظیم ہے، اس کو یاد رکھنا چاہئے۔

ایک صحابی میں جذبۂ اطاعت:

امام ابوداؤدؒ نے ایک انصاری صحابیؓ کا عجیب واقعہ بیان کیا ہے جو انکے عشق رسول پر دلیل ہونے کے ساتھ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اصل محبت وعشق وہی

ہے، جس میں اطاعت وفرمانبرداری ہو اور مخالفت ونافرمانی نہ ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت رسول کریم ﷺ باہر تشریف لے گئے تو راستے میں ایک بلند قبہ بنا ہوا دیکھا اور صحابہ کرام سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ صحابہ کرام نے بتایا کہ یہ قبہ فلاں انصاری شخص کا ہے، حضور یہ سن کر خاموش ہوگئے، پھر وہ انصاری صحابی جن کا وہ مکان تھا، خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور سلام عرض کیا تو آپ نے منہ پھیر لیا اور کئی دفعہ ایسا ہی کیا، اس سے ان صحابی کو آپ کا ناراض ہونا معلوم ہوا، تو صحابہ کرام سے معاملہ پوچھا، صحابہ نے فرمایا کہ حضور نے تمہارا قبہ دیکھا تھا، یہ سن کر صحابی نے سمجھا کہ شاید آپ اسی قبہ کے بنانے سے ناراض ہیں اور واپس گئے اور اپنا مکان منہدم کر دیا اور زمین کے برابر کر دیا، پھر کسی وقت اللہ کے نبی اس طرف سے گزرے اور اس قبہ کو نہ پا کر سوال کیا کہ قبہ کیا ہوا؟ تب صحابہ نے پورا واقعہ آپ کو سنایا۔ (ابوداؤد: ۲/۱۱۷، حدیث: ۵۲۳۷)

یہ ہے سچی محبت اور سچا عشق کہ محبوب کی اتباع واطاعت کرنے کی دھن اور فکر لگی رہے اور اس کو ناراض کرنے والی ادنی سی حرکت بھی گوارا نہ کرے، اور جیسے اللہ کے رسول ﷺ کی محبت کے لیے آپ کی اطاعت لازم ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے بھی لازم ہے۔

اطاعت کے دو درجے:

فرمایا کہ اطاعت کے دو درجے ہیں: ایک ہے فرض درجہ اور ایک ہے نفل، فرائض کا درجہ نوافل سے بڑھا ہوا ہے، جب آدمی اللہ کی محبت حاصل کرنا چاہے، قربت حاصل کرنا چاہے تو اللہ کی محبت وقربت کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ فرائض

کو پوری پابندی کے ساتھ ادا کرے،فرائض کیا ہیں؟ یہ دوکام ہیں ایک تو یہ کہ جتنے کام اللہ نے ضروری قرار دیے ہیں ان سب کو ادا کرے،دوسرے یہ کہ جتنے کاموں سے بچنے کوضروری قرادیا ہے ان سے بچے،جب اس طرح تمام فرائض پر پوری طرح پابندی کرے گا تو ایک درجہ اس کا پار ہو جائے گا،اس کے بعد دوسرا درجہ نوافل کا ہے،جس سے بندہ اللہ کے قریب سے قریب تر ہوتا رہتا ہے۔

حدیث قدسی میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی نے کہا کہ:

” مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیّاً فَقَدْ آذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ وَمَا تَقَرَّبَ إِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ أَحَبَّ إِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ ، وَمَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ إِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی أُحِبُّهٗ “ ۔(بخاری:۶۱۳۷)

(اللہ فرماتے ہیں کہ جو شخص میرے دوست سے عداوت رکھے،میں اس سے اعلان جنگ کرتا ہوں اور بندہ کسی چیز سے جو مجھے پسند ہے میرے اتنا قریب نہیں ہوتا جتنا کہ فرائض سے جو میں نے اس پر فرض کئے ہیں،اور بندہ نوافل کے ذریعہ برابر میرے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو چاہنے لگتا ہوں)

❁ پہلے فرائض ادا کرو اور قضاء کا طریقہ:

اگر آدمی فرائض ہی انجام نہیں دیا تو آگے کا وہ کوئی درجہ پار نہیں کرسکتا،بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا پہلا درجہ ہی پورا نہیں ہوتا،اگلے کی فکر میں لگ جاتے ہیں،نمازیں ہی پوری نہیں ہوئیں،سر پر نمازوں کا بار ہے،اللہ کا قرض ذمہ میں موجود ہے،لیکن باتیں بہت بڑی بڑی کرتا ہے،اگر آدمی کو اگلے مراحل طے کرنا ہے تو سب سے پہلے چاہئے کہ نمازیں اپنی پوری کرے۔

اس لیے میں نے پہلے بھی بتایا کہ جن کے ذمہ نمازیں باقی ہوں وہ تھوڑی تھوڑی کر کے اپنے ذمہ سے اس کو ادا کرتے رہیں، کم از کم ایک ادا نماز کے ساتھ ایک قضا نماز مزید پڑھ لے، کسی کی دس سال کی نمازیں باقی ہیں، کسی کی پانچ سال کی نمازیں باقی ہیں، کسی کی دو چار سال کی نماز باقی ہے، اس کو چاہئے کہ حساب لگائے، حساب لگانے کے بعد اس کو روزانہ ادا کرنا شروع کر دے، اسی طرح کسے کے ذمہ روزے باقی ہیں تو روزوں کی قضاء رکھے، بہت سارے لوگ ہیں جو زکوۃ ہی ادا نہیں کرتے، کئی سالوں کی ان کے ذمہ زکاۃ باقی ہے، ان کو چاہئے کہ حساب لگا کر زکوۃ ادا کریں۔

اس طرح جب فرائض کی ادائیگی ذمہ سے اتر جائے گی تو فرض کا درجہ مکمل ہوگا، اس کے بعد نوافل سے قرب حق کا دوسرا درجہ وہ پا سکتے ہیں۔ بعض لوگ فرائض کے بغیر ہی نوافل کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ مسئلہ سن لیجئے کہ فرائض کے باقی ہوتے ہوئے نوافل پڑھنا جائز نہیں ہے۔ فرائض کے پورا ہونے کے بعد نوافل کا نمبر ہے، جس سے درجات بلند ہوتے ہیں، جیسا کہ ابھی آپ نے حدیث سنی کہ آدمی نوافل سے برابر اللہ تعالی کے قریب ہوتا رہتا ہے۔

دوسری علامت - رضاء بالقضاء:

محبت کی دوسری علامت یہ ہے کہ راحت و نعمت یا آفت و مصیبت جو کچھ بھی اللہ کی طرف سے پیش آئے، اس پر بدل و جان راضی رہے، یہ نہیں کہ راحت و نعمت ملنے پر تو خوش ہو جائے اور آفت و مصیبت اور تنگی و پریشانی پیش آئے تو واویلا مچائے اور اللہ کا شکوہ کرنے لگے، یہ بات محبت سے بہت دور ہے۔ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ محبوب کی طرف سے جو بھی پیش آئے اس پر راضی رہے۔

حضرت محبوب سبحانی شیخ جیلانی علیہ الرحمہ نے ایک وعظ میں فرمایا ہے کہ اے کذاب! تو نعمت کی حالت میں خدا کو محبوب سمجھتا ہے، لیکن جب بلا آتی ہے تو بھاگ کھڑا ہوتا ہے، گویا اللہ عزوجل تیرا محبوب نہیں تھا، بندہ تو آزمائش ہی کے وقت ظاہر ہوتا ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلائیں آئیں اور تو جما رہے تو بے شک تو محبّ (عاشق خدا) ہے اور اگر تیری حالت میں تبدیلی آجائے تو جھوٹ کھل گیا اور پہلا دعویٔ محبت ٹوٹ گیا۔ (خطبات غوثیہ مجلس نمبر:۱)

ایک اور بزرگ حضرت یحییٰ بن معاذ رازیؒ نے بڑی عجیب بات فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ "حقيقة المحبة أن لا تزيد بالعطاء ولا تنقص بالجفاء" کہ محبت کی حقیقت یہ ہے کہ نہ عطاء سے بڑھے اور نہ جفا سے گھٹے۔ (مرقات: ۱/۵۷، فتح الباری ایضا: ۱/۶۲)

مطلب یہ ہے کہ حقیقی محبت ایسی ہوتی ہے کہ محبوب کی طرف سے عطاء ونوال اور بخشش ونوازش کا معاملہ ہو تو کیا اور اس کی طرف سے کچھ (ظاہری طور پر) پریشانی ومصیبت پیش آئے تو کیا، وہ ہر صورت میں برقرار رہتی ہے۔

محبت کو پرکھنے کا معیار:

اور یہی اصلی محبت کو پرکھنے کا معیار ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوے اور عرض کیا کہ اے نبی اللہ! میں آپ سے محبت رکھتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ دیکھ لو کیا کہتے ہو؟ انہوں نے پھر عرض کیا کہ میں آپ سے محبت رکھتا ہوں، اسی طرح تین مرتبہ انہوں نے کہا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم سچے ہو تو فقر وفاقہ برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ، کیونکہ فقر وفاقہ میرے چاہنے والوں کی طرف اس سے زیادہ جلدی آتا ہے، جتنا کہ سیلاب اپنی

منزل کی طرف چلتا ہے۔(ترمذی:۲۳۵۰،مستدرک:۳۶۷/۴،شعب الایمان: ۱۷۳/۲)

ایک اور موقعہ پر فرمایا کہ سب سے زیادہ سخت آزمائش انبیاء کرام کی ہوتی ہے، پھر ان کی جوان سے زیادہ قریب ہوتے ہیں، پھر وہ جوان کے بعد کا درجہ رکھتے ہیں۔ (ترمذی:۲۳۹۸،سنن دارمی:۴۱۲/۲،صحیح ابن حبان:۱۶۰/۷،وغیرہ)

غرض یہ کہ اللہ ورسول سے محبت کا دعویٰ تو سبھی کرتے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ آزمائش کے موقعہ پر وہ کس قدر ثابت قدم رہتا ہے، اور اس کو کس طرح خوشدلی سے برداشت کرتا ہے، اگر صبر وتحمل سے کام لیتا ہے اور شکوہ شکایت سے باز رہتا ہے اور اللہ کے فیصلہ پر راضی رہتا ہے تو وہ واقعی اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والا ہے، ورنہ وہ اپنے محبت کے دعوے میں جھوٹا ہے۔

مجھے حضرت شیخ جیلانیؒ کی بات یاد آتی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''اللہ ورسول کی محبت فقر وبلا کے ساتھ ملی ہوئی ہے، اسی لیے ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ بلاومصیبت ولایت پر تعینات کردی گئی ہے تاکہ ہر کوئی ولایت کا دعوی نہ کرسکے، اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر شخص اللہ کی محبت کا دعویٰ کر بیٹھتا۔پس بلا وفقر پر جمے رہنے کو اللہ ورسول کی محبت کے لیے علامت بنا دیا گیا ہے۔(خطباب غوثیہ مجلس نمبر:۱)

غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ پیش آئے خواہ جی چاہے یا نہ چاہے اس پر راضی وصابر رہے۔

۞ رضاء بالقضاء کی لذت:

یہ رضاء بالقضاء ایمان کا ایک حصہ ہے، اور اسی کے ساتھ اس میں دنیا میں بھی

ایک قسم کی حلاوت ولذت ملتی ہے ۔مولانا محمد علی جوہر نے ایک شعر کہا ہے جو بڑا جاندار وشاندار ہے،اس میں اس حقیقت کو سمجھا دیا ہے، کہتے ہیں:

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہوتو مزا دیکھ
دنیا ہی بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

واقعی جو شخص اللہ کی تقدیر پر راضی ہوجا تا ہے اور ہر خیر وشر کو اللہ کی طرف سے جانتا ہے اور اس میں اللہ کی حکمتوں کا مشاہدہ کرتا ہے وہ بڑے مزے میں ہوتا ہے، گویا اسے اس دنیا ہی میں جنت کا لطف ومزہ مل جاتا ہے۔

اور جب اس کو اس میں مزہ آتا ہے تو وہ بزبان حال یوں کہتا ہے:

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

کہ اے اللہ! کسی دشمن کو یہ بات نصیب نہ ہو کہ وہ آپ کے تیغ وخنجر سے ہلاک ہو، کیونکہ ہم دوستوں کا سر سلامت ہے کہ آپ اس پر خنجر آزمائیں۔

الحاصل جو اللہ کا بندہ اللہ کی جانب سے پیش آنے والے حالات کو اللہ کی جانب سے سمجھتا ہے اس کو اس میں مزہ آتا ہے،اور اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ یہ حالات ومصائب کسی کافر کو نہیں بلکہ ہمیں ہی پیش آئیں کہ یہ ہمارے محبوب کی طرف سے ہیں۔

آج کا دعویٔ محبت:

اس تفصیل کے بعد ذرا اپنے اوپر بھی ایک نظر ڈالتے چلئے،آج بہت سے لوگ دعویٔ محبت تو کرتے ہیں،مگر محبت کی جو شرائط بیان کی گئی ہیں،ان میں سے بعض کے پاس تو ایک بھی نہیں ہوتی اور بعض کے پاس ایک ہوتی ہے تو دوسری غائب ہوتی

ہے۔مثلاً اطاعت خداوندی واطاعت رسول ہے جومحبت الٰہی کی اولین شرط ہے۔ اسی طرح ان کی معصیت ونافرمانی سے بچنا کہ محبت الٰہی کے لیے یہ بھی لازم ہے؛ مگر بہت سے دعویداران شرائط سے غافل ہی نہیں، بلکہ ان کے تارک بھی ہوتے ہیں کہ مستقل طور پر اللہ ورسول کی طاعت سے اعراض وروگردانی کرتے اوران کی نافرمانی اورمعصیت میں مبتلا رہتے ہیں اورساتھ ساتھ محبت وعشق خداوندی کادعویٰ بھی کرتے ہیں۔عبادات میں غفلت وکوتاہی کی جاتی ہے،معاشرتی احکام کوپس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔اخلاقی قوانین سے بے التفاتی برتی جاتی ہے جب کہ یہ ساری تعلیمات وتلقینات حضرت محمدعربی ﷺ کے ذریعہ نازل فرمائی گئیں اورہم سے مطالبہ کیا گیا کہ ان کی پیروی کرو،مگر پیروی کے بجائے بے راہ روی اختیار کی جاتی ہے۔کیا یہ محبت کا تقاضا ہوسکتا ہے؟

اسی طرح اگراللہ کی طرف سے کوئی بیماری، پریشانی،آفت ومصیبت پیش آتی ہے تو واویلا مچایا جاتا ہے، اس کا شکوہ کیا جاتا ہے۔بعض لوگ نعوذباللہ اللہ تعالیٰ کوگالیاں بھی دیتے ہیں۔کوئی مرجائے تو چیختے چلاتے ہیں، ماتم کرتے ہیں، بے صبری کا پوری طرح مظاہرہ کرتے ہیں۔کیا یہ اللہ سے محبت ہے؟نہیں یہ توخلاف محبت ہے۔

۞ حضرت فاطمہؓ کا صبر وصال نبوی ﷺ پر:

حضرت فاطمہؓ نبی الثقلین سرورکونین حضرت محمد ﷺ کی لختِ جگر ونورِنظر، جب اللہ کے نبی ﷺ کا وصال مبارک ہوا تو ظاہر ہے کہ آپ کو بہت غم ہوگا،کس قدر غم ہوا ہوگا اس کا اندازہ ان کے ان اشعار سے لگایا جاسکتا ہے جوانہوں نے اس موقعہ

پر فرمائے تھے ۔

صُبَّتْ عَلَيَّ مَصَائِبُ لَوْ أَنَّهَا صُبَّتْ عَلَى الْأَيَّامِ صِرْنَ لَيَالِيَا

(فرماتی ہیں کہ مجھ پر اللہ کے رسول کی وفات کی وجہ سے جو مصائب ڈالے گئے ہیں وہ اگر دنوں پر ڈال دیے جائیں تو دن رات ہو جائیں)۔

یعنی دن کی روشنی ان مصائب کا تحمل نہ کر سکے گی اور دن بھی اندھیریوں میں تبدیل ہو جائیں جیسے راتیں ہوتی ہیں۔

اندازہ کیجئے کہ کس قدر غم ہوگا، مگر کوئی شکوہ وشکایت انکی زبان پر نہ جاری ہوا۔ آج عورتیں اپنے کسی رشتہ دار باپ، ماں یا شوہر کے یا کسی اور کے انتقال پر نہایت ہی بے صبری کا مظاہرہ کرتی اور شکوہ وشکایت کی زبان دراز کرتی نظر آتی ہیں۔ یاد رکھو! یہ محبت الہیہ کے خلاف ہے۔

۞ محبت حق پیدا کرنے کا طریقہ - ذکر حق:

اب سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ہوگا کہ ہمارے دل کے اندر اللہ کی محبت سمائے؟ اس کا کیا طریقہ ہے کہ ہم بھی اللہ کی محبت میں چور ہو جائیں؟ علماء وصوفیاء نے اس کے لیے چند اصول وطریقے بیان کئے ہیں۔

اس میں سب سے اعلیٰ اور سب سے اہم ترین طریقہ یہ ہے کہ اللہ کا ذکر کیا جائے جس قدر اللہ کا ذکر ہوگا، اللہ کی محبت دل میں سمائے گی، گھس جائے گی، رچ جائے گی، بس جائے گی۔

چنانچہ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: "يقول الله أنا عند ظن عبدی بی وأنا معه إذا ذكرنی فی ملإٍ ذكرته فی ملإٍ خير منهم ، وإن تقرب إلى شبرًا تقربت إليه ذراعاً ، وإن تقرب إلى ذراعاً تقربت

إليه باعاً، وإن أتاني يمشي أتيته هرولةً۔ (مسلم:۲۶۷۵)

(اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں میرے بندے کے گمان کے قریب ہوں اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں، جب وہ مجھے کسی مجمع میں یاد کرتا ہے تو میں اس سے بہتر مجمع میں اس کو یاد کرتا ہوں اور اگر وہ ایک بالشت میرے قریب ہوتا ہے تو میں ایک ہاتھ اس کے قریب ہو جاتا ہوں اور اگر وہ ایک ہاتھ میرے قریب ہوتا ہے تو میں دو ہاتھ اس کے قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ میرے پاس چل کر آتا ہے تو میں دوڑ کر اس کے پاس جاتا ہوں)

بھائیو! اس حدیث سے کیا معلوم ہوتا ہے؟ یہ کہ جب بندہ اللہ کا ذکر کرتا ہے تو وہ اللہ کی قربت اور اللہ کی محبت پاتا ہے اور جب بندہ کو اللہ کی محبت ملتی ہے تو اس کے دل میں بھی اللہ سے محبت پیدا ہو جاتی ہے، کیونکہ جب اللہ ہم کو چاہے تو ضرور ہم بھی اللہ کو چاہیں گے۔

ذکر سے مذکور تک:

حضرت مولانا عبد الغنی پھول پوری علیہ الرحمہ حضرت حکیم الامت تھانوی کے ایک جلیل القدر و عظیم المرتبت خلیفہ گزرے ہیں، ان کی ایک بات یاد آئی، آپ فرماتے تھے کہ ذکر ذاکر کو مذکور تک پہنچا دیتا ہے۔

ذکر معلوم ہے اور ذاکر بھی معلوم ہے، مذکور کون ہے؟ مذکور اللہ کی ذات ہے، جب کوئی بندہ اللہ کا ذکر کرتا ہے تو یہ ذکر اس کو اللہ تک پہنچا دیتا ہے۔ کس قدر عظیم خوشخبری ہے ذاکرین کے لئے! کہ وہ اللہ تک رسائی پا جانے والے ہیں، اس سے بڑی کیا نعمت چاہئے؟

❁ بعض سالکین کی ایک غلطی پر تنبیہ:

یہیں سے ان سالکین کی غلطی معلوم ہوگئی جو ذکر کی توفیق ملنے کے باوجود یہ کہتے پھرتے ہیں کہ ہم ذکر تو کر رہے ہیں مگر کوئی فائدہ محسوس نہیں ہو رہا ہے۔ اے سالکین! یہ بہت بڑی غلطی ہے، جب اللہ نے آپ کو ذکر کی توفیق عطاء فرمائی ہے تو یہ خود بہت بڑی اور عظیم الشان نعمت ہے، اگر اس کے بعد اور کچھ بھی نہ ملے تو بھی آپ کو بہت کچھ مل گیا۔ اس کے علاوہ قرآن وحدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب بندہ اللہ کا ذکر کرتا ہے تو خود اللہ تعالیٰ بھی بندہ کو یاد کرتے ہیں، جیسے ابھی میں نے حدیث سنائی تھی، اور قرآن میں بھی یہ بات ہے، چنانچہ فرمایا کہ " فَاذْكُرُونِيْ أَذْكُرْكُمْ " کہ تم مجھے یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا۔ اس سے بھی بڑی کیا چیز چاہیئے کہ اللہ ہمیں یاد فرمائیں اگر کوئی ہمیں بتائے کہ وزیر اعظم یا چیف منسٹر نے ہمیں یاد کیا تو ہماری حالت کیا ہوتی ہے، کس قدر خوشی وفخر محسوس ہوتا ہے؟ جب کہ یہ سب ہم ہی جیسے بندے اور مخلوق ہیں، اگر ہمیں اللہ تعالیٰ یاد کریں تو بتاؤ اس سے بڑی کیا نعمت ہوسکتی ہے؟

ایک صاحب حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے پاس آئے اور یہی شکایت کرنے لگے کہ میں ذکر تو کرتا ہوں، مگر مجھے کچھ حاصل نہیں ہو رہا ہے، حضرت حاجی صاحب نے جو کہ اس راہ کے رہبر ہیں انہوں نے فرمایا کہ تم اس سے بڑھ کر اور کیا چاہتے ہو کہ اللہ نے تم کو اپنے پاک نام کے لینے کی توفیق دیدی، یہ کیا کچھ کم ہے؟

❁ کیا ہمارے پاس ذکر کرنے کے لئے وقت نہیں؟

بہت سارے لوگ ذکر شروع کرتے ہیں، لیکن پابندی نہیں کرتے، کوئی آٹھ

دن تک کیا، اس کے بعد چھوڑ دیا، کوئی دس دن کیا، اس کے بعد چھوڑ دیا، کوئی ایک مہینہ دو مہینہ کیا، اس کے بعد چھوڑ دیا، مصروفیات اور مختلف قسم کی مشغولیات کا بہانہ سامنے آتا رہتا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بہانہ اور عذر بالکل بے کار اور فضول ہے، کل بھی میں ایک صاحب سے کہہ رہا تھا کہ اپنے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے دو فہرستیں تیار کیجئے: ایک فہرست ان اعمال کی اور مصروفیات کی جو ہمارے لیے ضروری ہیں، دوسری فہرست ان اعمال کی اور مصروفیات کی جو غیر ضروری ہیں، صبح سے لے کر شام تک جو اعمال ہم سے صادر ہوتے ہیں، اس پر غور کریں کہ میں صبح اٹھا، اس کے بعد یہ کام کیا، اس کے بعد یہ کام کیا، شام تک کا حساب لگائے، ایک خانہ میں ان چیزوں کو لکھتا جائے جن کو ضروری سمجھتا ہے، اور دوسرے خانہ میں ان اعمال کو لکھتا جائے جو غیر ضروری ہیں۔ اب اس کے بعد یہ دیکھے کہ کونسی فہرست لمبی ہے، میرا اپنا خیال یہ ہے، اندازہ یہ ہے کہ ہماری وہ فہرست بڑی لمبی چوڑی نکلے گی جو غیر ضروری چیزوں پر مشتمل ہے، فضولیات پر مشتمل ہے، کیونکہ ہمارے پاس بے کار دھندے، اور خوامخواہ کی بات چیت اور فضول کاموں کا ایک طویل سلسلہ ہے، بلکہ گناہوں کا سلسلہ بھی ہے، کہیں غیبتیں ہیں، کہیں چغلیاں ہیں، کہیں بہتان تراشیاں ہیں، کہیں ادھر ادھر کی بکواس ہے، اس طرح کی بہت ساری چیزیں اس میں ملیں گی۔ اور جو انتہائی ضروری کام ہیں ان کی فہرست بہت مختصر ہوگی، کیونکہ ہم ضروری کام تو کرتے ہی نہیں، تو آپ کو خود ہی اندازہ ہوجائے گا کہ آپ کی مشغولیت کا جو آپ بہانہ بناتے ہیں یہ غلط ہے۔

جب آدمی کہتا ہے کہ اتنا مصروف ہوں، اتنا مصروف ہوں کہ ذکر نہیں کرسکتا،

بڑی شرم کی بات ہے، کیا ذکر اللہ سے بھی بڑھ کر کوئی ضروری کام ہے، کیا اللہ کے ذکر سے بھی بڑھ کر بھی مؤمن کی کوئی مشغولیت ہوسکتی ہے؟ دوکان سے بڑھ کر، مکان سے بڑھ کراور دنیا و مافیہا سے بڑھ کر کیا اللہ کی ذات نہیں ہے؟

جب ہم ان سب چیزوں کو وقت دینے کے لیے تیار ہیں، تو پھر اللہ کے ذکر کے لیے ہمارے پاس وقت کیوں نہیں؟ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہانہ بالکل فضول قسم کی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پاس بہت وقت ہے، اللہ تعالیٰ نے بے شمار وقت ہم کو دیا ہے۔

❁ دنیا کے مشغلے ذکر میں رکاوٹ بنیں تو کیا کریں:

اور اگر مان بھی لیا جائے کہ وقت ہمارے پاس کم ہے اور ہم وقت نہیں نکال پا رہے ہیں اور اس وقت میں کچھ بھی نہیں کر سکتے تو ایک بات عرض کرتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اگر ایسا ہی ہمارا خیال ہے، تو پھر ہم کو ساری دنیا کی مصروفیتوں کو چھوڑ کر صرف ذکر کو پکڑ لینا چاہئے، اس لیے کہ جب دنیا کے مشغلے اللہ کے ذکر میں رکاوٹ بن رہے ہیں، تو ان سب کو چھوڑ کر، بس ذکر ہی کرے آدمی۔ ایک شاعر نے کہا ؎

إِذَا كُنتُ أَعلم عِلماً يَقِيناً   بأنَّ جميعَ حَياتِيُ كَسَاعَه

فلِمَ لا أكُونُ ضَنِيناً بِهَا   وَأَجعلُهَا فی صَلاح وَ طَاعَه

(یعنی شاعر کہتا ہے کہ جب میں یقینی طور پر اچھی طرح یہ جانتا ہوں کہ میری پوری زندگی ایک گھنٹے کے برابر ہے تو پھر میں کیوں نہ بخیل بن جاؤں اپنی اس زندگی کے بارے میں، اپنے وقت کے بارے میں کہ میں بخیلی کرتے ہوئے کنجوسی برتتے ہوئے اس پورے وقت کو نیکی وطاعت میں کیوں نہ لگا دوں)

ارے جب وہ جانتا ہے کہ اور کچھ وقت نہیں مل رہا ہے تو اسے یہی چاہئے کہ اللہ

کے ذکر میں لگ جائے، اللہ کی طاعت میں لگ جائے، اور بس پوری زندگی اسی کے لیے وقف کر دے اور حقیقت بھی یہی ہے۔

فضول گفتگو سے بچنے کی تدبیر، مولانا میاں صاحب کا واقعہ:

ایک بزرگ تھے دیوبند میں جن کا نام ہے حضرت مولانا میاں صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے محدث تھے، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے بھی اساتذہ میں سے ہیں، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ان کا واقعہ ذکر کیا ہے کہ ان کی مجلس ہوتی تھی اور اس میں علماء، صلحاء اور طلباء سب جمع ہوتے تھے اور کوئی مسئلہ پوچھتا، کوئی مشورہ لیتا، حضرت کبھی کچھ بیان فرماتے اور کبھی مسائل کی تحقیق ہوتی، مختلف قسم کی باتیں ہوتی رہتیں۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں کہ ایک دن حضرت نے فرمایا کہ بھائی کل سے ہماری مجلس میں گفتگو صرف عربی زبان میں ہوگی اردو میں نہیں، اس کے بعد مجلس برخاست ہوگئی اور لوگ چلے گئے، دوسرا دن ہوا تو لوگ آئے، آنے کے بعد سب خاموش بیٹھے ہوئے ہیں، کوئی بولتا نہیں، کوئی کچھ پوچھتا ہی نہیں، اگرچہ وہ علماء تھے، طلباء تھے، لیکن عام طور پر عربی زبان میں گفتگو کی مشق چونکہ نہیں ہوتی ہے تو وہ جیسے اردو سرسر بول لیتے ہیں، اس طرح نہیں بول پاتے، اور سب کے سب خاموش بیٹھے ہوئے ہیں، بہت دیر کے بعد کسی نے کہا کہ حضرت ایک مسئلہ ہے، عربی میں اس نے ایک جملہ بہت ہی جچا تلا استعمال کیا، اب حضرت نے اس کا جچا تلا عربی میں جواب دیا، پھر مجلس پر خاموشی طاری ہوگئی، پھر کچھ دیر کے بعد کسی نے سوال کیا، پھر اسی طرح جواب ہوگیا پھر خاموشی طاری ہوگئی، دو چار ہی باتیں ہوئیں تھیں کہ عصر سے مغرب تک کا وقت ختم ہوگیا اور لوگ چلے گئے۔

دوسرا دن ہوا وہی کیفیت، تیسرا دن ہوا وہی کیفیت، کوئی کچھ بولتا ہی نہیں، دو تین دن کے بعد کسی نے حضرت سے سوال کیا کہ حضرت! آپ نے یہ عربی والی قید لگا کر ہم لوگوں کو بڑی مشکل میں ڈال دیا اور استفادہ کا دروازہ بند کر دیا، افادہ کا دروازہ بند ہو گیا ہے، آپ نے ایسا کیوں کیا؟ تو حضرت نے فرمایا کہ بھائی میں دیکھ رہا تھا کہ لوگ ایک چھوٹی سی بات ہوتی ہے، لیکن اس چھوٹی سی بات کے لیے بہت سے فضول الفاظ استعمال کرتے ہیں، پانچ لفظوں میں جو بات پوری ہو سکتی ہے اس کے لیے دس لفظ استعمال کرتے ہیں، جو بات دس لفظوں میں پوری ہو سکتی ہے اس کے لیے چالیس پچاس لفظ استعمال کرتے ہیں، وہ سب فضول ہوتے ہیں، اس لئے میں نے سوچا کہ ہماری اتنی عمریں ہو چکی ہیں، میری عمر پچاس ہو گئی ہے، کسی کی عمر چالیس ہو گئی، کسی کی عمر پینتالیس ہو گئی، کسی کی عمر بیس ہو گئی ہے۔ اور لوگ لمبی لمبی گفتگو کر کے اپنا وقت برباد کرتے ہیں، میں نے سوچا کہ یہ فضول گوئی میں جو وقت گزر رہا ہے، اس سے ان لوگوں کو بچاؤں، اس لیے میں نے یہ قید لگا دی کہ عربی میں بولو، اب عربی میں بولے گا تو جچے تلے الفاظ میں بولے گا، بے کار کوئی لفظ استعمال نہیں کرے گا، جیسے اردو میں آدمی بکواس کر لیتا ہے، اس لیے وہاں بڑا سوچ سمجھ کر بولے گا، ضرورت ہی کا لفظ بولے گا، بلکہ جتنا ضروری ہے وہ بھی پورا نہیں بول سکے گا، اس میں بھی کچھ گھٹ ہی جائے گا۔ اس لئے میں نے یہ قید لگائی ہے۔

بھائیو! یہ تھی ہمارے بزرگوں کی نظر کہ ہمارا وقت خراب نہ ہو اور اس وقت کو بچا بچا کر رکھے، اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے سامان تیار کیا جائے، اللہ تعالیٰ کے عشق کو دل میں بسانے کے لیے تدبیریں کی جائیں، اور وہ سارا وقت اسی کے لیے صرف ہو جائے۔

عمر گھٹتی ہے یا بڑھتی ہے؟

اورلوگ کہتے ہیں کہ ہماری عمر بڑھ گئی ، بڑھ کہاں گئی؟ درحقیقت گھٹ گئی، دراصل جتنی عمر لے کرآدمی آیا تھااس سے گھٹ گئی، جب بچہ پیدا ہوا تو وہ مثال کے طور پر پچاس سال کی عمر لے کرآیا، یا کوئی ستر برس کی عمر لے کرآیا،اور ہرایک سال گزرنے کے بعداس کا برتھ ڈے منایا جاتا ہے،لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا بچہ ایک سال کا بڑا ہوگیا، حالاں کہ یہ بے وقوفی ہے،حقیقت یہ ہے کہ اس کا اس کی لائی ہوئی عمر میں سے ایک سال کا گھٹ گیا ہے۔

ایک عربی شاعر نے ایک عجیب شعر کہا ہے ؎

یَسُرُّ الْمَرْءَ مَاذَهَبَ اللَّيَالِی   وَ كَانَ ذَهَابُهُنَّ لَهٗ ذَهَاباً

کہتا ہے کہ آدمی کو یہ بات بہت خوش کرتی ہے کہ اتنی راتیں گزرگئیں اوراتنے دن گزر گئے ،ایک سال گزر گیا، دوسال گزر گئے، تین سال میرے گزر گئے، میں اتنا بڑا ہوگیا، حالانکہ ان کا گزرنا تو خوداس کا گزرجانا ہے، یہ ایام اورراتیں گزرتی ہیں تو حقیقت میں یہ خود بھی گزرتا رہتا ہے۔

جب یہ راتیں اوردن گزرتے ہیں تو یہ کہتا ہے کہ میں اتنا بڑا ہوگیا، حالانکہ اور گھٹ گیااور گھٹتے گھٹتے ایک دن تو وہ پوری طرح گھٹ ہی جائے گا، بلکہ مرہی جائے گا،اورقبر میں دفن ہوجائے گااور یہ سمجھ رہاہے کہ میں بڑھ رہاہوں، حالانکہ گھٹتا جارہا ہے۔ احقر کااس پرایک شعری قطعہ سن لیجئے:

بجلی کی طرح تیز گزرتے دیکھا
اور مثلِ برف ہم نے پگھلتے دیکھا

کہتا ہے زمانہ عمر بڑھتی ہے شعیبؔ
ہم نے تو ہمیشہ اِسے گھٹتے دیکھا

تو میں کہہ رہا تھا کہ اللہ کا ذکر سب سے زیادہ اہم ترین چیز ہے۔ لہٰذا اللہ کا ذکر شروع کیجئے، ذکر مقصود اعظم ہے۔

کیا آپ ﷺ ہمیشہ اللہ کا ذکر کرتے تھے، ایک علمی افادہ:

اللہ کے نبی ﷺ کے بارے میں حدیث میں آتا ہے" إن النبی ا کان یذکراللّٰهَ علی كُلِّ أحُيانِه "(اللہ کے نبی ﷺ تمام اوقات میں اللہ کے ذاکر تھے) کوئی وقت ایسا نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کرتے ہوں۔(مسلم:۳۷۳)

علماء نے لکھا ہے کہ اس سے وہ وقت مستثنیٰ ہے جو استنجا کے لیے ہوتا ہے، اس لیے کہ استنجا خانہ میں جب جاتے ہیں تو وہاں پر ذکر اللہ منع ہے، لیکن باقی اوقات سب کے سب ذکر اللہ میں مشغول رہتے تھے۔

لیکن میرے ذہن میں اس سلسلہ میں ایک لطیف بات آتی ہے، وہ یہ کہ جو اللہ تعالیٰ کا ذکر بیت الخلاء کے موقعہ پر منع ہے، وہ اس لیے ہے کہ آدمی جب بیت الخلاء جاتا ہے تو اس سے گندگی خارج ہوتی ہے، اور وہ ناپاک ہوجاتا ہے، اور گندگی میں تلوث کی وجہ سے ہم اس قابل نہیں رہتے کہ اللہ تعالیٰ کا وہاں پر نام لیں، لیکن رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اکثر و بیشتر علماء کی رائے ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ کا فضلہ بھی پاک تھا، تو اللہ کے نبی ﷺ سے جو خارج ہوتا تھا وہ فضلہ پاک تھا تو آپ کو تلوث بالنجاست نہیں ہوتا تھا، اور جب تلوث بالنجاست نہیں تو آپ کے لیے بیت الخلاء میں اللہ کا ذکر ممنوع نہیں، ممنوع تو ان کے لیے ہے جو ملوث ہوتے ہیں نجاست کے

ساتھ، اور جن سے خروج ہوتا ہے نجاست کا، اور جب نجاست کا خروج ہی وہاں پر نہیں، تلوث بالنجاست نہیں تو آپ کے لیے ممنوع نہیں، اس لیے اگر اس حدیث " إن النبی ﷺ کان یذکراللّٰه علی کل احیانه "(اللہ کے نبی ﷺ تمام اوقات میں اللہ کے ذاکر تھے) کو اپنے پورے عموم پر رکھ لیا جائے تو کوئی اعتراض نہیں، استثناء کی کوئی ضرورت نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

بہرحال ایک رائے کی بات ہے، رائے تو بھائی کبھی رائی کے برابر ہوتی ہے، اور کبھی پائی کے برابر ہوتی ہے، اب یہ رائی کے برابر ہو تو ٹھکرا دیجئے نہیں تو قبول کر لیجئے، اگر صحیح ہو تو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ معاف فرمادے اور اس کے شر سے ہماری حفاظت فرمائے۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضرت سیدنا عمر بن الخطابؓ جب کوئی رائے پیش کرتے تھے تو اس وقت یہ فرماتے تھے کہ اگر یہ صواب ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے، اور اگر اس میں کوئی خطا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرمائے۔

تو بہرحال یہ تو ضمنی بات تھی، دراصل یہ کہنا تھا کہ نبی اکرم ﷺ ہر وقت ذکراللہ میں رہتے تھے۔

ذکر کا دوسرا طریقہ:

ذکراللہ کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی بیٹھ کر اللہ کو یاد کرے، خاص وقت میں، اور دوسرا طریقہ اس کا یہ ہے کہ چلتے ہوئے پھرتے ہوئے مختلف اوقات میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرے، اور اس کی ایک تدبیر یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ان دعاؤں کے پڑھنے کا اہتمام کرے جو اللہ کے نبی ﷺ نے مختلف اوقات کی ہم کو تعلیم دی ہے، کھاتے

وقت کی دعاء ہے، پیتے وقت کی دعاء ہے، کھانا ختم کرتے وقت کی دعاء ہے، کھانے کے درمیان کی دعا ہے، بیت الخلاء جانے کی دعاء ہے، بیت الخلاء سے آنے کی دعاء ہے، گھر سے باہر نکلنے کی دعاء ہے، گھر میں داخلے کی دعاء ہے، سونے کی دعاء ہے، اٹھنے کی دعاء ہے، اور بعض ایسی دعائیں جس میں ہم اپنے گناہوں سے استغفار کے ذریعہ اللہ کو یاد کر سکتے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ " يا أَيُّهَا النَّاسُ تُوبُوا إِلى اللّٰهِ ، فَإِنِّي أَتُوبُ إِلَيْهِ كُلَّ يوم مِائة مرةً "(اے اللہ کے بندو! اللہ تعالیٰ کی جناب میں توبہ کرو، کیوں کہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی جناب میں ایک دن میں سو سو دفعہ توبہ کرتا ہوں)۔(مسلم:۲۷۰۲)

تو یہ توبہ بھی اللہ کا ذکر ہے، اور زندگی کے تمام اوقات میں دعائیں اللہ کے نبی ﷺ سے منقول ہیں، اگر ان اوقات کی دعاؤں کو یاد کیا جائے اور وقت وقت پر ان کو پڑھ لیا جائے تو ہمارا پورا وقت ذکر اللہ میں مشغول ہو جائے گا۔

کتنی آسان تدبیر ہے، بہترین تدبیر ہے، ان دعاؤں میں کہیں وہ ذکر، اللہ تعالیٰ کی یاد کے طور پر ہے، اور کہیں وہ ذکر، اللہ کے شکر کے طور پر ہے، اور کہیں وہ ذکر، طلب اور دعا کے عنوان سے ہے، لیکن کسی نہ کسی طور پر اللہ کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔

لہٰذا آدمی کو جو دنیوی کام کرنا ہے وہ بھی کرے اور اس کے ساتھ ذکر بھی کرے تو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی، اس لیے اللہ تعالیٰ کے ذکر میں اس طرح لگنا چاہئے۔

اور اس ذکر کا حاصل اور خلاصہ اور اس ذکر کا نتیجہ اور ثمرہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہو جاتی ہے، اس لیے کہ جو آدمی جس کا ذکر زیادہ کرتا ہے، اس سے محبت ہو جاتی ہے اور جس آدمی کو جس سے زیادہ محبت ہوتی ہے، وہ اس کا زیادہ ذکر بھی

کرتا ہے، یہ لازم ملزوم چیزیں ہیں، اگر محبت نہیں ہے ذکر شروع کر دو، محبت آ جائے گی اور اگر محبت پہلے سے موجود ہے تو پھر بھی آدمی اسی کا ذکر بار بار کرتا رہتا ہے، ذکر وہ چیز ہے۔

حصولِ محبت کا دوسرا طریقہ۔نعمتوں میں غور وفکر:

بات شروع کی تھی اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرنے کے طریقے کے متعلق کہ وہ کس طرح پیدا کی جا سکتی ہے، تو میں نے ایک طریقہ یہ بیان کیا کہ اس کا طریقہ اللہ کا ذکر ہے۔ اور اللہ کی محبت پیدا کرنے کا دوسرا طریقہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور وفکر کرنا ہے، یہ ہم جانتے ہیں کہ اللہ کی بے شمار نعمتیں ہیں، ایسی ایسی نعمتیں ہیں جن کی کوئی انتہاء نہیں ہے، کوئی حد نہیں ہے، عجیب وغریب نعمتیں ہیں، ان نعمتوں پر غور کیا جائے۔

اللہ نے جگہ جگہ قرآن میں اپنی نعمتوں میں غور وفکر کی دعوت دی ہے کہ زمین کو دیکھو، آسمان کو دیکھو، سورج کو دیکھو، چاند کو دیکھو، ہماری اس نعمت کو دیکھو، ہماری اُس نعمت کو دیکھو، کہیں سمندر کا ذکر ہے، کہیں ستاروں کا ذکر ہے، اور کہیں پھلوں اور پھولوں کا ذکر ہے، اور کہیں خود انسان کے اندر کی چیزوں کا ذکر ہے، ان سب چیزوں میں غور وفکر کیا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور وفکر اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کر دیتا ہے، اور ان شاء اللہ اس سے اللہ تعالیٰ سے بے حد محبت پیدا ہو جائے گی۔

جب باپ سے اس لیے محبت ہے کہ وہ ہمیں نعمتیں دیتا ہے، ہماری رکھوالی کرتا ہے، ہماری نگہبانی کرتا ہے، ہماری تربیت وکفالت کرتا ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور وفکر کریں گے تو کیا اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں پیدا ہوگی؟ ضرور پیدا ہو جائے گی، اس لیے کچھ دیر آدمی کو چاہئے کہ اللہ کی محبت کی نیت سے غور وفکر کرے

ان نعمتوں میں، کبھی کسی نعمت میں کرلے، تو کبھی کسی اور نعمت میں کرلے۔

امام غزالیؒ کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے ''رموزِ کائنات'' انہوں نے اس میں اس کائنات کی مختلف چیزوں کے اسرار بیان کیے ہیں، زمین اللہ نے کیوں پیدا کی؟ اس کی کیا خصوصیات ہیں؟ اس کے اندر کیا حکمتیں ہیں؟ اس کے اندر کیسی عجیب وغریب چیزیں ہیں۔ آسمان کو بنایا تو اس میں کیا کیا ہے؟ سورج میں کیا ہے؟ چاند میں کیا ہے؟ اگر وہ کتاب ملے تو اس کو پڑھ لیجئے، پڑھنے کے بعد غور وفکر شروع کر دیجئے۔

کتنی محنتوں کے بعد ایک لقمہ تیار ہوتا ہے:

ایک بات عرض کرتا ہوں کہ آپ کے سامنے کھانے کا ایک لقمہ آئے، روٹی کا ایک نوالہ آئے، چاول کا ایک دانہ آئے تو آپ اس پر غور کرنا شروع کر دیں کہ یہ دانہ کیسے پیدا ہوتا ہے، اس کے اوپر کیسی کیسی محنتیں ہوئی ہیں، اللہ کے فرشتوں نے اس پر کام کیا، اللہ کی ہواؤں نے اس پر کام کیا، اللہ کے سورج نے اس پر کام کیا، اللہ کے بنائے ہوئے انسانوں نے اس پر کام کیا، اس کے اوپر جانوروں نے کام کیا، اس کے اوپر نہ معلوم اور کتنی مخلوقات نے کام کیا ہے۔ ان ساری مخلوقات کے کام کرنے کے بعد وہ چیز پیدا ہوئی اور پیدا ہو کر جب سامنے آئی، پھر اس کی کٹائی ہوئی، کاٹنے والے کچھ لوگ تھے، پھر اسکی صفائی ہوئی، صفائی کرنے والے دوسرے لوگ تھے، پھر اس کے بعد بٹائی ہوئی، بٹائی کرنے والے تیسرے قسم کے لوگ تھے، پھر وہاں سے کہیں اور بازار میں آیا، اس کو خریدنے والے کوئی اور لوگ تھے، پھر وہاں سے دوکانوں میں اور اپنے اپنے محلوں میں آیا، وہاں پر لانے والے کچھ اور لوگ تھے، پھر وہاں سے ہم نے خریدا اور پھر ہمارے گھروں میں وہ دانہ آیا، پھر عورتوں

نے اس کو پکایا اور اس کے بعد ہمارے سامنے آیا تو مزیدار لقمہ بن کر آیا۔

غور فرمایا جائے کہ ایک نوالہ کے لیے اتنی مخلوقات کو خدا نے لگا دیا اور اور مسخر کر دیا کہ یہ کام کریں، ہواؤں کو مسخر کیا، سورج کو مسخر کیا اور جانوروں کو مسخر کیا، فرشتوں کو مسخر کیا اور انسانوں کو مسخر کیا اور ان سب کی محنتوں کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ چیز ہمارے سامنے لائی ہے اور ہم اس کو مزے لے کر کھاتے ہیں، غور کرو کہ ہمارے خالق نے ایک دانہ ہم تک پہنچانے کے لئے کتنی مخلوقات کو اس کے پیچھے لگا دیا اور ہم ہیں کہ بغیر غور و فکر کیے اللہ کی نعمتوں کو استعمال کرتے ہیں، کیا ان میں غور و فکر کرنے سے اللہ کی محبت پیدا نہیں ہوگی؟ ضرور پیدا ہوگی۔

کھانے کا عجیب نظام قدرت:

اللہ کی نعمتوں میں سے ایک چیز پر غور کیجئے، وہ یہ کہ جب ہم کھانا کھاتے ہیں تو کھانا حلق کے ذریعہ اندر جاتا ہے، اس کا بھی اللہ نے عجیب نظام بنایا ہے، اللہ نے حلق میں دو نالیاں آگے پیچھے بنائی ہیں، سامنے ایک نالی ہے اور اس کے پیچھے دوسری نالی ہے، پیچھے کی نالی ہے کھانے پینے کے لئے ہے، اس سے کھانا پانی اندر جاتا ہے، اور سامنے کی جو نالی ہے وہ سانس کی نالی ہے، یہ نالیاں بازو بازو نہیں، بلکہ آگے پیچھے بنائی گئی ہیں اور اس سانس کی نالی میں ایک قطرہ پانی چلا جائے تو آدمی کے لیے خطرہ ہی خطرہ ہے۔ وہ قطرہ خطرہ بن جائے گا، ایک دانہ اگر اس کے اندر گھس جائے، سانس رک جائے گی اور آدمی کا دم گھٹ جائے گا، ہوسکتا ہے کہ اس کا نتیجہ موت ہو، اسی سامنے کی نالی کو پار کر کے کھانا پیچھے کی نالی میں جانا ہے۔ اب ذرا غور کیجئے کہ اللہ نے اس کے لیے کیا طریقہ رکھا ہے؟ حلق کے سامنے ایک چھوٹی سی جیب لگا رکھی ہے، جب آدمی لقمہ منہ کے اندر رکھتا ہے اور حلق میں اتارنے کی

کوشش کرتا ہے تو وہ جیب سامنے والی نالی پر پل کی طرح پڑ جاتی ہے اور اس کو بند کر دیتی ہے اور وہ لقمہ اس پل کے اوپر سے پار ہو کر حلق کے اندر داخل ہوتا ہے۔

اب تھوڑی دیر اس پر غور کیجئے کہ ہمارا وہ خالق کیسا ہوگا، ہمارا وہ مالک کیسا ہوگا، جس نے ایسا عجیب وغریب نظام ہماری حفاظت کا بنایا، جس میں خطرہ ہی خطرہ ہے، یہ غذا ہی ہماری بقا کا ذریعہ ہے، لیکن خطرہ سے دو چار ہے، حالانکہ اگر اللہ چاہتے تو کیا ایسا نہیں کر سکتے تھے کہ سامنے کی نالی کو پیچھے اور پیچھے کی نالی کو سامنے کر دیتے، تو سامنے کی نالی سے کھانا آسانی سے پار ہو جاتا، پیچھے کی نالی اندر سے سانس کے لیے رکھ دی جاتی، اس میں کوئی خطرہ کی بات نہ تھی اور ایسا کرنا اللہ کو کیا مشکل تھا؟ جو اللہ سانس کی نالی کو سامنے اور لقمہ جانے کی نالی کو پیچھے رکھ سکتا ہے وہ اللہ اس کا برعکس بھی تو کر سکتا ہے، لیکن اللہ نے یہ بتانا چاہا ہے کہ میں قادر مطلق ہوں، میں جو چاہے کر سکتا ہوں، اس لیے سب انسانوں کے لیے بقاء کا نظام ایسا بنایا کہ سامنے کی نالی سانس کے لیے بنائی، پیچھے کی نالی کھانے کے لے بنائی، جب بھی نوالہ جائے گا تو وہ سامنے کی نالی بند ہوگی، جب نوالہ پاس ہو جائے گا تو کھل جائے گی، یہ نظام ہے اللہ تعالیٰ کا، اس نظام پر غور کریں، اور اس کا شکر بجالائیں۔

ناشکری ناسمجھی کا نتیجہ:

اللہ کی ایسی نعمتوں کو استعمال کرنے کے باوجود بہت سارے لوگ اللہ کی ناشکری کرتے ہیں اور شکوہ شکایت کرتے ہیں، ایک صاحب جو مولانا بھی ہیں مجھ سے کہنے لگے کہ میرے بہت سے کام رکے ہوئے ہیں، میں جو کام بھی سوچتا ہوں ، اور جو بھی کرنا چاہتا ہوں، اس میں کچھ نہ کچھ پریشانی آجاتی ہے اور وہ کام نہیں ہوتا۔

میں نے کہا کہ آپ کا یہ جملہ غلط ہے کہ جو بھی آپ سوچتے ہیں نہیں ہوتا، اور یہ ناشکری ہے اللہ کی نعمتوں کی، جو دن رات آپ کی طرف متوجہ ہیں، میں نے ان سے کہا کہ آپ سوچیے آج صبح آپ بیدار ہوئے ہوں گے تو آپ نے چاہا ہوگا کہ میں بستر پر سے اٹھوں، اور اٹھ گئے، پھر اٹھنے کے بعد آپ نے سوچا ہوگا کہ یہاں سے چلوں اور بیت الخلاء جاؤں، اور چلے گئے تھے، پھر چاہا ہوگا کہ جو کچھ گندگی ہے اسے خارج کروں، وہ کام بھی ہو گیا تھا، پھر سوچا ہوگا کہ پانی اٹھاؤں تو ہاتھ اُٹھے ہوں گے، پانی ملا ہوگا، اور وضوء کیا ہوگا۔

آدمی اس پر غور نہیں کرتا کہ میری مرضی کے مطابق اللہ تعالیٰ کیا کیا کام میرے کر دیتے ہیں؟ ہم گردن کو ادھر ادھر دیکھنے کے لئے حرکت دینا چاہتے ہیں تو ادھر اور ادھر اس کو گھماتے ہیں، اگر یوں ہوتا کہ گردن گھومنے اور حرکت کرنے سے انکار کر دیتی تو ہم کیا کر لیتے؟ ہم ہاتھ اُٹھانا چاہتے ہیں اور وہ اُٹھ جاتا ہے، اگر وہ نہ اُٹھتا یا اُٹھانے کے بعد نیچے نہ آتا تو کیا کر لیتے؟ انگلیاں کھلتی اور بند ہوتی ہیں، اگر یہ کھل جاتیں بند نہ ہوتیں تو کیا کر لیتے یا بند ہو جاتیں، نہ کھلتیں تو کیا کر لیتے؟ سوچیے اس طرح ہم دن رات میں کتنی حرکتیں کرتے ہیں اور سب ہم اپنی مرضی سے کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس پر اپنی رحمت اور کرم کی وجہ سے ہمارا ساتھ دیتا ہے، اس طرح آپ صبح سے شام تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عنایتیں ہیں، اس پر ذرا غور کیجئے، اور پھر یہ سوچیے کہ آپ جو یہ کہہ رہے ہیں کہ میرا کوئی کام نہیں ہوتا یہ حقیقت سے کس قدر دور ہے۔ لاحول ولاقوۃ یہی تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری و ناشکری ہے۔

۞ انسان بڑا ہی ناشکرا ہے:

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے:

﴿ وَالْعٰدِیَاتِ ضَبْحاً فَالْمُورِیٰتِ قَدْحاً فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحاً فَأَثَرْنَ بِهِ نَقْعاً فَوَسَطْنَ بِهِ جَمْعاً إِنَّ الْإِنسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ ﴾ (ہانپتے ہوئے دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم، پھر ٹاپ مار کر آگ جھاڑنے والے گھوڑوں کی قسم، پھر صبح کے وقت دھاوا بولنے والے گھوڑوں کی قسم، پس اس وقت گرد وغبار اڑاتے ہیں، پھر اسی کے ساتھ فوجوں کے درمیان گھس جاتے ہیں، یقیناً انسان بڑا ناشکرا ہے)

[العدیت]

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے گھوڑوں کی قسم کھا کر فرمایا کہ انسان بڑا ناشکرا ہے، کیونکہ گھوڑا اپنے آقا و مالک کا اتنا فرمانبردار ہوتا ہے کہ وہ اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر میدان جہاد میں فوجوں کے درمیان گھس پڑتا ہے، اور مالک کے ایک اشارے پر اپنی جان کو بھی ہلاکت میں ڈال دیتا ہے، کیوں؟ اس لئے کہ اس کا یہ مجازی مالک اس کو کھانا دیتا ہے اور اسکے آرام کا کچھ سامان کر دیتا ہے، لیکن انسان گھوڑے سے بھی گیا گزرا ہے کہ وہ اپنے رب کی ہزار ہا نعمتیں کھاتا ہے استعمال کرتا ہے، اسی میں اس کی صبح وشام ہوتی ہے، پھر بھی وہ بڑا ناشکرا ہے، اللہ کا شکوہ کرتا ہے اور اطاعت کے موقعہ پر اطاعت نہیں کرتا۔

بھائیو! اللہ تعالیٰ اس سورت میں انسانوں کی شکایت فرما رہے ہیں کہ وہ ہماری قسم ہا قسم کی نعمتیں کھا کر بھی اطاعت نہیں کرتا اور ناشکری کرتا ہے۔

ٹھنڈے پانی کی قدر جہنمیوں سے پوچھو:

اللہ کی ہر نعمت عجیب اور نہایت قیمتی ہے، پانی کی نعمت کیا کم ہے؟ یہ نعمت ہم روزانہ استعمال کرتے ہیں، مگر ہمیں اس کی کوئی قدر نہیں، اس کی قدر جہنمی لوگوں سے پوچھو، جن کو صرف گرم گرم کھولتا ہوا پانی ملے گا، حضرت عبداللہ بن عمر نے ایک بار

ٹھنڈا پانی پیا اور رونے لگے اور رونا بھی شدید ہو گیا تو پوچھا گیا کہ کیا بات ہے؟ تو فرمایا کہ مجھے ایک آیت یاد آ گئی، "وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ" (اور ان کافروں اور ان کی خواہشوں کے درمیان آڑ لاگ دی جائے گی)، میں نے اس سے سمجھا کہ جہنمی لوگ صرف ٹھنڈا پانی چاہیں گے۔ (شعب الایمان: ۱۴۹/۴)

مطلب یہ ہے کہ جہنمی لوگوں کو خواہش ہوگی ٹھنڈے پانی کی تو ان سے اس کو ہٹا دیا جائے گا، ان کو نہیں دیا جائے گا، حضرت عبداللہ بن عمر اس کو یاد کر کے روتے تھے کہ آج یہ عظیم نعمت ہم کو مل رہی ہے مگر ہم اس کی قدر نہیں کرتے۔

ٹھنڈے پانی کا شکر بھی ہم سے نہیں ہوسکتا:

یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تعالی کی نعمت کا شکر ہم نہیں کر پاتے، ہمارے اندر اس کی قابلیت ہی نہیں ہے۔

حضرت حسن بصری کے زمانے میں ایک شخص نے زہد کی راہ اختیار کی اور کہا کہ میں خبیص جو کہ ایک قسم کا حلوا گھی اور کھجور سے بنتا ہے اور فالودہ نہیں کھاؤں گا، کیونکہ میں ان نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکتا، حضرت حسن بصری کے سامنے اس کا ذکر کیا گیا تو فرمایا کہ یہ تو احمق ہے، کیا وہ ٹھنڈے پانی کا شکر ادا کر سکتا ہے؟ (شعب الایمان: ۱۳۹/۴)

جب ٹھنڈے پانی کا بھی شکر ہم سے نہیں ہوتا تو کسی اور کا کیا ہوگا؟ اس لئے جس قدر ہو سکے اتنا تو آدمی بندہ ہونے کی حیثیت سے کرے۔

ہر مومن کے دل میں اللہ کی محبت ہوتی ہے لیکن:

ایک بات یہاں سمجھ لیجئے کہ وہ مومن نہیں ہے جس کے دل میں اللہ کی محبت نہ

ہو، جب ہمارے دلوں میں ایمان ہے تو تھوڑی بہت محبت تو ضرور ہوگی، لیکن بعض لوگوں کی محبت راکھ کے ڈھیر میں اندر چھپ گئی ہے، اور بعض کی محبت راکھ سے باہر ہے اور ہوا اس کو اپنے جھونکوں سے بھڑکا رہی ہے اور ہر چیز میں وہ نظر آرہی ہے، ذکر کر رہا ہے تو اس میں بھی اللہ کے محبت کی جھلک ہے، نماز پڑھ رہا ہے تو اس کے اندر بھی محسوس ہو رہی ہے، اور اسی طرح اس کی چال ڈھال سے معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت والا ہے، اس لیے کہ اللہ کی محبت بھڑک رہی ہے۔ بعضوں کی محبت ایسی ہے کہ راکھ کے ڈھیر کے اندر چھپ گئی ہے، راکھ کے ڈھیر کے اندر سے نکال کر اس کو ذرا ہوا کا جھونکا دیا جائے تو انشاءاللہ وہ بھی بھڑکنے لگے گی۔

پہلے زمانے میں لکڑی کے چولہے جلتے تھے، اب بھی بہت جگہ جلتے ہوں گے، قریوں میں، دیہاتوں میں، تو وہاں ایسا ہوتا ہے کہ عورتیں کھانا پکانے کے بعد ایک انگارا اٹھا کر راکھ کے ڈھیر کے اندر چھپا دیتی ہیں؛ کیوں چھپاتی ہیں؟ اس لیے کہ دوسرے وقت کا کھانا جب پکانا ہوتا ہے تو اس کو باہر نکال کر ذرا سی پھونک لگاؤ تو پھر آگ بھڑک جاتی ہے، اور مستقل تیاری کی ضرورت نہیں پڑتی، اس لیے راکھ کے ڈھیر میں اس کو چھپا کر رکھ دیتی ہے۔

اس طرح بہت سارے لوگوں کی محبت الٰہیہ راکھ کے ڈھیر کے اندر چھپ جاتی ہے۔ یہ راکھ کا ڈھیر کیا ہے؟ یہ ہمارے گناہ ہیں، کوتاہیاں اور برائیاں ہیں اور دنیا کی محبتیں ہیں، دنیا کی لالچیں ہیں اور دنیا کی حرص ہے، شہوتیں ہیں اور لذتیں ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں جو ہماری محبت الٰہیہ کے اوپر آگئیں اور اس کو اندر چھپا کر رکھ دیا۔ اب ذرا آپ اس کو باہر نکالیے، اور پھر اس کو ذرا جھونکا دیجئے، جھونکا کس چیز کا؟ اللہ کے ذکر کا جھونکا دیجئے، تلاوت کا جھونکا دیجئے، تو پھر محبت الٰہیہ بھڑکنے لگے

گی اور بھڑ کنے کے بعد وہ آگ کی چنگاری اور چنگاری سے آگ کا شعلہ بن جائے گی اور سب کو جلا دے گی، آپ کے دل میں آ کر تمام لذتوں، نفسانی خواہشوں، نا جائز تمناؤں، شہوتوں سب کو جلا کر خاک کر دے گی۔

پھر دیکھئے اللہ کی محبت کیسے جاگ اٹھتی ہے اور پھر جیسے اولیاء اللہ کے دلوں میں اللہ نے اپنی محبت سما دی ہمارے دلوں میں بھی آ جائے گی، لیکن اس کے لئے محنت کی ضرورت ہے بغیر محنت کے کام نہیں ہوگا، یہ لازم ہے کہ آدمی محنت کرے، بغیر محنت اگر سو سو کر گزارے گا تو اللہ کی محبت کیسے پیدا ہوگی۔

ایک شاعر نے کہا ہے کہ:

يَا نَائِمَ اللَّيلِ مَتىٰ ترقُدُ   قُمْ ياحَبِيبِي قَد دَنَا المَوعِدُ

مَنْ نَامَ حَتّٰى يَنقَضِيَ لَيْلُهٗ   لَمْ يَبْلُغِ الْمَنزِلَ لَوْ يَجْهَدُ

(اے سونے والے کب تک سوئے گا؟ اے میرے پیارے! وقت تو ہو گیا ہے ذرا اٹھ جا، اور جو آدمی پوری رات سو کر گزارتا ہے وہ منزل تک نہیں پہنچتا، اگر چہ کہ جدو جہد کرے)

منزل تک پہنچنے کے لیے ذرا صبح جاگنا ہے، اٹھنا ہے اور رات میں جاگ کر کچھ دیر اللہ تعالیٰ کو پکارنا ہے، پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی محبت کی چنگاری بھڑک اٹھے گی، تو اس لیے محنت ضروری ہے۔

۞ اصل میں اللہ ہی ہم سے محبت کرتے ہیں:

مگر ہماری یہ محنت صرف ایک علامت ہے، ورنہ اصل تو اللہ ہی ہم سے محبت کرتے ہیں، انہی کی محبت کا اثر ہے کہ ہم اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصے بنائے

،ان میں سے ایک حصہ اللہ نے دنیامیں بھیجااور باقی ننانوے رحمتیں اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس رکھی ہیں اوروہ قیامت کے دن کھولے گا اوراسی ایک حصہ کی وجہ سے دنیامیں ماں باپ اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں، جانور بھی اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں ، ایک آدمی دوسرے سے محبت کرتا ہے ۔(مسلم:۲۷۵۲،ترمذی :۳۵۴۱)

یہ دنیامیں جومحبتیں، الفتیں ،تعلقات اورایک دوسرے کے ساتھ رحم وکرم اور سلوک واحسان سب چل رہا ہے،اسی ایک رحمت کی وجہ سے ہے،اب اندازہ کرو کہ ایک رحمت کا حال یہ ہے کہ لوگ محبت میں جان دینے تک تیارہوجاتے ہیں، ماں اسی ایک رحمت کی وجہ سے بچوں پر قربان ہو جاتی ہے ،اگر بچے ذرا بیمار ہوجاتے ہیں تو رات بھراس کی نیند حرام ہوجاتی ہے، ڈاکٹروں کے یہاں دوڑ رہی ہے ، بزرگوں سے دعائیں کرارہی ہے ،اورتعویذات لارہی ہے ۔تووہ خالق ومالک جس کے پاس ایسی رحمت کے ننانوے حصے ہیں اس کی رحمت اورمحبت کا کیا عالم ہوگا، وہ بندوں سے کیسی محبت کرتا ہوگا ؟

مولانا رومیؒ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرماتے ہیں ’’مادراں رامہر من آموختم‘‘ کہ اے لوگو!اور ماؤں کی محبت پر ناز کرنے والو!ماں کومحبت کرنا میں نے ہی تو سکھایا ہے، ان کے جگر میں مامتا میں نے ہی تو رکھی ہے،لہٰذا میری محبت کا کیاعالم ہوگا، ہماری محبت کوبھی سوچا کروکہ جب ہماری مخلوق میں یہ اثر ہے تو ہم تمہارے ساتھ کتنی محبت کرتے ہیں؟

لیکن عام طور پرلوگ سوچتے نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کیسی ہے،ایسی رحمت والے پروردگار سے ہم محبت نہیں کرتے ۔

اسی لئے اللہ تعالی نے قرآن کریم میں فرمایا ہے: ﴿ وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ ﴾ (اورلوگوں نے اللہ کی کما حقہ قدر نہیں کی)

ایک علمی نکتہ:

اس پر مجھے ایک آیت کا اشارہ ذہن میں آ گیا، اللہ تعالی فرماتے ہیں:

﴿ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [آل عمران:]

(اے نبی آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ کو چاہتے ہوتو میری اتباع کرو، اللہ خود تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا، اللہ بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا)

اس میں اللہ تعالی نے اولا یہ بتایا کہ اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہوتو اس کا طریقہ یہ ہے کہ محمد ﷺ کی اتباع کرو، آپ کی سنتوں کو مضبوط تھام لو، پھر یہ بتایا کہ اگر تم نے ایسا کیا تو خود اللہ تم کو چاہنے لگے گا، کیونکہ ہم اللہ کو اس وقت تک نہیں چاہ سکتے، جب تک کہ اللہ ہم کو نہ چاہے۔

ایک شخص نے ایک باندی خریدی، اور اپنے گھر لایا، وہ راتوں میں اُٹھ کر نماز پڑھتی اور روتی اور مناجات کرتی تھی، بڑی اللہ والی اور عابدہ زاہدہ تھی، ایک رات اس شخص نے اس کو دیکھا کہ وہ اللہ کے سامنے رو رہی ہے اور گڑگڑا رہی ہے اور اس طرح مناجات کر رہی ہے کہ ''اے اللہ! تجھے اس محبت کی قسم جو تجھ کو مجھ سے ہے'' یہ شخص اس کو سن کر اس کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ اے عورت! اس طرح نہ کہنا، بلکہ یوں کہنا کہ اے اللہ! جو محبت مجھے تجھ سے ہے اس کی قسم، وہ باندی کہنے لگی کہ جا جا، سو جا، اگر اس کو مجھ سے محبت نہ ہوتی تو وہ تجھے کیوں سلاتا اور مجھے اپنے دربار میں کیوں بلاتا؟ اصل میں اسی کو مجھ سے محبت ہے تب جا کر میں اس سے محبت کرتی ہوں۔

اللہ اکبر! کس قدر عارف باللہ باندی تھی کہ اس حقیقت کو سمجھ لیا، کہ اصل محبت تو اسی کی جانب سے ہوتی ہے۔

ایک شرابی پر اللہ تعالیٰ کی عنایت:

حبیب عجمی ایک بزرگ گزرے ہیں، وہ ایک دفعہ دریائے دجلہ کے کنارے پر بیٹھے ہوئے وضو کررہے تھے، تو وہاں ان کو ایک عجیب تماشا نظر آیا، وہ یہ کہ ایک بڑا کچھوا تھا، ایک بچھو دوڑتے ہوئے آکر اس کی پشت پر بیٹھ گیا، اور کچھوا چل کر پانی میں کود گیا، اب یہ کچھوا اسے لے کر چلنے لگا، ان کو بڑا تعجب ہوا، دل میں خیال آیا کہ کوئی نہ کوئی بات اللہ تعالیٰ کی حکمت کی ظاہر ہونے والی ہے، اس لیے چلو اس کے پیچھے جائیں گے، دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے۔

چنانچہ فوراً ایک کشتی میں بیٹھے اور اسی رخ پر یہ بھی چلنے لگے، دیکھا کہ اس کنارے سے اس کنارے ساحل پر وہ گیا اور کچھوا تو ایک جگہ ٹھہر گیا اور وہ بچھو وہاں سے اُتر کر جلدی جلدی دوڑنے لگا، حبیب عجمی بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگے کہ دیکھیں کہاں جاتا ہے، کچھ دیر بعد دیکھا کہ وہ بچھو جارہا ہے اور دوسری طرف ایک شرابی آدمی شراب کے نشے میں چور وہاں پر پڑا ہوا ہے، اسے کچھ خبر نہیں اور اس کے قریب تک ایک سانپ آ گیا ہے، جو اس شرابی کو کاٹنے کے درپے ہے۔ یہ بچھو گیا اور سانپ پر حملہ کر کے اس کو ماردیا، سانپ مر گیا، بچھوا سے مار کر واپس چلا گیا۔

حبیب عجمی اللہ تعالیٰ کے دربار میں مناجات کرتے ہوئے سربسجود ہو گئے اور کہنے لگے کہ اے اللہ! تیرا کیسا رحم ہے، کیسا کرم ہے، کیسا فضل ہے، کیسا احسان ہے کہ شرابی کو بچانے کے لیے اتنا بڑا انظام چلارہا ہے، ادھر سے سانپ آکر اسے کاٹنے

والا ہے، اس سانپ کو مارنے کے لیے بچھو کو دوسری جگہ سے بھیجا جاتا ہے، اور اس کی سواری کچھوے کو بنایا جاتا ہے، جو ایک دریا کے کنارے سے دوسرے کنارے تک اس کو پہنچاتا ہے، تو رو روکر اللہ تعالیٰ کی تعریفیں بیان کرنے لگے، اتنے میں وہ سویا ہوا آدمی جاگ اٹھا، دیکھا تو یہ بزرگ حبیب عجمی ہیں، کہنے لگا کہ حضرت! آپ یہاں کیسے آئے؟ تو انہوں نے کہا کہ دیکھ بھائی! میں نے ایک عجیب وغیب تماشہ دیکھا ہے، اللہ نے تیری حفاظت کے لیے ایسا ایسا کیا ہے، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، یہ دیکھ سانپ مرا پڑا ہے، جو تیرے سر تک کاٹنے کے لیے آگیا تھا، اگر ذرا بھی تاخیر ہوتی تو تجھے یہ ڈس لیتا، لیکن اللہ نے فوراً ایک بچھو کے ذریعہ اس کو ختم کرایا اور تیری حفاظت کی، یہ سن کر وہ شرابی بھی رونے لگا اور اللہ تعالی کی اس عجیب وغریب رحمت پر شکر بجالایا اور اپنے گناہوں سے تائب ہوگیا۔

بہرحال اللہ تعالی سے محبت کرنا ہمارا فرض ہے اور دنیا اور دنیا کی چیزوں سے لو نہ لگانا بھی اس کے لئے ضروری ہے۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالی ہم سب کو اپنی محبت کاملہ عطاء فرما کر اپنے محبوبین میں شامل فرمالے۔

و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عشق رسول اور اس کے تقاضے

الحمدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ، اَمَّا بَعْدُ: فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ ﷺ: لَایُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی أَکُوْنَ أَحَبَّ إِلَیْہِ مِنْ نَفْسِہٖ وَوَالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِیْنَ۔

محبت الٰہیہ کی دو قسمیں:

محبت الٰہیہ کی دو قسمیں ہیں: ایک کو محبت فی اللہ کہتے ہیں اور ایک کو محبت للہ کہتے ہیں، محبت فی اللہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے محبت کی جائے، اور محبت للہ کا مطلب یہ ہے کہ کسی نیک وصالح بندے سے اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت کی جائے۔

جن بندوں سے اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت کی جانی چاہئے، ان میں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام، حضرات صحابہ کرام علیہم الرضوان، حضرات ائمہ وفقہاء عظام اور حضرات اولیاء کرام علیہم الرحمۃ کی ذوات مقدسہ داخل ہیں، پھر ان میں سے سب سے اولین درجہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو حاصل ہے، بلکہ ان سے محبت ایمان کا جزء لازم ہے، پھر حضرات انبیاء کرام میں سے بھی سب سے مقدم واہم ہمارے اور آپ کے مقدس ومحترم نبی سرور کائنات فخر موجودات رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کی ذات والا صفات ہے۔

عشقِ نبوی، اصل ایمان ہے:

اس لئے حضرت سرور عالم محبوب دوعالم ﷺ سے عشق ومحبت، ایمان کے لیے

لازم اورضروری ہے، کوئی شخص اس وقت تک ایمان داراور مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ آپ اسے محبت نہ کرے اور محبت بھی کیسی؟ ایسی کہ دنیا کے تمام رشتے وتعلقات اس پرقربان ہوں، مال ودولت اس پر نثاراور دل وجان اس پر نچھاور ہوں، ماں باپ، بھائی بہن، بیوی بچے، رشتہ دار واحباب سب ایک طرف اورحضرت نبی کریم ﷺ کی محبت ایک طرف ہو،تو مؤمن کی شان یہ ہے کہ وہ ان سب کے مقابلہ میں آپ کی محبت کو ترجیح دیتا ہے، مال ودولت کے انبار ہوں، زیب وزینت کی بہار ہو، آرام وراحت کے اسباب ہوں، مزیدار کھانے اورمشروبات ہوں، خوش منظر ملبوسات ہوں، شاندار وفلک بوس عمارات ہوں، ہر چیز کو وہ محبت وعشق نبوی میں قربان کرنا اپنا فریضہ سمجھتا ہے اور اسی کے ساتھ اس کی طبیعت بھی اسی کا اقتضاء کرتی ہے۔

میں نے ابھی جو حدیث آپ کے سامنے پڑھی ہے اس میں اسی بات کو ان الفاظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے:

”لَایُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی أَکُوْنَ أَحَبَّ إِلَیْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِیْنَ “(تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے ماں باپ،اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں۔(بخاری:۱۴،مسلم:۶۳)

ایک اورحدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کوئی بندہ (یا یہ فرمایا کہ) کوئی آدمی مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ مجھے اپنے اہل وعیال و مال سے زیادہ محبوب نہ رکھے۔(مسلم:۴۹/۱)

حضرت عمرؓ کا واقعہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی جناب میں عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ مجھے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں، سوائے میرے نفس کے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا نہیں، خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ میں تمہارے نفس سے زیادہ تم کو محبوب نہ ہو جاؤں۔ پھر حضرت عمر نے فرمایا کہ خدا کی قسم اب آپ مجھے میری ذات سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں! اب (ایمان مکمل ہوا) اے عمر۔ (بخاری: ۲/ ۹۸۱)

ان تمام احادیث سے یہ بات نکلتی ہے کہ ہر چیز سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کی محبت ہونا چاہئے اور یہ ایمان کا تقاضا ہے، بلکہ اصل ایمان ہے۔

علامہ نوویؒ ایک عظیم محدث گذرے ہیں، جنہوں نے مسلم شریف کی شرح لکھی ہے، اور دیگر بہت سی حدیثی خدمات انجام دی ہیں، انہوں نے شرح مسلم میں لکھا ہے کہ:

''قاضی عیاض نے فرمایا کہ ایمان کی حقیقت بغیر محبت نبوی کے مکمل نہیں ہوتی اور رسول اللہ ﷺ کی قدر و منزلت کو ہر والد، ہر بچے، ہر فضل و احسان کرنے والے کی قدر و منزلت پر بلند کیے بغیر ایمان صحیح نہیں ہوتا، اور جو شخص اس بات پر عقیدہ نہ رکھے اور اس کے علاوہ پر اعتقاد رکھے تو وہ مؤمن ہی نہیں ہے۔'' (شرح مسلم: ۱/ ۴۹)

معلوم ہوا کہ حب نبی اصل ایمان ہے، جس طرح اللہ کی محبت اصل ایمان ہے اور جیسے محبت الٰہی کے بغیر ایمان صحیح نہیں ہوتا، بالکل اسی طرح محبت نبوی کے بغیر ایمان کا تحقق نہیں ہوتا۔

محبت کی تین قسمیں، شرح حدیث:

ابھی جو احادیث میں نے نقل ہیں، ان میں غور کیجئے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مومن کو اپنے والد، اپنی اولاد اور دیگر تمام لوگوں کی محبت سے زیادہ آپ سے محبت رکھنے کا حکم فرمایا ہے، یہاں ان تین قسم کے لوگوں کا ذکر کر کے ایک اہم نکتہ کی جانب اشارہ کیا ہے۔

وہ یہ کہ علامہ ابن بطال، قاضی عیاض وغیرہ حضرات نے بیان کیا ہے کہ محبت تین قسم کی ہوتی ہے:

(۱) محبت عظمت (۲) محبت شفقت (۳) محبت احسان۔

محبتِ عظمت جیسے بچوں کو بڑوں سے محبت ہوتی ہے، مثلاً باپ دادا، استادو پیر وغیرہ بڑوں سے جو محبت ہوتی ہے یہ محبت عظمت کی بنا پر ہوتی ہے، اسی کو محبت عظمت کہتے ہیں۔ اور محبت شفقت وہ محبت ہے جس کی بنا شفقت و پیار ہو، جیسے اپنی اولاد اور دیگر بچوں بڑوں کو جو محبت ہوتی ہے وہ شفقت و پیار کی بنا پر سے ہوتی ہے، یہی محبت شفقت ہے۔ اور محبت احسان جس کی بنا احسان و کرم ہوتا ہے، جیسے عام لوگوں کو ایک دوسرے سے ہوتی ہے کہ کسی نے احسان کیا تو اس سے محبت ہوگئی۔

علماء نے فرمایا کہ حدیث میں والد کا ذکر کر کے محبت عظمت کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ محبت عظمت سب سے زیادہ مجھ سے ہونا چاہئے، اور جو اس محبت میں دوسروں کو مجھ پر ترجیح دے وہ کامل ایمان والا نہیں۔ اور اولاد کا ذکر کر کے محبت شفقت کی جانب اشارہ کرنا مقصود ہے کہ محبت شفقت بھی سب سے زیادہ مجھ سے ہونا چاہئے۔ اور دیگر لوگوں کے تذکرہ سے مقصود یہ بتانا ہے کہ جس طرح لوگ ایک دوسرے سے احسان وفضل کی وجہ سے محبت رکھتے ہیں، یہ محبت

احسان بھی مجھ سے غالب ہونا چاہئے۔(شرح مسلم:۴۹/۱)

ایک اور نکتہ:

علماء کے اس کلام میں باپ، اولاد اور دیگر لوگوں سے محبت پر حضور سرور عالم ﷺ کی محبت کو غالب کرنے کے بارے میں حدیث میں مذکوران تین قسم کے لوگوں کی تخصیص کی حکمت بتائی گئی ہے، مگر بعض اور روایات میں جو اہل و مال اور نفس کا ذکر آتا ہے اس سے کس جانب اشارہ ہے؟ احقر کے خیال میں یہ آتا ہے کہ نفس سے اشارہ ناجائز خواہشات کی طرف اور مال سے تمام دنیوی ساز و سامان و اسباب کی طرف ہے اور اہل یعنی بیوی سے تمام جائز خواہشات کی طرف اشارہ ہے، تو حدیث کا حاصل یہ ہے کہ تمام جائز و ناجائز خواہشات اور تمام دنیوی اسباب و ساز و سامان پر جب تک نبی کریم ﷺ کی محبت کو ترجیح نہ دے گا، کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا۔

محبت عقلی و طبعی میں کون افضل ہے؟

میں عرض کرتا ہوں کہ یہاں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ حدیث میں نفس سے اشارہ محبت طبعی کی طرف ہو، اور دوسری چیزوں سے اشارہ محبت عقلی کی طرف ہو، اور اس احتمال پر یہاں ایک بحث یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ نبی کریم ﷺ سے جو محبت ہونا چاہئے وہ محبت طبعی ہے یا محبت عقلی؟ جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ مراد محبت عقلی و محبت ایمانی ہے، محبت طبعی مراد نہیں۔(فتح الباری :۵۹/۱، شرح مسلم :۴۹/۱، مرقات:۷۳/۱)

جمہور علماء کا کہنا یہ ہے کہ محبت طبعی غیر اختیاری ہوتی ہے اور پھر محض ایک جذباتی چیز ہے جس کو پائیداری حاصل نہیں، اس لیے انسان اس کا مکلّف نہیں

ہوسکتا اور اس کے برخلاف محبت عقلی اختیاری بھی ہوتی ہے اور پائیدار بھی ہوتی ہے، اس لیے محبت عقلی ہی مراد ہے اور افضل بھی وہی ہے۔

مگر حضرات صوفیاء میں سے بعض کہتے ہیں کہ قرآن وحدیث میں اللہ ورسول سے محبت سے مراد محبت طبعی ہے اور وہ حضرات اسی کو افضل قرار دیتے ہیں، مگر اس سلسلہ میں میرے مرشد روحانی حضرت مسیح الامت ایک گہری بات فرمائی ہے، وہ یہ کہ محبت طبعی مطلوب نہیں، بلکہ محبت عقلی مطلوب ہے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ حب عقلی والوں یعنی کاملین میں حب طبعی نہیں ہوتی بلکہ مطلب یہ ہے کہ غلبہ حب عقلی کو ہوتا ہے، باقی جن پر حب عقلی کا غلبہ ہوتا ہے بعض اوقات ان میں محبت طبعی بھی ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے جن پر محبت طبعی کا غلبہ ہے، مگر وہاں محبت طبعی پر حب عقلی غالب ہوتی ہے، اس لیے جوش دبا رہتا ہے، لیکن گاہے گاہے کاملین پر بھی حب طبعی کا غلبہ ہوتا ہے۔

بہرحال کاملین تو حب عقلی اور حب طبعی دونوں کے جامع ہوتے ہیں، مگر ان میں غلبہ عقلی کو ہوتا ہے، اور ناقصین میں حب طبعی کا غلبہ ہوتا ہے، یہ کمال گو مطلوب نہیں مگر محمود ضرور ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ افضل واعلیٰ اور مامور بہ تو محبت عقلی ہی ہے، البتہ محبت عقلی سے پھر محبت طبعی بھی عموماً پیدا ہو جاتی ہے، گویا محبت عقلی کے بعد محبت طبعی کا بھی حاصل ہو جانا، یہ انتہائی کمال اور انتہائی محبت وعشق کی بات ہے۔

۞ حضرت عمرؓ کے واقعہ کی شرح:

اور غالباً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں جو ابھی عرض کیا گیا، اسی کی

جانب اشارہ ہے، حضرت عمرؓ کا واقعہ اوپر عرض کر چکا ہوں کہ آپ نے ایک دفعہ نبی کریم ﷺ کی جناب میں عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ مجھے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں، سوائے میرے نفس کے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا نہیں، خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ میں تمہارے نفس سے زیادہ تم کو محبوب نہ ہو جاؤں۔ اس پر حضرت عمر نے فرمایا کہ خدا کی قسم! اب آپ مجھے میری ذات سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اب (ایمان مکمل ہوا) اے عمر۔

اس واقعہ میں علماء محدثین نے کافی کلام کیا ہے، بعض نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ نے پہلے تو یہ سمجھا کہ محبت طبعی مامور بہ ہے اور میں اپنے اندر نفس کے بارے میں اس کو نہیں پاتا، لہٰذا اولاً یہ عرض کیا کہ سوائے میرے نفس کے آپ مجھے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں، مگر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنی ذات سے بھی زیادہ مجھ سے محبت نہ رکھو، تو حضرت عمرؓ سمجھ گئے کہ مراد محبت عقلی ہے اور وہ اپنی ذات کے اعتبار سے بھی حضور ﷺ ہی سے زیادہ ہے، تو دوبارہ عرض کیا کہ میں میری ذات سے بھی زیادہ آپ سے محبت رکھتا ہوں۔ (دیکھو فتح الباری: ۱۱/۵۲۸، مرقات: ۱/۴۷)

اور حضرت ملا علی قاری نے ایک توضیح یہ بیان کی ہے اور واقعی بڑی لطیف توضیح وعجیب بات فرمائی ہے، وہ یہ کہ حضرت عمرؓ کو محبت عقلی وایمانی تو حضور سرور عالم ﷺ سے ایسی حاصل تھی کہ کسی چیز حتی کہ ذات سے بھی ایسی نہیں تھی اور یہی محبت عقلی مؤمن پر فرض وواجب ہے۔ البتہ محبت طبعی اپنی ذات سے زیادہ نہ تھی لہٰذا حضرت عمرؓ نے اس کی شکایت رسول اللہ ﷺ سے کی کہ مجھے ہر چیز سے زیادہ آپ سے طبعی

طور پر بھی محبت ہے جیسے عقلی طور پر ہے، البتہ اپنی ذات سے طبعی محبت آپ کی محبت پر غالب پاتا ہوں، تو اس وقت نبی کریم ﷺ نے اپنی روحانی توجہ حضرت عمرؓ کی طرف فرمائی اور اس توجہ کا یہ اثر ہوا کہ حضرت عمرؓ کے دل میں آپ کی طبعی محبت بھی اپنی ذات سے زیادہ اور غالب ہوگئی اور اس بات کو آپ کے سامنے حضرت عمرؓ نے ظاہر کیا تو آپ نے فرمایا کہ اب تمہارا ایمان کامل ہوگیا۔ (دیکھو: مرقات: ۱/۴۷)

غرض یہ کہ درجۂ فرض میں تو محبت عقلی مراد ہے اور درجۂ استحسان میں محبت طبعی مراد ہے۔ لہٰذا چاہئے کہ ہم نبی کریم ﷺ سے ایسی محبت رکھیں کہ کسی سے ایسی محبت نہ ہو، آپ کی محبت کے سامنے ہر چیز ہیچ ہو، لغو ہو، بے حیثیت ہو، بے وقعت ہو۔

آپ علیہ السلام سے محبت غالبہ کا مطالبہ:

اسی لیے قرآن نے آپ سے محض محبت کا مطالبہ نہیں کیا، بلکہ آپ سے محبت غالبہ رکھنے کا مطالبہ کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

﴿قُلْ إِن كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُواْ حَتَّى يَأْتِيَ اللّهُ بِأَمْرِهِ وَاللّهُ لاَ يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴾[التوبۃ:]

(اگر تمہارے آباء واجداد، تمہاری اولاد، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان، تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہاری وہ تجارت جس کے گھاٹے کا تم کو خطرہ ہوتا ہے اور تمہارے مکانات جس کو تم پسند کرتے ہو، یہ سب چیزیں اگر تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اللہ کے راستے میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو تم انتظار کرو کہ اللہ اپنا حکم (عذاب) لے آئے اور یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ فاسقوں کو ہدایت

نہیں دیتا)

علامہ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ یہ آیت حضور کی محبت کے لازم ہونے ،فرض ہونے اوراس کے عظیم ہونے اور محبت کے آپ کے حق ہونے پر کافی طور پر دلالت وتنبیہ کرتی ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو دھمکایاہے جوآپ سے زیادہ کسی اور کومحبوب رکھتا ہو،اوراس کووعید سنائی ہے کہ اللہ کے عذاب کا انتظار کرو۔اوران کوفاسق قرار دیا ہےاور بتایا ہے کہ یہ لوگ گمراہ ہیں اوراللہ نے ان کو ہدایت نہیں دی ہے۔(شفا:۲/۱۷)

امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ یہ آیت بہت سخت ہے،اتنی سخت آیت قرآن مجید میں کوئی اورنہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دوسروں کی محبت کواپنی محبت پرغالب کرنے والوں کوعذاب کی دھمکی دی ہے۔معلوم ہوا کہ بہت سخت بات ہے کہ اللہ ورسول کی محبت کوچھوڑکرکسی اور کی محبت کوزیادہ کرلیاجائے،غالب کرلیاجائے۔

غرض یہ کہ اس آیت میں یہ مطالبہ ہے کہ اللہ ورسول کوسب چیزوں سے زیادہ محبوب رکھو،اگراتنی ہی محبت اللہ ورسول سے کیا جتنی کہ ماں باپ سے،اپنی اولاد سے، بیوی سے، مال ودولت، تجارت وملازمت سے محبت ہے تووہ بھی اس وعید کا مستحق ہے،لہٰذا آپ سے محض محبت کافی نہیں، بلکہ غالب محبت ہونا چاہئے۔

عشقِ نبوی ﷺ کا ثمرہ:

جب ایسی محبت ہوگی تواس کا ثمرہ کیاہے؟ اس کا ذکر حدیث میں ہے کہ ایک صحابیؓ ایک دفعہ نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اورعرض کیا کہ اے

اللہ کے رسول آپ مجھے میرے اہل وعیال اور مال سے زیادہ محبوب ہیں اور میں آپ کو یاد کرتا ہوں تو صبر نہیں آتا، پس میں آتا ہوں اورآپ کی زیارت کرتا ہوں اور جب میں آپ کے وصال اور میرے مرنے کو یاد کرتا ہوں تو پریشان ہو جاتا ہوں کیوں کہ جانتا ہوں کہ آپ جنت میں نبیوں کے ساتھ بلند درجات میں ہوں گے اور میں وہاں آپ کو دیکھ نہ سکوں گا۔

ان صحابی کی اس کیفیت پر جواب میں، ان کو تسلی دینے کے لئے اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿وَمَن يُطِعِ اللّهَ وَالرَّسُولَ فَأُوْلَـئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاء وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَـئِكَ رَفِيقاً﴾ [سورہ نساء:۶۹]

(اور جو اللہ ورسول کی اطاعت کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا، یعنی انبیاء کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین اور یہ لوگ بہترین ساتھی ہیں)

اس آیت کے نازل ہونے پر نبی کریم ﷺ نے ان صحابی کو بلا کر یہ آیت سنادی۔ (تفسیر ابن: ۵۲۲/۱)

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک تو یہ کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ عشق ومحبت کا ثمرہ یہ ہوگا کہ اس کو ان حضرات کی صحبت جنت میں بھی نصیب ہوگی۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ سچی محبت وہی ہے جس میں اطاعت ہو؛ کیوں کہ قرآن نے ان صحابی کے جواب میں اور ان کی تسلی کے لیے یہ فرمایا کہ جو اللہ ورسول کی اطاعت کریں گے وہ ان حضرات کے ساتھ ہوں گے، اس میں اشارہ ہے کہ محض

دعویٰ محبت وعشق سے یہ دولت نصیب نہیں ہوگی، بلکہ محبت کے ساتھ اطاعت ہوتب یہ دولت حاصل ہوگی، ورنہ اللہ تعالیٰ ان صحابی کا جواب یوں فرماتا"من یحب اللّٰہ والرسول فاولئك مع الذین انعم اللّٰہ علیھم" (کہ جواللہ ورسول سے محبت کریں گے وہ ان حضرات کے ساتھ ہوں گے) مگراس کے بجائے اطاعت کا ذکر کیا۔معلوم ہوا کہ اصلی و سچی محبت وہی ہے جس میں اپنے محبوب کی اطاعت کا جذبہ ہو،یہی چیز انسان کومراتب عالیہ پرفائز کرتی ہے۔

عشق رسول کا بےنظیر نمونہ:

حضرات صحابۂ کرام کی حضرت رسول اکرم ﷺ سے محبت وعشق کا عجیب حال تھا، اوپرجوآیت ایک صحابی کے واقعہ میں پیش کی گئی، یعنی" من یطع اللّٰہ والرسول" الخ اس کے شان نزول میں مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہ ؓ نے حاضرخدمت ہوکرعرض کیا کہ یارسول اللہ !جب آپ بھی انتقال فرماجائیں گےاورہم بھی مرجائیں گے،تو آپ علیین میں ہوں گے، جہاں سے ہم نہ آپ کودیکھ سکیں گے اور نہ آپ کے ساتھ جمع ہوسکیں گے، پھرانھوں نے اس پر بڑے ہی حزن اورغم کااظہارکیا،تواللہ نے یہ آیت نازل فرمائی،(جس میں ہے کہ اللہ ورسول کی اطاعت جوبھی کرے گا وہ انبیاء ،صدیقین ،شہداء اورصالحین کے ساتھ ہوگا)۔

انہی حضرت عبداللہ ؓ کے بارے میں آیاہے کہ جب نبی کریم ﷺ کاوصال ہواتوانہوں نے دعا کی کہ "اللّٰھُمَّ أَعِمّنِیُ حتّی لَا أَرٰی شَیًأً بعدَہٗ "(یعنی اے اللہ! مجھ کواندھا کردے تا کہ نبی کریم ﷺ کے بعدکسی چیزکونہ دیکھ سکوں)،ان کی

یہ دعاءفوراً قبول ہوئی اوراسی وقت وہ نابینا ہوگئے۔(تفسیر قرطبی:۲۷۱/۵)

اللہ اکبر! کیا عشق تھا،محبوب دوعالم ﷺ کے ساتھ کہ آپ کے بعداپنی آنکھوں سے کسی کودیکھنا بھی نہیں چاہتے تھے،گویا یہ آنکھیں صرف اس لیے تھیں کہ حضور ﷺ کی ان سے زیارت کریں جب آپ کا وصال ہو گیا تو اب اس کا امکان نہ رہا تو آنکھوں کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی، وہ آنکھیں کس کام کی جن سے محبوب کا دیدارنہ ہو۔

حضرت ثوبانؓ کا عشق:

ایک اورصحابی حضرت ثوبانؓ ہیں جورسول اللہ ﷺ کے آزادکردہ غلام ہیں،ان کا حضرت نبی کریم ﷺ کے عشق ومحبت میں یہ حال ہوگیا کہ ایک دفعہ حاضرخدمت ہوئے اوررنگ بدلا ہواتھااورجسم نحیف وکمزورہوگیا تھااورچہرہ پرغم اورحزن کے آثار نمایاں تھے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اے ثوبان! تمہارارنگ کیوں بدلا ہواہے؟ حضرت ثوبان نےعرض کیا کہ نہ مجھےکوئی نقصان ہوااورنہ درد ہے؟ لیکن بات یہ ہے کہ جب میں آپ کونہیں دیکھتا تو بےقرارہوجاتا ہوں اورشدید وحشت وگھبراہٹ محسوس کرتا ہوں اورجب تک آپ کونہ دیکھ لوں اورآپ سے نہ مل لوں قرارنہیں آتا۔جب میں نے آخرت کا معاملہ سوچا تواندیشہ ہوا کہ میں وہاں آپ کونہ دیکھ سکوں گا؛ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ آپ انبیاء کےساتھ بلندترین مقام پرہوں گے اورمیں اگر جنت میں داخل بھی ہواتو آپ کے درجہ سے کم درجہ پررہوں گا اوراگرجنت میں داخل ہی نہ ہوسکا تو پھرکبھی بھی آپ کونہ دیکھ پاؤں گا،یہ سوچ کرمجھ کوغم ہوگیااوریہ حال ہوگیاہے۔مفسرین نے لکھا ہے کہ انہی کے اس واقعہ پروہ

آیت نازل ہوئی جو اوپر پیش کی گئی ہے۔ (قرطبی: ۵/۲۷۱)

ایک طالب علمانہ شبہ کا جواب:

یہاں ایک طالب علمانہ شبہ پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ اوپر پیش کردہ آیت اور روایت سے معلوم ہوا کہ اللہ ورسول کی محبت کا یہ ثمرہ ہے کہ محبت رکھنے والے انبیاء و صدیقین، شہداء وصالحین کے ساتھ جنت میں رہیں گے، حالانکہ یہ بدیہی البطلان ہے؛ کیوں کہ اس سے لازم آتا ہے کہ انبیاء وغیر انبیاء کا درجہ ایک ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت وحدیث میں معیت اور ساتھ ہونے کا جو ذکر ہے اس سے مراد ایک خاص معیت اور صحبت ہے، اور وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے درجے اور منزل میں رہتے ہوئے حسب ضرورت وموقعہ آپ کی زیارت وملاقات کا شرف پاسکے گا، جیسے دنیا میں آپ کی ملاقات وزیارت سے صحابہ کرام مشرف ہوتے تھے۔

چنانچہ ملاعلی قاریؒ نے فرمایا کہ اس سے مراد معیت خاصہ ہے اور وہ یہ ہے کہ جنت میں محبّ ومحبوب کے درمیان ملاقات کا موقعہ حاصل ہوگا، یہ مراد نہیں کہ وہ دونوں ایک ہی درجہ میں ہوں گے؛ کیوں کہ یہ بدیہی طور پر باطل ہے۔ (مرقات: ۹/۲۵۱)

اور علامہ قرطبیؒ نے فرمایا کہ ساتھ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک مقام پر اور ایک ہی قسم کی نعمتوں میں ہوں گے اور ایک دوسرے سے ملاقات اور ایک دوسری کی زیارت سے متمتع ہوں گے۔ یہ معنیٰ نہیں کہ وہ سب درجے میں برابر ہوں گے؛ کیوں کہ ان کے درجات الگ الگ ہوں گے، لیکن وہ ایک دوسرے کی زیارت کریں گے، بوجہ اس کے کہ دنیا میں اتباع واقتداء کرتے تھے۔ (قرطبی: ۵/۲۷۲)

اور علامہ آلوسی بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ معیت سے مراد درجہ میں اتحاد نہیں ہے اور نہ مطلق دخول جنت میں اشتراک مراد ہے، بلکہ یہ مراد ہے کہ وہ وہاں ایسا رہیں گے کہ ان میں ہر ایک کو دوسرے کی دیدار وزیارت کا موقعہ ملے گا، اگر چہ ایک کی جگہ دوسرے سے مسافت بعیدہ پر ہو۔ (روح المعانی: ۷۸/۵)

غرض یہ کہ جن کے دل عشق ومحبت نبوی سے سرشار ہوں گے، ان کو وہاں آپ کی زیارت اور ملاقات کا موقعہ ملے گا، اسی بات کو احادیث میں معیت سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ نہیں کہ محبت والے آپ کے درجہ میں رہیں گے۔

بھائیو! مگر یہ دولت بھی کیا کم ہے کہ آپ سے محبت کے نتیجہ میں آپ کی زیارت اور ملاقات کا شرف جنت میں بھی ملتا رہے۔ خدا کی قسم اگر کچھ نہ ملتا اور جنت میں صرف یہی دولت ونعمت مل جاتی تب بھی یہ سودا بہت سستا تھا۔

اسلام کے بعد صحابہ کی سب سے بڑی خوشی:

اسی وجہ سے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اس وقت نہایت درجہ خوش ہوئے جب کہ نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ " اَلْمَرْأُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ " (آدمی جنت میں اس کے ساتھ ہوگا جس سے محبت رکھے گا)۔

اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت نبی کریم ﷺ کی خدت میں ایک شخص حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! قیامت کب ہوگی؟ آپ نے اس سے پوچھا کہ تم نے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے؟ ان صاحب نے عرض کیا کہ میں نے کچھ تیاری نہیں کی ہے، مگر یہ کہ میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ تم اس کے ساتھ ہوگے جس سے محبت کرتے ہو۔

حضرت انس بن مالکؓ اس حدیث کے راوی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے مسلمانوں یعنی صحابہ کرام کو نہیں دیکھا تھا کہ وہ اسلام کے بعد کسی چیز سے اس قدر خوش ہوئے ہوں جتنا کہ آپ کے اس ارشاد سے خوش ہوئے۔(مشکل الآثار:۱/۴۲۱)

ایک حدیث میں ہے کہ اس شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں نے نہ روزوں کی کثرت سے، نہ نماز کی کثرت سے، نہ صدقے کی کثرت، کسی سے تیاری کی نہیں ہے، لیکن میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہوں۔(بخاری:۲/۱۰۵۹)

ابن حجر نے لکھا ہے کہ یہ صاحب جنہوں نے سوال کیا تھا، حضرت ذوالخویصرہ یمنیؓ تھے اور انہیں نے ایک دفعہ اسلام لانے سے قبل مسجد میں پیشاب کر دیا تھا۔ (فتح الباری:۱۱/۵۵۵)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرات صحابۂ کرام کے لیے یہ بہت ہی زیادہ خوشی کا موقعہ تھا جب کہ حضور اقدس ﷺ نے یہ فرمایا کہ آدمی اس کے ساتھ ہوگا جس سے محبت رکھے گا۔ اسی طرح ہر مسلمان کے لیے یہ ارشاد خوشی وسرور کا پیغام ہے اور امید کی ایک کرن ہے، ورنہ ہمارے پاس کون سا ایسا عمل ہے کہ جنت کی تمناوآرزو کر سکیں۔

غرض یہ کہ یہ محبت بڑی دولت ونعمت ہے کہ جنت میں اللہ کے رسول علیہ السلام کی زیارت وملاقات کا موقعہ مل جائے، مگر یہ دولت کس کو نصیب ہوگی؟ عشق ومحبت نبوی میں جو سچا اور پکا ہو، اس کو یہ دولت نصیب ہوگی، لہٰذا آپ سے سچی و پکی محبت پیدا کرنا چاہئے۔

آپ علیہ السلام میں تمام اسباب محبوبیت جمع ہیں:

اور کیوں نہ ہو جب کہ آپ کے اندر وہ سارے اسباب جمع ہیں جو کسی کو مقام

محبوبیت تک پہنچاتے ہیں، اور پھر ہر سبب علی وجہ الکمال آپ میں پایا جاتا ہے۔ جمال میں دیکھوتو آپ بے مثال ہیں، کمال میں دیکھوتو آپ بے نظیر ہیں، عطا ونوال میں دیکھوآپ لاثانی ہیں، آپ کی ہر چیز نرالی وعجیب ہے، لہٰذا خدا تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ چاہے جانے اور محبت کیے جانے کے قابل کوئی ہے تو وہ آپ ہی کی ہستی ہے۔

جمال محمدی ﷺ:

چنانچہ حسن وجمال کے لحاظ سے آپ کی کوئی مثال نہیں ہے، عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت سیدنا یوسف علیہ السلام دنیا میں سب سے زیادہ حسین تھے، مگر یہ اپنی جگہ صحیح ہے، مگر اس عموم میں حضرت رسالت پناہ ﷺ داخل نہیں ہیں۔ حضرت یوسفؑ دنیا کے تمام حسینوں میں سب سے زیادہ حسین تھے اور تمام جمیلوں میں سے زیادہ صاحب جمال تھے، مگر حضرت محمد ﷺ سے زیادہ نہیں، کیوں کہ آپ کا حسن وجمال، حضرت یوسفؑ سے بھی بڑھا ہوا تھا۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ کیا رسول اللہ ﷺ کا چہرہ تلوار کی مانند چمک دار تھا؟ تو حضرت براء نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ آپ کا چہرۂ انور تو چاند کی طرح تھا۔ (شمائل ترمذی:۲، مشکوۃ:۵۱۵)

ایک صحابی حضرت کعب بن مالک فرماتے ہیں کہ جب آپ خوش ہوتے تو آپ کا چہرہ چمک اٹھتا، گویا کہ چاند کا ٹکڑا ہے اور یہ بات ہم سب جانتے تھے۔ (مشکوۃ:۵۱۷)

حضرت ربیع بنت معوذ بن عفراء نے فرمایا کہ اگر تم حضور ﷺ کو دیکھتے تو گویا تم سورج کو دیکھتے۔ (مشکوۃ:۵۱۷)

حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ چاندنی رات میں میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، پس کبھی میں آپ کی طرف نظر کرتا اور کبھی چاند کو دیکھتا، اس وقت آپ کے جسم مبارک پر سرخ چادر تھی، پس آپ چاند سے بھی زیادہ حسین تھے۔ (شمائل ترمذی:۲)

حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ حسین کسی چیز کو نہیں دیکھا، گویا کہ سورج آپ کے چہرۂ انور میں چل رہا ہے۔ (مشکوۃ ۵۱۸)

حضرت عائشہ وحضرت حسان کے اشعار:

حضرت عائشہ صدیقہؓ کے دو شعر آپ کے حسن و جمال کی تعریف میں بڑے عجیب ہیں، وہ کہتی ہیں:

فَلَوْ سَمِعُوْا فِيْ مِصْرَ أَوْصَافَ خَدِّهٖ
لَمَا بَذَلُوْا فِيْ سَوْمِ يُوْسُفَ مِنْ نَقَدٖ
لَوَاحِيْ زُلَيْخَا لَوْ رَأَيْنَ جَبِيْنَهٗ
لَآثَرْنَ بِالْقَطْعِ الْقُلُوْبَ عَلَى الْأَيْدٖ

جس کا خلاصۂ مضمون یہ ہے کہ اگر مصر والے نبی کریم ﷺ کے رخ انور کے اوصاف سن لیتے تو حضرت یوسف کے سودے میں کچھ نقد مال نہ لگاتے، اور اگر زلیخا کی سہیلیاں آپ کی جبین کو دیکھ لیتیں تو ہاتھ کے بجائے اپنے دلوں کو چاک کر ڈالتیں۔

اور شاعر رسول حضرت حسانؓ کے اشعار ہیں:

وَأَحْسَنَ مِنْكَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَيْنِيْ

وَأَجْمَلَ مِنْكَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ
خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِّنْ كُلِّ عَيْبٍ
كَأَنَّكَ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

(یعنی آپ سے زیادہ حسین میری آنکھ نے قطعاً نہیں دیکھا، اور آپ سے زیادہ جمیل عورتوں نے نہیں جنا، آپ ہر عیب سے پاک پیدا کئے گئے ہیں، گویا آپ ایسے پیدا ہوئے ہیں جیسے خود آپ نے چاہا ہو)

❁ جمال نبویؐ پر مزید روایات:

یہ تو آپ کے چہرۂ انور کے جمال کا حال ہے، اس کے علاوہ ایک صحابی حضرت سراقہؓ فرماتے ہیں کہ میں آپ کی پنڈلی دیکھنے لگا گویا کہ وہ انگارہ ہے (یعنی سرخ ہے) اور مہرش الکعبیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کی پیٹھ دیکھی گویا کہ وہ چاندی کی تختی ہے۔ (فتح الباری: ۵۷۰/۶)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بالکل گورے رنگ کے تھے اور آپ کا پسینہ موتی معلوم ہوتا تھا اور فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی دیباج اور ریشم کا کپڑا ابھی ایسا نہیں چھوا جو رسول اللہ ﷺ کی ہتھیلی سے زیادہ نرم ہو اور نہ کوئی مشک اور عنبر ایسا سونگھا جو نبی کریم ﷺ کی خوشبو سے زیادہ خوشبودار ہو۔ (مشکوۃ: ۵۱۷)

حضرت ام سلیمؓ رسول اللہ ﷺ کا پسینہ جمع فرماتیں اور اسے عطر میں ملا دیتیں جب حضور ﷺ نے دریافت کیا کہ یہ کیا ہے؟ فرمایا کہ یہ آپ کا پسینہ ہے، ہم ہمارے عطر میں اس کو ڈال لیتے ہیں اور وہ سب سے زیادہ عمدہ عطر ہوتا ہے۔ (مشکوۃ: ۵۱۷)

حضرت انسؓ کی جب وفات ہونے لگی تو وصیت فرمائی کہ اس عطر میں سے ان کو بھی لگایا جائے۔ (مرقات: ۱۱/۷۹)

حضرت جابر بن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے میرے گال پر اپنا ہاتھ پھیرا تو میں نے اس کی ٹھنڈک اور خوشبو محسوس کی گویا کہ وہ ابھی ابھی عطار کی شیشی میں ڈال کر نکالا گیا ہو۔ (مشکوۃ: ۵۱۷)

میں نے بطور نمونہ چند احادیث کے حوالے پیش کئے ہیں جن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کے حسن و جمال کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔

حضرات علماء کے ارشادات:

علامہ مناویؒ اور ملا علی قاری نے علامہ قرطبیؒ کا یہ روح افزا قول نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا پورا حسن و جمال دنیا میں ظاہر نہیں ہوا، ورنہ آپ کو دیکھنے کی آنکھوں میں طاقت نہ ہوتی۔ (جمع الوسائل: ۱/۹ و شرح شمائل للمناوی علی حامش جمع الواسل: ۱/۱۸)

حضرت شیخ زکریا صاحب کاندھلویؒ شمائل ترمذی کی شرح میں لکھتے ہیں کہ

''مناویؒ نے لکھا ہے کہ ہر شخص یہ اعتقاد رکھنے کا مکلّف ہے کہ حضور ﷺ کا جسم مبارک جن اوصاف جمیلہ کے ساتھ متصف ہے کوئی دوسرا ان اوصاف میں حضور ﷺ جیسا نہیں ہوسکتا اور یہ محض اعتقادی چیز نہیں، سیر و تاریخ و احادیث کی کتابیں اس سے لبریز ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ نے کمالات باطنیہ کے ساتھ جمال ظاہری بھی علی وجہ الاتم عطاء فرمایا تھا''۔ (خصائل نبوی: ۱۶)

بھائیو! غور کرو، کہ جب آپ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ جسمانی لحاظ سے بھی کوئی آپ کا ثانی نہیں، آپ بے نظیر و بے مثال ہیں تو آپ کے باطنی کمالات کے بارے میں کیا خیال ہے؟

کمالِ محمدی ﷺ:

یہ تو جمال کا ذکر تھا، اب لیجئے آپ کا کمال، آپ علیہ السلام کے کمال کی طرف نظر کیجئے تو وہ بھی بے مثال اور بے نظیر ہے، کمال علمی کو لیجئے تو وہ عروج کی انتہائی منزلوں پر پہنچا ہوا ہے۔ سب مخلوقات میں آپ کو اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ علم عطاء فرمایا تھا، اور علم غیب میں سے اللہ نے آپ کو بہت سی باتوں پر مطلع کیا، اس قدر امور پر کہ کسی اور کو اس قدر باتوں پر مطلع نہیں کیا گیا۔

امام بوصریؒ نے قصیدۂ بردہ میں فرمایا کہ:

فَإِنَّ مِنْ جُوْدِكَ الدُّنْيَا وَ ضَرَّتِهَا
وَ مِنْ عُلُوْمِكَ عِلْمُ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ

(آپ ہی کی سخاوت سے یہ دنیا اور آخرت ہے اور آپ کے علوم سے لوح و قلم کا علم ہے)

اور یہ کمال علمی دلیل ہے آپ کے کمال عقلی کا، کیوں کہ علمی کمال بغیر کمال عقل کے ممکن نہیں۔

آپ کے کمال عقلی کا ایک واقعہ:

آپ کا کمال عقلی اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ جب قریش مکہ نے کعبۃ اللہ کی عمارت کو از سر نو تعمیر کیا اور اس وقت حجر اسود کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا گیا تھا، تو تعمیر کے بعد قریش کے قبائل نے اس بارے میں اختلاف کیا کہ حجر اسود کو کون اپنی جگہ نصب کرے؟ ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ یہ فضلیت اس کو ملے، یہاں تک نوبت پہنچی کہ لوگ اپنی بہادری اور جرأت مندی کا مظاہرہ کرنے کے لیے عربوں کے دستور و

رواج کے مطابق پیالوں میں خون بھر کر اس میں ہاتھ ڈال کر کہنے لگے کہ یہ فضیلت ہم حاصل کریں گے۔

اس میں اشارہ تھا کہ ہم جنگ کے لیے بھی تیار ہیں۔ ایک تجربہ کار بوڑھے نے مشورہ دیا کہ ایسا کرو کہ کل صبح جو آدمی سب سے پہلے کعبۃ اللہ میں داخل ہو، اسی کو اس کا اہل سمجھا جائے کہ وہ کعبۃ اللہ میں حجر اسود نصب کرے۔ اس پر سب کا اتفاق ہو گیا، جب صبح ہوئی تو سب سے پہلے اس میں داخل ہونے والے وہ ہمارے اور آپ کے آقا حضرت سرکارِ مدینہ ﷺ تھے۔ جب قریش نے آپ کو دیکھا تو خوش ہو گئے، اور آپ سے کعبۃ اللہ میں حجر اسود نصب کرنے کے لیے کہا، مگر آپ نے اپنی کمال عقلی کا مظاہرہ فرماتے ہوئے عجیب تدبیر پیش فرمائی، آپ نے فرمایا کہ ایک چادر بچھا دو، جب چادر ڈال دی گئی تو آپ نے اپنے دست مبارک سے حجر اسود کو اٹھا کر اس میں رکھا، پھر تمام سرداران قریش سے فرمایا کہ سب اس چادر کو پکڑ کر چلیں، جب چلے تو کعبۃ اللہ کے پاس آپ نے رکوا کر اپنے دست مبارک سے حجر اسود کو نصب کر دیا، خود بھی اس فضیلت سے مشرف ہوئے اور سب کو بھی شامل کر لیا اور ایک بڑی جنگ سے لوگوں کو بچا لیا۔ یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا ہے۔ (دیکھو سیرت ابن ہشام: ۱/۱۹۷)

اسی طرح آپ کو ایک کمال فصاحت لسانی کا عطا فرمایا گیا تھا اور اس میں بھی آپ بے نظیر تھے، حتی کہ حضرات صحابہ کرام کو بعض وقت آپ کی گفتگو سمجھنے میں دقت پیش آتی اور وہ آپ کی انتہائی فصیح و بلیغ زبان جو انتہائی کمال عروج کو پہنچی ہوئی تھی، سمجھ نہ سکتے، اس لیے بسا اوقات آپ کو بات دہرانی پڑتی۔

حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ آپ سے عرض کیا کہ آپ ہم میں ہی رہے، پھر بھی

آپ ہم میں سب سے زیادہ فصیح ہیں، یہ کیسے؟ آپ نے فرمایا کہ حضرت اسماعیل کی زبان کی فصاحت مٹ گئی تھی، حضرت جبرئیل اس کو لے کر میرے پاس آئے اور میں نے اس کو یاد کیا۔

اور ایک روایت میں ہے کہ آپ سے حضرات صحابہ نے عرض کیا کہ آپ اور ہم ایک ہی خاندان کے ہیں اور ایک ہی شہر میں زندگی کررہے ہیں مگر آپ ایسا کلام کرتے ہیں کہ ہم سمجھ نہیں پاتے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ادب کی تعلیم دی ہے اور بہترین تعلیم دی ہے۔ (جمع الوسائل:۸/۲)

اور ایک کمال آپ کا اخلاقی کمال ہے، کمال اخلاق کا یہ عالم کہ جو آپ کو دیکھتا اور آپ کے اخلاق کو دیکھتا وہ آپ کا گرویدہ ہوجاتا، حضرت انس بن مالکؓ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ عمدہ اخلاق والے تھے۔ (شمائل ترمذی:۲۳)

غرض یہ کہ کسی طرح کا بھی کمال ہو وہ آپ میں علی وجہ الاتم والاکمل پایا جاتا ہے، اسی لیے علامہ مناوی فرماتے ہیں کہ علماء نے تصریح کی ہے کہ کمال ایمان یہ ہے کہ یہ عقیدہ رکھا جائے کہ کوئی شخص نبی کریم ﷺ سے زیادہ صاحب کمال نہیں اور نہ کوئی ایسا ہے جو آپ کے برابر صاحب کمال ہو۔ (شرح شمائل علی حامش جمع الوسائل:۱۸/۱)

ایسے صاحبِ کمال کے بارے میں کیا خیال ہے جب کہ معمولی سے معمولی کما ل بھی باعثِ محبت ہوا کرتا ہے تو آپ سے محبت وعشق بھی سب سے زیادہ لازم وضروری ہوئی۔

عطاونوالِ محمدی ﷺ:

محبت کا تیسرا سبب عطاونوال بھی آپ کے اندر علی وجہ الکمال پایا جاتا ہے، آپ

نے ظاہری وباطنی مادی وروحانی عطیہ جات اتنے دیئے ہیں کہ ان کا شمار کرنا دشوار ہے۔حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ آپ " اَجوَدُالنَّاسِ " (یعنی لوگوں میں سب سے زیادہ سخی تھے۔(مشکوۃ:۵۱۷،شمائل ترمذی:۱)

اورایک روایت میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جس چیز کا بھی سوال کیا گیا،آپ نے "نہیں" نہیں فرمایا۔(فتح الباری:۱/۱۳۱)

اور جوآپ نے ایمان،اسلام،دین کے احکام،وحی وقرآن،عمدہ اخلاق و نیک اعمال کے ہدایا امت کوعطا فرمائے ہیں،یہ باطنی وروحانی عطیہ جات ہیں،اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام بوصریؒ نے قصیدۂ بردہ میں فرمایا کہ

فَإِنَّ مِنْ جُودِكَ الدُّنيَا وَ ضَرَّتِهَا
وَ مِنْ عُلُومِكَ عِلمُ اللَّوحِ وَالْقَلَمِ

(آپ ہی کی سخاوت سے یہ دنیا اور آخرت ہے اور آپ کے علوم سے لوح وقلم کا علم ہے)۔

غرض آپ نے ہمیں دین ودنیا میں سے بہت کچھ عطا فرمایا تو آپ سے محبت نہ ہوتو پھر کس سے ہو؟اس طرح آپ کی ذات اطہر میں تمام اسبابِ محبت جمع ہیں،اس لیے آپ سب سے زیادہ محبت کیے جانے کے مستحق ہیں۔

۞ عشقِ نبوی کے آثار:

مگر یاد رہے کہ ایک ہے محبت اور ایک ہے دعویٔ محبت،دعویٔ محبت سے محبت کا ثبوت نہیں ہوجاتا،جب تک کہ اس کی دلیل یا کم ازکم اس کی علامت نہ پائی جائے اور چوں کہ آج کل عشقِ رسول ومحبت رسول کے مدعی بے شمار ہیں اور بعض غرض

پرست ومفاد پرست لوگ عشقِ رسول کے دعوی سے عوام الناس کو دھوکہ اور فریب میں مبتلا کرنے اور اپنے مفادات واغراض کے حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ عشقِ نبوی کے علامات وآثار کا ذکر کیا جائے، تاکہ لوگ محبت ودعوئ محبت میں فرق جان لیں اور ہر مدعی کے پیچھے پڑ کر گمراہی وضلالت کا شکار نہ ہو جائیں۔

علماء نے لکھا ہے کہ دعوئ محبت میں وہی سچا ہے جو محبت کی علامتیں بھی اپنے اندر رکھتا ہو۔ حضرت قاضی عیاضؒ شفاء میں فرماتے ہیں:

''جو کسی چیز سے محبت کرتا ہے وہ اس کو ترجیح دیتا ہے اور اس سے موافقت کرتا ہے، ورنہ وہ اپنی محبت میں سچا نہیں ہوسکتا، بلکہ محض مدعی ہوگا۔ (شفاء:۲۲/۲)

اتباع سنت وشریعت:

یہاں چند اہم اہم علامتوں کا ذکر کرتا ہوں، تاکہ بات پوری طرح سامنے آجائے، لیجئے سنئے کہ عشق رسول کی ایک اہم اور بڑی علامت یہ ہے کہ اتباع سنت وشریعت کا اہتمام ہو، جو شخص جس قدر شریعت کا اتباع کرتا ہے اور سنت کی پیروی کرتا ہے، سمجھا جائے گا کہ اسی قدر محبتِ نبوی وعشق نبوی اس کے دل کے اندر ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت انسؓ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''بیٹا! اگر تو ایسا کر سکے کہ کسی سے دل میں کوئی کینہ نہ ہو تو ایسا کرنا، یہ میری سنت ہے اور جس نے میری سنت (پرعمل کرکے اس کو) زندہ کیا اس نے مجھ سے محبت رکھی اور جو میرے سے محبت رکھتا ہے وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ (الشفاء:۲۲/۲)

معلوم ہوا کہ محبت وعشق رسول کے لیے اتباع شریعت واتباع سنت لازم و

ضروری ہے، اگر اس کے بغیر کوئی دعویٔ محبت کرتا ہے تو وہ صحیح نہیں ہے۔

معرفت وطریقت کے نام پر دھوکہ:

آج ایک طبقہ معرفت وطریقت اور عشق ومحبت کے نام پر خلاف شرع وخلاف سنت بہت سی باتوں کو اختیار کیے ہوئے ہے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ یہ شریعت وسنت کے خلاف ہے تو کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ معرفت وطریقت کی باتیں ہیں ،جن کو شریعت والے سمجھ نہیں سکتے ،حالانکہ یہ سراسر گمراہی ہے ،جو طریقت ومعرفت شریعت کے موافق نہیں ،اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

حضرت پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ یادرکھ کہ جس حقیقت وطریقت کی شریعت تائید وتوثیق نہ کرے اوراسے جائز نہ ٹھہرائے وہ صریحاً کفر والحاد ہے۔(فتوح الغیب:۱۰۹،مقالہ:۴۰)

حضرت شیخ جیلانیؒ کے ہمعصر دوسرے بزرگ حضرت احمد کبیر رفاعیؒ ایک جگہ فرماتے ہیں:

طریقت شریعت کا عین ہے، مگر بعض لوگ اولیاء اللہ پر تہمت لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ طریقت الگ ہے اور شریعت الگ ہے۔(رموزِ رفاعیہ:۳)

غرض یہ کہ جب تک شریعت کا اتباع نہ ہو اور سنتوں کی پیروی نہ ہو وہ اپنے دعویٔ محبت میں سچا نہیں ہوسکتا، اگر چہ وہ کچھ عجیب کرتب دکھائے اور حیرت انگیز افعال اس سے سرزد ہوں، مگر ان باتوں سے دھوکہ ہر گز نہ کھانا چاہئے۔

ذکر نبوی:

آپ سے محبت کی ایک علامت یہ ہے کہ آپ کا ذکر مبارک کرتا رہے؛ کیوں کہ جو کسی سے محبت کرتا ہے وہ اس کا ذکر زیادہ سے زیادہ کرتا ہے۔

حضرات صحابہ کرام جب بیٹھتے تو آپ کا ذکر کیا کرتے ،آپ کے افعال و اعمال، آپ کے خصائل وشمائل کا تذکرہ فرماتے،مگر یاد رہے کہ یہاں ذکر سے مراد آپ کے نام کی تسبیح پڑھنا نہیں ہے ، بلکہ مراد یہ ہے کہ جیسے کوئی اپنے شیخ وپیر یا استاذ وباپ کا تذکرہ کرتا ہے، اس طرح آپ کا ذکر ہو،آپ کے واقعات وحالات ،آپ کی سیرت وسنت، آپ کے حسن وجمال، آپ کے فضل وکمال کا ذکر کیا جائے ،خواہ وہ کسی جگہ بھی ہو، یہ آپ سے محبت کی علامت ہے۔

﴿۞﴾ میلا د کر لینا کافی نہیں:

بعض لوگ جو میلا د کا جلسہ کر کے خوش ہو جاتے ہیں کہ ہم نے اللہ کے نبی کا حق ادا کر دیا، یہ کافی نہیں بلکہ دن رات آپ کا ذکر ہونا چاہئے ،کوئی مجلس اس سے خالی نہ ہو جائے ،اور تمام معاملات وحالات میں آپ کو یاد رکھنا چاہئے ،اسی لیے حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی فرماتے تھے کہ لوگ سال میں ایک دفعہ میلا د کرتے ہیں اور ہمارے یہاں تو الحمدللہ روزانہ میلا د ہوتا ہے۔

کیا مطلب؟ مطلب یہ ہے کہ ہم ہر وقت اللہ کے نبی ﷺ کو یاد کرتے ہیں اور ہر لمحہ آپ کا ذکر خیر کرتے ہیں،اور میلا د والے سال میں ایک بار میلا د کا جلسہ کرنے کے بعد کبھی بھول کر بھی آپ کا ذکر نہیں کرتے ۔کیا یہی آپ کا حق ہے،اور کیا آپ اس سے خوش ہو جائیں گے؟

﴿۞﴾ مشابہت نبوی ﷺ:

محبت کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ آپ کے ساتھ ہر چیز میں مشابہت پیدا کرنے کی کوشش کرے،صورت میں، سیرت میں، چال چلن میں ، ہنسنے

اور بولنے میں، کھانے پینے میں، لباس و پوشاک میں۔

حضرت ابن عمرؓ چمڑے کی جوتیاں پہنتے تھے اور پیلے رنگ سے رنگتے تھے؛ کیوں کہ نبی کریم ﷺ بھی ایسا کرتے تھے۔(شفاء:۲/۲۴)

حضرت انسؓ نے جب آپ کو دیکھا کہ آپ کدو پسند کرتے ہیں تو وہ بھی کدو کو پسند کرنے لگے۔(شمائل ترمذی:۱۰)

حضرت حسن بن علی، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہم ایک دفعہ حضرت سلمہؓ کے پاس آئے اور کہا کہ ہمیں وہ کھانا پکا کر دیجئے جو نبی کریم ﷺ کو پسند تھا۔(شمائل ترمذی:۱۱)

حضرت ابن عمر کا کمال اتباع:

حضرت ابن سیرین بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ نے ایک دفعہ حج کیا، اور حج کے بعد واپسی ہم لوگ ساتھ تھے، آپ اونٹ پر سوار ہوئے اور چلتے رہے اور ہم بھی ساتھ چلتے رہے، درمیان راستے میں ایک جگہ اونٹ والے سے کہا کہ اونٹ کو بٹھادو، اس نے اونٹ کو بٹھا دیا، آپ اترے اور ذرا دور چلے گئے، پھر ایک جگہ اس طرح بیٹھ گئے جیسے کوئی پیشاب کرنے بیٹھتا ہے، اس کے بعد واپس آئے اور فرمایا کہ چلو۔ حضرت ابن سیرین نے کہا کہ حضرت ہم تو یہ سوچ رہے تھے کہ آپ نے پیشاب کیا ہے تو وضو بھی کریں گے اور دو چار رکعتیں پڑھیں گے؟ فرمایا کہ میں نے تو پیشاب نہیں کیا، میرا تو وضو ہے، اس پر لوگوں کو اور تعجب ہوا، تو عرض کیا کہ حضرت! آپ نے تو ابھی ادھر جا کر پیشاب کیا تھا؟ کہا کہ نہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ میں ایک دفعہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ اسی راستے پر تھا سے گزر رہا تھا، تو آپ ا کو پیشاب کی ضرورت ہوئی اور آپ نے اسی جگہ پیشاب فرمایا تھا، جہاں میں جا کر بیٹھا تھا، مجھے

اس وقت پیشاب تو نہیں آیا، مگر میں نے سوچا کہ آپ کی اس میں بھی اتباع کروں، لہٰذا مشابہت نبوی کے لئے صرف وہاں جا کر بیٹھ کر آ گیا ۔ (مفتاح الجنۃ للسیوطی: ۳۹۔۴۰)

یہ ہے محبت کا کرشمہ اور اس کو عشق کہتے ہیں کہ اتباع و مشابہت نبوی کامل طور پر ہو، اور ہر ہر چیز میں ہو۔

خلاصہ کلام:

غرض یہ کہ دعوئ محبت کافی نہیں، بلکہ ان علامات کے ذریعہ ثبوت دینا بھی ضروری ہے ۔ آج دعوئ محبت کرنے والے، ایسے ہیں کہ جو بدعات وخرافات اور جاہلی رسومات اور من مانی محدثات سے اپنی زندگی کو آراستہ کرتے اور سنتوں اور شرعی احکام سے بغاوت کرتے ہیں اور سنت وتوحید کا نام لینے والوں کے دشمن ہو جاتے اور ان کو بدنام کرنے کی سازش وکوشش کرتے ہیں، جو تحریکیں اور جماعتیں دین کی خدمت ونصرت، حمایت واشاعت، تبلیغ ودعوت کا کام کرتی ہیں، جیسے تبلیغی جماعت، اور دیوبندی مکتبِ فکر کے علماء ان کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

لہٰذا عوام کو چوکنا رہنا چاہئے اور محض دعوی محبت سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ عاشق ہو گیا ہے، جب کہ وہ دین وشریعت پر نہیں چلتا اور دینی وتبلیغی کام کو بھی نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

اللہ تعالی ہم سب کو نبی کریم ﷺ کی سچی محبت عطا فرمائے ۔ آمین ثم آمین ۔

باسمہ تعالیٰ

محبت وخشیت کے آنسو

اللہ تبارک وتعالی کی محبت یا خشیت سے رونا ایک عظیم عبادت اور مقدس عمل ہے، اور جس کے دل میں اللہ تعالی کی محبت پیدا ہو جاتی ہے اسے یہ دولت نصیب ہوتی ہے، پھر اس رونے پر آنکھوں سے نکلنے والے آنسوں بھی مقدس اور قابل قدر ہو جاتے ہیں۔

محبت الٰہیہ میں رونے کی فضیلت:

اللہ کی محبت میں رونے کی فضیلت اس حدیث میں آئی ہے، جس میں سات قسم کے لوگوں کو قیامت کے دن اللہ تعالی کے عرش کے سایہ میں جگہ ملنے کی بشارت سنائی گئی ہے، ان سات خوش قسمت لوگوں میں ایک وہ ہے جس کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا گیا:

"رجل ذکر اللّٰہ خالیاً ففاضت عیناہ" (وہ آدمی جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور اسکی آنکھیں بہہ گئیں)۔ (بخاری:۶۲۹)

اس حدیث میں خدا کو یاد کر کے رونے کا ذکر ہے۔ علامہ قرطبی نے فرمایا کہ رونا ذاکر کے حال اور اس کو جو مکشوف ہوتا ہے اس کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ جلال خداوندی اگر مکشوف ہوا تو رونا اللہ کی خشیت وخوف سے ہوگا اور اگر اوصاف جمال کا مشاہدہ ہوا تو رونا، محبت وشوق کی وجہ سے ہوگا۔ (فتح الباری:۲/۱۴۷، عمدۃ القاری:۵/۱۷۹)

اس سے معلوم ہوا کہ خدا کے اوصاف جمال کے مکشوف ہونے پر اللہ کی محبت اور اسکے شوق دیدار میں رونا بڑا بھاری عمل اور مقدس عبادت ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ:

مولانا رومی نے اپنی مثنوی میں ذکر کیا ہے کہ ایک بزرگ اللہ کی محبت میں رویا کرتے تھے اور شوق دیدار انکو بے چین ومضطرب کئے ہوئے تھا، ان کے ایک رفیق طریق نے ان کو نصیحت کی اور کہا کہ اتنا نہ رویا کرو، ورنہ کہیں آنکھوں مین خلل وخرابی نہ آجائے۔

مولانا رومیؒ اس کو نقل کرتے ہیں:

زاہدے را گفت یارے در عمل　　کم گری تا چشم را نیاید خلل

اس پر زاہد وعابد وعاشق نے جواب دیا کہ دیکھو بھائی! دو حال سے خالی نہیں یا تو اس رونے اور گریہ وزاری کی وجہ سے آخرت میں جمال خداوندی مجھے نصیب ہوگا یا یہ کہ ان آنکھوں کو یہ دولت نصیب نہ ہوگی، اگر رونے سے جمال خداوندی نصیب ہوجاتا ہے تو ان آنکھوں کے نہ رہنے اور خراب ہوجانے کا کیا غم؟ اللہ کے وصال ودیدارِ جمال کیلئے دو آنکھیں کیا، لاکھوں آنکھوں کو بھی قربان کیا جاسکتا ہے اور اگر خدانخواستہ میری بدبخت آنکھوں کو جمال حق کا دیکھنا نصیب نہ ہوا تو ان بدبخت آنکھوں کا پھوٹ جانا ہی بہتر ہے، وہ آنکھ ہی کیا جو جمال یار کے دیکھنے کے قابل نہ ہو۔

مولانا رومیؒ زاہد کا یہ جواب نقل کرتے ہیں:

گفت زاہد از دو بیروں نیست حال ☆ چشم بیند یا نہ بیند آں جمال

گر بہ بیند نورِ حق خود چہ غم است ☆ در وصالِ حق دو دیدے کم است

و ر نہ بیند نو رحق را گو بر و ! ☆ ایں چنیں چشم شقی گو کو رشو

ایک عاشقِ خدا کا گریہ و بکا:

امام غزالیؒ نے مکاشفۃ القلوب میں حکایت لکھی ہے کہ حضرت ذوالنون مصریؒ کہتے ہیں کہ ایک دن میں خانہ کعبہ میں داخل ہوا تو ستون کے قریب ایک برہنہ نوجوان مریض کو پڑے دیکھا جس کے دل سے رونے کی آواز نکل رہی ہے، میں نے اس کے قریب جا کر اسے سلام کیا اور پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا کہ میں ایک غریب الوطن عاشق ہوں، میں اسکی بات سمجھ گیا اور میں نے کہا کہ میں بھی تیری طرح ہوں، وہ رونے لگا، اسکا رونا دیکھ کر مجھے بھی رونا آ گیا، اس نے مجھے دیکھ کر کہا کہ تم کیوں رو رہے ہو؟ میں نے کہا کہ اسلئے رو رہا ہوں کہ تیرا اور میرا مرض و بیماری ایک ہے، اس نے چیخ ماری اور اسکی روح پرواز کر گئی۔

یہ ہے خدا کی محبت اور عشق کا رونا جس پر وعدہ ہے کہ خدا تعالی ایسے شخص کو قیامت کے دن اپنے سائے میں جگہ دیگا۔

خوف خدا سے رونے کی فضیلت:

اور خوف وخشیت سے رونا بھی فضیلت والا عمل ہے۔ چنانچہ حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ.

" لَيْسَ شَيْءٌ اَحَبَّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ قَطْرَتَيْنِ : قَطْرَةِ دُمُوْعٍ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَقَطْرَةِ دَمٍ يُهْرَاقُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ". (اللہ کے نزدیک کوئی شی دو قطروں سے زیادہ پیاری نہیں، ایک آنسو کا قطرہ جو اللہ کے خوف وڈر سے نکلے اور دوسرے خون کا قطرہ جو اللہ کے راستے میں بہایا جائے)۔ (ترمذی،مشکوۃ:۳۳۳)

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ''کوئی مؤمن بندہ ایسا نہیں کہ اسکی آنکھوں سے خوف خدا کی وجہ سے آنسو نکلے، اگر چہ وہ مکھی کے سر کے برابر ہی (چھوٹا) کیوں نہ ہو، پھر اس آنسو سے اسکے چہرہ پر کچھ حصہ لگ جائے، مگر اللہ اسکو دوزخ پر حرام کر دیتے ہیں۔ (مشکوۃ:۴۵۸)

مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے خوف و ڈر سے جو آنسو نکلتا ہے وہ اللہ کی نظر میں اس قدر قیمتی ہوتا ہے کہ اسکا کوئی بھی حصہ اگر چہرہ پر لگ جائے تو وہ چہرہ بھی قیمتی ومبارک ہوجاتا ہے اور اللہ تعالی اس پر دوزخ کو حرام کر دیتے ہیں، یادر ہے کہ مراد چہرہ سے مؤمن کی ذات ہے کہ اس آنسو کی وجہ سے اسکی ذات کو دوزخ پر حرام کر دیا جاتا ہے۔

ایک عجیب نکتہ:

اس حدیث میں یہ نہیں فرمایا کہ '' حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ النَّارَ'' (کہ اللہ اس مؤمن پر دوزخ کو حرام کر دیتا ہے) بلکہ یہ فرمایا کہ '' حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ'' (کہ اس مؤمن کو دوزخ پر حرام کر دیتا ہے) مؤمن پر دوزخ کے حرام ہونے اور دوزخ پر مؤمن کے حرام ہونے میں بڑا فرق ہے۔ مؤمن پر دوزخ کے حرام ہونے کا مطلب تو یہ ہے کہ مؤمن دوزخ میں نہ جائیگا، کیونکہ اس پر دوزخ حرام کردی گئی ہے، اور دوزخ پر مؤمن کے حرام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مؤمن اگر دوزخ میں کسی وجہ سے ڈال بھی دیا جائے، تب بھی دوزخ پر حرام ہے کہ وہ اسکو جلائے یا اذیت پہنچائے۔

لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سے ڈر کر رونے والے مؤمن کو دوزخ میں نہ ڈالا جائیگا، لیکن اگر بفرض محال یا کسی وجہ سے ایسا مؤمن دوزخ میں ڈال بھی دیا

جائے، تب بھی اسکو دوزخ نہ جلائے گی۔

شاہ عبدالغنیؒ کا واقعہ:

معلوم ہوا کہ یہ خوفِ خدا کے آنسو کا قطرہ بہت ہی قیمتی دولت ہے اور اس کو چہرہ پر مل لینا چاہیے، حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ جو حضرت تھانویؒ کے خلیفہ گذرے ہیں، ان کے بارے میں پڑھا ہے کہ وہ روتے وگڑگڑاتے اور جو آنسو کے قطرے نکلتے ان کو اپنے چہرہ پر مل لیتے تھے۔

بعض لوگ رومال سے ان آنسوؤں کو پوچھ لیتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ ایسا کرنے کے بجائے ان قطروں کو منہ پر، ہاتھ پر یا اور کسی عضو پر مل لینا چاہیے تا کہ ان قطرات سے جہنم کی آگ پر یہ اعضاء حرام ہو جائیں۔

ایک عجیب وحیرت زا واقعہ:

بعض علماء سے یہ واقعہ جو بڑا عجیب وحیرت زا ہے سنا گیا کہ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کے دور میں ایک شخص مسافر کہیں جا رہا تھا، راستہ میں کسی شخص کو نزع کے عالم میں دیکھا اور مرنے کے بعد اس کی تجہیز وتکفین میں شریک رہا اور خود قبر میں اُتر کر اسکو قبر میں رکھا، اس کے بعد اس کو اندازہ ہوا کہ اس کے جیب سے روپیوں کی تھیلی غائب ومفقود ہے۔ خیال ہوا کہ شاید تدفین کے وقت قبر میں گر گئی ہوگی، اس لئے قبر کو کھودنے کا ارادہ کیا اور کھودنا شروع کیا، تو دیکھتا کیا ہے کہ قبر آگ کے شعلے بھڑکا رہی ہے اور اس آگ کا اس کے ہاتھ پر بھی اثر ہوا، جس کی وجہ سے اس کے ہاتھ میں بے انتہاء سوزش وجلن پیدا ہوگئی جو نا قابل برداشت وتحمل تھی، اس نے اس کا علاج بھی کرایا، مگر تمام اطباء وحکماء اور ڈاکٹر عاجز آ گئے، کسی کا علاج کارگر نہ

ہوا، ایک زمانہ اسی بے قراری و بے چینی واضطراب و پریشانی میں گذر گیا، کسی نے اسکومشورہ دیا کہ تم دہلی جاؤ وہاں اس زمانہ کے سب سے بڑے عالم و بزرگ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز دہلویؒ ہیں، ان سے دعاء کراؤ، وہ شخص اس مشورہ پر دہلی حضرت کی خدمت میں گیا اور سارا واقعہ سنایا، اس پر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے فرمایا کہ قبر میں جس آگ سے تیرا ہاتھ جلا ہے وہ دنیا کی آگ نہیں، بلکہ آخرت کی اور جہنم کی آگ ہے، جہنم کی آگ کا علاج دنیا کی دوائیاں اور دنیا کے حکیم وڈاکٹر نہیں کرسکتے، اس آگ کا علاج صرف ایک ہے، وہ یہ کہ اللہ سے اپنے گناہوں پر استغفار کراور اس کے سامنے خوب گڑگڑا کر رو، اور آنکھوں سے جو آنسوں نکلیں وہ اپنے اس جلے ہوئے ہاتھ پر لگا، کیونکہ حدیث میں ہے کہ جہنم کی آگ خدا کے خوف سے رونے سے بجھ سکتی ہے۔

چنانچہ اس آدمی نے ایسا ہی کیا تو دیکھا کہ وہ سوزش اور جلن ختم ہوگئی، معلوم ہوا کہ یہ آنسو کے قطرے بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔

خوفِ خدا سے رونے کے واقعات:

خوف خدا سے رونے والے حضرات کے واقعات ہمارے لئے بڑے عبرت خیز بھی ہیں، اور دلوں کو نرم کرنے والے بھی ہیں، اس لئے کبھی کبھی ان کے اس طرح کے حالات سننا بھی چاہئے۔

ایک بار خلیفہ عبدالملک بن مروان نے ایک شخص کو دیکھا جس نے بہت لمبا سجدہ کیا، جب اس نے سر اُٹھایا تو اس کے سجدے کی جگہ آنسوؤں کی وجہ سے بھیگی ہوئی تھی، خلیفہ نے ایک آدمی کو وہاں نگرانی کرنے کھڑا کر دیا اور کہا کہ جب یہ فارغ ہوجائے تو میرے پاس لانا، تاکہ اس کی عقل کا امتحان کروں۔ الغرض جب وہ نماز

سے فارغ ہوا تو بادشاہ کے سامنے لایا گیا، بادشاہ نے کہا کہ میں نے تجھ سے ایک ایسی بات دیکھی ہے کہ جنت تو اس کے بغیر بھی مل سکتی ہے (یعنی اتنا رونے کی کیا ضرورت ہے جب کہ اس کے بغیر بھی جنت مل سکتی ہے)۔ اس شخص نے ایک زور کی چیخ ماری جس سے بادشاہ بھی خوف زدہ ہو گیا، پھر وہ شخص بے ہوش ہو گیا، پھر بہت دیر بعد اس کو ہوش آیا تو وہ اپنے چہرے سے پسینہ پوچھ رہا تھا، اور اللہ سے خطاب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ اے اللہ! تیری نافرمانی کرنے والا ہلاک ہو جب تک کہ وہ آپ کے پاس گناہ کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہے، اس کا یہ خوف دیکھ کر بادشاہ بھی رونے لگا، مگر وہ شخص پیٹھ پھیرے ہوئے کھڑا رہا، یہاں تک کہ نکل گیا۔ (الرقۃ والبکاء:۱۹۰)

ابن ابی الدنیا نے یہ بھی حیرت ناک واقعہ لکھا ہے کہ ابوعمر کہتے ہیں کہ میں وراد عجلی کو دیکھا کرتا تھا کہ وہ مسجد کو سر کو رومال سے ڈھک کر آتے اور ایک کونے میں کھڑے ہو کر مسلسل نماز پڑھتے، دعاء کرتے اور روتے رہتے، پھر مسجد سے نکلتے اور ظہر میں آتے اور اسی طرح نماز و دعاء اور بکاء میں لگے رہتے، یہاں تک کہ عشاء ہو جاتی، پھر مسجد سے نکلتے، نہ کسی سے بات چیت کرتے اور نہ کسی کے پاس بیٹھتے۔ ابو عمر کہتے ہیں کہ میں نے ان کے محلّہ کے ایک آدمی سے ان کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟ یہ وراد عجلی ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا ہے کہ جب تک اللہ کو قیامت میں دیکھ نہیں لیں گے اس وقت تک نہیں ہنسوں گا۔ (الرقۃ والبکاء:۱۹۲)

حضرت مالک بن ضیغم کہتے ہیں کہ مجھ سے حضرت حکم بن نوح نے میرے والد ابو مالک کے بارے میں کہا کہ ایک رات آپ کے والد اول سے آخر تک روتے ہی

رہے جس میں نہ کوئی سجدہ کیا نہ رکوع کیا، جب صبح ہوئی تو ہم نے کہا کہ اے ابو مالک! پوری رات میں آپ نے نہ نماز پڑھی نہ دعاء کی۔ تو وہ رونے لگے اور کہا کہ: اگر مخلوقات یہ جان لیں کہ کل وہ کس چیز کا سامنا کرنے والے ہیں تو کسی عیش کی چیز میں ان کو لذت نہ ملے، خدا کی قسم! میں نے جب رات کو، اس کی ہول ناکی اور اس کی تاریکی کی شدت دیکھی تو قیامت اور اس کی شدت و ہولنا کی یاد آ گئی، جہاں ہر نفس اپنے آپ میں مشغول ہوگا، نہ کوئی باپ بیٹے کے کام آئے گا اور نہ بیٹا باپ کے کچھ کام آئیگا۔ یہ کہکر وہ بے ہوش ہو گئے اور مسلسل کانپتے رہے، پھر جب کچھ سکون ہوا تو ان کو اٹھا کر لے گئے۔ (الرقۃ والبکاء:۲۰۳)

اللہ والوں کے یہ واقعات بتا رہے ہیں کہ ان حضرات کو اللہ کا کس قدر خوف تھا اور آخرت کی کس قدر فکر تھی جس کی وجہ سے رات رات بھر وہ بے چین رہتے اور روتے اور گڑگڑایا کرتے تھے۔

حضرت رسالت مآب ﷺ کی ایک دعا:

حدیث میں حضرت رسالت مآب ﷺ کی دعاؤں میں یہ دعا بھی آئی ہے، آپ فرماتے ہیں:

"اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ عَیْنَیْنِ ھَطَّالَتَیْنِ تَسْقِیَانِ الْقَلْبَ بِذُرُوْفِ الدَّمْعِ مِنْ خَشْیَتِكَ قَبْلَ اَنْ تَكُوْنَ الدُّمُوْعُ دَمًا وَّالْاَضْرَاسُ جَمْراً" (الحزب الاعظم)

(اے اللہ! مجھے دو ایسی آنکھیں عطاء فرمادیجئے جو بہت زیادہ برسنے والی (یعنی رونے والی) ہوں، جو آپ کے خوف سے آنسو بہا کر دل کو سیراب کر دیں، اس سے پہلے کہ آنسو (قیامت کے ہولناک منظر سے) خون بن جائیں اور

داڑھیں آگ بن جائیں)

اس عجیب دعاء میں نبی کریم ﷺ نے ایسی آنکھیں، اللہ سے مانگی ہیں کہ جو خوب رونے والی ہوں اور یہ رونا اللہ کے ڈر وخوف کی شدت سے ہو، اس کے ساتھ اس دعاء میں بعض حیرت انگیز اشارات بھی ہیں:

(۱) ایک تو یہ کہ اللہ کے ڈر سے رونے سے دل کو سیرابی نصیب ہوتی ہے، "تسقیان القلب "، میں اس کی طرف اشارہ ہے، بعض روایات میں "تشفیان القلب " آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "دل کو شفاء دینے والی آنکھیں عطاء فرما"، یہ شفا سے ماخوذ ہے اگر اس روایت کو لیا جائے تو اس میں اشارہ ہے کہ اللہ کے ڈر سے رونا دل کی بیماریوں کے لیے شفاء ہے، اگر دل گناہ کا عادی ہے تو اللہ کے ڈر سے رو کر تو دیکھو کہ اس میں کیسا جلا پیدا ہوتا ہے، پہلی روایت پر سیراب کرنے والی آنکھوں سے مراد یہ ہے کہ رونے سے دل اللہ کی عظمت اور خوف وخشیت سے لبریز ہوتا اور اس کے اثرات سے سیراب ہوتا ہے۔

(۲) دوسرا یہ کہ قیامت کی ہولنا کی وخوفنا کی ایسی ہوگی کہ آنکھ سے آنسوؤں کی جگہ خون نکلے گا؛ جیسے محاورہ میں بھی کہا جاتا ہے کہ خون کے آنسو روؤگے" دنیا میں تو یہ مجاز ہے اور قیامت میں حقیقت، اس لئے آپ نے دعاء کی کہ اس دن کے آنے سے پہلے کہ رونا بھی چاہئیں تو آنسو نہ نکلے، ہم کو ایسی آنکھیں عطا فرمادے، جو خوب رونے والی ہوں، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں آدمی کو اللہ کے ڈر سے خوب رولینا چاہئے کہ بعد میں یہ موقعہ نہ ملے گا۔

(۳) تیسرے یہ کہ قیامت میں دوزخ کا عذاب ایسا سخت ہوگا کہ ڈاڑھ، دوزخ کی آگ میں جلکر خود آگ بن جائیں گے، آپ نے دعاء کی کہ اس واقعہ کے

آنے سے پیشتر رونے والی آنکھیں عطا فرمادے، تاکہ گناہ پر رو رو کر یہیں گناہ صاف ہوجائیں۔ ہر مسلمان کو یہ دعا کرنا چاہئے اور اس کے مطابق رونا بھی چاہئے۔

باسمہ تعالیٰ

وصول الی اللہ کے لئے ترک دنیا ضروری نہیں

الحمد لله و كفى و سلام على عباده الذين اصطفى امابعد:

أعوذبالله من الشيطان الرجيم ـبسم الله الرحمان الرحيم

﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ﴾

یہ آیت کریمہ قرآن کریم کی ایک آیت کا ایک ٹکڑا ہے، جس میں اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ: ''اللہ کے کچھ مخصوص بندے ایسے بھی ہیں، جن کو ان کی تجارت اوران کے دنیوی کاروباراللہ کے ذکر سے ، نماز سے ، زکوۃ سے غافل نہیں کرتے'' حالانکہ وہ دنیا کا کام کرتے ہیں، دنیا کے معاملات کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود نہ ذکر سے غافل ہوتے ہیں، نہ نماز سے غافل ہوتے ہیں، نہ زکوٰۃ سے غافل ہوتے ہیں۔

اللہ کی یاد ان کے سینوں کے اندر ہر وقت ایسی موجزن ہوتی ہے جیسے کہ سمندر کا پانی موجزن ہوتا ہے، دنیوی کوئی کاروبار، دنیوی کوئی معاملہ ان کو اس سے غافل نہیں ہونے دیتا۔

مردوں کی دو قسمیں، ایک نکتہ:

یہ اولیاء اللہ کی صفت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان کیا ہے، یہ اللہ کے مخصوص بندے ہیں۔ یہاں پر قابل غور نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کہا ''رِجَالٌ''

رجال ’’رجل‘‘ کی جمع ہے،جس کے معنی’’مرد‘‘ کے آتے ہیں،تواللہ تعالیٰ کی نظر میں مردیہی ہیں، باقی سب نامرد ہیں۔

جیسے کہتے ہیں کہ دیوبند میں ایک دیوانی تھی اور وہ گلی کوچوں میں بالکل ننگی پھرا کرتی تھی،لیکن اگر کسی گلی میں چلتے چلتے اس کے راستہ میں حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ ایک طرف سے آجاتے تو فوراً پردہ کرلیتی اور کپڑا اپنے بدن پر ڈال لیتی اور کہتی کہ مرد آرہا ہے ، مرد آرہا ہے۔گویا اس دیوانی کی نظر میں پورے دیوبند میں مرد ایک ہی تھے، باقی جتنے بھی تھے سب نامرد تھے،اس لیے ان سے تو پردہ کرتی تھی، باقی سب کے سامنے ننگی پھرا کرتی تھی۔

تو اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے مخصوص ومقرب بندوں کو’’رجال‘‘ کہا ہے، یہ بتانے کے لئے کہ حقیقت میں یہی لوگ مرد ہیں جوایسے مضبوط ہوتے ہیں کہ دنیا کے سارے کاروبار کرتے ہوئے بھی اپنے خدا سے کبھی غافل نہیں ہوتے ، یہ اصلی مرد ہیں۔مرد بھی دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک اصلی مرد اور ایک نامی گرامی مرد،یعنی نام کے مرد، اللہ کی نظر میں اصلی مرد وہی ہیں جن کو دنیا کی کوئی طاقت ، دنیا کا کوئی کاروبار اور بیوی ، بچے دنیا کی اور چیزیں یہ سب کی سب مل کر بھی اللہ سے غافل ہونے نہیں دیتیں۔

۞ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے ہزاروں راستے ہیں:

اسی لیے حضرات صوفیاء کرام کہتے ہیں کہ اللہ تک پہنچنے کے لیے ایک ہی راستہ مقرر نہیں، بلکہ بزرگوں کا ارشاد ہے کہ تمام انسانوں کی جتنی سانسیں ہیں، خدا تک پہنچنے کے لیے اتنے ہی راستے اور طرق ہیں۔انسان کی سانسوں کی کیا تعداد ہے،

ایک دن میں ایک آدمی چوبیس ہزار مرتبہ سانس لیتا ہے، ہر آدمی چوبیس ہزار مرتبہ سانس لیتا ہے، اور دنیا میں کروڑوں انسان ہیں، کروڑوں انسانوں کی ہر روز کی سانسیں اور پھر ایک ایک انسان کی اتنی لمبی لمبی عمر، تو کتنا حساب بیٹھے گا؟ اس میں کوئی تعداد ہم بیان نہیں کر سکتے، بلکہ اس کا اندازہ بھی ہم صحیح طور پر نہیں کر سکتے۔ اس لیے دنیا کی کوئی چیز انسان کو خدا سے غافل کر ہی نہیں سکتی، بلکہ ہر چیز کے اندر سے اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔

اللہ تک پہنچنے کے لئے ایک تو وہ چیزیں مقرر ہیں اللہ کی طرف سے جو ضروری ہیں، جیسے نماز، زکوۃ، روزہ اور کچھ مخصوص چیزیں وہ اپنی جگہ پر ہیں، لیکن اس کے علاوہ ہر چیز میں انسان اللہ تعالیٰ کا راستہ پانے کے لیے سبیل تلاش کر سکتا ہے اور کوئی چیز اس کو غافل نہیں کرے گی، بلکہ اللہ تک پہنچا دیگی۔

تو اس لیے میں کہنا چاہتا ہوں کہ آپ حضرات مختلف کاروباری ہیں، مختلف مصروفیات کے ہیں۔ کوئی پڑھنے پڑھانے والا ہے، کوئی قرآن پڑھاتا ہے، کوئی حدیث پڑھاتا ہے، کوئی کچھ پڑھاتا ہے اور کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو تاجر پیشہ ہیں، کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو ملازمت پیشہ ہیں، مگر ہم سب کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ دنیا کا یا دین کا کوئی معاملہ ہم کو خدا سے غافل نہ کردے۔ دینی معاملہ کے غافل کرنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے، وہ تو غافل کرنے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ تک پہنچانے ہی کے لیے ہے۔

❁ دینی خدام میں دو چیزوں کی کمی:

ایک اہم بات ہے، وہ یہ کہ مثلاً ایک آدمی قرآن پڑھاتا ہے، حدیث پڑھاتا ہے، فقہ کا درس دیتا ہے، یا اور کوئی دینی خدمت کرتا ہے، لیکن اس کے باجود

ہوسکتا ہے کہ اس کے ذریعہ وہ خدا تک نہ پہنچے۔

اور ایک آدمی کاروبار کرتا ہے، منڈی میں تجارت کرتا ہے، لیکن ہوسکتا ہے کہ منڈی کا وہ تاجر خدا تک پہنچ جائے۔ ایک آدمی قرآن پڑھا کر جہنم میں جاسکتا ہے اور ایک آدمی تاجر ہوکر جنت میں جاسکتا ہے، وہ کیسے؟

اس کی دو وجہ ہیں، ایک وجہ نیت کا فرق اور اخلاص کا فقدان اور ایک وجہ اپنی ذمہ داری کا احساس نہ ہونا۔ یہ دو وجوہات ہوتی ہیں عام طور پر جس کی وجہ سے نیک کام کرکے بھی ایک آدمی جہنم رسید ہوجاتا ہے، اور یہ دو باتیں آجکل عموماً دینی خدام میں پائی جاتی ہیں، اس لئے میں نے عرض کردیا کہ یہاں بھی ماشاءاللہ دینی خدام جمع ہیں، اور طالب اصلاح بھی ہیں، اگر یہ اصلاحی باتیں اب نہ کہی جائیں تو پھر ان مجالس کا کیا فائدہ؟

نیت کا فتور اور مفتی محمد شفیع کا ارشاد:

نیت کا فرق وفتور کیا ہے؟ مثال کے طور پر ایک آدمی قرآن پڑھ رہا ہے، لیکن اس کی نیت یہ نہیں ہے کہ وہ اللہ کو پہچانے، اللہ کو پائے، بلکہ اپنے کسی دنیوی مفاد کے لیے پڑھ رہا ہے۔ یہ اخلاص کا فقدان ہے اور نیت کا فتور ہے۔

اسی لیے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ایک موقعہ پر دارالعلوم میں تقریر فرمائی تھی اور وہ تقریر حضرت کی چھپی ہوئی ہے۔ اس میں حضرت فرماتے ہیں کہ میں اپنی پوری زندگی کے مطالعہ کے بعد وہ تمام بزرگان دین جن کی خدمت میں اللہ نے مجھ کو پہنچایا، ان کی صحبتوں کو پانے کے بعد اور ان کے اقوال وارشادات اور ان کے ملفوظات کی روشنی میں جو کچھ مجھے دین سمجھ میں آیا، اس دین کی روشنی میں

میں یہ کہتا ہوں کہ ''اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو دین کے اس کام کے لیے قبول کیا ہے تو اس سے بہتر کوئی چیز نہیں، بشرطیکہ یہ اللہ کے لیے ہو، اور اس سے بدتر بھی کوئی مشغلہ نہیں ہے بشرطیکہ یہ دنیا کے لیے ہو۔

کیا خوب جملہ فرمایا، عجیب وغریب جملہ ہے، کہ دین کی خدمت سے بہتر بھی کوئی چیز نہیں ہے بشرطیکہ اللہ کے لیے ہو، اس سے بدتر بھی کوئی چیز نہیں ہے بشرطیکہ وہ دنیا کے لیے ہو جائے۔

موٹی سی مثال ہے کہ ایک عالی شان بہترین کپڑا ہے۔ فرض کیجئے کہ ریشم کا کپڑا ہے، اس ریشم کے کپڑے کو اگر کوئی شخص اپنے جوتوں کی دُھول پونچھنے کے لیے کام میں لایا کرے تو کیا کوئی آدمی یہ کہے گا کہ بڑا اچھا کام کیا ہے؟ سب اس کو کہیں گے کہ بے وقوف ہے، پاگل ہو گیا ہے۔ اسی طرح دین ریشم کے کپڑے کی طرح ہے، بلکہ اس سے بھی اعلیٰ درجہ کی چیز ہے۔ اگر کوئی اس کو دنیا کے لیے استعمال کر رہا ہے تو وہ بھی بے وقوف ہے۔ اس لیے کہ کوئی ریشم کے کپڑے کو جوتوں کی دھول پونچھنے میں استعمال نہیں کر سکتا، اسی طریقہ پر قرآن وحدیث کو پڑھانے کا سلسلہ دنیا کی کمائی کے لیے نہیں ہو سکتا۔

اس کے برخلاف اگر کوئی شخص کسی معمولی کپڑے کو استعمال کرے، کسی اچھی چیز کی دھول کو پونچھنے کے لیے تو کہیں گے کہ بھائی! شاباش، اچھی بات ہے۔ آپ کا کمپیوٹر رکھا ہوا تھا یا اور کوئی چیز رکھی ہوئی تھی، فریج رکھا ہوا تھا۔ آپ نے ایک معمولی سا کپڑا جو کسی کام کے قابل نہیں، اس غیر پسندیدہ کپڑے کو اٹھا کر اس کی دھول پونچھنے کے لیے استعمال کیا تو یہ کام ٹھیک کیا ہے۔

اسی طریقہ پر دنیا اللہ کی نظر میں ایک بے حیثیت چیز ہے، بے وقعت چیز ہے،

دنیا کو دین کے لیے استعمال کیا جائے تو بہت اچھی بات ہے، لیکن دین کو اگر دنیا کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو وہ بدترین چیز ہو جاتی ہے۔اس لیے حضرت نے یہ جملہ فرمایا تھا۔تو ایک وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ نیت ٹھیک نہیں آدمی کی۔

ذمہ داری کا احساس نہ ہونا:

اور دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ ذمہ داری کا احساس نہیں، جس کام پر لگا ہے، اس کا احساس نہیں ہے کہ مجھے کیا کام میں اللہ نے لگایا ہے، کیسے اعلیٰ کام میں لگایا ہے، اشرف ترین کام میں لگایا ہے، کیسے انتہائی مہذب، محترم کام میں اللہ نے لگایا ہے۔ جب اس کو مہذب، محترم ، اشرف ، مشرف، معظم سمجھے گا تو اس کے شایانِ شان خدمت بھی کرے گا۔اگر اس کے شایان شان خدمت نہیں ہو رہی ہے تو یہ ہمارا ایسا قصور ہے جس کی وجہ سے ہوسکتا ہے کہ ہم کو اللہ تعالیٰ اس سے محروم کر دے۔

یہ دو وجہ ہوتی ہیں۔تو میں کہہ رہا تھا کہ دین کی خدمت کے ہونے کے باوجود ہوسکتا ہے کہ کوئی اللہ کو نہ پائے ،اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ دنیا کا کاروبار کرنے والا اس کے ذریعہ اللہ کو پالے۔

تاجر ولی بن سکتا ہے، شیخ منکدر کا واقعہ:

حضرت امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں ایک قصہ لکھا ہے کہ بغداد کے علاقہ میں ایک شخص رہتے تھے، جن کا نام تھا شیخ منکدر، اور ان کی ایک دکان تھی، تجارت پیشہ آدمی تھے، انہوں نے اپنے خادموں سے ایک دفعہ کہہ دیا کہ بھائی دیکھو! یہ کپڑا اتنے کا ہے، اور وہ کپڑا اتنے کا ہے، یہ لبادہ اتنے کا ہے، فلاں لبادہ اتنے کا ہے۔اس سے زیادہ قیمت میں فروخت نہ کرنا۔اور ایک کپڑے کے بارے میں بتایا کہ یہ دو دینار کا

ہے،اور ایک کے بارے میں کہا کہ یہ تین دینار کا ہے،اس طرح تاکید کردی۔

ایک مرتبہ اپنے کسی کام سے جارہے تھے،راستہ میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی جو اعرابی و دیہاتی تھا،دیکھا تو اس کے پاس ایک لبادہ ہے،انہوں نے پوچھا کہ بھائی! یہ لبادہ کہاں سے خریدا؟ تو اس نے کہا کہ ادھر ایک دکان ہے وہاں سے خریدا ہے۔ پھر پوچھا کہ کتنے میں خریدا؟ تو اس نے کہا کہ میں نے تین دینار میں خریدا ہے۔

تو انہوں نے اسے لے کر الٹ پلٹ کرکے دیکھا اور اس کے بعد میں کہا کہ یہ تو دو دینار کا ہے،تم نے تین دے دیئے ،ایک دینار تم نے زائد دیدیا ہے،اس لیے چلو اس کو واپس کردو، یا تو اپنی قیمت واپس لے لو یا نہیں تو اپنا ایک دینار واپس لے لو۔

تو اس نے کہا کہ آپ کون ہے؟ انہوں نے کہا کہ میں اسی دکان کا مالک ہوں، تو شیخ منکدر اس دیہاتی کو لے کر واپس پہنچے اور اپنے خادم سے کہا کہ تم نے یہ غلط حرکت کیوں کی؟ اس کا ایک دینار واپس کرو یا نہیں تو اسے تین دینار والا لبادہ دے دو۔خادم نے اس شخص سے پوچھا کہ کیا چاہتے ہیں؟ اس دیہاتی نے کہا کہ ایک دینار واپس کردو۔ چنانچہ ایک دینار واپس کردیا گیا اور وہ دیہاتی واپس جانے لگا، چلتے چلتے کچھ آس پاس کے لوگوں سے پوچھا کہ بھائی یہ کون صاحب ہیں، بڑے امانت دار معلوم ہوتے ہیں کہ ایسا ایسا واقعہ میرے ساتھ پیش آیا ہے۔تو لوگوں نے کہا کہ آپ نہیں جانتے ان کو؟ یہ شیخ منکدر ہیں۔

تو اب اس دیہاتی نے کہا کہ اچھا یہ ہیں شیخ منکدر،ہم لوگ اپنے علاقہ میں جب کبھی بارش بند ہوجاتی ہے تو شیخ منکدر کا واسطہ دے کر دعائیں مانگا کرتے ہیں، اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہم کو بارش دے دیتا ہے،اس نے کہا یہ تو وہ آدمی

ہیں، مجھے پتہ نہیں تھا اور کہنے لگا کہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ شیخ منکدر کوئی صاحب جبہ ودستار شخصیت ہوگی، جو کسی خانقاہ میں بیٹھ کر تسبیح گھماتے ہوں گے،لیکن یہاں آ کر پتہ چلا کہ یہ تو تاجر آدمی ہیں، تجارت کر رہے ہیں،لیکن مقام ایسا ہے اللہ کے نزدیک کہ اللہ ان کے نام کی بدولت، ان کے واسطے کی وجہ سے بارشیں نازل کر رہا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر راستے سے خدا کو پایا جا سکتا ہے۔

❁ بادشاہ بھی ولی اللہ ہوسکتا ہے،حضرت شجاع کرمانی کا واقعہ:

مثال کے طور پر کرمان کے بادشاہ حضرت شجاع کرمانی دیکھئے، یہ کرمان ایک بستی ہے، حضرت شجاع اس بستی کے بادشاہ تھے،اور ساتھ ہی بہت بڑے اللہ کے ولی تھے،ان کا ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ وہ مسجد تشریف لائے،نماز پڑھنے کے بعد دیکھا کہ ایک طالب علم نماز پڑھ رہے ہیں، بڑے خشوع کے ساتھ ، بڑے اطمینان کے ساتھ ،اور ایسی اچھی نماز کہ انہوں نے خال خال ہی کسی کو ایسا نماز پڑھتے دیکھا تھا۔

توان کا دل اندر سے کہنے لگا کہ یہ طالب علم جو نماز پڑھ رہا ہے ،اتنی شاندار نماز، یہ اس قابل ہے کہ میں اس کو اپنا داماد بنالوں،انہوں نے مال نہیں دیکھا،انہوں اس کی دنیوی حیثیت نہیں دیکھی ، اس کا حسب ونسب نہیں دیکھا،اس لیے کہ ان چیزوں سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے،تو شیخ کرمانی کے دل میں آیا کہ کیوں نہ میں اسکو اپنا داماد بنالوں، وہ طالب علم نماز سے فارغ ہوا،توانہوں نے اپنے وزیر سے کہا کہ اس طالب علم کو بلا کر لاؤ،وزیر نے جا کر اس کو بلایا،وزیر کے بلانے پر وہ بیچارہ کانپ

گیا کہ بادشاہ بلا رہے ہیں، پتہ نہیں کیا بات ہے؟ اب وہ آیا ڈرتے ہوئے، کانپتے ہوئے کہ معلوم نہیں میرے سے کیا خطا ہوگئی، لغزش ہوگئی ہوگی یا معلوم نہیں کہ کیا سوال کرلیا جائے اور میں جواب دے سکوں کہ نہ دے سکوں؟ جب وہ حاضر ہوا تو بادشاہ نے اسے بٹھایا اور بٹھانے کے بعد کہا کہ میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ میرے دل میں یہ خواہش گزری کہ میں تم کو اپنا داماد بنالوں، تمہاری اگر شادی نہیں ہوئی ہے تو تم اگر شادی کرنا چاہو تو میری لڑکی سے شادی کرلو، بس جناب یہ سننا تھا کہ ان کا دماغ چکرانے لگا، اس لیے کہ باشادہ کی بیٹی کو یہ فقیر شادی کرکے کیا کرے گا؟ کہاں رکھے گا؟ کیا کھلائے گا؟ کیسے اس کی خواہشات پوری کرے گا؟ اسے ہوسکتا ہے کہ دن میں پچاس جوڑوں کی ضرورت ہو، اب بے چارہ چکر میں آ گیا، ہاں کہوں تو مشکل، نہ کہوں تو بھی مشکل، ہاں کہنے میں یہ مصیبت، نہ کہنے میں یہ کہ بادشاہ کہیں ناراض ہوجائے کہ میری طرف سے یہ پیغام دیا جارہا ہے اور تو ٹھکرارہا ہے۔

بالآخر اس نے قبول کرلیا، اس کے بعد شادی کا وقت آیا، شادی ہوگئی، شادی ہونے کے بعد رخصتی ہوئی، یہ اپنے جھونپڑے میں لے گیا شہزادی کو، اور کھانے پینے کا مختصر انتظام ایک دو وقت کے لیے اس نے بنا رکھا تھا، جب کھانے کا وقت آیا تو میاں بیوی کھانے کے لیے بیٹھے، شرماشرمی میں کچھ زیادہ نہیں کھایا گیا، اور کچھ کھانا بچ گیا، اس طالب علم نے اپنی بیوی سے جو کہ شہزادی تھی کہا کہ اس بچے ہوئے کھانے کو کو اُٹھا کر رکھ دینا، صبح ہمیں ناشتے میں کام آئے گا، اس نے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور رونے بیٹھ گئی، اب رورہی ہے، رورہی ہے، طالب علم بہت پریشان کہ آخر کیا ماجرا ہے؟ اس نے اس سے بار بار پوچھا کہ کیا بات ہے؟ کیوں

روتی ہو مگر اس نے کوئی جواب ہی نہیں دیا، یہ کہنے لگا کہ میں نے تمہارے والد سے پہلے ہی کہا تھا کہ میں آپ کی بیٹی کو کیسے سنبھالوں گا، میری جھونپڑی اسے کیسے پسند آئے گی، میری رہائش کا اندازا سے کیسے پسند آئے گا، میرا سوکھا موکھا کھانا اسے کیسے پسند آئے گا، لیکن آپ کے والد نے بڑی غلطی کی کہ میرے سے آپ کی شادی کر دی اور آپ کے تمام جذبات اور تمام خواہشات کو انہوں نے بالکل پیس کر رکھ دیا، یہ آپ کے والد کی غلطی ہے، میری غلطی نہیں ہے، شاید تم کو میرا یہ جھونپڑا اور یہ سوکھا کھانا پسند نہیں آیا، اس لئے رو رہی ہو؟ شہزادی نے کہا کہ میں اس لیے نہیں رو رہی ہوں کہ مجھے جھونپڑے میں رکھا گیا یا سوکھا کھانا کھلایا گیا، بلکہ اس لیے رو رہی ہوں کہ میرے والد نے مجھے یہ کہا تھا کہ میں ایک متقی پرہیزگار اور اللہ والے سے تیرا رشتہ کر رہا ہوں، جو توکل علی اللہ کی دولت سے مالا مال ہے، لیکن میں نے یہاں پر آ کر آپ میں توکل نہیں دیکھا، آپ کہہ رہے ہیں کہ
کھانا اٹھا کر کل کے لیے رکھو، جس خدا نے آج آپ کو دیا وہ کیا کل نہیں دے سکتا؟ اس لیے مجھے رونا آ رہا ہے۔

اللہ اکبر! آپ سوچئے کہ وہ بادشاہ کیسا ہوگا اور بادشاہ کی بیٹی پر اس کی تربیت کیسی ہوگی، اس کا اندازہ کچھ دیر کے لیے آپ کرنا چاہیں، میں سمجھتا ہوں کہ صحیح طور پر نہیں کر پائیں گے، بادشاہ کا جو انداز ہوتا ہے، اس کے پاس جو طاقتیں ہوتی ہیں، جو چیزیں ہوتی ہیں، اس کے اندر دینی غیرت ایسی، توکل ایسا، اللہ سے تعلق ایسا پیدا کرنے کی اس نے اگر کوشش کی ہے تو کیا کیا نہ کیا ہوگا؟

معلوم ہوا کہ ایک آدمی بادشاہ ہوتے ہوئے خدا کا ولی ہوسکتا ہے، شہزادی خدا کی ولی ہوسکتی ہے، شہزادہ خدا کا ولی ہوسکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ تک پہنچنے کے لیے

ہزار راستے ہیں، کروڑوں ہیں، جس راستے سے چاہے آدمی پہنچ سکتا ہے، کوئی چیز اسے اللہ تک پہنچنے سے روک نہیں سکتی، جیسا کہ آپ کو یہ مثالیں بتا رہی ہیں۔

سب کچھ کریں، مگر دل اللہ سے غافل نہ ہو:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ اللہ کے نبی علیہ الصلوۃ والسلام گھر میں اس طرح رہتے تھے کہ کوئی دور سے دیکھنے والا یہ اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ آپ اتنے بڑے جلیل الشان خدا کے نبی ہیں، بالکل معمولی سا انداز ہوتا تھا، آپ گھر کا کام بھی کررہے ہیں، کبھی جھاڑو بھی دے رہے ہیں، کبھی چولہا بھی پھونک رہے ہیں اور مختلف کاموں میں لگے ہوئے ہیں، بیویوں کے ساتھ ہنستے بولتے بھی ہیں، مزاح وتفریح بھی ہورہی ہے، اپنے گھر کے اورافراد کے ساتھ بھی بات چیت ہورہی ہے، اس کے بعد کہتی ہیں لیکن جونہی اذان ہوجاتی تو آپ کے چہرۂ انور کا رنگ بدل جاتا، اذان ہوتے ہی ایسا معلوم ہوتا کہ آپ ہم کو پہچانتے ہی نہیں ہیں۔(خلاصہ از بخاری:۵۶۹۲ ، ترمذی:۲۴۸۹، مسند احمد: ۲۵۷۵۱، صحیح ابن حبان:۱۲/۴۹۰)

اس طرح ہمیں بھی زندگی کرنا چاہئے کہ دنوی کاروبار کے وقت اس کو کیا جائے مگر خدا سے غافل نہ ہوں، نماز سے قرآن سے، ذکر وتلاوت سے کسی سے غافل نہ ہونا چاہئے۔

اسی کو بزرگوں نے کہا اور نقشبندیہ سلسلہ کے بزرگوں میں ایک اصطلاح ہے، ''خلوت درانجمن''لوگوں کے درمیان میں انجمن میں بیٹھے ہیں، مجلس میں بیٹھے ہیں، لیکن تب بھی خلوت میں ہیں، لوگوں سے بات چیت ہورہی ہے، دل اللہ کی طرف لگا ہے، لوگوں سے میل ملاپ ہورہا ہے، لیکن دل کا تعلق اللہ سے قائم ہوگیا ہے۔

اس کو کہا قرآن نے کہا:﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ﴾

ایک دربان کا مقام ولایت، عبداللہ حاجب کا واقعہ:

اسی طرح ایک واقعہ کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک آدمی جنگل سے گزر کر شہر کی طرف آرہا تھا تو ایک بوڑھے سے ملاقات ہوئی، تو ان بوڑھے صاحب نے اس سے پوچھا کہ آپ کہاں جارہے ہیں؟ تو کہا کہ میں شہر کی طرف جارہا ہوں، تو کہا کہ اچھا دیکھو اگر فلاں محلّہ میں آپ کا جانا ہو تو عبداللہ نام کے ایک صاحب فلاں جگہ پر رہتے ہیں، ان کو عبداللہ حاجب کہتے ہیں، وہ ایک رئیس کے دربان ہیں، ان سے میرا سلام سنا دینا۔

جب یہ صاحب اس محلّہ میں آئے تو ان کو یاد آیا تو انہوں نے تلاش کیا کہ یہاں عبداللہ حاجب کون ہیں؟ تو لوگوں نے بتایا کہ فلاں جگہ پر رہتے ہیں، اور ایک امیر کے دربان ہیں، دربان کیا؟ گیٹ کیپر، کوئی بڑا عہدہ نہیں ہے۔

اب وہاں پہنچے اور ان کو جا کر کہا کہ میں فلاں جگہ سے فلاں دن آرہا تھا، راستہ میں ایک بزرگ شخصیت سے ملاقات ہوئی، انہوں نے آپ کو سلام بھیجا ہے، عبداللہ حاجب نے وعلیک وعلیہ السلام کہا۔ اس کے بعد اس آدمی نے پوچھا کہ وہ بزرگ کون تھے جو آپ کو سلام سنا رہے تھے، تو عبداللہ حاجب نے کہا کہ آپ کو اس سے کیا غرض ہے؟، مگر وہ آدمی اصرار کرتا رہا کہ بتا دیجئے! کیونکہ ان کا چہرہ بہت نورانی تھا، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی بہت بڑی شخصیت ہے۔

تو انہوں نے کہا کہ وہ اصل میں حضرت خضر علیہ السلام تھے۔ اس آدمی کے دل میں آیا کہ حضرت خضر علیہ السلام خصوصیت کے ساتھ اس آدمی کو سلام کیوں بھیج رہے

ہیں، جب کہ اس شہر میں اتنے لوگ ہیں، مسجدوں کے امام بھی ہوں گے، اور مدارس کے معلمین و مدرسین بھی ہوں گے، بڑی بڑی خانقاہوں کے شیوخ بھی ہوں گے، علماء ومفتیان بھی ہونگے ، لیکن ان سب کو چھوڑ کر حضرت خضر علیہ السلام اس کو کیوں سلام پہنچا رہے ہیں، وہ بھی ایک دربان کو، کیا بات ہے؟ تو اس نے پوچھا کہ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آخر حضرت خضر علیہ السلام آپ کو خصوصیت کے ساتھ سلام کیوں سنائے ہیں؟ تو وہ صاحب کہنے لگے کہ بس ہمارا اور ان کا ایک تعلق ہے، اس لئے انہوں نے سلام کہا ہے۔

اس آدمی نے کہا کہ کیا آپ کوئی مخصوص عمل کرتے ہیں؟ تو عبداللہ حاجب نے کہا کہ کسی بھی کام میں لگتا ہوں تو میرا دل خدا سے غافل نہیں ہوتا، پھر انہوں نے اپنی تفصیل سنائی کہ صبح اٹھتا ہوں ، اس کے بعد یہ کرتا ہوں ، اس کے بعد یہ کرتا ہوں، اس کے بعد امیر کے پاس جاتا ہوں، اس کی یہ خدمت کرتا ہوں، اور یوں رہتا ہوں، لیکن جو کچھ بھی کرتا ہوں، لیکن خدا سے کبھی دل غافل نہیں ہوتا ہے۔

یہ ہے وہ بات جس کو قرآن کہتا ہے" رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰه" ایسے مرد ہیں، عجیب وغریب مرد کہ سب کچھ کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود تجارت اور خرید وفروخت ان کو اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی ، ایسے بندوں کے لیے اللہ کے نزدیک خصوصیت کا مقام ہے ،تو اس لیے ہمیں کسی بھی راستے کو یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس کے ذریعہ ہم اللہ کے راستہ میں چلنے سے فیل ہوجائیں گے۔ تاجر اپنی تجارت کے ذریعہ اللہ کو پاسکتا ہے، ملازم اپنی ملازمت کے ذریعہ اللہ کو پاسکتا ہے۔ دو واقعات میں نے آپ کو سنائے، پہلے واقعہ میں تاجر کا قصہ آیا ہے، دوسرے واقعہ میں ملازم کا قصہ آیا۔

معلوم ہوا کہ کوئی شخص ملازمت کرتے ہوئے بھی خدا تک پہنچ سکتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی تاجر تجارت کرتے ہوئے اللہ کو پالے، یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ آپ دنیا کے کاروبار کو چھوڑیں، تبھی آپ اللہ تک پہنچ سکتے ہیں، یہ بات بالکل غلط ہے، اور ذہن میں اس طرح کی بات لانے سے ہوسکتا ہے کہ شیطان کسی اور راہ پر ڈال دے۔ کسی بھی راستہ پر اللہ نے آپ کو لگایا ہو، جائز طریقہ ہو، اس کے ذریعہ آپ اللہ کو پاسکتے ہیں۔

❁ یادِ حق اور کاروبار کا اجتماع ممکن، ایک واقعہ:

فرمایا کہ ہاں یہ سوال یہاں پیدا ہوتا ہے کہ ہم کاروبار میں، ملازمت میں اور دنیوی کاموں میں رہتے ہوئے بھی کس طرح اللہ کو یاد رکھ سکتے ہیں؟ اکثر لوگ ان دو باتوں میں تضاد سمجھتے ہیں، مگر ان میں کوئی تضاد نہیں، میں اپنا ایک واقعہ سناتا ہوں، اس سے اس پر روشنی پڑتی ہے، وہ یہ کہ ہمارے بچپن کا واقعہ ہے کہ میسور میں جو مہاراجہ گزرا ہے اس کا محل اب تک موجود ہے، مشہور ہے، اور بڑا عالیشان ہے، واقعی بہت شاندار ہے، شاید پرانے محلات میں سے یہی ایک محل ایسا باقی رہ گیا ہے، جو شروع سے اخیر تک محفوظ ہے، ورنہ تو سب کھنڈروں میں تبدیل ہو چکے ہیں، بہت زمانہ پہلے بچپن میں ایک بار ہم لوگ وہاں گئے، میرے ساتھ اور بھی کچھ لوگ تھے، تو وہاں یہ بتایا گیا کہ اتوار کو یا ہفتہ کے دن پورے محل کے لائٹ جو اس کے اوپر ڈیکوریشن کے طور پر لگائے گئے ہیں، پورے کے پورے ایک ہی وقت میں جلائے جاتے ہیں، اور اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورے محل کو ایک دم آگ لگ گئی، ایک دم ایک ہی سکنڈ میں پورا محل روشن ہوجاتا ہے، ہزاروں ہزار لائٹس اس کے پورے محل کے اوپر لگائے ہوئے ہیں، اور سب کے سب ایک دم سے جلائے جاتے ہیں۔ اس کو دیکھنے کے لیے ہزاروں لوگ آکر بیٹھے ہوئے تھے، تو ہم لوگ بھی چلے

گئے، اور ایک طرف کو بیٹھ گئے، تو جو حضرات ہمارے ساتھ تھے وہ کچھ کھانے کے لیے بھی لائے، اور ہم لوگ کھا بھی رہے تھے، اور کچھ باتیں بھی کر رہے تھے، لیکن اس کے باوجود دل دماغ اُدھر ہی لگا ہوا تھا، کہ وہ لائٹ اب جلیں گے، تب جلیں گے، اس لیے کہ وہ لمحہ ایک ہی لمحہ آتا ہے، اور وہ لمحہ ہی میں دیکھنے کا ہوتا ہے، جلنے کے بعد تو سبھی دیکھتے رہتے ہیں، وہ دیکھنے کا نہیں ہے، دیکھنا یہ ہے کہ جلتے وقت کیسا جلتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا کہ یہ پورا محل آگ ہی ہے، اسی وقت اسی سکنڈ میں دیکھنا ہے، یہ سکنڈ گزر گیا تو پھر ایک ہفتہ کے بعد میں وہ سکنڈ آئے گا، اس لئے کھاتے پیتے، کام کاج کرتے، بات چیت کرتے ہوئے بھی دماغ ادھر ہی لگا تھا۔

اس سے ایک بات کی جانب ذہن منتقل ہو گیا اور یہ بات معلوم ہوئی کہ جو بزرگانِ دین کہتے ہیں کہ دنیا کا کام کرتے ہوئے بھی اللہ کی طرف توجہ ہو سکتی ہے، وہ دراصل ایسے ہی ہے کہ کھانے پینے میں باتوں میں مصروف ہونے کے باجود دماغ ادھر ہوا لگا ہوا ہو۔

بھائیو! اسی طریقہ پر اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اللہ کی طرف توجہ ایک آدمی کے دل میں اگر رسوخ پکڑ جائے تو دنیا کا کوئی کاروبار اور دنیا کی کوئی چیز اسے غافل نہیں کر سکتی۔

یہ مضمون ہے اس کو آپ ذہن میں لے جایئے اور اپنے کاروبار کرتے ہوئے، اپنی ملازمت کرتے ہوئے، اپنی تعلیم کرتے ہوئے، اور دنیا میں مختلف اپنے کام وکاج میں لگتے ہوئے، بیوی بچوں میں رہتے ہوئے، گھریلو کام کرتے ہوئے، کسی بھی چیز میں یہ نہ سوچیے کہ یہ اللہ سے ہم کو غافل کرنے والی ہے، بلکہ یہ سب چیزیں ہمارے لیے اللہ کے کام میں معین اور مددگار ہو سکتی ہیں، اس کے ذریعہ اپنے آپ کو خدا تک پہنچانے کی کوشش کریں، اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی توفیق عطا فرمائے۔

اُنہیں کا کرم دیکھتے ہیں

از: محمد شعیب اللہ خان ظرؔفی

زمانے کو زیرِ قدم دیکھتے ہیں ☆ یہ سب ہم اُنہیں کا کرم دیکھتے ہیں
غلاموں کو شاہی کی عزت ملی ہے ☆ غلامی کا صدقہ یہ ہم دیکھتے ہیں
کبھی کیف و مستی کبھی قبض و وحشت ☆ سبھی میں رُموز و حِکَم دیکھتے ہیں
مَرَض ہو یا صحّت، الم ہو یا راحت ☆ مشیت پہ سب ہی کو خم دیکھتے ہیں
مقامِ ولایت جنہیں مل گیا ہو ☆ نہ خائف وہ ہوتے نہ غم دیکھتے ہیں
ترے عشق کا غم جنہیں مل گیا ہو ☆ دلوں میں وہ لطفِ حَرَم دیکھتے ہیں
ترے نام کی لذّتیں پا گئے جو ☆ تجلّی تری دمبدم دیکھتے ہیں

شعیبؔ اُن سے اُن کے سوا ہم کیا مانگیں
کہ ہر شئ کو ہم کالعدَم دیکھتے ہیں

جلد سوم

افادات

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی ومہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم بنگلور

وخلیفہ حضرت اقدس مولانا مفتی مظفر حسین صاحب نور اللہ مرقدہ

مرتب

مولوی محمد زبیر قاسمی

فیضان معرفت

جلد سوم

افادات

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم
بانی و مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم بنگلور

وخلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ
ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

مرتب
محمد زبیر
(استاذ جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور)

ناشر:
فیصل پبلیکیشنز دیوبند

اجمالی فہرست

فہرست مضامین

عناوین | **صفحہ**

اللہ تعالیٰ کی محبت کیسے ملتی ہے

انسانی دل ایک کمپیوٹر ہے

ایک حدیث کی جدید اور انوکھی تشریح

نبی ﷺ کی ذات اسوۂ حسنہ

معرفت الٰہی اور اس کے آثار

شیطانی حربے

اللہ تعالیٰ ہی کو مقصود بنائیے

نماز کو نماز کیسے بنائیں

بیعت کیا اور کیوں؟

اطاعت مومن کی حیات ہے

ملنے کا پتہ
مکتبہ مسیح الامت
۸۴ ر آرمسٹرانگ روڈ، بیدواڑی، بنگلور
فون: 9036701512

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

الحمد لأهله والصلوة لأهلها:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے، اسی مقصد خداوندی کی تبلیغ کے لئے انبیاء کرام کا مبارک سلسلہ جاری ہوا، جو امام الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر ختم ہوا، آپ کے بعد اس عظیم کام کو حضرات اہل علم اور بالخصوص اولیاء عظام نے سنبھالا، اور انہوں نے تصنیف وتالیف، درس وتدریس، وعظ ونصیحت کے ذریعہ امت تک اس امانت کو امانت داری کے ساتھ بحسن وخوبی پہنچایا۔ ان صلحاء واولیاء کی صحبتیں اور مجلسیں انسانوں کے دلوں کو معرفت الٰہی ومحبت الٰہی کے نور سے منور کرنے میں ہر زمانہ میں مؤثر رہی ہیں۔

اسی سلسلۂ عالیہ کی کیمیا اثری کا نمونہ مربی ومرشدی فداہ ابی وامی حضرت اقدس دامت برکاتہم ہیں اور ویران دل کے تاروں کو چھونے والی آپ کی نورانی مجالس وملفوظات ہیں، جس کے مجموعہ ''فیضان معرفت'' کی جلد اول ودوم کو اللہ تعالیٰ نے بے پناہ مقبولیت عطاء فرمائی، اور الحمد للہ سالکین طریقت کو اس سے بہت فائدہ پہنچا، جس کی وجہ سے بہت سارے احباب تیسری جلد کے منتظر تھے۔

اب اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اساتذۂ کرام کی محنتوں اور دعاوں کے نتیجہ میں بندہ کو جلد سوم کی ترتیب کی سعادت ملی۔ ان مجالس کے مجموعہ کی ایک خوبی یہ ہے کہ

حضرت والا اس پر از اول تا آخر نظر فرماتے ہیں، اور نہایت مفید اضافے فرما کر ترتیب کی خامی کی وجہ سے پیدا شدہ مضامین کی تشنگی کو دور فرماتے ہیں۔

نیز اپنے قیمتی مشوروں سے نواز کر احقر کی ہمت افزائی فرماتے ہیں، اسی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے کہ مجالس کی ترتیب کا سلسلہ آگے بڑھ رہا ہے۔

اخیر میں میں حافظ سید محمد صہیب متعلم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم اور حافظ و مولوی حبیب الرحمٰن صاحب نائب امام مسجد بید کا ممنون و مشکور ہوں کہ انہوں نے مجالس کی ترتیب کے سلسلہ میں میرا بھرپور تعاون فرمایا، جس کے لئے میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اجرِ عظیم عطاء فرمائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ پہلی اور دوسری جلد کی طرح تیسری جلد کو بھی مقبولیت عطاء فرمائے، اور ان مجالس کی ترتیب کے سلسلہ کو مزید آگے بڑھانے کی توفیق عطاء فرمائے اور امت کو نفع پہنچائے اور میرے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے، اور حضرت اقدس دامت برکاتہم کا سایہ ہم پر تا دیر قائم و دائم رکھے تا کہ ہم آپ کے علوم ظاہری و باطنی سے اور آپ کے مواعظ حسنہ سے اور آپ کی صحبتوں سے فیضیاب ہوتے رہیں۔

محمد زبیر
استاذ جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم
۱۵/ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ

اللہ تعالیٰ کی محبت کیسے ملتی ہے

باسمہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ کی محبت کیسے ملتی ہے

الحمدللّٰه و کفیٰ و سلام علی عباده الذین اصطفیٰ . أما بعد فقد قال النبی ﷺ قال اللّٰه تعالی:"وجبت محبتی للمتحابین فیَّ و المتجالسین فیَّ والمتزاورین فیَّ والمتباذلین فیَّ (أو کما قال علیه الصلاة والسلام)(مؤطا امام مالك :١٧٤٨، مسند احمد:٢٢٦٥١)

میں نے ایک حدیث قدسی آپ کے سامنے پڑھی ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ خبر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:"میری محبت واجب ہوگئی ان لوگوں کے لیے جو میرے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے بھی میری محبت واجب ہوگئی، ضروری ہوگئی، جو میری محبت کی خاطر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے اٹھتے ہیں اور ان کے لیے بھی میری محبت واجب ہوگئی، جو میری محبت کی خاطر ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں اور آخری جملہ میں فرماتے ہیں کہ"ان لوگوں کے لیے بھی میری محبت واجب ہوگئی جو میری ہی محبت کی خاطر مال و دولت خرچ کرتے ہیں)

یہ حدیث ایک عجیب قسم کی حدیث ہے، اس میں اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ میری محبت کیسے ملتی ہے اور کب ملتی ہے۔

جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

سن لے اے دوست جب ایام بھلے آتے ہیں
گھات ملنے کی وہ خود آپ ہی بتلاتے ہیں

اللہ اکبر! جب اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتے ہیں اور اس کا اچھا وقت آجاتا ہے تو خود وہی بتاتے ہیں کہ کیسے ملنا ہے ہم سے؟ کہاں ملنا ہے ہم سے؟ اور ملنے کی راہ کیا ہے؟ یہ سب باتیں وہ خود ہی بتلا دیتے ہیں۔ اور اگر کسی کے ایام بھلے نہیں آتے تو آدمی ٹکروں پر ٹکّریں کھاتا رہتا ہے، نماز بھی جاری، ذکر بھی جاری، تلاوت بھی جاری، سب جاری اور دوسری طرف سے فضیحت بھی جاری، اس لیے کہ اس کا بھلا وقت نہیں آیا۔

شیطان نے بہت سجدے مارے لیکن کیا اس کا کوئی سجدہ اس کے کام آیا؟ بہت سجدے کیے یہاں تک کہ بعض علماء لکھتے ہیں کہ زمین کا کوئی چپہ ایسا نہیں جہاں اس نے سجدہ نہ کیا ہو، چپہ چپہ پر اس کا سجدہ، لیکن اس کا سجدہ اسے کچھ بھی کام نہیں آیا، کیوں؟ اس لیے کہ اس کے لیے کہ بھلے ایام آئے ہی نہیں۔

اب دیکھئے کہ اللہ نے اپنی محبت کے حصول کا کیا پتہ دیا ہے؟ اس حدیث میں کل چار قسم کے لوگوں کا ذکر ہے جن کو اللہ اپنی محبت عطاء فرماتے ہیں، ایک وہ جو ایک دوسرے سے اللہ کے لئے محبت کرتے ہیں، دوسرے وہ جو اللہ کی خاطر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے اٹھتے ہیں، تیسرے وہ جو اللہ کی خاطر ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں اور چوتھے وہ جو اللہ کے لئے مال و دولت خرچ کرتے ہیں۔

اور یہ چار الگ الگ قسم کے لوگ نہیں ہیں، بلکہ یہ چار وہ ہیں جن کے اندر یہ چاروں صفات یکجا ملتی ہیں، گویا کہ یہ چاروں کی چاروں صفات ایک ہی ذات کے اندر ملتی ہیں، اس لیے کہ وہ آپس میں لازم ملزوم ہیں، ایک کے بغیر دوسرے کا وجود نہیں۔ اور جب ایک پایا جائے تو دوسرے کے نہ پائے جانے کا کوئی سوال نہیں۔ لہٰذا اس حدیث سے یہ سمجھ میں آیا کہ اللہ کی محبت ان لوگوں کو ملتی ہے جن کے

اندر یہ چار صفات موجود ہوں۔لہذا اللہ کی محبت کا پتہ یہ ہے کہ ان چار صفات کو پالیں،جس کو یہ چار صفات مل گئیں اس کو اللہ کی محبت مل گئی۔

ہر ایک اللہ کی محبت کا خواہاں ہے

بھائیو! ہم میں کون ایسا ہے جو یہ نہ چاہتا ہو کہ اللہ تعالی کی محبت اسے ملے؟ سب چاہتے ہیں کہ اللہ کی محبت ہم کو مل جائے، ہر آدمی کی آرزو ہے، جستجو ہے، تلاش ہے، تمنا ہے، خواہش ہے کہ اللہ کی محبت ملے، حتی کہ جو لوگ گناہوں میں ملوث ہیں، وہ لوگ بھی چاہتے ہیں کہ ان کو اللہ کی محبت حاصل ہو، آپ کسی شرابی سے پوچھ کر دیکھئے، اور کسی زناکار سے پوچھ کر دیکھئے، کسی فاسق اور فاجر سے پوچھ کر دیکھئے بلکہ کافر سے پوچھ کر دیکھئے وہ بھی اللہ کی محبت چاہتا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے کہ اس چیز کی الفت اور محبت خدا نے سب کے دلوں میں ڈال رکھی ہے، اسی لیے اللہ کی معرفت انسان کی طبعی خواہش ہے، اللہ سے محبت انسان کی فطری آرزو ہے۔

جو مضطرب ہے اس کو ادھر التفات ہے

آخر خدا کے نام میں کوئی تو بات ہے

یہ الگ بات ہے کہ اسے شیطان بھٹکا بھٹکا کر غلط راہوں پر ڈالتا ہے جس کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب نہیں ہوتا، لیکن جہاں تک مسئلہ ہے نفس کی خواہش کا تو وہ ہر انسان کے دل میں ہے کہ اللہ کی محبت چاہئے اور اللہ کی معرفت چاہئے۔

پہلی صفت- اللہ والوں سے محبت

اب دیکھئے کہ اللہ کی محبت کن کن کو ملتی ہے؟ اس حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ نے سب سے پہلے فرمایا کہ "وجبت محبتی للمتحابیین فی" کہ اللہ کی محبت

ایک تو ان کو ملتی ہے جو اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔

یہ بات بہت واضح ہے کہ اللہ کے لیے محبت اسی آدمی سے ہوسکتی ہے جو اللہ کا محبوب ولاڈلا ہے، ورنہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ مثلاً کسی کافر سے محبت کریں اور کہیں کہ میں اللہ کے لیے ایک کافر سے محبت رکھتا ہوں؟ کسی فاجر سے، کافر سے اور کسی غلط کار انسان سے آپ محبت کریں اور پھر یہ دعویٰ کریں کہ میں اس آدمی سے جو محبت کررہا ہوں وہ محض اللہ کی محبت کے لیے ہے تو یہ بات حدیث کے منشاء کے خلاف ہے، اور اس دعوے کے اندر کوئی واقعیت اور کوئی حقیقت نہیں۔

اس لیے یہاں لامحالہ مراد یہ ہے کہ اللہ سے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں یعنی نیک لوگوں سے محبت کرتے ہیں۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد اولیاء اللہ کی اور نیک لوگوں کی محبت ہے۔

دوسری بات اس میں سمجھنے کی یہ ہے کہ ''متحابین'' عربی پڑھنے والے جانتے ہیں کہ یہ ''تحابب'' سے بنا ہے اور اس میں اشتراک پایا جاتا ہے، اس لئے اس کا ترجمہ ہے'' آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرنا''لہٰذا ''متحابین'' دو قسم کے لوگ ہوں گے: ایک محبت کرنے والے ہوں گے اور ایک وہ ہوں گے جن سے محبت کی جائے، اسی وقت ''متحابین'' کا اطلاق صحیح ہوتا ہے، تو اب مطلب یہ ہوا کہ کچھ لوگ محض اللہ کی محبت میں اللہ کے محبوب بندوں سے محبت کریں گے اور دوسرے وہ لوگ جو اللہ کے محبوب ہیں وہ بھی ان لوگوں سے اس لیے محبت کریں گے کہ یہ اللہ کو چاہتے ہیں، اور اللہ کی محبت حاصل کرنے ان کی خدمت میں آئے ہیں۔ادھر سے بھی محبت کا تحقق ہو، ادھر سے بھی محبت کا تحقق ہو، جب دونوں طرف سے تحقق محبت کا ہوا تو اشتراک ہوگیا۔

لہٰذا اولیاء اللہ کی خدمت میں جانا ہے؛ کیوں؟ ان سے محبت رکھنا ہے؛ کیوں؟ ان سے تعلق رکھنا ہے؛ کیوں؟ اس لیے کہ ان سے محبت کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ اپنی محبت ضرور بالضرور دیتے ہیں۔

ان سے ملنے کی ہے یہی یک راہ
ملنے والوں سے راہ پیدا کر

ارے جناب! اگر آپ اللہ کو چاہتے ہیں تو انہیں لوگوں کے پاس تو جائیں گے جن کے پاس اللہ ملے گا، چاول خریدنے انھیں کے پاس تو جائیں گے جن کے پاس چاول ملے گا، سونا خریدنے انھیں کے پاس تو جائیں گے جن کے پاس سونا ملے گا، اگر کسی آدمی کو سونا چاہیے اور وہ چلا گیا لوہار کے پاس تو اسے کبھی بھی سونا نہیں ملے گا۔ اسی طرح کافر کے پاس کفر ملے گا، فاسق کے پاس فسق ملے گا، خدا کی محبت نہیں ملے گی، جن کے پاس خدا کی محبت ہے وہ ہیں اولیاء اللہ، ان کے دلوں کے اندر جو خدا کی محبت ہے، اس کو پانے کے لیے ان سے محبت کیجئے۔ یہ ہے حاصل اس حدیثِ پاک کا۔

اللہ کے لئے محبت کرنے والوں کا مقام

ایک حدیث میں ہے، اللہ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اللہ فرماتے ہیں: "أَلْمُتَحَابُّوْنَ فِي جَلَالِي لَهُمْ مَنَابِرُ مِنْ نُوْرٍ يَغْبِطُهُمُ النَّبِيُّوْنَ وَ الشُّهَدَاءُ" (جو لوگ میرے جلال کی وجہ سے ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں، ان کے لیے قیامت کے دن نور کے ممبر بچھائے جائیں گے اور ان کو دیکھ کر انبیاء اور صدیقین بھی رشک کریں گے)۔ (ترمذی: ۶۴/۲، مسند احمد: ۲۲۰۸۰)

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام دعاؤں میں مسلسل

ایک دعا یہ بھی کرتے تھے:

﴿ أَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِی حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ یَّنْفَعُنِیْ حُبَّہٗ عِنْدَکَ ﴾

(اے اللہ! مجھے تیری محبت عطاء فرما اور اس شخص کی بھی محبت عطاء فرما جس کی محبت تیرے نزدیک کام آنے والی ہے) (ترمذی: ۲/۱۸۷)

اللہ کے نبی دعاء میں کہہ رہے ہیں: اے اللہ! اس شخص کی بھی محبت عطاء فرما جس کی محبت تیرے پاس مجھے کام آنے والی ہے۔ سب سے بڑے تو حضور ہی ہیں، ان سے بڑا تو کوئی نہیں حتیٰ کہ انبیاء بھی نہیں، آپ سردارِ انبیاء ہیں، آپ سید الاولین والآخرین ہیں، آپ سید الکائنات ہیں، آپ سید الانبیاء ہیں، سید المرسلین ہیں، آپ امام الانبیاء ہیں، آپ سے بڑا تو کوئی نہیں، اس کے باوجود یہ دعاء مانگنا دراصل ہمیں اور آپ کو اللہ والوں کا مقام بتانے اور سمجھانے کے لیے ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ والوں کی محبت مطلوب عندالشرع ہے۔ اور دوسری بات یہ بھی سمجھ میں آئی کہ اللہ کے ولیوں سے محبت رکھیں گے تو اللہ کے نزدیک وہ کام بھی آئے گی، کبھی ان کی سفارش ہوجائے گی، کبھی ان کی دعاء لگ جائے گی۔

بعض بزرگان دین نے ایک عجیب بات فرمائی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے محبوب بندوں کے دلوں میں جھانکتے ہیں، اور ان کے دلوں میں جن جن کی محبت ہوتی ہے ان کو بھی مقبول بنادیتے ہیں۔

اللہ اکبر! گویا اللہ تعالیٰ کہتے ہیں: یہ میرے بندے کا دل ہے اور اس دل میں دیکھو فلاں فلاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ یعنی یہ بندہ ان بندوں سے محبت کرتا ہے، جب ان سے یہ بندہ محبت کرتا ہے تو پھر میں ان کو بھی قبول کرلیتا ہوں۔

اہل اللہ کے جلیس محروم نہیں ہوتے

اسی لیے عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جو اولیاء اللہ سے تعلق رکھنے والے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو ہمیشہ محفوظ و مامون رکھتا ہے، جو اولیاء اللہ سے محبت کے ساتھ دین سیکھتے ہیں، اولیاء اللہ کی سرپرستی میں عمل سیکھتے ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ دین پر چلنا انگلی پکڑ پکڑ کر سیکھتے ہیں، جیسے بچہ اپنے باپ کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھتا ہے تو انشاء اللہ! اللہ تعالیٰ ان کو کفر سے، شرک سے، بدعت سے، ضلالت وگمراہی سے محفوظ و مامون رکھیں گے۔

ایک حدیث ذہن میں آ گئی، وہ یہ کہ نبی کریم ﷺ نے ایک طویل حدیث میں فرمایا کہ اللہ کے فرشتے راستوں میں ذاکرین کو تلاش کرتے رہتے ہیں، جب وہ اللہ کے پاس جاتے ہیں تو اللہ تعالی ان سے اہل ذکر کے بارے میں پوچھتے ہیں پھر فرماتے ہیں کہ تم گواہ رہنا کہ میں نے ان کی مغفرت کر دی، تو ایک فرشتہ کہتا ہے کہ اے اللہ! ان میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو ذکر کے لئے نہیں بلکہ اپنی کسی حاجت کی وجہ سے وہاں آیا تھا، تو اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ: "**هُمُ الْجُلُسَاءُ لَايَشْقٰى بِهِمْ جَلِيْسُهُمْ**" (یہ اہل ذکر وہ لوگ ہیں کہ ان کے پاس بیٹھنے والا بھی محروم نہیں ہے)
(بخاری: ۶۴۰۸، صحیح ابن حبان: ۳/۱۳۵)

اولیاء اللہ سے محبت و تعلق کا فائدہ، امام رازی کا واقعہ

اولیاء اللہ سے تعلق ومحبت رکھنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالی ان کی وجہ سے ہمیں نواز دیتے ہیں، اور ایمان محفوظ رہتا ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ امام رازیؒ ایک جلیل القدر عالم، فاضل، مفسر اور اسی کے ساتھ ساتھ آپ بہت بڑے

فلسفی منطقی تھے، آپ نے محبت خداوندی کی خاطر ایک اللہ والے سے بیعت کی، شیخ نے اذکار و وظائف بتائے رات میں اٹھکر تہجد پڑھنے کو کہا، ذکر کرنے کا حکم دیا۔

امام رازی حکم کے مطابق جب ذکر کے لیے رات میں بیٹھتے تو ان کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کے اندر سے ایک دھواں نکل رہا ہے، انھوں نے چند دن تو دیکھا، اس کے بعد اپنے شیخ کے پاس جا کر شکایت کی کہ حضرت! میں ذکر کرتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے دل کے اندر ایک آگ ہے، اس کا دھواں نکل کر میرے منہ سے باہر جا رہا ہے۔

شیخ نے کہا کہ یہ اللہ کی محبت کی آگ ہے جو دل میں لگ رہی ہے، اور تمہارے فلسفہ اور منطق کے علوم کو جلا رہی ہے، اسی کا یہ دھواں ہے۔ امام رازی کو یہ سن کر بڑا افسوس ہوا، اس لیے کہ ان علوم کے پیچھے تو عمر لگائی تھی، زندگی کھپائی تھی، بڑا پیسہ خرچ کیا تھا، رات رات جاگتے رہے تھے، اپنا سارا آرام اور عیش اس کے پیچھے گنوا ڈالا تھا، یہاں تک کہ دنیا میں منطقیوں اور فلسفیوں کے امام قرار پائے۔

تو امام رازی نے کہا کہ اتنا سارا علم جو میں نے اتنی محنت اور مجاہدہ سے حاصل کیا ہے، اگر وہ جل کر خاک ہو جاتا ہے تو یہ مجھے منظور نہیں ہے۔ اس لیے واپس چلے آئے، لیکن آگ تو اندر لگ چکی تھی، وہ ایک چنگاری کی شکل میں اندر دبی رہی، زمانہ گزرتا رہا، گزرتا رہا، پھر ایک وقت وہ آیا جو ہر انسان کے لیے اللہ نے مقدر کر رکھا ہے یعنی موت کا وقت۔ موت کے وقت شیطان بہکانے کے لیے آیا اور اس نے امام رازی سے بحث شروع کر دی کہ تم اللہ کو ایک مانتے ہو؟ بتاؤ کیا دلیل ہے؟ امام رازی نے اپنے دماغ سے ایک سو دلیلیں اللہ کی وحدانیت پر فلسفیانہ منطقیانہ تیار کی تھیں۔

امام رازی نے دلیل پیش کی، لیکن شیطان تو ان سے بھی بڑا فلسفی تھا، اس نے

اس دلیل میں نقص وعیب نکال دیا، امام رازی نے کہا کہ یہ دلیل چھوڑو، دوسری لو۔ اس نے اس دلیل میں بھی کوئی کسر نکال دی۔ انھوں نے تیسری دلیل پیش کی، شیطان نے اس کے اندر بھی کوئی کھوٹ نکال دیا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ انھوں نے ننانوے دلیلیں پیش کیں اور اس نے سب کو توڑ دیا۔ اب روح قبض ہونے والی ہے، شیطان ادھر بہکانے میں مشغول ہے، اسی وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے شیخ کو الہام کیا، وہ اس وقت وضو کررہے تھے، ان کے قلب پر الہام ہوا کہ تمہارے وہ مرید جو آئے تھے تمہارے پاس اور تم نے میری محبت کی آگ ان کے دل میں لگادی تھی لیکن وہ پھر بھی واپس ہوگئے تھے۔ آگ لگ جانے کے بعد میں کسی کو محروم نہیں کیا کرتا، ذرا ان کی طرف آپ توجہ کریں۔ امام رازیؒ کی وہ گفتگو جو شیطان کے ساتھ چل رہی تھی، اللہ نے اِن بزرگ کو پہنچادی، شیخ کو آواز آئی اور وہ سن رہے تھے۔

شیخ نے کہا کہ یہ کیا بحث ومباحثہ میں مبتلا ہو، کیوں نہیں کہہ دیتے کہ میں بے دلیل خدا کو ایک مانتا ہوں۔ یہ دلیل، وہ دلیل، یہ کیا دلیلیں ہیں؟ اللہ نے کہہ دیا کافی ہے ہمارے لیے، اب کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ امام رازی کو اللہ نے شیخ کی آواز سنائی، شیخ کی وہ آواز کان میں آتے ہی امام رازی کی زبان سے نکلا کہ میں بے دلیل خدا کو ایک مانتا ہوں۔ جب یہ کہا تو اسی وقت ان کی روح قبض ہوگئی اور شیطان بھاگ گیا۔

معلوم ہوا کہ جو اس راستہ پر چل پڑا، جو اس راستہ میں داخلہ لے لیا وہ کبھی محروم نہیں ہوگا، اللہ کبھی نہ کبھی اس کو پہنچا ہی دیتے ہیں۔

اللہ کے ولی کا ادب اور مغفرت، امام احمد بن حنبل کا واقعہ

بزرگوں کے واقعات میں لکھا ہے کہ امام احمد ابن حنبلؒ کے زمانہ میں ایک شخص کا انتقال ہوا۔ کسی کے خواب میں وہ شخص آیا تو اس نے پوچھا کہ بھائی! تیرے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کیا معاملہ ہوا؟ تو اس نے کہا کہ اللہ کے فضل سے میری مغفرت ہوگئی۔ پوچھا کہ کس بنیاد پر مغفرت ہوئی؟ کہا کہ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ مجھے وضو کرنے کی ضرورت پڑی تو میں وضو کرنے کے لیے ایک نہر کے کنارے پہنچا، میں نے دیکھا کہ نیچے کی طرف امام احمد بن حنبلؒ بیٹھ کر وضو کر رہے ہیں تو میں نے یہ خیال کیا کہ وہ وہاں وضو کر رہے ہیں، مجھے بھی وضو کرنا ہے، اگر میں یہاں بیٹھ کر وضو کروں گا تو میرا غسالہ (اعضاء کا دھویا ہوا پانی) ان کی طرف جائے گا اور ان کے وضو کے پانی میں ملے گا، یہ ادب کے خلاف ہے، اس لیے مجھے وہ جہاں بیٹھے ہیں اس سے نیچے بیٹھ کر وضو کرنا چاہئے۔ یہ سوچ کر میں وہاں سے اٹھا اور امام احمد بن حنبل جہاں بیٹھے تھے، اس کے نیچے جا کر میں نے وضو کیا تا کہ ان کا غسالہ میری طرف آئے گا تو مجھے بھی کچھ تبرک حاصل ہوگا۔ کہتے ہیں کہ اس ادب پر میری بخشش ہوگئی۔

اس واقعہ میں غور کیجئے کہ اللہ والے کا ایک معمولی ادب کرنے کی وجہ سے اللہ تعالی نے مغفرت جیسی عظیم دولت عطاء فرمادی، جو شخص ہمیشہ ان کی اتباع کرے تو اسے کیا کچھ اللہ تعالی نہیں دیں گے۔ اسی لئے بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ: "هُمْ قَوْمٌ لَا يَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ" کہ یہ اولیاء اللہ کی قوم وہ قوم ہے کہ ان کے پاس بیٹھنے والا کبھی محروم نہیں ہوتا۔ (بخاری: ۶۴۰۸)

دوسری صفت-مجالست

آگے حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی محبت پانے والوں کی دوسری صفت

بیان کی کہ "والمتجالسین فیّ"(جو میرے لئے مصاحبت اور مجالست اختیار کرتے ہیں، ان کے لیے بھی میری محبت واجب ہوگئی)

مجالست ومصاحبت کیا ہے؟ کہ نیک لوگوں کی صحبت ومعیت میں رہا جائے ، ان کے ساتھ اٹھنا ، بیٹھنا ہو۔اس حدیث میں مجالست پر اللہ کی محبت دیئے جانے کا ذکر ہے کہ جو اللہ والوں کے پاس اٹھتا بیٹھتا ہو اس کے لئے بھی اللہ کی محبت واجب ہوگئی۔

اے اللہ کو چاہنے والو! اگر تم واقعۃً اللہ کے طالب ہو تو جاؤ اہل اللہ کی صحبت اختیار کرو۔اس سے اللہ کی محبت تم میں بھی منتقل ہو جائے گی۔

کیسے؟ سنو کہ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:''نیک لوگوں کی صحبت کی مثال ایسی ہے، جیسے کوئی عطار ہو اور آدمی اس کے پاس پہنچے تو جب تک اس کے پاس رہے گا، ہوسکتا ہے کہ وہ خود اسے عطر لگادے، عطر پیش کردے، اگر نہیں تو کم از کم جب تک وہاں بیٹھا رہے گا، اس کا دل ودماغ عطر کی خوشبوؤں سے معطر ہوتا رہے گا اور فرمایا کہ بری صحبت کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی آدمی کسی لوہار کے پاس اس کی بھٹی میں جاکر بیٹھ جائے ، جب تک وہاں بیٹھے گا یا تو یہ ہوگا کہ اس کے کپڑے جلیں گے ، کہیں چنگاریاں آئیں گی ، اس کو جلائیں گی ، اگر یہ نہیں ہوگا تو کم از کم از کم وہاں کے دھوئیں سے اس کا دماغ مکدر ہو جائے گا ۔ (بخاری: ۱/۲۸۲ ، مسلم :۲/۳۳۰)

اسی طرح نیک صحبت میں جب بیٹھے گا ، اللہ کے ولیوں کی صحبت میں بیٹھے گا ، نیک کردار لوگوں کی صحبت میں بیٹھے گا تو وہاں اللہ کا ذکر ہوتا رہے گا ، رسول اللہ ﷺ کا ذکر ہوتا رہے گا ، دین کا ذکر ہوتا رہے گا ، دین کی فکر ہوتی رہے گی ، دل ودماغ اس کی

وجہ سے معطر ہو جائے گا اور جب تک ان کے ساتھ بیٹھے گا دماغ کے اندر صالح تبدیلیاں بھی شروع ہو جائیں گی، اگر طبیعت میں ایسی تبدیلی پیدا ہوگئی جو پائیدار ہو تو پھر بیڑہ پار ہو جائے گا، اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو جب تک بیٹھے گا اس وقت تک تو یہ ہوگا کہ اس کے دل میں نیکی کا جذبہ و خیال، آخرت کی فکر و تڑپ پیدا ہو جائے گی۔ اسی بات کو رسول اللہ ﷺ نے ایک عمدہ مثال سے سمجھا دیا ہے۔

معلوم ہوا کہ نیک صحبت بہت ضروری ہے، نیک لوگوں کی مجلس کا اثر ضرور مرتب ہوتا ہے، دنیا کے اندر آپ دیکھ لیجئے، بڑی مجلسیں ہوتی ہیں، بری بھی ہوتی ہیں، اور اچھی بھی ہیں، مختلف قسم کی ہیں، دنیوی بھی ہیں، دینی بھی ہیں۔ ہر مجلس کا رنگ الگ ہوتا ہے، ہر مجلس کا اثر الگ ہوتا ہے، ہر مجلس کی کیفیت الگ ہوتی ہے۔ یہ اس لیے کہ یہ بات طے شدہ ہے کہ مجالس وصحبتوں کا اثر ضرور ہوتا ہے اور مجالس کا اثر صاحب مجلس کی وجہ سے ہوتا ہے۔

خود قرآن کریم نے بھی اس کا حکم دیا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور صادقین کے ساتھ رہا کرو) (التوبة :۱۱۹)

اس میں "كُوْنُوْا" فرمایا گیا، اس کے معنی ہیں "رہا کرو" ایک دفعہ رہو نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر استمرار ہے، ہوسکتا ہے کہ کوئی طالب علم سوال کر بیٹھے کہ اس میں استمرار کہاں سے آیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عربی داں جانتے ہیں کہ امر کا صیغہ مضارع سے بنتا ہے، جب مضارع سے بنتا ہے تو مضارع کی خصوصیات بھی اس کے اندر رہتی ہیں، لہذا مضارع میں تجدد بھی ہوتا ہے، مضارع کے اندر استمرار بھی ہوتا ہے، تو امر میں بھی استمرار اور تجدد پایا جائیگا۔

تو ''کونوا'' کا ترجمہ ہے، اولیاء اللہ ساتھ مستقل رہا کرو، یہ نہیں کہ ایک دفعہ جا کر پھر اس کے بعد بند کردو۔

مجالس کا اثر مرتب ہونے پر ایک حسی مثال

بھائیو! مجالس کا اثر کس طرح مرتب ہوتا ہے اس کو ایک حسی مثال سے سمجھئے، کہ اگر کسی جگہ دو چار آدمی بیٹھ کر ہنس رہے ہوں، کسی بات پر کوئی تبصرہ انہوں نے کیا، کسی بات کا تذکرہ کیا اور اس میں کسی بات پر ہنسی آگئی اور سب ہنسنے لگے، اسی ہنسی کے موقعہ پر آپ وہاں پہنچ گئے، اور وہ لوگ برابر ہنسنے میں مشغول ہوں۔ تو آپ بتائیے کہ آپ وہاں روئیں گے یا خاموش بیٹھے گے، یا آپ بھی ہنسیں گے؟ ظاہر ہے کہ آپ بھی ضرور ہنسیں گے۔ اب یہاں سوال یہ ہے کہ آپ نے تو کچھ سنا نہیں کہ بات کیا ہے، آپ کو بالکل معلوم نہیں ہے کہ اہل مجلس کیوں ہنس رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود آپ بھی ہنسیں گے۔ یہ ہے اثر کا منتقل ہونا، ان کے ہنسنے کا اثر آپ کے دل پر پڑ رہا ہے، اور آپ کو بھی ہنسی آرہی ہے۔

بالکل اسی طریقہ پر ایک جگہ پر چند لوگ بیٹھے ہوئے رو رہے تھے اور آپ کو بالکل خبر نہیں تھی کہ وہ کیوں رو رہے ہیں، اپنی کسی بیماری سے رو رہے ہیں، کسی پریشانی سے رو رہے ہیں، کسی کے مار دینے سے رو رہے ہیں، یا اور بھی کوئی بات ہوسکتی ہے۔ اتفاق سے آپ اس مجلس میں پہنچ گئے تو خود بخود آپ کو بھی رونا آجائے گا، بغیر وجہ کے جانے آپ بھی رونا شروع کردیں گے۔ اگر آپ سے پوچھا جائے کہ آپ کیوں رو رہے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ مجھے پتہ نہیں ہے۔ یہ ہے مجلس کا اثر۔

اسی طرح مجالسِ اولیاء کے ذریعہ سے غیر شعوری طور پر علوم منتقل ہوتے ہیں، معرفت منتقل ہوتی ہے، محبت منتقل ہوتی ہے، اور دیگر کیفیات باطنی منتقل ہوتی ہیں،

اس کا انکار کرنا بداہت کا انکار ہے، اس کا انکار دن کے اجالے میں سورج کے انکار کے مرادف ہے۔

مجلس کا اثر کیسے ہوتا ہے؟ ایک حکیم صاحب کا واقعہ

حضرت مولانا حکیم الامت اشرف علی تھانویؒ کے ایک مرید تھے، انھوں نے ایک دفعہ حضرت تھانوی کے پاس خط لکھا کہ حضرت! میرے اندر غصہ بہت زیادہ ہے، میں یہ چاہتا ہوں کہ میری اصلاح ہو جائے۔ لہٰذا اس کے لیے کوئی نسخہ تجویز فرما دیں۔ وہ صاحب لکھنؤ سے قریب کے رہنے والے تھے۔

حضرت نے ان کو جواب لکھا کہ لکھنؤ میں میرے خلیفہ فلاں حکیم صاحب رہتے ہیں، فلاں جگہ پر ان کا مطب، کلینک ہے، تم ان سے اجازت لے کر ان کے پاس بیٹھ جایا کرو، وہ تو اپنے کام میں مشغول رہیں گے لیکن تم ان کے پاس جا کر بیٹھ جایا کرو اور یہ بھی لکھا کہ پندرہ دن تک بیٹھنے کے بعد مجھے خط لکھنا کہ کیا اثر ہوا۔

چنانچہ وہ صاحب پتہ تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچے، حکیم صاحب کی کلینک مل گئی، اور ان سے ملاقات کی اور کہا کہ حضرت نے مجھے ایسا لکھا ہے کہ میں آپ کی خدمت میں بیٹھا کروں، اگر آپ اجازت دیں تو یہاں بیٹھ جایا کروں گا۔ انھوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ وہ حکیم صاحب تو اپنے کام میں مشغول رہتے، بیماروں کی نبض دیکھتے، دوائیاں تجویز کرتے تھے، اور یہ صاحب ان کے قریب بیٹھے رہتے تھے۔ پندرہ دن کے بعد انھوں نے حضرت تھانوی کو خط لکھا کہ اللہ کا فضل ہے کہ غصہ بالکل کافور ہو گیا، انھوں نے اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ حضرت! غصہ تو میرا کافور ہو گیا، لیکن ایک سوال ذہن میں آ گیا ہے کہ حکیم صاحب نے نہ مجھے کچھ کہا اور نہ میں نے ان سے کچھ کہا، صرف ان کے پاس بیٹھنے سے میرا غصہ کیسے ختم ہو گیا؟ یہ

فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ حضرت کے پاس خط آیا تو اس کا جواب لکھا کہ جی! نہ انہوں نے کچھ کہا، نہ تم نے کچھ کہا، لیکن ان کے دل میں جو حلم کا مادہ ہے، صحبت کی تاثیر سے وہ منتقل ہوکر تمہارے دل میں آ گیا۔ اللہ اکبر! یہ ہے تاثیر صحبت اولیاء کی۔

لہذا یہ نیک لوگوں کی مصاحبت ومجالست بہت ضروری ہے، مجالست ایک ذریعہ ووسیلہ ہے اللہ کی معرفت کو پانے کا، اللہ کی محبت کو پانے کا، اسی کا ذکر مذکورہ حدیث کے اندر کیا گیا ہے۔

تیسری صفت - اہل اللہ کی زیارت

اب تیسری صفت سنئے، اس حدیث میں آگے فرمایا کہ: ''والمتزاورین فی'' (کہ میری محبت ان کے لئے بھی واجب ہوگئی جو میری خاطر ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں) لہذا اللہ کی محبت پانا ہو تو ایک کام یہ کرنا ہوگا کہ اہل اللہ کی زیارت وملاقات کی جائے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ: ایک شخص نے اپنے ایک مومن بھائی کی زیارت کی جو دوسرے گاؤں میں رہتا تھا، تو اللہ نے اس کی حفاظت کے لئے ایک فرشتہ کو اس کے راستے پر مقرر کردیا، جب وہ شخص چلتے ہوئے اس فرشتے کے قریب سے گزرا تو فرشتہ نے پوچھا کہ کہاں کا ارادہ ہے؟ اس نے کہا کہ میرے بھائی جو اس گاؤں میں ہیں ان کے پاس جانے کا ارادہ ہے۔ فرشتہ نے پوچھا کہ کیا تمہاری کوئی اس سے رشتہ داری ہے؟ اس نے کہا نہیں، بلکہ صرف اللہ کے واسطے اس کی زیارت کو جارہا ہوں، فرشتہ نے کہا کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا ہوں، اللہ نے تم کو بتایا ہے کہ اللہ بھی تم سے محبت کرتا ہے جس طرح تم اللہ کے لئے اس بندے سے محبت کرتے ہو۔ (مسلم:۶۷۱۴، احمد:۹۵۲۹)

بھائیو! جب اللہ کے واسطے اللہ کے محبوب بندوں کی زیارت کی جاتی ہے تو اللہ خوش ہوتے ہیں اور اس کو اپنی محبت عطا کر دیتے ہیں۔ اور بارگاہ الٰہی کے مقربین کی زیارت پر صرف آخرت ہی کی نعمتیں نہیں بلکہ دنیا کی نعمتیں بھی ملتی ہیں۔ ایک حدیث میں اس کا ذکر ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کسی بندے کی اللہ کے لئے زیارت کرتا ہے اس کو ایک منادی پکارتا ہے اور کہتا ہے کہ: تو خوش رہے اور تیرا سفر (یعنی آخرت کا سفر) بھی آرام سے ہو اور تو جنت میں اپنی منزل بنائے۔ (ترمذی: ۲۱۳۹)

غور فرمائیے کہ اس میں دین و دنیا دونوں کی بھلائی کی اللہ کا فرشتہ دعاء دے رہا ہے، کہ تو دنیا میں خوش رہے اور آخرت کا سفر بھی آرام سے ہو اور جنت میں منزل بھی بنالے۔ یہ کس بات پر دعاء دی جاتی ہے؟ اللہ کے نیک بندوں کی زیارت کرنے پر، معلوم ہوا کہ اللہ کے نیک بندوں کی زیارت و ملاقات کے لئے جانا چاہئے۔ یہ کام بہت بہترین کام ہے۔

مگر آجکل لوگوں میں اس کا رواج ہی ختم ہو گیا کہ اللہ والوں کی ملاقات و زیارت کی خاطر سفر کریں، ان کے مقام پر پہنچ کر ان سے استفادہ کریں۔ بلکہ اب کوئی بزرگ آجاتے ہیں تو لوگ بھیڑ کر کے ان کو دیکھ لیتے ہیں، اور وہ بھی ان کو تکلیف واذیت پہنچا کر دیکھ لیتے ہیں۔ مصافحہ کے لئے ایک دوسرے پر تشدد کرتے ہیں، خود ان کو بھی تکلیف دیتے ہیں۔ یہ زیارت کوئی زیارت نہیں۔ ادب کے ساتھ ان کے پاس جائیے، اگر دور ہوں تو سفر کیجئے۔

چوتھی صفت: اہل اللہ پر خرچ

اب ایک صفت آخری رہ گئی جس پر اللہ کی جانب سے محبت عطا ہوتی ہے، اور

اس کا ذکر اس جملہ میں کیا گیا ہے: ''والمتباذلین فی'' (کہ میری محبت ان کے لئے بھی واجب ہوگئی جو ایک دوسرے پر محض میرے واسطے خرچ کرتے ہیں) لہذا اللہ کی محبت پانا ہو تو اللہ کے راستہ میں اللہ کی خاطر خرچ بھی کرنا چاہئے۔ اس میں مدارس و دینی کاموں پر خرچ بھی داخل ہے، کیونکہ دین پر اور اہل دین پر خرچ اللہ ہی کے لئے ہوتا ہے، اس کا اور کوئی مقصد نہیں، اور نہ ہونا چاہئے، لہذا تمام دینی خدمات و کاموں پر، خواہ وہ مدارس ہوں یا خانقاہیں ہوں، یا مساجد ہوں یا تبلیغی و دعوتی کام ہوں، جہادی ضرورتیں ہوں، یا طلبہ کی ضروریات ہوں، ان سب پر خرچ اللہ کی خاطر خرچ میں داخل ہے، اور اس پر اس حدیث میں یہ وعدہ ہے کہ اللہ کی محبت ملے گی۔

سخاوت اولیاء اللہ کی صفت ہے

بزرگو! اسی وجہ سے سخاوت کو ولی کا خاصہ کہا گیا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالی نے فرمایا کہ:

﴿وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّأَسِيْرًا﴾ [الدھر:۸]

(وہ اللہ کی محبت میں مسکین و یتیم و قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں)

ایک اور جگہ فرمایا گیا کہ:

﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾ [البقرۃ:۱۷۷]

(لیکن بھلائی یہ ہے کہ کوئی اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں پر، اور اللہ کی کتاب پر اور نبیوں پر ایمان لائے، اور اللہ کی محبت میں رشتہ داروں، یتیموں،

مسکینوں اور مسافر کو مال دے)

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: " مَا جَبَلَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَلِیًّا لَہٗ اِلَّا عَلَی السَّخَاءِ " (اللہ نے اپنا کوئی ولی ایسا نہیں پیدا کیا جس میں سخاوت نہ ہو)(جمع الجوامع للسیوطی: ۶۵۰، بسند ضعیف)

حضرت علیؓ کی سخاوت کا واقعہ

ابھی جو سورہ دہر کی آیت اوپر سنا تا آیا ہوں، وہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی کے یہاں فاقہ تھا، کھانے کو کوئی چیز میسر نہیں تھی، آپ نے اس موقعہ پر ایک رات کسی کے باغ کو پانی سینچ کر ڈالنے کی مزدوری کی، اور اس کام پر صبح کو باغ والے نے کچھ ''جو'' دئے، آپ اس کو لیکر آئے اور گھر میں اس ''جو'' کے تین حصے بنا کر ایک حصہ چکی میں پسوایا اور اس سے خزیرہ نام کا ایک کھانا پکایا گیا، اور کھانے کے لئے بیٹھے تو ایک مسکین آیا اور دستک دی کہ اللہ کے نام پر کچھ دیدو، آپ نے اور گھر کے افراد نے وہ سارا کھانا فقیر کو دیدیا، پھر باقی آٹے میں سے کچھ نکال کر پکایا اور کھانے بیٹھے تو ایک یتیم آیا کہ اللہ کے نام پر کچھ دیدو، آپ نے یہ کھانا بھی اللہ کے نام پر اس یتیم کو دیدیا، اور آٹے کے آخری بچے ہوئے حصہ کو لیکر اس کو پکایا، اور کھانے بیٹھے تو ایک قیدی آیا اور سوال کیا، آپ نے یہ بھی اللہ کے نام پر دیدیا۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، اور اس میں آپ کی تعریف فرمائی گئی۔(اسباب النزول واحدی: ۴۰۷)

بھائیو! یہ اللہ کا کرم ہی ہوتا ہے کہ کوئی سخاوت کا کام کیا کرے، اور یہ کرم حضرات صحابہ پر اللہ کا بے حد تھا، اس لئے وہ حضرات حیرت انگیز قسم کی سخاوت بھی کرتے تھے۔ جس کا ایک نمونہ یہ ہے۔

بیک وقت ایک لاکھ اسی ہزار کی سخاوت

لیجئے، ایک اور حیرت ناک سخاوت کا واقعہ سنئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی خدمت میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے دو بوروں میں ایک لاکھ اسی ہزار درہم بھیجے، حضرت عائشہ نے ایک طباق منگوایا اور یہ ساری رقم لوگوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا، جب شام ہوئی تو اپنی باندی سے فرمایا کہ میری افطاری لاؤ، باندی نے ایک روٹی اور زیتون کا تیل پیش کیا، حضرت عائشہ کی ایک خادمہ ام درہ تھیں، انھوں نے عرض کیا کہ کیا آپ نے جو مال تقسیم کیا اس میں ایک درہم کا گوشت ہمارے لئے نہیں خریدا جا سکتا تھا جس سے ہم لوگ افطار کرتے؟ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ اگر تم نے مجھے یاد دلایا ہوتا تو میں خرید لیتی۔

یہ حیرت انگیز قسم کی سخاوت ہے کہ خود تو یاد نہیں رہے، اور ساری دنیا پر لٹا دیا، اور رقم بھی کوئی معمولی نہیں، بلکہ ایک لاکھ اسی ہزار درہم، کیا ٹھکانہ ہے اس سخاوت کا!

حضرت ابن عباسؓ کی سخاوت کا ایک واقعہ

اسی طرح ایک واقعہ حضرت ابن عباس کا کتابوں میں لکھا ہے، وہ یہ کہ ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ کے پاس شہرہ بصرہ کے چند علماء آئے، اس وقت حضرت ابن عباس بصرہ کے گورنر تھے، انھوں نے کہا کہ ہمارے پڑوس میں ایک صاحب رہتے ہیں جو صوام وقوام یعنی دن بھر روزہ رکھنے والے اور رات بھر نماز پڑھنے والے، بڑے عابد وزاہد اور اللہ والے ہیں، ہم میں سے ہر شخص کی خواہش ہے کہ ان جیسے بن جائیں، انھوں نے اپنی لڑکی کا نکاح اپنے ایک غریب بھتیجے سے کر دیا ہے، اور وہ اس قابل نہیں کہ اپنی بیٹی کی رخصتی کا انتظام کر سکیں۔ یہ سن کر حضرت ابن عباس ان علماء کو

اپنے گھر لے گئے اور ایک صندوق کھولکر اس میں سے درہموں کی چھ تھیلیاں نکالیں اور فرمایا کہ یہ لے جاؤ، پھر کہنے لگے کہ ٹھیرو، یہ کوئی انصاف کی بات نہیں کہ ہم ایک شخص کی عبادت میں خلل ڈالدیں، لہذا مجھے بھی ساتھ لیتے چلو تا کہ ہم سب اس کی بیٹی کی رخصتی میں اس کی مدد کریں، دنیا اتنی قابل قدر نہیں کہ مومن کی عبادت میں اس سے خلل ڈالا جائے، اور ہم اتنے بڑے نہیں کہ اولیاء اللہ کی خدمت نہ کریں۔

ایثار سخاوت کا اعلی درجہ

بھائیو! ایک بات یہاں اور جان لیں کہ ایثار سخاوت کا اعلی درجہ ہے، اور ایثار کہتے ہیں خود پر دوسروں کو ترجیح دینا، خود کو بھوک لگی ہے مگر خود نہیں کھاتا دوسروں کو کھلاتا ہے، خود پیاسا ہے مگر دوسروں کو پلاتا ہے۔ حضرات صحابہ کی یہی خصوصیت تھی کہ وہ محض سخی نہیں تھے، بلکہ ایثار کرتے تھے۔ اسی لئے قرآن نے ان کی تعریف میں فرمایا کہ:

﴿ وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾ [الحشر: ۹]

(وہ حضرات اپنے پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگر چہ خود ان کو تنگی ہو)

یعنی خود کو بھوگ و پیاس وغیرہ کی پریشانی ہے، مگر اس کے باوجود وہ حضرات دوسروں کو دیتے ہیں اور خود صبر کر لیتے ہیں۔

صحابہ کا ایثار - واقعات کی روشنی میں

یہاں ان حضرات کے ایثار کی چند مثالیں سناتا ہوں، ان سے ان کے بلند مقامات کا کچھ تھوڑا سا اندازہ ہوسکتا ہے۔

حدیث وتفاسیر کی کتابوں میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے

پاس آئے اور انھوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! مجھے سخت فاقہ لگا ہے۔ آپ نے اپنی عورتوں سے معلوم کیا کہ کوئی چیز تم لوگوں کے پاس ہے؟ لیکن کسی جگہ بھی کوئی کھانے کی چیز نہیں تھی۔ آپ نے اعلان کیا کہ کوئی ہے جو ہمارے مہمان کی آج رات مہمان نوازی کرے؟ تو حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے ،انھوں نے کہا کہ میں ان کی مہمان نوازی کروں گا۔ پھر ان کو اپنے گھر لے گئے، اور اپنی بیوی سے کہا کہ مہمان رسول کی خاطر داری میں کوئی کسر نہ چھوڑنا، ان کی بیوی نے کہا کہ آج ہمارے گھر سوائے بچوں کے کھانے کے کوئی چیز نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ بچوں کو بہلا پھسلا کر سلادو، اور ہم بھی آج اللہ کے نبی کے مہمان کی خاطر بھوکے رہ جائیں گے اور جو کھانا ہے، اس کو لے آؤ، اور جب ہم کھانے بیٹھیں تو کسی بہانے سے چراغ بجھادو، تاکہ مہمان سمجھیں کہ ہم بھی ان کے ساتھ کھارہے ہیں۔ چنانچہ ان کی بیوی نے ایسا ہی کیا۔ اس طرح مہمان کو سارا کھانا کھلا دیا اور خود وہ اور ان کے بیوی بچے سب بھوکے رہ گئے۔ جب صبح ہوئی اور یہ حضرات رسول اللہ کی خدمت میں گئے تو آپ نے فرمایا کہ فلاں مرد و فلاں عورت سے اللہ نے تعجب کیا اور ان کے بارے میں آیت نازل کی ہے۔

پھر یہ آیت سنائی: ﴿ وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْكَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾ [الحشر:۹]

(وہ حضرات اپنے پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگر چہ خود ان کو تنگی ہو) (الدر المنثور:۸/۱۰۷، الکشف والبیان للنیسابوری:۹/۲۶۹)

اسی آیت کے شان نزول میں بعض مفسرین کرام نے یہ واقعہ بھی روایت کیا ہے کہ ایک صحابی کو کسی نے بکری کی سری ہدیہ میں بھیجی، ان صحابی نے کہا کہ فلاں

بھائی صاحب اولاد ہیں، وہ مجھ سے زیادہ اس کے محتاج ہیں، لہذا ان کو دیدو۔ لہذا وہ سری ان کے گھر بھیج دی گئی۔ وہ دوسرے صحابی کہنے لگے کہ میرے سے فلاں صاحب محتاج ہیں، لہذا ان کو دیدو، وہ سری وہاں سے ایک تیسرے صحابی کے پاس پہنچی، اس طرح ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے گھر ہوتی ہوتی سات گھروں کا چکر لگا کر، اور بعض روایات میں ہے کہ نو گھروں کا چکر لگا کر وہ سری پھر پہلے صحابی کے پاس ہی آ گئی۔ اس پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔

(الدر المنثور: ۱۰۸/۸، الکشف والبیان للنیسابوری: ۲۶۹/۹)

ایک اور حیرت انگیز واقعہ تاریخ نے محفوظ کیا ہے، وہ یہ کہ حضرت ابوجہم بن حذیفہ ایک صحابی ہیں اور انھوں نے بڑی لمبی عمر پائی تھی، زمانہ جاہلیت بھی دیکھا اور زمانہ اسلام بھی دیکھا تھا، وہ کہتے ہیں کہ جنگ یرموک میں میرے چچازاد بھائی کو تلاش کرنے نکلا اور ساتھ میں ایک پانی کا مشکیزہ لے لیا تاکہ اگر وہ مل جائیں اور پانی کی ضرورت پڑے تو پریشانی نہ ہو، کہتے ہیں کہ میں نے ان کو ایک جگہ پالیا، وہ نزع کی حالت میں زخمی پڑے ہوئے تھے، میں نے ان سے کہا کہ کیا میں تمہیں پانی پلاؤں؟ انھوں نے کہا کہ ہاں! اتنے میں ان کے قریب ایک اور شخص زخمی حالت میں پڑے ہوئے تھے انھوں نے آہ کی، میرے چچازاد بھائی نے کہا کہ پہلے ان کو پانی پلاؤ، دیکھا تو وہ حضرت عمرو بن العاص کے بھائی ہشام بن العاص تھے، میں ان کے پاس پہنچا اور کہا کہ کیا پانی پلاؤں؟ تو انھوں نے کہا کہ ہاں! اتنے میں ایک اور شخص کے کراہنے کی آواز آئی، تو ہشام کہنے لگے کہ اس کو پہلے پلادو، حضرت ابوجہم کہتے ہیں کہ میں اس کے پاس پہنچا تو ان کا انتقال ہو چکا تھا، لہذا میں ہشام کے پاس آیا، دیکھا تو ان کا بھی انتقال ہو گیا ہے، یہ دیکھ کر میں اپنے چچازاد بھائی کے پاس آیا

کہ ان کو پانی پلادوں، مگر جب ان کے پاس پہنچا تو ان کا بھی وصال ہو چکا تھا۔ (مختصر تاریخ دمشق: ۱۴۲/۸)

یہ تھے حضرات صحابہ جن کے دلوں میں اللہ و رسول کی محبت اس طرح سمائی گئی تھی کہ وہ ہر چیز کو اس کے لئے قربان کر سکتے تھے۔ یہ اللہ و رسول کے عاشقین بھی تھے اور محبوبین بھی تھے۔

ایک اللہ والے غلام کا کتے پر ایثار

صحابہ تو بہ ہر حال صحابہ تھے، ان کے علاوہ بھی ایسے لوگ گزرے ہیں جنھوں نے بے مثال سخاوت و ایثار کا ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ مجھے ایک غلام کا قصہ یاد آیا کہ عبداللہ بن جعفر کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اپنی ایک زمین کے سلسلہ میں ایک مقام پر گیا، وہاں ایک صاحب کے باغ میں بیٹھا تھا، دیکھا کہ ایک کالا غلام وہاں موجود ہے، اور کھانا کھا رہا ہے، اس کے پاس تین روٹیاں تھیں، اتنے میں ایک کتا آیا، اور اس غلام نے اس کتے کو ایک روٹی ڈالدی، کتا وہ روٹی کھا کر پھر آیا ، اس غلام نے ایک اور روٹی اس کو ڈالدی، کتے نے وہ بھی کھالی اور پھر آ کھڑا ہوا، اس غلام نے آخری روٹی بھی اس کو ڈالدی۔ عبداللہ بن جعفر کہتے ہیں کہ میں یہ سارا ماجرا ایک طرف بیٹھ کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس غلام سے پوچھا کہ روزانہ تجھے کتنی خوراک ملتی ہے؟ اس نے کہا کہ یہی جو آپ نے دیکھی یعنی تین روٹیاں، عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ تو نے تو ساری روٹیاں کتے کو ڈالدیں، اب تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا کہ میں بس بھوکا رہ جاؤں گا۔ میں نے پوچھا کہ ایسا کیوں کیا؟ تو وہ کہنے لگا کہ اصل یہ ہے کہ یہ علاقہ کوئی کتوں کا نہیں ہے، یہ کتا کہیں دور سے بھوکا آیا ہے، میں نے یہ

اچھا نہیں سمجھا کہ میں تو کھالوں اور کتا کھڑا دیکھتا رہے۔

اللہ اکبر! یہ حیرت انگیز سخاوت وایثار ہے، جس کی نظیر ملنی مشکل ہے کہ خود بھوکا رہ کر کتے کو سارا کھانا کھلا دیا، آج لوگ اپنے بھائیوں تک کی طرف نظر نہیں کرتے، سگا بھائی پریشان ہے، خود فضول خرچی کرتے ہیں مگر اپنے بھائی کے کھانے پینے اور دوا دارو کا بھی خیال نہیں کرتے۔ ہمارے اسلاف کے یہ واقعات بتاتے ہیں کہ انھوں نے سخاوت کے ذریعہ مال لٹا کر محبت الٰہی کا خزانہ پالیا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اگر ایک شخص کو اللہ کی محبت اپنا مال خرچ کر کے مل جائے تو اس سے سستا سودا کوئی نہیں۔

ایک بزرگ کا واقعہ

جیسے ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے اللہ! میں آپ کو پانا چاہتا ہوں۔ آپ کی قیمت کیا ہے؟ اگر آپ کی قیمت معلوم ہو جائے تو کوشش کر کے آپ کو پالوں گا۔ اللہ نے فرمایا کہ میری قیمت معلوم کرنا چاہتے ہو تو سنو کہ میری قیمت دونوں عالم ہیں۔ اس پر وہ بزرگ وجد میں آ گئے اور اللہ کی جناب میں عرض کیا کہ اے اللہ! اگر آپ کی قیمت صرف یہ ہے کہ دو عالم دے دیئے جائیں تو یہ تو بہت سستا سودا ہے۔ کہنے لگے کہ

قیمتِ خود ہر دو عالم گفتۂ نرخ بالا کن، ارزانی ہنوز

یعنی آپ نے اپنی قیمت دو عالم بتائی ہے، اپنی قیمت میں اضافہ کیجئے، کہ یہ تو بہت کم ہے۔ اس طرح اللہ کی محبت اگر دنیا کے ان معمولی ٹکوں کے بدلہ میں مل جائے تو بہت سستا سودا ہے۔

سخاوت کی بہت سی شکلیں ہیں

اب یہاں ایک بات اور سمجھ لیں کہ سخاوت صرف مال کی نہیں ہوتی ، بلکہ سخاوت بہت سی چیزوں کی ہوتی ہے۔ایک سخاوت تو مال کی ہوتی ہے جو مالدار لوگ کریں گے۔اور ایک سخاوت علم کی ہوتی ہے جو حضرات علماء کی جانب سے ہوتی ہے ،ایک سخاوت محنت وخدمت کی ہوتی ہے جو قوت وطاقت والوں کی طرف سے ہوتی ہے۔لہذا ہر شخص اپنے بساط اور اپنی استعداد کے مطابق سخاوت کرسکتا ہے۔کسی کے پاس مال نہیں ہے تو وہ اپنے علم یا محنت وخدمت کے ذریعہ سخاوت کرے،کسی کے پاس علم نہیں ہے تو وہ نیک لوگوں کی خدمت کرے ، اس طرح کسی نہ کسی طرح سخاوت کا درجہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔اور اس سخاوت کا بھی یہی پھل ہے کہ اللہ اپنی محبت سے نوازتے ہیں۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی محبت ومعرفت سے نوازیں اور اپنے محبوب بندوں میں شامل فرمائیں۔آمین۔

انسانی دل ایک کمپیوٹر ہے

باسمہ تعالیٰ

انسانی دل ایک کمپیوٹر ہے

ایک حدیث کی جدید اور انوکھی تشریح

الحمدللّٰہ و کفیٰ و سلام علٰی عبادہ الذین اصطفیٰ . اما بعد : فقد قال النبی ﷺ ﴿ **أَلَا اِنَّ فِی الْجَسَدِ لَمُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّه وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّه ، اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ** ﴾

(بخاری:۱/۱۳، مسلم:۲/۸۲)

دینی بھائیو! میں نے ایک حدیث پڑھی ہے جس میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ:"کان کھول کر سن لو کہ جسم کے اندر ایک لوتھڑا ہے، اگر وہ صحیح رہتا ہے تو جسم کا پورا نظام صحیح رہتا ہے اور اگر وہ ٹیڑھا ہو جائے، خراب ہو جائے تو جسم کا پورا نظام خراب ہو جاتا ہے، جان لو کہ وہ لوتھڑا دل ہے"۔

یہ ایک بہت ہی اہم حدیث ہے، جس میں اصلاح قلب کی جانب توجہ دلائی گئی ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ دل جسم کے اندر سب سے اہم ہے اور اسی پر جسم کا ظاہری نظام بھی قائم ہے اور باطنی نظام بھی، لہذا دل کا نظام و سسٹم صحیح ہو تو جسم کا نظام صحیح رہتا ہے اور اگر دل کا سسٹم خراب ہو جاتا ہے تو جسم کا پورا نظام و سسٹم برباد ہو جاتا ہے۔

اس وقت میں اس حدیث کی تشریح کرنا چاہتا ہوں، اور اللہ نے اس حدیث کی توضیح و تشریح میں ایک بات میرے دل میں ڈالی ہے، اسی کو اس وقت پیش کروں گا۔

بزرگو! ابھی کچھ دیر پہلے یہاں جامعہ میں دوصاحبان ملاقات کے لئے آئے تھے، جوایک سافٹ ویر کمپنی میں کام کرتے ہیں، انھوں نے کچھ اصلاحی باتیں سننے کی خواہش کی، ان سے گفتگو کے دوران ایک مضمون دل میں آیا اوراسی کے ساتھ مذکورہ حدیث کامفہوم اوراس کی شرح بھی سامنے آگئی ، میں نے ان کے سامنے اسی کو پیش کردیا، میں اسی کو یہاں آپ حضرات کوبھی سنانا چاہتا ہوں۔

خطاب میں مخاطب کی رعایت

یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ موجودہ دور کمپیوٹر کا دور ہے، سافٹ ویر کا دور ہے، بنگلور بھی اس سافٹ ویر کی دنیا میں بہت آگے ہے، جوصاحبان آئے تھے وہ بھی سافٹ ویر کمپنی میں ملازمت کرتے ہیں، اس لئے میرے ذہن میں ایک بات اسی کے حوالہ سے آئی ، کیونکہ خطاب میں مخاطب کی رعایت ضروری ہے، اگرمخاطب ہو جاہل اوراس سے خطاب کیا جائے عالمانہ وفاضلانہ تو وہ پوری بات نہیں سمجھ سکتا، اسی طرح مخاطب ہوعالم وفاضل اورخطاب میں وہ طریقہ استعمال کیا جائے جوایک عامی کے مناسب ہے تو یہ مناسب نہ ہوگا۔ پھر اس میں بھی اگر ڈاکٹر سے اس کی اپنی اصطلاحات وزبان میں گفتگو کی جائے تو وہ بہت جلد مانوس ہوجاتا ہےاور بات کا اثر جلد قبول کرتا ہے، اگرمخاطب انجینئر ہےاوراس سے گفتگو میں اس کی اصطلاحات کا سہارا لیا جائے تواس کا بڑا اثر مرتب ہوتا ہے۔علماءکواس کی بھی رعایت کرنا چاہئے۔ الغرض میں نے جب دیکھا کہ یہ لوگ سافٹ ویرانجینئر ہیں تو میں نے انہی کی زبان میں گفتگوشروع کی۔

کمپیوٹر میں تین چیزیں ہیں

ان کے سامنے جوعرض کیا گیا خلاصہ اس مضمون کا یہ ہے کہ کمپیوٹر میں دو چیزیں

ہوتی ہیں: ایک کو ہارڈ ویر(HARD WARE) کہتے ہیں، اور ہارڈ ویر اس کا ظاہری جسم ہے، جو نظر آتا ہے اور دوسری چیز سافٹ ویر(SOFT WARE) ہے، یہ دراصل کمپیوٹر کی جان و روح ہے۔ پھر ہارڈ ویر میں ایک تو اس کی ہارڈ ڈسک (HARD DISK) ہوتی ہے اور ایک اس کا مانیٹر(MONITOR) ہوتا ہے۔ اس طرح کمپیوٹر میں کل تین چیزیں ہوتی ہیں: ایک ہے مانیٹر، دوسری ہے ہارڈ ڈسک اور تیسری ہے سافٹ ویر(SOFT WARE)۔

اب سنئے کہ مانیٹر تو صرف یہ کام کرتا ہے کہ کمپیوٹر کے اندر کی چیزوں کو اسکرین پر دکھاتا اور ظاہر کرتا ہے، اس کے سوا اس کا کوئی کام نہیں۔ اور ہارڈ ڈسک اس میں اصل چیز اور اس کی روح ہے، اسی سے کمپیوٹر کا پورا سسٹم چلتا ہے۔ اور سافٹ ویر اس ہارڈ ڈسک میں ایک چیز ڈالی جاتی ہے، جب آپ سافٹ ویر اس میں ڈالیں گے تو وہ اس کو اخذ یعنی (catch) کرلے گا، اور پھر اسی چیز کو مانیٹر کے ذریعہ دکھائے گا، مانیٹر کا کام صرف مظاہرہ کا ہے، یعنی دکھانے کا، ڈسپلے کرنے کا، اصل چیز یہ نہیں ہے، یہ دراصل کمپیوٹر کا جسم ہے اور ہارڈ ڈسک اس کمپیوٹر کے جسم کا دل ہے اور جو اس کے اندر سافٹ ویر بھرا ہوا ہوتا ہے، وہ دراصل اس کی روح ہے۔

ہارڈ ڈسک کو آپ پکڑ سکتے ہیں، چھو سکتے ہیں، دکھا سکتے ہیں، بتا سکتے ہیں، خرید کے اسے ہاتھ میں اٹھا کر لا سکتے ہیں، لیکن سافٹ ویر جو ہارڈ ڈسک کے اندر ڈالا جاتا ہے اس کو آپ پکڑ نہیں سکتے، اس کو آپ چھو نہیں سکتے، یہ ایک معنوی چیز ہے، جو ہارڈ ڈسک کے اندر داخل کردی جاتی ہے، جب آپ اسے اس کے اندر داخل کریں گے تو مانیٹر دکھائے گا کہ اس میں کیا کیا چیزیں ہیں، اس کے اندر جو جو عجیب وغریب چیزیں ہیں، وہ سب اس کے اندر سے نظر آئیں گی۔ اور سافٹ ویر

ڈالے بغیر کمپیوٹر کوئی کام نہیں کرسکتا، اس کو کام میں لانا ہوتو سافٹ ویر اس میں داخل کرنا پڑے گا۔

انسان کی تمثیل کمپیوٹر سے

جب یہ سمجھ میں آگیا تو اب یہ سمجھو کہ اسی طرح انسان کی مثال ایک کمپیوٹر کی سی ہے، اور اس میں بھی دو چیزیں ہیں: ایک ہارڈ ویر ہے یہ اس کا جسم ہے، اور اس میں ایک ظاہری جسم ہے، یہ مانیٹر کے مانند ہے اور ایک اندرونی جسم ہے، یہ دل ہے، یہ ہارڈ ڈسک کی طرح ہے، اور یہ دونوں چیزیں انسان میں ہارڈ ویر کی طرح ہیں، اور اس ہارڈ ویر کو آپ پکڑ سکتے ہیں،، دیکھ سکتے ہیں، کسی کو دکھا بھی سکتے ہیں، دل کو بھی آپ نکالیں گے تو ہاتھ میں آجائے گا، اور یہ دیکھا بھی جا سکتا ہے، اور دکھایا بھی جاسکتا ہے۔ اور دوسری چیز اس دل میں ڈالی جانے والی چیز ہے، جیسے ایمان وکفر، نیکی یا برائی، طاعت یا معصیت وغیرہ، یہ اس انسانی کمپیوٹر کا سافٹ ویر ہے۔

بھائیو! اب غور کرو کہ جس طرح کمپیوٹر سافٹ ویر کے بغیر کام نہیں کرتا، اسی طرح دل کے اندر ایمان ونیکی کا سافٹ ویر داخل کئے بغیر انسان بھی صحیح طور پر کام نہیں کرسکتا، لہذا ایک سافٹ ویر آپ کو اپنے دل کے اندر داخل کرنا پڑے گا، جو سافٹ ویر داخل کریں گے وہی آپ کے اعمال وافعال سے نظر آئے گا، وہی آپ کے اندر سے نظر آئے گا، اور یہ نظر آئے گا کہاں؟ مانیٹر میں، اور وہ مانیٹر انسان کا جسم ہے۔ سافٹ ویر کو رکھنے والی چیز ہارڈ ڈسک ہے اور ہارڈ ڈسک کے اندر جس سافٹ ویر کو آپ نے داخل کر دیا ہے، اس کا مظاہرہ کرنے کے لیے جسم مانیٹر ہے، اس میں آپ کے سارے عمل جو اندر سے آئیں گے، وہ مظاہرہ میں آئیں گے، اچھا عمل،

براعمل، نیکی وطاعت کا عمل، برائی ومعصیت کا عمل، شر کا عمل، خیر کا عمل، شیطانی عمل، رحمانی عمل، سب اسی جسم پر ظاہر ہوگا، لیکن ظاہر کیسے ہوگا؟ دل کی وجہ سے ظاہر ہوگا لیکن دل بھی یہ کام خودنہیں کرتا، بلکہ جو سافٹ ویر آپ اس میں ڈالیں گے، اسی سافٹ ویر کو آپ کے اعضاء سے دکھائے گا۔

یہ مثال میری سمجھ میں آئی اور مجھے یہ حدیث بھی سمجھ میں آئی کہ اللہ کے نبی کہتے ہیں کہ جسم کے اندر ایک لوتھڑا ہے وہ دل ہے، جب وہ صحیح رہتا ہے، یعنی جب اچھا سافٹ ویر اس میں داخل کیا جاتا ہے، جب اسے صالح بنایا جاتا ہے، اسے ڈھنگ کا بنایا جاتا ہے، اس کے اندر بہترین چیزیں داخل کی جاتی ہیں تو جسم بھی صحیح وسالم رہتا ہے، اور اگر دل کی ہارڈ ڈسک میں کوئی گندہ سافٹ ویر ڈال دیا تو جسم سے بھی برائی وخباثت ہی ظاہر ہوگی۔

دل کے لئے ایمانی سافٹ ویر

اب سنئے کہ اعمال واخلاق جو جسم سے ظاہر ہوتے ہیں ان کے صحیح واچھے ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دل میں ایمانی سافٹ ویر داخل کئے جائیں، یہ ایمانی سافٹ ویر کیا ہیں؟ یہ محبت وعشق الٰہی، ذکر و یاد الٰہی، خوف وخشیت الٰہی، توکل و اعتماد علی اللہ، انابت وتوجہ الی اللہ، اخلاص وللّٰہیت، خشوع وخضوع، عشق رسول، عظمت رسول، خوف وفکر آخرت، زہد وقناعت، وغیرہ کے سافٹ ویر ہیں۔ مثال کے طور پر خوفِ خداوندی کا سافٹ ویر اس میں آپ داخل کردیں، محبت خداوندی کا سافٹ ویر آپ اس میں داخل کردیں، اور عشقِ محمدی کا سافٹ ویر آپ اس میں داخل کردیں اور اسی طریقہ پر آپ اس کے اندر اخلاص کا سافٹ ویر داخل کردیں، تواضع کا ایک سافٹ ویر داخل کردیں، اسی طرح بہت سارے یہ سافٹ ویر داخل

کئے جا سکتے ہیں، جب اس قسم کے سافٹ ویر اس میں داخل کر دیں گے تو اب آپ کے اس مانیٹر سے یعنی جسم کے اعضاء سے، اسی طرح کے نیک و عمدہ اعمال وافعال آنے لگیں گے، اب اس سے تواضع چھلکتی ہے، اخلاص اس سے ظاہر ہوتا ہے، اللہ کا خوف محسوس ہوتا ہے، کبھی آنسو چھلک پڑتے ہیں، کبھی دل میں اللہ کے ڈر اور خوف کی وجہ سے ایک قسم کی گھبراہٹ پیدا ہونے لگتی ہے، آدمی کا دل بھی، دماغ بھی سب اس سے متاثر ہوتے ہے، اللہ کی محبت آجاتی ہے، نمازوں کی طرف دل چلنے لگتا ہے، خشوع وخضوع کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، دماغ آخرت کے کاموں کی طرف چلنے لگتا ہے۔

یہ ساری باتیں جو آپ کے جسم کے مانیٹر سے ظہور میں آتی ہیں، یہ دراصل دل کی ہارڈ ڈسک کی وجہ سے ہیں بلکہ اس کے اندر جو پڑا ہوا سافٹ ویر ہے اس کی وجہ سے ہیں۔

شیطانی سافٹ ویر

اس کے برخلاف دل کو بگاڑنے والے سافٹ ویر بھی ہوتے ہیں، جو ایمانی سافٹ ویر کے برخلاف دل کو تباہ و برباد کرتے ہیں، جیسے مثال کے طور پر اللہ سے غفلت کا سافٹ ویر، دنیا کی محبت کا سافٹ ویر، تکبر کا سافٹ ویر، یا ریاکاری کا سافٹ ویر، خواہش نفس کا سافٹ ویر، آخرت سے غفلت کا سافٹ ویر، وغیرہ۔ اور فرض کیجئے کہ آپ نے دل کی اس ہارڈ ڈسک میں جیسے دنیا کے لوگ کمپیوٹر میں غلط سافٹ ویر بھی داخل کر دیتے ہیں۔ مثلاً اس کے اندر ناچ گانا، فحش وعریاں تصاویر، حیا سوز مناظر، یا ایمان سوز باتیں، اسی طرح مختلف قسم کی گندی اور خبیث قسم کی چیزیں، شیطانی قسم کے اعمال کے سافٹ ویر اس میں داخل کر دیتے ہیں، اس طرح

کے شیطانی سافٹ ویر انسٹال کر دئے تو جو سافٹ ویر اس میں رہے گا، وہی نظر آئے گا، آپ اسے کھولیں گے تو ننگے ناچ بھی نظر آئیں گے، خباثتیں بھی نظر آئیں گی، شرارتیں بھی نظر آئیں گی۔

اسی طرح دل کے اندر اگر غلط سافٹ ویر آپ نے داخل کر دیا تو آپ کے اعمال سے بھی اور آپ کے جسم کے مانیٹر سے بھی وہی سب چیزیں چھلکیں گی۔

لہٰذا جو خبائث ورذائل ہمارے اعمال سے صادر ہوتے ہیں وہ دراصل دل کی ہارڈ ڈسک کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

حدیث مذکور کی شرح

اس تمہید کے بعد اب سنئے کہ اللہ کے نبی ﷺ اسی کو فرماتے ہیں کہ جسم میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے:

''**اِذَا صَلُحَتْ** ''(جب یہ لوتھڑا صحیح رہتا ہے)، اچھا سافٹ ویر اس میں داخل کیا جاتا ہے ایمان کا، طاعت وعبادت کے چسکہ کا، محبت الٰہی کا، خوف الٰہی کا، تقوی وتزکیہ کا اخلاس وللّٰہیت کا، خوف وفکر آخرت کا تو پھر کیا ہوتا ہے:

''**صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّه**''(پورے جسم کا نظام صحیح طور پر قائم رہتا ہے) اور اس کے مانیٹر سے بھی اچھے اچھے اعمال، اچھی اچھی باتیں صادر ہوتی ہیں۔ زبان سے اللہ کا ذکر، دین کی باتیں، لوگوں کی بھلائی کی باتیں صادر ہوں گی، ہاتھ پیر سے نیک اعمال واخلاق کا ظہور ہوگا، کانوں اور آنکھوں سے بھی صلاح وتقوی نکلے گا۔

''**وَاِذَا فَسَدَتْ**''(اور اگر یہ لوتھڑا خراب وفاسد ہو جاتا ہے) غلط سافٹ ویر اس میں داخل کر دیا جاتا ہے، بے ایمانی کا، غفلت کا، معصیت کا، تکبر وعجب کا، دنیا

کی محبت کا، اور یہ دل کا ہارڈ ڈسک خراب ہوجائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ:

" **فَسَدَالْجَسَدُ کُلُّه** " (تو پورا جسم کا نظام خراب ہوجائے گا) پھر پورے جسم سے غلط ہی غلط چیزیں نظر آئیں گی، حیا سوز وایمان سوز اعمال صادر ہوں گے، کفر وشرک دکھائی دے گا، معصیت وگناہ کی باتیں ظاہر ہوں گی، نہ زبان ٹھیک چلے گی، نہ ہاتھ پیر صحیح کام کریں گے، نہ آنکھ وکان ڈھنگ وسلیقہ کے ہوں گے، الغرض سارا جسم غلط ہی کام کرے گا۔

حضرات صوفیاء کا کام

لہذا انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے دل میں اچھے اچھے سافٹ ویر داخل کرے اور برے وگندے سافٹ ویر سے پرہیز کرے۔ میں کہتا ہوں کہ حضرات صوفیاء کا یہی کام ہے، وہ آپ کے دل کو نیکی وطاعت کے جذبات سے بھر دینا چاہتے ہیں، وہ اللہ کی محبت ومعرفت سے قلوب کو لبریز کرنا چاہتے ہیں، دنیا کی محبت سے دلوں کو خالی کرنا چاہتے ہیں، لہذا حضرات مشائخ کے یہاں جو محنت ہوتی ہے، اس محنت کا خلاصہ اگر آج کی کمپیوٹر کی زبان میں، سائنس کی زبان میں پیش کیا جائے تو وہ یہ ہے کہ مشائخ دو کام کرتے ہیں: ایک یہ کہ آپ کو اچھے سافٹ ویر اپنے جسم میں داخل کرنے کی تلقین اور گندے سافٹ ویر سے دور رہنے کی تعلیم دیا کرتے ہیں، اور دوسرے یہ کہ وہ خود یہ سافٹ ویر فراہم بھی کرتے ہیں، اس کی دکان انہی کے پاس ہے۔

دل کا سافٹ ویر کہاں ملے گا؟

اگر آپ کہیں کہ وہ ایمانی وروحانی سافٹ ویر کہاں ملے گا؟ یہ دنیا کے سافٹ ویر تو ہم کو مل جاتے ہیں، بہت سی کمپنیاں ان کو بناتی ہیں، اور اس کے ایڈورٹائیز آتے

رہتے ہیں ،اخبار میں ایڈورٹائیز، رسائل وجرائد میں ایڈورٹائیز،اسی طرح ٹیلی ویژن میں اس کا ایڈورٹائیز، ہرجگہ پراس کا ایڈورٹائیز ہوتا ہے، بورڈ بہت بڑے بڑے لگے ہوئے ہیں، اوران کی کمپنیاں بڑی بڑی عمارتوں میں قائم ہیں ،نظرآتی رہتی ہیں۔مگر دل کا سافٹ ویر کہاں ملے گا؟

قرآن کریم نے اس کا جواب دیا ہے:

﴿ یٰٓاَیُّهَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ﴾ (اےایمان والو!اللہ سے ڈرواور نیک لوگوں کےساتھ رہو)

اگر جدید انداز میں موجودہ حالات کے پیش نظر یوں ترجمہ کریں تو بھی صحیح ہے کہ ’’اےایمان والو! اللہ سے ڈرکا سافٹ ویرخریدلو) یہ آج کا جدید ترجمہ ہے،لوگ چاہتے بھی ہیں کہ جدید جدید ترجمے ہوں، لیجئے جدید ترجمہ میں کررہا ہوں۔

اس پرسوال پیدا ہوا کہ یہ سافٹ ویر کہاں سے خریدیں؟ تواس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ:﴿وَ کُوْنُوْامَعَ الصّٰدِقِیْنَ﴾ (نیک لوگوں کی مجلسوں کو چلے جاؤ، ان کے پاس یہ سافٹ ویرمل جائے گا) نیک لوگوں کی معیت میں،مجلس میں،صحبت میں،نیکوں کے قریب رہنے سے وہ سافٹ ویرتم کومل سکتا ہے۔

معلوم ہوا کہ اولیاء اللہ کی مجالس میں ، اولیاء اللہ کی صحبتوں میں اللہ نے وہ سافٹ ویر رکھ دیا ہے، جوآدمی ان کی صحبت میں بصدق دل رہتا ہے،اسے خریدنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی، دنیا کے سافٹ ویرتو ہزاروں روپے دے کرخریدنا پڑتا ہے ،لیکن یہاں اولیاء اللہ کے پاس سے تو یہ سافٹ ویر مفت میں کاپی (copy)ہوجاتا اور منتقل ہوتا رہتا ہے۔یہ اللہ والے دل کی ہارڈ ڈسک میں داخل کئے جانے والے سافٹ ویر کے’’سافٹ ویرانجینیر ‘‘ بھی ہیں،اوراس کے ڈیلربھی

مگران کے یہاں کی ڈیلنگ بھی عجیب ہے کہ سب کو مفت میں دیتے ہیں۔لہذا جس کو یہ روحانی و ایمانی سافٹ ویر چاہئے اس کو اولیاء اللہ و صالحین کی خدمت میں جانا چاہئے،اوران سے یہ حاصل کرنا چاہئے۔

دل کا وائرس[virus]

یہاں ایک بات یہ بھی سمجھ لیں کہ کمپیوٹر کی دنیا میں ایک چیز اور بھی ہوتی ہے،وہ یہ ہے کہ کمپیوٹر والے کہتے ہیں کہ کمپیوٹر میں وائرس [virus] آجاتا ہے،جس کی وجہ سے کمپیوٹر کھولتے ہیں تو اسٹارٹ ہی نہیں ہوتا،اور کبھی اسٹک ہوجاتا ہےاور کبھی بہت دیر سے چلتا ہے،اوراس کی وجہ سے اس میں ڈلے ہوئے سافٹ ویر خراب ہوجاتے ہیں۔

اب سافٹ ویر انجینیر دیکھ کر کہتا ہے کہ اس میں وائرس [virus] آ گیا ہے۔ کیا ہے وائرس؟ کیا بلا ہے یہ؟ وائرس کہتے ہیں زہریلے مادہ کو، جب یہ وائرس زہریلا مادہ کمپیوٹر پر حملہ کرتا ہے تو اس کے نظام کو تہس نہس کر کے رکھ دیتا ہے، یہ تو کمپیوٹر کا وائرس ہے،اور ہمارے دل کے لحاظ سے اور آپ کو سمجھانے کے لیے وائرس کا ایک ترجمہ میں یہ کرسکتا ہوں کہ وائرس ہے ''شیطان''، وائرس کیا ہے؟ اس ہمارے کمپیوٹر کے شیطان کا نام ''وائرس'' ہے۔لہذا یہ بھی جب ہم پر حملہ کرتا ہے تو ہمارے پورے نظام کو تہس نہس کر کے رکھ دیتا ہے ، دل خراب ، دماغ خراب ، آنکھیں خراب ،کان خراب ،زبان خراب،ہاتھ پیر خراب ،سارے اعضاء نکمے ہوجاتے ہیں۔

اس شیطانی وائرس کا ذکر حدیث میں آیا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:''**اِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ مِنَ الْإِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ**''

(کہ شیطان انسان کے اندر خون کی طرح یا خون کی رگوں میں دوڑتا ہے) (صحیح بخاری: ۲۰۳۸، صحیح مسلم: ۵۸۰۷، صحیح ابن حبان: ۳۷۴۱)

اس حدیث میں ایک لفظ آیا ہے: ''مجری الدم'' اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ یہ لفظ ''مجری'' مصدر ہو اور دوڑنے کے معنے میں ہو، اس صورت میں اس حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ شیطان انسان کے اندر اس طرح دوڑتا ہے جس طرح اس کے اندر خون دوڑتا ہے۔ اور یہ مجری اس صورت میں ''یجری'' کا مفعول مطلق ہوگا۔ اور دوسرے یہ کہ یہ ''مجری'' اسم ظرف ہو، اور دوڑنے کی جگہ کے معنے میں ہو، اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ: شیطان انسان کے اندر خون دوڑنے کی جگہ میں یعنی اس کی رگوں میں دوڑتا ہے۔ پہلی صورت میں یہ بتایا ہے کہ شیطان انسان کے اندر دوڑتا ہے، مگر کہاں دوڑتا ہے؟ یہ نہیں بتایا گیا۔ اور دوسری صورت میں یہ بتایا گیا ہے کہ شیطان انسان کے اندر کہاں دوڑتا ہے؟ خون دوڑنے کی جگہ میں دوڑتا ہے، یعنی رگوں میں دوڑتا ہے۔ الغرض شیطان انسان کے اندر دوڑتا ہے، داخل ہوتا ہے۔ اور اس طرح یہ وائرس اس کو بیکار و خراب کرتا ہے۔

دل کا اینٹی وائرس (Anti-Virus)

اس لئے جس طرح کمپیوٹر کو وائرس سے بچایا جاتا ہے اسی طرح ہمیں بھی خود کو شیطان سے بچانا ضروری ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس وائرس سے کیسے بچیں؟ کمپیوٹر والے کہتے ہیں کہ وائرس بڑا خبیث ہوتا ہے، اس کو ختم کرنے کے لیے اینٹی وائرس (Anti - Virus) سافٹ ویر بھی کمپیوٹر میں داخل کیا جاتا ہے۔ اینٹی وائرس کا مطلب ''زہر مخالف'' سافٹ ویر، اور وہاں جس طرح اینٹی وائرس ضروری ہے اسی طرح دل کے لئے ایک اینٹی وائرس یعنی ''شیطان کا مخالف'' سافٹ ویر

چاہئے۔اینٹی'' کے معنی ''مخالف''، جیسے اینٹی اسلام کے معنی کیا؟ اسلام مخالف۔اسی طرح اینٹی وائرس کا مطلب ہوا ''وائرس مخالف'' یہ وائرس اس میں آ گیا، اس کا ایک مخالف ایک سافٹ ویراس میں داخل کرنا پڑتا ہے، جب آپ اس میں وہ ڈالیں تو جونہی وائرس اس میں داخل ہوگا، فوراً وہ بتائے گا کہ آپ کے کمپیوٹر میں وائرس آ گیا ہے، مجھے کام میں لاؤ، میں اس کو پکڑ کے ختم کر دوں گا۔اگر آپ نے اس پر کلک کر دیا، تو کلک کرتے ہی وہ فوراً اسے پکڑ کر جہاں بھی ہوگا اسے ختم کر دے گا۔ یہ ہے اینٹی وائرس سافٹ ویر۔

اسی طرح بھائیو! ہمارے دل کے لئے بھی ایک اینٹی وائرس سافٹ ویر کی ضرورت ہے، تاکہ ہمارا نظام دل وجسم خراب نہ ہو جائے۔یہ اینٹی وائرس کیا ہے؟ وہ اللہ کا ڈروخوف ہے، اور یہ ''خوف الٰہی کا اینٹی وائرس سافٹ ویر'' بھی حضرات اولیاء اللہ ہی ہمارے دل میں داخل کرتے ہیں۔اور اسی کا نام ''اینٹی شیطان'' ہے۔تو خوفِ الٰہی کے اینٹی وائرس کو دل میں ڈال کے چھوڑ دو، اب وہ دل میں پڑا رہے گا، جہاں کہیں شیطان آپ کے جسم پر حملہ کرے گا، یا دل میں گھس کر بہکائے گا تو وہ فوراً پکڑ لے گا، اور اس کو باہر نکال دے گا۔

خلاصہ کلام

میرے بھائیو! اس تمام تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے اندر دل اصل ہے، اس کی اچھائی و برائی کا اثر ہمارے ظاہر پر پڑتا ہے، دل اچھا تو سب اچھا، دل برا تو سب برا، لہذا ہمیں ضرورت ہے کہ ہم اپنے دل کی اصلاح وتزکیہ کا کام کریں، اور اس کا طریق یہ سمجھ میں آیا کہ اس میں ایمانی وروحانی سافٹ ویر داخل کریں، یہی کہنا ہے کہ ہمارے دلوں میں بہترین سافٹ ویر داخل کرنے کی ضرورت ہے۔اللہ

کے عشق کا، اللہ کے خوف کا، اللہ کے تقویٰ کا اور اسی طریقہ پر اخلاص کا، اور تواضع کا، اور نیکیوں کا، نماز سے لگاؤ کا اور دین کے کاموں سے الفت ومحبت کا، یہ سب سافٹ ویر ہیں اور ایک کمپیوٹر میں بہت سارے سافٹ ویر داخل کیے جاسکتے ہیں، اور وہ سب کام کر سکتے ہیں۔ اسی طرح برے وخبیث سافٹ ویر سے اس کو دور رکھیں، نیز شیطانی وائرس سے اس کو بچائیں، مگر یہ ایمانی وروحانی سافٹ ویر کہاں ملے گا؟ یہ اہل اللہ کی خدمت میں جانے سے ملے گا، اسی طرح وائرس سے بچانے کے لئے اس دل کی ہارڈ ڈسک میں اینٹی وائرس داخل کرنے کی ضرورت ہے، اور یہ بھی اہل اللہ کے پاس ملے گا، لہذا ان کی خدمت میں جایا جائے اور ان کو حاصل کیا جائے۔

اسی طرح دل کی اس ہارڈ ڈسک کے اندر آپ ان سافٹ ویروں کو داخل کردیجئے وہ سب اندر پڑے پڑے آپ کو بہترین انسان بنائیں گے، اور آپ کے مانیٹر سے یعنی جسم کے اعضاء سے بہترین اعمال صادر کر کے لوگوں کو بتائیں گے۔

اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی سمجھ عطا فرمائے اور عمل کی بھی توفیق عطا فرمائے۔

نبی ﷺ کی ذات اسوۂ حسنہ

باسمہ تعالیٰ

نبی ﷺ کی ذات اسوۂ حسنہ

الحمد للّٰہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ . اما بعد فقد قا ل اللّٰہ تعالیٰ فی القرآن الکریم :

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾(الاحزاب:۲۱)

(تحقیق کہ تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں بہترین نمونہ ہے)

بلا اتباع نبی کوئی اللہ تک نہیں پہنچ سکتا

قرآن اور حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا اور آپ کے اسوۂ حسنہ کو اپنے لئے قابل تقلید بنانے کا مختلف جگہ متعدد عنوانات کے ساتھ ذکر موجود ہے اور اولیاء اللہ کا بلکہ تمام امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے بغیر کوئی بھی شخص اللہ کے دربار میں کوئی مقام حاصل نہیں کرسکتا، حضور کی اتباع کے ذریعہ ہی محبت خداوندی کا دروازہ کھلتا ہے، اگر اتباع محمدی کے بغیر کوئی شخص محبت خداوندی کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو قیامت تک نہیں کھل سکتا، یہی ایک راستہ ہے جو اللہ نے خود مقرر کردیا ہے، جب اللہ خود کسی راستے کو متعین کردے، مقرر کردے اور یہ بتادے کہ اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے، تو پھر کسی اور راستے

پر چلنے سے کامیابی کیسے مل سکتی ہے؟

تو معلوم ہوا کہ یہی ایک راستہ ہے اللہ کی محبت کا اور اللہ کے راستے میں چلنے کا کہ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی جائے، اسی لئے قرآن میں اللہ تعالی نے دوسری جگہ فرمایا ہے: ﴿قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ﴾ (اے نبی ﷺ! آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کو چاہتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں گے) (آل عمران:۳۱)

باقی تجارت میں، دنیا میں، دنیا کی چیزوں میں آگے بڑھ جائے تو وہ الگ بات ہے، لیکن اللہ کے دربار میں کوئی مقام، کوئی منزلت آدمی کو اسی وقت ملتی ہے اور مل سکتی ہے جبکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتا ہو، اور آپ کی اتباع تمام معاملات کے اندر ضروری ہے، عقائد میں، عبادات میں، معاملات میں، معاشرت میں، اخلاق میں، سیاست میں، تعلیم میں، تہذیب میں، تمدن میں، تمام چیزوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

اُسوہ کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے:

﴿لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ﴾

(تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں بہترین نمونہ ہے)

محض اسوہ نہیں کہا، بلکہ اسوۂ حسنہ، یعنی بہترین اسوہ و بہترین نمونہ فرمایا، اسوہ اور نمونہ وہ چیز ہوتی ہے جس کو دیکھ کر دوسری چیز تیار کی جاتی ہے، جیسے کپڑوں کا جوڑا نمونے کے طور پر دیا جاتا ہے؛ تاکہ اسکے مطابق دوسرا کپڑا اڈھالا جائے، سیا جائے، گھر کا ماڈل دیا جاتا ہے؛ تاکہ دوسرا گھر اسی کے مطابق بنایا جائے، جوتے کا ماڈل

دیا جاتا ہے تا کہ اسی کے مطابق دوسرا جوتا تیار کیا جائے۔

اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کی زندگی کا عمل ساری دنیائے انسانیت کیلئے ایک ''ماڈل'' ہے اور ''بہترین نمونہ'' ہے، عقائد ہیں تو اس میں بھی آپ نمونہ ہیں، اعمال وعبادات ہیں تو اس میں بھی آپ نمونہ ہیں، معاشرت وتہذیب ہے تو اس میں بھی نمونہ ہیں، اور اخلاق ہیں تو اس میں بھی آپ ہمارے لئے نمونہ ہیں، اسی طرح تمام معاملات میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نمونہ ہیں، پھر اسی کے ساتھ آپ کی آنکھیں نمونہ ہیں ہماری آنکھوں کے لئے، آپ کے کان نمونہ ہیں ہمارے کانوں کے لئے، آپ کا دل نمونہ ہے ہمارے دل کے لئے، اسی طرح آپ کی زبان نمونہ ہے ہماری زبان کے لئے، آپ کے ہاتھ پیر نمونہ ہیں ہمارے ہاتھ پیر کے لئے۔

انسان اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی مشین ہے

اس کو اس طرح سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک مشین کی طرح بنایا ہے، اس کے اندر بہت سے پرزے لگے ہوئے ہیں اور یہ ایسی مشین ہے جس کے اندر ہر پرزہ اپنا اپنا کام کرتا ہے، جیسے دل ایک پرزہ ہے، زبان ایک پرزہ ہے، آنکھ، ناک، کان ان میں سے ہر ایک ایک ایک پرزہ اور پارٹ ہے، ہاتھ، پیر یہ الگ الگ پرزے ہیں، اس کے علاوہ بہت سے اجزاء، اعضاء، بہت سے پارٹس، بہت سے پرزے، اس مشین میں لگے ہوئے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ مشین ایک ہے، لیکن اس کا ہر پارٹ الگ پارٹ ادا کرتا ہے، یعنی الگ الگ کام کرتا ہے بہت سی مشینیں دنیا میں ایسی ہوتی ہیں کہ بہت سے پارٹ ملنے کے بعد کام ایک ہی کرتے ہیں۔ مثلا: ''فریج'' ہے، فریج میں بہت سے پارٹس ہیں، لیکن پورے پارٹس مل کر کام تو ایک ہی کرتے ہیں، اسی طریقے پر ''بس'' ہے ایک مشین ہے، اس کے اندر بہت سے پارٹس

ہیں وہ پورے پارٹس مل کر جب کام کرتے ہیں تو کام تو ایک ہی ہوتا ہے۔

لیکن ہماری مشین جو اللہ نے بنائی ہے، یہ مشین ایسی ہے کہ اس کا ہر پارٹ کام کرتا ہے اور ہر ایک کا کام الگ الگ ہوتا ہے، یہ نہیں کہ پورے اجزاء اور پارٹس مل کر ایک ہی کام کرتے ہوں، مثلاً ناک کا کام الگ ہے، اس کی مستقل ایک ڈیوٹی ہے، زبان کا جو کام ہے وہ مستقل کام، آنکھ کا جو کام ہے وہ مستقل کام، اسی طرح کان کا کام ہے تو وہ مستقل کام، اس طرح ہر پارٹ الگ الگ کام کرتا ہے۔

کتاب اللہ اور رجال اللہ اس مشین کو چلانا سکھاتے ہیں

اس مشین کو چلانے کے لئے اور صحیح نہج پر اسکو (Active) کرنے کیلئے اور صحیح نہج پر اس کی نگرانی کرنے کے لئے اللہ تعالی نے ایک تو اپنی کتاب نازل کی جس کے اندر اس کے اصول وطریقے بتا دیئے کہ یہ مشین تمہیں ان ان اصولوں پر اور اس اس طرح چلانا ہے، لیکن مشین چلانے کیلئے صرف صحیفوں و کتابوں میں لکھے ہوئے حروف اور نقوش کام نہیں آتے ، بلکہ اسے عملاً (Practical) بھی بتانا ضروری ہوتا ہے، اس کے لئے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے، جیسے کوئی فیکٹری (Factory) مشین تیار کرتی ہے تو اس کا بروشر (Brochure) بھی تیار کرتی ہے اور ساتھ ساتھ کچھ اس مشین کو چلانے کے لئے اور اس کا مظاہرہ کرنے کے لئے بھی کچھ لوگ تیار کئے جاتے ہیں، وہ آ کر آپ کو بتاتے ہیں کہ اس مشین کو چلانے کے لئے پہلے یہ بٹن دبانا ہے، پھر یہ بٹن دبانا ہے، اور اس طرح سے کام لینا ہے، اگر ایسا ہو جائے تو ایسا کرنا ہے، اور ایسا ہو جائے تو یوں کرنا ہے۔ ایک طرف بروشر میں بھی یہ پورا طریقہ لکھا ہوا ہوتا ہے، اور اس کے اندر ہر ہر پارٹ کی تصویر بھی ہوتی ہے اور ان کے نام کی نشاندہی بھی کی جاتی

ہے، پھر ہر پارٹ کا کام بھی بتایا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ اس کا طریقہ بھی بتایا جاتا ہے، کہ اس کو کس طرح (Operate) کرنا چاہیئے، الغرض بروشر میں سب کچھ لکھا ہوا موجود ہوتا ہے، لیکن کتنے لوگ ہیں جو صرف اس کو دیکھ کر چلانا سیکھ لیتے ہیں؟ شاید ہزاروں میں ایک ہوگا۔ جب دنیا کی مشین میں صرف لکھا ہوا کام نہیں آتا، بلکہ اس کے لئے کچھ (Practical) بتانے والے ضروری ہوتے ہیں تو پھر آپ سوچیئے کہ یہ اللہ کی بنائی ہوئی مشین جو بہت با مقصد طور پر پیدا کی گئی ہے، اس کے ہر ہر جزء میں، ہر ہر پارٹ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے بڑی حکمتیں، بڑی مصلحتیں رکھی ہیں اور انکا الگ الگ کام مقرر کردیا ہے اور اس کام کو لینے کیلئے اس کا ایک طریقہ بھی مقرر کردیا ہے کہ اس طریقہ پر اس سے یہ کام لینا ہے، تو پھر اس کو بتانے کیلئے صرف صحیفہ خداوندی کافی نہ تھا، بلکہ رجال خداوندی کی بھی ضرورت تھی، اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ اللہ نے شروع دور سے ایک طرف کتاب اللہ کا سلسلہ جاری کیا ہے تو دوسری طرف رجال اللہ کا بھی سلسلہ جاری کیا ہے، اللہ کی کتاب بھی آتی ہے اور اللہ کی طرف سے کچھ رجال کار بھی آتے ہیں، وہ آکر بتاتے ہیں کہ یہ طریقہ زندگی کرنے کا ہے، اس مشین کے چلانے کا، اس کے استعمال کرنے کا، اگر اس مشین کو اس کے برخلاف استعمال کروگے تو یہ خراب ہوجائیگی، اور اگر صحیح طریقہ پر استعمال کروتو ٹھیک وصحیح سالم رہے گی۔

بہت سے انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام آئے اور آخر میں ہمارے اور آپ کے آقا حضرت سیدنا ومولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اور آپ نے اپنی زندگی کے اندر ایک ایک چیز کے بارے میں تفصیلی معلومات اور عملی طور پر اس کا ایک نمونہ ہمارے سامنے رکھ دیا، آنکھ کے بارے میں بھی رکھا، کان کے بارے میں بھی رکھا، دل کے بارے میں بھی رکھا، زبان کے بارے میں بھی رکھا،

ہاتھ پیر کے بارے میں بھی رکھا کہ یہ سب کے سب اجزاء اور پارٹ کس طرح استعمال میں لانا ہے اور ان کو اگر غلط استعمال کریں گے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا ؟ یہی بات ہمیں اور آپ کو سیکھنا ہے، حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے ذریعے سے کہ ہماری اس مشین کو جو اللہ کی بنائی ہوئی ہے، دنیا میں ٹھیک ٹھیک چلا کر اس کو استعمال کر کے کیسے اس سے کام لیں۔

یہ مشین بطور امانت دی گئی ہے

یادرکھیں کہ یہ اللہ کی عطا کردہ مشین ہے اور ہم کو بطور امانت دی گئی ہے، بطور ملکیت نہیں دی گئی ہے، ایک ہوتا ہے بطور ملکیت دیدینا اور ایک ہوتا ہے بطور امانت اور ودیعت دینا، بطور ملکیت دیدینے پر ہم مختار کل ہوتے ہیں جو چاہیں کریں، لیکن اللہ نے ہم کو بطور ملکیت نہیں دیا، ہم کو اس کی (Ownership) نہیں دی بلکہ ہمارے پاس محض بطور امانت کے رکھی ہوئی ہے۔ اسی لئے ایک حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ نے اللہ کو مخاطب بنا کر عرض کیا ہے کہ: اَللّٰھم ان قلوبنا و جوارحنا بیدك ، لم تملكنا منها شيئا ، فاذا فعلت ذلك بهما فكن أنت ولينا ''(اے اللہ! بلا شبہ ہمارے قلوب اور اعضاء آپ کے قبضہ میں ہیں، ان میں سے کسی چیز کا آپ نے ہمیں مالک نہیں بنایا، پس جب آپ ان کو ایسا کریں تو آپ ہی ہمارے محافظ بن جائیں)(الجامع الصغیر:۱۵۱۲، کنز العمال:۳۶۴۴)

معلوم ہوا کہ ہم ہمارے اعضاء کے مالک نہیں ہے کہ جو چاہیں کریں، بلکہ صرف امین ہیں۔ اسی لیے علماء نے مسئلہ لکھا ہے کہ ہمارے اس جسم کا کوئی عضو اور پارٹ اٹھا کر ہم اپنی مرضی سے کسی کو نہیں دے سکتے، مثلاً آپ کے جی میں آیا کہ اپنے بھائی کو میں اپنا گردہ دیدوں، اپنی آنکھ کسی کو دیدوں تو یہ جائز نہیں ہے۔

آپ کو کیا اختیار ہے؟ کیا یہ آپ کی اپنی Body ہے؟ آپ کا جسم ہے؟ آپ کی آنکھیں ہیں؟ آپ کے گردے ہیں؟ آپ کا دل ہے؟ نہیں، بلکہ یہ تو سب اللہ کا ہے اور اللہ کی اجازت کے بغیر اس میں کسی کو تصرف کا حق نہیں ہے، اس لیے مسئلہ یہ ہے کہ ان اجزاء واعضاء میں سے کسی عضو کو بغیر اللہ کی مرضی کے نہیں دے سکتے۔

اب رہا یہ کہ اللہ کی مرضی کب ہے، کب نہیں، کیسے معلوم ہوگا؟ آپ مفتی سے پوچھیں، مفتی بتائے گا کہ اللہ کی مرضی ہے کہ نہیں، اس لیے کہ وہ قرآن میں غور کریگا، احادیث میں غور کریگا، دلائل میں غور کریگا، اور فتوی دیگا۔

اگر مشین کا غلط استعمال ہو تو خراب ہو جائیگی

ایک اور بات بھی یہاں سمجھ لیں کہ مشین کا استعمال اگر غلط ہوا اور آپ اس سے وہ کام کرنا چاہیں جو اس کے فساد وخرابی کا سبب بنے تو وہ مشین خراب ہو جائیگی اور اس کے اوپر کچھ دوسرے اثرات مرتب ہو جائیں گے۔ یہاں یہ سمجھ لیں کہ کسی بھی چیز کا استعمال صحیح اسی وقت ہوگا جب اس میں دو باتوں کا دھیان دیں گے: ایک تو یہ کہ اس چیز کو اسی کے مقصد میں استعمال کیا جائے اور دوسرے یہ کہ اس کو اسی طریقہ کے مطابق استعمال کریں جو اس کے لئے مقرر ہے۔

مثال کے طور پر ہمارے سامنے یہ ٹیوب لائٹ جل رہا ہے، اس کو ایک تو اسی مقصد میں استعمال کرنا چاہیئے جس کے لئے یہ بنایا گیا ہے، یہ بنایا گیا ہے ہمیں روشنی دینے کے لئے، اگر کوئی بے وقوف اس کام کے بجائے اس کو کسی اور کام مثلاً کسی کو مارنے میں استعمال کرے یا عصا بنالے تو ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اسی طرح کتاب پڑھنے، مطالعہ کرنے کے لئے ہے، اگر کوئی اس سے پنکھے کا کام لینے لگے تو یہ بات غلط ہوگی، کیونکہ اس کے مقصد کے خلاف استعمال کیا گیا۔

دوسرے یہ بھی ضروری ہے کہ چیز کے استعمال کرنے کا طریقہ بھی سیکھا جائے، ٹیوب لائٹ جلانے یا پنکھا چلانے کا ایک طریقہ ہے، استعمال کرنے کا ایک انداز ہے کہ کس طرح اس کو استعمال کریں، اگر خدانخواستہ اس طریقہ کے مطابق استعمال نہ کریں، تو ہوسکتا ہے کہ اس کا فائدہ نہ ہو اور خراب ہو جائے ، مثلاً ایک آدمی نے دیکھا کہ ٹیوب لائٹ جل نہیں رہا ہے، اس کے جی میں آیا کہ یہ تو جلتا نہیں ہے، اس کو جلانا ہے، اس بیوقوف نے سوچا کہ یہ کیوں نہیں جلتا؟ اسکو میں جلاتا ہوں، میں روزانہ اپنے گھر کا ''اسٹو'' ماچس کی تیلی جلا کر جلا لیتا ہوں اور وہ جل جاتا ہے۔ لہٰذا یہاں بھی میں اس کو جلاؤنگا، اس نے ایک ماچس لا کر اس سے ایک تیلی نکالی اور اس کو جلایا اور اس سے ٹیوب لائٹ جلانے لگا۔

اب بتایئے کہ اس کا حشر کیا ہوگا؟ اس کو ساری دنیا کہے گی کہ یہ طریقہ نہیں ہے اس کو جلانے کا، یہ طریقہ دوسری چیزوں کے لئے استعمال ہوسکتا ہے، لیکن یہ طریقہ اس کے لئے استعمال کریں گے تو اس کے لئے خطرہ ہی خطرہ ہے۔

اولاً تو وہ کالا ہو جائیگا اور پھر ہوسکتا ہے کہ اگر تیز بھاپ اس کو لگ جائے تو پھٹ بھی جائے، اس لئے کہ یہ طریقہ اس کے استعمال کا ہرگز نہیں ہے۔

اب یہاں ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک چیز کو جلانے کا جو طریقہ مقرر ہے، اس طریقہ کے خلاف اگر اس کو استعمال کیا جاتا ہے تو اس کو خطرہ ہے کہ نہیں ہے؟

اسی طرح بھائیو! اگر ہمارے دل کو روشن کرنے کے لئے، دل کے اندر نور اور اجالا پیدا کرنے کے لئے کوئی آدمی وہ چیز استعمال نہ کرے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے اور وہ چیز استعمال کرے جسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے خطرہ بتایا ہے، تو پھر اس کا دل روشن نہیں ہو سکے گا، دیکھئے ماچس سے

آپ سگریٹ جلا سکتے ہیں، موم بتی جلا سکتے ہیں، اپنی گیس لائٹ جلا سکتے ہیں، لیکن ٹیوب لائٹ ہرگز نہیں جلا سکتے، بلکہ جلائینگے تو کالا ہوجائیگا۔

اسی طرح سمجھئے دل بھی ایک روشن چیز کی طرح ہے، اس میں ایک آگ جلانے اور دھکانے کی ضرورت ہے، وہ آگ جو اس میں لگے گی وہ عشق الٰہی کی آگ ہے، اگر دل میں عشق الٰہی کی آگ جلا کر آپ اس کو روشن کریں گے تو انشاء اللہ اس کی روشنی بڑی خوبصورت ہوگی، اور بہت دور دور تک پہونچے گی، آپ کو بھی روشن کرے گی اور آپ کے پاس بیٹھنے والوں کو بھی روشن کرے گی، لیکن اگر کوئی بیوقوف صاحب اللہ کی محبت سے دل کو جلانے کے بجائے، دنیا کی محبت سے جلانا چاہیں تو دل کالا ہوجائیگا، روشن کبھی نہیں ہوگا۔

معلوم ہوا کہ دل کو روشن کرنا ہو تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنا پڑیگا کہ آپ کا اسوہ کیا ہے؟ آپ کو اللہ نے کیا طریقہ دے کر بھیجا ہے وہ طریقہ آپ ہم کو بتائیں، تاکہ ہم اس طریقہ سے اپنے دل کو روشن کریں۔ اسی طرح آنکھیں ہیں، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آنکھوں سے جو کام لیا اور جس انداز سے کام لیا، آنکھوں کو اسی طرح استعمال کرنا چاہئے اور اسی مقصد میں استعمال کرنا چاہئے اور اگر اس کو مقصد سے ہٹا کر استعمال کریں گے اور غلط طریقہ پر اس کو استعمال کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آنکھوں کو اجاڑنے کا ہم کام کر رہے ہیں، آنکھوں کو بسانے کا کام ہم نہیں کر رہے ہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آنکھوں سے کیا کام لیا؟ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دل سے کیا کام لیا؟ وہی کام ان سے ہمیں بھی لینا ہے۔

دل اللہ کی معرفت کی تجلی گاہ ہے

اسلئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث کے ذریعے بھی اور اپنے

عمل کے ذریعہ بھی بتایا ہے کہ دل کو اللہ کی محبت اور معرفت کا مسکن اور ٹھکانہ بناؤ، یہ ہے دل کا کام، اگر کوئی اس کے بجائے دل کے اندر دنیا بھر کی غلاظتیں لے جا کر بھر ڈالے، عورت کی محبت دل میں ہے، اور انسانوں کی محبت دل میں ہے، چیزوں کی محبت دل میں ہے اور مکانوں کی محبت دل میں ہے، پکوان کی محبت دل میں ہے، کھانوں کی محبت دل میں ہے، تو اس کی مثال ایسی ہے، جیسے کوئی آدمی بہترین قسم کا محل بنانے کے بعد اس کے اندر تمام قسم کی غلاظتیں اور مختلف قسم کی گندگیاں لا کر ڈالدے۔ دل اللہ کی معرفت کا تجلی گاہ ہے، اللہ تعالی کی محبت کا مسکن ہے، اس کے اندر دنیا کی اور مختلف قسم کی محبتیں لا کر ڈال رہا ہے، تو یہ گندگیاں ہیں، غلاظتیں ہیں، یہ غلاظتیں دل کے اندر آجائیں گی تو بھائی ذرا اندازہ کیجئے، آپ اس آدمی کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ جس نے محل بنایا اور پھر محل کے اندر غلاظتیں لا کر جمانا شروع کر دیا۔

آنحضرت ﷺ کا دل کیسا تھا؟

الغرض آپ ﷺ کا دل ہمارے لئے اسوہ حسنہ ہے، اللہ کے نبی ﷺ کا دل کیا کیا کام کرتا تھا؟ کن کن خوبیوں کا وہ دل مالک تھا؟ کن چیزوں کو اس میں جگہ نہیں دی تھی؟ اس کے مطابق ہم کو اپنا دل بنانا ہے۔ آج ہمارے دلوں کو ہم دیکھ لیں کہ اس دل کے اندر وہ چیزیں جمع ہیں جو محمد ﷺ کے دل میں نہیں تھیں، اور وہ چیزیں ہمارے دل میں موجود نہیں ہیں، جو نبی ﷺ کے دل میں موجود تھیں، نبی ﷺ کا دل وہ دل تھا کہ اس میں دنیا کی محبت ایک رائی کے برابر نہیں تھی اور خدا کی محبت سو فیصد بسی ہوئی تھی۔

حدیث میں آتا ہے کہ نبی ﷺ کی خدمت میں کافروں کے بہت سارے گروگھنٹالوں نے ایک آدمی کو بھیجا، وہ آپ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ: اے محمد ﷺ! مجھے فلاں اور فلاں نے آپ کے پاس بھیجا ہے، میں مکہ کے سرداروں کی طرف سے

آیا ہوں اور مجھے ایک بات آپ کے سامنے رکھنی ہے، اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ کیابات ہے؟ اس نے کہا کہ میں یہ پیغام لیکر آیا ہوں کہ اگر آپ دین اسلام چھوڑ دیں تو ہم آپ کو حکومت وسرداری دینے تیار ہیں، ہم آپ کو اپنا سردار بنالیں گے، اور آپ چاہیں تو ساری دولتیں آپ کے قدموں میں لاکر ڈالدیں گے، اور اگر آپکا مقصد عیش وراحت ہے تو ہم عرب کی خوبصورت لڑکیاں آپ پر نچھاور کردیں گے۔بس یہ شرط ہے کہ آپ یہ دین کا کام کرنا چھوڑ دیں، توحید وسنت کا کام بند کردیں۔

اللہ کے نبی ﷺ اس کی بات سننے کے بعد پوچھتے ہیں، آپ کی بات ختم ہوگئی؟ وہ کہتا ہے، ہاں! میں نے اپنی بات پوری کرلی۔ اللہ کے نبی ﷺ فرماتے ہیں کہ: ''اب میری بات سنو''، اس کے بعد آپ قرآن مجید کی تلاوت شروع کردیتے ہیں، سورہ حمٓ سجدہ کی آیتیں پڑھنی شروع کردیتے ہیں، آپ پڑھتے رہے، یہاں تک کہ وہ آیتیں آگئیں جس میں قوم عاد کا اور مختلف قوموں اور لوگوں کا ذکر ہے، ان کی ہلاکت وتباہی کا ذکر ہے تو اس آدمی سے برداشت نہ ہوا اور وہ اللہ کے نبی ﷺ کے قریب پہونچ کر آپ کے منھ پر ہاتھ رکھکر کہتا ہے: ''اللہ کے لئے اس کو بند کرو میرے سینے میں اس کو سننے کی طاقت موجود نہیں ہے، اللہ کے نبی ﷺ بند کردیتے ہیں تو وہ اٹھ کر چلا جاتا ہے۔

کافر لوگ مکہ کے سردار وہاں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتے ہیں کہ آپ کے پاس سے کیا جواب لاتا ہے؟ لیکن اس آدمی میں ان سے بات کرنے کی طاقت نہیں تھی، تو اپنے گھر چلا گیا اور تین دن تک لوگوں کو نظر بھی نہیں آیا، تین دن کے بعد وہ لوگوں کے سامنے آتا ہے اور کہتا ہے کہ محمد ﷺ ایک ایسا کلام پیش کرتے ہیں کہ میں نے کبھی ایسا کلام نہیں سنا ہے۔ (تفسیر قرطبی: ۳۳۸/۱۵، حیاۃ الصحابہ: ۳۷/۱)

تو بھائیو! ہمارے نبی ﷺ کو دنیا دی جا رہی تھی، دولت و مال آپ کے قدموں میں ڈالنے کے وعدے کئے جا رہے تھے، لیکن آپ نے یہ فرمایا کہ امارت، عیش و عشرت اور مال و دولت تو میرے پیروں میں ہے، اس میں سے کسی کو بھی لینا نہیں چاہتا، دنیا کی دولت اور دنیا کی چیزوں کی محبت محمد ﷺ کے دل کے اندر ایک پائی کے برابر بھی نہیں تھی۔

مال و دولت سے نبی ﷺ کا استغناء

حدیث میں آتا ہے کہ مدینہ ہجرت کے بعد بہت سارے ممالک فتح ہوتے چلے گئے، بحرین کا ملک بھی فتح ہوگیا، اس وقت اللہ کے نبی ﷺ نے لوگوں کو بحرین بھیجا کہ جاؤ (tax) ٹیکس وصول کر کے لاؤ۔ چنانچہ حضرات صحابہ گئے، اور بحرین سے دولت کا انبار لے کر آئے، اس میں سونا، چاندی، اناج و غلہ اور کپڑا اور دیگر مختلف قیمتی چیزیں تھیں۔

یہ سب چیزیں مسجد نبوی کے صحن میں جمع کر دی گئیں، اور اللہ کے نبی ﷺ کو خبر کر دی گئی۔ ذرا سوچئے کہ اگر میں یا آپ اس جگہ ہوتے تو جا کر کم از کم دیکھتے کہ کتنی دولت آئی ہے؟ اور کیا کیا مال آیا ہے؟ لیکن اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، مسجد میں ڈال دو اور آرام کرو، صحابہؓ اپنی اپنی جگہ چلے گئے، لوگوں میں شہرت ہوگئی کہ بحرین سے بہت کچھ مال آگیا ہے، یہ دور فقر و فاقہ کا دور تھا، ایسے دور میں بحرین سے اس قدر مال جمع ہوگیا تھا، فجر کی نماز کا وقت ہوگیا تو مدینہ کی مختلف مساجد کے نمازی بھی مسجد نبوی کے اندر آ کر جمع ہوگئے، ایک جم غفیر دوسرے دنوں کے لحاظ سے کچھ زیادہ ہی تھا، اب لوگ انتظار میں ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ نماز فجر پڑھانے کے لئے آئیں گے۔

چنانچہ وقت ہوا تو آپ ﷺ تشریف لائے، حضرت بلالؓ ساتھ میں موجود تھے لوگوں کا خیال تھا کہ آپ ﷺ آ کر مال کا جائزہ لیں گے اور ایک ایک چیز کو اچھی طرح غور و فکر سے دیکھیں گے، لیکن دیکھتے ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ تشریف لائے اور ایک نگاہ بھی اٹھا کر مال کی طرف نہیں دیکھا، بلکہ سیدھا محراب کے اندر تشریف لے گئے اور نماز پڑھائی، اس کے بعد مصلیوں کی طرف چہرہ کر کے بیٹھ گئے اور پوچھا کہ تم لوگ مختلف محلوں کے یہاں جمع ہو گئے، شاید تم لوگوں کو یہ خبر ملی ہو گی کہ بحرین سے مال آیا ہے، اس لئے تم لوگ یہاں جمع ہو گئے ہو، صحابہؓ نے عرض کیا، ہاں! یا رسول اللہ! ہم اسی لئے جمع ہوئے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا:

پچھلی امتیں جو تباہ و ہلاک ہوئیں، وہ مال و دولت میں غرق ہونے کی وجہ سے ہلاک ہوئیں، مجھے کوئی خوف تمہارے فقر و فاقہ کا نہیں ہے، اگر مجھے کسی بات کا خوف تمہارے بارے میں ہے تو یہی کہ دنیا تمہارے او پر وسیع کر دی جائے اور تم ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں مسابقت (race) کرو گے اور ہلاک کر دیئے جاؤ گے، پھر اس کے بعد مال کے پاس تشریف لائے اور حضرت بلالؓ سے فرمایا کہ تقسیم کرنا شروع کرو، جس کو جس چیز کی ضرورت ہو دیتے چلے جاؤ، حضرت بلال حبشی تقسیم کرتے رہے یہاں تک کہ جو کچھ آیا تھا سب تقسیم ہو گیا، جب اللہ کے نبی ﷺ وہاں سے اٹھے ہیں تو یوں اپنا دامن جھاڑ کر اٹھ گئے کہ ایک پائی بھی اپنے لئے نہیں رکھی۔ (بخاری: ۱/۴۴۷، مسلم: ۲/۴۰۷)

یہ اللہ کے نبی ﷺ کا اسوہ ہے کہ اتنے مال کی فراوانی کے باوجود ایک نگاہ بھی اٹھا کر آپ نے نہیں دیکھی اور حضرات صحابہؓ کے دلوں میں جو تھوڑی سی محبت جمع ہو گئی تھی، اس کو بھی کھینچ کر نکال دیا۔

اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک موقعہ پر آپ ﷺ نے نمازِ عصر پڑھائی، نماز کے بعد آپ ﷺ لوگوں کو پھلانگتے ہوئے بڑی تیزی کے ساتھ گھر گئے، حضرات صحابہؓ پریشان ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ کو کیا ضرورت پیش آ گئی کہ آپ دوڑتے ہوئے اور لوگوں کو پھلانگتے ہوئے گھر تشریف لے گئے؟.......کچھ دیر بعد واپس آئے، اور دیکھا کہ ان حضرات کو تعجب ہو رہا ہے تو صحابہؓ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ نماز میں مجھے یاد آیا کہ میرے گھر میں ایک سونے کا ٹکڑا رہ گیا ہے، میں نے یہ مکروہ سمجھا کہ وہ مجھے مشغول کر لے، ایک روایت میں یوں فرمایا کہ کہیں وہ میرے پاس رات میں رہ نہ جائے، لہذا میں نے اس کو تقسیم کرنے کا حکم دیدیا ہے۔ (بخاری:۸۵۱،نسائی:۱۳۶۴)

یہ تھے اللہ کے نبی ﷺ، کہ آپ کے دل میں دنیا کی کوئی محبت نہیں تھی، اب اللہ کے نبی کا دل دیکھو کہ کیسا تھا، میں یہ سمجھانا چاہ رہا ہوں کہ نبی ﷺ کی ذات میں تمہارے لئے نمونہ موجود ہے، آپ کے دل کو دیکھ کر اپنا دل بھی ویسا ہی بنالو۔

اللہ کے نبی کے دل میں خوفِ الٰہی

ایک صفت ہمارے نبی ﷺ کے دل کی یہ تھی کہ آپ کے دل میں خدا کا خوف بے پناہ موجود تھا؟ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے، آپ ﷺ کو شدید بھوک لگی، اور کھانے کے لئے کچھ بھی موجود نہیں تھا، آپ گھر کے باہر تشریف لائے، دیکھا تو ایک طرف صدیق اکبر نظر آئے، دوپہر کی شدید گرمی کا وقت تھا، آپ نے ان سے پوچھا: ''اے ابوبکر! ایسے وقت کیوں باہر آ گئے؟'' تو انہوں نے کہا کہ یارسول اللہ! بھوک کی شدت نے باہر نکلنے پر مجبور کیا، اس لئے باہر نکل آیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے بھی بھوک نے ہی مجبور کیا؛ اس لئے میں بھی باہر نکل آیا

ہوں، دونوں حضرات کچھ آگے بڑھے تو حضرت عمر بن خطابؓ نظر آئے، ان سے پوچھا کہ اس وقت باہر کیوں؟ تو انکا بھی وہی عذر کہ بھوک کی شدت نے مجبور کیا۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ چلو ابوالہیثم کے باغ میں چلیں گے، یہ ایک صحابی تھے، ان کا مدینہ کے اندر بڑا باغ تھا، حضور ﷺ وہاں تشریف لے گئے، اس وقت ابوالہیثم وہاں موجود نہیں تھے، ان کی بیوی موجود تھیں، انھوں نے حضور ﷺ کو دیکھا تو وہ خوش ہوگئیں، چادر بچھائیں، اس کے بعد کھانے کے لئے انگور وغیرہ لاکر رکھدیا، حضور اور صحابہ نوش فرمارہے تھے، اتنے میں حضرت ابوالہیثم بھی آگئے، آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے، ان کی تو عید ہوگئی، ان کے پاس ایک بکری موجود تھی، اس کو جلدی سے ذبح کیا، اور اس کو بھونا، بیوی کو حکم دیا کہ روٹی پکاؤ، گرم گرم روٹیاں پکادی گئیں، سالن بھی تیار ہوگیا، لاکر حضور کے سامنے رکھ دیا، حضور نے بھی کھایا اور دیگر اصحاب نے بھی کھایا، فراغت کے بعد حضور نے رونا شروع کردیا، حضور ﷺ کو دیکھ کر سب کو رونا آگیا اور ایک کہرام سا مچ گیا، لیکن کسی کو کچھ نہیں پتہ کہ کیوں رویا جارہا ہے؟ اللہ کے نبی کے رونے کو دیکھ کر سب کو رونا آگیا، ابوبکرؓ نے آپ سے پوچھا کہ: یا نبی اللہ! آپ کیوں رورہے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ: ابوبکر! جو ابھی ہم نے کھانا کھایا ہے، قیامت کے میدان میں ان میں سے ایک ایک چیز کا ہمیں جواب دینا ہے؛ اس لئے رورہا ہوں۔ (ترمذی: ۶۲/۲)

ہمارا حال تو یہ ہے کہ صبح کھارہے ہیں، شام کھارہے ہیں، تین تین وقت کھارہے ہیں، اس کے علاوہ بھی کبھی لسی، کبھی چائے، اس کے باوجود ہمارے دلوں میں اللہ کا کوئی خوف نہیں ہے، جب اللہ کے نبی رورو کر یہ آخری جملہ ادا کررہے تھے تو سب کے دل میں عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔

اس لئے بھائیو! نبی کے جیسا دل بناؤ، اللہ کا خوف دل میں پیدا کرو اور اللہ کی محبت دل میں پیدا کرو، واقعات تو بہت ہیں، لیکن ایک (point) جو اس وقت میں نے اٹھایا ہے، میں ضروری سمجھتا ہوں کہ کم از کم اس نکتہ پر مجھے اور آپ کو اچھی طرح غور وخوض کر کے اس کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لینا چاہئے کہ ہمارا دل تو محمد ﷺ جیسا بن جائے، آج وہی فکر وہی خوف ہمارے اندر پیدا ہو تو انشاء اللہ ہماری پوری زندگی میں تبدیلی پیدا ہو جائیگی، اس لئے کہ اصل تو دل ہی ہے، تمام اعضاء جو بنتے ہیں وہ دل ہی سے بنتے ہیں۔

آپ کے دل میں تعلق مع اللہ کی کیفیت

اسی طرح ایک اور بات سن لیجئے، جو بہت اہم ہے کہ آپ ﷺ کے دل میں اللہ سے تعلق کی جو کیفیت تھی، وہ بے مثال و بے نظیر تھی۔ یہ بھی ایک چیز ہے جس کو ہمیں اپنے نبی کے اسوہ سے لینا اور سیکھنا ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اللہ کے نبی گھر میں آتے تھے تو گھر کے کام کاج کرتے تھے اور جیسے ہی اذان ہوتی یا نماز کا وقت ہوتا تو نماز کے لئے نکل جاتے۔
(بخاری:۶۷۶، ترمذی:۲۴۸۹، الادب المفرد:۱/۲۱۵)

مطلب یہ ہوا کہ آپ علیہ السلام کا معمول تھا کہ گھر میں کام کاج میں شریک ہوتے، اور ازواج مطہرات کے ساتھ ہنسی مذاق بھی فرماتے تھے، اور جیسے ہی اذان کی آواز آتی تھی تو پھر آپ سب کام چھوڑ کر نماز کی طرف اور اللہ کی جانب متوجہ ہو جاتے تھے۔ ملا علی قاری نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ:" ترك جميع عمله ، و كأنه لم يعرف أحدا من أهله " کہ آپ سب کاموں کو چھوڑ دیتے گویا کہ آپ اپنے اہل میں سے کسی کو جانتے پہچانتے ہی نہیں۔ (مرقاۃ:۱۰/۴۸۷)

حالانکہ آپ کا گھر میں ایک معمول یہ بھی تھا کہ آپ اپنی ازواج کے ساتھ ہنسی مزاح بھی کیا کرتے تھے۔

جیسے حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ حضرت عائشہؓ کے مکان میں تھے، انھوں نے حضور ﷺ کے لئے حریرہ گھر میں تیار کیا، اور لے آئیں، کہنے لگیں : اے اللہ کے نبی! میں نے یہ آپ کے لئے تیار کیا ہے، اس کو کھایئے، یہاں حضرت سودہ بھی حاضر تھیں، حضرت عائشہؓ نے ان سے کہا: تم بھی کھاؤ، لیکن حضرت سودہ نے فرمایا کہ میں تو نہیں کھاؤنگی، وہ روٹھ گئیں، لیکن حضرت عائشہ نے اصرار کیا کہ تمہیں کھانا پڑیگا، یہ اصرار وانکار اتنا بڑھتا گیا کہ دونوں کے درمیان میں بات ذرا آگے بڑھ گئی، حضرت عائشہ نے کہا کہ : اگر تم اسے نہیں کھاؤ گی تو میں یہ کھانا تمہارے منھ پر مل دونگی، یعنی ایک مذاق اور تفریح کا موقعہ تھا۔

چنانچہ انہوں نے حریرہ میں ہاتھ ڈالکر ان کے منھ پر مل دیا، حضور ﷺ بازو بیٹھے ہوئے ہنس رہے تھے، مسکراہٹ آپ کے چہرے پر کھیل رہی تھی، جب حضرت سودہؓ کو دیکھا کہ ان کا پورا چہرہ کھانے سے ملوث ہوگیا ہے تو حضور ﷺ نے ان سے فرمایا کہ عائشہ نے تمہارے منھ پر یہ لگایا ہے، اب میں ان کے ہاتھ پکڑ لیتا ہوں تم ان کے منھ پر یہ مل دو۔ چنانچہ حضرت عائشہ کے ہاتھوں کو حضور ﷺ نے پکڑ لیا تو حضرت سودہ نے حریرہ اٹھا کر ان کے منھ پر مل دیا اور پھر ایک ہنسی کا موقعہ فراہم ہوگیا۔ (حیاۃ الصحابہ: ۲/۷۹۹)

یہ تھا حضور ﷺ کے گھر کا ماحول بیویوں کے ساتھ، اور اسی کے ساتھ جب اللہ کی طرف سے بلاوا آجاتا تو نماز و ذکر کی جانب توجہ کا یہ عالم جو آپ نے سنا، یہ ہے خدا کی محبت، ایک طرف بیویوں کا حق بھی ادا کر رہے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ جب اللہ کا پیغام آتا تھا تو حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اب ہمارے سے حضور ﷺ کو کوئی تعلق

نہیں، یہ اللہ کی محبت ہے جو نبی ﷺ کے سینے میں موجود تھی۔

دل کو گندگیوں سے پاک کرو، ایک واقعہ

الغرض دل تو اللہ نے اسی لئے بنایا ہے کہ اس میں اللہ کی محبت پیدا کی جائے اور ہمارے دلوں کو آپ ﷺ کے دل جیسا بنایا جائے، دل میں محبت الٰہی کی جگہ کوئی اور چیز آجائے تو اللہ کبھی اسے برداشت نہیں کریں گے، مجھے ایک بات یاد آگئی، میں نے چند دن پہلے اپنے دوستوں کو سنایا تھا، غالباً دو یا تین ہفتے پہلے مجھ سے فون پر کچھ لوگوں نے رابطہ کیا اور کہا کہ یہاں ایک مکان ہے اور ایک بھائی بہن اس مکان میں رہتے ہیں، اس کے اندر غلاظتیں ہی غلاظتیں جمع ہیں، ہم محلے کے کچھ لوگ مل کر اس مکان کے اندر سے وہ گندگیاں اور غلاظتیں باہر نکال کر پھینک دینا چاہتے ہیں، تو کیا شرعاً ہم کو اس کی اجازت ہے؟ مسئلہ پوچھ رہے تھے۔

میں نے جواب دینے سے پہلے ان سے تفصیل پوچھی، کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟ تاکہ تفصیل مجھے معلوم ہوجائے، تو انہوں نے جو تفصیل بتائی تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے، انہوں نے کہا کہ ایک صاحب ہیں جو پہلے Education Department میں بڑے آفیسر تھے، بعد میں ان کا دماغ خراب ہوگیا، بچے اور بیوی سب ان کو چھوڑ کر چلے گئے، ان کی ایک بہن ہے، اس کا بیماریوں میں عجیب وغریب برا حال ہے، نہ اٹھ سکتی ہے، نہ کچھ کام کرسکتی ہے، نہ کچھ بول سکتی ہے، اپنے بیڈ پر پڑی ہوئی ہے، پیشاب وہیں، پاخانہ وہیں، کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں، بھائی کا حال یہ ہے کہ دماغ خراب ہونے کی وجہ سے راستہ چلتے ہوئے راستے میں جتنی گندگیاں اور غلاظتیں ہوتی ہیں وہ چن چن کر لاتا اور اپنے گھر میں جماتا ہے،

کاغذ پڑا ہے، وہ لا کر گھر میں ڈال رہا ہے، کوئی اخبار پڑا ہوا ہے، اسے اٹھا کر لا رہا ہے، کوئی لوہے کی چیز ملی اسے اٹھا کر گھر میں ڈال رہا ہے، کوئی پتھر ملا اسے اٹھا کر گھر میں ڈال رہا ہے، غرض یہ کہ چلتے پھرتے ہزاروں قسم کی اچھی بری چیزیں ملتی ہیں، دماغ خراب ہونے کی وجہ سے گھر میں لا لا کر ڈالتا چلا جا رہا ہے، یہاں تک کہ جو اس کا پلنگ ہے، پلنگ پر بھی یہی سب کچھ رکھا ہوا ہے، وہ خود تو نیچے سوتا ہے، اور پلنگ کے اوپر یہ سب جمع کرتا ہے، اور پھر یہ چیزیں رکھے رکھے کبھی پانی پڑ گیا یا کچھ اور ہو گیا، اور وہ چیزیں خراب ہونے لگیں، سڑنے لگیں، اس طرح پورے گھر میں سوائے غلاظت، گندگی اور بدبو کے اور کچھ نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم اس گھر کو خالی کرنا چاہتے ہیں، مگر ان صاحب کی اجازت نہیں ہے۔ اور وہ صاحب اسے خالی کرنے کیلئے تیار نہیں، اور وہ بہت مزاحمت کر رہے ہیں کہ تم لوگ ہمارے گھر میں کیوں آئے ہو؟ اور کیوں ان چیزوں کو نکال رہے ہو، یہ میری چیزیں ہیں، یہ اخبار مجھے کام آئیگا، پچیس سال پہلے کا اخبار بھی پڑا ہے، بیس سال پہلے کا بھی اخبار پڑا ہے، اور وہ اسے پھینکنے کے لئے تیار نہیں۔

میں نے کہا کہ جب یہ صورت حال ہے اور آپ لوگ ان کے گھر کو خالی کرنا چاہتے ہیں، اور اس کا مقصد دراصل ان کے گھر کو پاک کرنا ہے اور بیکار و بے ہودہ چیزوں سے خالی کرنا ہے تو یہ شرعاً جائز ہے، اس لئے کہ نکالنے کی چیز کو نکالنا تو گناہ نہیں ہے، کسی کے گھر کو صاف کرنا کوئی جرم نہیں، یہ الگ بات ہے کہ وہ صاحب اپنی بے وقوفی کی وجہ سے اس کو سمجھیں کہ یہ غلط کام ہے۔

بھائیو! بزرگو! مجھے اس واقعہ سے بتانا کیا ہے؟ یہ بتانا ہے کہ جیسے ایک اچھے گھر میں اچھی چیزیں رکھنے کے بجائے گندگی، غلاظت کوئی جمع کرتا ہے، تو دنیا کا کوئی انسان اسے برداشت نہیں کرتا بلکہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کے دماغ کے اندر خرابی

ہے اور واقعی خرابی بھی ہوتی ہے، اسی طرح جو اپنے دل کے محل کو خدا کی محبت سے سجانے کے بجائے دنیا کی غلاظتوں سے ملوث کر لیتا ہے تو آپ بتائیے کہ اس کے بارے میں کیا کہا جائے، ہمارے نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے اندر ہم کو یہی درس دیا گیا ہے کہ اس دل کو کیسے سجائیں؟ پاک کریں؟

نجس دل میں اللہ کی تجلی نہیں ہوتی

یاد رکھو کہ دل کی خرابی بہت بڑی خرابی ہے، اس لئے وہاں گندگی ڈالنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، کیا اپنی آفس روم میں کوئی گندگی غلاظت ڈالے گا؟ جہاں سارے لوگ آتے جاتے ہوں، میل ملاقات وہیں ہوتی ہو، صوفہ رکھا ہوا ہو، فرنیچر ہو، ٹیبل رکھا ہوا ہو، ان کے اوپر چار پانچ جگہ گندگی اور غلاظت ڈال دی جائے۔ سوچو کہ کون آئیگا؟ آپ کے آفس میں یا ایسے گھر میں؟

اسی طرح اس گھر (دل) میں جس کے اندر گندگیاں اور غلاظتیں ڈالدی گئی ہوں، وہاں خدا کیسے آسکتا ہے؟ نجس دل میں کبھی اللہ کی تجلی نہیں آتی، جس میں اخلاقی واعتقادی، نظریاتی و دیگر رذائل وخبائث ہوں۔ آج یہی ہمارا روگ ہے، سب سے بڑی مصیبت ہے، سب سے بڑا المیہ ہے، کہ ہم نے محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی اور آپ کے اسوۂ حسنہ سے دل کے بنانے کا فن نہیں سیکھا، دل کو سجانے کا فن نہیں سیکھا۔

دنیا والوں سے عبرت لیجئے

بھائیو! ہمیں اس سلسلہ میں دنیا والوں سے عبرت لینا چاہئے، آج دنیا ترقی کرتے کرتے کہاں سے کہاں پہونچ رہی ہے، وہ ترقی کرتے کرتے اپنے گھروں کو سجانے کے لئے کیا کیا انداز اختیار کر رہی ہے، ہر کام کے لئے الگ الگ آدمی

موجود ہیں، مختلف قسم کے ڈیزائن ہوتے ہیں، اندرونی کام (Interior)، اور باہری کام (Exterior)، اور ہر ایک کے لئے الگ الگ اشخاص ہوتے ہیں (Interior) کام کی مخلوق الگ، وہ لوگ صرف اندرون خانہ کام کرتے ہیں، ان کا کام باہر کا نہیں، اور (Exterior) کام والے باہر کا کام کرتے ہیں، یہ لوگ اندر کا کام نہیں کرتے، صوفے والے ٹیبل کا کام نہیں کرتے، ٹیبل والے صوفے کا کام نہیں کرتے، کارپیٹ بچھانے والے چھت پر ڈیزائننگ کا کام نہیں کرتے، ہر ایک کے لئے الگ الگ قسم کے لوگ ہیں، اور ہر ایک اپنے فن کا فنکار ہے، اور ہر ایک اپنا فن دکھا رہا ہے اور لوگ ہر ایک سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے گھروں کو، اپنی آفسوں کو سجا رہے ہیں کہ ہمارا گھر ایسا ہونا چاہئے، ہماری آفس ایسی ہونی چاہئے، ہمارا دکان ایسا ہونا چاہیے، لیکن افسوس یہ ہے کہ اگر سجاوٹ نہیں ہو رہی ہے تو اس دل کے گھر کی نہیں ہو رہی ہے، جو خالق کائنات اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے بنایا ہے، کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے؟ ہمارے رہنے کے مکانات تو اتنے عالیشان ہوں، اور اللہ کا مکان ''دل'' اتنا گھٹیا اور اتنا گندا ہو کہ مت پوچھو، ساری غلاظتیں اس میں، حسد اس میں، کینہ اس میں، تکبر اس میں، بغض اس میں، مردار دنیا کی محبت اس میں، بے حساب گندگیاں اس میں۔

مرشدی شاہ ابرار الحق صاحب کا ایک مقولہ

حضرت مرشدی مولانا شاہ ابرار الحق صاحب نور اللہ مرقدہ، بار بار ایک جملہ ارشاد فرمایا کرتے تھے، وہ جملہ یاد آ گیا، حضرت وہ جملہ قرآن و اذان و نماز کے بارے میں فرمایا کرتے تھے، کہتے تھے کہ ''قرآن آج لوگوں کا بڑھیا نہیں ہے، اذان بڑھیا نہیں ہے''، اور کہتے تھے ''کھانا بڑھیا، پانی بڑھیا، مکان بڑھیا، دکان بڑھیا، حتی

کہ پان بھی بڑھیا لیکن قرآن بڑھیا نہیں''، یہ جملہ ہے حضرت کا۔

میں کہتا ہوں کہ اسی طرح دنیا بھر کے دکان، دنیا بھر کے مکان سب عالیشان، ان کے اندر و باہر تمام سجاوٹوں کا ہم اہتمام کرتے ہیں، لیکن خدا کے دل کو بسانے اور سجانے کا کوئی اہتمام نہیں، محمد ﷺ کی سیرت میں دل کو سجانے کا بہت زیادہ اہتمام ہے، یہ فن وہاں سے سیکھنا ہے، اس کو آپ سجائیں کیسے؟ اس کو سجانے کے لئے کیا کرنا پڑیگا؟ اللہ کا ذکر، اللہ کے ذکر سے اللہ کے دل کی سجاوٹ ہوتی ہے، سبحان اللہ پڑھیں، الحمدللہ پڑھیں، اللہ اکبر پڑھیں، لا الہ الا اللہ پڑھیں، اور ذکر واذکار کریں، قرآن پاک کی تلاوت کریں، تو جوں جوں آپ قرآن پاک کی تلاوت اور ذکر واذکار کرتے جائیں گے تو اس اللہ کے گھر میں بیل بوٹے لگتے چلے جائیں گے، سبحان اللہ سے ایک پھول نکلے گا، الحمدللہ سے ایک پھول نکلے گا۔

ذکر اللہ سے معرفت ومحبت کا عکس دل پر پڑیگا، ایک واقعہ

جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں، اللہ ان کے دل میں بسیرا کرتا ہے، کیسا بسیرا، ایک عجیب وغریب واقعہ سنئے، آپ نے مہدوی فرقہ کا نام سنا ہوگا، اس فرقہ کے بارے میں تمام علماء کا کہنا ہے کہ یہ گمراہ فرقہ ہے، اور کافر ہے۔ اب رہی اس کی تفصیلات تو اس وقت کہنا نہیں ہے، اس فرقے کے جو بانی تھے، وہ بانی بنالئے گئے ہیں، وہ خود شاید بانی نہ ہوں، لوگوں نے ان کو بانی قرار دے لیا ہے، بہرحال یہ لوگ ان کو مانتے ہیں، ان کا نام ہے ''محمد جونپوری'' جونپور (یو، پی) کے رہنے والے تھے، ان کے بارے میں مورخین کی رائے مختلف ہے، بعض کہتے ہیں کہ یہ غلط قسم کے آدمی تھے، لوگوں کو ایک گمراہی پر ڈال گئے، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ صوفی منش آدمی تھے، اللہ

والے تھے، بہ ہر حال وہ جیسے بھی تھے، اس وقت اس کی بھی بحث نہیں ہے، البتہ ان کا ایک واقعہ سنانا ہے، وہ یہ کہ انہوں نے اپنے کچھ لوگوں کے ساتھ غیروں سے جہاد کرنا شروع کیا، مختلف جگہ ان کی فوجیں جاتی تھیں، اور جہاد کرتی تھیں، تاریخ میں یہ واقعہ لکھا ہوا ہے کہ ایک جگہ راجا دلیپ راؤ اور راجا کی فوج سے ان کی مڈبھیڑ ہوئی اور آپس میں دونوں کا مقابلہ ہوا اور اس مقابلہ میں سید جونپوری نے بادشاہ کے اوپر حملہ کیا، وار کاری تھا، راجا گرا اور گر کر مر گیا، یہاں تک کہ اس کا سینہ پھٹ کر دل باہر نکل آیا، جب اس کا دل نکل کر باہر آ گیا، تو لوگوں نے ایک عجیب وغریب بات یہ دیکھی کہ اس کے دل کے اوپر اس مورتی کی تصویر تھی جس کی وہ پوجا کیا کرتا تھا، اس طرح جیسے چھپی ہوئی تصویر ہوتی ہو، اس کا کیا مطلب ہوا؟ مطلب یہ کہ جب وہ کافر بادشاہ پورے دھیان وتوجہ کے ساتھ اپنی مورتی کی پوجا کرتا تھا، تو دل نے اس کا عکس قبول کر لیا۔

بھائیو! ذرا سوچو کہ جو خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگا تو کیا خدا تعالیٰ کی معرفت ومحبت کا عکس اس کے دل پر نہیں آئیگا، کیوں نہیں؟ ایک عربی شاعر نے کہا ہے:

لِيْ حَبِيْبٌ خَيَالُهٗ نُصْبَ عَيْنِيْ

وَ اسْمُهٗ فِيْ ضَمَائِرِيْ مَكْنُوْنٗ

اِنْ تَذَكَّرْتُهٗ فَكُلِّيْ قُلُوْبٌ

وَ اِنْ تَأَمَّلْتُهٗ فَكُلِّيْ عُيُوْنٗ

یعنی میرا ایک محبوب ومعشوق ہے جس کا تصور وخیال ہمیشہ میری آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے، اور اس کا نام میرے ضمیر میں پوشیدہ ہے، اگر میں اس کو یاد کرتا ہوں تو میں سراپا دل ہو جاتا ہوں اور اگر میں اس کو دیکھتا ہوں تو سراپا آنکھ بن جاتا ہوں۔

لہٰذا اللہ کو، اللہ کی محبت کو اپنے دل میں بسانے کے لئے ضروری ہے کہ اللہ کا ذکر کرو، اس کی طرف دھیان لگاؤ، اس کی طرف محبت کے ساتھ متوجہ ہو جاؤ، جب یہ کام کریں گے تو انشاء اللہ! یہ دل محمد ﷺ کی سیرت کے مطابق اور آپ ﷺ کے اسوہ کے مطابق اللہ کا واقعی مسکن بنے گا اور اس مسکن میں خدا کی محبت رہے گی، پلے گی، پھلے گی، پھولے گی۔

حضرت نبی ﷺ کی آنکھ بھی اسوہ ہے

اسی طرح ہمارے نبی ﷺ کی آنکھیں بھی ہمارے لئے اسوہ ونمونہ ہیں۔ کس طرح؟ اس طرح کہ ہم یہ دیکھیں کہ آپ کی آنکھیں کہاں اور کس طرح استعمال ہوتی تھیں؟ آپ راستوں میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے نہیں چلتے تھے، بلکہ نگاہیں آپ کی نیچے کی جانب ہوتی تھیں۔ (طبقات ابن سعد: ۱/۳۷۹، سبل الھدی والرشاد: ۸/ ۱۵۹)

آپ کسی حرام و ناجائز چیز کو نہیں دیکھتے تھے، کسی نامحرم پر نگاہ نہیں اٹھاتے تھے۔ نیز آپ کی آنکھیں اللہ کی محبت یا خوف سے روتی تھیں۔ ایک بار سورج گرہن ہو گیا تو آپ نے نماز کسوف پڑھائی اور لمبا لمبا رکوع اور لمبا لمبا سجدہ کیا، اور سجدہ میں روتے روتے کہتے جا رہے تھے: "ألم تعدني أن لا تعذبهم و أنا فيهم" (اے اللہ! کیا آپ نے مجھ سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ میں جب تک ان لوگوں میں موجود ہوں آپ ان کو عذاب نہیں دیں گے) یہ کہتے جاتے اور روتے جاتے تھے۔ (شمائل ترمذی: حدیث: ۳۱۵)

ایک بار حضرت ابن مسعودؓ سے فرمایا کہ تم مجھے قرآن سناؤ، انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا میں آپ کو قرآن سناؤں جبکہ قرآن آپ پر نازل ہوا ہے؟ آپ

نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ کسی اور سے قرآن سنوں۔ حضرت ابن مسعود نے قرآن پڑھنا شروع کیا اور سورہ نساء پڑھی۔ وہ کہتے ہیں کہ جب میں نے آپ کو دیکھا تو: ''رأیت عینی رسول اللّٰه تهملان ''(دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کی آنکھیں بہہ رہی ہیں)(شمائل:۳۱۴)

ساری چمک دمک تو انہی موتیوں سے ہے
آنسو نہ ہوں تو عشق میں کچھ آبرو نہیں

ہر چیز پر عبرت کے لئے نگاہ ڈالتے تھے،فضول و بے کار کسی چیز کو دیکھتے نہیں تھے۔ یہ ہے اللہ کے نبی ﷺ کی آنکھوں کو اسوہ بنانا،لہذا اس کے مطابق اپنی آنکھوں کو بنانا چاہئے۔

زبان نبوی اور اسوۂ حسنہ

اسی طرح مثال کے طور پر زبان کو لیجئے کہ اللہ کے نبی ﷺ کی زبان کہاں اور کس طرح استعمال ہوتی تھی؟ آپ نہ اس کو گالی بکنے میں استعمال کرتے تھے،نہ کسی بری بات میں استعمال کرتے تھے،نہ کسی کو اس سے ذیت پہنچاتے تھے، بلکہ یہ زبان یا تو اللہ کا کلام پڑھنے میں یا ذکر اللہ میں یا کسی کو اچھے امور کی تعلیم و تبلیغ میں،وعظ ونصیحت میں استعمال ہوتی تھی،لہذا ہمیں بھی اپنی اپنی زبان کا استعمال صحیح طریقہ کے مطابق اسوۂ حسنہ کی روشنی میں کرنا چاہئے۔

الغرض یہ چند مثالیں اور اشارے ہیں،ان سے اندازہ ہو جائے گا کہ اللہ کے نبی ﷺ کو ہمیں کس طرح اسوۂ حسنہ بنانا ہے۔ ہر ہر بات میں آپ کو نمونہ بنانا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں بھی عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العالمین

معرفت الٰہی اور اس کے آثار

باسمہ تعالی

معرفت الٰہی اور اس کے آثار

الحمدللّٰہ و کفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ، امابعد

فاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم ، بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (الذریٰت:۵۶)

محترم حضرات !

اللہ تعالی نے دنیا میں انسان کو بھی پیدا کیا اور دیگر مخلوقات کو بھی پیدا کیا، مگر علما نے لکھا ہے کہ انسان کے پیدا کرنے اور دیگر مخلوقات کے پیدا کرنے میں ایک بڑا فرق ہے، وہ یہ کہ انسان کی تخلیق کا مقصد اللہ تعالی کی معرفت ہے، اور دیگر مخلوقات کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اللہ کی معرفت کا انسان کے لئے ذریعہ بنیں، زمین اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہے، آسمان اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہے، چاند وسورج اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہیں، درخت کو اللہ نے اس لئے نہیں پیدا کیا ہے کہ درخت کو اللہ کی معرفت ہو، اور نہ جانوروں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ جانور اللہ کے عارف بندے بن جائیں، عارف تو بنے گا وہ بندہ جس کو انسان کہتے ہیں، اسی لئے زمین کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اللہ کی عارف ہے، آسمان کو اللہ کا عارف نہیں کہہ سکتے، شجر وحجر کو اللہ کا عارف نہیں کہہ سکتے، چرند پرند کو اللہ کا عارف نہیں کہہ سکتے، ان کو معرفت

نصیب نہیں ہے، معرفت اللہ تعالیٰ نے صرف انسان اور جنات کو عطاء کی ہے۔

قرآن کریم کی جو آیت میں نے تلاوت کی ہے، اس میں اسی طرف اشارہ ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (میں نے جنات اور انسانوں کو صرف میری عبادت کے لئے پیدا کیا ہے) (الذاریت:۵۶)

حضرت ابن عباس و حضرت مجاهد کی تفسیر

حضرت ابن عباسؓ اور ان کے شاگرد حضرت مجاہدؒ نے " لیعبدون " کی تفسیر " لیعرفون " سے کی ہے، یعنی عبادت سے مراد یہاں اللہ کی معرفت اور پہچان ہے۔ چنانچہ علامہ آلوسی نے "سبحان الذی أسری الخ" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ: ابن عباس نے آیت: "وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون" کی تفسیر "الا لیعرفون" سے کی ہے۔ (روح المعانی:۱۵/۱۵)

اور حضرت مجاہد سے یہ تفسیر متعدد حضرات مفسرین نے نقل کی ہے، جیسے امام ابوحیان نے البحر المحیط میں، علامہ آلوسی نے روح المعانی میں، ابن عادل نے اللباب میں اس کا ذکر کیا ہے۔ (البحر المحیط :۱۰۹/۸، روح المعانی:۱۵/۱۵، اللباب: ۴۶۸۰/۱)

الغرض یہاں اللہ تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ بندے میری معرفت حاصل کریں، اس لئے انسان و جنات کو پیدا فرمایا گیا۔

معرفت کو عبادت سے تعبیر کرنے میں حکمت

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "لیعبدون "کیوں فرمایا جبکہ مقصود

"لیعرفون "ہے؟ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ اللہ کی معرفت کا ذریعہ عبادت ہے،اگر اللہ کی معرفت پیدا کرنا ہےتو اس کا وسیلہ اور ذریعہ ہی اللہ کی عبادت ہے، لہذا اللہ کی عبادت کے بغیر اگر کوئی معرفت کا دعوی کرتا ہےتو وہ جھوٹا ہے،اس کی جانب اشارہ کرنے کے لئے معرفت کوعبادت سے تعبیر فرمایا گیا۔

اس میں ان جیسے لوگوں کا رد ہو گیا جو آج کل معرفت خداوندی کا دعوی کرتے ہیں،لیکن عبادت خداوندی سے عاری وخالی ہوتے ہیں،نہ نماز ہے،نہ روزہ ہے،نہ زکوۃ ہے،نہ سنت کی پابندی ہے،نہ ذکر ہے،نہ تسبیح ہے،دن رات اللہ کی نافرمانی ہے،پھر بھی معرفت کا دعوی ہے،نماز وہ نہیں پڑھیں گے،کہیں گے کہ ہم دل کی نماز پڑھتے ہیں،ذکر وہ نہیں کریں گے،کہیں گے کہ ہمارا دل ہر وقت ذاکر وشاغل رہتا ہے،زکوۃ وہ نہیں دیں گے،کہیں گے کہ زکوۃ سے مراد طہارت ہے،وہ ہمیں حاصل ہے،اس طرح تمام عبادات اور شرعی احکامات کے اندر تاویل کی راہ اختیار کرتے ہیں،اور گمراہی میں پھنس جاتے ہیں۔اس لئے اللہ تعالی جوعلام الغیوب ہیں، جسے ساری کائنات کا علم ہے،اسے یہ بھی معلوم ہے کہ لوگ کیسی کیسی تاویلیں کریں گے، اس لئے قرآن میں خود ان کا علاج ذکر کر دیا کہ اگر تم بغیر عبادت کے معرفت خداوندی کا دعوی کرتے ہوتو تم جھوٹے ہو۔

اسی لئے اللہ تعالی نے رسول اللہ ﷺ کو دنیا میں بھیجا،آپ دنیا میں سب سے بڑے عارف،سب سے زیادہ اللہ کو پہچاننے والے،اللہ کے نبی نے خود ہی فرمایا ہے :"ان أتقاکم و أعلمکم باللّٰہ أنا "کہ تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اللہ کی معرفت رکھنے والا میں ہوں۔(بخاری:حدیث:۲۰)

اس کی وجہ یہی ہے کہ آپ سب سے بڑے عارف باللہ تھے،اللہ تعالی نے معرفت سمجھانے آپ کو مبعوث فرمایا،آپ سے اعمال کروائے،عبادات:نماز،روزہ

زکاۃ، حج وقربانی، ذکر واذکار وغیرہ کراوئے تاکہ دنیا والوں کو بتائیں کہ یہی راستہ ہے، جس پر چل کر اللہ کی معرفت نصیب ہوتی ہے۔

معرفت کی حقیقت

اب یہ سنئے کہ معرفت کسے کہتے ہیں؟ معرفت عربی کا لفظ ہے، لغت میں اس کے معنی ہیں ''جاننا پہچاننا''، شریعت وتصوف کی راہ میں معرفت سے مراد یہ ہے کہ اللہ کو اس طرح جانا جائے پہچانا جائے کہ اس جاننے پہچاننے کے آثار اپنی ذات پر ظاہر ہونے لگیں۔ اللہ نے انسان کو اسی لئے پیدا کیا ہے۔

لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ ہم اللہ کی ذات کو جان نہیں سکتے تو پھر اللہ کو جاننے کا کیا مطلب ہے؟ جواب یہ ہے کہ اللہ کو جاننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی صفات کو جانا جائے، دوسرے اللہ تعالی کے افعال کو جانا جائے، تیسرے اللہ تعالی کے شئون کو جانا جائے، اللہ تعالی نے قرآن کریم میں اپنے افعال، اپنی صفات، اپنے شئون جگہ جگہ بیان فرمائے ہیں، انسان جب ان چیزوں کو جان لیتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس کو اللہ کی پہچان حاصل ہے، اسے معرفت کی دولت مل گئی ہے۔

ذات خداوندی کی معرفت محال ہے

ابھی میں نے جو عرض کیا کہ اللہ کی ذات کو ہم نہیں جان سکتے، تو واقعی بات یہی ہے؛ اس لئے اللہ کی ذت کو جاننے کی کوشش نہ کرے، اس لئے کہ ذات کو جاننے کی کوشش کرے گا تو ناکام ہو جائے گا، کیونکہ اللہ کی ذات کو کوئی نہیں جان سکتا، ذات کو جاننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کیسے ہیں ذات کے اعتبار سے، جیسے انسان کی حقیقت ذات کے اعتبار سے یہ ہے کہ وہ مٹی سے بنایا گیا ہے، اس کے اعضاء اتنے ہیں، ان کے فلاں فلاں کام ہیں، اسی طرح دیگر مخلوقات کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ

کس چیز سے بنے ہیں، ان سب چیزوں کی پہچان ان کے مادہ سے ہوتی ہے، لیکن اگر کوئی چاہے کہ مخلوقات کی طرح اللہ کی ذات کو جانوں تو یہ ناممکن بات ہے، اس لئے کہ اللہ کی ذات انسان کی عقل سے ماوراء ہے، انسان کی عقل نہ وہاں پہونچ سکتی ہے، نا اس دنیا میں اس کی آنکھ اسے دیکھ سکتی ہے۔

اسی لئے اللہ تعالی نے قرآن کریم میں فرمایا:

﴿لَاتُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ﴾ (اس کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں) (الأنعام:۱۰۴)

اورحدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے: " تفکروا فی خلق اللّٰہ لا تتفکروا فی اللّٰہ "(اللہ کی مخلوق میں غور وفکر کرو، اللہ کی ذات میں غور وفکر نہ کرو) (جامع الاحادیث:۱۰۹۰۱)

اسی لئے جب حضرت موسی علیہ السلام اللہ کی طرف سے فرعون کے پاس بھیجے گئے اور آپ نے فرعون سے کہا کہ میں رب العالمین کی طرف سے رسول بن کر آیا ہوں تو فرعون نے کہا: ﴿وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (رب العالمین کیا چیز ہے) (الشعراء:۲۵)

یعنی ذات کے بارے میں پوچھ لیا۔ حضرت موسی سمجھ گئے کہ اسے معرفت کی ''الف ب'' بھی معلوم نہیں ہے، حالانکہ معرفت کی ''الف ب'' سے تو کوئی کافر بھی خالی نہیں۔

قرآن کریم میں ہے کہ جب کفار کی کشتی بھنور میں پھنس جاتی ہے، طوفان کی زد میں آجاتی ہے، تو اس وقت وہ لوگ بھی اللہ ہی کو پکارتے ہیں، اپنے بتوں کو بھول جاتے ہیں، کیا مطلب ہوا؟ مطلب یہ ہوا کہ اللہ نے اپنی پہچان کافر کو بھی عطاء کی ہے، لیکن فرعون ملعون اتنا نابلد و بے وقوف تھا کہ اسے بالکل اللہ کی پہچان نہیں تھی جس کی وجہ سے ایسا غلط سوال کیا کہ رب العالمین کیا چیز ہے؟ حالانکہ پوچھنا چاہئے

کہ ''رب العالمین'' کون ہے؟ جیسے آپ سے آکر کوئی پوچھے کہ آپ کیا چیز ہیں؟ تو آپ ہنسیں گے، یہ پوچھنا چاہئے کہ آپ کون ہیں؟

الغرض حضرت موسیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا: ﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ﴾ (وہ آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی سب چیزوں کا رب ہے اگر تم یقین مانو) [الشعراء: ۲۴]

اور فرمایا: ﴿رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَائِكُمُ الْأَوَّلِيْنَ﴾ (اللہ وہ ہے جو زمین اور آسمان کا رب ہے، تمہارا اور تمہارے آباء واجداد کا رب ہے) [الشعراء: ۲٦]

اور فرمایا: ﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَ مَابَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ (وہ مشرق و مغرب اور ان کے درمیان کی چیزوں کا پروردگار ہے، اگر تم سمجھو) [الشعراء: ۲۸]

یعنی اللہ کی صفات کو بیان فرمایا، اللہ کی ذات کو بیان نہیں کیا، اس سے بھی معلوم ہوا کہ اللہ کی ذات کو کوئی جان نہیں سکتا۔ لہذا معرفت کا حاصل یہ ہوا کہ اللہ کی صفات و افعال کے بارے میں قرآن و حدیث اور انفس و آفاق میں پھیلے ہوئے دلائل میں غور و فکر کرتے ہوئے اس کی پہچان پیدا کرنا۔

جھوٹے مدعیانِ معرفت کی بے راہ روی

بعض لوگ اس لفظ معرفت کو بالکل غلط استعمال کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ایک شریعت والے ہیں، ایک معرفت والے ہیں، ان سے پوچھا جائے کہ معرفت کیا ہے؟ تو کہتے ہیں یہ کان میں کہی جانے والی بات ہے، سب کو نہیں بتائی جائیگی۔ اللہ تو معرفت کو قرآن میں کھلے عام بیان کر رہا ہے، احادیث میں ہمارے آقا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے کھلے عام بیان فرمایا ہے، تو یہ کون ہوتے ہیں جو یہ کہیں

کہ معرفت عام نہیں ہے، اللہ نے تو اس لئے عام کر دیا تا کہ جو بندہ چاہے آسانی سے حاصل کر سکے اور جو لوگ معرفت کو خاص کرتے ہیں، ان سے ہوتا کچھ نہیں صرف دعوے کرتے ہیں۔

ہر ضروری چیز کو اللہ نے عام رکھا ہے

دنیا میں اللہ تعالی کا ایک اصول یہ ہے کہ انسان کو جس چیز کی جس قدر زیادہ ضرورت ہے، اللہ نے اسے اسی قدر عام کیا ہے، اور قیمتی بھی نہیں بنایا۔ مثلاً انسان کو کھانے کی زیادہ ضرورت تھی، اللہ نے اسے ہر جگہ عام کیا، دکان میں ملے گا، بازار میں ملے گا، ہر جگہ ملے گا۔ اسی طرح انسان کو پانی کی ضرورت کھانے سے بھی زیادہ ہوتی ہے؛ اس لئے اللہ تعالی نے پانی کو کھانے سے بھی زیادہ عام کیا ہے، اور اللہ نے ہر جگہ مفت رکھا ہے، ہم جو پانی کی بل دیتے ہیں وہ اللہ کو نہیں دیتے بلکہ پانی پہنچانے کا انتظام کرنے والوں کو دیتے ہیں، گورنمنٹ کو دیتے ہیں، اس لئے کہ انہوں نے اس اللہ کے پانی کو گھر گھر پہنچایا تو ہم ان کو سروس چارج دیتے ہیں، یہ پانی کا چارج نہیں ہے، پانی کا سروس چارج ہے، پانی کا چارج کون دے سکتا ہے؟ اگر اللہ تعالی پانی کا بل (bill) مانگنے لگیں تو آپ کسی بِل میں گھس جائیں گے، پانی کا بل نہیں دے سکیں گے، اور پانی سے زیادہ ضرورت انسان کو ہوا کی ہوتی ہے، اس لئے اللہ تعالی نے ہوا کو اتنا عام کیا ہے کہ آپ جہاں میں جہاں بھی جائیں گے وہیں ہوا آپ کا استقبال کرے گی، اس کا بھی کوئی بل کسی طور پر بھی نہیں لگتا، ایک انسان چوبیس گھنٹوں میں چوبیس ہزار دفعہ سانس لیتا ہے، یعنی ایک گھنٹے میں ایک ہزار دفعہ سانس لیتا ہے، اگر اللہ تعالی ایک گھنٹے کا بھی چارج کرتے تو انسان کی حالت کیا ہوتی؟

اس کے برخلاف جس چیز کی ضرورت کم ہوتی ہے، اللہ تعالی اسے خاص کرتے

چلے جاتے ہیں ،اس پر پابندیاں لگاتے چلے جاتے ہیں ، پابندیاں لگاتے لگاتے اسے قیمتی بھی بنادیتے ہیں ،مقید کردیتے ہیں ،محبوس کردیتے ہیں ، مجبور کردیتے ہیں ، اور قیمتی سے قیمتی بنادیتے ہیں ، جیسے ''ہیرا'' انسان کی ضرورت کا نہیں ہے،اس لئے اللہ نے اسے اتنا قیمتی بنادیا کہ عام آدمی اسے خرید نہیں سکتا ، اور محبوس بھی کردیا ، ہم میں سے بہت سارے لوگوں نے ہیرے کو دیکھا ہی نہیں ہوگا ، اسی طرح سونا ،موتی وغیرہ ہیں۔

اب اس اصول کو سامنے رکھ کر میں ایک بات سمجھانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اللہ کی معرفت انسان کو سانس سے زیادہ ضروری ہے،اس کے کھانے سے زیادہ ضروری ہے،اس کے پینے سے زیادہ ضروری ہے، اتنی زیادہ ضروری چیز کو کیا اللہ تعالیٰ خاص کرکے رکھ دیں گے کہ بعض لوگوں کو دیدیں اور کہیں کہ تم ہی اسے لئے پھرنا ،صرف کان میں بولنا۔ ہو ہی نہیں سکتا ، ناممکن بات ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ضرورت انسانی کی اشیاء کو کھلے عام پیش کردیا ہے، اسی طرح معرفت الٰہی بھی ہماری روح کے لئے ضروری چیز ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے کھلے عام بیان فرمایا ہے، یہ کوئی مخفی اور پوشیدہ راز نہیں ہے۔

معرفت الٰہی کتنی عام ہے

اب میں آپ لوگوں کو بتاؤں گا کہ اللہ تعالیٰ نے معرفت الٰہی کو انسانی ضرورت کے پیش نظر کتنا عام کیا ہے۔ قرآن کریم کی ہر آیت کے اندر معرفت موجود ہے۔

واقعہ لکھا ہے کہ ایک آدمی مسلمان ہوا، اس سے پوچھا گیا کہ کس چیز نے تمہیں اسلام کی طرف مائل کیا تو اس نے کہا کہ میں نے قرآن کریم پڑھا تو معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی ہر آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کوئی نہ کوئی صفت بیان کی ہے، کہیں

بصیر فرمایا ہے تو کہیں خبیر، کہیں علیم فرمایا ہے تو کہیں علام الغیوب وغیرہ۔اس سے میں نے سمجھا کہ قرآن و اسلام در اصل اللہ کی معرفت کی تعلیم دیتے ہیں ،اس کے برخلاف عیسائی اور دوسرے مذاہب میں خدا کا کوئی خاص تذکرہ نہیں ، نہ اس کی صفات کا بیان ہے،اس لئے مجھے اسلام نے اپیل کیا اور میں مسلمان ہو گیا۔

تو معلوم ہوا ہر آیت میں معرفت کا سامان ہے ، جو بھی قرآن کریم غور سے پڑھے گا تو وہ ضرور بالضرور اللہ کا عارف بندہ بن جائے گا ، دوسری طرف احادیث نبوی بھی معرفت سے بھری پڑی ہیں ،تیسرے یہ کہ اللہ نے ساری دنیا کی ہر چیز کو معرفت کا سامان بنادیا ہے، زمین کا ذرہ ذرہ معرفت الٰہی کا مظہر ہے، آسمان کا ذرہ ذرہ معرفت الٰہی کا مخزن ہے،سورج اللہ کی معرفت کا سامان ، چاند اللہ کی معرفت کا سامان، شجر وحجر اللہ کی معرفت کا سامان ، چیونٹی اللہ کی معرفت کا سامان ،خود انسان اور اس کے اعضاء اللہ کی معرفت کا سامان ہیں۔

بھائیو! اب بتاؤ کہ اللہ کی معرفت کتنی عام ہے؟ کھانا لینے تو آپ کو بازار جانا پڑے گا ، لیکن معرفت حاصل کرنے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ، نیچے دیکھو تو معرفت ،اوپر دیکھو تو معرفت ، داہنی طرف دیکھو تو معرفت ، بائیں طرف دیکھو تو معرفت ،سامنے دیکھو تو معرفت ، پیچھے دیکھو تو معرفت ، ہر سو اللہ کی معرفت کا سامان جمع ہے۔

اسی لئے ایک جگہ اللہ تعالی نے فرمایا:

﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَ الۡفُلۡکِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّةٍ وَّ

تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ﴾(البقرۃ:۱۶۴)

(بلا شبہ زمین وآسمانوں کی تخلیق میں اوررات و دن کے آنے جانے میں اور کشتیوں میں جوسمندر میں لوگوں کی نفع بخش چیزیں لیکر چلتی ہیں اور پانی میں جس کو اللہ نے آسمان سے نازل کیا، پھراس سے زمین کے خشک ہو جانے کے بعداس کوتر و تازہ کیا (اور کھیتیاں اگائیں) اوران سے زمین میں ہر قسم کے حیوانات پھیلائے، اور ہواؤں کی سمتوں کے بدلنے میں (کہ کبھی پرُ وا ہوا چلتی ہے تو کبھی پچھوا، کبھی گرم تو کبھی سرد) اور بادل میں جو زمین وآسمان کے درمیان معلق ہے، ان سب میں عقل سے کام لینے والوں کے لئے نشانیاں موجود ہیں)

قرآن میں اس طرح کی سینکڑوں آیات ہیں جن میں اللہ تعالی نے انسانوں کو انفس وآفاق میں غور کرکے اللہ کی معرفت حاصل کرنے کی دعوت دی ہے۔

ایک جگہ کس قدر عجیب انداز سے فرمایا گیا کہ:

﴿اَفَلاَ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَتۡ ، وَ اِلَی السَّمَآءِ کَیۡفَ رُفِعَتۡ وَاِلَی الۡجِبَالِ کَیۡفَ نُصِبَتۡ ، و اِلَی الۡاَرۡضِ کَیۡفَ سُطِحَتۡ﴾ [الغاشیۃ:۱۷-۲۰]

(تو کیا یہ لوگ اونٹ کونہیں دیکھتے کہ کیسے بنایا گیا ہے، اور آسمان کونہیں دیکھتے کہ کس طرح بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں کونہیں دیکھتے کہ کس طرح کھڑے کئے گئے ہیں اورزمین کونہیں دیکھتے کہ کس طرح پھیلائی گئی ہے)

اس میں سبھی لوگوں کو بالعموم اورعربوں کو بالخصوص دعوت دی گئی ہے جن کے پاس اونٹ ہوا کرتے تھے کہ اللہ کی قدرت دیکھنا ہواوراس کی معرفت پیدا کرنا ہوتو

ان اونٹوں اور دیگر مخلوقات کو دیکھو اور معرفت حاصل کرو۔

حصول معرفت کا طریقہ

الغرض اللہ کی صفات کو جاننے اور ان پر غور کرنے سے اللہ کی معرفت آتی ہے، اللہ کی بے شمار صفات ہیں، جیسا کہ اللہ کے صفاتی ناموں سے معلوم ہوتا ہے، اللہ کے ہزاروں صفاتی نام ہیں، ہر نام میں اللہ کی ایک صفت بیان کی گئی ہے، ان میں سے ایک مثال کے طور پر اللہ کا رحم وکرم ہے، یہ ایک ایسی صفت ہے کہ بچہ بچہ جانتا ہے، ہر آن اور ہر لمحہ اللہ کی طرف سے ہمارے اوپر رحم وکرم کی بارش ہو رہی ہے، یہ اتنی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس کھلی ہوئی حقیقت کو کھولنے کی کوشش کرنا تحصیل حاصل ہے۔

اب ہم نے اللہ تعالی کو جانا کہ ہمارا رب وہ رب ہے جو ہمارے اوپر ہر وقت احسان وکرم ورحم فرما رہا ہے، میں اٹھتا ہوں تو اللہ کا رحم وکرم میرے ساتھ، بیٹھتا ہوں تو اللہ کا رحم میرے ساتھ، میں کھاتا ہوں تو اللہ کا رحم وکرم میرے ساتھ، ہر وقت اور ہر حال میں اللہ کا رحم وکرم میرے ساتھ، سب جگہ رحم ہی رحم اور کرم ہی کرم ہو رہا ہے۔

آپ بستر سے اٹھ رہے ہیں، اگر خدا کا رحم وکرم شاملِ حال نہ ہوتو آپ بستر سے کیسے اٹھ جائیں گے؟ اگر خدا کا رحم وکرم نہ ہوا تو آپ کا کھانا آپ کے حلق کے اندر کیسے اتر جائے گا، وہی لقمہ آپ کے لیے موت کی دعوت بن سکتا تھا، لیکن وہ لقمہ آپ کھاتے ہیں، اندر بھی پہونچتا ہے، ہضم ہوتا ہے، اس سے قوت بنتی ہے اور آپ کام کاج کرنے کے قابل ہوتے ہیں، دین ودنیا کے بہت سارے کام کاج کرنے لگتے ہیں، کیا یہ اللہ تعالیٰ کا رحم وکرم شامل حال ہونے ہی کی وجہ سے نہیں ہے؟

کھاتے وقت اللہ کا عجیب رحم وکرم

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہ نے ایک جگہ پر فرمایا ہے کہ ہم جو روزانہ کھانا کھاتے ہیں، یہ اصل میں اگر ہم غور کریں تو دو دفعہ اپنے اوپر فائرنگ کرنے کی طرح ہے، بندوق چلانے کی طرح ہے؛ کیوں؟ اس لیے کہ جب آپ لقمہ لیتے ہیں اور منہ میں رکھتے ہیں اور حلق میں اتارتے ہیں تو حلق میں اتارنے کے وقت ایک ایسے کٹھن ونازک مرحلہ سے آپ کو گذارا جاتا ہے کہ اگر آدمی تھوڑی دیر سوچے تو پریشان ہو جائے، بڑا نازک مرحلہ ہوتا ہے۔

ہر انسان کے حلق میں دو نلکیاں ہوتی ہیں، ایک سامنے اور ایک پیچھے، پیچھے جو نلکی ہے، اس میں کھانا جاتا ہے اور سامنے جو نلکی ہے، اس میں ہوا کا آنا جانا ہوتا ہے، جس سے آپ سانس لیتے ہیں، تو پہلے سانس کی نلکی آتی ہے اور سانس کی نلکی کو پار کر کے کھانا پیچھے کی نلکی میں جاتا ہے، اب سوچئے کہ اگر ذرا سا پانی کا قطرہ یا ذرا سا کھانے کا دانہ پیچھے کی نلکی میں جانے کے بجائے پہلی میں اُتر جائے تو ہلاکت اور موت ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا کیا نظام بنایا؟ حلق کے پاس ایک چھوٹی سے جیب بنائی ہے اور جب انسان کھانا یا پینا چاہتا ہے تو اس جیب کو حلق کے اوپر پل کی طرح بنا دیتے ہیں، جب آپ کھانا کھاتے ہیں تو وہ جیب پلٹ کر اس پہلی نلکی کو بند کر دیتی ہے، اور اس پر پل بن جاتی ہے اور کھانا اس پل پر سے پار ہو کر اندر دوسری اندر والی نلکی میں چلا جاتا ہے۔

یہ ہے سسٹم، اب اس سسٹم پر تھوڑی دیر کے لیے غور کیجئے کہ وہ جیب بند نہ ہوئی تو کیا ہوگا، اگر کوئی پروبلم (problem) آجائے پھر تو ہلاکت ہی ہلاکت ہے۔

یہ رحم نہیں ہے اللہ کا؟ اگر خدا تعالیٰ کا رحم ایک منٹ کے لئے بھی بلکہ ایک منٹ

کے ۱۰۰ حصہ میں سے بھی تھوڑے حصہ میں نہ ہو تو پھر انسان کے لیے ہلاکت ہے۔ اب روزانہ ہم تین دفعہ کھانا کھاتے ہیں، دراصل تین دفعہ ہم روزانہ اپنے اوپر فائرنگ کرتے ہیں۔ اب کھاتے وقت آدمی یہ سوچے کہ میں کھانے جارہا ہوں، اور اندر کی جیب کھل رہی ہے، پل بن رہا ہے، وہ میرا کیسا خدا اور مالک ہے جس نے ایسا سسٹم بنا رکھا ہے۔ کیا اس سے اللہ کی معرفت پیدا نہیں ہوگی؟

صفت رحمت سے قرآن کی ابتداء

قرآن کریم جہاں شروع ہوا ہے، وہاں سب سے پہلے یہ آیت ہے۔ ﴿ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ﴾ (شروع اللہ کے نام سے جو بہت رحم والا نہایت مہربان ہے) رحیم ورحمان دو لفظ لائے گئے، دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں، دونوں کے اندر انتہائی مبالغہ ہے، رحمٰن کے معنی ہیں، بے انتہا رحم کرنے والا،، یہی معنی رحیم کا بھی ہے، اور دونوں میں فرق ہے، وہ فرق یہ ہے کہ رحمان اس کو کہتے ہیں جس کا رحم وکرم ہر چیز پر عام ہو، اور رحیم کہتے ہیں اس کو جس کا فضل وکرم ورحم مخصوص قسم کے لوگوں کے لیے مخصوص انداز کا ہو، جیسے انبیاء کے لیے مخصوص رحم ہے، اولیاء کے لیے مخصوص کرم ہے، اپنے خاص بندوں کے لیے مخصوص انداز کا اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے، مخصوص رحم کرنے والے کو رحیم کہتے ہیں اور جس کی رحمت سب کے لیے عام ہو، چاہے کافر ہو، چاہے ماننے والا ہو، چاہے نہ ماننے والا ہو، چاہے وہ انسان ہو یا کوئی اور چیز ہو، سب کے لیے جس کی رحمت عام ہو، اسے رحمان کہتے ہیں۔

اسی لیے علماء کرام نے لکھا ہے کہ کسی انسان کو رحمٰن نام رکھنا تو جائز نہیں ہے، ہاں رحیم نام رکھ سکتے ہیں، اس لیے کہ انسان اس قدر عام رحم کا معاملہ کر ہی نہیں سکتا، لہذا انسان رحمان نہیں بلکہ عبد الرحمٰن ہے، رحمان کا بندہ ہے، لیکن رحیم چاہے تو رکھ

سکتے ہیں، اس لیے کہ مخصوص رحم انسان بھی کسی کے ساتھ کر دیتا ہے، لیکن عام رحم جیسے اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، اچھوں پر، بروں پر، انسانوں وجانوروں پر، ہر مخلوق پر، ہر طرح، ہر اعتبار سے، اس طرح رحم کرنے والا صرف اور صرف اللہ ہے۔

اللہ نے سب سے پہلے یہ آیت قرآن میں ذکر کی، یہ بتانے کے لیے کہ میری ذات کا عنوان ہی رحمان ورحیم ہے۔ جب ہم اللہ کی اس صفت میں غور کریں گے تو معرفت الٰہی پیدا ہوگی۔

تصوف کا ایک مسئلہ

جب آپ کو یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اسی سے ایک تصوف کا مسئلہ بھی حل ہو گیا وہ یہ کہ جہاں تک حصول معرفت کا مسئلہ ہے، اس کے لئے کسی شیخ ومرشد کی کوئی ضرورت نہیں، ہوسکتا ہے کچھ لوگوں کو یہ بات عجیب لگے، لیکن حقیقت یہی ہے، اس لئے کہ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا دنیا ومافیہا کا ہر ذرہ اپنے اندر معرفت الٰہی کا سامان رکھتا ہے، تو حصول معرفت کے لئے کسی شیخ کی ضرورت نہیں۔ اب سوال پیدا ہوگا کہ پھر پیر کی ضرورت کس لئے ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ معرفت کے آثار اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے شیخ کی ضرورت ہے، حصول معرفت کے لئے نہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے معرفت الٰہی کے سلسلہ میں کسی بھی انسان کو معذور قرار نہیں دیا ہے

مثلاً کوئی کہنے لگے، اے اللہ! مجھے تیری معرفت ملی ہی نہیں، معلوم ہی نہیں ہوا، میں کیا کروں؟ اگر مجھے تیری معرفت مل جاتی تو میں تیری عبادت کرتا، اگر اللہ کے سامنے یوں کہے گا تو اس کا عذر معتبر نہیں ہوگا، اس لئے کہ کائنات کا ہر ذرہ معرفت کا سامان ہے۔ اسی لئے امام اعظم ابو حنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ کسی بھی انسان کو اللہ کی معرفت اور توحید بتانے کے لئے کسی نبی کا آنا ضروری نہیں، بلکہ اس کے لئے اس کی

عقل خود کافی ہے۔معلوم ہوا جب معرفت الٰہی کے لئے نبی ہی کی ضرورت نہیں تو پھر شیخ کی کیا ضرورت ہے؟ ہاں معرفت کے آثار اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے شیخ کی ضرورت ہے۔

کیونکہ معرفت کی شرعی تعریف صرف یہ نہیں ہے کہ اللہ کی صفات کو جان لیا جائے ، کیونکہ اتنا جاننا تو ہر مخلوق میں عام ہے ،حتیٰ کہ کافر بھی اتنا جانتا ہے ، بلکہ معرفت کی تعریف یہ ہے کہ اللہ کو اس طرح سے جانے پہچانے کہ اس کے آثار نمایاں ہوں اوران سے انسان متأثر ہو۔

معرفت کا علم آثارِ معرفت ہی سے ہوتا ہے

جب اللہ کی معرفت بندہ کے قلب میں آتی ہے تو اس پر اس کے کچھ آثار مرتب ہوتے ہیں اور ہر چیز میں یہی بات ہے کہ جب کسی چیز کو جاننے کے بعد اُس کا اثر مرتب ہو تب کہا جاتا ہے ، سمجھا جاتا ہے ،عوام میں بھی ،خواص میں بھی کہ اس کو وہ چیز حاصل ہوگئی۔

مثال کے طور پر ایک لڑکا ہے ،وہ اپنے باپ کو گالی دیتا ہے تو آپ اُسے کہتے ہیں کہ کیا حرکت کررہا ہے ،وہ تو تیرا باپ ہے باپ ۔ وہ لڑکا آپ کو پلٹ کر یہ کہے گا کہ مجھے آپ سے زیادہ معلوم ہے کہ یہ میرا باپ ہے ۔ باپ ہونے کا علم بیٹے کو جتنا ہے کسی اور کو کیا ہوسکتا ہے؟ ظاہر بات ہے ،وہ دوسروں سے زیادہ اپنے باپ کی پہچان رکھتا ہے ،لیکن اسے آپ بتاتے ہیں کہ بھائی !وہ تیرا باپ ہے باپ ۔ کیوں بتاتے ہیں؟ اس لیے کہ باپ کو باپ جاننے کا جو اثر ہونا چاہئے ،اس کا ادب ،اس کی جلالت ،اس کی عظمت ، اس کا خوف ،اس کی خشیت ، وہ اس کے اندر نہیں ہے ،اس لیے آپ اسے کہتے ہیں، بھائی! یہ تیرا باپ ہے باپ ۔وہ اگر آپ کو پلٹ کر یہ

جواب دے کہ مجھے تو آپ سے اچھا معلوم ہے کہ یہ میرا باپ ہے، تو آپ اسے کہتے ہیں کہ تو نے باپ کو جانا ہی نہیں ہے، اگر تو جان لیتا تو پھر اس کی عظمت نہ ہونے کا کیا سوال؟ اس سے محبت نہ ہونے کا کیا سوال؟ اس کا ادب نہ کرنے کا کیا سوال؟ ظاہر بات ہے کہ یہ چیزیں جاننے کا اثر ہیں، لازمہ ہیں، وہ اس کے اندر آنا ضروری ہے۔

جب تک معرفت و پہچان کا اثر نہیں پیدا ہوگا نہیں سمجھا جائے گا اور نہیں مانا جائے گا نہیں قبول کیا جائے گا کہ اسکو اس چیز کی معرفت حاصل ہے، ہوسکتا ہے کہ لغت و ڈکشنری کے معنی کے لحاظ سے حاصل ہوگئی ہو، مگر شریعت میں اس کو معرفت حاصل نہیں ہوئی۔

بالکل اسی طریقہ پر بھائیو! اللہ کی معرفت یعنی اللہ کے اوصاف اور کمالات اور اللہ کی خصوصیات کو جاننے و پہچاننے کا جو اثر ہونا چاہئے، جب تک وہ اثر ہمارے اندر نہیں پیدا ہوگا، یہی سمجھا جائے گا کہ اللہ کی معرفت نصیب نہیں ہے۔ اور جب اس معرفت کے آثار پیدا ہو جائیں تو سمجھا جائے گا کہ معرفت حاصل ہوگئی۔ اس لئے یوں کہا جا سکتا ہے کہ معرفت کا علم آثار معرفت ہی سے ہوتا ہے۔

اللہ کی معرفت کا پہلا اثر محبت ہے

اب آیئے یہ دیکھیں کہ معرفت الٰہی کے آثار کیا کیا ہیں؟ اللہ کی معرفت کا ایک اہم ترین اثر اللہ کی محبت ہے اور یہ قلب کی عبادت ہے، دل میں اللہ کی محبت آئے گی تو دل اللہ کا عبادت گذار بنے گا، اور جب دل کے اندر دنیا اور دنیا والوں کی محبت ہوگی تو دل گنہگار ہو جائے گا۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴾(التوبۃ:۲۴)

(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے ماں باپ، تمہاری اولاد، تمہارے بھائی بہن، بیویاں، رشتہ دار، تمہارے مال جو تم کماتے ہو، تجارت جس کے خسارے کا تم کو خطرہ لگا رہتا ہے، تمہارے مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو، یہ سب اگر تم کو اللہ و رسول اور اللہ کے راستے میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ کا حکم یعنی عذاب آجائے، اور اللہ حد سے گزر جانے والوں کو ہدایت نہیں دیتے)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ ان لوگوں سے محبت نہ رکھو، اور تم ماں باپ سے محبت نہیں کر سکتے، بیوی سے محبت نہیں کر سکتے، جائیداد و املاک سے محبت نہیں رکھ سکتے، بلکہ یہ فرمایا کہ ان سے اللہ و رسول سے زیادہ محبت نہیں رکھ سکتے۔ ہاں والدین سے بھی محبت چاہئے، بیوی سے بھی محبت چاہئے، اگر والدین سے محبت نہ ہوگی تو والدین کا حق کیسے ادا ہوگا، ان کا ادب کیسے کریں گے۔ سب سے محبت ہو، لیکن وہ محبت کمزور ہو اور اللہ و رسول کی محبت غالب ہو۔

معلوم یہ ہوا کہ ساری چیزوں کی محبت کمزور ہونی چاہئے، اللہ اور رسول کی محبت غالب ہونا چاہئے۔ یہ معرفت کا اثر ہے، جب بندہ اللہ کو پہچان لے گا اور یہ بھی پہچان لے گا کہ ماں باپ کو بنانے والا بھی وہی، میری بیوی کو بنانے والا بھی وہی، میرے بھائی بہنوں کو پیدا کرنے والا بھی وہی، جائیداد املاک کو پیدا کر کے مجھ تک

پہونچا کر میرے لیے راحت کا سامان کرنے والا بھی وہی، تو اللہ کی محبت ضرور آئے گی، اس لیے جب معرفت آئے گی تو اللہ کی محبت ضرور آئے گی۔

معرفت سے ہی محبت پیدا ہوتی ہے، امام رَبِیْعَۃُ الرَّ ائے کا واقعہ

یاد رکھئے کہ جب تک انسان کو اللہ کی پہچان نہ ہو، اس کے دل میں اللہ کی محبت پیدا نہیں ہوسکتی، بہت زمانہ پہلے یعنی بنوامیہ کے دور کا واقعہ ہے، جب کہ امام مالک ابھی طالب علمی کی زندگی گذار رہے تھے، ان کے ایک استاذ تھے، جن کا نام رَبِیْعَۃُ الرَّ ائے تھا، بہت بڑے عالم تھے، آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ امام مالک کے استاذ کیسے ہوں گے؟ بہت بڑے جلیل القدر فقیہ بھی تھے اور محدث بھی تھے، اور اللہ والے بزرگ بھی تھے، ان کے والد کا نام فروخ تھا۔

جب امام ربیعۃ الرائے ماں کے پیٹ میں تھے تو ان کے والد فروخ خراسان کی جانب جہاد کی مہم پر امیر المومنین کے حکم سے نکل گئے، جب جہاد میں جانے کے لیے نکلے تو چوں کہ ان کو معلوم نہیں تھا کہ کب واپسی ہوگی اور کیا حالات ہوں گے کہ زندہ بھی آؤں گا یا اللہ کی راہ میں شہید ہوجاؤں گا؟ اس لئے ان کے پاس جو ۳۰ ہزار دینار یا درہم تھے، انہوں نے اپنی بیوی کو دیا اور کہا کہ میں جہاد میں جارہا ہوں اور یہ تیس ہزار تمہارے حوالے ہیں، ضرورت کے مطابق اس میں سے خرچ کرتے رہنا، اگر اللہ تعالیٰ نے زندگی باقی رکھی اور واپسی ہوگئی تو پھر میں تم سے آکر حساب لے لوں گا یہ کہہ کر نکل گئے۔

جو نکلے تو ایسے حالات ان کے اوپر آئے کہ تاریخ بغداد کے مطابق تقریباً اس واقعہ کے ستائیس برس بعد ان کو لوٹنا نصیب ہوا، لمبے چوڑے عرصے کے بعد واپسی ہوئی۔ مدینہ ان کی بستی تھی اور اپنی بیوی کو مدینہ میں ہی چھوڑ کر گئے تھے، جب

واپس مدینہ آئے تو دیکھا کہ وہاں کی پوری فضا بدلی ہوئی ہے، نئی نئی سڑکیں بن گئی ہیں، نئی نئی عمارتیں بن گئی ہیں، خیر آئے اور بہت غور وفکر کے بعد اپنی گلی وغیرہ کو پہچانا اور اپنے گھر پہنچے اور جب پہونچے تو وہ رات کا وقت تھا، اپنے گھوڑے کو ایک طرف باندھا اور نیزے سے دروازہ کھولا، اور دروازے کے اندر گھسنے لگے۔

تو ایک صاحب باہر آرہے تھے، دونوں میں ملاقات ہوئی، جب انہوں نے دیکھا کہ یہ اندر گھس رہے ہیں تو ان کوٹوکا اور کہا کہ ارے اللہ کے دشمن! کسی کے گھر میں بلا اجازت جانا جائز نہیں ہے، تو فروخ نے کہا: یہ کسی کا گھر نہیں ہے، یہ تو میرا گھر ہے، میرے گھر میں کس سے اجازت لوں؟ اب دونوں میں تو تو میں میں ہونے لگی، وہ کہتے ہیں یہ میرا گھر ہے اور وہ کہتے ہیں تم گھس نہیں سکتے، یہ تو میرا گھر ہے، دونوں میں جو گفتگو ہوئی تو پڑوسی لوگ جمع ہو گئے، ربیعہ کہنے لگے کہ میں ان کو سلطان کے پاس فیصلہ کے لئے لے جاؤں گا اور فروخ نے کہا کہ ہاں میں بھی تم کو بادشاہ کے پاس لے جاؤں گا، یہ سب باتیں ہو رہی تھیں کہ ان کی بیوی نے اندر سے سنا اور آکر دیکھا کہ کیا ہو رہا ہے؟

جو دیکھا تو تماشا یہ نظر آیا کہ دونوں باپ بیٹے دست وگریبان ہیں، ان کو بڑا تعجب ہوا، اور انہوں نے کہا کہ یہ معرفت نہ ہونے کی وجہ سے جھگڑا ہو رہا ہے، پہچان نہیں ہے، باپ نے بیٹے کو پہچانا اور نہ بیٹے نے باپ کو پہچانا۔ بیوی نے کہا کہ تم دونوں آپس میں کیا کر رہے ہو؟ بیٹے سے کہا: بیٹا ربیعہ! یہ تو تمہارے باپ ہیں، ملاقات کرو اور ان سے کہا فروخ یہ تمہارے بیٹے ہیں، ان سے ملاقات کرو۔ جب ماں نے پہچان کرائی تو پھر دونوں نے معافی چاہی اور روتے ہوئے آپس میں گلے ملنے لگے۔ (تاریخ بغداد: ۴۲۲/۸)

میں نے یہ مثال اس لیے دی تھی کہ جب دونوں میں پہچان نہیں تھی تو لب و لہجے میں فرق، اور انداز ایسا، اور جب بیٹے کو معلوم ہوا کہ یہ میرے ابا جی ہیں اور باپ کو معلوم ہوا کہ یہ میرا بیٹا ہے تو پھر گلے مل رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ معرفت و پہچان اتنی بڑی چیز ہے کہ جب پہچان ہوتی ہے تو دل میں محبت آتی ہے اور پہچان نہیں ہوتی تو دل میں محبت نہیں ہوتی۔ اس لیے جب انسان اللہ کی پہچان اپنے اندر پیدا کرتا ہے تو اس کے دل کے اندر اللہ کی محبت آجاتی ہے۔

معرفت کا ایک اثر خوف الٰہی ہے

معرفت کا ایک اثر خوف الٰہی ہے، کہ آدمی اللہ کی جلالت وعظمت کی وجہ سے اللہ سے خوف کھائے اور ڈرے۔ خوفِ خداوندی معرفت الٰہی کے اثرات میں سے بہت بڑا اثر ہے، جس میں اللہ کی معرفت ہوگی وہ اللہ کا خوف اور خشیت بھی رکھے گا اور جس کے دل میں خوف الٰہی نہ ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دل میں معرفت الٰہی بھی نہیں ہے۔

اللہ کا خوف دو وجہ سے ہوتا ہے، ایک وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے میرے گناہوں کی وجہ سے عذاب دیں گے، اس وجہ سے اللہ سے ڈر رہا ہے، یہ تھرڈ کلاس ڈر ہے، اور فسٹ کلاس ڈر یہ ہے کہ اس لیے ڈر رہا ہے کہ اللہ کی عظمت وجلالت اس کے دل میں ہے کہ اللہ کیسی عظیم و بھاری ذات ہے، کتنی قدرت والی ذات ہے، اس اللہ کی عظمت و کبرائی کے پیش نظر وہ اللہ سے ڈرتا ہے۔

دونوں بھی درست ہیں لیکن ان میں اعلیٰ وادنی کا فرق ہے۔ اللہ کی عظمت وجلالت کے پیش نظر ہمارے دلوں میں خوف خدا پیدا ہوجائے، اور یہ کب پیدا

ہوگا؟ جب اللہ کی معرفت ہوگی۔ جیسے ایک شخص باپ کی عظمت کو جانتا ہے تو اس کا خوف وڈر اس کے دل میں پیدا ہوجاتا ہے۔ باپ سے نہ ڈرنے والے دراصل باپ کی عظمت وجلالت سے واقف ہی نہیں ہوتے؛ اس لئے وہ باپ کی توہین کرتے اور اس سے بے خوف ہوتے ہیں۔ اسی طرح اگر اللہ تعالی کی عظمت وجلالت کا مشاہدہ ہوجائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ کا ڈر نہ پیدا ہو۔ جب یہ معلوم ہو کہ اللہ کی ذات وہ ہے جس کے بارے میں خود اس نے کہا ہے کہ: ﴿**يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ وَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ**﴾ (کہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو ارادہ کرتا ہے اس کا فیصلہ کرتا ہے) اس کی عظیم ہستی کے سامنے کسی نبی یا ولی یا فرشتہ کو لب کشائی کی مجال نہیں۔ اس کے سامنے کسی کی سفارش کرنا بھی اس کے اذن وحکم کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ ان سب امور کی معرفت سے ضرور اللہ کا خوف پیدا ہوگا۔

خوف الٰہی بھی معرفت کا نتیجہ ہے، ایک واقعہ

اس سے معلوم ہوا کہ خوف بھی معرفت و پہچان کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے، اگر معرفت و پہچان نہ ہو تو خوف نہیں آسکتا، جب پہچان ہوگی تو خوف آجائے گا۔

امام جلال الدین رومیؒ نے لکھا ہے کہ ایک آدمی سفر پر نکلا، جنگل میں چلتا رہا، جنگل میں بہت دور چلنے کے بعد اسے تھکان ہوئی اور تھکان کی وجہ سے نیند غالب ہوگئی، اس نے سوچا کہ کہیں آرام کرلوں لیکن آرام کرنے اس لیے ہمت نہیں ہوئی کہ جنگل کا راستہ ہے اور جنگل کے راستہ میں کیسے آرام کروں؟ سوچتا رہا کہ کوئی چیز مجھے ایسی مل جائے جس کی وجہ سے مجھے کچھ سہارا مل جائے تو میں آرام کرلوں، بہت آگے جانے کے بعد دیکھا کہ ایک جانور سویا ہوا ہے، اس نے کہا کہ بہت اچھا،

یہ کوئی جانور سو رہا ہے، میں بھی اس کے بازو سو جاؤں۔

چنانچہ جانور کے بازو وہ بھی جا کر لیٹ گیا، نیند کا اتنا غلبہ تھا، تھکان ایسی تھی کہ بس پڑتے ہی نیند لگ گئی، کچھ دیر بعد اسی راستے سے ایک دو آدمی آرہے تھے، پیچھے سے آتے آتے جب وہ وہاں پہنچے تو ایک عجیب منظر انہوں نے دیکھا کہ ایک انسان سویا ہوا ہے اور اس کے بازو جو جانور سویا ہوا ہے، وہ حقیقت میں شیر ہے، یہ لوگ بہت پریشان ہوئے کہ کہیں یہ شیر جاگے اور اس بیچارے کو کھا جائے۔ انہوں نے آہستہ سے سونے والے کو آواز دی اور جگایا، جب وہ جاگا تو ان لوگوں نے اس سے کہا کہ کہاں سوئے ہو؟ وہ تمہارے بازو شیر ہے شیر۔ بس جناب اتنا سنتے ہی وہ گھبرایا پریشان ہوا اور ڈر کے مارے اس کی جان نکل گئی اور مر گیا۔

دیکھئے جب تک اسے شیر کی معرفت و پہچان نہیں تھی تو اس پر شیر کا خوف بھی پیدا نہیں ہوا، جیسے ہی شیر کی معرفت حاصل ہوئی تو اس کا خوف بھی پیدا ہوا اور وہ مر گیا۔ اسی طرح جب اللہ کی پہچان انسان کو ہو جاتی ہے کہ اللہ کتنا بڑا اور زبردست ہے، کتنی بڑی طاقت والا ہے، وہ کیا سے کیا کر سکتا ہے،؟ جب یہ پہچان اللہ کی انسان کو ہوگی تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کے دل کے اندر کوئی ہلچل نہ مچے اور اس کی وجہ سے اس کے دل میں اللہ کا خوف پیدا نہ ہو۔

نبی ﷺ کا خوف

دیکھئے رسول اللہ ﷺ اور اولیاء اللہ کو معرفت حاصل تھی تو وہ حضرات اللہ کا ڈر و خوف بھی رکھتے تھے۔ حدیث میں ہے، ایک صحابی کہتے ہیں کہ میں آپ ﷺ کی خدمت میں آیا تو دیکھا کہ:" وهو يصلي ولصدره أزيز كأزيز المرجل" (رسول اللہ ﷺ جب نماز پڑھ رہے تھے اور آپ کے سینہ سے ایک آواز نکل رہی تھی

جیسے ہانڈی پکنے کی آواز ہوتی ہے)(ابوداود:۹۰۴،احمد:۱۶۳۵۵،شرح السنۃ:۲۴۵/۳، نسائی:۱۲۱۴)

حضرت عبید بن عمیر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا سے عرض کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی کوئی عجیب بات سنایئے جو آپ نے دیکھی ہو، حضرت عائشہ کچھ دیر خاموش رہیں، پھر کہا کہ ایک بار اللہ کے نبی میرے پاس رات میں لیٹے ہوئے تھے، آپ نے کہا کہ یا عائشہ! چھوڑ کہ میں آج رات اللہ کی عبادت کروں، حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں تو آپ کا قرب چاہتی ہوں، اور یہ بھی کہ جو آپ کو پسند ہو۔ پھر آپ اٹھے اور وضو کیا اور نماز پڑھنے لگے اور برابر روتے رہے، یہاں تک کہ آپ کی ڈاڑھی مبارک اور زمین تر ہوگئی۔ پھر حضرت بلال آپ کو نماز فجر کیلئے بلانے آئے اور جب دیکھا کہ آپ رو رہے ہیں تو عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کیوں روتے ہیں جبکہ اللہ نے آپ کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف کردئے ہیں تو فرمایا کہ کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔(صحیح ابن حبان:۳۸۶/۲،مشکل الآثار للطحاوی:۲۳۶/۱۰،موارد الظمآن :۱۴۳/۱)

صحابہ کا خوف

اسی طرح حضرات صحابہ بھی عارفین تھے تو ان کو بھی خوف خدا حاصل تھا۔ بخاری وغیرہ میں حضرات صحابہ کے بارے میں آیا ہے کہ ایک بار اللہ کے نبی ﷺ نے خطبہ دیا، حضرت انس کہتے ہیں کہ میں نے کبھی ایسا خطبہ نہیں سنا، آپ نے اس میں فرمایا کہ :" لو تعلمون ما أعلم لضحكتم قليلا و لبكيتم كثيرا"(اگر تم ان باتوں کو جان لو جو میں جانتا ہوں تو تم بہت کم ہنستے اور زیادہ روتے) یہ سن کر

حضرات صحابہ سب کے سب رونے لگے۔ایک روایت میں ہے کہ صحابہ نے اپنے سروں کوڈھانپ لیااوررونے لگے۔(بخاری:۴۶۲۱)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے سورۂ مطففین نماز میں پڑھی اورآیت: ''یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' (جس دن کہ لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے) تک پہنچے تو روتے رہے یہاں تک کہ بے ہوش کرگر پڑے۔(صفۃ الصفوۃ:۲۰۳/۱)

اولیاءاللہ کا خوف

حضرات اولیاءاللہ کا خوف بھی دیکھئے،ایک بڑے بزرگ حضرت منصور بن عمار گزرے ہیں،امام ابن الجوزی نے ان سے ایک اللہ والے کا قصہ ذکر کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں رات میں باہر نکلا،ابھی رات کا ایک حصہ باقی تھا، میں کسی کے ایک چھوٹے سے دروازے کے پاس بیٹھ گیا تو وہاں ایک نوجوان کی آواز آرہی تھی جو رورہا تھا،اوراللہ سے یوں کہتا جارہا تھا کہ اے اللہ! تیری عزت وجلالت کی قسم، میں گناہ کرکے تیری مخالفت کرنا نہیں چاہا،اور جب میں نے تیری نافرمانی کی ہے،تو میں تیری سزا سے لاعلم نہیں تھا،اور نہ تیری نظر سے غائب تھا، لیکن میرے نفس نے مجھے چکما و دھوکہ دیا اور مجھ پر بدبختی غالب آگئی،اور میرے گناہوں پر پڑے ہوئے تیرے پردے نے مجھے مغرور کردیا،اوراب مجھے تیرے عذاب سے کون بچائے گا اور اگر تیری رسی سے میں کٹ جاؤ گا تو کس کی رسی کو تھاموں گا، ہائے میں کتنی دفعہ توبہ کروں اور کتنی دفعہ پھر گناہوں کی طرف جاؤں؟ اب وقت آگیا کہ میں میرے رب سے شرماؤں۔حضرت منصور بن عمار کہتے ہیں کہ میں نے یہ سن کرزور سے یہ آیت پڑھ دی:

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلائِكَةٌ غِلاظٌ شِدَادٌ الخ ﴾[التحریم:٦]

(اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، جس کا ایندھن انسان و پتھر ہیں، جس پر سخت گیر و تندخو فرشتے مقرر ہیں)

کہتے ہیں کہ پھر میں نے ایک اضطراب و پریشانی کی آواز محسوس کی، اور اپنے کام سے چلا گیا، صبح کو جب واپس ہوا تو دیکھا کہ اسی گھر پر ایک جنازہ رکھا ہوا ہے اور ایک بوڑھی عورت وہاں آجارہی ہے، میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کس کا جنازہ ہے تو کہنے لگی کہ میرے غم کو تازہ مت کرو، میں نے کہا کہ میں مسافر ہوں اس لئے پوچھ رہا ہوں تو کہنے لگی کہ یہ میرا بیٹا ہے، رات کسی نے ایک آیت پڑھ دی تھی جس میں جہنم کا ذکر تھا، اس کو سن کر میرا بیٹا بے قرار ہو گیا اور روتا رہا، یہاں تک کہ مر گیا۔ حضرت منصور کہتے ہیں کہ یہی ان حضرات کی صفت ہوتی ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔(التبصرہ: علامہ ابن الجوازی: ١٧)

تو دیکھئے یہ مثالیں میں نے دی کہ معرفت سے محبت بھی پیدا ہوتی ہے اور خوف بھی، دونوں جگہ جو مشترک مضمون ہے، وہ کیا ہے؟ ''پہچان''، پہچان ہوئی تو محبت آئی، پہچان ہوئی تو خوف آیا، پہچان نہیں تو محبت بھی نہیں، خوف بھی نہیں، اسی لیے عام طور پر اللہ کی محبت اور اللہ کا خوف نہیں ہوتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ صحیح معنوں میں اللہ کی پہچان نہیں، صحیح معنوں میں اللہ کی پہچان ہو تو ضرور انشاء اللہ یہ دونوں چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔

معرفت کا ایک اثر عبدیت و بندگی ہے؟

جب اللہ کی معرفت بندے کو نصیب ہوتی ہے تو بندے پر معرفت کا ایک اثر یہ

ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عبدیت و عجز کا حامل ہوجاتا ہے، اور اسی سے پھر اللہ تعالی کی عبادت کثرت سے کرتا ہے، اس عبدیت و عبادت کے اثر سے پہچانا جائے گا کہ معرفت حاصل ہے یا نہیں، اس لئے کہ ہمارے اور آپ کے لئے نمونہ اور اسوہ آپ ﷺ کی ذات اقدس ہے، آپ اللہ تعالی کے سب سے بڑے عارف تھے، اور سب سے زیادہ عبدیت بھی آپ میں تھی اور عبادت بھی آپ سب سے زیادہ کرنے والے تھے۔ اتنی عبادت کرتے تھے کہ پاؤں میں ورم آجاتا تھا، صحابہ کو ترس آجاتا تھا، پوچھتے یارسول اللہ! آپ تو بخشے بخشائے ہیں، اس قدر عبادت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ فرماتے: ''أفلا اکون عبدا شکورا'' (کیا میں اللہ کا شکر گذار بندہ نہ بنوں) (بخاری: ۱۵۲/۱، مسلم: ۳۷۷/۲)

اسی طرح تمام صحابہ اور اولیاء اللہ نے بھی اللہ کو پہچانا، جس کا اثر ان پر یہ ہوا کہ وہ کثرت سے عبادت انجام دیتے تھے۔ معلوم ہوا کہ معرفت کا ایک اثر عبادت ہے۔ لہذا جو بغیر عبادت کئے معرفت کا دعوی کرے وہ جھوٹا ہے۔

عبادت کیا ہے؟

عبادت کیا ہے؟ عبادت کسے کہتے ہیں ا؟ للہ کا جو بھی حکم بندے کو جہاں بھی آئے، جس وقت بھی آئے اسے انجام دینا عبادت ہے، عبادت دراصل انتہائی خضوع اور انتہائی ذلت کے اختیار کرنے کا نام ہے، اللہ کی بڑائی، اللہ کی جلالت، اللہ کی عظمت کے سامنے بندہ اپنے آپ کو ذلیل کردے تو اس کا نام عبادت ہے، پھر عبادت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک قلبی عبادت اور ایک جسمانی عبادت، جسم سے بھی عبادت ہوتی ہے اور قلب سے بھی عبادت ہوتی ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے، ہم نماز پڑھتے ہیں، جسم حرکت میں آتا ہے کہ آدمی

ہاتھ اٹھاتا ہے، اللہ کے سامنے عاجزانہ باندھ لیتا ہے اور پھر اللہ کی ستائش کرنے لگتا ہے، پھر اس کے سامنے جھک جاتا ہے، جسے رکوع کہتے ہیں، پھر مزید اور جھکتے ہوئے اس کے سامنے سجدہ ریز ہوجاتا ہے۔ یہ جو عبادت ہورہی ہے جسم کی عبادت ہے اور پھر ایک عبادت اسی عبادت کے اندر ہے، وہ ہے خشوع اور خضوع اور اخلاص، اب یہ جو اندرونی عبادت ہوتی ہے وہ بھی دراصل اسی کا جز ہے، اور وہ قلبی عبادت ہے، اور دونوں ضروری ہیں۔

اگر ایک آدمی صرف اٹھ رہا ہو، رکوع و سجدہ میں جھک رہا ہو، لیکن قلب کے اندر وہ خشوع نہ ہو، خضوع نہ ہو، اللہ سے محبت نہ ہو، تعلق نہ ہو تو وہ عبادت نہیں، بلکہ صرف اٹھنا اور بیٹھنا ہے۔ جیسے بہت سارے لوگ نماز پڑھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے پہلوانی کررہے ہیں، کسرت کررہے ہیں، اٹھ رہے ہیں، بیٹھ رہے ہیں، جھپٹ رہے ہیں اور تیز تیز رکوع وسجدہ ہورہا ہے، اور آزو بازو کے لوگوں کو ذرا اپنی قوت دکھاتے ہوئے مار بھی رہے ہیں۔ یہ کوئی عبادت ہے؟ عبادت تو عاجزی کا نام ہے، عبادت وہ ہے جس کے اندر انتہائی ذلت اور مسکنت بھری ہوئی ہو۔

ڈینگ مارنے والے معرفت سے خالی

اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اللہ والے کبھی اپنی بڑائی نہیں کرتے، وہ ڈینگیں نہیں مارتے، بلکہ وہ تو عاجزی وانکساری والے ہوتے ہیں۔ کسی شاعر نے بہت اچھی بات کہی ہے کہ:

تکمیل بشر نہیں ہے سلطاں ہونا
یا صف میں فرشتوں کے نمایاں ہونا
تکمیل بشر ہے عجز و بندگی کا احساس
انسان کی معراج ہے انساں ہونا

آج ایک طبقہ ولایت کا مدعی ایسا پیدا ہو گیا ہے کہ صرف ڈینگیں مارنا اس کا کام ہے، کبھی ولایت کا دعوی، کبھی کرامت کا دعوی، کبھی بزرگی کا دعوی، یہ سب باتیں اولیاء اللہ کی صفات سے دور ہیں۔ وہ عجز و بندگی کو ہی اپنا سرمایۂ افتخار سمجھتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی انکساری کا حال

اب ذرا یہ بھی دیکھئے کہ ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ کی عاجزی وانکساری کا کیا حال تھا؟ ایک بار آپ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص کو لایا گیا اور اس پر اس وقت آپ کے رعب کی وجہ سے کپکپی طاری ہوگئی، آپ نے اس کو دیکھا تو ایک عجیب انکساری وتواضع کا جملہ فرمایا، وہ یہ کہ: ’’أنا ابن امرأة من قريش كانت تأكل القديد في هذه البطحاء ‘‘ (میں تو قریش کی ایک عورت کا لڑکا ہوں جو سوکھا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی) اور ایک روایت میں یوں ہے کہ اپنے اوپر آسانی کر، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں، ایک عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی۔
(مستدرک: ۱۵۸/۴، ابن ماجہ: ۳۳۱۲)

اللہ اکبر! کیا ٹھکانہ ہے اس عاجزی وانکساری کا! اور یہ درحقیقت اللہ جل شانہ کی عظمت وجلالت کی معرفت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کا بارگاہ الٰہی میں عجز و نیاز

اس عاجزی وانکساری پر آپ ﷺ کی ایک دعا کی طرف ذہن منتقل ہو گیا، جس میں آپ نے اللہ تعالی کے سامنے انتہائی وغایت درجہ کی تواضع وانکساری کا مظاہرہ کیا ہے، وہ دعاء یہ ہے:

’’اَللّٰهُمَّ إِنَّکَ تَسْمَعُ كَلاَمِي وَ تَرٰى مَكَانِي وَ تَعْلَمُ سِرِّي وَ

عَلانِیَتِيْ وَلَا یَخْفٰی عَلَیْکَ شَيْءٌ مِنْ أَمْرِيْ وَ أَنَا الْبَائِسُ الْفَقِیْرُ الْمُسْتَغِیْثُ الْمُسْتَجِیْرُ الْوَجِلُ الْمُشْفِقُ الْمُقِرُّ الْمُعْتَرِفُ بِذَنْبِيْ، أَسْئَلُکَ مَسْئَلَةَ الْمِسْکِیْنِ وَ أَبْتَهِلُ إِلَیْکَ ابْتِهَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِیْلِ وَ أَدْعُوْکَ دُعَاءَ الْخَائِفِ الضَّرِیْرِ مَنْ خَضَعَتْ لَکَ رَقَبَتُهٗ وَفَاضَتْ لَکَ عَیْنَاهُ وَ ذَلَّ جَسَدُهٗ وَ رَغِمَ أَنْفُهٗ لَکَ، اَللّٰهُمَّ لاَ تَجْعَلْنِي بِدُعَائِکَ شَقِیًّا وَّ کُنْ بِيْ رَءُ وْفًا رَّحِیْمًا یَا خَیْرَ الْمُسْئُوْلِیْنَ وَ یَا خَیْرَ الْمُعْطِیْنَ " (اے اللہ! بلا شبہ تو میری بات سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا ہے، اور میری پوشیدہ وظاہر ہر قسم کی بات کو جانتا ہے، اور تجھ پر میری کوئی بات مخفی نہیں، اور میں مصیبت زدہ ہوں، فقیر ہوں، فریادی ہوں، پناہ جو ہوں، ترساں و ہراساں ہوں، اپنے گناہوں کا معترف و اقراری مجرم ہوں، میں تجھ سے مسکین کی طرح سوال کرتا ہوں، اور تیرے سامنے ذلیل گناہ گار کی طرح گڑگڑاتا ہوں، اور تجھ سے خوف زدہ آفت رسیدہ کی طرح مانگتا ہوں، جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہوئی ہو، اور جس کے آنسو بہہ رہے ہوں، اور جس کا جسم تیرے سامنے عاجز ہو، اور جو تیرے سامنے اپنی ناک رگڑتا ہو، اے اللہ! تو مجھے دعا میں ناکام نہ فرما، اور مجھ پر تو رحیم وکریم ہوجا، اے سوال کئے جانے والوں میں سب سے بہتر اور اے عطا کرنے والوں میں سب سے بہتر) (المعجم الکبیر طبرانی: ۱۱/۱۷۴، المعجم الصغیر: ۱۵/۲)

اس دعا کا ایک ایک لفظ جس فروتنی وعاجزی ومسکنت وتواضع وانکساری کا حامل ہے وہ بہت ہی واضح و ظاہر ہے۔ الغرض یہ عجز و انکساری بھی معرفت خداوندی کا ایک اثر ہے۔

اللہ کی معرفت کا ایک اثر توکل علی اللہ ہے

جب بندے کو اللہ کی پہچان ہوتی ہے تو پہچان کے نتیجہ میں وہ اللہ پر اعتماد ضرور کرے گا، اللہ پر بھروسہ ضرور کرے گا، جن لوگوں کو اللہ پر بھروسہ نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ ان کو خدا کی پہچان نہیں ہے۔ کیسے؟ اس لیے کہ جب وہ اللہ کو پہچانے گا تو اللہ کی صفات کی حقیقت سامنے آئے گی کہ میرا اللہ وہ اللہ ہے جو میرے لیے ہر چیز میں بھلائی چاہتا ہے، میرے لیے کوئی مصیبت نہیں چاہتا، میرے لیے کوئی پریشانی نہیں چاہتا، میرے لیے اچھائی اور بھلائی ہی چاہتا ہے، برائی نہیں چاہتا، جو کچھ بھی وہ کرتا ہے ہماری بھلائی کے لئے کرتا ہے۔ تو جب وہ کھلے طور پر یہ دیکھتا ہے تو اس کا دل کہتا ہے کہ اس کے اوپر مجھے کلی اعتماد کرنا ہے کہ جو کرتا ہے صحیح کرتا ہے۔

حضرت علی کا ایمان افروز واقعہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک ایمان افروز ارشاد و واقعہ ملاحظہ کیجئے، وہ یہ کہ مسافر بن عوف بن الاحمر نے ایک بار جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اہل نھروان سے جہاد کے لئے نکلنا چاہتے تھے، کہا کہ آپ اس وقت نہ جائیں اور دن کے تین گھنٹے گزرنے کے بعد جائیں، حضرت علی نے پوچھا کہ کیوں؟ اس نے کہا کہ کیونکہ آپ اس گھڑی میں جائیں گے تو آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو بلاء و شدید نقصان پہنچے گا، اور اگر اس وقت میں جائیں جو میں نے بتایا ہے تو آپ کو کامیابی و غلبہ نصیب ہوگا۔ حضرت علی نے فرمایا کہ حضرت محمد ﷺ کا کوئی نجومی نہیں تھا اور نہ اب تک ہمارا کوئی نجومی ہے، کیا تو جانتا ہے کہ اس تیرے گھوڑے کے پیٹ میں کیا

ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں اگر میں حساب لگاؤں تو جان لوں گا، آپ نے کہا کہ جس نے تیری اس بات کی تصدیق کی اس نے قرآن کی تکذیب کی، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو یہ کہتے ہیں کہ ﴿إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ﴾ (اللہ ہی پاس قیامت کا علم ہے وہی بارش نازل کرتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ ماں کے رحم میں کیا ہے) حضرت محمد ﷺ نے کبھی اس چیز کے جاننے کا دعوی نہیں کیا جس کا تو نے دعوی کیا ہے، کیا تو گمان کرتا ہے تو اس گھڑی و وقت کو جانتا ہے جس میں سفر کرنے سے کوئی برائی لاحق ہوگی؟ اس نے کہا کہ ہاں! آپ نے فرمایا کہ جس نے تیری اس بات کی تصدیق کی وہ گویا برائی کے پہنچانے کے بارے میں اللہ سے مستغنی ہوگیا اور اس کو مناسب ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر تجھے ہی اپنے معاملہ کا متولی بنا دے، کیونکہ تو گمان کرتا ہے کہ تو اس کو اس گھڑی کی جانب ہدایت کرسکتا ہے جس میں سفر کرنے سے وہ برائی سے نجات پا جائے گا، پس جس نے اس بات کو سچ سمجھا مجھے اس پر اندیشہ ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ شرک کرنے والے کی طرح ہے۔

پھر آپ نے فرمایا کہ اے اللہ! کوئی فال نہیں ہے مگر تیرا فال اور کوئی خیر نہیں ہے مگر تیرا خیر، پھر اس شخص سے فرمایا کہ ہم تیری تکذیب و مخالفت کرتے ہیں اور اسی گھڑی میں سفر کرتے ہیں جس سے تو نے روکا ہے، پھر آپ نے لوگوں کو دیکھ کر فرمایا کہ اے لوگو! تم علم نجوم سے بچو، مگر وہ جس سے خشکی و سمندر کی اندھیریوں میں راستہ پاسکو، نجومی تو کافر ہے اور کافر جہنمی ہے۔ پھر اس شخص سے کہا کہ اللہ کی قسم! اگر مجھے یہ بات پہنچی کہ تو علم نجوم میں غور و فکر کرتا اور اس پر عمل کرتا ہے تو میں تجھے تیرے یا میرے رہنے تک حبس دوام میں رکھ دوں گا اور جتنا میرے بس میں ہے

اس قدر تجھ کو بخشش سے محروم کر دوں گا۔

اس کے بعد آپ اسی وقت میں سفر پر نکلے جس میں نکلنے سے اس نے منع کیا تھا، اور اہل نھر وان کے پاس آئے اور ان کو قتل کیا، پھر فرمایا کہ اگر ہم اُس وقت میں چلتے جس میں چلنے کا اس شخص نے حکم دیا تھا اور فتح و غلبہ پاتے تو کوئی کہنے والا یہ کہتا کہ یہ اسی وقت میں چلے تھے جس میں چلنے کا نجومی نے حکم دیا تھا۔ حضرت محمد ﷺ کا کوئی نجومی نہیں تھا اور نہ اب تک ہمارا کوئی نجومی ہے، مگر اللہ نے ہمارے لئے کسریٰ اور قیصر کے شہروں اور دیگر ممالک کو فتح کرا دیا، پس تم اللہ پر توکل کرو اور اسی پر اعتماد کرو، کہ وہی اپنے ماسوا سے ہمارے لئے کافی ہے۔ (مسند الحارث: ۶۰۱/۲، کنز العمال: ۲۳۵/۵)

یہ ہے توکل علی اللہ، جو انسان کو معرفت خداوندی کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے، جس سے انسان یہ سمجھتا ہے کہ میرا پروردگار میرا کارساز حقیقی ہے، مجھے کسی فکر کی ضرورت نہیں۔

ایک شعر اور حضرت تھانوی کی اس میں اصلاح

یہاں مجھے ایک شاعر کا شعر یاد آ گیا، وہ کہتا ہے کہ:

کارساز ما بفکر کار ما — فکر ما در کار ما آزار ما

(ہمارا کارساز حقیقی ہمارے کاموں کی فکر میں لگا ہوا ہے، لہذا ہمارے کاموں میں ہمارا فکر کرنا خود کو تکلیف پہنچانا ہے)

اس شعر میں شاعر نے اللہ کے لئے فکر کا لفظ استعمال کیا ہے، حالانکہ اللہ کو کسی فکر کی ضرورت نہیں، اس لئے حضرت حکیم الامت تھانوی نے فرمایا کہ یہ شاعر جاہل

ہے عارف نہیں، اس لئے اسے یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اللہ کے لئے کیا لفظ استعمال کرنا چاہئے، اور کیا نہ کرنا چاہئے؟ کیا اللہ تعالیٰ کو کسی کے کام بنانے کے لئے فکر کی ضرورت پڑتی ہے؟ نہیں، لہذا حضرت تھانوی نے فرمایا کہ میں اس شعر میں ذرا ترمیم کرتا ہوں، وہ ترمیم یہ ہے کہ:

کارساز مابساز کار ما فکر ما درکار ما آزار ما

اب کیا مطلب ہوا؟ یہ مطلب ہوا کہ ہمارا کارساز حقیقی ہمارے کاموں کے بنانے میں لگا ہوا ہے، لہذا ہمارا خود کے کاموں کی فکر میں لگنا خود کو تکلیف دینا ہے۔

دیکھئے کہ حضرت تھانوی نے کس طرح ذرا سی تبدیلی سے اس شعر کو صحیح کر دیا اور اس کے مضمون کو اسلامی عقیدے سے ہم آہنگ کر دیا۔ الغرض معرفت کا یہ اثر ہے کہ اللہ پر اعتماد و توکل پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ جو بھی فیصلہ کرے، جو بھی کام کرے، سب عین حکمت و مصلحت ہے۔

اللہ ہر کام وقت پر کرتا ہے، ایک بزرگ کا واقعہ

ایک قصہ یاد آ گیا کہ ایک بزرگ جا رہے تھے، بہت سخت گرمی پڑ رہی تھی، یہ بڑی پریشانی کے ساتھ چل رہے تھے، اچانک بارش ہونے لگی، ٹھنڈے ٹھنڈے بارش کے قطرات جب ان کے جسم پر پڑے تو ان کی زبان پر بے ساختہ و بے اختیار ایک جملہ آ گیا، انہوں نے کہا کہ واہ! آج کیا وقت پر بارش ہوئی! اس پر فوراً اللہ کی طرف سے الہام ہوا، اور عتاب نازل ہوا کہ او بے ادب! کیا ہم نے کبھی بے وقت بھی بارش برسائی ہے؟ جو بھی کرتے ہیں وقت پر ہی تو کرتے ہیں، تجھے پیدا کیا تو وقت پر کیا، تجھے ماریں گے تو وقت پر ماریں گے، تجھے بخار دی تو وقت پر دیا، تجھے

صحت دی تو وقت پر دیا۔ کیا مطلب ہوا؟ کہ اللہ تعالی پر جب اعتماد ہو کہ وہ سب کام حکمت و مصلحت کے مطابق کرتے ہیں تو اللہ پر توکل واعتماد کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔

معرفت کا ایک اثر رضا بالقضاء

اور اسی توکل واعتماد سے ایک اور اثر معرفت کا یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عارف باللہ، اللہ تعالی کے ہر فیصلہ پر راضی رہتا ہے۔ اس کو اسلام میں رضا بالقضاء کہتے ہیں۔ یہ بھی ایک اہم اثر وعلامت ہے معرفت الہیہ کا، اس کے بغیر تو ایمان بھی مکمل نہیں ہوتا، لہذا ضروری ہے کہ اللہ کے ہر فیصلہ پر مومن راضی رہے اور راضی رہنے کا مطلب یہ ہے کہ دل اللہ کے ہر فیصلہ پر مطمئن رہے کہ جو بھی اس نے کیا صحیح و درست کیا اور ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعاؤں میں بھی اللہ سے اس کا سوال کیا ہے۔ آپ نے ایک دعا میں فرمایا کہ: ”**أَللّٰهُم إني أَسئلك الرَّضا بالقضاء** “(اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں رضا بالقضاء) (سنن النسائی: ۱۳۰۶، السنن الکبری نسائی: ۳۰،۴۰، کنز العمال: ۳۶۱۱)

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اللہ پر اس کے فیصلوں میں اعتراض کرتے ہیں وہ درحقیقت معرفت الہیہ سے دور ہیں، اگر اللہ کی معرفت ان کو نصیب ہوتی اور وہ اللہ کی اس صفت سے واقف ہوتے کہ وہ حکیم ہے تو اعتراض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اللہ بہترین مربی ہیں

جبکہ قرآن میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کاملہ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ قرآن پاک کے شروع ہی میں ربوبیت کا ذکر ہے: ﴿ **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ**

رَبِّ الْعَالَمِیْن﴾ (تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو تمام عالموں کا پروردگار ہے، رب ہے) رب کے کیا معنی آتے ہیں؟ تربیت کرنے والا، ماں تربیت کرتی ہے، باپ تربیت کرتا ہے، استاذ اور پیرو شیخ بھی تربیت کرتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی تربیت بھی مجازی ہے اور ان کو مربی کہنا بھی مجازی اعتبار سے ہے ورنہ حقیقی مربی تو اللہ جل جلالہ وعم نوالہ ہیں، جو ساری کائنات کے ذرے ذرے کی تربیت کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ انسانوں کو کبھی مختلف قسم کی نعمتیں دے کر اور کبھی ان نعمتوں کو چھین کر اور کبھی بیماری دے کر اور کبھی اس کی جگہ شفا دے کر ان کی تربیت کرتا ہے، حوادثات، پریشانیاں، مصائب، اور مختلف قسم کے جھنجھوڑ کر رکھ دینے والے حالات و واقعات، یہ سب کچھ پیش آتے رہتے ہیں، یہ ساری کی ساری چیزیں دراصل اللہ کی ربوبیت و تربیت کے نتیجہ میں پیش آتی رہتی ہیں۔

بعض وقت بعض بیماریاں آجاتی ہیں تو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ مریض کو کھانا بالکل نہ دیا جائے، تو کیا آپ یہ حکم لگادیں گے کہ ڈاکٹر صاحب بڑے ظالم ہیں؟ ڈاکٹر کو ظالم کہتے ہیں یا رحیم کہتے ہیں؟ بلکہ سب رحیم ہی کہتے ہیں۔ بھائیو! کیوں؟ اس لئے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بات جو ڈاکٹر صاحب نے کہی یہ ان کے علم طب کا تقاضا ہے، اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کبھی ہمارا کھانا بند کر دیتا ہے، فقر و فاقہ میں مبتلا کر دیتا ہے، کبھی کسی اور بیماری و پریشانی میں مبتلا کر دیتا ہے تو ہم اللہ کو کیوں رحیم نہ کہیں۔

ہم نہیں جانتے کہ ہمارے لئے کس میں بھلائی ہے، مگر اللہ جانتے ہیں کہ ہمارے لئے کیا مفید ہے، کیا غیر مفید ہے، اللہ ہی مصلحتوں کو جاننے والے ہیں، وہ حکیم ہیں، ان کا ہر کام کسی حکمت پر مبنی ہوتا ہے، کبھی وہ ہمیں دنیوی پریشانی دیکر

ہماری آخرت بنانا چاہتے ہیں ۔جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشادفرمایا: "ما یصیبُ المسلمُ من نصب ولا وصب ولا هم ولا حزن ولا أذى ولا غم حتى الشوكة يشاكها إلا كفر الله بها من خطاياه"(مسلمان کوکوئی کانٹا لگے بیماری ہو جائے ، یا کوئی پریشانی پہنچے، یا کوئی غم ، یا کوئی تکلیف واذیت حتی کہ کوئی کانٹا چبھے تو اللہ اس سے اس کی خطاؤں کا کفارہ کر دیتے ہیں)

(صحیح بخاری:۵۳۱۸،صحیح ابن حبان:۲۹۰۵،الادب المفرد: حدیث:۴۹۲)

اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اس سے ایک نیکی بھی لکھی جاتی ہے ۔(مسلم: ۶۷۳۲،مسند احمد:۱۶۶۰۹)

یعنی تمہیں ایک کانٹا چبھتا ہے تو تمہارا ایک گناہ مٹایا جاتا ہے اور ایک نیکی لکھی جاتی ہے، ٹھوکر لگتی ہے، ایک گناہ مٹایا جاتا ہے اور ایک نیکی لکھی جاتی ہے ۔غرض جو بھی تکلیف دہ بات پیش آئے ، اس پر ایک نیکی لکھی جاتی ہے ،اور ایک ایک گناہ مٹایا جاتا ہے۔

ایک دوسری حدیث پاک میں آتا ہے، اللہ کے نبی ﷺ نے ارشادفرمایا کہ ایک رات کا بخار ایک سال کے گناہوں کو دھو دیتا ہے۔(مسند قضاعی:۶۱)

غور کریں کہ جسے ہم تکلیف سمجھتے ہیں، اس میں دراصل ہماری آخرت بن رہی ہے، کتنی بڑی نعمت ہے، اس لئے ہمیں چاہئے کہ اللہ کے ہر فیصلہ پر راضی رہیں، اسی کا نام رضا بالقضا ہے جو بہت بڑی دولت ہے، جس پر حدیث میں بڑی فضیلت بھی آئی ہے۔چنانچہ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشادفرمایا:

ذَاقَ طعْمَ الایْمان مَنْ رَضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِياً وَرَسُوْلاً "(وہ آدمی ایمان کا مزا چکھ لیا جو اللہ سے رب ہونے کی حیثیت سے

راضی ہو گیا، اور اسلام سے دین ہونے کی حیثیت سے راضی ہو گیا اور محمد ﷺ سے نبی اور رسول ہونے کی حیثیت سے راضی ہو گیا) (مسلم: ۱/۴۷)

معلوم ہوا کہ معرفت کا ایک اثر رضا بالقضاء بھی ہے۔ یہ سارے آثار جس بندے پر ظاہر ہوں سمجھا جائے گا کہ اس کو اللہ کی معرفت حاصل ہے۔

اب دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی ہم تمام لوگوں کو اپنی معرفت کا ایک حصہ عطا فرمائیں اور اس کے ذریعہ محبت الٰہی اور خوف الٰہی وغیرہ آثار معرفت کی دولت سے بھی مالا مال فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

شیطانی حربے

باسمہ تعالیٰ

شیطانی حربے

أعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ، ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ﴾ (آل عمران:۱۴)

(خوشنما بنادی گئی ہے لوگوں کے لئے خواہشوں کی محبت یعنی عورتیں اور بیٹے، اور بڑے بھاری مال سونے کے اور چاندی کے، اور نشان لگائے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتیاں، یہ دنیا والی زندگی کا فائدہ اٹھانا ہے، اور اللہ کے پاس ہے اچھا ٹھکانہ)

حضرات! ایک آیت آپ کے سامنے تلاوت کی گئی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ حب الشہوات'' یعنی دنیا کی جولذتیں اور خواہشیں اور انسان کے دل کو اپیل کرنے والی چیزیں ہیں، یہ انسان کے لیے مزین کردی گئی ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ''حب الشہوات'' کی تفسیر بیان کی کہ حب الشہوات سے مراد یہ دنیا کی مختلف چیزیں یعنی بیویاں ہیں، بچے ہیں، مال ہے، دولت ہے، سونا ہے، چاندی ہے، پیسہ ہے، یہ ساری چیزیں دنیا کی چیزیں ہیں۔ اللہ نے ان کا لقب رکھا ہے: ''الشہوات''،

اور فرمایا کہ ان خواہشات کی محبت انسان کے لیے مزین کر دی گئی ہے۔

لفظ ''زُيِّنَ'' استعمال کیوں فرمایا؟

یہاں ''زُيِّنَ'' کا لفظ یہ بتا رہا ہے کہ حقیقت میں دنیا کی یہ چیزیں ایسی نہیں ہے، جیسی نظر آتی ہیں، اگر حقیقت میں بھی ایسی ہوتیں تو پھر لفظ مزین لانے کی کوئی ضرورت ہی نہ ہوتی، کیونکہ جو چیز ہو کالی، اسے آپ کچھ رنگ روغن مسالہ لگا کر بنادیں گوری، تب کہا جائے گا کہ مزین کر دیا گیا ہے، آج کل لوگ ملمع سازی کرتے ہیں، کوٹنگ کرتے ہیں، بہت ساری چیزوں کی کوٹنگ ہوتی ہے، لوہے کی کوٹنگ کی اور سونے کا پانی اس پر چڑھا دیا، دیکھنے میں ایسا لگ رہا ہے، جیسا کہ سونا ہوتا ہے، آج کل عورتوں کے زیورات بھی ایسے آنے لگے ہیں۔ آپ دیکھیں تو ایسے معلوم ہوں جیسے کہ یہ واقعی سونا ہیں، لیکن حقیقت میں یہ سونا نہیں ہے، بلکہ سوجانا ہے، کوئی طاقت نہیں ہے اس کے اندر، لیکن دیکھنے میں بالکل ایسا ہی لگے گا جیسے کہ سونا ہو، اسی طرح مختلف چیزوں پر رنگ وروغن مسالہ لگا کر اس کو مزین کر دیا جاتا ہے، ملمع سازی کرنے کے بعد دیکھنے میں چیزیں اچھی لگتی ہیں، حالانکہ حقیقت میں یہ چیزیں کچھ اور ہوتی ہیں۔

اسی طرح دنیا کی جو چیزیں آپ کو نظر آتی ہیں، چاہے وہ عورتیں ہوں، چاہے تمہاری اولاد ہو، چاہے مال ہو، دولت ہو، سونا ہو، چاندی ہو، یہ سب کی سب چیزیں جو تم کو بہت بھلی اور اچھی لگتی ہیں، پیاری لگتی ہیں، یہ دراصل سب کوٹنگ کی ہوئی چیزیں ہیں، مزین کر دی گئی ہیں، ان کی اصلیت وہ نہیں ہے جو نظر آ رہی ہے۔ اس جانب توجہ دلانے اور اشارہ کرنے کے لئے یہاں لفظ ''مزین'' لایا گیا۔

اگر ان چیزوں کی حقیقت انسان کے سامنے کھل جائے تو خدا کی قسم وہ اِن

چیزوں کو دیکھنا بھی گوارہ نہ کرے۔وہ کہے گا کہ یہ چیزیں دیکھنے کے قابل ہیں؟ دیکھنے کے بھی قابل نہیں ہیں،لیکن اس کے باوجود انسان چوں کہ مزین کردہ چیزوں سے متاثر ہوجاتا ہے، اس لیے ان چیزوں کے اوپر فریفتہ ہوتا رہتا ہے۔ سونا دیکھا منہ میں پانی آ گیا، چاندی دیکھا رال ٹپکنے لگی،روپیہ اور پیسہ سامنے آیا، دل اس کے اوپر ریجھنے لگا، اور مختلف قسم کی چیزیں دیکھیں، دل ان کے اوپر آ گیا۔ لیکن حقیقت میں یہ چیزیں اس قابل نہیں ہیں کہ ان سے دل لگایا جائے اور ان پر فریفتہ ہوا جائے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ دنیا کی چیزیں انسان کے لیے مزین کردی گئی ہیں۔آگے چل کر اللہ تعالیٰ نے خود ہی فرمادیا ہے: ﴿ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا﴾ (یہ تو دنیا کی چیزیں ہیں، دنیا کا ساز وسامان ہے) اور اصل چیز وہ تو اللہ تعالیٰ کے پاس میں رکھی ہوئی ہے جو حقیقت کے اعتبار سے بھی اچھی ہے اور بھلی ہے یہاں تو جو کچھ بھی نظر آتا ہے، یہ صرف دیکھنے میں اچھا معلوم ہوتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے سامنے بھی دنیا کو مزین کر کے پیش کیا گیا تھا

حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب معراج تشریف لے گئے تو اس موقعہ پر ایک واقعہ پیش آیا کہ نبی اکرم ﷺ کے سامنے ایک عورت آئی اور مزین تھی، اپنے آپ کو اس نے آراستہ پیراستہ کیا تھا، زیورات کے ساتھ اور مختلف زیب وزینت کی چیزوں کے ساتھ، نبی اکرم ﷺ کی طرف بڑھتی ہوئی آئی، اللہ کے نبی علیہ السلام نے چہرہ پھیرلیا، پھر دوبارہ بھی آئی، اللہ کے نبی علیہ السلام نے پھر چہرہ پھیرلیا، تیسری دفعہ بھی ایسا ہی ہوا۔ جبرئیل امین علیہ السلام نے آگے بڑھنے کے بعد نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا، یارسول اللہ! آپ نے پہچانا کہ یہ عورت کون تھی؟ آپ

نے فرمایا کہ نہیں میں نے نہیں پہچانا، کون تھی یہ عورت؟ جبرئیل امین علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ عورت نہیں بلکہ دراصل دنیا تھی، اور یہ بوڑھی ہو چکی ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو آراستہ پیراستہ، مزین کر کے آپ کو بہکانے کے لیے آئی تھی۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ اس کی طرف نظر بھی نہیں فرمائی، اگر آپ خدانخواستہ اس عورت کو دیکھ لیتے تو آپ کی پوری امت ہلاک ہو جاتی۔ (تفسیر ابن کثیر: ۵/۳)

اس ناپاک دنیا کو اللہ کے نبی علیہ السلام نے دیکھا نہیں اور امت کا یہ حال ہے کہ وہ اس میں ملوث ہے۔ اور اگر اللہ کے نبی دیکھ لیتے تو پھر کیا ہوتا؟ اس سے اندازہ کیجیے کہ آج ہم لوگوں کے اندر کتنا قصور اور فتور پیدا ہو گیا ہے اور ایمانی اعتبار سے کس قدر کمزوری آ گئی ہے کہ ہمارے نبی علیہ السلام نے جس کو دیکھا تک نہیں، آج ہم اسی کے اندر پوری طرح ملوث ہو گئے ہیں، اسی مال کے لیے، پیسے کے لیے، اسی دنیا کے لیے، زیب و زینت کی چیزوں کے لیے، انسان اپنا سب کچھ خرچ کر دیتا ہے، اپنی جوانی لگا دیتا ہے، اپنی ساری طاقت گنوا دیتا ہے، اپنی آنکھوں کی طاقت، کانوں کی طاقت، دل کی طاقت، دماغ کی طاقت، سب اسی کے پیچھے لگایا ہوا ہے، بس ہر وقت اسی فکر میں ہے کہ کس طرح کماؤں، کس طرح جمع کروں، کس طرح کھاؤں، کس طرح گنواؤں؟ پھر اسی اُدھیڑ بن میں پوری زندگی گزر جاتی ہے، جب کہ یہ دنیا اس قابل تھی کہ اللہ کے نبی علیہ السلام نے جس طرح اس کے ساتھ برتاؤ کیا ہمیں بھی اسی طرح برتاؤ کرنا چاہیے تھا کہ ہم اس کی طرف نہ دیکھتے، منہ پھیر لیتے، لیکن اس کے تزین و ملمع کاری نے ہم لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے، اس لیے انسان دنیا کی چیزوں کی طرف لپکتا چلا جاتا ہے۔

''زُيِّنَ'' صیغۂ مجہول لانے کی عجیب حکمت

یہاں ایک اور بات سنتے چلئے، وہ یہ کہ اس آیت کریمہ میں ''زُيِّنَ'' کا جولفظ آیا ہے، عربی پڑھنے والے جانتے ہیں کہ یہ مجہول کا صیغہ ہے، مجہول میں اصل فعل مجہول نہیں ہوتا، بلکہ فاعل مجہول یعنی نا معلوم ہوتا ہے۔ بظاہر تو کہتے ہیں فعل مجہول، حقیقت میں وہ فاعل مجہول ہے۔ فعل تو نظر آرہا ہے، معلوم ہورہا ہے، وہ مجہول کہاں ہے؟ وہ فعل تو یہاں بھی معلوم ہوگیا کہ وہ ''تزین وملمع کاری'' ہے، تزئین ہے، زیب وزینت ہے۔ یہ تو خود ہی پتہ چل رہا ہے، جس چیز کا پتہ ہو وہ مجہول کہاں ہے وہ تو معروف ہے، ہاں یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ مزین کرنے والا کون ہے، اس کو مجہول رکھا گیا ہے۔ کیوں؟

اس کو سمجھنے سے پہلے ایک بات سمجھ لیں کہ قرآن کریم میں ''تزئین کاری'' کا ذکر اور جگہ بھی آیا ہے، اور بعض جگہ اس کا فاعل بھی بتایا گیا ہے، نیکی کے سلسلہ میں اللہ تبارک وتعالی کو فاعل بتایا ہے، جیسے فرمایا کہ: ﴿ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ﴾ (اور لیکن اللہ نے ایمان کو تمہارے نزدیک محبوب بنایا اور اس کو تمہارے قلوب میں مزین کردیا) اور برائی کے موقعہ پر شیطان کو اس کا فاعل کہا ہے، جیسے فرمایا کہ: ''وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ '' (اور یاد کرو جبکہ شیطان نے ان کے برے اعمال کو ان کے لئے مزین کیا)

مگر یہاں اس آیت میں اللہ تعالی تزئین کاری کے فاعل کو مجہول کے صیغہ میں چھپا دیا، کیوں؟ اس کی وجہ بندے کے نزدیک یہ معلوم ہوتی ہے کہ دنیا اور دنیا کی چیزیں جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، یہ مطلقا نہ بری ہیں نہ مطلقا اچھی، بلکہ اگر ان کو خدا کے حکم ورسول کی تعلیم کے مطابق استعمال کیا جائے تو اچھی ہیں اور یہی چیزیں

آخرت کا وسیلہ بن جاتی ہیں، اور اگر ان چیزوں کا خدا کے حکم اور رسول کی تعلیم کے مطابق استعمال کیا جائے تو یہ بری اور وبال جان بن جاتی ہیں۔ لہذا ان چیزوں میں ایک پہلو بھلائی کا ہے، لہذا اس پہلو سے ان چیزوں کا مزین ہونا اللہ کی جانب منسوب ہوگا اور ایک پہلو ان میں برائی کا ہے، اور اس لحاظ سے ان کا مزین ہونا شیطان کی جانب منسوب ہوگا۔ اس لئے اللہ تعالی نے اس کام کے فاعل کو مجہول کر دیا، تاکہ دونوں پہلو کی جانب اشارہ ہو سکے۔

اس تقریر سے ایک بہت بڑی حقیقت سامنے آ گئی، وہ یہ کہ دنیا فی نفسہ نہ اچھی ہے نہ بری، بلکہ اگر اللہ کے حکم کے مطابق استعمال ہو تو اچھی ہے ورنہ بری ہے۔ ہاں عام طور پر چونکہ اس کا استعمال لوگ غلط طور پر کرتے ہیں، اور اس کے ذریعہ شیطان بہکاتا ہے اس لئے اس کو برا کہا جاتا ہے۔

عورت شیطان کا ایک حربہ

بہر حال اب اس پر غور کیجئے کہ اللہ تعالی نے یہاں آیت کریمہ میں ''شہوات'' کی تفسیر میں جو چیزیں بیان کی ہیں ان میں سے ایک ''عورتیں'' ہیں، جن کو شیطان ملمع کاری کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ شیطان گمراہ کرنے کے لیے عورت کو اپنا ایجنٹ بناتا ہے۔ ایک بزرگ حسن بن صالح فرماتے ہیں کہ میں نے شیطان کو سنا کہ وہ عورت سے کہہ رہا تھا کہ:

'' أنتِ نصف جندي، أنتِ سهمي الذي أرمي به فلا أخطأ و أنتِ موضع سري ، و أنتِ رسولي في حاجتي'' (تو میری آدھی فوج ہے، اور تو میرا وہ تیر ہے جس سے میں شکار کرتا ہوں، میں خطا نہیں کرتا اور تو میری راز دار اور حاجت کے وقت میری قاصد ہے) (مکائد الشیطان، ابن ابی الدنیا: ۵۹)

اورحدیث میں بھی یہ مضمون موجود ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: النساء حبائل الشیطان"(عورتیں شیطان کا شکار کا آلہ ہیں)(جامع الاصول: حدیث:۸۴۸۰)

عورت کے ذریعہ شیطان انسان کو پھانسنے کی، گمراہی میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بہت حد تک کامیاب ہوجاتا ہے، بڑے بڑے لوگ پھنس جاتے ہیں، کبھی ایمان کھودیتے ہیں، صرف لذت کی وجہ سے، خواہش کی وجہ سے، اور یہ چیز انسان کو کبھی اندھا بنادیتی ہے، کبھی بہرہ بنادیتی ہے، کبھی گونگا بنادیتی ہے۔ جیسے حدیث میں ہے کہ: "حُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِيْ وَيُصِمُّ "(کسی چیز کی محبت انسان کو اندھا و بہرا بنادیتی ہے)(شعب الایمان:۳۶۸/۱)

اس لئے انسان بے سوچے سمجھے، اندھا بہرا ہوکر عورت پر فریفتہ ہوجاتا ہے، اس کو خود بھی اس کا عیب نظر نہیں آتا اور دوسرے اس کو سمجھائیں بتائیں تو وہ بہرا بن جاتا ہے۔

دنیا کی عورتوں اور جنت کی حوروں کا فرق

دنیا کی عورتوں کو شیطان ملمع کاری کے ذریعہ حسین دکھاتا ہے، جبکہ انسان کو غور کرنے سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ دنیا کی عورت میں کس قدر کھوٹ وعیب ہے۔ قرآن کریم نے اسی لئے دنیا کی عورتوں کے مقابلہ میں جنت کی حوروں کا تذکرہ کرکے ان کے فرق کو بتایا ہے۔ تاکہ شیطان کی ملمع سازی اور تزیین کاری کو پہچانا جائے۔

اس سلسلہ میں غوروفکر کے لئے قرآن کریم میں بعض جگہ اشارات دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالی نے بعض جگہ جنت کے ذکر میں فرمایا:

﴿لَھُمْ فِیْهَا اَزْوَاجٌ مُّطَھَّرَةٌ﴾[البقرۃ:۲۵،النساء:۵۷]

یعنی جنت میں جنتیوں کو جو بیویاں حوریں ملیں گی وہ مطہر یعنی پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ پاکیزہ بیویاں، جن کے اندر نجاست نہیں، گندگی کا نام ونشان نہیں، بالکل پاک وصاف۔

یہ طہارت دو قسم کی ہے۔ایک ظاہری طہارت اور ایک باطنی طہارت۔ظاہری طہارت کیا؟ پاخانہ نہیں ہوگا، پیشاب ان سے نہیں نکلے گا، پسینہ نہیں نکلے گا، اسی طرح اور جو مختلف قسم کے فضلات انسان کے جسم سے نکلتے ہیں جو کبھی نفرت کا باعث بنتے ہیں، ان ساری چیزوں سے جنت کی حوریں پاک ہوں گی اور باطنی اعتبار سے مطہرہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دل کے اعتبار سے بھی بہت پاکیزہ ہوں گی، اخلاق کے اعتبار سے بھی بہت پاکیزہ ہوں گی، ان کے اندر کوئی عیب نہ ہوگا۔ یہ اس کا مطلب ہے۔

سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر اتنا بھی فرما دیے ہوتے: ﴿فِیْهَا اَزْوَاجٌ﴾ (جنت میں بیویاں ملیں گی) تو بات کافی ہوجاتی لیکن ''مطہرہ'' کہہ کر بتانا یہ چاہتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے غور کرو کہ دنیا کی عورتوں کا کیا حال ہے؟ آدمی عورت کو بہت پسند کرتا ہے، حالانکہ اسے پاخانہ بھی لگتا ہے؟ اس سے پیشاب بھی نکلتا ہے، ماہواری خون بھی جاری ہوتا ہے، اور گندگیاں بھی ہوتی ہیں، اور غسل نہ کرے تو بدن کے اندر بدبو پیدا ہوجاتی ہے، منہ اگر نہ دھوئے تو منہ کے اندر بدبو پیدا ہوجاتی ہے، گویا ساری گندگیوں کا مرکز اور معدن بن جاتی ہے۔ یہ ہے دنیا کی عورت کا حال جس پر تم فریفتہ ہوتے ہو۔

اور رہی اخلاق اور کردار کے اعتبار سے تو وہ معلوم ہی ہے، اسے تو کہنے کی

ضرورت ہی نہیں ہے کہ یہاں کی عورتوں کا کیا حال ہوتا ہے، بداخلاقی ، بدزبانی ، ناشکری، ان کے اندر عیوب ہی عیوب ہوتے ہیں۔

تو دیکھئے بظاہر عورت دیکھنے میں اچھی لگتی ہے، انسان اس کی طرف مائل ہوجاتا ہے، لیکن یہ ملمع سازی ہے، تزئین کاری ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے عورت ساری گندگیوں کا مرکز اور معدن ہے۔

شیطان کا دوسرا حربہ اولاد

اس آیت میں دوسری چیز جو "شہوات" کی تفسیر میں آئی ہے وہ ہے: "البنین" یعنی اولاد، جس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان اولاد کو مزین کر کے ماں باپ کو دکھاتا ہے اور وہ ان کی محبت میں اس طرح گرفتار ہوجاتے ہیں کہ اندے بہرے بن جاتے ہیں۔اور کبھی حلال وحرام کی تمیز کھو بیٹھتے ہیں اور کبھی احکام شریعت سے لاپرواہی برتتے ہیں ۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اولاد کی وجہ سے آدمی جہنم میں جاگرتا ہے۔اسی لئے قرآن نے اولاد کو بھی مال کی طرح ایک فتنہ قرار دیا ہے ۔فرمایا کہ: " **وَاعْلَمُوْا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ** "[الانفال: ۲۸](جان لو کہ تمہارے اموال اور اولاد فتنہ ہیں)اور علامہ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ فتنہ کے اصل معنی تو امتحان وآزمائش کے ہیں، لیکن عرف میں امتحان کے برے نتیجہ کو فتنہ کہتے ہیں۔(الاکمال المعلم :۲۹۸/۱)

لہذا اولاد کے سلسلہ میں انسان اللہ کی آزمائش میں عموما برا نتیجہ لاتا ہے یعنی ناکام ہوجاتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:" **اَلْوَلَدُ مَجْبَنَةٌ مَبْخَلَةٌ مَجْهَلَةٌ**"(اولاد انسان کو بزدل، بخیل اور جاہل بناتی ہے)(اتحاف الخیرۃ:۶۷۶۳، مصنف عبد الرزاق:۲۰۱۴۳)

اور ایک روایت میں " مَحْزَنَةٌ "(غم میں ڈالنے والی) کا اضافہ ہے۔ اس حدیث کی شرح میں علامہ مناوی نے لکھا ہے کہ: بخیل بناتی ہے کیونکہ اولاد کی وجہ سے ماں باپ نیکی وقرب کے کاموں میں خرچ کرنے سے سے کنجوسی کرتے ہیں اور بزدل بناتی ہے کیونکہ اولاد کی محبت میں باپ جہاد میں جانے اور اللہ کے لئے ہجرت کرنے سے باز رہتا ہے، اور جاہل بناتی ہے کیونکہ اولاد کی محبت اور اس کے لئے نان نفقہ کی فکر اس کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے سفر سے روکتی ہے، اور وہ جاہل ہی رہ جاتا ہے، اور غم میں ڈالنے والی ہے کیونکہ اولاد کبھی بیمار ہو یا کوئی اور چیز کا مطالبہ کرے جس کو والدین پورا نہ کرسکیں تو وہ اس کی وجہ سے غمگین ہوتے ہیں۔(التیسیر: ۶۱۵/۱، فیض القدیر: ۲۶۲/۶)

بہ ہر حال یہ اولاد کا فتنہ بھی بڑا سخت و شدید فتنہ ہوتا ہے، مگر کب؟ اس وقت جب انسان اولاد کی محبت میں اندھا بہرا ہوجاتا ہے۔ اس صورت میں یہ اولاد شیطان کا ایک حربہ ہے، جس سے وہ لوگوں کو مات دیتا ہے۔

دنیا کا ساز وسامان تیسرا شیطانی حربہ

اس آیت کریمہ میں تیسری چیز "شہوات" کی تفسیر میں دنیا کے مال ومتاع اور مختلف قسم کے ساز وسامان کو بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا کہ:

" وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ " (آل عمران)

یہ ساز وسامان، سونا چاندی، گھوڑے، چوپائے اور کھیتیاں بھی انسان کو مزین کر کے دکھائے جاتے ہیں، جس سے وہ دھوکہ میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ یہ چیزیں بڑی لائق وفائق ہیں، بڑی بہترین وعمدہ ہیں حالانکہ ان کی برائی وقباحت اس

قدر ہے کہ وہ اپنانے کے قابل نہیں۔مگر شیطان ان کو اس طرح مزین کر دیتا ہے کہ انسان خوامخواہ ہی ان کی جانب میلان کرتا ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ یہ مال ومتاع در حقیقت ایسا ہے جیسے پیشاب کے ڈھیلے، کہ ضرورت پر ان کا استعمال لازم ہے مگر ان سے محبت کرنا، ان کو گلے سے لگانا، اور ہر وقت ان ہی کی فکر میں لگا رہنا بڑی کم عقلی و بے وقوفی کی بات ہے۔

متاع کی تفسیر اور صاحب بن عباد کا واقعہ

اسی لئے یہاں قرآن نے دنیا کے ساز وسامان کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ: ''**ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا**'' (یہ سب دینوی زندگی کا سامان ہے) یہاں سامان کے لئے ''متاع'' کا لفظ آیا ہے، اور متاع حقیر قسم کی چیز وسامان کو کہتے ہیں۔ صاحب بن عباد ایک بہت بڑے عالم و ادیب گزرے ہیں اپنے وقت میں مؤید الدولہ بن رکن الدولہ کے وزیر بھی تھے، بڑے لغوی اور عربی زبان کے ادیب تھے، ان کا واقعہ ہے کہ ایک بار ان کو اس لفظ کی تحقیق کی ضرورت پڑ گئی۔انھوں نے سوچا کہ عربی زبان کی اصل کو معلوم کرنے دیہاتوں میں جانا چاہئے، کیونکہ وہاں زبان اپنی اصلیت پر باقی رہتی ہے، برخلاف شہروں کے کہ وہاں مختلف علاقوں کے لوگوں سے میل جول کی وجہ سے عربی زبان اپنی اصلیت پر باقی نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں مختلف گاؤں دیہاتوں میں اس لفظ کے معنے جاننے کے لئے گھومتا رہا، ایک جگہ دیکھا کہ ایک دیہاتی عربی لڑکا بیٹھا ہے، میں اس کے پاس چلا گیا، اور اس کے بازو بیٹھ گیا، اور اس کے قریب ایک کپڑا پڑا ہوا تھا جو زمین وغیرہ پوچھنے اور صاف کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اتنے میں ایک کتا آیا اور وہ پوچھنے کا کپڑا

اٹھا کر لے گیا۔ کچھ دیر بعد اس لڑکے کی ماں آئی تو اس لڑکے نے ماں سے کہا کہ:
"جاء الرقيم و أخذ المتاع و تبارك الجبل" (کہ کتا آیا اور متاع اٹھایا اور پہاڑ پر چڑھ گیا) علامہ صاحب بن عباد کہتے ہیں کہ اس سے مجھے سمجھ میں آیا کہ متاع کی کیا حقیقت ہے؟ اس لڑکے نے پوچھنے کے کپڑے کے لئے جو ایک معمولی وحقیر چیز ہوتی ہے اور سجانے کے نہیں بلکہ چھپانے کے قابل ہوتی ہے اس کو متاع کہا۔ لہذا متاع کے معنے یہ ہوئے کہ جو چیز ضرورت کی ہو، مگر حقیر ہو، معمولی درجہ کی ہو، جیسے پوچھنے کا کپڑا، اس کو عربی میں متاع کہتے ہیں۔

اللہ اکبر! قرآن کریم میں دنیا کے ساز وسامان کے لئے یہ لفظ لا کر یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا کا یہ مال ودولت اگرچہ کہ ایک ضرورت کے لئے ہے مگر وہ دل لگانے اور شوکیس میں سجانے اور لوگوں کو دکھانے کے قابل نہیں ہے۔ کیا کوئی پوچھنے کے کپڑے کو شوکیس میں سجاتا ہے؟ کیا کوئی اس کو دل سے لگاتا ہے، اس سے محبت کرتا ہے؟ نہیں، اسی طرح دنیا کو بھی سمجھنا چاہئے۔

الغرض یہ دنیا بھی مزین کر کے شیطان لوگوں کو دھوکہ دیتا ہے اور اس کو اپنے ایک حربے کی طرح استعمال کرتا ہے۔

دنیا کے ذریعہ شیطان کس طرح بہکاتا ہے؟

اس پر ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک دفعہ ایک آدمی نے دیکھا کہ ایک جگہ درخت ہے اور لوگ اس درخت کی پوجا کر رہے ہیں، تو اس آدمی کے دل کے اندر ایک عزم ایک حوصلہ پیدا ہوا کہ اس درخت کو اکھاڑ دینا چاہئے، اس لیے کہ یہ درخت لوگوں کو، اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف آنے سے مانع بن رہا ہے اور اس کے بجائے شرک و گمراہی اور کفر میں پھنسنے کا ذریعہ بن رہا ہے۔

چنانچہ وہ شخص کچھ ہتھیار لے کر گیا اور درخت کو اکھاڑنا شروع کیا، شیطان آیا اور کہنے لگا کہ کیا کررہے ہو؟ تو اس نے کہا کہ میں اس درخت کو اکھاڑنا چاہتا ہوں، اس لیے کہ اس درخت کی وجہ سے بہت سے اللہ کے بندے کفر میں پھنس رہے ہیں، اور شرک کا ارتکاب کررہے ہیں۔ شیطان نے کہا کہ نہیں نہیں، تم ایسا مت کرو، اس کو یہاں کے لوگوں نے اب تک پالا اور بڑھایا ہے، اور اس کے پیچھے ہم نے محنت کی ہے۔ مگر اس شخص نے کہا کہ نہیں نہیں، میں تو اللہ کے لیے آیا ہوں اور یہ کام میں کرکے رہوں گا۔ اس نے اپنا پورا عزم بتایا، پورا حوصلہ بتایا،۔ جب شیطان نے اس کا یہ عزم دیکھا تو اس کی ہمت اور طاقت کے مقابلہ میں شیطان مجبور ہوگیا، اس لیے کہ اخلاص کے ساتھ جب عمل ہوتا ہے تو اس کے اندر بڑی قوت ہوتی ہے اور شیطان اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا تو شیطان عاجز آ گیا۔ پھر سوچنے لگا کہ کس طرح اس کو اس نیکی سے روکوں؟ اس کی سمجھ میں ایک بات آ گئی، شیطان نے اس سے عاجزی سے کہا کہ میری ایک درخواست ہے اس کو سن لیں۔

اس نے کہا کیا درخواست ہے؟ شیطان نے کہا کہ درخواست یہ ہے کہ تم اس کام کو چھوڑ دو تو میں روزانہ تمہیں دو درہم دے دیا کروں گا، دو درہم روزانہ بغیر کسی محنت مزدوری گھر بیٹھے مل جائیں گے۔

یہ سنا تو دل میں دنیا کی لالچ آ گئی، اس نے کہا کہ اچھا دو درہم مجھے روزانہ ملیں گے، کون اسکا ذمہ دار ہوگا؟ شیطان نے کہا میں ذمہ دار ہوں، میں تجھے پیش کروں گا اور پیش بھی اس طرح کروں گا کہ روزانہ فجر کی نماز پڑھ کر مصلے سے اٹھیں گے تو تمہارے مصلے کے نیچے مل جائیں گے۔

اس نے کہا ٹھیک ہے دیکھتے ہیں، اب جو عزم لے کر آیا تھا، مال پیسے کی وجہ

سے وہ ختم ہوگیا، اور واپس اپنے گھر چلا گیا، رات سوکر صبح اٹھا، فجر کی نماز پڑھی اور اس کے دل ودماغ میں وہی دودرہم تھے، مصلے کے پاس گیا اور دیکھا تو واقعی مصلے کے پاس دودرہم اس کو مل گئے، اٹھایا اور جیب میں ڈال لیا، اور اس کے بعد دن بھر اپنے کام میں مصروف رہا، پھر دوسرا دن ہوا، اسی طرح فجر کے بعد مصلے کے پاس دودرہم مل گئے۔

اب روزانہ یہی تماشا ہوتا ہے کہ فجر پڑھ کے وہاں جاتا ہے دودرہم مل جاتے ہیں، مہینہ دومہینہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا، اس کے بعد شیطان نے درہم دینا بند کردیا۔ اب جب دودرہم نہیں ملے تو یہ شخص پھر اپنے ہتھیار وغیرہ لے کر وہاں پہنچا کہ درخت کو اکھاڑ دوں گا، شیطان بھی وہاں موجود تھا، جب اس نے وہ درخت اکھاڑنا چاہا تو شیطان نے کہا: کیا کررہے ہو؟ کہا: درخت اکھاڑوں گا، اس لئے کہ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ دودودرہم دیا کروں گا، کئی دنوں سے تم نے دیا نہیں، اب میں پھر وہی کام کروں گا جو پہلے کرنے آیا تھا۔ شیطان نے کہا کہ کرلے جو کرنا ہے، لیکن تجھے اس پر کوئی قدرت نہ ہوگی۔ اس نے کہا کہ کیوں؟ کہا کہ تو پہلے آیا تھا اللہ کے لیے، اب آیا ہے پیسے کے لیے، وہاں اخلاص موجود تھا اور یہاں اخلاص موجود نہیں ہے، اب تو اس میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد وہ آدمی اپنا منھ لیکر رہ گیا۔

بھائیو! اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کس طرح اپنے پھندے میں پھانسنے کے لیے لوگوں کو مال سے، پیسے سے، اپنی طرف مائل کرتا ہے۔

ایک بڑا شیطانی حربہ جہالت ہے

شیطان کا ایک مکر اور سب سے بڑا حربہ جہالت کی راہ سے ہوتا ہے۔ جب شیطان آدمی کو دیکھتا ہے کہ جاہل ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کے پاس صحیح علم نہیں، اور

اسے معلوم نہیں کہ حقیقت کیا ہے؟ اللہ کے بارے میں صحیح نہیں جانتا، رسول کے بارے میں صحیح نہیں جانتا، آخرت کے بارے میں نہیں جانتا، فرشتوں کا علم نہیں ہے، اسی طرح دینی معلومات کے اندر اس کے پاس کمی موجود ہے تو شیطان اس جہالت سے بہت فائدہ اٹھاتا ہے، اور عام طور پر جاہلوں کو ان کی جہالت کی وجہ سے بڑی بڑی قبیح ترین اور انتہائی ناروا باتوں کے اندر پھانس دیتا ہے۔

اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ مکر کے لیے اور فریب کے لیے سب سے بڑا راستہ جہالت ہوتا ہے، اور اگر آدمی کے اندر جہالت کے بجائے علم ہو تو علم کے ذریعے سے وہ شیطان کے مکر کو، کید کو سمجھنے لگتا ہے، اور شیطانی حربہ سے بچ جاتا ہے، اور کامیاب ہو جاتا ہے۔

اسی مضمون کی طرف ایک حدیث کے اندر اشارہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**فقيه واحد أشدعلى الشيطان من ألف عابد**'' (ایک فقیہ و عالم شیطان پر ایک ہزار عابدوں سے بھاری ہے) (ابن ماجہ: ۲۰، ترمذی: ۲/۹۷)

ایک طرف ایک ہزار عابد ہوں، شیطان کہتا ہے کہ ان سب کو میں ایک داؤ میں نیچا دھکا دوں گا، اس لیے کہ یہ لوگ عبادت تو کر رہے ہیں، لیکن ان کے پاس علم نہیں ہے، ہاں عبادت ہے، ریاضت ہے، مجاہدہ ہے، سب کچھ ہے لیکن علم شریعت نہ ہونے کی وجہ سے ایک داؤ میں ان کو گرادوں گا۔

لیکن اگر کوئی عالم ہوتا ہے تو وہ عالم سے ڈرتا ہے، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ڈر کر وہ پیچھے رہ جاتا ہے، جی ڈرتا تو ہے لیکن ڈرنے کے ساتھ کوشش یہ کرتا ہے کہ کوئی بڑا مکر ان کے لیے لاؤں۔ دوسروں کو تو چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ہلاک کرتا رہتا ہے، لیکن علماء کو بڑے بڑے مکر سے ہلاک کرتا ہے۔ تو اس لیے علماء بھی بے خبر نہیں رہ سکتے۔

جاہل پر شیطان کا داؤ۔ ایک قصہ

ایک بہت بڑے عالم گزرے ہیں، امام ابن عبد البر مالکی، انہوں نے اپنی کتاب ''جامع بیان العلم'' میں ایک قصہ لکھا ہے کہ شیطان کے چیلوں نے شیطان سے کہا کہ جب کسی عالم کا انتقال ہوتا ہے تو آپ بہت خوش ہوتے ہیں، کسی عابد و زاہد کی موت پر اتنا خوش نہیں ہوتے۔ کیا بات ہے؟

شیطان نے کہا کہ آؤ میں تم کو اس کی وجہ بتاتا ہوں۔ اس کے بعد شیطان اپنے چیلوں کو لیکر ایک عابد کے پاس گیا جو جاہل تھا، اور سلام کیا، خیر خیریت پوچھی، شیطان نے اس سے کہا کہ آپ بڑے اچھے آدمی لگتے ہیں، میرے دل میں ایک وسوسہ ہے، خیال ہے، سوال ہے، میں اس کے بارے میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ عابد نے کہا کہ پوچھئے، اگر مجھے معلوم ہوگا تو جواب دے دوں گا، اگر معلوم نہیں تو آپ کسی اور سے پوچھ لیجئے۔

شیطان نے کہا کہ میرے دل میں ایک سوال پیدا ہو رہا ہے، وہ یہ کہ کیا اللہ تعالیٰ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ ایک انڈے میں زمین کو، آسمان کو، چاند کو، سورج کو، پوری کائنات کو داخل کر دے؟ اس حالت میں کہ انڈا جتنا ہے اتنا ہی رہے، اس میں اضافہ نہ ہو اور یہ زمین و آسمان جتنی بڑی ہیں، اس میں کوئی کمی نہ ہو۔ یہ ذہن میں ایک سوال آرہا ہے، اس کے بارے میں آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں؟

بھائیو! ذرا اندازہ کیجئے سوال کا، وسوسے کا کہ کس قدر خطرناک ہے۔ اب وہ عابد تو جاہل و بے وقوف تھا ہی، صرف نماز روزے کی باتیں تو جانتا تھا، باقی اتنا بڑا علم تو تھا نہیں، تو اس نے کچھ دیر سوچا، اس کے بعد کہنے لگا کہ انڈا اتنا ہی رہے اور زمین بھی اتنی ہی رہے اور آسمان بھی اتنا رہے پھر انڈے میں یہ سب داخل ہو جائیں؟

کیسے ہوسکتا ہے؟ یعنی شک کے لہجے میں، تعجب کے انداز میں اس نے یہ سوال دہرایا، پھر کہنے لگا کہ نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔

شیطان کے چیلے وہیں موجود تھے، شیطان نے ان سے کہا کہ میں نے اس کے دل میں شک کا بیج داخل کردیا ہے جو اسے کفر تک پہنچادیگا۔ دیکھا کہ میں نے ایک منٹ میں اس عابدوزاہد کو کافر بنادیا، یا کفر کی دہلیز پر بٹھادیا۔ اس طرح کے لوگ زندہ رہیں یا مرجائیں، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس کے بعد شیطان ایک عالم سے ملا، اس سے بھی یہی سوال کیا، اور کہا کہ جناب آپ عالم ہیں، فاضل ہیں، میرے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوگیا ہے، اس کا جواب دریافت کرنے آیا ہوں؟ انھوں نے کہا کہ کیا سوال؟ کہا کہ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک انڈے میں زمین وآسمان کو ڈالدیں؟ تو ان عالم نے کہا کہ اس میں کیا تعجب کی بات ہے کہ انڈا اپنی حالت پر اسی طرح ہو، زمین اور آسمان بھی اسی طرح ہوں، پھر اللہ تعالیٰ انڈے میں ان کو داخل کردیں؟ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اللہ کی ذات تو وہ ہے کہ جب ارادہ کرتا ہے کسی چیز کا تو ''کُنْ'' فرماتا ہے اور وہ چیز ہوجاتی ہے۔ ﴿وَإِذَا قَضٰى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُوْلُ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ (اور جب وہ (اللہ) کسی چیز کا فیصلہ کرتا ہے تو اسے ''کن'' (ہوجا) کہتا ہے تو وہ ہو جاتی ہے) اس لئے مجھے یقین ہے کہ ایسا ہوسکتا ہے، اس میں کوئی بات شک وشبہ کی نہیں۔

شیطان نے اپنے چیلوں کو دیکھ کر کہا کہ دیکھو اس کا علم ایسا ہے کہ یہ ہمارے داؤ میں نہیں پھنس سکتا، اور اس کو بہکانا ہمارے لئے آسان نہیں، اس لئے ان لوگوں کے زندہ رہنے سے مجھے پریشانی ہوتی ہے اور یہ لوگ مرتے ہیں تو میں جشن مناتا ہوں، اور عابد کا حال ایسا کہ اسے جب چاہیں ہم ادھر سے ادھر کرسکتے ہیں، اور اس

کی جہالت کی وجہ سے جب چاہے اس کو صرف معصیت میں نہیں، کفر میں بھی مبتلا کر سکتے ہیں۔(جامع بیان العلم)

اس واقعہ سے اندازہ کیجئے کہ جب آدمی کے اندر جہالت ہوتی ہے، علمِ شرع سے ناواقف ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے جاہ وجلال سے ناواقف ہوتا ہے تو اس کے نتیجے میں انسان کس طرح کفر کے دلدل میں پھنس جاتا ہے؟ اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ جہالت سب سے بڑی بیماری ہے۔

سالک کا سب سے پہلا کام تحصیل علم ہے

یہیں سے میں سالکین سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ علم دین سے کبھی غافل نہ ہوں، کیونکہ سالکین طریقت کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ وہ علم دین حاصل کریں۔ اسی لئے امام مالک نے فرمایا کہ:

”من تصوف و لم یتفقه فقد تزندق ومن تفقه ولم یتصوف فقد تفسق ومن جمع بینهما فقد تحقق “ (جس نے تصوف اختیار کیا اور علم نہیں حاصل کیا وہ زندیق ہوگیا اور جس نے علم سیکھا مگر تصوف اختیار نہیں کیا وہ فاسق ہوگیا اور جس نے دونوں کو جمع کیا وہ محقق ہوگیا)(ایقاظ الهمم:۲)

حضرت سیدنا امام جنید بغدادیؒ جو ایک طرف حدیث کے امام بھی تھے تو ایک طرف تصوف کے بھی امام تھے، وہ فرماتے ہیں کہ تصوف کی راہ قرآن اور حدیث پر قائم ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس راہِ تصوف وسلوک کے اندر سب سے بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ علم شرع سے واقفیت ہو، لیکن علم شرع کا مطلب یہ نہیں کہ آپ پورے عالم و فاضل ہوجائیں، یہ کوئی ضروری نہیں، لیکن اتنا علم آدمی کے پاس ہونا چاہئے جس

سے کہ وہ حق و باطل میں تمیز کر سکے، اچھے اور برے کی پہچان اس کے اندر آ جائے، کھوٹ کیا ہے اور اصل کیا ہے اسکو سمجھ میں آ جائے، اتنا علم اگر اس کے پاس موجود ہے تو اس علم کے ذریعے وہ راہ کو طے کر سکتا ہے۔

لہٰذا علماء کی خدمت میں جانا، شریعت سے واقف ہونا، ضروری امور سے واقف ہونا، عقائد سے واقف ہونا، انتہائی ضروری ہے، ان کے بغیر آدمی کا اس راہ میں چلنا دشوار ہے، ورنہ کہیں نہ کہیں آدمی کو شیطان دھوکہ دے دیتا ہے۔

ایک جاہل کی گمراہی کا قصہ

حضرت مولانا تھانویؒ نے ایک جگہ بیان کیا ہے کہ ان کے گاؤں میں ایک آدمی تھا، بڑا عابد تھا، لیکن علمِ دین سے واقف نہیں تھا۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہاں کے کچھ لڑکوں نے اس کا مذاق بنانا چاہا اور سوچا کہ اس آدمی کی بے وقوفی ظاہر کی جائے، ایک دن وہ اپنے گھر میں سو رہا تھا، رات کا وقت تھا تو محلے کے دو چار لڑکے اس کی چھت پر چڑھ گئے اور بناوٹی آواز میں اس کا نام لے کر ایک خاص لب و لہجہ میں اس کو پکارا۔ وہ چونکا، اور پوچھنے لگا کہ کون ہے؟ ایک لڑکے نے آواز بنائی اور کہا کہ میں تمہارا خدا بول رہا ہوں۔ یہ سنتے ہی وہ جاہل اٹھ کر بیٹھ گیا، اس کے بعد کہنے لگا کہ اے باری تعالیٰ! کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ تو اس نے کہا کہ تیری عبادت مجھے بہت پسند آ گئی، اس لیے آج سے ہم نے تیرے سے نماز معاف کر دی ہے۔ یہ کہہ کر وہ لڑکے تو غائب ہو گئے۔

اب یہ جاہل عابد سمجھا کہ واقعی یہ اللہ تعالی ہی کی آواز ہے، اس لئے اس کو یقین آ گیا کہ نماز معاف ہو گئی۔ اب اس کے بعد جو تہجد تھی وہ بھی ختم، فرائض تھے وہ بھی ختم، نماز کے لئے مسجد کو آنا بند کر دیا۔ اس طرح دو چار دن ہو گئے اور وہ نماز کو نہیں

آیا تو محلے کے لوگوں نے سوچا کہ بیمار تو نہیں ہوگیا؟ چلو جا کر دریافت کریں، کچھ لوگ وفد کی شکل میں اس کے گھر پہنچے، خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد پوچھا کہ طبیعت تو اچھی ہے؟ کہا کہ ہاں الحمدللہ! بہت اچھا ہوں۔ لوگوں نے پوچھا کہ پھر نماز کو کیوں نہیں آرہے ہو؟ بہت دن ہوگئے آپ نماز کو نہیں آئے، کیا بات ہے؟ تو کہنے لگا کہ آپ کو خبر ہوئی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سے خوش ہوکر میرے سے نماز معاف کردی۔ لاحول ولاقوۃ اِلا باللہ!

دیکھئے شیطان جاہل لوگوں کو کس طرح بہکانے لگتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان جہالت سے لوگوں کے اوپر تسلط قائم کر لیتا ہے۔

اللہ نے مجھے بچایا ہے، شیخ عبدالقادر جیلانی کا قصہ

یہ تو جاہلانہ طبیعت کا اثر ونتیجہ ہے، اس کے برخلاف جب علم ہوتا ہے تو کیا حال ہوتا ہے انسان کا؟ اس کو ایک واقعہ سے سمجھئے، کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جیسا کہ ہم جانتے ہیں بہت بڑے عالم تھے، محدث بھی تھے، بہت بڑے صوفی اور بزرگ بھی تھے، ان کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ان کے سامنے ایک ابر چھا گیا اور اس میں سے چمک ظاہر ہوئی، انہوں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے اندر سے ایک آواز آنے لگی، آواز کی طرف متوجہ ہوئے تو اس آواز میں ان سے کہا گیا کہ آپ کی عبادت آپ کا زہد، ریاضت، آپ کے مجاہدات سے ہم بہت خوش ہوگئے، اس لیے آپ سے نماز معاف کردی جاتی ہے۔

انہوں نے یہ سنتے ہی سوچا کہ نماز اللہ کے نبی ﷺ سے معاف نہیں ہوئی جبکہ آپ ﷺ کی عبادت وریاضت کا جو حال تھا وہ سب کو معلوم ہے تو میرے سے کیسے معاف ہوسکتی ہے؟ لہذا یہ دراصل شیطان کی آواز ہے، پھر " **لاحول ولا قوہ إلا**

باللّٰہ ''پڑھا۔ یہ پڑھنا تھا کہ وہ ابر جونظر آ رہا تھا اوراس کے اندر سے چمک ظاہر ہورہی تھی وہ دُھویں کی شکل میں تبدیل ہوکر غائب ہو گئے، حضرت سمجھ گئے کہ دراصل شیطان کی آواز تھی، پھر کچھ دیر بعد اسی طرح ہوا اوراس کے اندر کہا گیا کہ آپ کوآپ کے علم نے بچالیا۔ حضرت نے فوراًاس کے جواب میں فرمایا کہ میرے علم نے نہیں، میرے خدا نے مجھے بچالیا۔

دیکھا آپ نے کہ علم انسان کی رہنمائی کرتا ہے، لیکن بچانے والی ذات تو اللہ ہی کی ہوتی ہے، اگر خدا بچانا نہ چاہے تو وہ عالموں کو بھی گمراہ کردے، جیسے بہت سے ہوجاتے ہیں۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ساتھ ایک اور واقعہ بھی پیش آیا، کہ آپ ایک مرتبہ بڑی شدت سے پیاس محسوس کررہے تھے، حضرتؒ نے جنگلات میں کئی سالوں تک زندگی گزاری ہے، ریاضت کے لیے، مجاہدات کے لیے، تو اس زمانہ میں پانی ایک دفعہ نہیں ملا، بڑی شدت کی پیاس لگ رہی تھی، دور دور تک پانی کا نام و نشان نہیں تھا۔ اسی وقت ایک ہاتھ ظاہر ہوا اوراس ہاتھ میں ایک گلاس تھا جو سونے یا چاندی کا تھا اوراس کے اندر پانی بھی تھا اور آواز آرہی تھی کہ آپ کے لیے یہ جنت سے بھیجا جارہا ہے، آپ اس کو لیجئے استعمال کیجئے۔ حضرت نے سمجھ لیا کہ یہ شیطان کی مکاری ہے، لہٰذا'' **لاحول ولا قوّۃ الا باللّٰہ** ''پڑھا، حضرت کو یہ بات کیسے سمجھ میں آئی کہ یہ شیطان کی مکاری وعیاری ہے؟ یہ بات سمجھ میں آئی شریعت کے علم سے، کیونکہ یہ سونے اور چاندی کا گلاس تھا اور سونے اور چاندی کا استعمال اللہ کے نبی علیہ السلام کی شریعت میں ممنوع ہے، حرام ہے، ناجائز ہے۔ دنیا میں رہتے ہوئے جنت سے وہ چیز دی جائے جو خود شریعت کے اندر حرام ہو یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

شیطان نے بہکانے کی کوشش کی ،لیکن حضرت سمجھ گئے ،لاحول ولاقوۃ پڑھا تو شیطان کہنے لگا آپ کے علم نے آپ کو بچالیا۔حضرت نے فرمایا کہ علم نے نہیں بلکہ میرے خدا نے مجھ کو بچالیا۔تو اس طرح علم رہنمائی کرتا ہے جس کی وجہ سے شیطان کے مکر کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

شیطان کی حضرت عیسی علیہ السلام کو بہکانے کی کوشش

یادرکھو کہ شیطان کی عیاری ومکاری بڑی خطرناک ہوتی ہے،وہ کسی کو بھی نہیں چھوڑتا،حتی کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو بھی نہیں چھوڑتا۔

ایک دفعہ شیطان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آیااور آکر کہنے لگا: آپ تو وہ ہیں کہ اپنی ربوبیت سے شیرخوارگی میں آپ نے کلام کیا ، جبکہ کوئی اور ایسا نہیں کرسکتا۔حضرت عیسی علیہ السلام نے فرمایا کہ ربوبیت والوہیت تو اس اللہ کے لئے ہے جس نے مجھے قوت گویائی دی۔

پھر وہ کہنے لگا کہ اے وہ ذات کہ جس نے اپنی الوہیت سے مردوں کو زندہ کیا ہے،اے وہ ذات جس نے اپنی الوہیت سے مختلف پرندوں کو بنا کر زندہ چھوڑا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہنے لگے "لاحول ولاقوۃالاباللّٰہ"،میں کہاں کا خدا، میرے اندر کہاں الوہیت؟الوہیت تو اس اللہ کے اندر ہے جو مجھے بھی زندگی اورموت دیتا ہے۔(مکائدالشیطان ابن ابی الدنیا:۶۷)

دراصل شیطان ان باتوں سے ان کو بہکانے کے لیے آیا تھا تا کہ ان کے ذہن میں یہ ڈال دے کہ جیسے لوگ سمجھتے ہیں،اسی طرح یہ الوہیت کے حامل ہیں۔یعنی خدائی صفات ان کے اندر ہیں،تو خدائی صفات کا حامل بتایااوران کے ذہن میں یہ بات ڈالنی چاہی تا کہ نعوذ باللہ حضرت عیسی گمراہ ہوجائیں،لیکن اللہ تو انبیاء کرام علیہم

الصلوۃ والسلام کی حفاظت کرتا ہے، اور اپنی عصمت سے ان کو نوازتا ہے، اس لیے حضرت عیسی علیہ السلام نے فوراً یہ جواب دیا۔

معلوم ہوا کہ شیطان بڑا مکار ہے، عیار ہے، اور اسی لیے وہ چیزوں کو مزین کرتا ہے اور باتوں کو اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ انسان بہک جاتا ہے۔

حضرت جنید بغدادی سے شیطان کا عجیب سوال

حضرت جنید بغدادیؒ کا نام کون نہیں جانتا! آپ کا واقعہ ہے کہ حضرت جنیدؒ بغدادیؒ نے ایک مرتبہ دل میں خیال کیا کہ اگر شیطان سے ملاقات ہو جائے تو ایک سوال کروں گا، اور انہوں نے ایک دن اللہ سے دعاء بھی کر دی کہ اے اللہ! کبھی شیطان سے ملاقات کرا دے تاکہ اس سے سوال کرلوں۔ ایک دن نماز پڑھ کر مسجد کے باہر نکلے تو ایک بوڑھا آدمی جھک کر سلام کرنے لگا۔ حضرت جنیدؒ نے اس کو دیکھ کر کہا کہ کون ہو تم؟ کہنے لگا کہ میں وہی ہوں جس سے ملنے کی آپ کو آرزو اور تمنا تھی۔

حضرت سمجھ گئے کہ یہ اصل میں شیطان ہے۔ شیطان نے کہا کہ آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟ حضرت جنیدؒ نے کہا کہ میرے ذہن میں تیرے متعلق ایک سوال ہے، سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تجھے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تجھے کس چیز نے اللہ کے حکم کی تعمیل سے منع کیا؟ کیوں تو نے سجدہ نہیں کیا، کیا اللہ کی عظمت کو نہیں جانتا تھا؟ ارے تجھے اللہ کی معرفت حاصل تھی، اللہ تعالیٰ کی عظمتوں اور جلالتوں سے تو واقف تھا، اس قدر اللہ کی قربت رکھنے کے باوجود جب اللہ نے تجھے حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کر۔ تو تو نے آخر کیوں سجدہ نہیں کیا؟

اس پر شیطان کا جواب کیا تھا، وہ سننے کے قابل ہے، اس کے جواب نے کچھ دیر کے لئے حضرت جنید کے ہوش اُڑا دیے۔ اس نے کہا کہ جنید! آپ جیسا توحید پرست آدمی اور یہ مشرکانہ سوال؟ آپ جیسا توحید پرست ایک اللہ کو ماننے والا، ایک اللہ کی پوجا کرنے والا اور آپ کے ذہن میں سوال آرہا ہے مشرکانہ سوال کہ میں نے غیر اللہ کو سجدہ کیوں نہیں کیا؟ کہنے لگا کہ آدم تو غیر خدا تھے، خدا تو نہیں تھے، میں غیر اللہ کو کیوں سجدہ کر لیتا۔ آپ جیسا توحید پرست آدمی ایسا مشرکانہ سوال میرے سے کر رہا ہے، بڑے افسوس کی بات ہے۔

حضرت جنیدؒ کہتے ہیں کہ جب اس نے یہ بات میرے سے کہی تو مجھے لگا کہ ہاں! یہ تو ٹھیک کہہ رہا ہے، اور پھر تھوڑی دیر کے لیے مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرا ایمان سلب ہو رہا ہے، اس لیے میں سناٹے میں پڑ گیا، ہوش وحواس باقی نہ رہے، میں سوچنے لگا کہ اس کو کیا جواب دے سکتا ہوں۔ اس لیے کہ جب وہ کہہ رہا ہے کہ تم ایک اللہ کو ماننے والے ہو اور مجھے پوچھتے ہو کہ آدم کو سجدہ کیوں نہیں کیا؟ حضرت جنید کہتے ہیں کہ میرے ذہن میں جواب نہیں آیا۔ فوراً اللہ کی طرف سے الہام ہوا اور مجھ سے کہا گیا کہ اس سے یہ پوچھو کہ حکم دینے والا کون تھا؟ حکم دینے والا جب خود کہہ رہا ہے کہ فلاں چیز کو سجدہ کرو تو توحید اسی کا نام ہے کہ اس کی بات کو مان لیا جائے۔ حضرت جنید کہتے ہیں کہ اس الہام کے بعد میرا ایمان برقرار ہوا اور نہ تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے ایمان میں تزلزل پیدا ہو گیا ہے۔

بھائیو! یہ ہے شیطان کی مکاری اور عیاری، نہ ولیوں کو چھوڑا، نہ غوث وقطب وابدال کو چھوڑا، نہ انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کو چھوڑا۔ غور کرو کہ شیطان باتوں کو اور چیزوں کو کس طرح مزین کرتا ہے اور گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس کا ذرا اندازہ اس واقعہ سے آپ کر لیجئے، اس لیے کبھی بھی شیطان سے بے فکر نہیں ہونا چاہئے، شیطان کی عیاری اور مکاری سے بسا اوقات انسان بے ایمان بھی ہو جاتا ہے، لیکن اسے خبر نہیں رہتی کہ میں بے ایمان ہو گیا ہوں۔ شیطان کفر کو مزین کر دیتا ہے۔

مجھ سے کونسا گناہ ہو گیا؟

بعض لوگوں کی زبان پر کبھی کبھی ایسے الفاظ سنے جاتے ہیں جیسے مثلاً کبھی کوئی مصیبت آ گئی، پریشانی آ گئی، اللہ کی طرف سے بیماری میں مبتلا کر دیا گیا یا کھانے کی پینے کی اور کسی قسم کی پریشانی پیش آ گئی تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے سے کیا گناہ ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ہم کو یہ مصیبت دے رہا ہے۔ اس جملہ پر غور کیجئے! نفسانی کید اور شیطانی مکر پر غور کیجئے کہ اس جملے کے اندر کس قدر نفسانی کید اور شیطانی مکر پوشیدہ ہے، گویا کہ اس جملے میں وہ دعوی کر رہا ہے کہ میں گناہ نہیں کرتا، میں گناہوں سے بالکل معصوم اور پاک ہوں، اس لئے کہتا ہے کہ مجھ سے کون سا گناہ ہو گیا؟ یعنی بالکل نہیں ہوا، قطعاً نہیں ہوا، پھر اللہ تعالیٰ مصیبت میں مجھے کیوں ڈال رہا ہے؟ اس میں دعویٰ ہو گیا اپنے آپ کے پاکباز ہونے کا، جس کا دعویٰ انبیاء کرام علیہ الصلوۃ والسلام نے بھی کبھی نہیں کیا تھا، لیکن یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ میرے سے کوئی گناہ نہیں ہوا، اور جب گناہ ہی نہ ہونے کا یہ دعویدار ہو گیا تو اس کا مطلب یہ ہو گیا کہ نعوذ باللہ یہ انبیاء جیسا معصوم ہو گیا۔

اب بتاؤ کہ اس جملے میں شیطانی مکر پوشیدہ ہے کہ نہیں ہے؟ نفسانی کید پوشیدہ ہے کہ نہیں ہے؟ لیکن یہ جملہ کتنی آسانی و سادگی کے ساتھ زبان سے نکل جاتا ہے، اور کس قدر لوگ اس کے اندر ملوث ہیں، لیکن کبھی ان کو دھیان تک نہیں جاتا کہ ہم

نے اس جملہ کے اندر کتنا بڑا دعوی کیا ہے، اس دعویٰ کی وجہ سے ان کی ساری عبادت بھی رائیگاں چلی جاتی ہے۔

حضرت آدم اور شیطان کی خطاؤں میں فرق

یہاں ایک نکتہ عرض کرتا ہوں، وہ یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام سے بھی خطا ہوئی اور شیطان نے بھی خدا کی نافرمانی کی، مگر ان دونوں کی نافرمانیوں میں ایک زبردست اور بڑا عظیم فرق ہے، وہ یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام سے جب ایک خطا کا صدور ہوا تو فوراً اللہ تعالیٰ کے سامنے انہوں نے اپنے گناہ کا اعتراف کرلیا، اور شیطان سے جب گناہ ہوا تو وہ اڑ گیا کہ مجھ سے گناہ نہیں ہوا ہے، بلکہ میں نے تو آدم کو سجدہ نہ کر کے توحید کا مظاہرہ کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ بندہ کا اللہ کی جناب میں عجز و نیاز اور اپنی خطاؤں و گناہوں کا اعتراف ہی اس کو اللہ کے یہاں مقام دلاتا ہے۔

اس لئے یوں کہنا کہ میں نے کونسا گناہ کیا یہ بہت نازیبا بات ہے اور اس میں دعوی ہے۔ لہذا ایسے قبیح جملوں کے استعمال کرنے سے بچنا چاہئے، شیطان ایسے جملے ہماری زبانوں سے نکلوا کر ہمارا ایمان برباد کرنا چاہتا ہے۔

عبادات پر ناز- ایک عظیم شیطانی حربہ

شیطانی حربوں کا ذکر چل رہا ہے تو ایک اور اہم بات کی طرف توجہ کیجئے، خاص طور پر میں سالکین کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ شیطان انسانوں کو گمراہ کرنے ایک حربہ یہ بھی استعمال کرتا ہے جو زیادہ خطرناک اور قابل توجہ ہے، وہ کیا؟ وہ یہ کہ بسا اوقات شیطان عبادات وریاضات کے ذریعہ، نماز روزہ کے ذریعہ، وظائف کے ذریعہ انسان کو بہکاتا ہے، اور دل میں یہ بات ڈالتا ہے کہ تو

بڑا عابد و بزرگ ہو گیا ہے، تیرا بہت اونچا مقام ہے، اس طرح عبادات پر ناز و فخر میں مبتلا کر کے انسان کو خدا کی نظروں سے گرا دیتا ہے۔

بعض لوگ ہوتے ہیں کہ دو چار رکعات پڑھ کر ڈینگیں مارنے لگتے ہیں، اور خود کو سب سے افضل اور دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ یہ عبادات و ریاضات پر ناز و فخر دل کی نجاستوں و گندگیوں میں سے ایک ہے۔ معلوم نہیں کتنی گندگیاں ایسی ہمارے اندر ہیں، کتنی خباثتیں اور رذائل ہمارے اندر جمی ہوئی ہیں اور ہم اس کے باوجود بڑے مطمئن ہیں کہ ہم تو ماشاء اللہ ذاکر ہیں، شاکر ہیں، سالک ہیں اور فلاں اور فلاں قسم کی عبادتوں میں لگے ہوئے ہیں، حالانکہ یہ عبادت نہیں، بلکہ عبادت کے لباس میں گناہ ہیں جن کو شیطان نے اس طرح مزین کر دیا ہے اور نیکی کا پردہ ڈال دیا ہے کہ اس کے اصلی چہرہ کو دیکھنے اور اس کی اصلیت کو پہچاننے سے ہماری آنکھیں قاصر ہیں۔

اسی لئے شیخ کی ضرورت پڑتی ہے کہ وہ شیطان کے مکر و فریب سے واقف ہوتا ہے، نیکی اور بدی کی پہچان رکھتا ہے، وہ شیطان کی چالوں کو سمجھتا ہے، وہ بتاتا ہے کہ شیطان کہاں چکما دے رہا ہے، کس طرح گمراہ کر رہا ہے، اسی لئے ہمارے بزرگان دین فرماتے ہیں کہ کسی اللہ والے سے تعلق رکھنا اور اس کی رہبری میں دین پر چلنا ضروری ہے ورنہ شیطان ایسا مکار اور چالباز ہے کہ اس نے نہ ولیوں کا چھوڑا، نہ غوث و قطب کو چھوڑا، نہ انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کو چھوڑا، نہ کسی اور کو چھوڑا تو ہمارے اور آپ کے ساتھ اس کا کیا معاملہ ہوتا ہوگا؟

شیطان کا اللہ کے سامنے دعوی

بھائیو! ہم سب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے،

قرآن کریم میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے: ﴿اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ﴾ (بے شک شیطان کھلا دشمن ہے) (القصص:۱۵)

اور ایک جگہ قرآنِ کریم کے اندر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ شیطان نے اللہ کے سامنے اس بات کا دعوی کیا کہ وہ انسانوں کو ہر طریقہ سے اور ہر طرف سے گمراہ کرنے کی کوشش کرے گا، اللہ تعالی شیطان کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ:

﴿قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ﴾ (الأعراف:۱٦)

(اے اللہ! آپ نے چونکہ مجھے گمراہ کیا؛ اس لئے میں لوگوں کو بہکانے تیرے سیدھے راستے پر بیٹھوں گا پھر میں ان کے سامنے سے، پیچھے سے، ان کے داہنی طرف سے اور بائیں طرف سے بہکانے آؤں گا، پھر آپ ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہیں پائیں گے)

ان آیتوں میں شیطان کے اسی دعوی کا ذکر کیا گیا ہے، شیطان کے یہ الفاظ قابل غور ہیں، اور یہ بات بھی کہ اس نے اتنا بڑا یہ دعوی خود اللہ تعالی کے سامنے کھڑے ہو کر کیا تھا۔ شیطان کہتا ہے کہ اے اللہ! چوں کہ آپ نے مجھے گمراہ قرار دیا ہے، اس لیے میں صراط مستقیم پر آکر میں بیٹھوں گا تاکہ میں ان کو گمراہ کرتا رہوں، دائیں سے بائیں سے، آگے سے پیچھے سے چہار طرف سے آکر ان کو بہکانے کی کوشش کروں گا۔ تو وہ اپنے اس دعوی کو حقیقت بنانے کیا کچھ نہ کرتا ہوگا اور اس کے لئے کس قدر قوت وطاقت سے، اور اپنی عقل و تجربے سے کام لیتا ہوگا؟ اس کا اندازہ کرنا کوئی مشکل نہیں۔

شیطان صرف چار طرفوں سے بہکاتا ہے، کیوں؟

یہاں اس آیت میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ شیطان نے بہکانے کے لئے صرف چار طرفوں کا ذکر کیا ہے: آگے، پیچھے، داہنے اور بائیں کا، جبکہ جہات چھ ہیں، ان میں اوپر اور نیچے کا ذکر شیطان نے نہیں کیا، کیوں؟

اس کی وجہ علماء لکھتے ہیں کہ شیطان نے نیچے کی جہت کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ وہ نیچے سے آنا نہیں چاہتا، کیونکہ اس کے اندر کا تکبر اسے نیچے سے آنے میں مانع بنتا ہے، اس لیے کہ نیچے سے آنے میں جھکنا پڑتا ہے، اور جس میں تکبر ہوتا ہے وہ کبھی جھکنے کو گوارہ نہیں کرتا، اور اس نے اوپر کی جہت کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ شیطان کو اوپر سے آنے کی اللہ نے قدرت نہیں دی ہے، اس لیے کہ اوپر سے فرشتوں کے آنے کا مقام ہے، اللہ تعالیٰ نے اس راہ کو شیطان کے لیے مسدود کر دیا ہے۔

شیطان صراط مستقیم پر؟ ایک عجیب نکتہ

اب اس آیت کے مضمون پر غور کرو کہ شیطان نے یہ کہا کہ میں صراط مستقیم پر بیٹھوں گا، ''لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَکَ الْمُسْتَقِیْمَ''

سوال یہ ہے کہ کیا شیطان بھی صراط مستقیم پر بیٹھتا ہے؟ جی ہاں! بیٹھتا ہے، مگر ایک ہے صراط مستقیم پر قائم ہونا کھڑا ہونا اور ایک ہے صراط مستقیم پر بیٹھنا، دونوں میں بڑا فرق ہے، ہر مسلمان، نیک آدمی، اللہ والا صراط مستقیم پر کھڑا ہوتا ہے، اور محاورے میں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صراط مستقیم پر چلنے کی غرض سے وہ اس پر کھڑا ہے اور چل رہا ہے، لیکن صراط مستقیم پر بیٹھنا الگ چیز ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ چلنے کے لئے نہیں، اس کو پار کرنے کے لئے نہیں، بلکہ کسی بری غرض و نیت سے اس پر ہی

بیٹھ گیا ہے۔ جیسے ڈاکو لوگ شاہ راہوں پر بیٹھ جاتے ہیں اور گزرنے والے قافلوں کو لوٹ لیتے ہیں بالکل شیطان کا صراط مستقیم پر بیٹھنا بھی اسی طرح کا بیٹھنا ہے کہ وہ اس پر بیٹھ کر لوگوں کے ایمانوں اور نیکیوں کو لوٹ لینا چاہتا ہے۔

یہیں سے ایک نکتہ کی بات بھی سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ کہ شیطان لوگوں کو بہکانے کے لئے صراط مستقیم پر آتا ہے، یعنی ان لوگوں کے پاس آتا ہے جو صراط مستقیم پر چل رہے ہیں، اسے تو انہی کو بہکانا ہے اور وہ لوگ جو پہلے ہی سے بہکے ہوئے اور گمراہ ہیں ان کو بہکانے کی اسے ضرورت کیا ہے؟ وہ تو بہکے ہوئے ہیں، لہذا صراط مستقیم پر آ کر بہکانے کا حاصل یہ ہوا کہ وہ صراط مستقیم پر چلنے والوں کی تلاش وجستجو میں وہاں آتا اور وہاں بیٹھ کر ان کو بہکاتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر وہ کفر و معصیت اور جہالت و بغاوت کے راستے پر جا کر بیٹھے گا تو اس کو بہکانے کے لئے کون ملے گا؟ وہاں تو کافر ہوں گے، شرابی ہوں گے، زانی ہوں گے، لٹیرے ہوں گے، یہ سب لوگ پہلے سے بھٹکے و بہکے ہوئے ہیں، شیطان اتنا بے وقوف نہیں کہ وہ اپنی محنت ان کے پیچھے ضائع کر دے، لہذا وہ صراط مستقیم پر آتا ہے کہ یہیں اس کو مومنین ملتے ہیں، مسلمین ملتے ہیں، ذاکرین ملتے ہیں، نمازی ملتے ہیں، حاجی ملتے ہیں، اللہ والے ملتے ہیں۔

ایک عالم کا قصہ

مجھے ایک عالم کا قصہ یاد آیا کہ ان سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت! ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ اہل سنت میں سے ہوتے ہیں، اور وہ بہک جاتے اور شیعہ فرقے میں داخل ہو جاتے ہیں، کوئی قادیانی بن جاتا ہے، کوئی اور کسی گمراہ فرقوں و لوگوں میں داخل و شامل جاتا ہے، مگر ہم نے کبھی نہیں سنا کہ ان گمراہ فرقوں کے لوگ مسلمان

ہو گئے اور اہل سنت میں داخل ہو گئے ،اس کی کیا وجہ ہے؟ تو ان عالم نے بڑا عمدہ جواب دیا ،انھوں نے کہا کہ دیکھو! شیطان انہی لوگوں کو بہکا تا ہے اور ان ہی کے دلوں میں وسوسہ وشبہات ڈالتا ہے جو حق پر ہوتے ہیں ،اور جو پہلے ہی سے بہکے ہوئے ہوں ان کو شیطان ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے ۔لہذا بہکاوا اگر ہوگا تو اہل سنت ہی کو ہوگا ، نہ کہ اہل باطل کو۔اس لئے شیطان اہل حق کو بہکا تا ہے اور انہی میں سے کچھ لوگ بہک جاتے ہیں۔

سالکین کو شیطان کس طرح بہکا تا ہے؟

اب آیئے اصل بات کی طرف ،علماء نے بیان کیا ہے کہ صراط مستقیم پر بیٹھنے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ شیطان نیکیوں کے ذریعہ بھی انسانوں کو تباہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ اس طرح پر کہ جب نیک لوگ نیکی کرتے ہیں تو ان کے دل ودماغ کے اندر ان کی بڑائی کا تصور ڈال دیتا ہے، اور وہ نیکی کے کام کر کے اپنے کو بڑا سمجھتے اور ناز وفخر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ایک دفعہ حضرت سیدنا موسی علیہ السلام کے پاس شیطان پہنچا ،حضرت موسی علیہ السلام نے اسے دیکھا تو فرمایا کیا تو شیطان نہیں ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں میں شیطان ہوں۔حضرت موسی علیہ السلام نے کہا کہ مجھے یہ بتا کہ تو اب تک لوگوں کو گمراہ کرتا آیا ہے، گمراہ کرنے کے لیے سب سے بڑا کونسا حربہ اختیار کرتا ہے؟

اس نے کہا کہ میں اس طرح گمراہ کرتا ہوں کہ انسان کو اس کی نیکیوں پر تفاخر میں مبتلا کر دیتا ہوں۔نیکی کرتا ہے تو سمجھتا ہے کہ میں بہت بڑا آدمی ہو گیا ہوں، میں نے تو بہت کچھ کر دیا ہے، اپنی نیکیوں کو اچھا سمجھنا، اپنے آپ کو اچھا سمجھنا، اپنی عبادت ریاضت ومجاہدہ کو قابل فخر چیز سمجھنا، اپنے آپ کو اونچا اور سب سے اعلی سمجھنا، یہ عجب

وتکبر ہے۔اس عجب وتکبر کے راستے سے میں ان کو بہکایا کرتا ہوں۔(تنبیہ الغافلین)

معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک حربہ ہے شیطان کا،اور بہت بڑا حربہ ہے۔چنانچہ بہت سارے لوگ عبادت کرتے ہیں، ریاضت کرتے ہیں،مجاہدات کرتے ہیں،علم کے میدان میں آگے بڑھتے ہیں اور مختلف قسم کی خدمات کرتے رہتے ہیں،اللہ کے دین کی اشاعت میں،اللہ کے دین کی دعوت میں،اللہ کے دین کو پھیلانے میں لگتے ہیں اور اسی کے ساتھ اس تکبر غرور اور فخر میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ''ہم چوں ماڈنگرے نیست''،ہم تو بہت آگے بڑھ گئے ہیں،اب ہمارا کوئی مقابل نہیں،اور اسی کے ساتھ ساتھ پھر دوسروں کی توہین اور تضلیل اور دوسروں کے بارے میں بدگمانی،دوسروں کے بارے میں ایک قسم کے برے خیالات بھی دل میں جما لیتے ہیں،جس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ آدمی جتنا عبادت کرتا ہے اتنا نیچے آجاتا ہے،اس سے اللہ کی نظر میں وہ انتہائی ناقص ہو جاتا ہے اور آخری منزل میں اس کو گرا کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

ایک بزرگ کی قیمتی نصیحت

اس لئے سالک کو ہمیشہ اپنے آپ کو حقیر سمجھنا چاہئے،اسی عاجزی وانکساری سے ترقی ہوتی ہے۔ایک بزرگ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے کہا کہ حضرت کوئی نصیحت فرمائیے!انہوں نے ایک دومنٹ سوچنے کے بعد کہا کہ بھائی! کبھی پہاڑ پر چڑھے ہو،اس نے سوچا،اس کے بعد کہا کہ ہاں چڑھا ہوں،فرمایا کہ جب پہاڑ پر چڑھے تھے تو کس طرح چڑھے تھے؟ جھک کر چڑھے تھے یا اکڑ کے،اس نے کہا کہ جب چڑھنے کا موقع آیا تو جھک کے چڑھا تھا۔

آپ بھی سوچ کر دیکھ لیجئے کہ جب پہاڑ یا کسی بھی بلندی پر چڑھنے کا موقع آتا ہے تو انسان کیسا چڑھتا ہے؟ جھک جاتا ہے، جھک کر اوپر چڑھتا ہے۔اس نے

کہا کہ حضرت چڑھنے کے لیے جھک کر چڑھتا رہا، فرمایا کہ اچھا، جب چڑھے تھے تو اترے بھی ہوں گے، اترے تو کس طرح اُترے تھے؟ جھک کر یا اکڑ کر؟ اس نے کہا کہ اکڑ کے اترا تھا۔

اس لیے کہ اگر جھک کے اتریں گے تو لڑھک کر نیچے آ جائیں گے، اوپر سے نیچے کی طرف آتے وقت جھکنا نہیں چاہیے، بلکہ اکڑ کے آنا چاہیے، اس نے کہا کہ حضرت اکڑ کے آیا تھا۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ اس کے اندر بڑی عبرت ہے، وہ یہ کہ جو جھکتا ہے، اللہ اسے بلندی پر لے جاتا ہے، جو اکڑتا ہے، اسے اوپر سے نیچے لاتا ہے۔

کیسی اچھی مثال دی ہے، کیا بہترین نصیحت فرمائی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جھکنا اللہ کو پسند ہے، اگر ظاہری طور پر بھی آپ کسی بلندی پر پہنچنا چاہتے ہیں، حسی طور پر بھی کسی بلندی پر پہنچنا چاہتے ہیں تو وہاں بھی جھکنا ضروری ہو جاتا ہے اور جب آدمی اکڑتا ہے تو اوپر سے نیچے کی طرف آ جاتا ہے۔

اسی طریقے پر روحانی و باطنی طور پر جو بلندیوں پر پہنچنا چاہتا ہے تو اسے بھی جھکنا پڑتا ہے، جھکے گا، چڑھے گا، اکڑے گا تو نیچے آ کر مرے گا، یا نہیں تو کم از کم گرے گا؛ اس لیے یہ فرمایا گیا ہے کہ شیطان کا ایک راستہ یہ بھی ہے کہ عبادت، ریاضت، مجاہدہ، نیکی، دینی خدمات یہ سب کچھ کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کو اس طرح کے خیالات میں مبتلا کرتا ہے، جس کی وجہ سے وہ اللہ کی نگاہ میں گر جاتا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کا شیطان سے ایک سوال

بہ ہر حال شیطان کے مختلف حربے ہیں جن سے وہ بہکاتا ہے، یہاں یاد آیا کہ

حضرت سیدنا نوح علیہ السلام طوفان کے موقعہ پر جب سفینہ میں سوار تھے تو وہاں پر اچانک ان کو شیطان نظر آیا، انہوں نے کہا کہ تو یہاں بھی پہنچ گیا؟ اب میں تجھے نہیں چھوڑوں گا، جب تک کہ تیرا راز نہ معلوم کرلوں۔ اس کو حضرت نوح علیہ السلام نے پکڑ لیا اور فرمایا کہ تیرا راز مجھ کو بتا کہ تو گمراہ جو کرتا ہے وہ کس راستے سے کرتا ہے؟

تو اس نے کہا کہ پانچ باتیں ہیں، لیکن پانچ میں سے میں آپ کو تین بتاتا ہوں، دو نہیں بتاتا۔ حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے وحی آئی کہ اس مردود سے کہو کہ ہمیں ان تین کی ضرورت نہیں ہے، وہ دو ہی ہم کو بتا دے؛ اس لیے کہ اصل تو وہی ہے راز۔ تو حضرت سیدنا نوح علیہ السلام نے کہا کہ مجھے ان تین حربوں کی ضرورت نہیں ہے، وہ دو بتا جو تو نہیں بتانا چاہتا۔ تو اب مجبور ہو گیا اور کہنے لگا کہ وہ دو باتیں جس سے میں لوگوں کو گمراہ کرتا ہوں، اور آپ کو بتانا نہیں چاہتا تھا وہ آپ سن لیجئے! ایک حسد اور ایک حرص۔ پھر شیطان کہنے لگا کہ حسد سے میں گرا اور حرص سے حضرت آدم گر گئے۔

اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو بنایا اور ان کو علم عطا فرمایا اور ان کی شان وشوکت کو فرشتوں کے سامنے ظاہر فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔ تو فرشتے تو سجدے میں گر گئے، ابلیس کو تکبر نے روکا، تکبر کے بعد حسد پیدا ہوا، حسد اس لیے پیدا ہوا کہ ان کی وجہ سے میں اللہ کی نگاہ میں گر گیا ہوں، اب کسی نہ کسی طرح ان کو بھی گرانا ہے، یہ ہے حسد۔ جب کسی کے پاس کوئی کمال دیکھے، جب کسی کے پاس حسن وجمال دیکھے، جب کسی کا عطا ونوال دیکھے، جب کسی کے اندر بڑائی دیکھے، جب کسی کے اندر علم دیکھے، جب کسی کے اندر مال ودولت کی فراوانی دیکھے، اس وقت دل کے اندر یہ خواہش کا ہونا کہ اس سے ساری

چیزیں چھن جائیں، چاہے مجھے ملیں کہ نہ ملیں، اس کے پاس بھی نہ رہیں، یہ ہے حسد کی بیماری، یہ حسد اللہ کی نگاہ میں بہت بری چیز ہے۔

شیطان نے سوچا کہ اللہ نے اُن کو اتنا اونچا بنایا ہے، ان کو بھی گراؤں گا، میں جیسے گر گیا ان کو بھی گراؤں گا، اس کے بعد اس حسد میں مبتلا ہو کر وہ فکر میں رہا کہ کس طرح ان کو میں ذلیل وخوار کرنے میں کامیاب ہو جاؤں؟ یہ ہے حسد جس کی وجہ سے شیطان گمراہ ہوا۔

اور حضرت آدم کو جس درخت سے منع کیا گیا تھا، جا کر اس کو کھا لیا تھا، اس لئے کہ شیطان نے قسم کھا کھا کر ان سے کہا تھا کہ میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ اس درخت کو کھانے کا اتنا بڑا فائدہ ہے، اور فائدہ یہ ہے کہ آپ اس کو کھا لیں گے تو کبھی نہیں مریں گے، ہمیشہ زندہ رہیں گے، انہوں نے کہا کہ بہت اچھا، کھا لیں گے تو حرص میں آ کر کھا گئے، اس کو شیطان نے کہا کہ حسد نے مجھے تباہ کیا اور حرص کی بیماری نے حضرت آدم علیہ السلام کو گرا کر رکھ دیا۔

عبرت وموعظت

میرے بھائیو اور دوستو! شیطان کے یہ سارے راز ہم کو اللہ کے کلام کے ذریعے ملے، انبیاء کرام سے ملے، بزرگوں کے کلام کے ذریعے ہم کو ملے، ان ساری چیزوں سے ہم کو معلوم ہوا کہ شیطان کس کس طریقے پر انسان کو بہکاتا ہے، اور ہمیں گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور پھر اللہ سے دوری میں مبتلا کرتا ہے، جب ہمیں یہ سب چیزیں معلوم ہو گئیں تو اب ہم ان ساری چیزوں سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو چوکنا رکھیں۔

قرآن کریم نے ہم کو بتا دیا ہے ﴿اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ﴾ (شیطان

کھلا ہوا دشمن ہے)(القصص:۱۵)

اگر کوئی آپ کا باپ یا استاذ، یا آپ کا دوست، آپ کو بتادے کہ فلاں آدمی سے چوکنا رہو، اس لیے کہ وہ تمہارا دشمن ہے، تو آپ کو یقین آتا ہے اور آپ بچتے ہیں کہ نہیں بچتے؟ باپ کی بات پر یقین، استاذ کی بات پر یقین، شیخ کی بات پر یقین، دوست کی بات پر یقین، لیکن اللہ کہہ رہا ہے کہ شیطان ہمارا کھلا دشمن ہے، مگر افسوس کہ اس پر یقین نہیں۔ اور وہ چیزیں جو شیطان ہم کو گمراہی میں پھنسانے کے لیے اختیار کرتا ہے، ان چیزوں کو بڑی آسانی سے ہم اختیار کرتے چلے جاتے ہیں، بہت بڑی ہمارے لیے عبرت کی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مکائد شیطان کو سمجھنے کی ہمیں توفیق دے، اور اس سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ ہمیں بھرپور توفیق وہمت عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

اللہ تعالیٰ ہی کو مقصود بنایئے

باسمہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ ہی کو مقصود بنایئے

اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ﴾ (الانشراح:۷-۸)

حضرات!

آپ کے سامنے قرآن کریم کی ایک مشہور سورت کی آخری آیتیں تلاوت کی گئی ہیں، جس کو ''سورۂ الم نشرح'' یا ''سورۂ انشراح'' کہا جاتا ہے، اوران آیات میں ایک نہایت اہم مضمون ارشاد فرمایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ﴾

(اے ہمارے نبی! جب آپ فارغ ہو جائیں تو محنت کیجئے اور اپنے رب ہی کی طرف رغبت کیجئے)

اس میں نبی اکرم ﷺ سے خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اے نبی ﷺ! آپ فارغ ہو جائیں، کس کام سے؟ اپنے دعوتی اور تبلیغی اور علمی و اصلاحی، جہادی اور مختلف قسم کے جو کام آپ کے سپرد ہیں، ان سے فارغ ہو جائیں تو پھر عبادت کے لیے تیار ہو جایئے اور اس میں خوب محنت کیجئے اور پھر اپنے ہی رب کی طرف پورے پورے طور پر متوجہ ہو جایئے۔

یہ آیتیں بڑی قابل غور آیتیں ہیں، اگرچہ خطاب ہے نبی اکرم ﷺ کو، لیکن

آپ کے واسطے سے تمام لوگوں کو ہے اور بالخصوص امتیوں کو، اور پھر بالاخص سالکین کو جو اللہ کے راستے میں چلنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

آیت زیر بحث کی تفسیر

اب آیئے ان آیات کے معنی پر غور کریں۔اس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ﴾ (اے ہمارے نبی! جب آپ فارغ ہوجائیں تو محنت کیجئے اور اپنے رب ہی کی طرف رغبت کیجئے)

اس میں جو یہ فرمایا کہ ''جب آپ فارغ ہوجائیں'' اس سے مراد یہ ہے کہ جب آپ اپنے دنیوی امور سے اور اپنی دینی و نبوی ذمہ داریوں سے فارغ ہوجائیں، ''فَانْصَبْ'' تو آپ عبادت میں اپنے کو لگا دیجئے۔ چنانچہ مفسرین کرام نے فارغ ہونے کے معنی میں دنیوی امور و دینی امور دونوں کو مراد لیا ہے۔اسی لئے بعض نے فرمایا کہ ''جب آپ دنیوی کاموں سے فارغ ہوجائیں''، بعض نے کہا کہ ''جب آپ جہاد سے فارغ ہوجائیں'' اور بعض نے کہا کہ ''جب آپ تبلیغ وحی سے فارغ ہوجائیں''۔(دیکھو تفسیر ابن کثیر و روح المعانی)

لہذا مطلب یہ ہوا کہ آپ جب اپنے دنیوی و دینی کاموں و ذمہ داریوں سے فارغ ہوجائیں تو اب آپ خالص اللہ کی عبادت میں اپنے کو لگا دیجئے، اب کوئی اور مشغولیت نہ ہو، کسی کی جانب دھیان نہ ہو، بلکہ صرف اور صرف عبادت الٰہی میں مصروف ہوجائیں۔اور ''وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَب'' (اپنے رب ہی کی جانب رغبت کیجئے) کیا مطلب؟ مطلب یہ کہ اب آپ کو کسی اور کام سے کوئی مطلب نہ ہو، حتیٰ کہ دعوت و تبلیغ، تعلیم و تفہیم وغیرہ سے بھی کوئی مطلب نہ ہو، بلکہ صرف اپنے رب کی جانب توجہ و رغبت کیجئے۔

بلاغت کا ایک قاعدہ

اس آیت میں ایک بات طالب علموں کو سمجھنے کی ہے، یہاں طلبہ بھی موجود ہیں وہ غور کریں، وہ یہ کہ عربی میں اصل یہ ہے کہ پہلے فعل آتا ہے پھر فاعل ومفعول آتے ہیں، پھر اس فعل کے متعلقات آتے ہیں، جیسے ہم کہتے ہیں: " **تَكَلَّمَ زَيْدٌ خَالِداً فِيْ التَّارِيْخِ** "(زید نے خالد سے تاریخ کے بارے میں گفتگو کی) اس میں دیکھو پہلے" **تكلم** " ہے جو کہ فعل ہے، پھر" زید" جو کہ فاعل ہے، اس کے بعد" خالد" آیا ہے، وہ مفعول ہے، اس کے بعد" **في التاريخ**" ہے جو اس فعل کا متعلق ہے۔ لیکن کبھی کسی مصلحت سے ایسا بھی ہوتا ہے کہ متعلقات فعل کو پہلے اور فعل کو بعد میں لاتے ہیں، جیسا کہ اس آیت میں ہے:" **وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ** " اس میں" فارغب" فعل ہے اور" اِلی ربک" اس فعل کا متعلق ہے، اس لئے اصل تو یوں کہا جاتا کہ: " فارغب اِلی ربک"، لیکن اس میں فعل کو بعد میں اور اس کے متعلق کو پہلے لائے، اس میں ایک مصلحت ہے، وہ یہ ہے کہ اس سے کلام میں حصر پیدا کرنا مقصود ہے۔ لہذا اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ": آپ اپنے رب ہی کی جانب رغبت کیجئے، اور کسی دوسری طرف رغبت نہ کیجئے"۔ اس بات کے پیدا کرنے کے لئے یہ تقدیم و تاخیر کی گئی۔ یہ بھی ایک قاعدہ ہے عربی زبان کا، بلاغت کا، جس کو علماء عربیت و بلاغت یوں تعبیر کرتے ہیں: " تقديم ما حقه التأخير يفيد الحصر"(اس چیز کو مقدم کرنا جس کا حق مؤخر ہونے کا ہے یہ حصر کا فائدہ دیتا ہے) لہذا اس آیت سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ اللہ تعالی کو مطلوب یہ ہے کہ آدمی اپنے تمام دنیوی و دینی کاموں سے جلد سے جلد فارغ ہو اور صرف وصرف اللہ کی جانب متوجہ ہو، اسی کی عبادت میں لگ جائے، اور اس وقت کسی اور چیز کی جانب اس کی توجہ ورغبت نہ ہو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس کو واضح فرما دیا ہے کہ مسلمان کی شان کیا ہونی چاہئے، دعوت و تبلیغ والوں کی شان کیا ہونی چاہئے، درس و تدریس والوں کی شان کیا ہونی چاہئے، محققین اور فقہاء کی شان کیا ہونی چاہئے اور مجتہدین کی شان کیا ہونی چاہئے۔

ایک علمی نکتہ

اس آیت میں غور کرنے سے ایک نکتہ یہ بھی سمجھ میں آئے گا کہ آپ ﷺ کا کوئی کام دنیوی نہیں ہوتا تھا، آپ کی ساری مصروفیات دینی ہوتی تھیں، آپ کی صبح بھی دینی، شام بھی دینی، چلنا پھرنا، کہیں آنا جانا، سفر کرنا سب دینی کاموں کے لئے ہوتا تھا، پھر بھی اللہ تعالیٰ نے محمد الرسول اللہ ﷺ کو یہ حکم دیا کہ آپ اپنے ان دینی کاموں سے جو کہ عبادت غیر مقصودہ کی قبیل سے ہیں، جلدی فارغ ہو کر اللہ ہی کی طرف رغبت کیجئے اور عبادت مقصودہ یعنی نماز، ذکر وغیرہ میں لگ جایئے۔

جب دینی کاموں ہی سے جلدی فارغ ہو کر عبادت مقصودہ میں لگنے کا حکم ہے تو آپ اندازہ کر لیجئے کہ جو لوگ دنیوی کاموں میں لگے ہوئے ہیں تو ان کے بارے میں کیا حکم ہوگا۔ ارے بھائی! جو دینی چیزیں ہیں انہی میں نہیں، جیسے تدریس ہے، تالیف ہے، تصنیف ہے، تحقیق ہے، مطالعہ ہے،، دعوت ہے، تبلیغ ہے، جب انہیں چیزوں میں مگن نہیں رہنا ہے تو اب سوچ لیجئے جو دین سے تعلق رکھنے والی ہی نہیں ہیں، وہ محض دنیا ہے، ان کے اندر کیسے دماغ لگایا جا سکتا ہے۔

دنیوی چیزیں تین قسم کی ہیں

اب یہ سمجھئے کہ اس کے اندر جو مضمون آیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کو مقصود بنا کر زندگی

گزاری جائے ، دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں، بہت سے حالات ہیں، بہت سے مسائل ہیں، بہت سی ضرورتیں ہیں، بہت سی حاجتیں ہیں، لیکن ان سب میں مقصود اعظم انسان کے لیے اللہ کی ذات ہے، باقی سب چیزیں ضمنی ہیں۔ یاد رکھئے کہ دنیا میں چیزیں تین قسم کی ہوتی ہیں: ایک وہ چیزیں جو اللہ کو پانے کے راستے میں کام آنے والی اور مفید و معین ہیں، جیسے تعلیم ہے ، تعلم ہے، پھر اس سے آگے بڑھیں تو تدریس اور وعظ ہے ، نصیحت ہے، دعوت و تبلیغ ہے ۔دوسرے وہ چیزیں جو اللہ کے راستے میں حارج اور مانع بننے والی اور اس کے لے مضر و نقصان دہ ہیں، جیسے گناہ کے کام ، اور تیسری وہ چیز ہیں جو اس میں نہ مفید و معین ہیں اور نہ مانع و حارج ، جیسے انسان بہت سارے کام کرتا ہے اور اسے کرنے کی ضرورت بھی ہوتی ہے، کھانے کی ضرورت ہے، پینے کی ضرورت ہے، کمانے کی ضرورت ہے اور بیوی بچوں کے ساتھ رہنے کی ضرورت ہے اور مختلف لوگوں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے ، تعلقات وابستہ کرنا پڑتا ہے، اور رشتہ داریوں کو نباہنا پڑتا ہے، دوستوں کے ساتھ بھی اٹھنا اور بیٹھنا پڑتا ہے۔

تو ان میں سے جو چیزیں کہ اس راستے میں مانع بننے والی ہیں، حارج بننے والی ہیں، ان سے دور رہنے کا حکم دیا گیا ہے، کیونکہ ان کاموں سے اللہ نہیں ملے گا اور جو چیزیں ایسی ہیں کہ مانع بھی نہیں اور حارج بھی نہیں وہ فضول اور بیکار ہیں، ان کو اپنی دنیوی ضرورت کے لئے اختیار کرے تو ٹھیک ہے، اور جو چیزیں اللہ کے راستے میں مفید ہیں، معین ہیں، مددگار ہیں، ان کو اختیار کرنے کا حکم ہے۔

لیکن ان میں بھی اس بات کا خیال و دھیان چاہیئے کہ اصل مقصود اللہ کی ذات ہے ، اور یہ دیگر چیزیں اگر چہ کہ اللہ کے راستے میں مفید و معین ہیں مگر ان کا درجہ ثانوی درجہ ہے، ان کو اولین درجہ دینا صحیح نہیں ہے۔

حضرت نبی ﷺ کی ذمہ داریاں

دیکھئے، حضرت نبی اکرم ﷺ پر بہت ساری دینی و نبوی ذمہ داریاں تھیں: دعوت الی اللہ کی ذمہ داری، تبلیغ احکام کی ذمہ داری، لوگوں کو سمجھانے وافہام وتفہیم کی ذمہ داری، قرآن پڑھانے کی ذمہ داری، جہاد کی ذمہ داری، تعلیم کی ذمہ داری، اصلاح احوال کی ذمہ داری، وغیرہ۔ان میں بھی سب سے اہم ذمہ داری جس کے لیے نبوت دے کر نبی کو دنیا میں بھیجا جاتا ہے، وہ ہے دعوت الی اللہ، لوگوں کو اللہ کا پیغام کو پہنچانا۔ یہ سب سے اہم ذمہ داری ہوتی ہے نبی کی اور یہ بالکل واضح وظاہر ہے کہ یہ سب اعمال دراصل اللہ کی جانب سے آپ پر عائد تھیں اوران کو ادا کرنے پر ضرور بالضرور قرب خداوندی بھی نصیب ہوتا ہے، مگر ان تمام ذمہ داریوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آپ سے کہا ہے کہ اے نبی! جب آپ ان کاموں سے، ان ذمہ داریوں سے فارغ ہوجائیں تو پھر عبادت کے لیے تیار ہوجایئے اور پھر اپنے ہی رب کو دیکھئے، کسی اور کو نہ دیکھئے، اپنے رب ہی کی طرف توجہ کیجئے، کسی اور کو دھیان میں نہ لایئے، اپنے پروردگار ہی کی جانب رغبت کیجئے، کسی اور طرف رغبت والتفات ہی نہ کیجئے۔تو اس میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سبجیکٹ {Subject} کیا ہے؟ اس آیت کا، اس آیت کی تھیم {Theme} کیا ہے؟ اس آیت کا مقصود اعظم کیا ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ اصل مقصود اس کا یہی ہے کہ اللہ کی ذات کو مقصود بنایا جائے اور دیگر چیزوں کو ثانوی درجہ دیا جائے۔

دینی اعمال کی دو قسمیں

دنیا کے کام تو بہ ہر حال دنیا کے کام ہیں، ان کا تو کیا ذکر! میں کہتا ہوں کہ جو دینی کام واعمال ہیں، ان کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں: ایک دینی عمل وہ ہے جو مقصود

بالذات ہوتا ہے ، دوسرا وہ دینی عمل ہے جو مقصود بالعرض ہوتا ہے، یعنی خود مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ جیسے علماء نے عبادت کی دو قسمیں بتائی ہیں: ایک عبادت مقصودہ، جیسے نماز، روزہ، حج وزکاۃ، اور دوسری عبادت غیر مقصودہ، جیسے وضو، غسل، مسجد میں داخل ہونا، قرآن پاک کو چھونا، وغیرہ، یہ دونوں قسم کے اعمال عبادتیں تو ہیں، لیکن ان کے اندر ایک بڑا فرق ہے کہ ان میں سے ایک عبادتِ مقصودہ ہے، اور دوسری عبادتِ غیر مقصودہ ہے۔

مقصودہ عبادات کی مثال جیسے نماز، روزہ، حج، زکوۃ، قربانی، تلاوت، ذکر، یہ سب عبادتیں وہ ہیں جو شریعت میں مقصود بالذات ہیں یعنی بذات خود وہی مقصود ہیں اور کچھ عبادتیں ایسی ہوتی ہیں جو بذات خود مقصود نہیں ہوتیں، بلکہ وہ کسی عبادت مقصودہ کا ذریعہ یا وسیلہ ہونے کی وجہ سے مقصود ہوتی ہیں۔

جیسے مثال کے طور پر وضو عبادت ہے، بہت بڑی عبادت ہے، بہت بڑا ثواب ہے اس کا، لیکن اس کے باوجود علماء نے لکھا ہے کہ یہ عبادت غیر مقصود عبادت ہے، یعنی خود وضو کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ وضو کا مقصود یہ ہے کہ وضو کرنے کے بعد نماز پڑھ لیں، وضو کرنے کے بعد ذکر کرلیں، وضو کرنے کے بعد تلاوت کرلیں، وضو کرنے کے بعد کوئی اور عبادت کرلیں۔ دیگر عبادات مقصودہ کے لیے اس کو وسیلہ اور ذریعہ قرار دیا گیا ہے، وضو بالذات کوئی عبادت نہیں ہے، بلکہ بالتبع وبالعرض عبادت ہے۔

اسی طریقے سے ہمارے اعمال کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک اعمال مقصودہ، ایک اعمال غیر مقصودہ۔ اعمال مقصودہ میں عبادات نماز روزہ، زکاۃ وحج، اوراذکار وغیرہ ہیں، یہ سب اعمال اسلام میں بذات خود مقصود ہیں۔

اور کچھ اعمال ایسے ہیں جو بذات خود مقصود نہیں ہیں، جیسے درس وتدریس خود مقصود نہیں ہے، تصنیف وتالیف خود مقصود نہیں ہے، دعوت وتبلیغ خود مقصود نہیں ہے،

بلکہ یہ سب ایک مقصود کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں، مقصود کیا ہے؟ دین وعلم دین کی حفاظت اور دوسرے لوگوں کو دین پر جما دینا وغیرہ ہے، اس کے لیے یہ درس وتدریس ووعظ و نصیحت، تقریر وتحریر، تصنیف وتالیف وغیرہ واسطہ ہیں، ذریعہ ہیں، وسیلہ ہیں۔

غیر مقصود کو مقصود کا درجہ دینا بدعت ہے

بھائیو! جب آپ نے اعمال مقصودہ اور غیر مقصودہ کو سمجھ لیا تو اب ان کے بارے میں ایک اصول سمجھ لیجئے۔ وہ یہ کہ غیر مقصود عبادت کو مقصود عبادت کا درجہ دے دینا بدعت اور مکروہ ہے۔ آپ کہیں گے دلیل کیا ہے؟ ہمارے لیے بہت بڑی دلیل حضرات فقہاء کا کلام ہے، اس لیے کہ حضرات فقہاء دین کو زیادہ سمجھتے ہیں، حضرات فقہاء کو اللہ تعالیٰ تفقہ فی الدین سے نوازتا ہے، اس وجہ سے ان کی بات ہمارے لیے کافی ہے۔

چنانچہ فقہاء نے مسئلہ لکھا ہے کہ وضو کرنے کے بعد کسی عبادت مقصودہ کے انجام دیئے بغیر دوبارہ وضو کرنا بدعت اور مکروہ ہے۔ آپ وضو کر کے آئے، نماز نہیں پڑھی، ذکر بھی نہیں کیا، تلاوت بھی نہیں کیا، کوئی عبادت نہیں کی، پھر چلے گئے وضو کرنے کے لیے، پھر جی چاہا کہ چلو ایک دفعہ اور وضو کریں، بہت بڑا ثواب ہے، اس سے گناہ بھی جھڑ جاتے ہیں، اس لیے ایک دفعہ اور کرلو تو فقہاء لکھتے ہیں کہ یہ مکروہ ہے، بدعت ہے؛ کیوں؟ اس لیے کہ وضو مقصودہ عبادت نہیں ہے، اور غیر مقصود عبادت کو مقصود عبادت کا درجہ دے دینا بدعت ہے۔

حاشیہ: (قال الإمام البغوی ناقلا عن الإمام أحمد في شرح السنة : " و تجدید الوضو مستحب إذا کان قد صلی بالوضوء الأول صلاة و کرهه قوم إذا لم یکن قد صلی بالوضوء الأول صلاة فرضا أو نفلا " (شرح السنة: ٤٤٩/١، مرقاة المفاتیح: ٢٢٥/٢، رد المحتار شامی: ١/ ١٢٩)

اب یہاں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جس طرح عبادت غیر مقصودہ کو عبادت مقصودہ کا درجہ دینا بدعت ومکروہ ہے، اسی طرح اعمال غیر مقصودہ کو اعمال مقصودہ کا درجہ دے دینا بھی بدعت ہے، اوراس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی اعمال غیر مقصودہ ہی کے پیچھے پڑ جائے کہ اسی کو بار بار کرنے لگے اور اعمال غیر مقصودہ میں اس قدر مصروف ہو جائے کہ اسے اعمال مقصودہ کو انجام دینے کا موقعہ ہی نہ ملتا ہو یا وہ خود ان کو اس اہتمام سے نہ ادا کرتا ہو، اور غیر مقصود اعمال کو ہی سب کچھ سمجھتا ہو تو یہ بھی ایک بدعت ہے، بلکہ شیطان کا بہت بڑا دھوکہ ہے کیونکہ شیطان یہ چاہتا ہے کہ آدمی اگر گناہ میں نہیں تو کم از کم اعمال غیر مقصودہ ہی میں لگا رہے، اور اعمال مقصودہ کو ادا نہ کر سکے۔

اس آدمی کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی صرف وضو ہی کرتا رہے، اور نماز نہ پڑھتا ہو، ذکر نہ کرتا ہو، تلاوت نہ کرتا ہو۔ اسی طرح جو لوگ اعمال غیر مقصودہ جیسے درس وتدریس، وعظ و بیان، تصنیف وتالیف اور دعوت وتبلیغ میں لگے رہتے ہیں اور نماز وذکر وغیرہ کی طرف دھیان نہیں دیتے یا ان کو اچھی طرح ادا نہیں کرتے وہ بھی یوں سمجھیں کہ صرف وضو پر وضو کر رہے ہیں، اور نماز ہی نہیں پڑھتے۔

مذکورہ آیت میں اللہ تعالی اسی فرق کو اور اسی نکتہ کو بتانا چاہتے ہیں کہ اعمال غیر مقصودہ کو ان کے درجہ پر رکھا جائے اور اعمال مقصودہ کو ان کا درجہ دیا جائے۔

اعمال مقصودہ کا درجہ بدلنے کا انجام

آج افسوس ہے کہ امت کا ایک طبقہ جہالت کی وجہ سے اعمال مقصودہ اور غیر مقصودہ میں فرق نہیں کر پاتا، اور ایک دوسرا طبقہ ہے جو اس کو جاننے کے باوجود اس کی طرف توجہ نہیں کرتا اور شیطانی دھوکہ میں پھنس جاتا ہے۔

اس صورت حال کا انجام ونتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اعمال مقصودہ کو نہ صحیح طریقے پر ادا

کرتا ہے اور نہ اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے؛ کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ جب آدمی کسی چیز کو مقصود بناتا و سمجھتا ہے تو اس کا ایک اثر ہوتا ہے دماغ پر، دل پر اور اسی کے ساتھ جذبات اور خیالات پر کہ آدمی اس کام کو عمدہ طریقہ پر، پوری دلجمعی کے ساتھ ادا کرتا ہے، اور اس کام کو ادا کرنے کے لیے کوشش کرتا ہے کہ دوسرے تمام کاموں سے جلدی جلدی فارغ ہوجائے اور پھر اس اصل ومقصود کام میں لگ جائے۔

اور اگر خدانخواستہ معاملہ الٹا ہو کہ مقصود کام کو غیر مقصود سمجھ لیا مثلاً مقصود ہے اللہ کو پانا، ایک آدمی نے اس کے خلاف درس وتدریس کو اپنی زندگی کا مقصود بنالیا، تو اب وہ کیا کرے گا؟ نماز جلدی جلدی سے پڑھے گا، اور درس وتدریس کے لیے تیاری کرے گا، ایک آدمی تصنیف وتالیف کو مقصود بنالیا کہ میری زندگی کا مقصود ہے تصنیف وتالیف، تو اب اسے نماز میں مزہ نہیں آئے گا، توجہ نہیں رہے گی، دل اس میں نہیں لگے گا، دل کہے گا جلدی جلدی نماز پڑھو، یہ کہاں کی مصیبت ہے، جلدی یہاں سے نمٹو اور جا کر اپنا وہ کام کرو، اور پھر لکھنے پڑھنے میں مشغول ہوجائے گا، کیوں؟ یہ سب دراصل اسی خیال کا اثر ہے۔ معلوم ہوا کہ اصل کو اصل اور غیر اصل کو غیر اصل سمجھنا چاہیے، اگر اس کا الٹا ہوا تو نتائج غلط سامنے آئیں گے۔

خواص بھی غلطی میں مبتلا

مگر افسوس کہ اس مسئلہ میں عوام تو عوام خواص بھی غلطی میں مبتلا ہیں، اور عام طور پر اس میں غلطی ہورہی ہے اور مقصود کو غیر مقصود، غیر مقصود کو مقصود بنالینے کی وجہ سے جو مقصود چیز ہے، اس کو تو جلدی جلدی نمٹاتے ہیں اور اپنے دوسرے کاموں کے اندر مشغول ہوجاتے ہیں۔ جو عوام ہیں وہ تو مقصود حیات نماز وغیرہ کو ٹال کر دنیا کے کاموں میں لگ جاتے ہیں، تجارت میں، بیوی بچوں میں وغیرہ، اور جو حضرات

خواص علماء وطلبہ ہیں وہ بھی مقصود عبادات کو جلدی جلدی ادا کر کے درس وتدریس و تقریر وتحریر، دعوت وتبلیغ وغیرہ میں لگ جاتے ہیں۔

چند مثالیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں:

مثلاً ایک صاحب کسی جامعہ و مدرسہ میں استاذ و مدرس ہیں، وہ سمجھ رہے ہیں کہ مجھے درس بڑا شاندار دینا ہے، اس کے لیے بہت مطالعہ کرنا ہے اوراس میں یہ رموز اوراسرار منکشف کرنا ہے، یا عجیب وغریب تحقیقات سامنے لانا ہے، محیر العقول باتیں پیش کرنا ہے اور یہی میری زندگی کا اصل کام ہے، مقصود حیات ہے۔ جب ان کے دماغ میں یہ سما گیا تو اب ان کو کہاں مزہ آئے گا نماز پڑھنے میں، ان کا دل کہے گا نماز جلدی سے پڑھو، الٹی سیدھی نمٹاؤ، سجدہ کرو جلدی سے، رکوع کرو جلدی سے، تلاوت کرو جلدی سے، تمام ارکان کو جلدی سے ادا کرو، اور پھر اپنے اصل کام و مقصود کام کے اندر لگ جاؤ۔ کیوں ایسا ہوا؟ اس لیے ہوا کہ انھوں نے اسکو مقصود سمجھا جس کو غیر مقصود سمجھنا چاہئے۔

دوسری مثال لیجئے کہ ایک طالب علم نماز کو جلدی جلدی نمٹا تا ہے، رکوع اور سجدے تو بس مرغی کی ٹھونگ کی طرح ادا ہو رہے ہیں؛ کیوں؟ اس لئے کہ اس کے دماغ میں سمایا ہے کہ اصل کام اس کا یہ ہے کہ اسے تکرار کرنا ہے، سبق یاد کرنا ہے، بڑا عالم بننا ہے، اور عربی ادب میں مہارت پیدا کرنا ہے، فقہ وحدیث کا ماہر بننا ہے، اور یہی زندگی کا مقصود ہے۔ اس خیال کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ اس کو نماز میں ذکر میں ، تلاوت میں، کوئی لطف نہیں آتا، بلکہ وہ نماز کو بھی بس سر سے ٹلانے پڑھتا ہے، دل سے نہیں پڑھتا۔

حالانکہ غور کیجئے کہ مدرسہ اس لئے کھولا گیا تھا تا کہ طلبہ خشوع خضوع والی نماز سیکھیں، عالم اس لئے بنایا جار ہا تھا کہ وہ ذاکر بنے، ورنہ تو لغت کا عالم بنانا مقصود

نہیں تھا، بالفاظ دیگر اسے عارف بنانا مقصود تھا، اس لئے عالم بنایا جارہا تھا، اور یہ طالب علم ہے کہ اسی علم میں اٹک کر رہ گیا، آگے جو مقصود تھا وہاں تک پہونچا ہی نہیں اس کی وجہ بھی وہی ہے کہ مقصود اور غیر مقصود کی تمیز نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور مثال عوام کے اعتبار سے سن لیجئے کہ آج کل عموماً اور اہل بنگلور میں خصوصاً ایک بہت بڑی بیماری یہ چل رہی ہے کہ لوگ صرف بیانات سننے لگے ہیں، آج کسی کا بیان ہے تو کل کسی کا بیان ہے، صبح کسی کا بیان ہے تو شام میں کسی کا بیان ہے اور لوگوں کو بیان سننے کے علاوہ آگے کچھ عملی اقدام کرنا ہی نہیں ہے۔

اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ بیان جو کہ غیر مقصود عبادت ہے، اسے مقصودہ کا درجہ دے دیا گیا اور اس میں ایسا لگ گئے کہ مقصودہ اعمال فوت ہو رہے ہیں، رات دیر تک جلسوں میں مشغول ہو کر فجر کی نماز ترک ہو رہی ہے، مگر اس کا کوئی احساس بھی نہیں، بتاؤ کہ یہ شیطانی دھوکہ نہیں تو اور کیا ہے؟

الغرض اس طرح آپ غور کرتے چلے جائیں تو آپ کو ایسے بہت سے دیندار ملیں گے جو دین کے ان کاموں کو جن کا درجہ اعمال مقصودہ کا نہیں تھا ان میں ایسے منہمک ہو گئے ہیں کہ اعمال مقصودہ کو بھول گئے ہیں۔

یہ ایک عظیم غلطی ہے جو آج کے ماحول میں ہو رہی ہے۔ بڑوں سے، چھوٹوں سے اور علماء سے، مفتیوں سے، حدیث پڑھانے والوں سے۔ اللہ حفاظت فرمائے۔

امام اعظم ابوحنیفہ نے اللہ کو مقصود بنایا

ہمارے اکابرین ایسے تھے درس بھی، تدریس بھی، تبلیغ بھی، دعوت بھی، اور تصنیف بھی، تالیف بھی، تحقیق بھی، مطالعہ بھی اور اسی کے ساتھ ساتھ اللہ کے لیے اتنا بڑا حصہ کہ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

امام اعظم ابوحنیفہ دن بھر درس وتدریس، مسائل کا استنباط اور استخراج، قرآن میں حدیث میں غور وفکر، تدبر وتفکر، فقہ کی ترتیب وغیرہ میں مصروف رہتے اور جب شام ہوتی، عشاء کا وقت ہوتا، لوگ عشاء پڑھ کر چلے جاتے تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نماز کے لئے رکعت باندھ کر کھڑے ہو جاتے اور یہ رکعتوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا، یہاں تک کہ فجر کا وقت ہو جاتا تھا۔

شروع شروع میں سو رکعت نماز پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن کہیں جا رہے تھے، راستہ میں ایک شخص نے ایک اپنے ساتھی سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کو دکھا کر آہستہ سے کہا کہ یہ جو بزرگ جا رہے ہیں، یہ روزانہ پانچ سو رکعت پڑھا کرتے ہیں۔ وہ تو آہستہ سے کہہ رہا تھا لیکن امام صاحب کے کانوں میں اس کی آواز پہنچ گئی۔ امام صاحب نے کہا کہ اللہ اکبر! یہ میرے بارے میں یہ خیال رکھتا ہے کہ میں پانچ سو رکعت روزانہ پڑھتا ہوں جب کہ میں صرف سو ہی رکعت پڑھتا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ میں قرآن کی اس آیت کا مصداق بن جاؤں: ﴿وَيُحِبُّوْنَ أَنْ يُحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا﴾ (اور وہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے ایسی بات پر جو انھوں نے نہیں کی)

اگر میں اس کا مصداق بن جاؤں تو کیا ہوگا؟ جہنم کی سزا ہوگی۔ امام صاحب نے کہا کہ لوگ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ میں پانچ سو رکعت پڑھا کرتا ہوں تو میں آج سے پانچ سو رکعت پڑھا کروں گا۔ اور اس کے بعد سے آپ کا یہی معمول ہو گیا۔

پھر اس کے بعد ایسا ہی واقعہ ہوا کہ ایک دفعہ جا رہے تھے تو کسی آدمی نے امام ابوحنیفہ کو دکھا کر کہا کہ یہ بزرگ روزانہ ہزار رکعت نماز پڑھا کرتے ہیں، حالانکہ اس وقت پانچ سو رکعت پڑھتے تھے۔ امام صاحب نے اس کی یہ بات سن لی، اور کہا کہ

اگر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں ہزار رکعات پڑھتا ہوں حالانکہ میں صرف پانچ سو پڑھتا ہوں تو مجھے اللہ کے سامنے جواب دینا ہوگا، اس لیے میں آج سے ہزار رکعت نماز پڑھوں گا۔ اور زندگی بھر یہی معمول رہا، کتابوں کے اندر لکھا ہے کہ چالیس برس تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کی ،آپ کی پوری پوری رات عبادت کے اندر گزر جاتی تھی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگوں کا عجیب حال تھا۔ دیکھئے کس طرح اللہ کو مقصود بنا کر زندگی گذاری جاتی ہے۔ لہذا پڑھو، لکھو، تحقیق کرو، مطالعہ کرو، اور لوگوں کے لیے نیک کام کرو، ہمدردی اور غمخواری کے کام بھی کرو، دعوت وتبلیغ کے کام بھی کرو، لوگوں کو نصیحت کرو، عبرت کی باتیں بتاؤ، اللہ کی طرف ان کو متوجہ کرو، لیکن ان ساری چیزوں کے ساتھ کبھی اس کو نہ بھولو کہ میں پیدا ہی ہوا ہوں اپنے رب کے لیے۔ وہی مقصود ہے، وہی مطلوب۔

امام اوزاعی کی عبادت کا تذکرہ

حضرت امام اوزاعی بہت بڑے عالم تھے، مجتہد تھے اور ان کا بھی مسلک بہت زمانے تک دنیا میں چلتا رہا تھا، جیسے امام ابوحنیفہ کا، امام شافعی کا، امام مالک کا، امام احمد بن حنبل کا مسلک آج چل رہا ہے۔ اسی طرح امام اوزاعی رحمۃ اللہ کا بھی مسلک چلتا تھا، لیکن جب ائمہ اربعہ کا مسلک بہت آگے بڑھ گیا، لوگوں کے اندر اس کو مقبولیت ہوگئی تو پھر دوسرے ائمہ کے ماننے والے ختم ہوگئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی بہت بڑے مجتہد وامام تھے۔

ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ فجر کے بعد ان کے گھر پر پڑوس کی ایک

عورت آئی، امام اوزاعی گھر میں موجود نہیں تھے، چھوٹا سا گھر تھا، ایک طرف مصلی بچھا ہوا تھا، ایک طرف حضرت کی اہلیہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ عورت آکر ان کے بازو بیٹھ گئی اور کچھ باتیں کرنے لگی، اتنے میں اس کی نظر مصلی پر پڑی تو وہ عورت حضرت کی اہلیہ سے کہنے لگی: اماں جان! یہ دیکھئے، مصلی بھیگا ہوا ہے، اس پر کسی بچے نے پیشاب کر دیا ہوگا۔

حضرت کی اہلیہ نے کہا کہ ہمارے یہاں تو کوئی بچہ ہے نہیں، ہم بوڑھا بوڑھی دو ہی آدمی یہاں رہتے ہیں، ہمارے یہاں کوئی بچہ نہیں ہے۔ اس عورت نے کہا کہ: اگر بچہ نہیں ہے تو پھر پانی پڑ گیا ہوگا، یہ دیکھئے مصلی بھیگا ہوا ہے، تو حضرت کی اہلیہ نے مصلی پر اپنا ہاتھ پھیرا تو اس کے اوپر نمی تھی، یہ دیکھ کر کہا کہ یہ نہ پیشاب کی نمی ہے نہ ہی پانی کی نمی ہے، بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے حضرت پوری رات اس مصلی پر روتے رہتے ہیں، وہ تری ان کے آنسوؤں کی وجہ سے ہے جو تم کو نظر آرہی ہے۔

حضرت مرۃ ہمدانی کی عبادت

اسی طرح حضرت مرہ بن شرحبیل ہمدانی بہت بڑے عالم گزرے ہیں، تابعی ہیں، قرآن کی تفسیر میں ان کا ذکر کثرت کے ساتھ آتا ہے، ان کی عبادت وریاضت کے بارے میں بہت سے عجیب باتیں منقول ہیں، حضرت حارث الغنوی کہتے ہیں کہ انھوں نے ایسا سجدہ کیا کہ زمین کی مٹی ان کی پیشانی کو کھا گئی۔ روزانہ چھ سو یا ایک ہزار رکعات پڑھا کرتے تھے، حضرت علاء بن عبدالکریم کہتے ہیں کہ ہم ان کی خدمت میں آتے تو ان کے چہرے اور ہاتھ پیر پر سجدے کا اثر نظر آتا، وہ کچھ دیر ہمارے ساتھ بیٹھتے پھر کھڑے ہوجاتے اور بس نماز پڑھتے رہتے۔ (سیر اعلام النبلاء:۴/۷۵، حلیۃ الاولیاء:۴/۱۶۵)

محمد بن کعب قرظی کا ذکر خیر

ایک بزرگ محمد بن کعب القرظی کا ذکر بھی سنتے چلئے ، وہ بھی بہت بڑے عالم تھے، تابعی تھے، بہت سے صحابہ سے علم حاصل کیا تھا، بہت متقی واللہ والے تھے، انکی عبادت وآہ وبکا کا حال یہ تھا کہ رات بھر عبادت وریاضت کے ساتھ روتے رہتے تھے، بڑے بے چین ومضطرب نظر آتے تھے، ان کی والدہ نے ایک باران سے کہا کہ بیٹا! اگر میں نے بچپن سے اب تک تجھے نیک وپرہیزگار نہ دیکھتی تو تیرا یہ رونا دھونا دیکھ کر کہتی کہ کوئی بڑا گناہ تجھ سے ہوگیا ہے، اس لئے تو ایسا روتا ہے۔ اس پر حضرت محمد بن کعب نے کہا کہ اے اماں! ہوسکتا ہے کہ اللہ نے مجھے اس وقت دیکھ لیا ہو جبکہ میں کسی گناہ میں مبتلا تھا اور وہ مجھ سے یوں کہہ سکتا ہے کہ جا میں تیری مغفرت نہیں کروں گا۔ (صفۃ الصفوۃ:۱۳۲/۲، سیر اعلام النبلاء:۶۵/۵)

بھائیو! یہ تھے ہمارے اسلاف، جو ایک طرف علم کا پہاڑ وسمندر تھے اور علم کی نشر واشاعت ودعوت وتبلیغ، درس وتدریس میں لگے ہوئے تھے تو دوسری جانب ان کی راتیں ایسی ہوتی تھیں، عبادت وریاضت کا یہ حال تھا۔ اسی لئے امام شافعی کا قول کئی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ میں علماء کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ ایک وقت اپنا محض اللہ کے لیے خاص کر کے رکھیں: ''والی ربك فارغب'' والا معاملہ ہے۔

عالم کا کردار حضرت ابن مسعود کی نظر میں

اسی لیے حضرت سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ نے عالم کا کردار کیا ہونا چاہئے اس کے بارے میں فرمایا تھا:

'' ينبغي لقارئ القرآن أن يعرف بليله إذا الناس نائمون ، وبنهاره إذاالناس مستيقظون ، وببكائه إذا الناس يضحكون ، وبصمته إذا الناس

يخوضون ، وبخضوعه إذا الناس يختالون ، وبحزنه إذا الناس يفرحون"
(قاری یعنی عالم قرآن کے لئے مناسب ہے کہ وہ اپنی رات سے پہچانا جائے جب کہ لوگ سوئے ہوئے ہوں، اور اپنے دن سے پہچانا جائے جب کہ لوگ بیدار ہوں، اور اپنے رونے سے پہچانا جائے جب کہ لوگ ہنس رہے ہوں اور اپنی خاموشی سے پہچانا جائے جب کہ لوگ بحثا بحثی کر رہے ہوں اور اپنی تواضع سے پہچانا جائے جب کہ لوگ ڈینگیں مار رہے ہوں اور اپنے غم سے پہچانا جائے جب کہ لوگ خوشیاں منا رہے ہوں) (مقدمہ تفسیر قرطبی)

اس میں حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا ہے کہ قاریٔ قرآن کے لیے، عالم دین کے لیے، دین کو سمجھنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ رات اس طرح گزارے کہ رات سے اس کی پہچان ہو، جب ساری دنیا سو رہی ہو تو یہ اٹھ کر پڑھ رہا ہو، بیدار رہ کر اللہ کو پکار رہا ہو، نماز پڑھ رہا ہو، دعا مانگ رہا ہو، اللہ کے سامنے گڑگڑا رہا ہو۔

یہ اس کی ادا ہونی چاہئے۔ آج لوگ اسکو بھول گئے، اس سے بالکل غافل ہو گئے، عوام بھی بھول گئے، علماء بھی بھول گئے، طلبہ بھی بھول گئے، مدرسین بھی بھول گئے، ان کو یاد ہی نہیں رہا کہ یہ بھی کوئی سبجکٹ Subject ہے ہماری زندگی کا، جو ہمارے لیے انتہائی ضروری ہے، بلکہ سب سے زیادہ ضروری ہے۔

کوشش کر کے تو دیکھو

آج لوگ کہتے ہیں کہ بڑوں کی اتباع کرنا اور ان کے نقش قدم پر چلنا، اللہ کو مقصود بنا کر زندگی گذارنا مشکل ہے، نماز کو پوری توجہ سے پڑھنا مشکل ہے۔

ہم صرف کہتے ہیں، کوشش نہیں کرتے، کوشش کریں تو ضرور ہو سکتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ جو حضرت تھانویؒ کے

استاذ ہیں اور دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے ناظم تعلیمات تھے، صدر المدرس بھی تھے۔ وہ درس دے رہے تھے، دوران درس جب یہ حدیث آئی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ''**من توضأ وضوئي هذا ثم يصلي ركعتين لا يحدث فيهما بشيء إلا غفر له ما تقدم من ذنبه**'' (جو آدمی میرے وضو کی طرح وضو کرے پھر ایسی دو رکعتیں پڑھے جس کے اندر کوئی وسوسہ، کوئی خیال نہ آئے تو اس کے پچھلے گناہ بخش دیے جاتے ہیں) (بخاری:۱۹۳۴، مسلم: مشکاۃ:۲۸۷)

حضرت مولانا یعقوب صاحب نے اس کی تشریح فرماتے ہوئے کہا کہ ایسی نماز پڑھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ تو ایک طالب علم نے اٹھ کر پوچھا کہ حضرت! ایسا ہو بھی سکتا ہے کہ ہم بغیر وسوسے کے نماز پڑھیں؟ تو اس پر حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ نے فرمایا کہ پوچھتے ہی رہو گے یا کبھی کرو گے بھی۔

اس کے بعد کہا کہ کر کے دیکھو کیوں نہیں ہوتا، اگر نہ ہونے والی بات ہوتی تو اللہ کے نبی ﷺ کیوں کہتے، کیا اللہ کے نبی ﷺ نہ کی جانے والی بات بتانے کے لیے آئے تھے؟ معلوم ہوا کہ انسان میں اسکی طاقت ہے، اسی لیے اللہ کے نبی نے فرمایا۔

لہذا کوشش کرنا ہمارے ذمہ ہے، محنت کرنا ہمارے ذمہ ہے، جب مجاہدہ کریں گے تو اللہ تعالی راہیں کھولیں گے۔ آج ہمارا حال یہ ہو گیا کہ ہم دنیا کے لئے تو بہت مجاہدہ کرتے ہیں، لیکن اللہ کو مقصود زندگی بنانے کے لئے مجاہدہ نہیں کرتے۔

کیا دنیا مقصود زندگی ہے کہ جس کے لئے ہم مجاہدہ کریں، کیا اللہ کی ذات غیر مقصود ہے؟ کیا بیوی بچے مقصودِ زندگی ہیں؟ کیا کھانا پینا مقصودِ زندگی ہے؟ کیا تجارت اور منڈیاں مقصودِ زندگی ہیں؟ کیا درس وتدریس مقصودِ زندگی ہے؟ تصنیف وتالیف مقصود زندگی ہے؟ نہیں ہرگز نہیں، مومن کا مقصود زندگی اللہ کی ذات ہے۔

یہی ہے آیت کا مقصود اور مطلوب جس کو میں سمجھانا چاہتا ہوں کہ اپنے تمام کاموں میں تفریق کریں، تقسیم کریں کہ کون سا کام محض دنیا کا ہے اور کون سا کام مقصود بالغیر ہے اور کونسا کام مقصود بالذات ہے، ان کے بارے میں اسی کے جیسا معاملہ کریں جیسے کہ ان کے ساتھ معاملہ ہونا چاہئے۔ اگر معاملہ ایسا نہیں ہورہا ہے تو بھائی! ہم غلطی میں ہیں، اللہ کی اس آیت کی خلاف ورزی میں مبتلا ہیں۔

اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالی ہم سب کو اللہ ہی کو مقصود زندگی بنا کر زندگی گذارنے کی توفیق عطاء فرمائے۔

نماز کو نماز کیسے بنائیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نماز کو نماز کیسے بنائیں

نشانِ سجود تیری جبیں پر ہوا تو کیا
کوئی ایسا سجدہ کر کہ زمیں پر نشاں رہے

الحمد للّٰہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ . أما بعد

فقد قال اللّٰہ تعالی فی القرآن الکریم

أعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم ، بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾

(العنکبوت: ۴۵)

محترم دینی بھائیو!

عبادتوں میں سب سے اہم ترین عبادت نماز ہے، مگر آج اس کے اندر بڑی کمی وکوتاہی آ گئی ہے، حالانکہ نماز ہی کے لئے ہم پیدا کئے گئے ہیں، اور ہم نماز کے علاوہ سارے کام کر رہے ہیں، تو اس کی مثال ایسی ہوئی کہ کسی آدمی کو ایک اسکول میں ٹیچر واستاذ کے عہدے پر مقرر کیا گیا لیکن وہ سارے اپنے دھندے کرتا ہے، سوائے ٹیچری کے۔ آپ بتائیے کہ اسے تنخواہ ملے گی؟ اور اسکو برداشت کیا جائے گا؟ اسی طرح ایک آدمی کو ایک فیکٹری میں اس لئے لیا گیا کہ فیکٹری میں کچھ چیزیں بنانے کی

ہوتی ہیں تو اس سلسلے میں کام کرے اور وہ آدمی ہے کہ سب کچھ کرتا ہے لیکن وہ کام نہیں کرتا جس کے لئے اسے مقرر کیا گیا ہے۔

آج ہم لوگوں کا ایسا ہی حال ہو گیا ہے کہ ہم پیدا ہی کئے گئے اس لئے کہ ہم اللہ کی عبادت کریں اور عبادت میں سب سے اہم ترین عبادت نماز ہے، لیکن ہم وہی عمل کرنا نہیں چاہتے۔ ہم کھانا چاہتے ہیں، پینا چاہتے ہیں، رہنا چاہتے ہیں، آرام و آسائش چاہتے ہیں، دنیا کی سب چیزیں کرنے کے لئے تیار ہیں، لیکن جس کے لئے پیدا کئے گئے اسی کے لئے تیار نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ہم سب بڑی غفلت میں مبتلا ہیں۔

بدترین چور

نماز کے بارے میں ایک تو وہ لوگ ہیں جو نماز ہی نہیں پڑھتے۔ دوسرے وہ جو نماز تو پڑھتے ہیں لیکن نماز کو نماز کے جیسا نہیں پڑھتے، حالانکہ نماز کو نماز کے جیسا پڑھنا چاہئے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: "أسرق الناس سرقاً الذی یسرق من صلاته" (لوگوں میں بدترین قسم کا چور وہ ہے جو نماز میں چوری کرتا ہے) صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! یہ نماز میں چوری کیسے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ نماز میں چوری یہ ہے کہ اس کا رکوع وسجدہ ٹھیک نہ ہو۔ (المعجم الکبیر للطبرانی :۳۵۲۳، مجمع الزوائد :۲۷۲۲)

ایک حدیث میں فرمایا مرغی جیسا ٹھونگ مارتی ہے ایسا سجدہ نہ کرو یہ اللہ کو اور اللہ کے نبی ﷺ کو سخت ناپسند ہے۔ (معجم الأوسط للطبرانی:٦١٦٠)

ایک آدمی ایک کام کرے لیکن اس طرح نہ کرے جیسے کہ کرنا چاہئے تو اس کام کا

کوئی اعتبار نہیں ہوا کرتا، دنیا کا کوئی بھی کام ہو جب اس کے اصول وقوانین، اس کے قواعد وضوابط اور اس کے لوازمات اور اسکے طور وطریقے اور مالہ وماعلیہ کے ساتھ اس کام کو کیا جاتا ہے تو تب سمجھا جاتا ہے کہ وہ کام ادا ہو گیا اور اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو سمجھا جاتا ہے کہ وہ کام نہیں ہوا۔

اسی سے آپ سمجھ لیجئے کہ نماز کو نماز کے اصول وقوانین کے مطابق نہ پڑھے تو وہ نماز نماز نہیں ہے۔ قرآن کریم کے اندر اللہ تعالی نے نماز کے کچھ آثار اور نماز پر مرتب ہونے والے ثمرات کو بیان کیا ہے، اسی طرح قرآن وحدیث میں غور کرنے سے ہمیں نماز کو نماز بنانے اور نماز میں خشوع خضوع پیدا کرنے کے طریقے معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے میں نے ارداہ کیا کہ آپ کے سامنے نماز کے بارے میں کچھ اہم اہم چیزیں بیان کی جائیں جس سے کہ ہم اپنی نماز کو نماز بنانے میں کامیاب ہوسکیں اور اگر کامیاب نہ بھی ہوئے تو کوشش ضرور کریں اور کوشش کرنا ہی دراصل کامیابی ہے۔

لیکن اس وقت میرا مقصود نماز کے فقہی مسائل اور نماز کے سنن ومستحبات اور فرائض وواجبات کو ذکر کرنا نہیں ہے، بلکہ نماز کی کیفیات اور احوال کو بیان کرنا ہے۔

معروف اور منکر کے معنی

میں نے آپ کے سامنے یہ آیت پڑھی ہے: ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَر﴾ (بلاشبہ نماز روکتی ہے، فحش وبے حیائی کے کاموں سے اور منکر یعنی غلط چیز سے)

شریعت میں منکر ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو غلط ہو اور شریعت کے اندر اس کا کوئی جواز نہ ہو، ایسی چیز کا نام شریعت میں منکر ہے اور جو چیز شریعت میں جائز ہے اور

شریعت نے اس کو مشروع کیا ہے، اس کا نام شریعت میں معروف ہے۔

منکر اور معروف کے لغوی معنی دیکھنے کے بعد پھر قرآن میں اسے جس معنی کے لئے استعمال کیا ہے، اس پر غور کرینگے تو واقعی قرآن کریم کی بلاغت کا اندازہ ہوگا۔

عربی زبان میں معروف کے معنی آتے ہیں مشہور کے، جیسے کہتے ہیں کہ فلاں صاحب بڑے معروف ہیں، تو جو جانا جائے، پہچانا جائے، سب لوگ جانتے ہوں، اس کو کہتے ہیں معروف۔ تو شریعت نے نیکی کا نام معروف رکھ کر یہ بتایا ہے کہ اسلامی معاشرے کے اندر نیکی جانی و پہچانی چیز ہوا کرتی ہے، انجانی کوئی چیز نہیں ہوا کرتی۔ اسی لئے اسلامی معاشرے میں نیکی معروف ہوتی ہے، مشہور ہوتی ہے۔

لیکن آج ہمارے معاشرے میں نیکی، معروف اور جانی پہچانی چیز ہونے کے بجائے انجانی چیز ہوگئی ہے، کہیں کوئی نماز پڑھنے کھڑا ہوجائے تو لوگ اس کو عجیب نظر سے دیکھیں گے، گویا کہ نہ کرنے کی کوئی چیز کررہا ہو، اور اگر سگریٹ پھونک رہا ہے تو کوئی نہیں دیکھے گا، ننگا پھر رہا ہے، اسے کوئی نہیں دیکھے گا، اس لئے کہ کوئی تعجب کی بات نہیں، کوئی اسے معیوب نہیں سمجھے گا۔

لیکن اگر آپ اسٹیشن میں نماز پڑھنے لگیں تو غیر تو غیر اپنے بھی کچھ انجانی نگاہوں سے دیکھیں گے، کیا مطلب ہوا؟ آج ہمارے معاشرے کے اندر معروف چیز معروف نہ رہی حالانکہ وہ تو جانی و پہچانی چیز ہے۔

اور منکر کے معنی آتے ہیں انجانی، جس کو پہچانا نہ جاتا ہو، پتہ نہ ہو کہ کیا چیز ہے؟ اسکا نام ہے اصطلاح شریعت میں منکر۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ برائی مسلمان معاشرے میں ایک انجانی چیز ہوتی ہے، اس کو کوئی پہچانتا نہیں کہ کیا ہے؟ شراب کو مسلمان نہیں جانتا کہ یہ کیا ہے؟ جھوٹ وغیبت کو مسلمان سمجھتا ہی نہیں کہ یہ کیا ہے؟

اس لئے کہ اسلامی معاشرے میں اس کا رواج نہیں ہوتا۔

اس میں اللہ نے بتادیا ہے کہ اسلامی معاشرے میں نیکی تو معروف ہوتی ہے اس لئے اس کا چلن اسلامی معاشرے میں ضرور ہونا چاہئے اور جو چیز غلط وحرام وناجائز ہے وہ منکر ہے اس لئے اسلامی معاشرے میں یہ انجانی ہونی چاہئے اور لازمی طور پر اس کا چلن بھی معاشرے میں نہ ہونا چاہئے۔

نماز ہمیں برائیوں سے کیوں نہیں روکتی؟

مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: ﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَاءِ وَالۡمُنۡکَرِ﴾ (بلاشبہ نماز روکتی ہے، فحش وبے حیائی کے کاموں سے اور منکر یعنی غلط چیز سے) اس سے معلوم ہوا کہ نماز پڑھنے کے بعد نماز کا یہ اثر مرتب ہونا چاہئے کہ نماز نمازی کو برائیوں سے روکے، ورنہ وہ نماز جب بے حیائی ومنکر سے نہیں روکتی تو اللہ تعالیٰ نے یہ کیسے فرمادیا کہ نماز ان سے روکتی ہے؟

یہاں پر ایک سوال علماء نے کھڑا کیا ہے کہ جب نماز ہر فحش وبرائی سے روکتی ہے، زنا سے، چوری سے، ڈکیتی سے، جھوٹ سے، دھوکہ بازی سے، غیبت سے، چغلی سے، ظلم زبردستی سے، تو اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ نماز پڑھ رہے ہیں، لیکن جھوٹ بھی بول رہے ہیں، غیبت بھی ان سے جاری ہے، دوسروں کا مال بھی لوٹ رہے ہیں، غصب بھی کررہے ہیں، حرام کاموں میں بھی مبتلا ہیں، یہ سب ناجائز کام کررہے ہیں، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب بعض حضرات نے یہ دیا ہے کہ نماز روکتی تو ہے، لیکن لوگ رکتے نہیں، تو اس سے آیت پر کیا اشکال؟ اللہ نے یہ تو نہیں کہا کہ تم رک بھی جاؤ گے۔ نماز ایسی چیز ہے جو روکتی ہے، جیسے مولانا حضرات بہت سے برے کاموں سے روکتے

ہیں، کہ برائی نہ کرو، حرام نہ کرو، لیکن لوگ سن کر نہ مانیں اور الٹا سیدھا کرتے رہیں تو مولانا پر کیا اشکال واعتراض؟

دوسرا جواب جو بہت عمدہ وحقیقت کشا ہے، یہ ہے کہ آیت کا منشأ یہ بتانا ہے کہ نماز اگر واقعی نماز ہو تو بیشک اس کا اثر یہ مرتب ہوگا کہ آدمی واقعی گناہ سے بچنا شروع کردے گا، لیکن نماز کو پہلے نماز تو بنانا چاہئے، نماز حقیقت میں نماز ہو، اس کے اندر وہ کمال، وہ خشوع، وہ خضوع ہو، اور اخلاص ہو، جب اس طرح نماز پڑھی جائے گی تو اس کا اثر یہی ہوگا کہ جب آدمی برائی کی طرف جانا چاہے گا تو اس کے سامنے نماز آئے گی کہ ابھی تو نماز پڑھ کے آیا ہے، کیا حرکت کرنے جارہا ہے؟ تو یہ آدمی فوراً برائی سے رک جائے گا۔ اس تقریر سے اس سوال کا جواب سامنے آ گیا کہ ہماری نماز ہمیں کیوں برائی سے باز نہیں رکھتی؟ معلوم ہوا کہ دراصل ہماری نماز نماز ہی نہیں ہوئی ہے، اگر نماز نماز ہو جائے تو اس کا یہ اثر ضرور مرتب وظاہر ہوگا۔

ایک عبرت ناک حدیث

اور نماز کا یہ اثر مرتب ہونا نماز کے نماز ہونے کی علامت ہے، اور اگر یہ اثر اس کا نہ مرتب ہو تو اس پر حدیث میں وعید آئی ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ حضرت بنی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

”مَنْ لَمْ تَنْهَهُ صَلَاتُهُ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْفَحْشَاءِ لَمْ يَزْدَدْ مِنَ اللّٰهِ إِلَّا بُعْداً“

(جس آدمی کی نماز اسے برائی و بے حیائی سے نہ روکے تو اس کی یہ نماز اللہ سے دوری میں اضافہ کا ذریعہ ہوگی) (المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۰۸۶۲)

معلوم ہوا کہ نماز کے نماز ہونے کی پہچان اور علامت یہی ہے کہ وہ برائیوں سے روکتی ہے، اگر نماز برائیوں سے نہ روکے تو وہ نماز نہیں بلکہ اللہ سے بعد و دوری کا

ذریعہ ہے، جب آدمی واقعی نیکیوں پر چلنے لگتا ہے اور نماز کو واقعی طور پر پڑھتا ہے، اس میں اخلاص وللّٰہیت کا، خشوع وخضوع کا اور دلجمعی کا لحاظ رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کی حالت پلٹ دیتے ہیں، برا انسان بھی اچھا ہوجاتا ہے، اس کی برائیاں چھوٹنے لگتی ہیں، اس میں روز بروز سدھار ونکھار آتا جاتا ہے۔

نماز برائیوں سے کیسے روکتی ہے، ایک چور کا واقعہ

میرے شیخ ومرشد حضرت مسیح الامتؒ نے ایک واقعہ سنایا تھا کہ کسی زمانے میں ایک چور تھا، وہ ایک بادشاہ کے محل میں چوری کرنے کے ارادے سے گیا، رات کا وقت تھا اور محل کے ایک کمرے سے بادشاہ اور اس کی بیوی کی گفتگو کی آواز آرہی تھی، وہ کھڑے ہوکر سننے لگا، اگرچہ ایسا سننا ناجائز ہے، حرام ہے، چوری ہے، لیکن چور چوری ہی کرنے آیا تھا تو اسے سننے میں کیا چیز مانع ہوتی؟ آخر کو وہ چور ہی تو تھا۔ تو اس نے سنا کہ بادشاہ اپنی بیوی سے کہہ رہا ہے اور اس کی بیوی ہاں میں ہاں ملا رہی ہے کہ میں اپنی بیٹی کی شادی ایسے آدمی سے کرونگا جو نہایت متقی وپرہیزگار ہو، جو بہت بڑا اللہ والا ہو، میں میری بچی کی کسی اور سے شادی نہیں کرونگا۔

جب چور یہ بات سن رہا تھا کہ تو اس کے دل میں آیا کہ کیوں نہ میں ہی کچھ ایسا بن کر دکھاؤں کہ میرے ہی ساتھ شاہزادی کی شادی بادشاہ کردے۔ دل میں ایک حرص پیدا ہوگئی، اب وہ چوری کو تو بھول گیا، لیکن دھوکہ پر اتر آیا اور گھر میں جاکر بہت دیر تک سوچنے لگا کہ کس طرح میں اس بات میں کامیاب ہوسکتا ہوں؟ تو ایک تدبیر اس کی سمجھ میں آئی کہ بادشاہ کے محل کے قریب ایک مسجد ہے، اس مسجد میں جاکر بزرگانہ لباس پہن کر اور ان کی وضع قطع اختیار کرکے وہاں دن رات عبادت میں مشغول ہوکر بیٹھ جاؤں، تو شدہ شدہ بادشاہ تک بات پہونچے گی کہ کوئی آدمی

یہاں ایسا متقی پرہیزگار ہے جو دن رات اللہ کی عبادت میں مصروف ہے، تو ہوسکتا ہے کہ بادشاہ کی نگاہِ انتخاب میرے اوپر پڑ جائے اور میں چن لیا جاؤں اور شاہزادی سے میری شادی ہوجائے۔

بھائیو! یہ اس کا ایک نہایت حقیر اور ذلیل دنیوی مقصد تھا، جس کے لئے اس نے یہ ارادہ کیا، اور اس نے اپنے پروگرام کے مطابق بزرگانہ لباس و پوشاک، وضع قطع اختیار کر کے اس مسجد میں جا کر نمازوں پر نمازیں، ذکر وتلاوت، مراقبہ سب شروع کرلیا۔ اب زمانہ چلتا رہا، لوگوں میں شہرت ہوتی گئی کہ کوئی اللہ کے بہت بڑے ولی یہاں آگئے ہیں، جو دن رات عبادت کرتے ہیں۔ اب اس کی وجہ سے لوگوں کی آمدورفت کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہاں تک کہ بادشاہ تک خبر پہونچ گئی کہ یہاں کوئی اللہ والے آکر بیٹھے ہیں، ہیں تو جوان لیکن زہد وعبادت میں لاجواب وتقوی وطہارت میں بے نظیر، جب بادشاہ کو یہ بات معلوم ہوئی تو اپنے ارادے کے مطابق غور وفکر شروع کردیا کہ شاہزادی کے متعلق جو سوچا تھا، اس کے لئے اسی کا انتخاب کرلیا جائے۔

بادشاہ نے اس سلسلہ میں گفتگو کے لئے اپنے وزیر کو بھیجا، وزیر اس شخص کے پاس مسجد میں پہنچا اور اس نے باادب اس سے کہا کہ میں آپ کی خدمت عالیہ میں بادشاہ جہاں پناہ کی طرف سے آیا ہوں ایک پیغام لیکر۔ اس نے کہا کہ کیا پیغام ہے؟ وزیر نے بتایا کہ بادشاہ نے کئی سال پہلے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اپنی لڑکی کا نکاح ایک ایسے شخص سے کریں گے جو بڑا ہی متقی و پرہیزگار ہو، اللہ والا ہو، اور وہ اس کی تلاش میں تھے، اب جو نظر گئی تو نظر انتخاب آپ پر آ کر رک گئی ہے، لہذا بادشاہ نے مجھے بھیجا ہے کہ اس سلسلے میں آپ سے گفتگو کروں، اگر آپ اس کے لئے تیار ہوں تو فرمایئے، اگلی نشست کے اندر اس سلسلے کی کوئی کاروائی آگے بڑھائی جائے گی۔

یہ شخص جو دراصل اسی تمنا و آرزو میں یہاں آ کر بیٹھا تھا، وہ بہت دیر تک یہ وزیر کی گفتگو سنتا رہا، اس کے بعد اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، وزیر نے پوچھا کہ کیا بات ہو گئی؟ تو کہنے لگا کہ آج جو پیغام لیکر آپ آئے ہیں، یہ پیغام مجھے منظور نہیں ہے۔ وزیر نے کہا کہ کیوں منظور نہیں؟ اس نے کہا کہ دیکھئے میں صاف صاف بات آپ کو بتاتا ہوں کہ میں اصل میں ایک چور تھا اور میں بادشاہ کے محل میں چوری کے ارادے سے ایک مرتبہ گیا تھا، پھر جو کچھ بھی ہوا اس کو سنایا اور اس کے بعد اس چور نے کہا کہ میں نے تو یہ وضع قطع اسی حرص کی وجہ سے اختیار کی تھی، لیکن جب میں یہاں آ کر بیٹھا تو خدا نے مجھے اپنا بنالیا، اب بس اس کے بعد مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔

اللہ اکبر! جب عبادت عبادت ہو جائے، نماز نماز ہو جائے اور ذکر ذکر ہو جائے اور ہماری دیگر عبادتیں واقعی عبادتیں ہو جائیں تو بے شک یہ نمازیں اور عبادتیں انسان کو برائیوں سے روکتی ہیں۔

اللہ کے عظیم دربار کا تصور کریں

بہ ہر حال مجھے یہ کہنا ہے کہ آج ہمیں ہماری نمازوں کو نماز بنانے کی ضرورت ہے، لہذا میں اس سلسلہ میں چند اہم امور کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جس سے ان شاء اللہ نماز کو نماز بنانا آسان ہو جائے گا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جب ہم نماز کا ارادہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہم وضو کرتے ہیں، تو وضو کے وقت ہی اس کا تصور جمانا شروع کر دیں کہ میں وضو کرنے کے بعد اللہ کے عظیم شاہی دربار میں جانے والا ہوں، عظیم خالق کے دربار، احکم الحاکمین کے دربار کے اندر حاضری کے لئے مجھے جانا ہے۔

حضرت زین العابدین علی ابن الحسنؓ کے واقعات میں ہے کہ آپ جب وضو کرنے بیٹھتے تھے تو آپ کے چہرے پر تغیر آجاتا تھا، ایک رنگ آتا ایک جاتا تھا، چہرے کے تغیر کو دیکھ کر لوگ پوچھا کرتے تھے کہ حضرت! آپ وضو کرتے ہیں تو آپ کی حالت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے، چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ کیا تمہیں یہ نہیں معلوم کہ وضو کرنے کے بعد کس کے دربار میں جانا ہے؟ یعنی جب اللہ کے دربار عالی میں جانا ہے تو اس کی ہیبت کی وجہ سے یہ اثرات ہوتے ہیں۔

اس طرح جب اللہ کے دربار میں جانے کا تصور قائم ہوجائیگا اور پھر اللہ کی عظمت و بڑائی اور اس کی جلالت و کبریائی کا تصور بھی کیا جائیگا اور سوچا جائیگا کہ اگر ہم دنیا کے کسی بادشاہ کے دربار میں جائینگے تو ہماری کیا حالت ہوتی ہے؟ کیا کسی شاہی دربار میں آدمی ایسے ہی چلا جاتا ہے؟ بے خبری اور غفلت کے ساتھ اندر چلا جاتا ہے؟ نہیں، بلکہ جب وہاں جاتا ہے تو اسے پورا احساس ہوتا ہے کہ میں ایک بڑے آدمی کے دربار میں جارہا ہوں، بادشاہ کے عظیم دربار میں جارہا ہوں۔ لہذا جب یہ سوچتا ہوا جاتا ہے تو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس پر رعب وجلال کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔

لیکن ہم خدا کے دربار میں جاتے ہیں تو سوچے سمجھے بغیر چلے جاتے ہیں، اس لئے مسجد کو جاتے ہوئے اللہ کے رعب وجلال کا کوئی اثر ہم پر نمایاں نہیں ہوتا۔ اس لئے جب نماز کیلئے جائیں تو سوچ کر سمجھ کر اللہ کے دربار کی عظمت کا تصور کرتے ہوئے جائیں، اور پورے وقار کے ساتھ جائیں، ایسے طریقے سے نہ جائیں جو وقار کے خلاف ہو۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے مسجد میں دوڑ کر جانے سے منع فرمایا ہے اور حکم دیا ہے کہ اطمینان کے ساتھ جاؤ، وقار کے ساتھ اللہ کے دربار میں جاؤ، اگر تم کو پوری نماز مل گئی تو الحمد للہ، نہ ملی تو بقیہ نماز اپنے طور پر مکمل کرو، نماز کو پانے کے لئے مسجد میں دوڑتے ہوئے جانا، یہ اللہ کے دربار کے آداب کے خلاف ہے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: "إذا أقيمت الصلاة فلا تأتوها تسعون ائتوها تمشون ، عليكم السكينة ، فما أدركتم فصلوا وما فاتكم فاقضوا" (جب نماز کھڑی ہو جائے تو تم دوڑ کر نماز کو نہ آؤ، بلکہ چل کر آؤ، اس طرح کہ تم پر وقار ہو، پس جو نماز مل جائے اس کو پڑھ لو اور جو نہ ملے تو قضا کر لو)

(بخاری: ۱/۱۲۴، مسلم: ۱/۲۲۰، صحیح ابن خزیمہ: ۲/۱۷۷)

حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ جب نماز کے لئے جاتے تھے تو اس قدر آہستہ آہستہ چلتے تھے جیسے چیونٹی چلتی ہے، حتی کہ ان کے ایک شاگرد کہتے ہیں کہ اگر ان کے ساتھ چیونٹی بھی چلتی تو وہ اس سے بھی آگے نہ ہوتے۔ (حیاۃ الصحابہ: ۱۲/۷)

الغرض اسی تصور کے ساتھ اگر مسجد میں جائینگے تو نماز کے اندر بھی وہی تصور رہیگا اور اس تصور کو باقی رکھنا آسان ہو جائیگا اور جو آدمی کہ باہر کے خیالات کے ساتھ اور ادھر ادھر کے تصورات کے ساتھ اللہ کے دربار میں کھڑا ہوگا تو اسے کوئی احساس نہیں ہوگا کہ میں اللہ کے دربار میں کھڑا ہوا ہوں، بلکہ دنیا ہی اس کے ذہن میں آتی رہے گی۔ اس لئے یہ سب سے پہلا اصول وادب اور طریقہ ہے کہ نماز کو جانے سے پہلے ہی اللہ کے دربار کا جلال اور اس کی عظمت و بڑائی کا تصور قائم کر لیا جائے۔

مسجد میں داخل ہونے کی نیت ودعا

دوسری بات یہ ہے کہ جب ہم مسجد جائیں تو مسجد میں داخل ہونے کی نیت بھی کریں اور دعاء بھی پڑھیں ،سب گھروں میں آپ بغیر نیت کے جائیں،کوئی مضائقہ نہیں،لیکن اللہ کے گھر میں جاؤ تو نیت کر کے جاؤ کہ میں اعتکاف کی نیت کرتا ہوں۔

اس لئے کہ جب نیت اعتکاف کے ساتھ مسجد میں جائینگے تو جب تک مسجد میں رہیں گے اور وہاں نماز پڑھیں گے،ذکر کریں گے،تلاوت کریں گے اور کوئی نیک کام کریں گے تو ہر ایک کے ثواب کے ساتھ آپ کو اعتکاف کا بھی ثواب مل جائیگا،اور اگر کسی وقت کوئی اور عبادت نہ کرسکیں تب بھی اعتکاف کا ثواب جاری رہے گا،اس لئے اعتکاف کی نیت کر کے جاؤ،نیت کے ساتھ دعاء پڑھو،دعاء کیا ہے؟

" بِسۡمِ اللّٰهِ ، اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ ، اَللّٰهُمَّ افۡتَحۡ لِیۡ أَبۡوَابَ رَحۡمَتِكَ "(عمل الیوم واللیلۃ:۱۶۷،الاذکار للنووی:۴۴)

ایک بات یاد رکھیں کہ دعاء کی جاتی ہے، پڑھی نہیں جاتی،آج ہمارا حال یہ ہے کہ دعاء کرتے نہیں ہیں،دعاء پڑھ لیتے ہیں،یہ بات صحیح نہیں۔دعاء پر غور کرو کہ ہم کیا پڑھ رہے ہیں؟ اس دعاء کا مطلب یہ ہے کہ ''اے اللہ! اپنی رحمت کے دروازے میرے لئے کھولدے''۔معلوم ہوا کہ مسجد میں آنے پر اللہ کی طرف سے رحمت کے دروازے کھولے جاتے ہیں،ورنہ اس موقعہ پر یہ دعاء کیوں تجویز کی جاتی، یہ مسجد میں داخلے کا وقت رحمت کے دروازے کھلنے وقت ہے،اس لئے اس موقعہ پر یہ دعاء تلقین کی گئی ہے۔اگر اللہ کے دربار میں حاضر ہوتے ہوئے یہ دعاء دل کی گہرائیوں سے کرینگے اور دعاء کو دعاء بنا کر کریں گے اور اللہ سے التجاء کی جائے گی تو

رحمت کے دروازے کھل جائیں گے، پھر بتاؤ کہ ہمارا کونسا مسئلہ اٹکا ہوا ہوگا؟ صحت کا، یا کھانے پینے کا یا تجارت کا، ملازمت کا، یا شادی کا، یا کوئی اور مسئلہ؟ اسی طرح دین وآخرت کا کوئی مسئلہ ہو، نجات کا، فلاح کا، کامیابی کا، حساب وکتاب کا، الغرض دین و دنیا کے جو بھی مسئلے حل ہوتے ہیں وہ اللہ کی رحمت سے حل ہوتے ہیں، اگر خدا کی رحمت رک جائے تو پھر انسان زندہ بھی نہیں رہ سکتا۔ اس لئے اس وقت خوب توجہ سے دعاء کرتے ہوئے مسجد میں داخل ہونا چاہئے۔

مسجد میں داخلے کا ادب اور حضرت گنگوہیؒ

جب ہم مسجد جائیں تو سب سے پہلے ہم اپنے جوتے سے بایاں پیر نکالیں اور داہنے پیر سے مسجد میں داخل ہوں، اس لئے کہ یہاں ایک تو جوتے نکالنے کا ادب بھی ہے اور ایک مسجد میں داخل ہونے کا ادب بھی، جوتے نکالنے کا ادب یہ ہے کہ پہلے بایاں پیر نکالو اور مسجد میں داخل ہونے کا ادب یہ ہے کہ پہلے سیدھا پیر داخل کرو۔

ایک عالم صاحب حضرت گنگوہیؒ کے مرید تھے، وہ کہتے ہیں کہ جب میں کتابوں میں یہ پڑھتا تھا کہ مسجد میں جاتے ہوئے پہلے بائیں پیر سے جوتا نکالو اور مسجد میں داہنا پیر داخل کرو تو مجھے اشکال ہوتا تھا کہ یہ دونوں باتیں کیسے جمع ہوسکتی ہیں؟ نکالنا ہے بایاں پیر سے جوتا، داخل کرنا ہے سیدھا پیر، تو وہ کہتے ہیں کہ میں حضرت گنگوہیؒ کے پاس گیا، اور جانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ میں یہ دیکھوں کہ حضرتؒ اس سنت پر کیسے عمل کرتے ہیں؟ جب نماز کا وقت آیا تو حضرت کے ساتھ ساتھ نماز کو گیا اور جب مسجد میں داخل ہوئے تو وہاں دیکھتا رہا کہ حضرت مسجد میں کیسے داخل ہوتے ہیں؟

وہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت گنگوہیؒ کو دیکھ رہا تھا کہ حضرتؒ نے پہلے اپنا بایاں

پیر جوتے سے نکال کر جوتے ہی پر رکھ لیا، پھر اپنا داہنا پیر جوتے سے نکال کر سیدھے مسجد کے اندر رکھا۔اب مجھے سمجھ میں آ گیا کہ اس طریقہ پر دونوں باتوں دونوں سنتوں پر عمل ہوسکتا ہے۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت پر عمل سیکھنے سے آتا ہے اور وہ سیکھنا اللہ والوں کی صحبت سے میسر ہوتا ہے۔

ادب مسجد اور سفیان ثوری کا واقعہ

بہ ہر حال مسجد میں بھی اسی تصور کے ساتھ ادب کا لحاظ رکھتے ہوئے جانا چاہئے کہ میں اللہ کے دربار میں داخل ہو رہا ہوں۔واقعہ سنا ہوگا حضرت سفیان ثوریؒ کا کہ ایک مرتبہ مسجد میں بے خیالی کے ساتھ چلے گئے ،اور مسجد میں اپنا داہنا پیر پہلے داخل کرنے کے بجائے بائیں پیر سے داخل ہو گئے تو فوراً الہام ہوا اور اس الہام میں ان سے کہا گیا کہ اے ثور! یعنی (اے بیل) کیا ہمارے دربار میں آنے کا یہی ادب و طریقہ ہے؟ اللہ نے ان کو بیل کہا، اس لئے کہ یہ جو بیل و گدھے ہوتے ہیں، ان کے لئے کوئی اصول نہیں ہوتا، جو چاہے پہلے رکھو اور جو چاہے بعد میں رکھو۔لیکن انسان ہوکر بھی یہی بے اصولی کرے تو یہ بات قابل گرفت ہوتی ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت سفیان ثوری کو ثوری اسی واقعہ کی وجہ سے کہتے ہیں، مگر اس میں اشکال ہے؛ کیونکہ ثوری میں یائے نسبت لگی ہوئی ہے ،اس لئے اس کا معنی تو یہ ہوگا کہ ’’بیل والا‘‘ حالانکہ اللہ نے ان کو خود بیل کہا ہے نہ کہ بیل والا ،اس لئے صحیح بات یہ ہے کہ ثوری ان کو ایک قبیلہ کی طرف نسبت کی وجہ سے کہتے ہیں ،الغرض جب یہ الہام ہوا تو فوراً اللہ کے سامنے سجدے میں پڑ گئے ،رونے اور گڑگڑانے لگے اور معافی مانگنے لگے۔ لہذا مسجد میں داخل ہوتے ہوئے اس ادب کا لحاظ و دھیان ہونا چاہئے۔

جلد سوم

افادات

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی ومہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم بنگلور

وخلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ

ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

مرتب

محمد زبیر

(استاذ جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور)

ناشر:

فیصل پبلیکیشنز دیوبند

اجمالی فہرست

فہرست مضامین

عناوین | **صفحہ**

اللہ تعالیٰ کی محبت کیسے ملتی ہے

انسانی دل ایک کمپیوٹر ہے

ایک حدیث کی جدید اور انوکھی تشریح

نبی ﷺ کی ذات اسوۂ حسنہ

معرفت الٰہی اور اس کے آثار

شیطانی حربے

اللہ تعالیٰ ہی کو مقصود بنایئے

نماز کو نماز کیسے بنائیں

بیعت کیا اور کیوں؟

اطاعت مومن کی حیات ہے

ملنے کا پتہ

مکتبہ مسیح الامت

۸۴ آر مسٹرانگ روڈ، بیدواڑی، بنگلور

فون:9036701512

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

الحمد لأ هله و الصلوة لأهلها:

اللہ تعالی نے انسان کوصرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے ،اسی مقصد خداوندی کی تبلیغ کے لئے انبیاء کرام کا مبارک سلسلہ جاری ہوا، جو امام الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر ختم ہوا، آپ کے بعد اس عظیم کام کو حضرات اہل علم اور بالخصوص اولیاء عظام نے سنبھالا، اور انہوں نے تصنیف وتالیف، درس وتدریس، وعظ ونصیحت کے ذریعہ امت تک اس امانت کو امانت داری کے ساتھ بحسن وخوبی پہنچایا۔ان صلحاء واولیاء کی صحبتیں اور مجلسیں انسانوں کے دلوں کو معرفت الٰہی ومحبت الٰہی کے نور سے منور کرنے میں ہر زمانہ میں مؤثر رہی ہیں۔

اسی سلسلۂ عالیہ کی کیمیا اثری کا نمونہ مربی ومرشدی فداہ ابی وامی حضرت اقدس دامت برکاتہم ہیں اور ویران دل کے تاروں کو چھونے والی آپ کی نورانی مجالس وملفوظات ہیں، جس کے مجموعہ ''فیضان معرفت'' کی جلد اول ودوم کو اللہ تعالی نے بے پناہ مقبولیت عطاء فرمائی، اور الحمد للہ سالکین طریقت کو اس سے بہت فائدہ پہنچا، جس کی وجہ سے بہت سارے احباب تیسری جلد کے منتظر تھے۔

اب اللہ تعالی کی توفیق اور اساتذۂ کرام کی محنتوں اور دعاوں کے نتیجہ میں بندہ کو جلد سوم کی ترتیب کی سعادت ملی۔ان مجالس کے مجموعہ کی ایک خوبی یہ ہے کہ

حضرت والا اس پر از اول تا آخر نظر فرماتے ہیں ،اور نہایت مفید اضافے فرما کر ترتیب کی خامی کی وجہ سے پیدا شدہ مضامین کی تشنگی کو دور فرماتے ہیں۔

نیز اپنے قیمتی مشوروں سے نواز کر احقر کی ہمت افزائی فرماتے ہیں، اسی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے کہ مجالس کی ترتیب کا سلسلہ آگے بڑھ رہا ہے۔

اخیر میں میں حافظ سید محمد صہیب متعلم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم اور حافظ ومولوی حبیب الرحمٰن صاحب نائب امام مسجد بید کا ممنون ومشکور ہوں کہ انہوں نے مجالس کی ترتیب کے سلسلہ میں میرا بھر پور تعاون فرمایا، جس کے لئے میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اجر عظیم عطاء فرمائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ پہلی اور دوسری جلد کی طرح تیسری جلد کو بھی مقبولیت عطاء فرمائے ،اور ان مجالس کی ترتیب کے سلسلہ کو مزید آگے بڑھانے کی توفیق عطاء فرمائے اور امت کو نفع پہنچائے اور میرے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے ،اور حضرت اقدس دامت برکاتہم کا سایہ ہم پر تادیر قائم ودائم رکھے تاکہ ہم آپ کے علوم ظاہری وباطنی سے اور آپ کے مواعظ حسنہ سے اور آپ کی صحبتوں سے فیضیاب ہوتے رہیں۔

محمد زبیر
استاذ جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم
۱۵/ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ

اللہ تعالیٰ کی محبت کیسے ملتی ہے

باسمہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ کی محبت کیسے ملتی ہے

الحمدللّٰه و کفیٰ وسلام علی عباده الذین اصطفیٰ . أما بعد فقد قال النبی ﷺ قال اللّٰه تعالی:"وجبت محبتی للمتحابین فیَّ و المتجالسین فیَّ والمتزاورین فیَّ والمتباذلین فیَّ (أو کما قال علیه الصلاة والسلام)(مؤطا امام مالك :۱۷٤۸، مسند احمد:۲۲٦٥۱)

میں نے ایک حدیث قدسی آپ کے سامنے پڑھی ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ خبر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ''میری محبت واجب ہوگئی ان لوگوں کے لیے جو میرے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے بھی میری محبت واجب ہوگئی، ضروری ہوگئی، جو میری محبت کی خاطر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے اٹھتے ہیں اور ان کے لیے بھی میری محبت واجب ہوگئی، جو میری محبت کی خاطر ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں اور آخری جملہ میں فرماتے ہیں کہ ''ان لوگوں کے لیے بھی میری محبت واجب ہوگئی جو میری ہی محبت کی خاطر مال ودولت خرچ کرتے ہیں)

یہ حدیث ایک عجیب قسم کی حدیث ہے، اس میں اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ میری محبت کیسے ملتی ہے اور کب ملتی ہے۔

جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

سن لے اے دوست جب ایام بھلے آتے ہیں
گھات ملنے کی وہ خود آپ ہی بتلاتے ہیں

اللہ اکبر! جب اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتے ہیں اور اس کا اچھا وقت آجاتا ہے تو خود وہی بتاتے ہیں کہ کیسے ملنا ہے ہم سے؟ کہاں ملنا ہے ہم سے؟ اور ملنے کی راہ کیا ہے؟ یہ سب باتیں وہ خود ہی بتلا دیتے ہیں۔ اور اگر کسی کے ایام بھلے نہیں آتے تو آدمی ٹکروں پر ٹکّریں کھاتا رہتا ہے، نماز بھی جاری، ذکر بھی جاری، تلاوت بھی جاری، سب جاری اور دوسری طرف سے فضیحت بھی جاری، اس لیے کہ اس کا بھلا وقت نہیں آیا۔

شیطان نے بہت سجدے مارے لیکن کیا اس کا کوئی سجدہ اس کے کام آیا؟ بہت سجدے کیے یہاں تک کہ بعض علماء لکھتے ہیں کہ زمین کا کوئی چپہ ایسا نہیں جہاں اس نے سجدہ نہ کیا ہو، چپہ چپہ پر اس کا سجدہ، لیکن اس کا سجدہ اسے کچھ بھی کام نہیں آیا، کیوں؟ اس لیے کہ اس کے لیے کہ بھلے ایام آئے ہی نہیں۔

اب دیکھئے کہ اللہ نے اپنی محبت کے حصول کا کیا پتہ دیا ہے؟ اس حدیث میں کل چار قسم کے لوگوں کا ذکر ہے جن کو اللہ اپنی محبت عطاء فرماتے ہیں، ا یک وہ جو ایک دوسرے سے اللہ کے لئے محبت کرتے ہیں، دوسرے وہ جو اللہ کی خاطر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے اٹھتے ہیں، تیسرے وہ جو اللہ کی خاطر ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں اور چوتھے وہ جو اللہ کے لئے مال و دولت خرچ کرتے ہیں۔

اور یہ چار الگ الگ قسم کے لوگ نہیں ہیں، بلکہ یہ چار وہ ہیں جن کے اندر یہ چاروں صفات یکجا ملتی ہیں، گویا کہ یہ چاروں کی چاروں صفات ایک ہی ذات کے اندر ملتی ہیں، اس لیے کہ وہ آپس میں لازم ملزوم ہیں، ایک کے بغیر دوسرے کا وجود نہیں۔ اور جب ایک پایا جائے تو دوسرے کے نہ پائے جانے کا کوئی سوال نہیں۔ لہٰذا اس حدیث سے یہ سمجھ میں آیا کہ اللہ کی محبت ان لوگوں کو ملتی ہے جن کے

اندر یہ چار صفات موجود ہوں۔لہذا اللہ کی محبت کا پتہ یہ ہے کہ ان چار صفات کو پالیں،جس کو یہ چار صفات مل گئیں اس کو اللہ کی محبت مل گئی۔

ہرایک اللہ کی محبت کا خواہاں ہے

بھائیو! ہم میں کون ایسا ہے جو یہ نہ چاہتا ہو کہ اللہ تعالی کی محبت اسے ملے؟ سب چاہتے ہیں کہ اللہ کی محبت ہم کو مل جائے، ہر آدمی کی آرزو ہے، جستجو ہے، تلاش ہے، تمنا ہے، خواہش ہے کہ اللہ کی محبت ملے، حتی کہ جو لوگ گناہوں میں ملوث ہیں، وہ لوگ بھی چاہتے ہیں کہ ان کو اللہ کی محبت حاصل ہو، آپ کسی شرابی سے پوچھ کر دیکھئے، اور کسی زناکار سے پوچھ کر دیکھئے، کسی فاسق اور فاجر سے پوچھ کر دیکھئے بلکہ کافر سے پوچھ کر دیکھئے وہ بھی اللہ کی محبت چاہتا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے کہ اس چیز کی الفت اور محبت خدا نے سب کے دلوں میں ڈال رکھی ہے، اسی لیے اللہ کی معرفت انسان کی طبعی خواہش ہے، اللہ سے محبت انسان کی فطری آرزو ہے۔

جو مضطرب ہے اس کو ادھر التفات ہے
آخر خدا کے نام میں کوئی تو بات ہے

یہ الگ بات ہے کہ اسے شیطان بھٹکا بھٹکا کر غلط راہوں پر ڈالتا ہے جس کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب نہیں ہوتا، لیکن جہاں تک مسئلہ ہے نفس کی خواہش کا تو وہ ہر انسان کے دل میں ہے کہ اللہ کی محبت چاہئے اور اللہ کی معرفت چاہئے۔

پہلی صفت-اللہ والوں سے محبت

اب دیکھئے کہ اللہ کی محبت کن کن کو ملتی ہے؟ اس حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ نے سب سے پہلے فرمایا کہ ”وجبت محبتی للمتحابیین فی“ کہ اللہ کی محبت

ایک تو ان کو ملتی ہے جو اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔

یہ بات بہت واضح ہے کہ اللہ کے لیے محبت اسی آدمی سے ہوسکتی ہے جو اللہ کا محبوب و لاڈلا ہے، ورنہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ مثلاً کسی کافر سے محبت کریں اور کہیں کہ میں اللہ کے لیے ایک کافر سے محبت رکھتا ہوں؟ کسی فاجر سے، کافر سے اور کسی غلط کار انسان سے آپ محبت کریں اور پھر یہ دعویٰ کریں کہ میں اس آدمی سے جو محبت کررہا ہوں وہ محض اللہ کی محبت کے لیے ہے تو یہ بات حدیث کے منشاء کے خلاف ہے، اور اس دعوے کے اندر کوئی واقعیت اور کوئی حقیقت نہیں۔

اس لیے یہاں لامحالہ مراد یہ ہے کہ اللہ سے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں یعنی نیک لوگوں سے محبت کرتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد اولیاء اللہ کی اور نیک لوگوں کی محبت ہے۔

دوسری بات اس میں سمجھنے کی یہ ہے کہ "**متحابین**" عربی پڑھنے والے جانتے ہیں کہ یہ "تحابب" سے بنا ہے اور اس میں اشتراک پایا جاتا ہے، اس لئے اس کا ترجمہ ہے "آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرنا" لہذا "متحابین" دو قسم کے لوگ ہوں گے: ایک محبت کرنے والے ہوں گے اور ایک وہ ہوں گے جن سے محبت کی جائے، اسی وقت "**متحابین**" کا اطلاق صحیح ہوتا ہے، تو اب مطلب یہ ہوا کہ کچھ لوگ محض اللہ کی محبت میں اللہ کے محبوب بندوں سے محبت کریں گے اور دوسرے وہ لوگ جو اللہ کے محبوب ہیں وہ بھی ان لوگوں سے اس لیے محبت کریں گے کہ یہ اللہ کو چاہتے ہیں، اور اللہ کی محبت حاصل کرنے ان کی خدمت میں آئے ہیں۔ ادھر سے بھی محبت کا تحقق ہو، ادھر سے بھی محبت کا تحقق ہو، جب دونوں طرف سے تحقق محبت کا ہوا تو اشتراک ہوگیا۔

لہٰذا اولیاء اللہ کی خدمت میں جانا ہے؛ کیوں؟ ان سے محبت رکھنا ہے؛ کیوں؟ ان سے تعلق رکھنا ہے؛ کیوں؟ اس لیے کہ ان سے محبت کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ اپنی محبت ضرور بالضرور دیتے ہیں۔

ان سے ملنے کی ہے یہی یک راہ
ملنے والوں سے راہ پیدا کر

ارے جناب! اگر آپ اللہ کو چاہتے ہیں تو انہیں لوگوں کے پاس تو جائیں گے جن کے پاس اللہ ملے گا، چاول خریدنے انھیں کے پاس تو جائیں گے جن کے پاس چاول ملے گا، سونا خریدنے انھیں کے پاس تو جائیں گے جن کے پاس سونا ملے گا، اگر کسی آدمی کو سونا چاہیے اور وہ چلا گیا لوہار کے پاس تو اسے کبھی بھی سونا نہیں ملے گا۔ اسی طرح کافر کے پاس کفر ملے گا، فاسق کے پاس فسق ملے گا، خدا کی محبت نہیں ملے گی، جن کے پاس خدا کی محبت ہے وہ ہیں اولیاء اللہ، ان کے دلوں کے اندر جو خدا کی محبت ہے، اس کو پانے کے لیے ان سے محبت کیجئے۔ یہ ہے حاصل اس حدیثِ پاک کا۔

اللہ کے لئے محبت کرنے والوں کا مقام

ایک حدیث میں ہے، اللہ کے نبی علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا کہ اللہ فرماتے ہیں: ''أَلْمُتَحَابُّوْنَ فِی جَلَالِی لَھُمْ مَنَابِرُ مِنْ نُوْرٍ یَغْبِطُھُمُ النَّبِیُّوْنَ وَ الشُّھَدَاءُ'' (جو لوگ میرے جلال کی وجہ سے ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں، ان کے لیے قیامت کے دن نور کے ممبر بچھائے جائیں گے اور ان کو دیکھ کر انبیاء اور صدیقین بھی رشک کریں گے)۔ (ترمذی: ۶۴/۲، مسند احمد: ۲۲۰۸۰)

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام دعاؤں میں مسلسل

ایک دعا یہ بھی کرتے تھے:

﴿ أَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ يَّنْفَعُنِيْ حُبَّهٗ عِنْدَکَ ﴾

(اے اللہ! مجھے تیری محبت عطاء فرما اور اس شخص کی بھی محبت عطاء فرما جس کی محبت تیرے نزدیک کام آنے والی ہے) (ترمذی:۲/۱۸۷)

اللہ کے نبی دعاء میں کہہ رہے ہیں: اے اللہ! اس شخص کی بھی محبت عطاء فرما جس کی محبت تیرے پاس مجھے کام آنے والی ہے۔ سب سے بڑے تو حضور ہی ہیں، ان سے بڑا تو کوئی نہیں حتی کہ انبیاء بھی نہیں، آپ سردارِ انبیاء ہیں، آپ سید الاولین والآخرین ہیں، آپ سید الکائنات ہیں، آپ سید الانبیاء ہیں، سید المرسلین ہیں، آپ امام الانبیاء ہیں، آپ سے بڑا تو کوئی نہیں، اس کے باوجود یہ دعاء مانگنا دراصل ہمیں اور آپ کو اللہ والوں کا مقام بتانے اور سمجھانے کے لیے ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ والوں کی محبت مطلوب عندالشرع ہے۔ اور دوسری بات یہ بھی سمجھ میں آئی کہ اللہ کے ولیوں سے محبت رکھیں گے تو اللہ کے نزدیک وہ کام بھی آئے گی، کبھی ان کی سفارش ہو جائے گی، کبھی ان کی دعاء لگ جائے گی۔

بعض بزرگان دین نے ایک عجیب بات فرمائی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے محبوب بندوں کے دلوں میں جھانکتے ہیں، اور ان کے دلوں میں جن جن کی محبت ہوتی ہے ان کو بھی مقبول بنا دیتے ہیں۔

اللہ اکبر! گویا اللہ تعالی کہتے ہیں: یہ میرے بندے کا دل ہے اور اس دل میں دیکھو فلاں فلاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ یعنی یہ بندہ ان بندوں سے محبت کرتا ہے، جب ان سے یہ بندہ محبت کرتا ہے تو پھر میں ان کو بھی قبول کر لیتا ہوں۔

اہل اللہ کے جلیس محروم نہیں ہوتے

اسی لیے عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جو اولیاء اللہ سے تعلق رکھنے والے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو ہمیشہ محفوظ و مامون رکھتا ہے، جو اولیاء اللہ سے محبت کے ساتھ دین سیکھتے ہیں، اولیاء اللہ کی سرپرستی میں عمل سیکھتے ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ دین پر چلنا انگلی پکڑ پکڑ کر سیکھتے ہیں، جیسے بچہ اپنے باپ کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھتا ہے تو انشاء اللہ! اللہ تعالیٰ ان کو کفر سے، شرک سے، بدعت سے، ضلالت و گمراہی سے محفوظ و مامون رکھیں گے۔

ایک حدیث ذہن میں آگئی، وہ یہ کہ نبی کریم ﷺ نے ایک طویل حدیث میں فرمایا کہ اللہ کے فرشتے راستوں میں ذاکرین کو تلاش کرتے رہتے ہیں، جب وہ اللہ کے پاس جاتے ہیں تو اللہ تعالی ان سے اہل ذکر کے بارے میں پوچھتے ہیں پھر فرماتے ہیں کہ تم گواہ رہنا کہ میں نے ان کی مغفرت کردی، تو ایک فرشتہ کہتا ہے کہ اے اللہ! ان میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو ذکر کے لئے نہیں بلکہ اپنی کسی حاجت کی وجہ سے وہاں آیا تھا، تو اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ: "**هُمُ الْجُلُسَاءُ لَايَشْقٰى بِهِمْ جَلِيْسُهُمْ**" (یہ اہل ذکر وہ لوگ ہیں کہ ان کے پاس بیٹھنے والا بھی محروم نہیں ہے)
(بخاری: ۶۴۰۸، صحیح ابن حبان: ۱۳۵/۳)

اولیاء اللہ سے محبت و تعلق کا فائدہ، امام رازی کا واقعہ

اولیاء اللہ سے تعلق و محبت رکھنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالی ان کی وجہ سے ہمیں نواز دیتے ہیں، اور ایمان محفوظ رہتا ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ امام رازیؒ ایک جلیل القدر عالم، فاضل، مفسر اور اسی کے ساتھ ساتھ آپ بہت بڑے

فلسفی منطقی تھے، آپ نے محبت خداوندی کی خاطر ایک اللہ والے سے بیعت کی، شیخ نے اذکار ووظائف بتائے رات میں اٹھکر تہجد پڑھنے کو کہا، ذکر کرنے کا حکم دیا۔

امام رازی حکم کے مطابق جب ذکر کے لیے رات میں بیٹھتے تو ان کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کے اندر سے ایک دھواں نکل رہا ہے، انھوں نے چند دن تو دیکھا، اس کے بعد اپنے شیخ کے پاس جا کر شکایت کی کہ حضرت! میں ذکر کرتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے دل کے اندر ایک آگ ہے، اس کا دھواں نکل کر میرے منہ سے باہر جا رہا ہے۔

شیخ نے کہا کہ یہ اللہ کی محبت کی آگ ہے جو دل میں لگ رہی ہے، اور تمہارے فلسفہ اور منطق کے علوم کو جلا رہی ہے، اسی کا یہ دھواں ہے۔ امام رازی کو یہ سن کر بڑا افسوس ہوا، اس لیے کہ ان علوم کے پیچھے تو عمر لگائی تھی، زندگی کھپائی تھی، بڑا پیسہ خرچ کیا تھا، رات رات جاگتے رہے تھے، اپنا سارا آرام اور عیش اس کے پیچھے گنوا ڈالا تھا، یہاں تک کہ دنیا میں منطقیوں اور فلسفیوں کے امام قرار پائے۔

تو امام رازی نے کہا کہ اتنا سارا علم جو میں نے اتنی محنت اور مجاہدہ سے حاصل کیا ہے، اگر وہ جل کر خاک ہو جاتا ہے تو یہ مجھے منظور نہیں ہے۔ اس لیے واپس چلے آئے، لیکن آگ تو اندر لگ چکی تھی، وہ ایک چنگاری کی شکل میں اندر دبی رہی، زمانہ گزرتا رہا، گزرتا رہا، پھر ایک وقت وہ آیا جو ہر انسان کے لیے اللہ نے مقدر کر رکھا ہے یعنی موت کا وقت۔ موت کے وقت شیطان بہکانے کے لیے آیا اور اس نے امام رازی سے بحث شروع کر دی کہ تم اللہ کو ایک مانتے ہو؟ بتاؤ کیا دلیل ہے؟ امام رازی نے اپنے دماغ سے ایک سو دلیلیں اللہ کی وحدانیت پر فلسفیانہ منطقیانہ تیار کی تھیں۔

امام رازی نے دلیل پیش کی، لیکن شیطان تو ان سے بھی بڑا فلسفی تھا، اس نے

اس دلیل میں نقص وعیب نکال دیا، امام رازی نے کہا کہ یہ دلیل چھوڑو، دوسری لو۔ اس نے اس دلیل میں بھی کوئی کسر نکال دی۔ انھوں نے تیسری دلیل پیش کی، شیطان نے اس کے اندر بھی کوئی کھوٹ نکال دیا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ انھوں نے ننانوے دلیلیں پیش کیں اور اس نے سب کو توڑ دیا۔ اب روح قبض ہونے والی ہے، شیطان ادھر بہکانے میں مشغول ہے، اسی وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے شیخ کو الہام کیا، وہ اس وقت وضو کر رہے تھے، ان کے قلب پر الہام ہوا کہ تمہارے وہ مرید جو آئے تھے تمہارے پاس اور تم نے میری محبت کی آگ ان کے دل میں لگا دی تھی لیکن وہ پھر بھی واپس ہو گئے تھے۔ آگ لگ جانے کے بعد میں کسی کو محروم نہیں کیا کرتا، ذرا ان کی طرف آپ توجہ کریں۔ امام رازیؒ کی وہ گفتگو جو شیطان کے ساتھ چل رہی تھی، اللہ نے اِن بزرگ کو پہنچا دی، شیخ کو آواز آئی اور وہ سن رہے تھے۔

شیخ نے کہا کہ یہ کیا بحث ومباحثہ میں مبتلا ہو، کیوں نہیں کہہ دیتے کہ میں بے دلیل خدا کو ایک مانتا ہوں۔ یہ دلیل، وہ دلیل، یہ کیا دلیلیں ہیں؟ اللہ نے کہہ دیا کافی ہے ہمارے لیے، اب کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ امام رازی کو اللہ نے شیخ کی آواز سنائی، شیخ کی وہ آواز کان میں آتے ہی امام رازی کی زبان سے نکلا کہ میں بے دلیل خدا کو ایک مانتا ہوں۔ جب یہ کہا تو اسی وقت ان کی روح قبض ہو گئی اور شیطان بھاگ گیا۔

معلوم ہوا کہ جو اس راستہ پر چل پڑا، جو اس راستہ میں داخلہ لے لیا وہ کبھی محروم نہیں ہوگا، اللہ کبھی نہ کبھی اس کو پہنچا ہی دیتے ہیں۔

اللہ کے ولی کا ادب اور مغفرت، امام احمد بن حنبل کا واقعہ

بزرگوں کے واقعات میں لکھا ہے کہ امام احمد ابن حنبلؒ کے زمانہ میں ایک شخص کا انتقال ہوا۔ کسی کے خواب میں وہ شخص آیا تو اس نے پوچھا کہ بھائی! تیرے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کیا معاملہ ہوا؟ تو اس نے کہا کہ اللہ کے فضل سے میری مغفرت ہوگئی۔ پوچھا کہ کس بنیاد پر مغفرت ہوئی؟ کہا کہ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ مجھے وضو کرنے کی ضرورت پڑی تو میں وضو کرنے کے لیے ایک نہر کے کنارے پہنچا، میں نے دیکھا کہ نیچے کی طرف امام احمد بن حنبلؒ بیٹھ کر وضو کر رہے ہیں تو میں نے یہ خیال کیا کہ وہ وہاں وضو کر رہے ہیں، مجھے بھی وضو کرنا ہے، اگر میں یہاں بیٹھ کر وضو کروں گا تو میرا غسالہ (اعضاء کا دھویا ہوا پانی) ان کی طرف جائے گا اور ان کے وضو کے پانی میں ملے گا، یہ ادب کے خلاف ہے، اس لیے مجھے وہ جہاں بیٹھے ہیں اس سے نیچے بیٹھ کر وضو کرنا چاہئے۔ یہ سوچ کر میں وہاں سے اٹھا اور امام احمد بن حنبل جہاں بیٹھے تھے، اس کے نیچے جا کر میں نے وضو کیا تا کہ ان کا غسالہ میری طرف آئے گا تو مجھے بھی کچھ تبرک حاصل ہوگا۔ کہتے ہیں کہ اس ادب پر میری بخشش ہوگئی۔

اس واقعہ میں غور کیجئے کہ اللہ والے کا ایک معمولی ادب کرنے کی وجہ سے اللہ تعالی نے مغفرت جیسی عظیم دولت عطاء فرما دی، جو شخص ہمیشہ ان کی اتباع کرے تو اسے کیا کچھ اللہ تعالی نہیں دیں گے۔ اسی لئے بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ: "هُمْ قَوْمٌ لَا يَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ" کہ یہ اولیاء اللہ کی قوم وہ قوم ہے کہ ان کے پاس بیٹھنے والا کبھی محروم نہیں ہوتا۔ (بخاری: ۶۴۰۸)

دوسری صفت- مجالست

آگے حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی محبت پانے والوں کی دوسری صفت

بیان کی کہ "والمتجالسین فیّ" (جو میرے لئے مصاحبت اور مجالست اختیار کرتے ہیں، ان کے لیے بھی میری محبت واجب ہوگئی)

مجالست و مصاحبت کیا ہے؟ کہ نیک لوگوں کی صحبت و معیت میں رہا جائے، ان کے ساتھ اٹھنا، بیٹھنا ہو۔ اس حدیث میں مجالست پر اللہ کی محبت دیئے جانے کا ذکر ہے کہ جو اللہ والوں کے پاس اٹھتا بیٹھتا ہو اس کے لئے بھی اللہ کی محبت واجب ہوگئی۔

اے اللہ کو چاہنے والو! اگر تم واقعۃً اللہ کے طالب ہو تو جاؤ اہل اللہ کی صحبت اختیار کرو۔ اس سے اللہ کی محبت تم میں بھی منتقل ہو جائے گی۔

کیسے؟ سنو کہ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "نیک لوگوں کی صحبت کی مثال ایسی ہے، جیسے کوئی عطار ہو اور آدمی اس کے پاس پہنچے تو جب تک اس کے پاس رہے گا، ہوسکتا ہے کہ وہ خود اسے عطر لگا دے، عطر پیش کردے، اگر نہیں تو کم از کم جب تک وہاں بیٹھا رہے گا، اس کا دل و دماغ عطر کی خوشبوؤں سے معطر ہوتا رہے گا اور فرمایا کہ بری صحبت کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی آدمی کسی لوہار کے پاس اس کی بھٹی میں جا کر بیٹھ جائے، جب تک وہاں بیٹھے گا یا تو یہ ہوگا کہ اس کے کپڑے جلیں گے، کہیں چنگاریاں آئیں گی، اس کو جلائیں گی، اگر یہ نہیں ہوگا تو کم از کم از کم وہاں کے دھوئیں سے اس کا دماغ مکدر ہو جائے گا۔ (بخاری: ۱/۲۸۲، مسلم: ۲/۳۳۰)

اسی طرح نیک صحبت میں جب بیٹھے گا، اللہ کے ولیوں کی صحبت میں بیٹھے گا، نیک کردار لوگوں کی صحبت میں بیٹھے گا تو وہاں اللہ کا ذکر ہوتا رہے گا، رسول اللہ ﷺ کا ذکر ہوتا رہے گا، دین کا ذکر ہوتا رہے گا، دین کی فکر ہوتی رہے گی، دل و دماغ اس کی

وجہ سے معطر ہوجائے گا اور جب تک ان کے ساتھ بیٹھے گا دماغ کے اندر صالح تبدیلیاں بھی شروع ہوجائیں گی، اگر طبیعت میں ایسی تبدیلی پیدا ہوگئی جو پائیدار ہو تو پھر بیڑہ پار ہوجائے گا، اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو جب تک بیٹھے گا اس وقت تک تو یہ ہوگا کہ اس کے دل میں نیکی کا جذبہ وخیال، آخرت کی فکر وتڑپ پیدا ہوجائے گی۔ اسی بات کو رسول اللہ ﷺ نے ایک عمدہ مثال سے سمجھا دیا ہے۔

معلوم ہوا کہ نیک صحبت بہت ضروری ہے، نیک لوگوں کی مجلس کا اثر ضرور مرتب ہوتا ہے، دنیا کے اندر آپ دیکھ لیجئے، بڑی مجلسیں ہوتی ہیں، بری بھی ہوتی ہیں، اور اچھی بھی ہیں، مختلف قسم کی ہیں، دنیوی بھی ہیں، دینی بھی ہیں۔ ہر مجلس کا رنگ الگ ہوتا ہے، ہر مجلس کا اثر الگ ہوتا ہے، ہر مجلس کی کیفیت الگ ہوتی ہے۔ یہ اس لیے کہ یہ بات طے شدہ ہے کہ مجالس وصحبتوں کا اثر ضرور ہوتا ہے اور مجالس کا اثر صاحب مجلس کی وجہ سے ہوتا ہے۔

خود قرآن کریم نے بھی اس کا حکم دیا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور صادقین کے ساتھ رہا کرو) (التوبۃ :۱۱۹)

اس میں ''کُوْنُوْا'' فرمایا گیا، اس کے معنی ہیں ''رہا کرو'' ایک دفعہ رہو نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر استمرار ہے، ہوسکتا ہے کہ کوئی طالب علم سوال کر بیٹھے کہ اس میں استمرار کہاں سے آیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عربی داں جانتے ہیں کہ امر کا صیغہ مضارع سے بنتا ہے، جب مضارع سے بنتا ہے تو مضارع کی خصوصیات بھی اس کے اندر رہتی ہیں، لہذا مضارع میں تجدد بھی ہوتا ہے، مضارع کے اندر استمرار بھی ہوتا ہے، تو امر میں بھی استمرار اور تجدد پایا جائیگا۔

تو "کونوا" کا ترجمہ ہے، اولیاء اللہ ساتھ مستقل رہا کرو، یہ نہیں کہ ایک دفعہ جا کر پھر اس کے بعد بند کر دو۔

مجالس کا اثر مرتب ہونے پر ایک حسی مثال

بھائیو! مجالس کا اثر کس طرح مرتب ہوتا ہے اس کو ایک حسی مثال سے سمجھئے، کہ اگر کسی جگہ دو چار آدمی بیٹھ کر ہنس رہے ہوں، کسی بات پر کوئی تبصرہ انہوں نے کیا، کسی بات کا تذکرہ کیا اور اس میں کسی بات پر ہنسی آ گئی اور سب ہنسنے لگے، اسی ہنسی کے موقعہ پر آپ وہاں پہنچ گئے، اور وہ لوگ برابر ہنسنے میں مشغول ہوں۔تو آپ بتائیے کہ آپ وہاں روئیں گے یا خاموش بیٹھے گے، یا آپ بھی ہنسیں گے؟ ظاہر ہے کہ آپ بھی ضرور ہنسیں گے۔اب یہاں سوال یہ ہے کہ آپ نے تو کچھ سنا نہیں کہ بات کیا ہے، آپ کو بالکل معلوم نہیں ہے کہ اہل مجلس کیوں ہنس رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود آپ بھی ہنسیں گے۔ یہ ہے اثر کا منتقل ہونا، ان کے ہنسنے کا اثر آپ کے دل پر پڑ رہا ہے، اور آپ کو بھی ہنسی آ رہی ہے۔

بالکل اسی طریقہ پر ایک جگہ پر چند لوگ بیٹھے ہوئے رو رہے تھے اور آپ کو بالکل خبر نہیں تھی کہ وہ کیوں رو رہے ہیں، اپنی کسی بیماری سے رو رہے ہیں، کسی پریشانی سے رو رہے ہیں، کسی کے مار دینے سے رو رہے ہیں، یا اور بھی کوئی بات ہو سکتی ہے۔اتفاق سے آپ اس مجلس میں پہنچ گئے تو خود بخود آپ کو بھی رونا آ جائے گا، بغیر وجہ کے جانے آپ بھی رونا شروع کر دیں گے۔اگر آپ سے پوچھا جائے کہ آپ کیوں رو رہے ہیں۔آپ کہیں گے کہ مجھے پتہ نہیں ہے۔ یہ ہے مجلس کا اثر۔

اسی طرح مجالسِ اولیاء کے ذریعہ سے غیر شعوری طور پر علوم منتقل ہوتے ہیں، معرفت منتقل ہوتی ہے، محبت منتقل ہوتی ہے، اور دیگر کیفیات باطنی منتقل ہوتی ہیں،

اس کا انکار کرنا بداہت کا انکار ہے، اس کا انکار دن کے اجالے میں سورج کے انکار کے مرادف ہے۔

مجلس کا اثر کیسے ہوتا ہے؟ ایک حکیم صاحب کا واقعہ

حضرت مولانا حکیم الامت اشرف علی تھانویؒ کے ایک مرید تھے، انھوں نے ایک دفعہ حضرت تھانوی کے پاس خط لکھا کہ حضرت! میرے اندر غصہ بہت زیادہ ہے، میں یہ چاہتا ہوں کہ میری اصلاح ہو جائے۔ لہٰذا اس کے لیے کوئی نسخہ تجویز فرمادیں۔ وہ صاحب لکھنؤ سے قریب کے رہنے والے تھے۔

حضرت نے ان کو جواب لکھا کہ لکھنؤ میں میرے خلیفہ فلاں حکیم صاحب رہتے ہیں، فلاں جگہ پر ان کا مطب، کلینک ہے، تم ان سے اجازت لے کر ان کے پاس بیٹھ جایا کرو، وہ تو اپنے کام میں مشغول رہیں گے لیکن تم ان کے پاس جا کر بیٹھ جایا کرو اور یہ بھی لکھا کہ پندرہ دن تک بیٹھنے کے بعد مجھے خط لکھنا کہ کیا اثر ہوا۔

چنانچہ وہ صاحب پتہ تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچے، حکیم صاحب کی کلینک مل گئی، اور ان سے ملاقات کی اور کہا کہ حضرت نے مجھے ایسا لکھا ہے کہ میں آپ کی خدمت میں بیٹھا کروں، اگر آپ اجازت دیں تو یہاں بیٹھ جایا کروں گا۔ انھوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ وہ حکیم صاحب تو اپنے کام میں مشغول رہتے، بیماروں کی نبض دیکھتے، دوائیاں تجویز کرتے تھے، اور یہ صاحب ان کے قریب بیٹھے رہتے تھے۔ پندرہ دن کے بعد انھوں نے حضرت تھانوی کو خط لکھا کہ اللہ کا فضل ہے کہ غصہ بالکل کافور ہو گیا، انھوں نے اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ حضرت! غصہ تو میرا کافور ہو گیا، لیکن ایک سوال ذہن میں آ گیا ہے کہ حکیم صاحب نے نہ مجھے کچھ کہا اور نہ میں نے ان سے کچھ کہا، صرف ان کے پاس بیٹھنے سے میرا غصہ کیسے ختم ہو گیا؟ یہ

فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ حضرت کے پاس خط آیا تو اس کا جواب لکھا کہ جی! نہ انہوں نے کچھ کہا، نہ تم نے کچھ کہا، لیکن ان کے دل میں جو حلم کا مادہ ہے، صحبت کی تاثیر سے وہ منتقل ہو کر تمہارے دل میں آ گیا۔ اللہ اکبر! یہ ہے تاثیر صحبت اولیاء کی۔

لہذا یہ نیک لوگوں کی مصاحبت و مجالست بہت ضروری ہے، مجالست ایک ذریعہ ووسیلہ ہے اللہ کی معرفت کو پانے کا، اللہ کی محبت کو پانے کا، اسی کا ذکر مذکورہ حدیث کے اندر کیا گیا ہے۔

تیسری صفت - اہل اللہ کی زیارت

اب تیسری صفت سنئے، اس حدیث میں آگے فرمایا کہ: "والمتزاورین فی" (کہ میری محبت ان کے لئے بھی واجب ہوگئی جو میری خاطر ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں) لہذا اللہ کی محبت پانا ہو تو ایک کام یہ کرنا ہوگا کہ اہل اللہ کی زیارت وملاقات کی جائے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ: ایک شخص نے اپنے ایک مومن بھائی کی زیارت کی جو دوسرے گاؤں میں رہتا تھا، تو اللہ نے اس کی حفاظت کے لئے ایک فرشتہ کو اس کے راستے پر مقرر کر دیا، جب وہ شخص چلتے ہوئے اس فرشتے کے قریب سے گزرا تو فرشتہ نے پوچھا کہ کہاں کا ارادہ ہے؟ اس نے کہا کہ میرے بھائی جو اس گاؤں میں ہیں ان کے پاس جانے کا ارادہ ہے۔ فرشتہ نے پوچھا کہ کیا تمہاری کوئی اس سے رشتہ داری ہے؟ اس نے کہا نہیں، بلکہ صرف اللہ کے واسطے اس کی زیارت کو جا رہا ہوں، فرشتہ نے کہا کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا ہوں، اللہ نے تم کو بتایا ہے کہ اللہ بھی تم سے محبت کرتا ہے جس طرح تم اللہ کے لئے اس بندے سے محبت کرتے ہو۔ (مسلم: ۶۷۱۴، احمد: ۹۵۲۹)

بھائیو! جب اللہ کے واسطے اللہ کے محبوب بندوں کی زیارت کی جاتی ہے تو اللہ خوش ہوتے ہیں اور اس کو اپنی محبت عطا کر دیتے ہیں۔ اور بارگاہ الٰہی کے مقربین کی زیارت پر صرف آخرت ہی کی نعمتیں نہیں بلکہ دنیا کی نعمتیں بھی ملتی ہیں۔ ایک حدیث میں اس کا ذکر ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کسی بندے کی اللہ کے لئے زیارت کرتا ہے اس کو ایک منادی پکارتا ہے اور کہتا ہے کہ: تو خوش رہے اور تیرا سفر (یعنی آخرت کا سفر) بھی آرام سے ہو اور تو جنت میں اپنی منزل بنائے۔ (ترمذی: ۲۱۳۹)

غور فرمائیے کہ اس میں دین و دنیا دونوں کی بھلائی کی اللہ کا فرشتہ دعاء دے رہا ہے، کہ تو دنیا میں خوش رہے اور آخرت کا سفر بھی آرام سے ہو اور جنت میں منزل بھی بنالے۔ یہ کس بات پر دعاء دی جاتی ہے؟ اللہ کے نیک بندوں کی زیارت کرنے پر، معلوم ہوا کہ اللہ کے نیک بندوں کی زیارت و ملاقات کے لئے جانا چاہئے۔ یہ کام بہت بہترین کام ہے۔

مگر آجکل لوگوں میں اس کا رواج ہی ختم ہو گیا کہ اللہ والوں کی ملاقات و زیارت کی خاطر سفر کریں، ان کے مقام پر پہنچ کر ان سے استفادہ کریں۔ بلکہ اب کوئی بزرگ آجاتے ہیں تو لوگ بھیڑ کر کے ان کو دیکھ لیتے ہیں، اور وہ بھی ان کو تکلیف و اذیت پہنچا کر دیکھ لیتے ہیں۔ مصافحہ کے لئے ایک دوسرے پر تشدد کرتے ہیں، خود ان کو بھی تکلیف دیتے ہیں۔ یہ زیارت کوئی زیارت نہیں۔ ادب کے ساتھ ان کے پاس جائیے، اگر دور ہوں تو سفر کیجئے۔

چوتھی صفت: اہل اللہ پر خرچ

اب ایک صفت آخری رہ گئی جس پر اللہ کی جانب سے محبت عطا ہوتی ہے، اور

اس کا ذکر اس جملہ میں کیا گیا ہے: ''والمتباذلین فی'' (کہ میری محبت ان کے لئے بھی واجب ہوگئی جو ایک دوسرے پر محض میرے واسطے خرچ کرتے ہیں) لہذا اللہ کی محبت پانا ہوتو اللہ کے راستہ میں اللہ کی خاطر خرچ بھی کرنا چاہئے۔ اس میں مدارس ودینی کاموں پر خرچ بھی داخل ہے، کیونکہ دین پر اور اہل دین پر خرچ اللہ ہی کے لئے ہوتا ہے، اس کا اور کوئی مقصد نہیں، اور نہ ہونا چاہئے، لہذا تمام دینی خدمات و کاموں پر، خواہ وہ مدارس ہوں یا خانقاہیں ہوں، یا مساجد ہوں یا تبلیغی ودعوتی کام ہوں، جہادی ضرورتیں ہوں، یا طلبہ کی ضروریات ہوں، ان سب پر خرچ اللہ کی خاطر خرچ میں داخل ہے، اور اس پر اس حدیث میں یہ وعدہ ہے کہ اللہ کی محبت ملے گی۔

سخاوت اولیاء اللہ کی صفت ہے

بزرگو! اسی وجہ سے سخاوت کو ولی کا خاصہ کہا گیا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالی نے فرمایا کہ:

﴿وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّأَسِيْرًا ﴾ [الدھر:۸]

(وہ اللہ کی محبت میں مسکین ویتیم وقیدی کو کھانا کھلاتے ہیں)

ایک اور جگہ فرمایا گیا کہ:

﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيِّيْنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِىْ الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾ [البقرة:۱۷۷]

(لیکن بھلائی یہ ہے کہ کوئی اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں پر، اور اللہ کی کتاب پر اور نبیوں پر ایمان لائے، اور اللہ کی محبت میں رشتہ داروں، یتیموں،

مسکینوں اور مسافر کو مال دے)

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: " مَا جَبَلَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَلِیًّا لَہٗ اِلَّا عَلَی السَّخَاءِ " (اللہ نے اپنا کوئی ولی ایسا نہیں پیدا کیا جس میں سخاوت نہ ہو)(جمع الجوامع للسیوطی:۶۵۰، بسند ضعیف)

حضرت علیؓ کی سخاوت کا واقعہ

ابھی جو سورہ دہر کی آیت اوپر سنا تا آیا ہوں، وہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی کے یہاں فاقہ تھا، کھانے کو کوئی چیز میسر نہیں تھی، آپ نے اس موقعہ پر ایک رات کسی کے باغ کو پانی سینچ کر ڈالنے کی مزدوری کی، اور اس کام پر صبح کو باغ والے نے کچھ ''جو'' دئے، آپ اس کو لیکر آئے اور گھر میں اس ''جو'' کے تین حصے بنا کر ایک حصہ چکی میں پسوایا اور اس سے خزیرہ نام کا ایک کھانا پکایا گیا، اور کھانے کے لئے بیٹھے تو ایک مسکین آیا اور دستک دی کہ اللہ کے نام پر کچھ دیدو، آپ نے اور گھر کے افراد نے وہ سارا کھانا فقیر کو دیدیا، پھر باقی آٹے میں سے کچھ نکال کر پکایا اور کھانے بیٹھے تو ایک یتیم آیا کہ اللہ کے نام پر کچھ دیدو، آپ نے یہ کھانا بھی اللہ کے نام پر اس یتیم کو دیدیا، اور آٹے کے آخری بچے ہوئے حصہ کو لیکر اس کو پکایا، اور کھانے بیٹھے تو ایک قیدی آیا اور سوال کیا، آپ نے یہ بھی اللہ کے نام پر دیدیا۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، اور اس میں آپ کی تعریف فرمائی گئی۔(اسباب النزول واحدی:۴۰۷)

بھائیو! یہ اللہ کا کرم ہی ہوتا ہے کہ کوئی سخاوت کا کام کیا کرے، اور یہ کرم حضرات صحابہ پر اللہ کا بے حد تھا، اس لئے وہ حضرات حیرت انگیز قسم کی سخاوت بھی کرتے تھے۔ جس کا ایک نمونہ یہ ہے۔

ؓبیک وقت ایک لاکھ اسی ہزار کی سخاوت

لیجئے ،ایک اور حیرت ناک سخاوت کا واقعہ سنئے ،حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی خدمت میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے دو بوروں میں ایک لاکھ اسی ہزار درہم بھیجے ،حضرت عائشہ نے ایک طباق منگوایا اور یہ ساری رقم لوگوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا ،جب شام ہوئی تو اپنی باندی سے فرمایا کہ میری افطاری لاؤ ، باندی نے ایک روٹی اور زیتون کا تیل پیش کیا ،حضرت عائشہ کی ایک خادمہ ام درہ تھیں ، انھوں نے عرض کیا کہ کیا آپ نے جو مال تقسیم کیا اس میں ایک درہم کا گوشت ہمارے لئے نہیں خریدا جا سکتا تھا جس سے ہم لوگ افطار کرتے ؟ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ اگر تم نے مجھے یاد دلایا ہوتا تو میں خرید لیتی ۔

یہ حیرت انگیز قسم کی سخاوت ہے کہ خود تو یاد نہیں رہے ،اور ساری دنیا پر لٹا دیا ،اور رقم بھی کوئی معمولی نہیں ، بلکہ ایک لاکھ اسی ہزار درہم ، کیا ٹھکانہ ہے اس سخاوت کا !

حضرت ابن عباس ؓ کی سخاوت کا ایک واقعہ

اسی طرح ایک واقعہ حضرت ابن عباس کا کتابوں میں لکھا ہے ، وہ یہ کہ ایک مرتبہ حضرت ابن عباس ؓ کے پاس شہرہ بصرہ کے چند علماء آئے ،اس وقت حضرت ابن عباس بصرہ کے گورنر تھے ، انھوں نے کہا کہ ہمارے پڑوس میں ایک صاحب رہتے ہیں جو صوام وقوام یعنی دن بھر روزہ رکھنے والے اور رات بھر نماز پڑھنے والے ، بڑے عابد وزاہد اور اللہ والے ہیں ، ہم میں سے ہر شخص کی خواہش ہے کہ ان جیسے بن جائیں ، انھوں نے اپنی لڑکی کا نکاح اپنے ایک غریب بھتیجے سے کر دیا ہے ، اور وہ اس قابل نہیں کہ اپنی بیٹی کی رخصتی کا انتظام کر سکیں ۔ یہ سن کر حضرت ابن عباس ان علماء کو

اپنے گھر لے گئے اور ایک صندوق کھولکر اس میں سے درہموں کی چھ تھیلیاں نکالیں اور فرمایا کہ یہ لے جاؤ، پھر کہنے لگے کہ ٹھیرو، یہ کوئی انصاف کی بات نہیں کہ ہم ایک شخص کی عبادت میں خلل ڈالدیں، لہذا مجھے بھی ساتھ لیتے چلوتا کہ ہم سب اس کی بیٹی کی رخصتی میں اس کی مدد کریں، دنیا اتنی قابل قدر نہیں کہ مومن کی عبادت میں اس سے خلل ڈالا جائے، اور ہم اتنے بڑے نہیں کہ اولیاء اللہ کی خدمت نہ کریں۔

ایثار سخاوت کا اعلی درجہ

بھائیو! ایک بات یہاں اور جان لیں کہ ایثار سخاوت کا اعلی درجہ ہے، اور ایثار کہتے ہیں خود پر دوسروں کو ترجیح دینا، خود کو بھوک لگی ہے مگر خود نہیں کھاتا دوسروں کو کھلاتا ہے، خود پیاسا ہے مگر دوسروں کو پلاتا ہے۔ حضرات صحابہ کی یہی خصوصیت تھی کہ وہ محض سخی نہیں تھے، بلکہ ایثار کرتے تھے۔ اسی لئے قرآن نے ان کی تعریف میں فرمایا کہ:

﴿ وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾ [الحشر: ۹]

(وہ حضرات اپنے پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگر چہ خود ان کو تنگی ہو)

یعنی خود کو بھوگ و پیاس وغیرہ کی پریشانی ہے، مگر اس کے باوجود وہ حضرات دوسروں کو دیتے ہیں اور خود صبر کر لیتے ہیں۔

صحابہ کا ایثار-واقعات کی روشنی میں

یہاں ان حضرات کے ایثار کی چند مثالیں سناتا ہوں، ان سے ان کے بلند مقامات کا کچھ تھوڑا سا اندازہ ہوسکتا ہے۔

حدیث وتفاسیر کی کتابوں میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے

پاس آئے اور انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے سخت فاقہ لگا ہے۔ آپ نے اپنی عورتوں سے معلوم کیا کہ کوئی چیز تم لوگوں کے پاس ہے؟ لیکن کسی جگہ بھی کوئی کھانے کی چیز نہیں تھی۔ آپ نے اعلان کیا کہ کوئی ہے جو ہمارے مہمان کی آج رات مہمان نوازی کرے؟ تو حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے ،انھوں نے کہا کہ میں ان کی مہمان نوازی کروں گا۔ پھر ان کو اپنے گھر لے گئے ،اور اپنی بیوی سے کہا کہ مہمان رسول کی خاطر داری میں کوئی کسر نہ چھوڑنا ،ان کی بیوی نے کہا کہ آج ہمارے گھر سوائے بچوں کے کھانے کے کوئی چیز نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ بچوں کو بہلا پھسلا کر سلا دو ،اور ہم بھی آج اللہ کے نبی کے مہمان کی خاطر بھوکے رہ جائیں گے اور جو کھانا ہے ،اس کو لے آؤ ،اور جب ہم کھانے بیٹھیں تو کسی بہانے سے چراغ بجھا دو ،تا کہ مہمان سمجھیں کہ ہم بھی ان کے ساتھ کھا رہے ہیں۔ چنانچہ ان کی بیوی نے ایسا ہی کیا۔ اس طرح مہمان کو سارا کھانا کھلا دیا اور خود وہ اور ان کے بیوی بچے سب بھوکے رہ گئے۔ جب صبح ہوئی اور یہ حضرات رسول اللہ کی خدمت میں گئے تو آپ نے فرمایا کہ فلاں مرد و فلاں عورت سے اللہ نے تعجب کیا اور ان کے بارے میں آیت نازل کی ہے۔

پھر یہ آیت سنائی: ﴿ وَ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾ [الحشر:۹]

(وہ حضرات اپنے پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگر چہ خود ان کو تنگی ہو) (الدر المنثور: ۸/۱۰۷، الکشف والبیان للنیسابوری: ۹/۲۶۹)

اسی آیت کے شان نزول میں بعض مفسرین کرام نے یہ واقعہ بھی روایت کیا ہے کہ ایک صحابی کو کسی نے بکری کی سری ہدیہ میں بھیجی ،ان صحابی نے کہا کہ فلاں

بھائی صاحب اولاد ہیں، وہ مجھ سے زیادہ اس کے محتاج ہیں، لہذا ان کو دیدو۔ لہذا وہ سری ان کے گھر بھیج دی گئی۔ وہ دوسرے صحابی کہنے لگے کہ میرے سے فلاں صاحب محتاج ہیں، لہذا ان کو دیدو، وہ سری وہاں سے ایک تیسرے صحابی کے پاس پہنچی، اس طرح ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے گھر ہوتی ہوتی سات گھروں کا چکر لگا کر، اور بعض روایات میں ہے کہ نو گھروں کا چکر لگا کر وہ سری پھر پہلے صحابی کے پاس ہی آ گئی۔ اس پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔

(الدر المنثور: ۱۰۸/۸، الکشف والبیان للنیسابوری: ۲۶۹/۹)

ایک اور حیرت انگیز واقعہ تاریخ نے محفوظ کیا ہے، وہ یہ کہ حضرت ابوجہم بن حذیفہ ایک صحابی ہیں اور انھوں نے بڑی لمبی عمر پائی تھی، زمانہ جاہلیت بھی دیکھا اور زمانہ اسلام بھی دیکھا تھا، وہ کہتے ہیں کہ جنگ یرموک میں میرے چچازاد بھائی کو تلاش کرنے نکلا اور ساتھ میں ایک پانی کا مشکیزہ لے لیا تاکہ اگر وہ مل جائیں اور پانی کی ضرورت پڑے تو پریشانی نہ ہو، کہتے ہیں کہ میں نے ان کو ایک جگہ پالیا، وہ نزع کی حالت میں زخمی پڑے ہوئے تھے، میں نے ان سے کہا کہ کیا میں تمہیں پانی پلاؤں؟ انھوں نے کہا کہ ہاں! اتنے میں ان کے قریب ایک اور شخص زخمی حالت میں پڑے ہوئے تھے انھوں نے آہ کی، میرے چچازاد بھائی نے کہا کہ پہلے ان کو پانی پلاؤ، دیکھا تو وہ حضرت عمرو بن العاص کے بھائی ہشام بن العاص تھے، میں ان کے پاس پہنچا اور کہا کہ کیا پانی پلاؤں؟ تو انھوں نے کہا کہ ہاں! اتنے میں ایک اور شخص کے کراہنے کی آواز آئی، تو ہشام کہنے لگے کہ اس کو پہلے پلادو، حضرت ابوجہم کہتے ہیں کہ میں اس کے پاس پہنچا تو ان کا انتقال ہو چکا تھا، لہذا میں ہشام کے پاس آیا، دیکھا تو ان کا بھی انتقال ہو گیا ہے، یہ دیکھ کر میں اپنے چچازاد بھائی کے پاس آیا

کہ ان کو پانی پلادوں، مگر جب ان کے پاس پہنچا تو ان کا بھی وصال ہو چکا تھا۔ (مختصر تاریخ دمشق: ۱۴۲/۸)

یہ تھے حضرات صحابہ جن کے دلوں میں اللہ و رسول کی محبت اس طرح سمائی گئی تھی کہ وہ ہر چیز کو اس کے لئے قربان کر سکتے تھے۔ یہ اللہ و رسول کے عاشقین بھی تھے اور محبوبین بھی تھے۔

ایک اللہ والے غلام کا کتے پر ایثار

صحابہ تو بہ ہر حال صحابہ تھے، ان کے علاوہ بھی ایسے لوگ گزرے ہیں جنھوں نے بے مثال سخاوت وایثار کا ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ مجھے ایک غلام کا قصہ یاد آیا کہ عبداللہ بن جعفر کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اپنی ایک زمین کے سلسلہ میں ایک مقام پر گیا، وہاں ایک صاحب کے باغ میں بیٹھا تھا، دیکھا کہ ایک کالا غلام وہاں موجود ہے، اور کھانا کھا رہا ہے، اس کے پاس تین روٹیاں تھیں، اتنے میں ایک کتا آیا، اور اس غلام نے اس کتے کو ایک روٹی ڈالدی، کتا وہ روٹی کھا کر پھر آیا ، اس غلام نے ایک اور روٹی اس کو ڈالدی، کتے نے وہ بھی کھالی اور پھر آ کھڑا ہوا، اس غلام نے آخری روٹی بھی اس کو ڈالدی۔ عبداللہ بن جعفر کہتے ہیں کہ میں یہ سارا ماجرا ایک طرف بیٹھ کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس غلام سے پوچھا کہ روزانہ تجھے کتنی خوراک ملتی ہے؟ اس نے کہا کہ یہی جو آپ نے دیکھی یعنی تین روٹیاں، عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ تو نے تو ساری روٹیاں کتے کو ڈالدیں، اب تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا کہ میں بس بھوکا رہ جاؤں گا۔ میں نے پوچھا کہ ایسا کیوں کیا؟ تو وہ کہنے لگا کہ اصل یہ ہے کہ یہ علاقہ کوئی کتوں کا نہیں ہے، یہ کتا کہیں دور سے بھوکا آیا ہے، میں نے یہ

اچھا نہیں سمجھا کہ میں تو کھالوں اور کتا کھڑا دیکھتا رہے۔

اللہ اکبر! یہ حیرت انگیز سخاوت و ایثار ہے، جس کی نظیر ملنی مشکل ہے کہ خود بھوکا رہ کر کتے کو سارا کھانا کھلا دیا، آج لوگ اپنے بھائیوں تک کی طرف نظر نہیں کرتے، سگا بھائی پریشان ہے، خود فضول خرچی کرتے ہیں مگر اپنے بھائی کے کھانے پینے اور دوا دارو کا بھی خیال نہیں کرتے۔ ہمارے اسلاف کے یہ واقعات بتاتے ہیں کہ انھوں نے سخاوت کے ذریعہ مال لٹا کر محبت الٰہی کا خزانہ پالیا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اگر ایک شخص کو اللہ کی محبت اپنا مال خرچ کر کے مل جائے تو اس سے سستا سودا کوئی نہیں۔

ایک بزرگ کا واقعہ

جیسے ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ انھوں نے اللہ تعالی سے عرض کیا کہ اے اللہ! میں آپ کو پانا چاہتا ہوں۔ آپ کی قیمت کیا ہے؟ اگر آپ کی قیمت معلوم ہو جائے تو کوشش کر کے آپ کو پالوں گا۔ اللہ نے فرمایا کہ میری قیمت معلوم کرنا چاہتے ہو تو سنو کہ میری قیمت دونوں عالم ہیں۔ اس پر وہ بزرگ وجد میں آگئے اور اللہ کی جناب میں عرض کیا کہ اے اللہ! اگر آپ کی قیمت صرف یہ ہے کہ دو عالم دے دیئے جائیں تو یہ تو بہت سستا سودا ہے۔ کہنے لگے کہ

قیمتِ خود ہر دو عالم گفتۂ نرخ بالا کن، ارزانی ہنوز

یعنی آپ نے اپنی قیمت دو عالم بتائی ہے، اپنی قیمت میں اضافہ کیجیے، کہ یہ تو بہت کم ہے۔ اس طرح اللہ کی محبت اگر دنیا کے ان معمولی ٹکوں کے بدلہ میں مل جائے تو بہت سستا سودا ہے۔

سخاوت کی بہت سی شکلیں ہیں

اب یہاں ایک بات اور سمجھ لیں کہ سخاوت صرف مال کی نہیں ہوتی ، بلکہ سخاوت بہت سی چیزوں کی ہوتی ہے۔ایک سخاوت تو مال کی ہوتی ہے جو مالدار لوگ کریں گے۔اورایک سخاوت علم کی ہوتی ہے جوحضرات علماء کی جانب سے ہوتی ہے ،ایک سخاوت محنت وخدمت کی ہوتی ہے جوقوت وطاقت والوں کی طرف سے ہوتی ہے۔لہذاہر شخص اپنے بساط اوراپنی استعداد کے مطابق سخاوت کرسکتا ہے۔کسی کے پاس مال نہیں ہےتو وہ اپنے علم یا محنت وخدمت کے ذریعہ سخاوت کرے،کسی کے پاس علم نہیں ہےتو وہ نیک لوگوں کی خدمت کرے ، اس طرح کسی نہ کسی طرح سخاوت کا درجہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔اوراس سخاوت کا بھی یہی پھل ہے کہ اللہ اپنی محبت سےنوازتے ہیں۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کواپنی محبت ومعرفت سےنوازیں اوراپنےمحبوب بندوں میں شامل فرمائیں۔آمین۔

انسانی دل ایک کمپیوٹر ہے

باسمہ تعالیٰ

انسانی دل ایک کمپیوٹر ہے

ایک حدیث کی جدید اور انوکھی تشریح

الحمدللّٰہ و کفیٰ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ . اما بعد : فقد قال النبی ﷺ ﴿ **أَلَا اِنَّ فِي الْجَسَدِ لَمُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّه وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّه ، اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ** ﴾

(بخاری:۱/۱۳، مسلم:۲/۸۲)

دینی بھائیو! میں نے ایک حدیث پڑھی ہے جس میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ: ''کان کھول کر سن لو کہ جسم کے اندر ایک لوتھڑا ہے، اگر وہ صحیح رہتا ہے تو جسم کا پورا نظام صحیح رہتا ہے اور اگر وہ ٹیڑھا ہوجائے، خراب ہوجائے تو جسم کا پورا نظام خراب ہوجاتا ہے، جان لو کہ وہ لوتھڑا دل ہے''۔

یہ ایک بہت ہی اہم حدیث ہے، جس میں اصلاح قلب کی جانب توجہ دلائی گئی ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ دل جسم کے اندر سب سے اہم ہے اور اسی پر جسم کا ظاہری نظام بھی قائم ہے اور باطنی نظام بھی، لہذا دل کا نظام و سسٹم صحیح ہوتو جسم کا نظام صحیح رہتا ہے اور اگر دل کا سسٹم خراب ہوجاتا ہے تو جسم کا پورا نظام و سسٹم برباد ہوجاتا ہے۔

اس وقت میں اس حدیث کی تشریح کرنا چاہتا ہوں، اور اللہ نے اس حدیث کی توضیح وتشریح میں ایک بات میرے دل میں ڈالی ہے، اسی کو اس وقت پیش کروں گا۔

بزرگو! ابھی کچھ دیر پہلے یہاں جامعہ میں دوصاحبان ملاقات کے لئے آئے تھے، جوایک سافٹ ویر کمپنی میں کام کرتے ہیں، انھوں نے کچھ اصلاحی باتیں سننے کی خواہش کی، ان سے گفتگو کے دوران ایک مضمون دل میں آیا اوراسی کے ساتھ مذکورہ حدیث کامفہوم اوراس کی شرح بھی سامنے آگئی ، میں نے ان کے سامنے اسی کوپیش کردیا، میں اسی کو یہاں آپ حضرات کوبھی سنانا چاہتا ہوں۔

خطاب میں مخاطب کی رعایت

یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ موجودہ دور کمپیوٹر کا دور ہے،سافٹ ویر کا دور ہے، بنگلور بھی اس سافٹ ویر کی دنیا میں بہت آگے ہے، جوصاحبان آئے تھے وہ بھی سافٹ ویر کمپنی میں ملازمت کرتے ہیں، اس لئے میرے ذہن میں ایک بات اسی کے حوالہ سے آئی ، کیونکہ خطاب میں مخاطب کی رعایت ضروری ہے، اگر مخاطب ہو جاہل اوراس سے خطاب کیا جائے عالمانہ وفاضلانہ تو وہ پوری بات نہیں سمجھ سکتا، اسی طرح مخاطب ہوعالم وفاضل اور خطاب میں وہ طریقہ استعمال کیا جائے جوایک عامی کے مناسب ہے تو یہ مناسب نہ ہوگا۔ پھر اس میں بھی اگر ڈاکٹر سے اس کی اپنی اصطلاحات وزبان میں گفتگو کی جائے تو وہ بہت جلد مانوس ہوجاتا ہے اور بات کا اثر جلد قبول کرتا ہے، اگر مخاطب انجینئر ہے اوراس سے گفتگو میں اس کی اصطلاحات کا سہارا لیا جائے تواس کا بڑا اثر مرتب ہوتا ہے۔علماءکواس کی بھی رعایت کرنا چاہئے۔ الغرض میں نے جب دیکھا کہ یہ لوگ سافٹ ویر انجینئر ہیں تو میں نے انہی کی زبان میں گفتگو شروع کی۔

کمپیوٹر میں تین چیزیں ہیں

ان کے سامنے جوعرض کیا گیا خلاصہ اس مضمون کا یہ ہے کہ کمپیوٹر میں دو چیزیں

ہوتی ہیں: ایک کو ہارڈ ویر(HARD WARE) کہتے ہیں، اور ہارڈ ویراس کا ظاہری جسم ہے، جونظرآتا ہے اور دوسری چیز سافٹ ویر(SOFT WARE) ہے، یہ دراصل کمپیوٹر کی جان وروح ہے۔ پھر ہارڈ ویر میں ایک تو اس کی ہارڈ ڈسک (HARD DISK) ہوتی ہے اور ایک اس کا مانیٹر(MONITOR) ہوتا ہے۔ اس طرح کمپیوٹر میں کل تین چیزیں ہوتی ہیں: ایک ہے مانیٹر، دوسری ہے ہارڈ ڈسک اور تیسری ہے سافٹ ویر(SOFT WARE)۔

اب سنئے کہ مانیٹر تو صرف یہ کام کرتا ہے کہ کمپیوٹر کے اندر کی چیزوں کو اسکرین پر دکھاتا اور ظاہر کرتا ہے، اس کے سوا اس کا کوئی کام نہیں۔ اور ہارڈ ڈسک اس میں اصل چیز اور اس کی روح ہے، اسی سے کمپیوٹر کا پورا سسٹم چلتا ہے۔ اور سافٹ ویر اس ہارڈ ڈسک میں ایک چیز ڈالی جاتی ہے، جب آپ سافٹ ویر اس میں ڈالیں گے تو وہ اس کو اخذ یعنی (catch) کرلے گا، اور پھر اسی چیز کو مانیٹر کے ذریعہ دکھائے گا، مانیٹر کا کام صرف مظاہرہ کا ہے، یعنی دکھانے کا، ڈسپلے کرنے کا، اصل چیز یہ نہیں ہے، یہ دراصل کمپیوٹر کا جسم ہے اور ہارڈ ڈسک اس کمپیوٹر کے جسم کا دل ہے اور جو اس کے اندر سافٹ ویر بھرا ہوا ہوتا ہے، وہ دراصل اس کی روح ہے۔

ہارڈ ڈسک کو آپ پکڑ سکتے ہیں، چھو سکتے ہیں، دکھا سکتے ہیں، بتا سکتے ہیں، خرید کے اسے ہاتھ میں اٹھا کر لا سکتے ہیں، لیکن سافٹ ویر جو ہارڈ ڈسک کے اندر ڈالا جاتا ہے اس کو آپ پکڑ نہیں سکتے، اس کو آپ چھو نہیں سکتے، یہ ایک معنوی چیز ہے، جو ہارڈ ڈسک کے اندر داخل کردی جاتی ہے، جب آپ اسے اس کے اندر داخل کریں گے تو مانیٹر دکھائے گا کہ اس میں کیا کیا چیزیں ہیں، اس کے اندر جو جو عجیب وغریب چیزیں ہیں، وہ سب اس کے اندر سے نظر آئیں گی۔ اور سافٹ ویر

ڈالے بغیر کمپیوٹر کوئی کام نہیں کرسکتا، اس کو کام میں لانا ہو تو سافٹ ویر اس میں داخل کرنا پڑے گا۔

انسان کی تمثیل کمپیوٹر سے

جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب یہ سمجھو کہ اسی طرح انسان کی مثال ایک کمپیوٹر کی سی ہے، اور اس میں بھی دو چیزیں ہیں: ایک ہارڈ ویر ہے یہ اس کا جسم ہے، اور اس میں ایک ظاہری جسم ہے، یہ مانیٹر کے مانند ہے اور ایک اندرونی جسم ہے، یہ دل ہے، یہ ہارڈ ڈسک کی طرح ہے، اور یہ دونوں چیزیں انسان میں ہارڈ ویر کی طرح ہیں، اور اس ہارڈ ویر کو آپ پکڑ سکتے ہیں،، دیکھ سکتے ہیں، کسی کو دکھا بھی سکتے ہیں، دل کو بھی آپ نکالیں گے تو ہاتھ میں آ جائے گا، اور یہ دیکھا بھی جا سکتا ہے، اور دکھایا بھی جا سکتا ہے۔ اور دوسری چیز اس دل میں ڈالی جانے والی چیز ہے، جیسے ایمان و کفر، نیکی یا برائی، طاعت یا معصیت وغیرہ، یہ اس انسانی کمپیوٹر کا سافٹ ویر ہے۔

بھائیو! اب غور کرو کہ جس طرح کمپیوٹر سافٹ ویر کے بغیر کام نہیں کرتا، اسی طرح دل کے اندر ایمان و نیکی کا سافٹ ویر داخل کئے بغیر انسان بھی صحیح طور پر کام نہیں کرسکتا، لہذا ایک سافٹ ویر آپ کو اپنے دل کے اندر داخل کرنا پڑے گا، جو سافٹ ویر داخل کریں گے وہی آپ کے اعمال و افعال سے نظر آئے گا، وہی آپ کے اندر سے نظر آئے گا، اور یہ نظر آئے گا کہاں؟ مانیٹر میں، اور وہ مانیٹر انسان کا جسم ہے۔ سافٹ ویر کو رکھنے والی چیز ہارڈ ڈسک ہے اور ہارڈ ڈسک کے اندر جس سافٹ ویر کو آپ نے داخل کر دیا ہے، اس کا مظاہرہ کرنے کے لیے جسم مانیٹر ہے، اس میں آپ کے سارے عمل جو اندر سے آئیں گے، وہ مظاہرہ میں آئیں گے، اچھا عمل،

برا عمل، نیکی وطاعت کا عمل، برائی ومعصیت کا عمل، شر کا عمل، خیر کا عمل، شیطانی عمل، رحمانی عمل، سب اسی جسم پر ظاہر ہوگا، لیکن ظاہر کیسے ہوگا؟ دل کی وجہ سے ظاہر ہوگا، لیکن دل بھی یہ کام خود نہیں کرتا، بلکہ جو سافٹ ویر آپ اس میں ڈالیں گے، اسی سافٹ ویر کو آپ کے اعضاء سے دکھائے گا۔

یہ مثال میری سمجھ میں آئی اور مجھے یہ حدیث بھی سمجھ میں آئی کہ اللہ کے نبی کہتے ہیں کہ جسم کے اندر ایک لوتھڑا ہے وہ دل ہے، جب وہ صحیح رہتا ہے، یعنی جب اچھا سافٹ ویر اس میں داخل کیا جاتا ہے، جب اسے صالح بنایا جاتا ہے، اسے ڈھنگ کا بنایا جاتا ہے، اس کے اندر بہترین چیزیں داخل کی جاتی ہیں تو جسم بھی صحیح وسالم رہتا ہے، اور اگر دل کی ہارڈ ڈسک میں کوئی گندہ سافٹ ویر ڈال دیا تو جسم سے بھی برائی وخباثت ہی ظاہر ہوگی۔

دل کے لئے ایمانی سافٹ ویر

اب سنئے کہ اعمال واخلاق جو جسم سے ظاہر ہوتے ہیں ان کے صحیح واچھے ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دل میں ایمانی سافٹ ویر داخل کئے جائیں، یہ ایمانی سافٹ ویر کیا ہیں؟ یہ محبت وعشق الٰہی، ذکر و یاد الٰہی، خوف وخشیت الٰہی، توکل و اعتماد علی اللہ، انابت وتوجہ الی اللہ، اخلاص وللّٰہیت، خشوع وخضوع، عشق رسول، عظمت رسول، خوف وفکر آخرت، زہد وقناعت، وغیرہ کے سافٹ ویر ہیں۔ مثال کے طور پر خوفِ خداوندی کا سافٹ ویر اس میں آپ داخل کر دیں، محبت خداوندی کا سافٹ ویر آپ اس میں داخل کر دیں، اور عشقِ محمدی کا سافٹ ویر آپ اس میں داخل کر دیں اور اسی طریقہ پر آپ اس کے اندر اخلاص کا سافٹ ویر داخل کر دیں، تواضع کا ایک سافٹ ویر داخل کر دیں، اسی طرح بہت سارے یہ سافٹ ویر داخل

کئے جا سکتے ہیں، جب اس قسم کے سافٹ ویر اس میں داخل کردیں گے تو اب آپ کے اس مانیٹر سے یعنی جسم کے اعضاء سے، اسی طرح کے نیک وعمدہ اعمال وافعال آنے لگیں گے، اب اس سے تواضع چھلکتی ہے، اخلاص اس سے ظاہر ہوتا ہے، اللہ کا خوف محسوس ہوتا ہے، کبھی آنسو چھلک پڑتے ہیں، کبھی دل میں اللہ کے ڈر اور خوف کی وجہ سے ایک قسم کی گھبراہٹ پیدا ہونے لگتی ہے، آدمی کا دل بھی، دماغ بھی سب اس سے متاثر ہوتے ہے، اللہ کی محبت آجاتی ہے، نمازوں کی طرف دل چلنے لگتا ہے، خشوع وخضوع کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، دماغ آخرت کے کاموں کی طرف چلنے لگتا ہے۔

یہ ساری باتیں جو آپ کے جسم کے مانیٹر سے ظہور میں آتی ہیں، یہ دراصل دل کی ہارڈ ڈسک کی وجہ سے ہیں بلکہ اس کے اندر جو پڑا ہوا سافٹ ویر ہے اس کی وجہ سے ہیں۔

شیطانی سافٹ ویر

اس کے برخلاف دل کو بگاڑنے والے سافٹ ویر بھی ہوتے ہیں، جو ایمانی سافٹ ویر کے برخلاف دل کو تباہ وبرباد کرتے ہیں، جیسے مثال کے طور پر اللہ سے غفلت کا سافٹ ویر، دنیا کی محبت کا سافٹ ویر، تکبر کا سافٹ ویر، یا ریاکاری کا سافٹ ویر، خواہش نفس کا سافٹ ویر، آخرت سے غفلت کا سافٹ ویر، وغیرہ۔ اور فرض کیجئے کہ آپ نے دل کی اس ہارڈ ڈسک میں جیسے دنیا کے لوگ کمپیوٹر میں غلط سافٹ ویر بھی داخل کردیتے ہیں۔ مثلاً اس کے اندر ناچ گانا، فحش وعریاں تصاویر، حیا سوز مناظر، یا ایمان سوز باتیں، اسی طرح مختلف قسم کی گندی اور خبیث قسم کی چیزیں، شیطانی قسم کے اعمال کے سافٹ ویر اس میں داخل کردیتے ہیں، اس طرح

کے شیطانی سافٹ ویر انسٹال کر دئے تو جو سافٹ ویر اس میں رہے گا، وہی نظر آئے گا، آپ اسے کھولیں گے تو ننگے ناچ بھی نظر آئیں گے، خباثتیں بھی نظر آئیں گی، شرارتیں بھی نظر آئیں گی۔

اسی طرح دل کے اندر اگر غلط سافٹ ویر آپ نے داخل کر دیا تو آپ کے اعمال سے بھی اور آپ کے جسم کے مانیٹر سے بھی وہی سب چیزیں چھلکیں گی۔

لہٰذا جو خبائث ورذائل ہمارے اعمال سے صادر ہوتے ہیں وہ دراصل دل کی ہارڈ ڈسک کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

حدیث مذکور کی شرح

اس تمہید کے بعد اب سنئے کہ اللہ کے نبی ﷺ اسی کو فرماتے ہیں کہ جسم میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے:

''اِذَا صَلُحَتْ ''(جب یہ لوتھڑا صحیح رہتا ہے)، اچھا سافٹ ویر اس میں داخل کیا جاتا ہے ایمان کا، طاعت وعبادت کے چسکہ کا، محبت الٰہی کا، خوف الٰہی کا، تقوی وتزکیہ کا اخلاس وللّٰہیت کا، خوف وفکر آخرت کا تو پھر کیا ہوتا ہے:

''صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّه''(پورے جسم کا نظام صحیح طور پر قائم رہتا ہے) اور اس کے مانیٹر سے بھی اچھے اچھے اعمال، اچھی اچھی باتیں صادر ہوتی ہیں۔ زبان سے اللہ کا ذکر، دین کی باتیں، لوگوں کی بھلائی کی باتیں صادر ہوں گی، ہاتھ پیر سے نیک اعمال واخلاق کا ظہور ہوگا، کانوں اور آنکھوں سے بھی صلاح وتقوی نکلے گا۔

''وَاِذَا فَسَدَتْ''(اور اگر یہ لوتھڑا خراب وفاسد ہو جاتا ہے) غلط سافٹ ویر اس میں داخل کر دیا جاتا ہے، بے ایمانی کا، غفلت کا، معصیت کا، تکبر وعجب کا، دنیا

کی محبت کا، اور یہ دل کا ہارڈ ڈسک خراب ہوجائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ:

" **فَسَدَالْجَسَدُ کُلُّه** " (تو پورا جسم کا نظام خراب ہوجائے گا) پھر پورے جسم سے غلط ہی غلط چیزیں نظر آئیں گی، حیا سوز و ایمان سوز اعمال صادر ہوں گے، کفر وشرک دکھائی دے گا، معصیت و گناہ کی باتیں ظاہر ہوں گی، نہ زبان ٹھیک چلے گی، نہ ہاتھ پیر صحیح کام کریں گے، نہ آنکھ و کان ڈھنگ و سلیقہ کے ہوں گے، الغرض سارا جسم غلط ہی کام کرے گا۔

حضرات صوفیاء کا کام

لہذا انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے دل میں اچھے اچھے سافٹ ویر داخل کرے اور برے وگندے سافٹ ویر سے پرہیز کرے۔ میں کہتا ہوں کہ حضرات صوفیاء کا یہی کام ہے، وہ آپ کے دل کو نیکی و طاعت کے جذبات سے بھر دینا چاہتے ہیں، وہ اللہ کی محبت و معرفت سے قلوب کو لبریز کرنا چاہتے ہیں، دنیا کی محبت سے دلوں کو خالی کرنا چاہتے ہیں، لہذا حضرات مشائخ کے یہاں جو محنت ہوتی ہے، اس محنت کا خلاصہ اگر آج کی کمپیوٹر کی زبان میں، سائنس کی زبان میں پیش کیا جائے تو وہ یہ ہے کہ مشائخ دو کام کرتے ہیں: ایک یہ کہ آپ کو اچھے سافٹ ویر اپنے جسم میں داخل کرنے کی تلقین اور گندے سافٹ ویر سے دور رہنے کی تعلیم دیا کرتے ہیں، اور دوسرے یہ کہ وہ خود یہ سافٹ ویر فراہم بھی کرتے ہیں، اس کی دکان انہی کے پاس ہے۔

دل کا سافٹ ویر کہاں ملے گا؟

اگر آپ کہیں کہ وہ ایمانی و روحانی سافٹ ویر کہاں ملے گا؟ یہ دنیا کے سافٹ ویر تو ہم کو مل جاتے ہیں، بہت سی کمپنیاں ان کو بناتی ہیں، اور اس کے ایڈورٹائیز آتے

رہتے ہیں ،اخبار میں ایڈورٹائیز، رسائل وجرائد میں ایڈورٹائیز،اسی طرح ٹیلی ویژن میں اس کا ایڈورٹائیز، ہر جگہ پر اس کا ایڈورٹائیز ہوتا ہے، بورڈ بہت بڑے بڑے لگے ہوئے ہیں، اوران کی کمپنیاں بڑی بڑی عمارتوں میں قائم ہیں ،نظر آتی رہتی ہیں۔مگر دل کا سافٹ ویر کہاں ملے گا؟

قرآن کریم نے اس کا جواب دیا ہے:

﴿ یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ﴾ (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور نیک لوگوں کے ساتھ رہو)

اگر جدید انداز میں موجودہ حالات کے پیش نظر یوں ترجمہ کریں تو بھی صحیح ہے کہ ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈر کا سافٹ ویر خرید لو) یہ آج کا جدید ترجمہ ہے،لوگ چاہتے بھی ہیں کہ جدید جدید ترجمے ہوں، لیجئے جدید ترجمہ میں کر رہا ہوں۔

اس پر سوال پیدا ہوا کہ یہ سافٹ ویر کہاں سے خریدیں؟ تو اس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ:﴿وَکُوْنُوْامَعَ الصّٰدِقِیْنَ﴾ (نیک لوگوں کی مجلسوں کو چلے جاؤ، ان کے پاس یہ سافٹ ویر مل جائے گا) نیک لوگوں کی معیت میں،مجلس میں،صحبت میں،نیکوں کے قریب رہنے سے وہ سافٹ ویر تم کو مل سکتا ہے۔

معلوم ہوا کہ اولیاء اللہ کی مجالس میں ، اولیاء اللہ کی صحبتوں میں اللہ نے وہ سافٹ ویر رکھ دیا ہے، جو آدمی ان کی صحبت میں بصدق دل رہتا ہے،اسے خریدنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی، دنیا کے سافٹ ویر تو ہزاروں روپے دے کر خریدنا پڑتا ہے ،لیکن یہاں اولیاء اللہ کے پاس سے تو یہ سافٹ ویر مفت میں کاپی (copy) ہو جاتا اور منتقل ہوتا رہتا ہے۔یہ اللہ والے دل کی ہارڈ ڈسک میں داخل کئے جانے والے سافٹ ویر کے ''سافٹ ویر انجینیر '' بھی ہیں،اوراس کے ڈیلر بھی

مگران کے یہاں کی ڈیلنگ بھی عجیب ہے کہ سب کو مفت میں دیتے ہیں۔لہذا جس کو یہ روحانی وایمانی سافٹ ویر چاہئے اس کو اولیاء اللہ وصالحین کی خدمت میں جانا چاہئے ،اوران سے یہ حاصل کرنا چاہئے۔

دل کا وائرس[virus]

یہاں ایک بات یہ بھی سمجھ لیں کہ کمپیوٹر کی دنیا میں ایک چیز اور بھی ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ کمپیوٹر والے کہتے ہیں کہ کمپیوٹر میں وائرس [virus] آجاتا ہے، جس کی وجہ سے کمپیوٹر کھولتے ہیں تو اسٹارٹ ہی نہیں ہوتا، اور کبھی اسٹک ہوجاتا ہے اور کبھی بہت دیر سے چلتا ہے، اوراس کی وجہ سے اس میں ڈلے ہوئے سافٹ ویر خراب ہوجاتے ہیں۔

اب سافٹ ویر انجینیر دیکھ کر کہتا ہے کہ اس میں وائرس [virus] آ گیا ہے۔ کیا ہے وائرس؟ کیا بلا ہے یہ؟ وائرس کہتے ہیں زہریلے مادہ کو، جب یہ وائرس زہریلا مادہ کمپیوٹر پر حملہ کرتا ہے تو اس کے نظام کو تہس نہس کر کے رکھ دیتا ہے، یہ تو کمپیوٹر کا وائرس ہے، اور ہمارے دل کے لحاظ سے اور آپ کو سمجھانے کے لیے وائرس کا ایک ترجمہ میں یہ کرسکتا ہوں کہ وائرس ہے''شیطان''، وائرس کیا ہے؟ اس ہمارے کمپیوٹر کے شیطان کا نام''وائرس'' ہے۔لہذا یہ بھی جب ہم پر حملہ کرتا ہے تو ہمارے پورے نظام کو تہس نہس کر کے رکھ دیتا ہے ، دل خراب ، دماغ خراب ، آنکھیں خراب ،کان خراب ،زبان خراب، ہاتھ پیر خراب ،سارے اعضاء نکمے ہوجاتے ہیں۔

اس شیطانی وائرس کا ذکر حدیث میں آیا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:''**اِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ**''

(کہ شیطان انسان کے اندر خون کی طرح یا خون کی رگوں میں دوڑتا ہے) (صحیح بخاری:۲۰۳۸،صحیح مسلم:۵۸۰۷،صحیح ابن حبان:۳۷۴۱)

اس حدیث میں ایک لفظ آیا ہے:''مجری الدم''اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ یہ لفظ''مجری''مصدر ہو اور دوڑنے کے معنے میں ہو،اس صورت میں اس حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ شیطان انسان کے اندر اس طرح دوڑتا ہے جس طرح اس کے اندر خون دوڑتا ہے۔اور یہ مجری اس صورت میں''یجری''کا مفعول مطلق ہوگا۔ اور دوسرے یہ کہ یہ''مجری''اسم ظرف ہو،اور دوڑنے کی جگہ کے معنے میں ہو،اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ: شیطان انسان کے اندر خون دوڑنے کی جگہ میں یعنی اس کی رگوں میں دوڑتا ہے۔پہلی صورت میں یہ بتایا ہے کہ شیطان انسان کے اندر دوڑتا ہے،مگر کہاں دوڑتا ہے؟ یہ نہیں بتایا گیا۔اور دوسری صورت میں یہ بتایا گیا ہے کہ شیطان انسان کے اندر کہاں دوڑتا ہے؟ خون دوڑنے کی جگہ میں دوڑتا ہے،یعنی رگوں میں دوڑتا ہے۔الغرض شیطان انسان کے اندر دوڑتا ہے،داخل ہوتا ہے۔اور اس طرح یہ وائرس اس کو بیکار وخراب کرتا ہے۔

دل کا اینٹی وائرس (Anti-Virus)

اس لئے جس طرح کمپیوٹر کو وائرس سے بچایا جاتا ہے اسی طرح ہمیں بھی خود کو شیطان سے بچانا ضروری ہے۔اب سوال یہ ہے کہ اس وائرس سے کیسے بچیں؟ کمپیوٹر والے کہتے ہیں کہ وائرس بڑا خبیث ہوتا ہے،اس کو ختم کرنے کے لیے اینٹی وائرس (Anti - Virus) سافٹ ویر بھی کمپیوٹر میں داخل کیا جاتا ہے۔اینٹی وائرس کا مطلب''زہر مخالف''سافٹ ویر،اور وہاں جس طرح اینٹی وائرس ضروری ہے اسی طرح دل کے لئے ایک اینٹی وائرس یعنی''شیطان کا مخالف''سافٹ ویر

چاہئے۔ اینٹی'' کے معنی ''مخالف''، جیسے اینٹی اسلام کے معنی کیا؟ اسلام مخالف۔ اسی طرح اینٹی وائرس کا مطلب ہوا ''وائرس مخالف'' یہ وائرس اس میں آ گیا، اس کا ایک مخالف ایک سافٹ ویر اس میں داخل کرنا پڑتا ہے، جب آپ اس میں وہ ڈالیں تو جونہی وائرس اس میں داخل ہوگا، فوراً وہ بتائے گا کہ آپ کے کمپیوٹر میں وائرس آ گیا ہے، مجھے کام میں لاؤ، میں اس کو پکڑ کے ختم کردوں گا۔ اگر آپ نے اس پر کلک کر دیا، تو کلک کرتے ہی وہ فوراً اسے پکڑ کر جہاں بھی ہوگا اسے ختم کر دے گا۔ یہ ہے اینٹی وائرس سافٹ ویر۔

اسی طرح بھائیو! ہمارے دل کے لئے بھی ایک اینٹی وائرس سافٹ ویر کی ضرورت ہے، تا کہ ہمارا نظام دل وجسم خراب نہ ہو جائے۔ یہ اینٹی وائرس کیا ہے؟ وہ اللہ کا ڈر وخوف ہے، اور یہ ''خوف الٰہی کا اینٹی وائرس سافٹ ویر'' بھی حضرات اولیاء اللہ ہی ہمارے دل میں داخل کرتے ہیں۔ اور اسی کا نام ''اینٹی شیطان'' ہے۔ تو خوفِ الٰہی کے اینٹی وائرس کو دل میں ڈال کے چھوڑ دو، اب وہ دل میں پڑا رہے گا، جہاں کہیں شیطان آپ کے جسم پر حملہ کرے گا، یا دل میں گھس کر بہکائے گا تو وہ فوراً پکڑ لے گا، اور اس کو باہر نکال دے گا۔

خلاصہ کلام

میرے بھائیو! اس تمام تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے اندر دل اصل ہے، اس کی اچھائی و برائی کا اثر ہمارے ظاہر پر پڑتا ہے، دل اچھا تو سب اچھا، دل برا تو سب برا، لہذا ہمیں ضرورت ہے کہ ہم اپنے دل کی اصلاح وتزکیہ کا کام کریں، اور اس کا طریق یہ سمجھ میں آیا کہ اس میں ایمانی وروحانی سافٹ ویر داخل کریں، یہی کہنا ہے کہ ہمارے دلوں میں بہترین سافٹ ویر داخل کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ

کے عشق کا، اللہ کے خوف کا، اللہ کے تقویٰ کا اور اسی طریقہ پر اخلاص کا، اور تواضع کا، اور نیکیوں کا، نماز سے لگاؤ کا اور دین کے کاموں سے الفت ومحبت کا، یہ سب سافٹ ویر ہیں اور ایک کمپیوٹر میں بہت سارے سافٹ ویر داخل کیے جاسکتے ہیں، اور وہ سب کام کر سکتے ہیں۔ اسی طرح برے وخبیث سافٹ ویر سے اس کو دور رکھیں، نیز شیطانی وائرس سے اس کو بچائیں، مگر یہ ایمانی وروحانی سافٹ ویر کہاں ملے گا؟ یہ اہل اللہ کی خدمت میں جانے سے ملے گا، اسی طرح وائرس سے بچانے کے لئے اس دل کی ہارڈ ڈسک میں اینٹی وائرس داخل کرنے کی ضرورت ہے، اور یہ بھی اہل اللہ کے پاس ملے گا، لہذا ان کی خدمت میں جایا جائے اور ان کو حاصل کیا جائے۔

اسی طرح دل کی اس ہارڈ ڈسک کے اندر آپ ان سافٹ ویروں کو داخل کر دیجئے وہ سب اندر پڑے پڑے آپ کو بہترین انسان بنائیں گے، اور آپ کے مانیٹر سے یعنی جسم کے اعضاء سے بہترین اعمال صادر کر کے لوگوں کو بتائیں گے۔

اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی سمجھ عطا فرمائے اور عمل کی بھی توفیق عطا فرمائے۔

نبی ﷺ کی ذات اسوۂ حسنہ

باسمہ تعالی

نبی ﷺ کی ذات اسوۂ حسنہ

الحمد للّٰہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ . اما بعد فقد قا ل

اللّٰہ تعالیٰ فی القرآن الکریم :

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾(الاحزاب:۲۱)
(تحقیق کہ تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں بہترین نمونہ ہے)

بلا اتباع نبی کوئی اللہ تک نہیں پہنچ سکتا

قرآن اور حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا اور آپ کے اسوۂ حسنہ کو اپنے لئے قابل تقلید بنانے کا مختلف جگہ متعدد عنوانات کے ساتھ ذکر موجود ہے اور اولیاء اللہ کا بلکہ تمام امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے بغیر کوئی بھی شخص اللہ کے دربار میں کوئی مقام حاصل نہیں کرسکتا، حضور کی اتباع کے ذریعہ ہی محبت خداوندی کا دروازہ کھلتا ہے، اگر اتباع محمدی کے بغیر کوئی شخص محبت خداوندی کا دروازہ کھٹکھٹا تا ہے تو قیامت تک نہیں کھل سکتا، یہی ایک راستہ ہے جو اللہ نے خود مقرر کردیا ہے، جب اللہ خود کسی راستے کو متعین کردے، مقرر کردے اور یہ بتادے کہ اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے، تو پھر کسی اور راستے

پر چلنے سے کامیابی کیسے مل سکتی ہے؟

تو معلوم ہوا کہ یہی ایک راستہ ہے اللہ کی محبت کا اور اللہ کے راستے میں چلنے کا کہ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی جائے، اسی لئے قرآن میں اللہ تعالی نے دوسری جگہ فرمایا ہے: ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (اے نبی ﷺ! آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کو چاہتے ہوتو میری اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں گے) (آل عمران:۳۱)

باقی تجارت میں، دنیا میں، دنیا کی چیزوں میں آگے بڑھ جائے تو وہ الگ بات ہے، لیکن اللہ کے دربار میں کوئی مقام، کوئی منزلت آدمی کو اسی وقت ملتی ہے اور مل سکتی ہے جبکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتا ہو، اور آپ کی اتباع تمام معاملات کے اندر ضروری ہے، عقائد میں، عبادات میں، معاملات میں، معاشرت میں، اخلاق میں، سیاست میں، تعلیم میں، تہذیب میں، تمدن میں، تمام چیزوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

اُسوہ کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾

(تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں بہترین نمونہ ہے)

محض اسوہ نہیں کہا، بلکہ اسوۂ حسنہ، یعنی بہترین اسوہ و بہترین نمونہ فرمایا، اسوہ اور نمونہ وہ چیز ہوتی ہے جس کو دیکھ کر دوسری چیز تیار کی جاتی ہے، جیسے کپڑوں کا جوڑا نمونے کے طور پر دیا جاتا ہے؛ تا کہ اسکے مطابق دوسرا کپڑا ڈھالا جائے، سیا جائے، گھر کا ماڈل دیا جاتا ہے؛ تا کہ دوسرا گھر اسی کے مطابق بنایا جائے، جوتے کا ماڈل

دیا جاتا ہے تاکہ اسی کے مطابق دوسرا جوتا تیار کیا جائے۔

اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کی زندگی کا عمل ساری دنیائے انسانیت کیلئے ایک ''ماڈل'' ہے اور ''بہترین نمونہ'' ہے، عقائد ہیں تو اس میں بھی آپ نمونہ ہیں، اعمال وعبادات ہیں تو اس میں بھی آپ نمونہ ہیں، معاشرت وتہذیب ہے تو اس میں بھی نمونہ ہیں، اور اخلاق ہیں تو اس میں بھی آپ ہمارے لئے نمونہ ہیں، اسی طرح تمام معاملات میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نمونہ ہیں، پھر اسی کے ساتھ آپ کی آنکھیں نمونہ ہیں ہماری آنکھوں کے لئے، آپ کے کان نمونہ ہیں ہمارے کانوں کے لئے، آپ کا دل نمونہ ہے ہمارے دل کے لئے، اسی طرح آپ کی زبان نمونہ ہے ہماری زبان کے لئے، آپ کے ہاتھ پیر نمونہ ہیں ہمارے ہاتھ پیر کے لئے۔

انسان اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی مشین ہے

اس کو اس طرح سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک مشین کی طرح بنایا ہے، اس کے اندر بہت سے پرزے لگے ہوئے ہیں اور یہ ایسی مشین ہے جس کے اندر ہر پرزہ اپنا اپنا کام کرتا ہے، جیسے دل ایک پرزہ ہے، زبان ایک پرزہ ہے، آنکھ، ناک، کان ان میں سے ہر ایک ایک ایک پرزہ اور پارٹ ہے، ہاتھ، پیر یہ الگ الگ پرزے ہیں، اس کے علاوہ بہت سے اجزاء، اعضاء، بہت سے پارٹس، بہت سے پرزے، اس مشین میں لگے ہوئے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ مشین ایک ہے، لیکن اس کا ہر پارٹ الگ پارٹ ادا کرتا ہے، یعنی الگ الگ کام کرتا ہے بہت سی مشینیں دنیا میں ایسی ہوتی ہیں کہ بہت سے پارٹ ملنے کے بعد کام ایک ہی کرتے ہیں۔ مثلا: ''فریج'' ہے، فریج میں بہت سے پارٹس ہیں، لیکن پورے پارٹس مل کر کام تو ایک ہی کرتے ہیں، اسی طریقے پر ''بس'' ہے ایک مشین ہے، اس کے اندر بہت سے پارٹس

ہیں وہ پورے پارٹس مل کر جب کام کرتے ہیں تو کام تو ایک ہی ہوتا ہے۔

لیکن ہماری مشین جو اللہ نے بنائی ہے، یہ مشین ایسی ہے کہ اس کا ہر پارٹ کام کرتا ہے اور ہر ایک کا کام الگ الگ ہوتا ہے، یہ نہیں کہ پورے اجزاء اور پارٹس مل کر ایک ہی کام کرتے ہوں، مثلاً ناک کا کام الگ ہے، اس کی مستقل ایک ڈیوٹی ہے، زبان کا جو کام ہے وہ مستقل کام، آنکھ کا جو کام ہے وہ مستقل کام، اسی طرح کان کا کام ہے تو وہ مستقل کام، اس طرح ہر پارٹ الگ الگ کام کرتا ہے۔

کتاب اللہ اور رجال اللہ اس مشین کو چلانا سکھاتے ہیں

اس مشین کو چلانے کے لئے اور صحیح نہج پر اسکو (Active) کرنے کیلئے اور صحیح نہج پر اس کی نگرانی کرنے کے لئے اللہ تعالی نے ایک تو اپنی کتاب نازل کی جس کے اندر اس کے اصول و طریقے بتادیئے کہ یہ مشین تمہیں ان ان اصولوں پر اور اس اس طرح چلانا ہے، لیکن مشین چلانے کیلئے صرف صحیفوں و کتابوں میں لکھے ہوئے حروف اور نقوش کام نہیں آتے، بلکہ اسے عملاً (Practical) بھی بتانا ضروری ہوتا ہے، اس کے لئے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے، جیسے کوئی فیکٹری (Factory) مشین تیار کرتی ہے تو اس کا بروشر (Brochure) بھی تیار کرتی ہے اور ساتھ ساتھ کچھ اس مشین کو چلانے کے لئے اور اس کا مظاہرہ کرنے کے لئے بھی کچھ لوگ تیار کئے جاتے ہیں، وہ آکر آپ کو بتاتے ہیں کہ اس مشین کو چلانے کے لئے پہلے یہ بٹن دبانا ہے، پھر یہ بٹن دبانا ہے، اور اس طرح سے کام لینا ہے، اگر ایسا ہو جائے تو ایسا کرنا ہے، اور ایسا ہو جائے تو یوں کرنا ہے۔ ایک طرف بروشر میں بھی یہ پورا طریقہ لکھا ہوا ہوتا ہے، اور اس کے اندر ہر ہر پارٹ کی تصویر بھی ہوتی ہے اور ان کے نام کی نشاندہی بھی کی جاتی

ہے، پھر ہر پارٹ کا کام بھی بتایا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ اس کا طریقہ بھی بتایا جاتا ہے، کہ اس کو کس طرح (Operate) کرنا چاہئے، الغرض بروشر میں سب کچھ لکھا ہوا موجود ہوتا ہے، لیکن کتنے لوگ ہیں جو صرف اس کو دیکھ کر چلانا سیکھ لیتے ہیں؟ شاید ہزاروں میں ایک ہوگا۔ جب دنیا کی مشین میں صرف لکھا ہوا کام نہیں آتا، بلکہ اس کے لئے کچھ (Practical) بتانے والے ضروری ہوتے ہیں تو پھر آپ سوچیے کہ یہ اللہ کی بنائی ہوئی مشین جو بہت با مقصد طور پر پیدا کی گئی ہے، اس کے ہر ہر جزء میں، ہر ہر پارٹ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے بڑی حکمتیں، بڑی مصلحتیں رکھی ہیں اور انکا الگ الگ کام مقرر کر دیا ہے اور اس کام کو لینے کیلئے اس کا ایک طریقہ بھی مقرر کر دیا ہے کہ اس طریقہ پر اس سے یہ کام لینا ہے، تو پھر اس کو بتانے کیلئے صرف صحیفہء خداوندی کافی نہ تھا، بلکہ رجال خداوندی کی بھی ضرورت تھی، اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ اللہ نے شروع دور سے ایک طرف کتاب اللہ کا سلسلہ جاری کیا ہے تو دوسری طرف رجال اللہ کا بھی سلسلہ جاری کیا ہے، اللہ کی کتاب بھی آتی ہے اور اللہ کی طرف سے کچھ رجال کار بھی آتے ہیں، وہ آکر بتاتے ہیں کہ یہ طریقہ زندگی کرنے کا ہے، اس مشین کے چلانے کا، اس کے استعمال کرنے کا، اگر اس مشین کو اس کے برخلاف استعمال کرو گے تو یہ خراب ہو جائیگی، اور اگر صحیح طریقہ پر استعمال کرو تو ٹھیک وصحیح سالم رہے گی۔

بہت سے انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام آئے اور آخر میں ہمارے اور آپ کے آقا حضرت سیدنا ومولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اور آپ نے اپنی زندگی کے اندر ایک ایک چیز کے بارے میں تفصیلی معلومات اور عملی طور پر اس کا ایک نمونہ ہمارے سامنے رکھ دیا، آنکھ کے بارے میں بھی رکھا، کان کے بارے میں بھی رکھا، دل کے بارے میں بھی رکھا، زبان کے بارے میں بھی رکھا،

ہاتھ پیر کے بارے میں بھی رکھا کہ یہ سب کے سب اجزاء اور پارٹ کس طرح استعمال میں لانا ہے اور ان کو اگر غلط استعمال کریں گے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا ؟ یہی بات ہمیں اور آپ کو سیکھنا ہے، حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے ذریعے سے کہ ہماری اس مشین کو جو اللہ کی بنائی ہوئی ہے، دنیا میں ٹھیک ٹھیک چلا کر اس کو استعمال کر کے کیسے اس سے کام لیں۔

یہ مشین بطور امانت دی گئی ہے

یاد رکھیں کہ یہ اللہ کی عطا کردہ مشین ہے اور ہم کو بطور امانت دی گئی ہے، بطور ملکیت نہیں دی گئی ہے، ایک ہوتا ہے بطور ملکیت دیدینا اور ایک ہوتا ہے بطور امانت اور ودیعت دینا، بطور ملکیت دیدینے پر ہم مختار کل ہوتے ہیں جو چاہیں کریں، لیکن اللہ نے ہم کو بطور ملکیت نہیں دیا، ہم کو اس کی (Ownership) نہیں دی بلکہ ہمارے پاس محض بطور امانت کے رکھی ہوئی ہے۔ اسی لئے ایک حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ نے اللہ کو مخاطب بنا کر عرض کیا ہے کہ: ألّٰلهم ان قلوبنا و جوارحنا بيدك ، لم تملكنا منها شيئا ، فاذا فعلت ذلك بهما فكن أنت ولينا ''(اے اللہ! بلا شبہ ہمارے قلوب اور اعضاء آپ کے قبضہ میں ہیں، ان میں سے کسی چیز کا آپ نے ہمیں مالک نہیں بنایا، پس جب آپ ان کو ایسا کریں تو آپ ہی ہمارے محافظ بن جائیں) (الجامع الصغیر: ۱۵۱۲، کنز العمال: ۳۶۴۴)

معلوم ہوا کہ ہم ہمارے اعضاء کے مالک نہیں ہے کہ جو چاہیں کریں، بلکہ صرف امین ہیں۔ اسی لیے علماء نے مسئلہ لکھا ہے کہ ہمارے اس جسم کا کوئی عضو اور پارٹ اٹھا کر ہم اپنی مرضی سے کسی کو نہیں دے سکتے، مثلاً آپ کے جی میں آیا کہ اپنے بھائی کو میں اپنا گردہ دیدوں، اپنی آنکھ کسی کو دیدوں تو یہ جائز نہیں ہے۔

آپ کو کیا اختیار ہے؟ کیا یہ آپ کی اپنی Body ہے؟ آپ کا جسم ہے؟ آپ کی آنکھیں ہیں؟ آپ کے گردے ہیں؟ آپ کا دل ہے؟ نہیں، بلکہ یہ تو سب اللہ کا ہے اور اللہ کی اجازت کے بغیر اس میں کسی کو تصرف کا حق نہیں ہے، اس لیے مسئلہ یہ ہے کہ ان اجزاء واعضاء میں سے کسی عضو کو بغیر اللہ کی مرضی کے نہیں دے سکتے۔

اب رہا یہ کہ اللہ کی مرضی کب ہے، کب نہیں، کیسے معلوم ہوگا؟ آپ مفتی سے پوچھیں، مفتی بتائے گا کہ اللہ کی مرضی ہے کہ نہیں، اس لیے کہ وہ قرآن میں غور کریگا، احادیث میں غور کریگا، دلائل میں غور کریگا، اور فتوی دیگا۔

اگر مشین کا غلط استعمال ہو تو خراب ہوجائیگی

ایک اور بات بھی یہاں سمجھ لیں کہ مشین کا استعمال اگر غلط ہوا اور آپ اس سے وہ کام کرنا چاہیں جو اس کے فساد وخرابی کا سبب بنے تو وہ مشین خراب ہوجائیگی اور اس کے اوپر کچھ دوسرے اثرات مرتب ہوجائیں گے۔ یہاں یہ سمجھ لیں کہ کسی بھی چیز کا استعمال صحیح اسی وقت ہوگا جب اس میں دو باتوں کا دھیان دیں گے: ایک تو یہ کہ اس چیز کو اسی کے مقصد میں استعمال کیا جائے اور دوسرے یہ کہ اس کو اسی طریقہ کے مطابق استعمال کریں جو اس کے لئے مقرر ہے۔

مثال کے طور پر ہمارے سامنے یہ ٹیوب لائٹ جل رہا ہے، اس کو ایک تو اسی مقصد میں استعمال کرنا چاہیئے جس کے لئے یہ بنایا گیا ہے، یہ بنایا گیا ہے ہمیں روشنی دینے کے لئے، اگر کوئی بے وقوف اس کام کے بجائے اس کو کسی اور کام مثلاً کسی کو مارنے میں استعمال کرے یا عصا بنالے تو ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اسی طرح کتاب پڑھنے، مطالعہ کرنے کے لئے ہے، اگر کوئی اس سے پنکھے کا کام لینے لگے تو یہ بات غلط ہوگی، کیونکہ اس کے مقصد کے خلاف استعمال کیا گیا۔

دوسرے یہ بھی ضروری ہے کہ چیز کے استعمال کرنے کا طریقہ بھی سیکھا جائے، ٹیوب لائٹ جلانے یا پنکھا چلانے کا ایک طریقہ ہے، استعمال کرنے کا ایک انداز ہے کہ کس طرح اس کو استعمال کریں، اگر خدانخواستہ اس طریقہ کے مطابق استعمال نہ کریں، تو ہوسکتا ہے کہ اس کا فائدہ نہ ہو اور خراب ہو جائے، مثلاً ایک آدمی نے دیکھا کہ ٹیوب لائٹ جل نہیں رہا ہے، اس کے جی میں آیا کہ یہ تو جلتا نہیں ہے، اس کو جلانا ہے، اس بیوقوف نے سوچا کہ یہ کیوں نہیں جلتا؟ اسکو میں جلاتا ہوں، میں روزانہ اپنے گھر کا ''اسٹو'' ماچس کی تیلی جلا کر جلا لیتا ہوں اور وہ جل جاتا ہے۔ لہٰذا یہاں بھی میں اس کو جلاؤنگا، اس نے ایک ماچس لا کر اس سے ایک تیلی نکالی اور اس کو جلایا اور اس سے ٹیوب لائٹ جلانے لگا۔

اب بتایئے کہ اس کا حشر کیا ہوگا؟ اس کو ساری دنیا کہے گی کہ یہ طریقہ نہیں ہے اس کو جلانے کا، یہ طریقہ دوسری چیزوں کے لئے استعمال ہوسکتا ہے، لیکن یہ طریقہ اس کے لئے استعمال کریں گے تو اس کے لئے خطرہ ہی خطرہ ہے۔

اولاً تو وہ کالا ہو جائیگا اور پھر ہوسکتا ہے کہ اگر تیز بھاپ اس کو لگ جائے تو پھٹ بھی جائے، اس لئے کہ یہ طریقہ اس کے استعمال کا ہرگز نہیں ہے۔

اب یہاں ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک چیز کو جلانے کا جو طریقہ مقرر ہے، اس طریقہ کے خلاف اگر اس کو استعمال کیا جاتا ہے تو اس کو خطرہ ہے کہ نہیں ہے؟

اسی طرح بھائیو! اگر ہمارے دل کو روشن کرنے کے لئے، دل کے اندر نور اور اجالا پیدا کرنے کے لئے کوئی آدمی وہ چیز استعمال نہ کرے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے اور وہ چیز استعمال کرے جسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے خطرہ بتایا ہے، تو پھر اس کا دل روشن نہیں ہو سکے گا، دیکھئے ماچس سے

آپ سگریٹ جلا سکتے ہیں، موم بتی جلا سکتے ہیں، اپنی گیس لائٹ جلا سکتے ہیں، لیکن ٹیوب لائٹ ہرگز نہیں جلا سکتے، بلکہ جلائینگے تو کالا ہو جائیگا۔

اسی طرح سمجھئے دل بھی ایک روشن چیز کی طرح ہے، اس میں ایک آگ جلانے اور دھکانے کی ضرورت ہے، وہ آگ جو اس میں لگے گی وہ عشق الٰہی کی آگ ہے، اگر دل میں عشق الٰہی کی آگ جلا کر آپ اس کو روشن کریں گے تو انشاء اللہ اس کی روشنی بڑی خوبصورت ہوگی، اور بہت دور دور تک پہونچے گی، آپ کو بھی روشن کرے گی اور آپ کے پاس بیٹھنے والوں کو بھی روشن کرے گی، لیکن اگر کوئی بیوقوف صاحب اللہ کی محبت سے دل کو جلانے کے بجائے، دنیا کی محبت سے جلانا چاہیں تو دل کالا ہو جائیگا، روشن کبھی نہیں ہوگا۔

معلوم ہوا کہ دل کو روشن کرنا ہو تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنا پڑیگا کہ آپ کا اسوہ کیا ہے؟ آپ کو اللہ نے کیا طریقہ دے کر بھیجا ہے وہ طریقہ آپ ہم کو بتائیں، تا کہ ہم اس طریقہ سے اپنے دل کو روشن کریں۔ اسی طرح آنکھیں ہیں، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آنکھوں سے جو کام لیا اور جس انداز سے کام لیا، آنکھوں کو اسی طرح استعمال کرنا چاہئے اور اسی مقصد میں استعمال کرنا چاہئے اور اگر اس کو مقصد سے ہٹا کر استعمال کریں گے اور غلط طریقہ پر اس کو استعمال کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آنکھوں کو اجاڑنے کا ہم کام کر رہے ہیں، آنکھوں کو بسانے کا کام ہم نہیں کر رہے ہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آنکھوں سے کیا کام لیا؟ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دل سے کیا کام لیا؟ وہی کام ان سے ہمیں بھی لینا ہے۔

دل اللہ کی معرفت کی تجلی گاہ ہے

اسلئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث کے ذریعے بھی اور اپنے

عمل کے ذریعہ بھی بتایا ہے کہ دل کو اللہ کی محبت اور معرفت کا مسکن اور ٹھکانہ بناؤ، یہ ہے دل کا کام، اگر کوئی اس کے بجائے دل کے اندر دنیا بھر کی غلاظتیں لے جا کر بھر ڈالے، عورت کی محبت دل میں ہے، اور انسانوں کی محبت دل میں ہے، چیزوں کی محبت دل میں ہے اور مکانوں کی محبت دل میں ہے، پکوان کی محبت دل میں ہے، کھانوں کی محبت دل میں ہے، تو اس کی مثال ایسی ہے، جیسے کوئی آدمی بہترین قسم کا محل بنانے کے بعد اس کے اندر تمام قسم کی غلاظتیں اور مختلف قسم کی گندگیاں لا کر ڈال دے۔ دل اللہ کی معرفت کا تجلی گاہ ہے، اللہ تعالی کی محبت کا مسکن ہے، اس کے اندر دنیا کی اور مختلف قسم کی محبتیں لا کر ڈال رہا ہے، تو یہ گندگیاں ہیں، غلاظتیں ہیں، یہ غلاظتیں دل کے اندر آجائیں گی تو بھائی ذرا اندازہ کیجئے، آپ اس آدمی کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ جس نے محل بنایا اور پھر محل کے اندر غلاظتیں لا کر جمانا شروع کر دیا۔

آنحضرت ﷺ کا دل کیسا تھا؟

الغرض آپ ﷺ کا دل ہمارے لئے اسوہ حسنہ ہے، اللہ کے نبی ﷺ کا دل کیا کیا کام کرتا تھا؟ کن کن خوبیوں کا وہ دل مالک تھا؟ کن چیزوں کو اس میں جگہ نہیں دی تھی؟ اس کے مطابق ہم کو اپنا دل بنانا ہے۔ آج ہمارے دلوں کو ہم دیکھ لیں کہ اس دل کے اندر وہ چیزیں جمع ہیں جو محمد ﷺ کے دل میں نہیں تھیں، اور وہ چیزیں ہمارے دل میں موجود نہیں ہیں، جو نبی ﷺ کے دل میں موجود تھیں، نبی ﷺ کا دل وہ دل تھا کہ اس میں دنیا کی محبت ایک رائی کے برابر نہیں تھی اور خدا کی محبت سو فیصد بسی ہوئی تھی۔

حدیث میں آتا ہے کہ نبی ﷺ کی خدمت میں کافروں کے بہت سارے گرو گھنٹالوں نے ایک آدمی کو بھیجا، وہ آپ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ: اے محمد ﷺ! مجھے فلاں اور فلاں نے آپ کے پاس بھیجا ہے، میں مکہ کے سرداروں کی طرف سے

آیا ہوں اور مجھے ایک بات آپ کے سامنے رکھنی ہے، اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ میں یہ پیغام لیکر آیا ہوں کہ اگر آپ دین اسلام چھوڑ دیں تو ہم آپ کو حکومت وسرداری دینے تیار ہیں، ہم آپ کو اپنا سردار بنالیں گے، اور آپ چاہیں تو ساری دولتیں آپ کے قدموں میں لاکر ڈالدیں گے، اور اگر آپکا مقصد عیش وراحت ہے تو ہم عرب کی خوبصورت لڑکیاں آپ پر نچھاور کردیں گے ۔بس یہ شرط ہے کہ آپ یہ دین کا کام کرنا چھوڑ دیں، توحید وسنت کا کام بند کردیں۔

اللہ کے نبی ﷺ اس کی بات سننے کے بعد پوچھتے ہیں، آپ کی بات ختم ہوگئی ؟ وہ کہتا ہے ، ہاں! میں نے اپنی بات پوری کرلی۔اللہ کے نبی ﷺ فرماتے ہیں کہ :''اب میری بات سنو''، اس کے بعد آپ قرآن مجید کی تلاوت شروع کردیتے ہیں، سورہ حم سجدہ کی آیتیں پڑھنی شروع کردیتے ہیں، آپ پڑھتے رہے، یہاں تک کہ وہ آیتیں آگئیں جس میں قوم عاد کا اور مختلف قوموں اور لوگوں کا ذکر ہے، ان کی ہلاکت وتباہی کا ذکر ہے تو اس آدمی سے برداشت نہ ہوا اور وہ اللہ کے نبی ﷺ کے قریب پہونچ کر آپ کے منھ پر ہاتھ رکھکر کہتا ہے :''اللہ کے لئے اس کو بند کرو میرے سینے میں اس کو سننے کی طاقت موجود نہیں ہے، اللہ کے نبی ﷺ بند کردیتے ہیں تو وہ اٹھ کر چلا جاتا ہے۔

کافر لوگ مکہ کے سردار وہاں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتے ہیں کہ آپ کے پاس سے کیا جواب لاتا ہے؟ لیکن اس آدمی میں ان سے بات کرنے کی طاقت نہیں تھی، تو اپنے گھر چلا گیا اور تین دن تک لوگوں کو نظر بھی نہیں آیا، تین دن کے بعد وہ لوگوں کے سامنے آتا ہے اور کہتا ہے کہ محمد ﷺ ایک ایسا کلام پیش کرتے ہیں کہ میں نے کبھی ایسا کلام نہیں سنا ہے۔(تفسیر قرطبی: ۳۳۸/۱۵، حیاۃ الصحابہ: ۳۷/۱)

تو بھائیو! ہمارے نبی ﷺ کو دنیا دی جارہی تھی، دولت و مال آپ کے قدموں میں ڈالنے کے وعدے کئے جارہے تھے، لیکن آپ نے یہ فرمایا کہ امارت، عیش و عشرت اور مال و دولت تو میرے پیروں میں ہے، اس میں سے کسی کو بھی لینا نہیں چاہتا، دنیا کی دولت اور دنیا کی چیزوں کی محبت محمد ﷺ کے دل کے اندر ایک پائی کے برابر بھی نہیں تھی۔

مال و دولت سے نبی ﷺ کا استغناء

حدیث میں آتا ہے کہ مدینہ ہجرت کے بعد بہت سارے ممالک فتح ہوتے چلے گئے، بحرین کا ملک بھی فتح ہوگیا، اس وقت اللہ کے نبی ﷺ نے لوگوں کو بحرین بھیجا کہ جاؤ (tax) ٹیکس وصول کر کے لاؤ۔ چنانچہ حضرات صحابہ گئے، اور بحرین سے دولت کا انبار لے کر آئے، اس میں سونا، چاندی، اناج و غلہ اور کپڑا اور دیگر مختلف قیمتی چیزیں تھیں۔

یہ سب چیزیں مسجد نبوی کے صحن میں جمع کر دی گئیں، اور اللہ کے نبی ﷺ کو خبر کر دی گئی۔ ذرا سوچئے کہ اگر میں یا آپ اس جگہ ہوتے تو جا کر کم از کم دیکھتے کہ کتنی دولت آئی ہے؟ اور کیا کیا مال آیا ہے؟ لیکن اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، مسجد میں ڈالدو اور آرام کرو، صحابہؓ اپنی اپنی جگہ چلے گئے، لوگوں میں شہرت ہوگئی کہ بحرین سے بہت کچھ مال آگیا ہے، یہ دور فقر و فاقہ کا دور تھا، ایسے دور میں بحرین سے اس قدر مال جمع ہوگیا تھا، فجر کی نماز کا وقت ہوگیا تو مدینہ کی مختلف مساجد کے نمازی بھی مسجد نبوی کے اندر آکر جمع ہوگئے، ایک جم غفیر دوسرے دنوں کے لحاظ سے کچھ زیادہ ہی تھا، اب لوگ انتظار میں ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ نماز فجر پڑھانے کے لئے آئیں گے۔

چنانچہ وقت ہوا تو آپ ﷺ تشریف لائے، حضرت بلالؓ ساتھ میں موجود تھے لوگوں کا خیال تھا کہ آپ ﷺ آ کر مال کا جائزہ لیں گے اور ایک ایک چیز کو اچھی طرح غور وفکر سے دیکھیں گے، لیکن دیکھتے ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ تشریف لائے اور ایک نگاہ بھی اٹھا کر مال کی طرف نہیں دیکھا، بلکہ سیدھا محراب کے اندر تشریف لے گئے اور نماز پڑھائی، اس کے بعد مصلیوں کی طرف چہرہ کر کے بیٹھ گئے اور پوچھا کہ تم لوگ مختلف محلوں کے یہاں جمع ہو گئے، شاید تم لوگوں کو یہ خبر ملی ہوگی کہ بحرین سے مال آیا ہے، اس لئے تم لوگ یہاں جمع ہو گئے ہو، صحابہؓ نے عرض کیا، ہاں! یارسول اللہ! ہم اسی لئے جمع ہوئے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا:

پچھلی امتیں جو تباہ وہلاک ہوئیں، وہ مال ودولت میں غرق ہونے کی وجہ سے ہلاک ہوئیں، مجھے کوئی خوف تمہارے فقر وفاقہ کا نہیں ہے، اگر مجھے کسی بات کا خوف تمہارے بارے میں ہے تو یہی کہ دنیا تمہارے اوپر وسیع کردی جائے اور تم ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں مسابقت (race) کروگے اور ہلاک کردیئے جاؤگے، پھر اس کے بعد مال کے پاس تشریف لائے اور حضرت بلالؓ سے فرمایا کہ تقسیم کرنا شروع کرو، جس کو جس چیز کی ضرورت ہو دیتے چلے جاؤ، حضرت بلال حبشی تقسیم کرتے رہے یہاں تک کہ جو کچھ آیا تھا سب تقسیم ہو گیا، جب اللہ کے نبی ﷺ وہاں سے اٹھے ہیں تو یوں اپنا دامن جھاڑ کر اٹھ گئے کہ ایک پائی بھی اپنے لئے نہیں رکھی۔ (بخاری: ۱/۴۴۷، مسلم: ۲/۴۰۷)

یہ اللہ کے نبی ﷺ کا اسوہ ہے کہ اتنے مال کی فراوانی کے باوجود ایک نگاہ بھی اٹھا کر آپ نے نہیں دیکھی اور حضرات صحابہؓ کے دلوں میں جو تھوڑی سی محبت جمع ہوگئی تھی، اس کو بھی کھینچ کر نکال دیا۔

اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک موقعہ پرآپ ﷺ نے نمازعصر پڑھائی، نماز کے بعدآپ ﷺ لوگوں کو پھلانگتے ہوئے بڑی تیزی کے ساتھ گھر گئے، حضرات صحابہؓ پریشان ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ کوکیا ضرورت پیش آ گئی کہ آپ دوڑتے ہوئے اور لوگوں کو پھلانگتے ہوئے گھر تشریف لے گئے؟.......کچھ دیر بعد واپس آئے، اور دیکھا کہ ان حضرات کو تعجب ہورہا ہے تو صحابہؓ کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا کہ نماز میں مجھے یاد آیا کہ میرے گھر میں ایک سونے کا ٹکڑا رہ گیا ہے، میں نے یہ مکروہ سمجھا کہ وہ مجھے مشغول کر لے، ایک روایت میں یوں فرمایا کہ کہیں وہ میرے پاس رات میں رہ نہ جائے، لہذا میں نے اس کو تقسیم کرنے کا حکم دیدیا ہے۔
(بخاری:۸۵۱،نسائی:۱۳۶۴)

یہ تھے اللہ کے نبی ﷺ، کہ آپ کے دل میں دنیا کی کوئی محبت نہیں تھی، اب اللہ کے نبی کا دل دیکھو کہ کیسا تھا، میں یہ سمجھانا چاہ رہا ہوں کہ نبی ﷺ کی ذات میں تمہارے لئے نمونہ موجود ہے، آپ کے دل کو دیکھ کر اپنا دل بھی ویسا ہی بنالو۔

اللہ کے نبی کے دل میں خوف الٰہی

ایک صفت ہمارے نبی ﷺ کے دل کی یہ تھی کہ آپ کے دل میں خدا کا خوف بے پناہ موجود تھا؟ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے، آپ ﷺ کو شدید بھوک لگی، اور کھانے کے لئے کچھ بھی موجود نہیں تھا، آپ گھر کے باہر تشریف لائے، دیکھا تو ایک طرف صدیق اکبر نظر آئے، دوپہر کی شدید گرمی کا وقت تھا، آپ نے ان سے پوچھا: ''اے ابوبکر! ایسے وقت کیوں باہر آ گئے؟'' توانہوں نے کہا کہ یارسول اللہ! بھوک کی شدت نے باہر نکلنے پر مجبور کیا، اس لئے باہر نکل آیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے بھی بھوک نے ہی مجبور کیا؛ اس لئے میں بھی باہر نکل آیا

ہوں، دونوں حضرات کچھ آگے بڑھے تو حضرت عمر بن خطابؓ نظر آئے، ان سے پوچھا کہ اس وقت باہر کیوں؟ تو انکا بھی وہی عذر کہ بھوک کی شدت نے مجبور کیا۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ چلو ابوالہیثم کے باغ میں چلیں گے، یہ ایک صحابی تھے، ان کا مدینہ کے اندر بڑا باغ تھا، حضور ﷺ وہاں تشریف لے گئے، اس وقت ابوالہیثم وہاں موجود نہیں تھے، ان کی بیوی موجود تھیں، انھوں نے حضور ﷺ کو دیکھا تو وہ خوش ہوگئیں، چادر بچھائیں، اس کے بعد کھانے کے لئے انگور وغیرہ لاکر رکھدیا، حضور اور صحابہ نوش فرمارہے تھے، اتنے میں حضرت ابوالہیثم بھی آگئے، آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے، ان کی تو عید ہوگئی، ان کے پاس ایک بکری موجود تھی، اس کو جلدی سے ذبح کیا، اور اس کو بھونا، بیوی کو حکم دیا کہ روٹی پکاؤ، گرم گرم روٹیاں پکادی گئیں، سالن بھی تیار ہوگیا، لاکر حضور کے سامنے رکھ دیا، حضور نے بھی کھایا اور دیگر اصحاب نے بھی کھایا، فراغت کے بعد حضور نے رونا شروع کر دیا، حضور ﷺ کو دیکھ کر سب کو رونا آگیا اور ایک کہرام سا مچ گیا، لیکن کسی کو کچھ نہیں پتہ کہ کیوں رویا جارہا ہے؟ اللہ کے نبی کے رونے کو دیکھ کر سب کو رونا آگیا، ابوبکرؓ نے آپ سے پوچھا کہ: یا نبی اللہ! آپ کیوں رو رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ: ابوبکر! جو بھی ہم نے کھانا کھایا ہے، قیامت کے میدان میں ان میں سے ایک ایک چیز کا ہمیں جواب دینا ہے؛ اس لئے رو رہا ہوں۔ (ترمذی:۶۲/۲)

ہمارا حال تو یہ ہے کہ صبح کھارہے ہیں، شام کھارہے ہیں، تین تین وقت کھارہے ہیں، اس کے علاوہ بھی کبھی لسی، کبھی چائے، اس کے باوجود ہمارے دلوں میں اللہ کا کوئی خوف نہیں ہے، جب اللہ کے نبی رو رو کر یہ آخری جملہ ادا کر رہے تھے تو سب کے دل میں عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔

اس لئے بھائیو! نبی کے جیسا دل بناؤ، اللہ کا خوف دل میں پیدا کرو اور اللہ کی محبت دل میں پیدا کرو، واقعات تو بہت ہیں، لیکن ایک (point) جو اس وقت میں نے اٹھایا ہے، میں ضروری سمجھتا ہوں کہ کم از کم اس نکتہ پر مجھے اور آپ کو اچھی طرح غور وخوض کر کے اس کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لینا چاہئے کہ ہمارا دل تو محمد ﷺ جیسا بن جائے، آج وہی فکر وہی خوف ہمارے اندر پیدا ہو تو انشاء اللہ ہماری پوری زندگی میں تبدیلی پیدا ہو جائیگی، اس لئے کہ اصل تو دل ہی ہے، تمام اعضاء جو بنتے ہیں وہ دل ہی سے بنتے ہیں۔

آپ کے دل میں تعلق مع اللہ کی کیفیت

اسی طرح ایک اور بات سن لیجئے، جو بہت اہم ہے کہ آپ ﷺ کے دل میں اللہ سے تعلق کی جو کیفیت تھی، وہ بے مثال و بے نظیر تھی۔ یہ بھی ایک چیز ہے جس کو ہمیں اپنے نبی کے اسوہ سے لینا اور سیکھنا ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اللہ کے نبی گھر میں آتے تھے تو گھر کے کام کاج کرتے تھے اور جیسے ہی اذان ہوتی یا نماز کا وقت ہوتا تو نماز کے لئے نکل جاتے۔ (بخاری:٦٧٦، ترمذی:۲۴۸۹، الادب المفرد:۲۱۵/۱)

مطلب یہ ہوا کہ آپ علیہ السلام کا معمول تھا کہ گھر میں کام کاج میں شریک ہوتے، اور ازواج مطہرات کے ساتھ ہنسی مذاق بھی فرماتے تھے، اور جیسے ہی اذان کی آواز آتی تھی تو پھر آپ سب کام چھوڑ کر نماز کی طرف اور اللہ کی جانب متوجہ ہو جاتے تھے۔ ملا علی قاری نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ:" ترك جميع عمله ، و كأنه لم يعرف أحدا من أهله " کہ آپ سب کاموں کو چھوڑ دیتے گویا کہ آپ اپنے اہل میں سے کسی کو جانتے پہچانتے ہی نہیں۔ (مرقاۃ:۴۸۷/۱۰)

حالانکہ آپ کا گھر میں ایک معمول یہ بھی تھا کہ آپ اپنی ازواج کے ساتھ ہنسی مزاح بھی کیا کرتے تھے۔

جیسے حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ حضرت عائشہؓ کے مکان میں تھے، انھوں نے حضور ﷺ کے لئے حریرہ گھر میں تیار کیا، اور لے آئیں، کہنے لگیں: اے اللہ کے نبی! میں نے یہ آپ کے لئے تیار کیا ہے، اس کو کھایئے، یہاں حضرت سودہ بھی حاضر تھیں، حضرت عائشہؓ نے ان سے کہا: تم بھی کھاؤ، لیکن حضرت سودہ نے فرمایا کہ میں تو نہیں کھاؤنگی، وہ روٹھ گئیں، لیکن حضرت عائشہ نے اصرار کیا کہ تمہیں کھانا پڑیگا، یہ اصرار وانکار اتنا بڑھتا گیا کہ دونوں کے درمیان میں بات ذرا آگے بڑھ گئی، حضرت عائشہ نے کہا کہ: اگر تم اسے نہیں کھاؤ گی تو میں یہ کھانا تمہارے منہ پر مل دونگی، یعنی ایک مذاق اور تفریح کا موقعہ تھا۔

چنانچہ انہوں نے حریرہ میں ہاتھ ڈالکر ان کے منہ پر مل دیا، حضور ﷺ بازو بیٹھے ہوئے ہنس رہے تھے، مسکراہٹ آپ کے چہرے پر کھیل رہی تھی، جب حضرت سودہؓ کو دیکھا کہ ان کا پورا چہرہ کھانے سے ملوث ہوگیا ہے تو حضور ﷺ نے ان سے فرمایا کہ عائشہ نے تمہارے منہ پر یہ لگایا ہے، اب میں ان کے ہاتھ پکڑ لیتا ہوں تم ان کے منہ پر یہ مل دو۔ چنانچہ حضرت عائشہ کے ہاتھوں کو حضور ﷺ نے پکڑ لیا تو حضرت سودہ نے حریرہ اٹھا کر ان کے منہ پر مل دیا اور پھر ایک ہنسی کا موقعہ فراہم ہوگیا۔ (حیاۃ الصحابہ: ۷۹۹/۲)

یہ تھا حضور ﷺ کے گھر کا ماحول بیویوں کے ساتھ، اور اسی کے ساتھ جب اللہ کی طرف سے بلاوا آجاتا تو نماز وذکر کی جانب توجہ کا یہ عالم جو آپ نے سنا، یہ ہے خدا کی محبت، ایک طرف بیویوں کا حق بھی ادا کر رہے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ جب اللہ کا پیغام آتا تھا تو حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اب ہمارے سے حضور ﷺ کو کوئی تعلق

نہیں، یہ اللہ کی محبت ہے جو نبی ﷺ کے سینے میں موجود تھی۔

دل کو گندگیوں سے پاک کرو، ایک واقعہ

الغرض دل تو اللہ نے اسی لئے بنایا ہے کہ اس میں اللہ کی محبت پیدا کی جائے اور ہمارے دلوں کو آپ ﷺ کے دل جیسا بنایا جائے، دل میں محبت الٰہی کی جگہ کوئی اور چیز آجائے تو اللہ کبھی اسے برداشت نہیں کریں گے، مجھے ایک بات یاد آگئی، میں نے چند دن پہلے اپنے دوستوں کو سنایا تھا، غالباً دو یا تین ہفتے پہلے مجھ سے فون پر کچھ لوگوں نے رابطہ کیا اور کہا کہ یہاں ایک مکان ہے اور ایک بھائی بہن اس مکان میں رہتے ہیں، اس کے اندر غلاظتیں ہی غلاظتیں جمع ہیں، ہم محلے کے کچھ لوگ مل کر اس مکان کے اندر سے وہ گندگیاں اور غلاظتیں باہر نکال کر پھینک دینا چاہتے ہیں، تو کیا شرعاً ہم کو اس کی اجازت ہے؟ مسئلہ پوچھ رہے تھے۔

میں نے جواب دینے سے پہلے ان سے تفصیل پوچھی، کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟ تاکہ تفصیل مجھے معلوم ہوجائے، تو انہوں نے جو تفصیل بتائی تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے، انہوں نے کہا کہ ایک صاحب ہیں جو پہلے Education Department میں بڑے آفیسر تھے، بعد میں ان کا دماغ خراب ہوگیا، بچے اور بیوی سب ان کو چھوڑ کر چلے گئے، ان کی ایک بہن ہے، اس کا بیماریوں میں عجیب وغریب برا حال ہے، نہ اٹھ سکتی ہے، نہ کچھ کام کرسکتی ہے، نہ کچھ بول سکتی ہے، اپنے بیڈ پر پڑی ہوئی ہے، پیشاب وہیں، پاخانہ وہیں، کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں، بھائی کا حال یہ ہے کہ دماغ خراب ہونے کی وجہ سے راستہ چلتے ہوئے راستے میں جتنی گندگیاں اور غلاظتیں ہوتی ہیں وہ چن چن کر لاتا اور اپنے گھر میں جماتا ہے،

کاغذ پڑا ہے، وہ لاکر گھر میں ڈال رہا ہے، کوئی اخبار پڑا ہوا ہے، اسے اٹھا کر لا رہا ہے، کوئی لوہے کی چیز ملی اسے اٹھا کر گھر میں ڈال رہا ہے، کوئی پتھر ملا اسے اٹھا کر گھر میں ڈال رہا ہے، غرض یہ کہ چلتے پھرتے ہزاروں قسم کی اچھی بری چیزیں ملتی ہیں، دماغ خراب ہونے کی وجہ سے گھر میں لا لا کر ڈالتا چلا جا رہا ہے، یہاں تک کہ جو اس کا پلنگ ہے، پلنگ پر بھی یہی سب کچھ رکھا ہوا ہے، وہ خود تو نیچے سوتا ہے، اور پلنگ کے اوپر یہ سب جمع کرتا ہے، اور پھر یہ چیزیں رکھے رکھے کبھی پانی پڑ گیا یا کچھ اور ہو گیا، اور وہ چیزیں خراب ہونے لگیں، سڑنے لگیں، اس طرح پورے گھر میں سوائے غلاظت، گندگی اور بدبو کے اور کچھ نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم اس گھر کو خالی کرنا چاہتے ہیں، مگر ان صاحب کی اجازت نہیں ہے۔ اور وہ صاحب اسے خالی کرنے کیلئے تیار نہیں، اور وہ بہت مزاحمت کر رہے ہیں کہ تم لوگ ہمارے گھر میں کیوں آئے ہو؟ اور کیوں ان چیزوں کو نکال رہے ہو، یہ میری چیزیں ہیں، یہ اخبار مجھے کام آئیگا، پچیس سال پہلے کا اخبار بھی پڑا ہے، بیس سال پہلے کا بھی اخبار پڑا ہے، اور وہ اسے پھینکنے کے لئے تیار نہیں۔

میں نے کہا کہ جب یہ صورت حال ہے اور آپ لوگ ان کے گھر کو خالی کرنا چاہتے ہیں، اور اس کا مقصد در اصل ان کے گھر کو پاک کرنا ہے اور بیکار و بے ہودہ چیزوں سے خالی کرنا ہے تو یہ شرعاً جائز ہے، اس لئے کہ نکالنے کی چیز کو نکالنا تو گناہ نہیں ہے، کسی کے گھر کو صاف کرنا کوئی جرم نہیں، یہ الگ بات ہے کہ وہ صاحب اپنی بے وقوفی کی وجہ سے اس کو سمجھیں کہ یہ غلط کام ہے۔

بھائیو! بزرگو! مجھے اس واقعہ سے بتانا کیا ہے؟ یہ بتانا ہے کہ جیسے ایک اچھے گھر میں اچھی چیزیں رکھنے کے بجائے گندگی، غلاظت کوئی جمع کرتا ہے، تو دنیا کا کوئی انسان اسے برداشت نہیں کرتا بلکہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کے دماغ کے اندر خرابی

ہے اور واقعی خرابی بھی ہوتی ہے، اسی طرح جو اپنے دل کے محل کو خدا کی محبت سے سجانے کے بجائے دنیا کی غلاظتوں سے ملوث کر لیتا ہے تو آپ بتایئے کہ اس کے بارے میں کیا کہا جائے، ہمارے نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے اندر ہم کو یہی درس دیا گیا ہے کہ اس دل کو کیسے سجائیں؟ پاک کریں؟

نجس دل میں اللہ کی تجلی نہیں ہوتی

یاد رکھو کہ دل کی خرابی بہت بڑی خرابی ہے، اس لئے وہاں گندگی ڈالنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، کیا اپنی آفس روم میں کوئی گندگی غلاظت ڈالے گا؟ جہاں سارے لوگ آتے جاتے ہوں، میل ملاقات وہیں ہوتی ہو، صوفہ رکھا ہوا ہو، فرنیچر ہو، ٹیبل رکھا ہوا ہو، ان کے اوپر چار پانچ جگہ گندگی اور غلاظت ڈال دی جائے۔ سوچو کہ کون آئیگا؟ آپ کے آفس میں یا ایسے گھر میں؟

اسی طرح اس گھر (دل) میں جس کے اندر گندگیاں اور غلاظتیں ڈالدی گئی ہوں، وہاں خدا کیسے آسکتا ہے؟ نجس دل میں کبھی اللہ کی تجلی نہیں آتی، جس میں اخلاقی واعتقادی، نظریاتی و دیگر رذائل وخبائث ہوں۔ آج یہی ہمارا روگ ہے، سب سے بڑی مصیبت ہے، سب سے بڑا المیہ ہے، کہ ہم نے محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی اور آپ کے اسوۂ حسنہ سے دل کے بنانے کا فن نہیں سیکھا، دل کو سجانے کا فن نہیں سیکھا۔

دنیا والوں سے عبرت لیجئے

بھائیو! ہمیں اس سلسلہ میں دنیا والوں سے عبرت لینا چاہئے، آج دنیا ترقی کرتے کرتے کہاں سے کہاں پہونچ رہی ہے، وہ ترقی کرتے کرتے اپنے گھروں کو سجانے کے لئے کیا کیا انداز اختیار کر رہی ہے، ہر کام کے لئے الگ الگ آدمی

موجود ہیں، مختلف قسم کے ڈیزائن ہوتے ہیں ، اندرونی کام (Interior)، اور باہری کام(Exterior)، اور ہر ایک کے لئے الگ الگ اشخاص ہوتے ہیں (Interior) کام کی مخلوق الگ، وہ لوگ صرف اندرون خانہ کام کرتے ہیں، ان کا کام باہر کا نہیں، اور (Exterior) کام والے باہر کا کام کرتے ہیں، یہ لوگ اندر کا کام نہیں کرتے ،صوفے والے ٹیبل کا کام نہیں کرتے ،ٹیبل والے صوفے کا کام نہیں کرتے، کارپیٹ بچھانے والے چھت پر ڈیزائننگ کا کام نہیں کرتے، ہر ایک کے لئے الگ الگ قسم کے لوگ ہیں، اور ہر ایک اپنے فن کا فنکار ہے، اور ہر ایک اپنا فن دکھارہاہے اور لوگ ہر ایک سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے گھروں کو، اپنی آفسوں کوسجارہے ہیں کہ ہمارا گھر ایسا ہونا چاہئے ، ہماری آفس ایسی ہونی چاہئے ، ہمارا دکان ایسا ہونا چاہیے، لیکن افسوس یہ ہے کہ اگر سجاوٹ نہیں ہورہی ہے تو اس دل کے گھر کی نہیں ہورہی ہے، جو خالق کائنات اللہ تعالی نے اپنے لئے بنایا ہے، کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے؟ ہمارے رہنے کے مکانات تو اتنے عالیشان ہوں، اور اللہ کا مکان ''دل'' اتنا گھٹیا اور اتنا گندا ہو کہ مت پوچھو، ساری غلاظتیں اس میں، حسد اس میں، کینہ اس میں، تکبر اس میں، بغض اس میں، مردار دنیا کی محبت اس میں، بے حساب گندگیاں اس میں۔

مرشدی شاہ ابرارالحق صاحب کا ایک مقولہ

حضرت مرشدی مولانا شاہ ابرارالحق صاحب نوراللہ مرقدہ، بار بار ایک جملہ ارشاد فرمایا کرتے تھے، وہ جملہ یاد آگیا، حضرت وہ جملہ قرآن و اذان و نماز کے بارے میں فرمایا کرتے تھے، کہتے تھے کہ'' قرآن آج لوگوں کا بڑھیا نہیں ہے، اذان بڑھیا نہیں ہے''، اور کہتے تھے'' کھانا بڑھیا، پانی بڑھیا، مکان بڑھیا، دکان بڑھیا، حتی

کہ پان بھی بڑھیا لیکن قرآن بڑھیا نہیں''، یہ جملہ ہے حضرت کا۔

میں کہتا ہوں کہ اسی طرح دنیا بھر کے دکان، دنیا بھر کے مکان سب عالیشان، ان کے اندر و باہر تمام سجاوٹوں کا ہم اہتمام کرتے ہیں، لیکن خدا کے دل کو بسانے اور سجانے کا کوئی اہتمام نہیں، محمد ﷺ کی سیرت میں دل کو سجانے کا بہت زیادہ اہتمام ہے، یہ فن وہاں سے سیکھنا ہے، اس کو آپ سجائیں کیسے؟ اس کو سجانے کے لئے کیا کرنا پڑیگا؟ اللہ کا ذکر، اللہ کے ذکر سے اللہ کے دل کی سجاوٹ ہوتی ہے، سبحان اللہ پڑھیں، الحمدللہ پڑھیں، اللہ اکبر پڑھیں، لا الہ الا اللہ پڑھیں، اور ذکر واذکار کریں، قرآن پاک کی تلاوت کریں، تو جوں جوں آپ قرآن پاک کی تلاوت اور ذکر واذکار کرتے جائیں گے تو اس اللہ کے گھر میں بیل بوٹے لگتے چلے جائیں گے، سبحان اللہ سے ایک پھول نکلے گا، الحمدللہ سے ایک پھول نکلے گا۔

ذکر اللہ سے معرفت ومحبت کا عکس دل پر پڑیگا، ایک واقعہ

جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں، اللہ ان کے دل میں بسیرا کرتا ہے، کیسا بسیرا، ایک عجیب وغریب واقعہ سنئے، آپ نے مہدوی فرقہ کا نام سنا ہوگا، اس فرقہ کے بارے میں تمام علماء کا کہنا ہے کہ یہ گمراہ فرقہ ہے، اور کافر ہے۔ اب رہی اس کی تفصیلات تو اس وقت کہنا نہیں ہے، اس فرقے کے جو بانی تھے، وہ بانی بنالئے گئے ہیں، وہ خود شاید بانی نہ ہوں، لوگوں نے ان کو بانی قرار دے لیا ہے، بہر حال یہ لوگ ان کو مانتے ہیں، ان کا نام ہے ''محمد جونپوری'' جونپور (یو، پی) کے رہنے والے تھے، ان کے بارے میں مورخین کی رائے مختلف ہے، بعض کہتے ہیں کہ یہ غلط قسم کے آدمی تھے، لوگوں کو ایک گمراہی پر ڈال گئے، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ صوفی منش آدمی تھے، اللہ

والے تھے، بہ ہر حال وہ جیسے بھی تھے، اس وقت اس کی بھی بحث نہیں ہے، البتہ ان کا ایک واقعہ سنانا ہے، وہ یہ کہ انہوں نے اپنے کچھ لوگوں کے ساتھ غیروں سے جہاد کرنا شروع کیا، مختلف جگہ ان کی فوجیں جاتی تھیں، اور جہاد کرتی تھیں، تاریخ میں یہ واقعہ لکھا ہوا ہے کہ ایک جگہ راجا دلیپ راؤ اور راجا کی فوج سے ان کی مڈبھیڑ ہوئی اور آپس میں دونوں کا مقابلہ ہوا اور اس مقابلہ میں سید جونپوری نے بادشاہ کے اوپر حملہ کیا، وار کاری تھا، راجا گرا اور گر کر مر گیا، یہاں تک کہ اس کا سینہ پھٹ کر دل باہر نکل آیا، جب اس کا دل نکل کر باہر آ گیا، تو لوگوں نے ایک عجیب وغریب بات یہ دیکھی کہ اس کے دل کے اوپر اس مورتی کی تصویر تھی جس کی وہ پوجا کیا کرتا تھا، اس طرح جیسے چھپی ہوئی تصویر ہوتی ہو، اس کا کیا مطلب ہوا؟ مطلب یہ کہ جب وہ کافر بادشاہ پورے دھیان وتوجہ کے ساتھ اپنی مورتی کی پوجا کرتا تھا، تو دل نے اس کا عکس قبول کر لیا۔

بھائیو! ذرا سوچو کہ جو خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگا تو کیا خدا تعالیٰ کی معرفت ومحبت کا عکس اس کے دل پر نہیں آئیگا، کیوں نہیں؟ ایک عربی شاعر نے کہا ہے:

لِيْ حَبِيْبٌ خَيَالُهٗ نُصْبَ عَيْنِيْ

وَ اسْمُهٗ فِيْ ضَمَائِرِيْ مَكْنُوْنٌ

اِنْ تَذَكَّرْتُهٗ فَكُلِّيْ قُلُوْبٌ

وَ اِنْ تَأَمَّلْتُهٗ فَكُلِّيْ عُيُوْنٌ

یعنی میرا ایک محبوب ومعشوق ہے جس کا تصور وخیال ہمیشہ میری آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے، اور اس کا نام میرے ضمیر میں پوشیدہ ہے، اگر میں اس کو یاد کرتا ہوں تو میں سراپا دل ہو جاتا ہوں اور اگر میں اس کو دیکھتا ہوں تو سراپا آنکھ بن جاتا ہوں۔

لہذا اللہ کو، اللہ کی محبت کو اپنے دل میں بسانے کے لئے ضروری ہے کہ اللہ کا ذکر کرو، اس کی طرف دھیان لگاؤ، اس کی طرف محبت کے ساتھ متوجہ ہو جاؤ، جب یہ کام کریں گے تو انشاء اللہ! یہ دل محمد ﷺ کی سیرت کے مطابق اور آپ ﷺ کے اسوہ کے مطابق اللہ کا واقعی مسکن بنے گا اور اس مسکن میں خدا کی محبت رہے گی، پلے گی، پھلے گی، پھولے گی۔

حضرت نبی ﷺ کی آنکھ بھی اسوہ ہے

اسی طرح ہمارے نبی ﷺ کی آنکھیں بھی ہمارے لئے اسوہ ونمونہ ہیں۔ کس طرح؟ اس طرح کہ ہم یہ دیکھیں کہ آپ کی آنکھیں کہاں اور کس طرح استعمال ہوتی تھیں؟ آپ راستوں میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے نہیں چلتے تھے، بلکہ نگاہیں آپ کی نیچے کی جانب ہوتی تھیں۔ (طبقات ابن سعد: ۱/۳۷۹، سبل الھدی والرشاد: ۸/۱۵۹)

آپ کسی حرام وناجائز چیز کو نہیں دیکھتے تھے، کسی نامحرم پر نگاہ نہیں اٹھاتے تھے۔ نیز آپ کی آنکھیں اللہ کی محبت یا خوف سے روتی تھیں۔ ایک بار سورج گرہن ہو گیا تو آپ نے نماز کسوف پڑھائی اور لمبا لمبا رکوع اور لمبا لمبا سجدہ کیا، اور سجدہ میں روتے روتے کہتے جارہے تھے: ”ألم تعدني أن لا تعذبهم و أنا فيهم“ (اے اللہ! کیا آپ نے مجھ سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ میں جب تک ان لوگوں میں موجود ہوں آپ ان کو عذاب نہیں دیں گے) یہ کہتے جاتے اور روتے جاتے تھے۔ (شمائل ترمذی: حدیث: ۳۱۵)

ایک بار حضرت ابن مسعودؓ سے فرمایا کہ تم مجھے قرآن سناؤ، انھوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا میں آپ کو قرآن سناؤں جبکہ قرآن آپ پر نازل ہوا ہے؟ آپ

نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ کسی اور سے قرآن سنوں۔ حضرت ابن مسعود نے قرآن پڑھنا شروع کیا اور سورہ نساء پڑھی۔ وہ کہتے ہیں کہ جب میں نے آپ کو دیکھا تو: ''رأیت عینی رسول اللّٰہ تھملان '' (دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کی آنکھیں بہہ رہی ہیں) (شمائل: ۳۱۴)

ساری چمک دمک تو انہی موتیوں سے ہے
آنسو نہ ہوں تو عشق میں کچھ آبرو نہیں

ہر چیز پر عبرت کے لئے نگاہ ڈالتے تھے، فضول و بے کار کسی چیز کو دیکھتے نہیں تھے۔ یہ ہے اللہ کے نبی ﷺ کی آنکھوں کو اسوہ بنانا، لہذا اس کے مطابق اپنی آنکھوں کو بنانا چاہیئے۔

زبان نبوی اور اسوۂ حسنہ

اسی طرح مثال کے طور پر زبان کو لیجئے کہ اللہ کے نبی ﷺ کی زبان کہاں اور کس طرح استعمال ہوتی تھی؟ آپ نہ اس کو گالی بکنے میں استعمال کرتے تھے، نہ کسی بری بات میں استعمال کرتے تھے، نہ کسی کو اس سے ذیت پہنچاتے تھے، بلکہ یہ زبان یا تو اللہ کا کلام پڑھنے میں یا ذکر اللہ میں یا کسی کو اچھے امور کی تعلیم و تبلیغ میں، وعظ و نصیحت میں استعمال ہوتی تھی، لہذا ہمیں بھی اپنی اپنی زبان کا استعمال صحیح طریقہ کے مطابق اسوۂ حسنہ کی روشنی میں کرنا چاہیئے۔

الغرض یہ چند مثالیں اور اشارے ہیں، ان سے اندازہ ہو جائے گا کہ اللہ کے نبی ﷺ کو ہمیں کس طرح اسوۂ حسنہ بنانا ہے۔ ہر ہر بات میں آپ کو نمونہ بنانا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں بھی عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

و آخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العالمین

معرفت الٰہی اور اس کے آثار

باسمہ تعالیٰ

معرفت الٰہی اوراس کے آثار

الحمدللّٰہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ، امابعد

فاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم ، بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾(الذریٰت:۵۶)

محترم حضرات !

اللہ تعالی نے دنیا میں انسان کوبھی پیدا کیا اور دیگر مخلوقات کوبھی پیدا کیا ،مگر علما نے لکھا ہے کہ انسان کے پیدا کرنے اور دیگر مخلوقات کے پیدا کرنے میں ایک بڑا فرق ہے، وہ یہ کہ انسان کی تخلیق کا مقصد اللہ تعالی کی معرفت ہے،اور دیگر مخلوقات کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اللہ کی معرفت کا انسان کے لئے ذریعہ بنیں، زمین اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہے،آسمان اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہے، چاندوسورج اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہیں، درخت کواللہ نے اس لئے نہیں پیدا کیا ہے کہ درخت کواللہ کی معرفت ہو،اور نہ جانوروں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ جانور اللہ کے عارف بندے بن جائیں، عارف تو بنے گا وہ بندہ جس کوانسان کہتے ہیں،اسی لئے زمین کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اللہ کی عارف ہے،آسمان کواللہ کا عارف نہیں کہہ سکتے ،شجر وحجر کو اللہ کا عارف نہیں کہہ سکتے ، چرند پرند کو اللہ کا عارف نہیں کہہ سکتے ،ان کومعرفت

نصیب نہیں ہے، معرفت اللہ تعالیٰ نے صرف انسان اور جنات کو عطاء کی ہے۔

قرآن کریم کی جو آیت میں نے تلاوت کی ہے، اس میں اسی طرف اشارہ ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (میں نے جنات اور انسانوں کو صرف میری عبادت کے لئے پیدا کیا ہے) (الذاریت:۵۶)

حضرت ابن عباس وحضرت مجاھد کی تفسیر

حضرت ابن عباسؓ اور ان کے شاگرد حضرت مجاھدؒ نے " لیعبدون " کی تفسیر " لیعرفون " سے کی ہے، یعنی عبادت سے مراد یہاں اللہ کی معرفت اور پہچان ہے۔ چنانچہ علامہ آلوسی نے "سبحان الذی أسری الخ" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ: ابن عباس نے آیت: "وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون" کی تفسیر "الا لیعرفون" سے کی ہے۔ (روح المعانی:۱۵/۱۵)

اور حضرت مجاھد سے یہ تفسیر متعدد حضرات مفسرین نے نقل کی ہے، جیسے امام ابوحیان نے البحر المحیط میں، علامہ آلوسی نے روح المعانی میں، ابن عادل نے اللباب میں اس کا ذکر کیا ہے۔ (البحر المحیط:۸/۱۰۹، روح المعانی:۱۵/۱۵، اللباب: ۱/۴۶۸۰)

الغرض یہاں اللہ تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ بندے میری معرفت حاصل کریں، اس لئے انسان و جنات کو پیدا فرمایا گیا۔

معرفت کو عبادت سے تعبیر کرنے میں حکمت

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "لیعبدون" کیوں فرمایا جبکہ مقصود

"لیعرفون "ہے؟ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ اللہ کی معرفت کا ذریعہ عبادت ہے،اگر اللہ کی معرفت پیدا کرنا ہے تو اس کا وسیلہ اور ذریعہ ہی اللہ کی عبادت ہے، لہذا اللہ کی عبادت کے بغیر اگر کوئی معرفت کا دعوی کرتا ہے تو وہ جھوٹا ہے،اس کی جانب اشارہ کرنے کے لئے معرفت کو عبادت سے تعبیر فرمایا گیا۔

اس میں ان جیسے لوگوں کا رد ہو گیا جو آج کل معرفت خداوندی کا دعوی کرتے ہیں،لیکن عبادت خداوندی سے عاری وخالی ہوتے ہیں، نہ نماز ہے، نہ روزہ ہے، نہ زکوۃ ہے، نہ سنت کی پابندی ہے، نہ ذکر ہے، نہ تسبیح ہے، دن رات اللہ کی نافرمانی ہے، پھر بھی معرفت کا دعوی ہے،نماز وہ نہیں پڑھیں گے،کہیں گے کہ ہم دل کی نماز پڑھتے ہیں، ذکر وہ نہیں کریں گے،کہیں گے کہ ہمارا دل ہر وقت ذاکر وشاغل رہتا ہے،زکوۃ وہ نہیں دیں گے،کہیں گے کہ زکوۃ سے مراد طہارت ہے، وہ ہمیں حاصل ہے،اس طرح تمام عبادات اور شرعی احکامات کے اندر تاویل کی راہ اختیار کرتے ہیں،اور گمراہی میں پھنس جاتے ہیں۔اس لئے اللہ تعالی جو علام الغیوب ہیں، جسے ساری کائنات کا علم ہے،اسے یہ بھی معلوم ہے کہ لوگ کیسی کیسی تاویلیں کریں گے، اس لئے قرآن میں خود ان کا علاج ذکر کر دیا کہ اگر تم بغیر عبادت کے معرفت خداوندی کا دعوی کرتے ہو تو تم جھوٹے ہو۔

اسی لئے اللہ تعالی نے رسول اللہ ﷺ کو دنیا میں بھیجا،آپ دنیا میں سب سے بڑے عارف،سب سے زیادہ اللہ کو پہچاننے والے،اللہ کے نبی نے خود ہی فرمایا ہے :"ان أتقاكم و أعلمكم بالله أنا "کہ تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اللہ کی معرفت رکھنے والا میں ہوں۔(بخاری: حدیث: ۲۰)

اس کی وجہ یہی ہے کہ آپ سب سے بڑے عارف باللہ تھے، اللہ تعالی نے معرفت سمجھانے آپ کو مبعوث فرمایا،آپ سے اعمال کروائے،عبادات: نماز،روزہ

زکاۃ، حج وقربانی، ذکر واذکار وغیرہ کراوئے تاکہ دنیا والوں کو بتائیں کہ یہی راستہ ہے، جس پر چل کر اللہ کی معرفت نصیب ہوتی ہے۔

معرفت کی حقیقت

اب یہ سنئے کہ معرفت کسے کہتے ہیں؟ معرفت عربی کا لفظ ہے، لغت میں اس کے معنی ہیں ''جاننا پہچاننا''، شریعت وتصوف کی راہ میں معرفت سے مراد یہ ہے کہ اللہ کو اس طرح جانا جائے پہچانا جائے کہ اس جاننے پہچاننے کے آثار اپنی ذات پر ظاہر ہونے لگیں۔ اللہ نے انسان کو اسی لئے پیدا کیا ہے۔

لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ ہم اللہ کی ذات کو جان نہیں سکتے تو پھر اللہ کو جاننے کا کیا مطلب ہے؟ جواب یہ ہے کہ اللہ کو جاننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی صفات کو جانا جائے، دوسرے اللہ تعالیٰ کے افعال کو جانا جائے، تیسرے اللہ تعالیٰ کے شئون کو جانا جائے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنے افعال، اپنی صفات، اپنے شئون جگہ جگہ بیان فرمائے ہیں، انسان جب ان چیزوں کو جان لیتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس کو اللہ کی پہچان حاصل ہے، اسے معرفت کی دولت مل گئی ہے۔

ذات خداوندی کی معرفت محال ہے

ابھی میں نے جو عرض کیا کہ اللہ کی ذات کو ہم نہیں جان سکتے، تو واقعی بات یہی ہے؛ اس لئے اللہ کی ذت کو جاننے کی کوشش نہ کرے، اس لئے کہ ذات کو جاننے کی کوشش کرے گا تو ناکام ہو جائے گا، کیونکہ اللہ کی ذات کو کوئی نہیں جان سکتا، ذات کو جاننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کیسے ہیں ذات کے اعتبار سے، جیسے انسان کی حقیقت ذات کے اعتبار سے یہ ہے کہ وہ مٹی سے بنایا گیا ہے، اس کے اعضاء اتنے ہیں، ان کے فلاں فلاں کام ہیں، اسی طرح دیگر مخلوقات کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ

کس چیز سے بنے ہیں، ان سب چیزوں کی پہچان ان کے مادہ سے ہوتی ہے، لیکن اگر کوئی چاہے کہ مخلوقات کی طرح اللہ کی ذات کو جانوں تو یہ ناممکن بات ہے، اس لئے کہ اللہ کی ذات انسان کی عقل سے ماوراء ہے، انسان کی عقل نہ وہاں پہونچ سکتی ہے، نا اس دنیا میں اس کی آنکھ اسے دیکھ سکتی ہے۔

اسی لئے اللہ تعالی نے قرآن کریم میں فرمایا:

﴿لاتُدْرِكُهُ الأَبْصَارُ﴾ (اس کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں) (الأنعام:۱۰۴)

اورحدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے: " تفکروا فی خلق اللّٰہ لا تتفکروا فی اللّٰہ "(اللہ کی مخلوق میں غور وفکر کرو، اللہ کی ذات میں غور وفکر نہ کرو) (جامع الاحادیث:۱۰۹۰۱)

اسی لئے جب حضرت موسی علیہ السلام اللہ کی طرف سے فرعون کے پاس بھیجے گئے اور آپ نے فرعون سے کہا کہ میں رب العالمین کی طرف سے رسول بن کر آیا ہوں تو فرعون نے کہا: ﴿وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (رب العالمین کیا چیز ہے) (الشعراء:۲۵)

یعنی ذات کے بارے میں پوچھ لیا۔ حضرت موسی سمجھ گئے کہ اسے معرفت کی ''الف ب'' بھی معلوم نہیں ہے، حالانکہ معرفت کی ''الف ب'' سے تو کوئی کافر بھی خالی نہیں۔

قرآن کریم میں ہے کہ جب کفار کی کشتی بھنور میں پھنس جاتی ہے، طوفان کی زد میں آجاتی ہے، تو اس وقت وہ لوگ بھی اللہ ہی کو پکارتے ہیں، اپنے بتوں کو بھول جاتے ہیں، کیا مطلب ہوا؟ مطلب یہ ہوا کہ اللہ نے اپنی پہچان کافر کو بھی عطاء کی ہے، لیکن فرعون ملعون اتنا نابلد و بے وقوف تھا کہ اسے بالکل اللہ کی پہچان نہیں تھی جس کی وجہ سے ایسا غلط سوال کیا کہ رب العالمین کیا چیز ہے؟ حالانکہ پوچھنا چاہئے

کہ ''رب العالمین'' کون ہے؟ جیسے آپ سے آ کر کوئی پوچھے کہ آپ کیا چیز ہیں؟ تو آپ ہنسیں گے، یہ پوچھنا چاہئے کہ آپ کون ہیں؟

الغرض حضرت موسیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا: ﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ﴾ (وہ آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی سب چیزوں کا رب ہے اگر تم یقین مانو) [الشعراء: ۲۴]

اور فرمایا: ﴿رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَائِكُمُ الْأَوَّلِيْنَ﴾ (اللہ وہ ہے جو زمین اور آسمان کا رب ہے، تمہارا اور تمہارے آباء واجداد کا رب ہے) [الشعراء: ۲٦]

اور فرمایا: ﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَ مَابَيْنَهُمَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ (وہ مشرق ومغرب اور ان کے درمیان کی چیزوں کا پروردگار ہے، اگر تم سمجھو) [الشعراء: ۲۸]

یعنی اللہ کی صفات کو بیان فرمایا، اللہ کی ذات کو بیان نہیں کیا، اس سے بھی معلوم ہوا کہ اللہ کی ذات کو کوئی جان نہیں سکتا۔ لہذا معرفت کا حاصل یہ ہوا کہ اللہ کی صفات وافعال کے بارے میں قرآن وحدیث اور انفس وآفاق میں پھیلے ہوئے دلائل میں غور وفکر کرتے ہوئے اس کی پہچان پیدا کرنا۔

جھوٹے مدعیان معرفت کی بے راہ روی

بعض لوگ اس لفظ معرفت کو بالکل غلط استعمال کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ایک شریعت والے ہیں، ایک معرفت والے ہیں، ان سے پوچھا جائے کہ معرفت کیا ہے؟ تو کہتے ہیں یہ کان میں کہی جانے والی بات ہے، سب کو نہیں بتائی جائیگی۔ اللہ تو معرفت کو قرآن میں کھلے عام بیان کررہا ہے، احادیث میں ہمارے آقا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے کھلے عام بیان فرمایا ہے، تو یہ کون ہوتے ہیں جو یہ کہیں

کہ معرفت عام نہیں ہے، اللہ نے تو اس لئے عام کردیا تا کہ جو بندہ چاہے آسانی سے حاصل کر سکے اور جو لوگ معرفت کو خاص کرتے ہیں، ان سے ہوتا کچھ نہیں صرف دعوے کرتے ہیں۔

ہر ضروری چیز کو اللہ نے عام رکھا ہے

دنیا میں اللہ تعالی کا ایک اصول یہ ہے کہ انسان کو جس چیز کی جس قدر زیادہ ضرورت ہے، اللہ نے اسے اسی قدر عام کیا ہے، اور قیمتی بھی نہیں بنایا۔ مثلاً انسان کو کھانے کی زیادہ ضرورت تھی، اللہ نے اسے ہر جگہ عام کیا، دکان میں ملے گا، بازار میں ملے گا، ہر جگہ ملے گا۔ اسی طرح انسان کو پانی کی ضرورت کھانے سے بھی زیادہ ہوتی ہے؛ اس لئے اللہ تعالی نے پانی کو کھانے سے بھی زیادہ عام کیا ہے، اور اللہ نے ہر جگہ مفت رکھا ہے، ہم جو پانی کی بل دیتے ہیں وہ اللہ کو نہیں دیتے بلکہ پانی پہنچانے کا انتظام کرنے والوں کو دیتے ہیں، گورنمنٹ کو دیتے ہیں، اس لئے کہ انہوں نے اس اللہ کے پانی کو گھر گھر پہنچایا تو ہم ان کو سروس چارج دیتے ہیں، یہ پانی کا چارج نہیں ہے، پانی کا سروس چارج ہے، پانی کا چارج کون دے سکتا ہے؟ اگر اللہ تعالی پانی کا بل (bill) مانگنے لگیں تو آپ کسی بِل میں گھس جائیں گے، پانی کا بل نہیں دے سکیں گے، اور پانی سے زیادہ ضرورت انسان کو ہوا کی ہوتی ہے، اس لئے اللہ تعالی نے ہوا کو اتنا عام کیا ہے کہ آپ جہاں میں جہاں بھی جائیں گے وہیں ہوا آپ کا استقبال کرے گی، اس کا بھی کوئی بل کسی طور پر بھی نہیں لگتا، ایک انسان چوبیس گھنٹوں میں چوبیس ہزار دفعہ سانس لیتا ہے، یعنی ایک گھنٹے میں ایک ہزار دفعہ سانس لیتا ہے، اگر اللہ تعالی ایک گھنٹے کا بھی چارج کرتے تو انسان کی حالت کیا ہوتی؟

اس کے برخلاف جس چیز کی ضرورت کم ہوتی ہے، اللہ تعالی اسے خاص کرتے

چلے جاتے ہیں، اس پر پابندیاں لگاتے چلے جاتے ہیں، پابندیاں لگاتے لگاتے اسے قیمتی بھی بنادیتے ہیں، مقید کردیتے ہیں، محبوس کردیتے ہیں، مجبور کردیتے ہیں، اور قیمتی سے قیمتی بنادیتے ہیں، جیسے ''ہیرا'' انسان کی ضرورت کا نہیں ہے، اس لئے اللہ نے اسے اتنا قیمتی بنادیا کہ عام آدمی اسے خرید نہیں سکتا، اور محبوس بھی کردیا، ہم میں سے بہت سارے لوگوں نے ہیرے کو دیکھا ہی نہیں ہوگا، اسی طرح سونا، موتی وغیرہ ہیں۔

اب اس اصول کو سامنے رکھ کر میں ایک بات سمجھانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اللہ کی معرفت انسان کو سانس سے زیادہ ضروری ہے، اس کے کھانے سے زیادہ ضروری ہے، اس کے پینے سے زیادہ ضروری ہے، اتنی زیادہ ضروری چیز کو کیا اللہ تعالی خاص کر کے رکھ دیں گے کہ بعض لوگوں کو دیدیں اور کہیں کہ تم ہی اسے لئے پھرنا، صرف کان میں بولنا۔ ہو ہی نہیں سکتا، ناممکن بات ہے، جیسے اللہ تعالی نے ضرورت انسانی کی اشیاء کو کھلے عام پیش کردیا ہے، اسی طرح معرفت الٰہی بھی ہماری روح کے لئے ضروری چیز ہے، جسے اللہ تعالی نے کھلے عام بیان فرمایا ہے، یہ کوئی مخفی اور پوشیدہ راز نہیں ہے۔

معرفت الٰہی کتنی عام ہے

اب میں آپ لوگوں کو بتاوں گا کہ اللہ تعالی نے معرفت الٰہی کو انسانی ضرورت کے پیش نظر کتنا عام کیا ہے۔ قرآن کریم کی ہر آیت کے اندر معرفت موجود ہے۔

واقعہ لکھا ہے کہ ایک آدمی مسلمان ہوا، اس سے پوچھا گیا کہ کس چیز نے تمہیں اسلام کی طرف مائل کیا تو اس نے کہا کہ میں نے قرآن کریم پڑھا تو معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی ہر آیت میں اللہ تعالی نے اپنی کوئی نہ کوئی صفت بیان کی ہے، کہیں

بصیر فرمایا ہے تو کہیں خبیر، کہیں علیم فرمایا ہے تو کہیں علام الغیوب وغیرہ۔اس سے میں نے سمجھا کہ قرآن و اسلام دراصل اللہ کی معرفت کی تعلیم دیتے ہیں ،اس کے برخلاف عیسائی اور دوسرے مذاہب میں خدا کا کوئی خاص تذکرہ نہیں ،نہ اس کی صفات کا بیان ہے،اس لئے مجھے اسلام نے اپیل کیا اور میں مسلمان ہو گیا۔

تو معلوم ہوا ہر آیت میں معرفت کا سامان ہے، جو بھی قرآن کریم غور سے پڑھے گا تو وہ ضرور بالضرور اللہ کا عارف بندہ بن جائے گا، دوسری طرف احادیث نبوی بھی معرفت سے بھری پڑی ہیں،تیسرے یہ کہ اللہ نے ساری دنیا کی ہر چیز کو معرفت کا سامان بنا دیا ہے،زمین کا ذرہ ذرہ معرفت الٰہی کا مظہر ہے،آسمان کا ذرہ ذرہ معرفت الٰہی کا مخزن ہے،سورج اللہ کی معرفت کا سامان، چاند اللہ کی معرفت کا سامان،شجر وحجر اللہ کی معرفت کا سامان، چیونٹی اللہ کی معرفت کا سامان،خود انسان اور اس کے اعضاء اللہ کی معرفت کا سامان ہیں۔

بھائیو! اب بتاؤ کہ اللہ کی معرفت کتنی عام ہے؟ کھانا لینے تو آپ کو بازار جانا پڑے گا،لیکن معرفت حاصل کرنے کہیں جانے کی ضرورت نہیں، نیچے دیکھو تو معرفت ،اوپر دیکھو تو معرفت ،داہنی طرف دیکھو تو معرفت ،بائیں طرف دیکھو تو معرفت،سامنے دیکھو تو معرفت، پیچھے دیکھو تو معرفت، ہر سو اللہ کی معرفت کا سامان جمع ہے۔

اسی لئے ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَ الۡفُلۡکِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّةٍ وَّ

تَصۡرِيۡفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَيۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ﴾(البقرۃ:۱۶۴)

(بلاشبہ زمین وآسمانوں کی تخلیق میں اور رات و دن کے آنے جانے میں اور کشتیوں میں جو سمندر میں لوگوں کی نفع بخش چیزیں لیکر چلتی ہیں اور پانی میں جس کو اللہ نے آسمان سے نازل کیا، پھر اس سے زمین کے خشک ہوجانے کے بعد اس کو تر و تازہ کیا (اور کھیتیاں اگائیں) اور ان سے زمین میں ہر قسم کے حیوانات پھیلائے، اور ہواؤں کی سمتوں کے بدلنے میں (کہ کبھی پُروا ہوا چلتی ہے تو کبھی پچھوا، کبھی گرم تو کبھی سرد) اور بادل میں جو زمین وآسمان کے درمیان معلق ہے، ان سب میں عقل سے کام لینے والوں کے لئے نشانیاں موجود ہیں)

قرآن میں اس طرح کی سینکڑوں آیات ہیں جن میں اللہ تعالی نے انسانوں کو انفس وآفاق میں غور کرکے اللہ کی معرفت حاصل کرنے کی دعوت دی ہے۔

ایک جگہ کس قدر عجیب انداز سے فرمایا گیا کہ:

﴿اَفَلاَ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَى الۡاِبِلِ كَيۡفَ خُلِقَتۡ ، وَ اِلَى السَّمَآءِ كَيۡفَ رُفِعَتۡ وَاِلَى الۡجِبَالِ كَيۡفَ نُصِبَتۡ ، و اِلَى الۡاَرۡضِ كَيۡفَ سُطِحَتۡ﴾ [الغاشية:۱۷-۲۰]

(تو کیا یہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنایا گیا ہے، اور آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح کھڑے کئے گئے ہیں اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح پھیلائی گئی ہے)

اس میں سبھی لوگوں کو بالعموم اور عربوں کو بالخصوص دعوت دی گئی ہے جن کے پاس اونٹ ہوا کرتے تھے کہ اللہ کی قدرت دیکھنا ہو اور اس کی معرفت پیدا کرنا ہو تو

ان اونٹوں اور دیگر مخلوقات کو دیکھو اور معرفت حاصل کرو۔

حصول معرفت کا طریقہ

الغرض اللہ کی صفات کو جاننے اور ان پر غور کرنے سے اللہ کی معرفت آتی ہے، اللہ کی بے شمار صفات ہیں، جیسا کہ اللہ کے صفاتی ناموں سے معلوم ہوتا ہے، اللہ کے ہزاروں صفاتی نام ہیں، ہر نام میں اللہ کی ایک صفت بیان کی گئی ہے، ان میں سے ایک مثال کے طور پر اللہ کا رحم وکرم ہے، یہ ایک ایسی صفت ہے کہ بچہ بچہ جانتا ہے، ہر آن اور ہر لمحہ اللہ کی طرف سے ہمارے اوپر رحم وکرم کی بارش ہو رہی ہے، یہ اتنی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس کھلی ہوئی حقیقت کو کھولنے کی کوشش کرنا تحصیل حاصل ہے۔

اب ہم نے اللہ تعالی کو جانا کہ ہمارا رب وہ رب ہے جو ہمارے اوپر ہر وقت احسان وکرم ورحم فرما رہا ہے، میں اٹھتا ہوں تو اللہ کا رحم وکرم میرے ساتھ، بیٹھتا ہوں تو اللہ کا رحم میرے ساتھ، میں کھاتا ہوں تو اللہ کا رحم وکرم میرے ساتھ، ہر وقت اور ہر حال میں اللہ کا رحم وکرم میرے ساتھ، سب جگہ رحم ہی رحم اور کرم ہی کرم ہو رہا ہے۔

آپ بستر سے اٹھ رہے ہیں، اگر خدا کا رحم وکرم شاملِ حال نہ ہوتو آپ بستر سے کیسے اٹھ جائیں گے؟ اگر خدا کا رحم وکرم نہ ہوا تو آپ کا کھانا آپ کے حلق کے اندر کیسے اتر جائے گا، وہی لقمہ آپ کے لیے موت کی دعوت بن سکتا تھا، لیکن وہ لقمہ آپ کھاتے ہیں، اندر بھی پہونچتا ہے، ہضم ہوتا ہے، اس سے قوت بنتی ہے اور آپ کام کاج کرنے کے قابل ہوتے ہیں، دین ودنیا کے بہت سارے کام کاج کرنے لگتے ہیں، کیا یہ اللہ تعالیٰ کا رحم وکرم شامل حال ہونے ہی کی وجہ سے نہیں ہے؟

کھاتے وقت اللہ کا عجیب رحم وکرم

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ نے ایک جگہ پر فرمایا ہے کہ ہم جو روزانہ کھانا کھاتے ہیں، یہ اصل میں اگر ہم غور کریں تو دو دفعہ اپنے اوپر فائرنگ کرنے کی طرح ہے، بندوق چلانے کی طرح ہے؛ کیوں؟ اس لیے کہ جب آپ لقمہ لیتے ہیں اور منہ میں رکھتے ہیں اور حلق میں اتارتے ہیں تو حلق میں اتارنے کے وقت ایک ایسے کٹھن و نازک مرحلہ سے آپ کو گذارا جاتا ہے کہ اگر آدمی تھوڑی دیر سوچے تو پریشان ہو جائے، بڑا نازک مرحلہ ہوتا ہے۔

ہر انسان کے حلق میں دو نلکیاں ہوتی ہیں، ایک سامنے اور ایک پیچھے، پیچھے جو نلکی ہے، اس میں کھانا جاتا ہے اور سامنے جو نلکی ہے، اس میں ہوا کا آنا جانا ہوتا ہے، جس سے آپ سانس لیتے ہیں، تو پہلے سانس کی نلکی آتی ہے اور سانس کی نلکی کو پار کر کے کھانا پیچھے کی نلکی میں جاتا ہے، اب سوچئے کہ اگر ذرا سا پانی کا قطرہ یا ذرا سا کھانے کا دانہ پیچھے کی نلکی میں جانے کے بجائے پہلی میں اُتر جائے تو ہلاکت اور موت ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا کیا نظام بنایا؟ حلق کے پاس ایک چھوٹی سے جیب بنائی ہے اور جب انسان کھانا یا پینا چاہتا ہے تو اس جیب کو حلق کے اوپر پل کی طرح بنا دیتے ہیں، جب آپ کھانا کھاتے ہیں تو وہ جیب پلٹ کر اس پہلی نلکی کو بند کر دیتی ہے، اور اس پر پل بن جاتی ہے اور کھانا اس پل پر سے پار ہو کر اندر دوسری اندر والی نلکی میں چلا جاتا ہے۔

یہ ہے سسٹم، اب اس سسٹم پر تھوڑی دیر کے لیے غور کیجئے کہ وہ جیب بند نہ ہوئی تو کیا ہوگا، اگر کوئی پروبلم (problem) آجائے پھر تو ہلاکت ہی ہلاکت ہے۔

یہ رحم نہیں ہے اللہ کا؟ اگر خدا تعالیٰ کا رحم ایک منٹ کے لئے بھی بلکہ ایک منٹ

کے ۱۰۰ حصہ میں سے بھی تھوڑے حصہ میں نہ ہو تو پھر انسان کے لیے ہلاکت ہے۔اب روزانہ ہم تین دفعہ کھانا کھاتے ہیں، دراصل تین دفعہ ہم روزانہ اپنے اوپر فائرنگ کرتے ہیں۔اب کھاتے وقت آدمی یہ سوچے کہ میں کھانے جارہا ہوں، اور اندر کی جیب کھل رہی ہے، پل بن رہا ہے، وہ میرا کیسا خدا اور مالک ہے جس نے ایسا سسٹم بنا رکھا ہے۔کیا اس سے اللہ کی معرفت پیدا نہیں ہوگی؟

صفت رحمت سے قرآن کی ابتداء

قرآن کریم جہاں شروع ہوا ہے، وہاں سب سے پہلے یہ آیت ہے۔ ﴿ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم ﴾ (شروع اللہ کے نام سے جو بہت رحم والا نہایت مہربان ہے) رحیم ورحمان دو لفظ لائے گئے، دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں، دونوں کے اندر انتہائی مبالغہ ہے، رحمٰن کے معنی ہیں، بے انتہا رحم کرنے والا،، یہی معنی رحیم کا بھی ہے، اور دونوں میں فرق ہے، وہ فرق یہ ہے کہ رحمان اس کو کہتے ہیں جس کا رحم وکرم ہر چیز پر عام ہو، اور رحیم کہتے ہیں اس کو جس کا فضل وکرم ورحم مخصوص قسم کے لوگوں کے لیے مخصوص انداز کا ہو، جیسے انبیاء کے لیے مخصوص رحم ہے، اولیاء کے لیے مخصوص کرم ہے، اپنے خاص بندوں کے لیے مخصوص انداز کا اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے، مخصوص رحم کرنے والے کو رحیم کہتے ہیں اور جس کی رحمت سب کے لیے عام ہو، چاہے کافر ہو، چاہے ماننے والا ہو، چاہے نہ ماننے والا ہو، چاہے وہ انسان ہو یا کوئی اور چیز ہو، سب کے لیے جس کی رحمت عام ہو، اسے رحمان کہتے ہیں۔

اسی لیے علماء کرام نے لکھا ہے کہ کسی انسان کو رحمٰن نام رکھنا تو جائز نہیں ہے، ہاں رحیم نام رکھ سکتے ہیں، اس لیے کہ انسان اس قدر عام رحم کا معاملہ کر ہی نہیں سکتا، لہٰذا انسان رحمان نہیں بلکہ عبدالرحمٰن ہے، رحمان کا بندہ ہے، لیکن رحیم چاہے تو رکھ

سکتے ہیں، اس لیے کہ مخصوص رحم انسان بھی کسی کے ساتھ کر دیتا ہے، لیکن عام رحم جیسے اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، اچھوں پر، بروں پر، انسانوں و جانوروں پر، ہر مخلوق پر، ہر طرح، ہر اعتبار سے، اس طرح رحم کرنے والا صرف اور صرف اللہ ہے۔

اللہ نے سب سے پہلے یہ آیت قرآن میں ذکر کی، یہ بتانے کے لیے کہ میری ذات کا عنوان ہی رحمان و رحیم ہے۔ جب ہم اللہ کی اس صفت میں غور کریں گے تو معرفت الٰہی پیدا ہوگی۔

تصوف کا ایک مسئلہ

جب آپ کو یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اسی سے ایک تصوف کا مسئلہ بھی حل ہو گیا وہ یہ کہ جہاں تک حصول معرفت کا مسئلہ ہے، اس کے لئے کسی شیخ و مرشد کی کوئی ضرورت نہیں، ہوسکتا ہے کچھ لوگوں کو یہ بات عجیب لگے، لیکن حقیقت یہی ہے، اس لئے کہ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا دنیا و مافیہا کا ہر ذرہ اپنے اندر معرفت الٰہی کا سامان رکھتا ہے، تو حصول معرفت کے لئے کسی شیخ کی ضرورت نہیں۔ اب سوال پیدا ہوگا کہ پھر پیر کی ضرورت کس لئے ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ معرفت کے آثار اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے شیخ کی ضرورت ہے، حصول معرفت کے لئے نہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے معرفت الٰہی کے سلسلہ میں کسی بھی انسان کو معذور قرار نہیں دیا ہے

مثلاً کوئی کہنے لگے، اے اللہ! مجھے تیری معرفت ملی ہی نہیں، معلوم ہی نہیں ہوا، میں کیا کروں؟ اگر مجھے تیری معرفت مل جاتی تو میں تیری عبادت کرتا، اگر اللہ کے سامنے یوں کہے گا تو اس کا عذر معتبر نہیں ہوگا، اس لئے کہ کائنات کا ہر ذرہ معرفت کا سامان ہے۔ اسی لئے امام اعظم ابوحنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ کسی بھی انسان کو اللہ کی معرفت اور توحید بتانے کے لئے کسی نبی کا آنا ضروری نہیں، بلکہ اس کے لئے اس کی

عقل خود کافی ہے۔ معلوم ہوا جب معرفت الٰہی کے لئے نبی ہی کی ضرورت نہیں تو پھر شیخ کی کیا ضرورت ہے؟ ہاں معرفت کے آثار اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے شیخ کی ضرورت ہے۔

کیونکہ معرفت کی شرعی تعریف صرف یہ نہیں ہے کہ اللہ کی صفات کو جان لیا جائے، کیونکہ اتنا جاننا تو ہر مخلوق میں عام ہے، حتیٰ کہ کافر بھی اتنا جانتا ہے، بلکہ معرفت کی تعریف یہ ہے کہ اللہ کو اس طرح سے جانے پہچانے کہ اس کے آثار نمایاں ہوں اور ان سے انسان متأثر ہو۔

معرفت کا علم آثارِ معرفت ہی سے ہوتا ہے

جب اللہ کی معرفت بندہ کے قلب میں آتی ہے تو اس پر اس کے کچھ آثار مرتب ہوتے ہیں اور ہر چیز میں یہی بات ہے کہ جب کسی چیز کو جاننے کے بعد اُس کا اثر مرتب ہو تب کہا جاتا ہے، سمجھا جاتا ہے، عوام میں بھی، خواص میں بھی کہ اس کو وہ چیز حاصل ہوگئی۔

مثال کے طور پر ایک لڑکا ہے، وہ اپنے باپ کو گالی دیتا ہے تو آپ اُسے کہتے ہیں کہ کیا حرکت کر رہا ہے، وہ تو تیرا باپ ہے باپ۔ وہ لڑکا آپ کو پلٹ کر یہ کہے گا کہ مجھے آپ سے زیادہ معلوم ہے کہ یہ میرا باپ ہے۔ باپ ہونے کا علم بیٹے کو جتنا ہے کسی اور کو کیا ہوسکتا ہے؟ ظاہر بات ہے، وہ دوسروں سے زیادہ اپنے باپ کی پہچان رکھتا ہے، لیکن اسے آپ بتاتے ہیں کہ بھائی! وہ تیرا باپ ہے باپ۔ کیوں بتاتے ہیں؟ اس لیے کہ باپ کو باپ جاننے کا جو اثر ہونا چاہئے، اس کا ادب، اس کی جلالت، اس کی عظمت، اس کا خوف، اس کی خشیت، وہ اس کے اندر نہیں ہے، اس لیے آپ اسے کہتے ہیں، بھائی! یہ تیرا باپ ہے باپ۔ وہ اگر آپ کو پلٹ کر یہ

جواب دے کہ مجھے تو آپ سے اچھا معلوم ہے کہ یہ میرا باپ ہے،تو آپ اسے کہتے ہیں کہ تو نے باپ کو جانا ہی نہیں ہے، اگر تو جان لیتا تو پھر اس کی عظمت نہ ہونے کا کیا سوال؟ اس سے محبت نہ ہونے کا کیا سوال؟ اس کا ادب نہ کرنے کا کیا سوال؟ ظاہر بات ہے کہ یہ چیزیں جاننے کا اثر ہیں، لازمہ ہیں، وہ اس کے اندر آنا ضروری ہے۔

جب تک معرفت و پہچان کا اثر نہیں پیدا ہوگا نہیں سمجھا جائے گا اور نہیں مانا جائے گا نہیں قبول کیا جائے گا کہ اسکو اس چیز کی معرفت حاصل ہے، ہوسکتا ہے کہ لغت و ڈکشنری کے معنی کے لحاظ سے حاصل ہوگئی ہو،مگر شریعت میں اس کو معرفت حاصل نہیں ہوئی۔

بالکل اسی طریقہ پر بھائیو! اللہ کی معرفت یعنی اللہ کے اوصاف اور کمالات اور اللہ کی خصوصیات کو جاننے و پہچاننے کا جو اثر ہونا چاہئے ، جب تک وہ اثر ہمارے اندر نہیں پیدا ہوگا، یہی سمجھا جائے گا کہ اللہ کی معرفت نصیب نہیں ہے۔اور جب اس معرفت کے آثار پیدا ہو جائیں تو سمجھا جائے گا کہ معرفت حاصل ہوگئی ۔اس لئے یوں کہا جا سکتا ہے کہ معرفت کا علم آثار معرفت ہی سے ہوتا ہے۔

اللہ کی معرفت کا پہلا اثر محبت ہے

اب آیئے یہ دیکھیں کہ معرفت الٰہی کے آثار کیا کیا ہیں؟ اللہ کی معرفت کا ایک اہم ترین اثر اللہ کی محبت ہے اور یہ قلب کی عبادت ہے، دل میں اللہ کی محبت آئے گی تو دل اللہ کا عبادت گذار بنے گا، اور جب دل کے اندر دنیا اور دنیا والوں کی محبت ہوگی تو دل گنہگار ہو جائے گا۔

قرآن کریم میں اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴾(التوبۃ:۲۴)

(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے ماں باپ، تمہاری اولاد، تمہارے بھائی بہن، بیویاں، رشتہ دار، تمہارے مال جو تم کماتے ہو، تجارت جس کے خسارے کا تم کو خطرہ لگا رہتا ہے، تمہارے مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو، یہ سب اگر تم کو اللہ ورسول اور اللہ کے راستے میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ کا حکم یعنی عذاب آجائے، اور اللہ حد سے گزر جانے والوں کو ہدایت نہیں دیتے)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ ان لوگوں سے محبت نہ رکھو، اور تم ماں باپ سے محبت نہیں کر سکتے، بیوی سے محبت نہیں کر سکتے، جائیداد واملاک سے محبت نہیں رکھ سکتے، بلکہ یہ فرمایا کہ ان سے اللہ ورسول سے زیادہ محبت نہیں رکھ سکتے۔ ہاں والدین سے بھی محبت چاہئے، بیوی سے بھی محبت چاہئے، اگر والدین سے محبت نہ ہوگی تو والدین کا حق کیسے ادا ہوگا، ان کا ادب کیسے کریں گے۔ سب سے محبت ہو، لیکن وہ محبت کمزور ہو اور اللہ ورسول کی محبت غالب ہو۔

معلوم یہ ہوا کہ ساری چیزوں کی محبت کمزور ہونی چاہئے، اللہ اور رسول کی محبت غالب ہونا چاہئے۔ یہ معرفت کا اثر ہے، جب بندہ اللہ کو پہچان لے گا اور یہ بھی پہچان لے گا کہ ماں باپ کو بنانے والا بھی وہی، میری بیوی کو بنانے والا بھی وہی، میرے بھائی بہنوں کو پیدا کرنے والا بھی وہی، جائیداد املاک کو پیدا کر کے مجھ تک

پہونچا کر میرے لیے راحت کا سامان کرنے والا بھی وہی، تو اللہ کی محبت ضرور آئے گی، اس لیے جب معرفت آئے گی تو اللہ کی محبت ضرور آئے گی۔

معرفت سے ہی محبت پیدا ہوتی ہے، امام رَبِیْعَۃُ الرَّ ائے کا واقعہ

یاد رکھئے کہ جب تک انسان کو اللہ کی پہچان نہ ہو، اس کے دل میں اللہ کی محبت پیدا نہیں ہوسکتی، بہت زمانہ پہلے یعنی بنو امیہ کے دور کا واقعہ ہے، جب کہ امام مالک ابھی طالب علمی کی زندگی گذار رہے تھے، ان کے ایک استاذ تھے، جن کا نام رَبِیْعَۃُ الرَّ ائے تھا، بہت بڑے عالم تھے، آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ امام مالک کے استاذ کیسے ہوں گے؟ بہت بڑے جلیل القدر فقیہ بھی تھے اور محدث بھی تھے، اور اللہ والے بزرگ بھی تھے، ان کے والد کا نام فروخ تھا۔

جب امام ربیعۃ الرائے ماں کے پیٹ میں تھے تو ان کے والد فروخ خراسان کی جانب جہاد کی مہم پر امیر المومنین کے حکم سے نکل گئے، جب جہاد میں جانے کے لیے نکلے تو چوں کہ ان کو معلوم نہیں تھا کہ کب واپسی ہوگی اور کیا حالات ہوں گے کہ زندہ بھی آؤں گا یا اللہ کی راہ میں شہید ہوجاؤں گا؟ اس لئے ان کے پاس جو ۳۰ / ہزار دینار یا درہم تھے، انہوں نے اپنی بیوی کو دیا اور کہا کہ میں جہاد میں جارہا ہوں اور یہ تیس ہزار تمہارے حوالے ہیں، ضرورت کے مطابق اس میں سے خرچ کرتے رہنا، اگر اللہ تعالیٰ نے زندگی باقی رکھی اور واپسی ہوگئی تو پھر میں تم سے آکر حساب لے لوں گا یہ کہہ کر نکل گئے۔

جو نکلے تو ایسے حالات ان کے اوپر آئے کہ تاریخ بغداد کے مطابق تقریباً اس واقعہ کے ستائیس برس بعد ان کو لوٹنا نصیب ہوا، لمبے چوڑے عرصے کے بعد واپسی ہوئی۔ مدینہ ان کی بستی تھی اور اپنی بیوی کو مدینہ میں ہی چھوڑ کر گئے تھے، جب

واپس مدینہ آئے تو دیکھا کہ وہاں کی پوری فضا بدلی ہوئی ہے، نئی نئی سڑکیں بن گئی ہیں، نئی نئی عمارتیں بن گئی ہیں، خیر آئے اور بہت غور وفکر کے بعد اپنی گلی وغیرہ کو پہچانا اور اپنے گھر پہنچے اور جب پہونچے تو وہ رات کا وقت تھا، اپنے گھوڑے کو ایک طرف باندھا اور نیزے سے دروازہ کھولا، اور دروازے کے اندر گھسنے لگے۔

تو ایک صاحب باہر آرہے تھے، دونوں میں ملاقات ہوئی، جب انہوں نے دیکھا کہ یہ اندر گھس رہے ہیں تو ان کوٹوکا اور کہا کہ ارے اللہ کے دشمن! کسی کے گھر میں بلا اجازت جانا جائز نہیں ہے، تو فروخ نے کہا: یہ کسی کا گھر نہیں ہے، یہ تو میرا گھر ہے، میرے گھر میں کس سے اجازت لوں؟ اب دونوں میں تو تو میں میں ہونے لگی، وہ کہتے ہیں یہ میرا گھر ہے اور وہ کہتے ہیں تم گھس نہیں سکتے، یہ تو میرا گھر ہے، دونوں میں جو گفتگو ہوئی تو پڑوسی لوگ جمع ہو گئے، ربیعہ کہنے لگے کہ میں ان کو سلطان کے پاس فیصلہ کے لئے لے جاؤں گا اور فروخ نے کہا کہ ہاں میں بھی تم کو بادشاہ کے پاس لے جاؤں گا، یہ سب باتیں ہو رہی تھیں کہ ان کی بیوی نے اندر سے سنا اور آکر دیکھا کہ کیا ہو رہا ہے؟

جو دیکھا تو تماشا یہ نظر آیا کہ دونوں باپ بیٹے دست وگریبان ہیں، ان کو بڑا تعجب ہوا، اور انہوں نے کہا کہ یہ معرفت نہ ہونے کی وجہ سے جھگڑا ہو رہا ہے، پہچان نہیں ہے، باپ نے بیٹے کو پہچانا اور نہ بیٹے نے باپ کو پہچانا۔ بیوی نے کہا کہ تم دونوں آپس میں کیا کر رہے ہو؟ بیٹے سے کہا: بیٹا ربیعہ! یہ تو تمہارے باپ ہیں، ملاقات کرو اور ان سے کہا فروخ یہ تمہارے بیٹے ہیں، ان سے ملاقات کرو۔ جب ماں نے پہچان کرائی تو پھر دونوں نے معافی چاہی اور روتے ہوئے آپس میں گلے ملنے لگے۔ (تاریخ بغداد: ۴۲۲/۸)

میں نے یہ مثال اس لیے دی تھی کہ جب دونوں میں پہچان نہیں تھی تو لب و لہجے میں فرق، اور انداز ایسا، اور جب بیٹے کو معلوم ہوا کہ یہ میرے ابا جی ہیں اور باپ کو معلوم ہوا کہ یہ میرا بیٹا ہے تو پھر گلے مل رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ معرفت و پہچان اتنی بڑی چیز ہے کہ جب پہچان ہوتی ہے تو دل میں محبت آتی ہے اور پہچان نہیں ہوتی تو دل میں محبت نہیں ہوتی۔ اس لیے جب انسان اللہ کی پہچان اپنے اندر پیدا کرتا ہے تو اس کے دل کے اندر اللہ کی محبت آجاتی ہے۔

معرفت کا ایک اثر خوف الٰہی ہے

معرفت کا ایک اثر خوف الٰہی ہے، کہ آدمی اللہ کی جلالت وعظمت کی وجہ سے اللہ سے خوف کھائے اور ڈرے۔ خوفِ خداوندی معرفت الٰہی کے اثرات میں سے بہت بڑا اثر ہے، جس میں اللہ کی معرفت ہوگی وہ اللہ کا خوف اور خشیت بھی رکھے گا اور جس کے دل میں خوف الٰہی نہ ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دل میں معرفت الٰہی بھی نہیں ہے۔

اللہ کا خوف دو وجہ سے ہوتا ہے، ایک وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے میرے گناہوں کی وجہ سے عذاب دیں گے، اس وجہ سے اللہ سے ڈر رہا ہے، یہ تھرڈ کلاس ڈر ہے، اور فسٹ کلاس ڈر یہ ہے کہ اس لیے ڈر رہا ہے کہ اللہ کی عظمت وجلالت اس کے دل میں ہے کہ اللہ کیسی عظیم و بھاری ذات ہے، کتنی قدرت والی ذات ہے، اس اللہ کی عظمت و کبرائی کے پیش نظر وہ اللہ سے ڈرتا ہے۔

دونوں بھی درست ہیں لیکن ان میں اعلیٰ وادنی کا فرق ہے۔ اللہ کی عظمت وجلالت کے پیش نظر ہمارے دلوں میں خوف خدا پیدا ہوجائے، اور یہ کب پیدا

ہوگا؟ جب اللہ کی معرفت ہوگی۔ جیسے ایک شخص باپ کی عظمت کو جانتا ہے تو اس کا خوف وڈر اس کے دل میں پیدا ہوجاتا ہے۔ باپ سے نہ ڈرنے والے دراصل باپ کی عظمت وجلالت سے واقف ہی نہیں ہوتے؛ اس لئے وہ باپ کی توہین کرتے اور اس سے بے خوف ہوتے ہیں۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلالت کا مشاہدہ ہوجائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ کا ڈر نہ پیدا ہو۔ جب یہ معلوم ہو کہ اللہ کی ذات وہ ہے جس کے بارے میں خود اس نے کہا ہے کہ: ﴿يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ وَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ﴾ (کہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو ارادہ کرتا ہے اس کا فیصلہ کرتا ہے) اس کی عظیم ہستی کے سامنے کسی نبی یا ولی یا فرشتہ کو لب کشائی کی مجال نہیں۔ اس کے سامنے کسی کی سفارش کرنا بھی اس کے اذن وحکم کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ ان سب امور کی معرفت سے ضرور اللہ کا خوف پیدا ہوگا۔

خوف الٰہی بھی معرفت کا نتیجہ ہے، ایک واقعہ

اس سے معلوم ہوا کہ خوف بھی معرفت و پہچان کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے، اگر معرفت و پہچان نہ ہو تو خوف نہیں آسکتا، جب پہچان ہوگی تو خوف آجائے گا۔

امام جلال الدین رومیؒ نے لکھا ہے کہ ایک آدمی سفر پر نکلا، جنگل میں چلتا رہا، جنگل میں بہت دور چلنے کے بعد اسے تھکان ہوئی اور تھکان کی وجہ سے نیند غالب ہوگئی، اس نے سوچا کہ کہیں آرام کرلوں لیکن آرام کرنے اس لیے ہمت نہیں ہوئی کہ جنگل کا راستہ ہے اور جنگل کے راستہ میں کیسے آرام کروں؟ سوچتا رہا کہ کوئی چیز مجھے ایسی مل جائے جس کی وجہ سے مجھے کچھ سہارا مل جائے تو میں آرام کرلوں، بہت آگے جانے کے بعد دیکھا کہ ایک جانور سویا ہوا ہے، اس نے کہا کہ بہت اچھا،

یہ کوئی جانور سو رہا ہے، میں بھی اس کے بازو سو جاؤں۔

چنانچہ جانور کے بازو وہ بھی جا کر لیٹ گیا، نیند کا اتنا غلبہ تھا، تھکان ایسی تھی کہ بس پڑتے ہی نیند لگ گئی، کچھ دیر بعد اسی راستے سے ایک دو آدمی آرہے تھے، پیچھے سے آتے آتے جب وہ وہاں پہنچے تو ایک عجیب منظر انہوں نے دیکھا کہ ایک انسان سویا ہوا ہے اور اس کے بازو جو جانور سویا ہوا ہے، وہ حقیقت میں شیر ہے، یہ لوگ بہت پریشان ہوئے کہ کہیں یہ شیر جاگے اور اس بیچارے کو کھا جائے۔ انہوں نے آہستہ سے سونے والے کو آواز دی اور جگایا، جب وہ جاگا تو ان لوگوں نے اس سے کہا کہ کہاں سوئے ہو؟ وہ تمہارے بازو شیر ہے شیر۔ بس جناب اتنا سنتے ہی وہ گھبرایا پریشان ہوا اور ڈر کے مارے اس کی جان نکل گئی اور مر گیا۔

دیکھئے جب تک اسے شیر کی معرفت و پہچان نہیں تھی تو اس پر شیر کا خوف بھی پیدا نہیں ہوا، جیسے ہی شیر کی معرفت حاصل ہوئی تو اس کا خوف بھی پیدا ہوا اور وہ مر گیا۔ اسی طرح جب اللہ کی پہچان انسان کو ہو جاتی ہے کہ اللہ کتنا بڑا اور زبردست ہے، کتنی بڑی طاقت والا ہے، وہ کیا سے کیا کر سکتا ہے،؟ جب یہ پہچان اللہ کی انسان کو ہوگی تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کے دل کے اندر کوئی ہلچل نہ مچے اور اس کی وجہ سے اس کے دل میں اللہ کا خوف پیدا نہ ہو۔

نبی ﷺ کا خوف

دیکھئے رسول اللہ ﷺ اور اولیاء اللہ کو معرفت حاصل تھی تو وہ حضرات اللہ کا ڈر و خوف بھی رکھتے تھے۔ حدیث میں ہے، ایک صحابی کہتے ہیں کہ میں آپ ﷺ کی خدمت میں آیا تو دیکھا کہ:" وھو یصلی ولصدرہ أزیز کأزیز المرجل" (رسول اللہ ﷺ جب نماز پڑھ رہے تھے اور آپ کے سینہ سے ایک آواز نکل رہی تھی

جیسے ہانڈی پکنے کی آواز ہوتی ہے)(ابوداود:۹۰۴،احمد:۱۶۳۵۵،شرح السنۃ:۳/۲۴۵، نسائی:۱۲۱۴)

حضرت عبید بن عمیر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا سے عرض کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی کوئی عجیب بات سنایئے جو آپ نے دیکھی ہو، حضرت عائشہ کچھ دیر خاموش رہیں، پھر کہا کہ ایک بار اللہ کے نبی میرے پاس رات میں لیٹے ہوئے تھے، آپ نے کہا کہ یا عائشہ! چھوڑ کہ میں آج رات اللہ کی عبادت کروں، حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں تو آپ کا قرب چاہتی ہوں، اور یہ بھی کہ جو آپ کو پسند ہو۔ پھر آپ اٹھے اور وضو کیا اور نماز پڑھنے لگے اور برابر روتے رہے، یہاں تک کہ آپ کی ڈاڑھی مبارک اور زمین تر ہوگئی۔ پھر حضرت بلال آپ کو نماز فجر کیلئے بلانے آئے اور جب دیکھا کہ آپ رو رہے ہیں تو عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ کیوں روتے ہیں جبکہ اللہ نے آپ کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف کردئے ہیں تو فرمایا کہ کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔(صحیح ابن حبان:۲/۳۸۶،مشکل الآثار للطحاوی:۱۰/۲۳۶،موارد الظمآن :۱/۱۴۳)

صحابہ کا خوف

اسی طرح حضرات صحابہ بھی عارفین تھے تو ان کو بھی خوف خدا حاصل تھا۔ بخاری وغیرہ میں حضرات صحابہ کے بارے میں آیا ہے کہ ایک بار اللہ کے نبی ﷺ نے خطبہ دیا، حضرت انس کہتے ہیں کہ میں نے کبھی ایسا خطبہ نہیں سنا، آپ نے اس میں فرمایا کہ :" لو تعلمون ما أعلم لضحكتم قليلا و لبكيتم كثيرا"(اگر تم ان باتوں کو جان لو جو میں جانتا ہوں تو تم بہت کم ہنستے اور زیادہ روتے) یہ سن کر

حضرات صحابہ سب کے سب رونے لگے۔ایک روایت میں ہے کہ صحابہ نے اپنے سروں کوڈھانپ لیااوررونے لگے۔(بخاری:۴۶۲۱)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے سورۂ مطففین نماز میں پڑھی اورآیت:''یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' (جس دن کہ لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے) تک پہنچےتو روتے رہے یہاں تک کہ بے ہوش کرگر پڑے۔(صفۃ الصفوۃ:۱/۲۰۳)

اولیاءاللہ کا خوف

حضرات اولیاءاللہ کا خوف بھی دیکھئے،ایک بڑے بزرگ حضرت منصور بن عمارگزرے ہیں،امام ابن الجوزی نے ان سے ایک اللہ والے کا قصہ ذکر کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں رات میں باہر نکلا،ابھی رات کا ایک حصہ باقی تھا، میں کسی کے ایک چھوٹے سے دروازے کے پاس بیٹھ گیا تو وہاں ایک نوجوان کی آواز آرہی تھی جورورہا تھا،اوراللہ سے یوں کہتا جارہا تھا کہ اے اللہ! تیری عزت وجلالت کی قسم،میں گناہ کرکے تیری مخالفت کرنانہیں چاہا،اور جب میں نے تیری نافرمانی کی ہے،تو میں تیری سزا سے لاعلم نہیں تھا،اور نہ تیری نظر سے غائب تھا، لیکن میرے نفس نے مجھے چکماودھوکہ دیااور مجھ پر بدبختی غالب آ گئی،اور میرے گناہوں پر پڑے ہوئے تیرے پردے نے مجھےمغرورکردیا،اوراب مجھے تیرے عذاب سے کون بچائے گا اوراگر تیری رسی سے میں کٹ جاؤ ں گا تو کس کی رسی کو تھاموں گا،ہائے میں کتنی دفعہ توبہ کروں اور کتنی دفعہ پھر گناہوں کی طرف جاؤں؟ اب وقت آ گیا کہ میں میرے رب سے شرماؤں۔حضرت منصور بن عمار کہتے ہیں کہ میں نے یہ سن کرزور سے یہ آیت پڑھ دی:

﴿ يَآَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قُوْا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلائِكَةٌ غِلاَظٌ شِدَادٌ الخ ﴾[التحریم:٦]

(اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، جس کا ایندھن انسان و پتھر ہیں، جس پر سخت گیر وتند خو فرشتے مقرر ہیں)

کہتے ہیں کہ پھر میں نے ایک اضطراب و پریشانی کی آواز محسوس کی، اور اپنے کام سے چلا گیا، صبح کو جب واپس ہوا تو دیکھا کہ اسی گھر پر ایک جنازہ رکھا ہوا ہے اور ایک بوڑھی عورت وہاں آجارہی ہے، میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کس کا جنازہ ہے تو کہنے لگی کہ میرے غم کو تازہ مت کرو، میں نے کہا کہ میں مسافر ہوں اس لئے پوچھ رہا ہوں تو کہنے لگی کہ یہ میرا بیٹا ہے، رات کسی نے ایک آیت پڑھ دی تھی جس میں جہنم کا ذکر تھا، اس کو سن کر میرا بیٹا بے قرار ہو گیا اور روتا رہا، یہاں تک کہ مر گیا۔ حضرت منصور کہتے ہیں کہ یہی ان حضرات کی صفت ہوتی ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔(التبصرہ: علامہ ابن الجوازی:۱۷)

تو دیکھئے یہ مثالیں میں نے دی کہ معرفت سے محبت بھی پیدا ہوتی ہے اور خوف بھی، دونوں جگہ جو مشترک مضمون ہے، وہ کیا ہے؟ ''پہچان''، پہچان ہوئی تو محبت آئی، پہچان ہوئی تو خوف آیا، پہچان نہیں تو محبت بھی نہیں، خوف بھی نہیں، اسی لیے عام طور پر اللہ کی محبت اور اللہ کا خوف نہیں ہوتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ صحیح معنوں میں اللہ کی پہچان نہیں، صحیح معنوں میں اللہ کی پہچان ہو تو ضرور انشاء اللہ یہ دونوں چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔

معرفت کا ایک اثر عبدیت و بندگی ہے؟

جب اللہ کی معرفت بندے کو نصیب ہوتی ہے تو بندے پر معرفت کا ایک اثر یہ

ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عبدیت و عجز کا حامل ہوجاتا ہے، اور اسی سے پھر اللہ تعالی کی عبادت کثرت سے کرتا ہے، اس عبدیت وعبادت کے اثر سے پہچانا جائے گا کہ معرفت حاصل ہے یا نہیں، اس لئے کہ ہمارے اور آپ کے لئے نمونہ اور اسوہ آپ ﷺ کی ذات اقدس ہے، آپ اللہ تعالی کے سب سے بڑے عارف تھے، اور سب سے زیادہ عبدیت بھی آپ میں تھی اور عبادت بھی آپ سب سے زیادہ کرنے والے تھے۔اتنی عبادت کرتے تھے کہ پاؤں میں ورم آجاتا تھا، صحابہ کو ترس آجاتا تھا، پوچھتے یارسول اللہ! آپ تو بخشے بخشائے ہیں، اس قدر عبادت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔آپ فرماتے: ''أفلا اکون عبدا شکورا'' (کیا میں اللہ کا شکرگذار بندہ نہ بنوں) (بخاری:۱/۱۵۲، مسلم:۲/۳۷۷)

اسی طرح تمام صحابہ اور اولیاء اللہ نے بھی اللہ کو پہچانا، جس کا اثر ان پر یہ ہوا کہ وہ کثرت سے عبادت انجام دیتے تھے۔معلوم ہوا کہ معرفت کا ایک اثر عبادت ہے۔لہذا جو بغیر عبادت کئے معرفت کا دعوی کرے وہ جھوٹا ہے۔

عبادت کیا ہے؟

عبادت کیا ہے؟ عبادت کسے کہتے ہیں؟ اللہ کا جو بھی حکم بندے کو جہاں بھی آئے، جس وقت بھی آئے اسے انجام دینا عبادت ہے، عبادت دراصل انتہائی خضوع اور انتہائی ذلت کے اختیار کرنے کا نام ہے، اللہ کی بڑائی، اللہ کی جلالت، اللہ کی عظمت کے سامنے بندہ اپنے آپ کو ذلیل کردے تو اس کا نام عبادت ہے، پھر عبادت دو قسم کی ہوتی ہے۔ایک قلبی عبادت اور ایک جسمانی عبادت، جسم سے بھی عبادت ہوتی ہے اور قلب سے بھی عبادت ہوتی ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے، ہم نماز پڑھتے ہیں، جسم حرکت میں آتا ہے کہ آدمی

ہاتھ اٹھاتا ہے، اللہ کے سامنے عاجزانہ باندھ لیتا ہے اور پھر اللہ کی ستائش کرنے لگتا ہے، پھر اس کے سامنے جھک جاتا ہے، جسے رکوع کہتے ہیں، پھر مزید اور جھکتے ہوئے اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ یہ جو عبادت ہو رہی ہے جسم کی عبادت ہے اور پھر ایک عبادت اسی عبادت کے اندر ہے، وہ ہے خشوع اور خضوع اور اخلاص، اب یہ جو اندرونی عبادت ہوتی ہے وہ بھی دراصل اسی کا جز ہے، اور وہ قلبی عبادت ہے، اور دونوں ضروری ہیں۔

اگر ایک آدمی صرف اٹھ رہا ہو، رکوع و سجدہ میں جھک رہا ہو، لیکن قلب کے اندر وہ خشوع نہ ہو، خضوع نہ ہو، اللہ سے محبت نہ ہو، تعلق نہ ہو تو وہ عبادت نہیں، بلکہ صرف اٹھنا اور بیٹھنا ہے۔ جیسے بہت سارے لوگ نماز پڑھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے پہلوانی کر رہے ہیں، کسرت کر رہے ہیں، اٹھ رہے ہیں، بیٹھ رہے ہیں، جھپٹ رہے ہیں اور تیز تیز رکوع و سجدہ ہو رہا ہے، اور آزو بازو کے لوگوں کو ذرا اپنی قوت دکھاتے ہوئے مار بھی رہے ہیں۔ یہ کوئی عبادت ہے؟ عبادت تو عاجزی کا نام ہے، عبادت وہ ہے جس کے اندر انتہائی ذلت اور مسکنت بھری ہوئی ہو۔

ڈینگ مارنے والے معرفت سے خالی

اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اللہ والے کبھی اپنی بڑائی نہیں کرتے، وہ ڈینگیں نہیں مارتے، بلکہ وہ تو عاجزی و انکساری والے ہوتے ہیں۔ کسی شاعر نے بہت اچھی بات کہی ہے کہ:

تکمیل بشر نہیں ہے سلطاں ہونا
یا صف میں فرشتوں کے نمایاں ہونا
تکمیل بشر ہے عجز و بندگی کا احساس
انسان کی معراج ہے انساں ہونا

آج ایک طبقہ ولایت کا مدعی ایسا پیدا ہوگیا ہے کہ صرف ڈینگیں مارنا اس کا کام ہے، کبھی ولایت کا دعوی، کبھی کرامت کا دعوی، کبھی بزرگی کا دعوی، یہ سب باتیں اولیاء اللہ کی صفات سے دور ہیں۔ وہ عجز و بندگی کو ہی اپنا سرمایۂ افتخار سمجھتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی انکساری کا حال

اب ذرا یہ بھی دیکھئے کہ ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ کی عاجزی و انکساری کا کیا حال تھا؟ ایک بار آپ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص کو لایا گیا اور اس پر اس وقت آپ کے رعب کی وجہ سے کپکپی طاری ہوگئی، آپ نے اس کو دیکھا تو ایک عجیب انکساری و تواضع کا جملہ فرمایا، وہ یہ کہ: ''أنا ابن امرأة من قريش كانت تأكل القديد في هذه البطحاء'' (میں تو قریش کی ایک عورت کا لڑکا ہوں جو سوکھا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی) اور ایک روایت میں یوں ہے کہ اپنے اوپر آسانی کر، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں، ایک عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی۔ (مستدرک: ۱۵۸/۴، ابن ماجہ: ۳۳۱۲)

اللہ اکبر! کیا ٹھکانہ ہے اس عاجزی و انکساری کا! اور یہ درحقیقت اللہ جل شانہ کی عظمت و جلالت کی معرفت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کا بارگاہ الٰہی میں عجز و نیاز

اس عاجزی و انکساری پر آپ ﷺ کی ایک دعا کی طرف ذہن منتقل ہوگیا، جس میں آپ نے اللہ تعالی کے سامنے انتہائی و غایت درجہ کی تواضع و انکساری کا مظاہرہ کیا ہے، وہ دعاء یہ ہے:

''اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ تَسْمَعُ كَلاَمِي وَ تَرٰى مَكَانِي وَ تَعْلَمُ سِرِّي وَ

عَلانِيَتِيْ وَلَا يَخْفٰى عَلَيْکَ شَيْءٌ مِنْ أَمْرِيْ وَ أَنَا الْبَائِسُ الْفَقِيْرُ الْمُسْتَغِيْثُ الْمُسْتَجِيْرُ الْوَجِلُ الْمُشْفِقُ الْمُقِرُّ الْمُعْتَرِفُ بِذَنْبِيْ، أَسْئَلُکَ مَسْئَلَةَ الْمِسْکِيْنِ وَ أَبْتَهِلُ إِلَيْکَ ابْتِهَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِيْلِ وَ أَدْعُوْکَ دُعَاءَ الْخَائِفِ الضَّرِيْرِ مَنْ خَضَعَتْ لَکَ رَقَبَتُهٗ وَفَاضَتْ لَکَ عَيْنَاهُ وَ ذَلَّ جَسَدُهٗ وَ رَغِمَ أَنْفُهٗ لَکَ، اَللّٰهُمَّ لاَ تَجْعَلْنِيْ بِدُعَائِکَ شَقِيًّا وَّ كُنْ بِيْ رَءُ وْفًا رَّحِيْمًا يَا خَيْرَ الْمَسْئُوْلِيْنَ وَ يَا خَيْرَ الْمُعْطِيْنَ " (اے اللہ! بلا شبہ تو میری بات سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا ہے، اور میری پوشیدہ وظاہر ہر قسم کی بات کو جانتا ہے، اور تجھ پر میری کوئی بات مخفی نہیں، اور میں مصیبت زدہ ہوں، فقیر ہوں، فریادی ہوں، پناہ جو ہوں، ترساں و ہراساں ہوں، اپنے گناہوں کا معترف و اقراری مجرم ہوں، میں تجھ سے مسکین کی طرح سوال کرتا ہوں، اور تیرے سامنے ذلیل گناہ گار کی طرح گڑگڑاتا ہوں، اور تجھ سے خوف زدہ آفت رسیدہ کی طرح مانگتا ہوں، جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہوئی ہو، اور جس کے آنسو بہہ رہے ہوں، اور جس کا جسم تیرے سامنے عاجز ہو، اور جو تیرے سامنے اپنی ناک رگڑتا ہو، اے اللہ! تو مجھے دعا میں ناکام نہ فرما، اور مجھ پر تو رحیم و کریم ہو جا، اے سوال کئے جانے والوں میں سب سے بہتر اور اے عطا کرنے والوں میں سب سے بہتر) (المعجم الکبیر طبرانی: ۱۱/۱۷۴، المعجم الصغیر: ۱۵/۲)

اس دعا کا ایک ایک لفظ جس فروتنی و عاجزی و مسکنت و تواضع و انکساری کا حامل ہے وہ بہت ہی واضح و ظاہر ہے۔ الغرض یہ عجز و انکساری بھی معرفت خداوندی کا ایک اثر ہے۔

اللہ کی معرفت کا ایک اثر توکل علی اللہ ہے

جب بندے کو اللہ کی پہچان ہوتی ہے تو پہچان کے نتیجہ میں وہ اللہ پر اعتماد ضرور کرے گا، اللہ پر بھروسہ ضرور کرے گا، جن لوگوں کو اللہ پر بھروسہ نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ ان کو خدا کی پہچان نہیں ہے۔ کیسے؟ اس لیے کہ جب وہ اللہ کو پہچانے گا تو اللہ کی صفات کی حقیقت سامنے آئے گی کہ میرا اللہ وہ اللہ ہے جو میرے لیے ہر چیز میں بھلائی چاہتا ہے، میرے لیے کوئی مصیبت نہیں چاہتا، میرے لیے کوئی پریشانی نہیں چاہتا، میرے لیے اچھائی اور بھلائی ہی چاہتا ہے، برائی نہیں چاہتا، جو کچھ بھی وہ کرتا ہے ہماری بھلائی کے لئے کرتا ہے۔ تو جب وہ کھلے طور پر یہ دیکھتا ہے تو اس کا دل کہتا ہے کہ اس کے اوپر مجھے کلی اعتماد کرنا ہے کہ جو کرتا ہے صحیح کرتا ہے۔

حضرت علی کا ایمان افروز واقعہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک ایمان افروز ارشاد و واقعہ ملاحظہ کیجئے، وہ یہ کہ مسافر بن عوف بن الاحمر نے ایک بار جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اہل نھروان سے جہاد کے لئے نکلنا چاہتے تھے، کہا کہ آپ اس وقت نہ جائیں اور دن کے تین گھنٹے گزرنے کے بعد جائیں، حضرت علی نے پوچھا کہ کیوں؟ اس نے کہا کہ کیونکہ آپ اس گھڑی میں جائیں گے تو آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو بلاء وشدید نقصان پہنچے گا، اور اگر اس وقت میں جائیں جو میں نے بتایا ہے تو آپ کو کامیابی و غلبہ نصیب ہوگا۔ حضرت علی نے فرمایا کہ حضرت محمد ﷺ کا کوئی نجومی نہیں تھا اور نہ اب تک ہمارا کوئی نجومی ہے، کیا تو جانتا ہے کہ اس تیرے گھوڑے کے پیٹ میں کیا

ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں اگر میں حساب لگاؤں تو جان لوں گا، آپ نے کہا کہ جس نے تیری اس بات کی تصدیق کی اس نے قرآن کی تکذیب کی، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو یہ کہتے ہیں کہ ﴿إِنَّ اللّٰهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ﴾ (اللہ ہی پاس قیامت کا علم ہے وہی بارش نازل کرتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ ماں کے رحم میں کیا ہے) حضرت محمد ﷺ نے کبھی اس چیز کے جاننے کا دعویٰ نہیں کیا جس کا تو نے دعویٰ کیا ہے، کیا تو گمان کرتا ہے تو اس گھڑی و وقت کو جانتا ہے جس میں سفر کرنے سے کوئی برائی لاحق ہوگی؟ اس نے کہا کہ ہاں! آپ نے فرمایا کہ جس نے تیری اس بات کی تصدیق کی وہ گویا برائی کے پہنچانے کے بارے میں اللہ سے مستغنی ہوگیا اور اس کو مناسب ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر تجھے ہی اپنے معاملہ کا متولی بنادے، کیونکہ تو گمان کرتا ہے کہ تو اس کو اس گھڑی کی جانب ہدایت کرسکتا ہے جس میں سفر کرنے سے وہ برائی سے نجات پا جائے گا، پس جس نے اس بات کو سچ سمجھا مجھے اس پر اندیشہ ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ شرک کرنے والے کی طرح ہے۔

پھر آپ نے فرمایا کہ اے اللہ! کوئی فال نہیں ہے مگر تیرا فال اور کوئی خیر نہیں ہے مگر تیرا خیر، پھر اس شخص سے فرمایا کہ ہم تیری تکذیب و مخالفت کرتے ہیں اور اسی گھڑی میں سفر کرتے ہیں جس سے تو نے روکا ہے، پھر آپ نے لوگوں کو دیکھ کر فرمایا کہ اے لوگو! تم علم نجوم سے بچو، مگر وہ جس سے خشکی و سمندر کی اندھیریوں میں راستہ پاسکو، نجومی تو کافر ہے اور کافر جہنمی ہے۔ پھر اس شخص سے کہا کہ اللہ کی قسم! اگر مجھے یہ بات پہنچی کہ تو علم نجوم میں غور و فکر کرتا اور اس پر عمل کرتا ہے تو میں تجھے تیرے یا میرے رہنے تک حبس دوام میں رکھ دوں گا اور جتنا میرے بس میں ہے

اس قدر تجھ کو بخشش سے محروم کردوں گا۔

اس کے بعد آپ اسی وقت میں سفر پر نکلے جس میں نکلنے سے اس نے منع کیا تھا، اور اہل نھروان کے پاس آئے اور ان کو قتل کیا، پھر فرمایا کہ اگر ہم اُس وقت میں چلتے جس میں چلنے کا اس شخص نے حکم دیا تھا اور فتح وغلبہ پاتے تو کوئی کہنے والا یہ کہتا کہ یہ اسی وقت میں چلے تھے جس میں چلنے کا نجومی نے حکم دیا تھا۔ حضرت محمد ﷺ کا کوئی نجومی نہیں تھا اور نہ اب تک ہمارا کوئی نجومی ہے، مگر اللہ نے ہمارے لئے کسریٰ اور قیصر کے شہروں اور دیگر ممالک کو فتح کرادیا، پس تم اللہ پر توکل کرو اور اسی پر اعتماد کرو، کہ وہی اپنے ماسوا سے ہمارے لئے کافی ہے۔ (مسند الحارث: ۲/۶۰۱، کنز العمال: ۵/۲۳۵)

یہ ہے توکل علی اللہ، جو انسان کو معرفت خداوندی کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے، جس سے انسان یہ سمجھتا ہے کہ میرا پروردگار میرا کارساز حقیقی ہے، مجھے کسی فکر کی ضرورت نہیں۔

ایک شعر اور حضرت تھانوی کی اس میں اصلاح

یہاں مجھے ایک شاعر کا شعر یاد آ گیا، وہ کہتا ہے کہ:

کارساز ما بفکر کار ما　　فکر ما در کار ما آزار ما

(ہمارا کارساز حقیقی ہمارے کاموں کی فکر میں لگا ہوا ہے، لہذا ہمارے کاموں میں ہمارا فکر کرنا خود کو تکلیف پہنچانا ہے)

اس شعر میں شاعر نے اللہ کے لئے فکر کا لفظ استعمال کیا ہے، حالانکہ اللہ کو کسی فکر کی ضرورت نہیں، اس لئے حضرت حکیم الامت تھانوی نے فرمایا کہ یہ شاعر جاہل

ہے عارف نہیں، اس لئے اسے یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اللہ کے لئے کیا لفظ استعمال کرنا چاہئے، اور کیا نہ کرنا چاہئے؟ کیا اللہ تعالیٰ کو کسی کے کام بنانے کے لئے فکر کی ضرورت پڑتی ہے؟ نہیں، لہذا حضرت تھانوی نے فرمایا کہ میں اس شعر میں ذرا ترمیم کرتا ہوں، وہ ترمیم یہ ہے کہ:

کارساز ما بساز کار ما فکر ما در کار ما آزار ما

اب کیا مطلب ہوا؟ یہ مطلب ہوا کہ ہمارا کارساز حقیقی ہمارے کاموں کے بنانے میں لگا ہوا ہے، لہذا ہمارا خود کے کاموں کی فکر میں لگنا خود کو تکلیف دینا ہے۔

دیکھئے کہ حضرت تھانوی نے کس طرح ذرا سی تبدیلی سے اس شعر کو صحیح کر دیا اور اس کے مضمون کو اسلامی عقیدے سے ہم آہنگ کر دیا۔ الغرض معرفت کا یہ اثر ہے کہ اللہ پر اعتماد و توکل پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ جو بھی فیصلہ کرے، جو بھی کام کرے، سب عین حکمت و مصلحت ہے۔

اللہ ہر کام وقت پر کرتا ہے، ایک بزرگ کا واقعہ

ایک قصہ یاد آ گیا کہ ایک بزرگ جا رہے تھے، بہت سخت گرمی پڑ رہی تھی، یہ بڑی پریشانی کے ساتھ چل رہے تھے، اچانک بارش ہونے لگی، ٹھنڈے ٹھنڈے بارش کے قطرات جب ان کے جسم پر پڑے تو ان کی زبان پر بے ساختہ و بے اختیار ایک جملہ آ گیا، انہوں نے کہا کہ واہ! آج کیا وقت پر بارش ہوئی! اس پر فوراً اللہ کی طرف سے الہام ہوا، اور عتاب نازل ہوا کہ او بے ادب! کیا ہم نے کبھی بے وقت بھی بارش برسائی ہے؟ جو بھی کرتے ہیں وقت پر ہی تو کرتے ہیں، تجھے پیدا کیا تو وقت پر کیا، تجھے ماریں گے تو وقت پر ماریں گے، تجھے بخار دی تو وقت پر دیا، تجھے

صحت دی تو وقت پر دیا۔ کیا مطلب ہوا؟ کہ اللہ تعالیٰ پر جب اعتماد ہو کہ وہ سب کام حکمت ومصلحت کے مطابق کرتے ہیں تو اللہ پر توکل واعتماد کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔

معرفت کا ایک اثر رضا بالقضاء

اور اسی توکل واعتماد سے ایک اور اثر معرفت کا یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عارف باللہ، اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلہ پر راضی رہتا ہے۔ اس کو اسلام میں رضا بالقضاء کہتے ہیں۔ یہ بھی ایک اہم اثر وعلامت ہے معرفت الٰہیہ کا، اس کے بغیر تو ایمان بھی مکمل نہیں ہوتا، لہذا ضروری ہے کہ اللہ کے ہر فیصلہ پر مومن راضی رہے اور راضی رہنے کا مطلب یہ ہے کہ دل اللہ کے ہر فیصلہ پر مطمئن رہے کہ جو بھی اس نے کیا صحیح و درست کیا اور ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعاؤں میں بھی اللہ سے اس کا سوال کیا ہے۔ آپ نے ایک دعا میں فرمایا کہ: ’’ **أَللّٰهُم إني أَسئلک الرَّضا بالقضاء** ‘‘ (اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں رضا بالقضاء) (سنن النسائی: ۱۳۰۶، السنن الکبریٰ نسائی: ۳،۴۰، کنز العمال: ۳۶۱۱)

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اللہ پر اس کے فیصلوں میں اعتراض کرتے ہیں وہ درحقیقت معرفت الٰہیہ سے دور ہیں، اگر اللہ کی معرفت ان کو نصیب ہوتی اور وہ اللہ کی اس صفت سے واقف ہوتے کہ وہ حکیم ہے تو اعتراض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اللہ بہترین مربی ہیں

جبکہ قرآن میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کاملہ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ قرآن پاک کے شروع ہی میں ربوبیت کا ذکر ہے: ﴿ **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ**

رَبِّ الْعَالَمِیْن﴾ (تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو تمام عالموں کا پروردگار ہے، رب ہے) رب کے کیا معنی آتے ہیں؟ تربیت کرنے والا، ماں تربیت کرتی ہے، باپ تربیت کرتا ہے، استاذ اور پیرو شیخ بھی تربیت کرتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی تربیت بھی مجازی ہے اور ان کو مربی کہنا بھی مجازی اعتبار سے ہے ورنہ حقیقی مربی تو اللہ جل جلالہ وعم نوالہ ہیں، جو ساری کائنات کے ذرے ذرے کی تربیت کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ انسانوں کو کبھی مختلف قسم کی نعمتیں دے کر اور کبھی ان نعمتوں کو چھین کر اور کبھی بیماری دے کر اور کبھی اس کی جگہ شفا دے کر ان کی تربیت کرتا ہے، حوادثات، پریشانیاں، مصائب، اور مختلف قسم کے جھنجھوڑ کر رکھ دینے والے حالات و واقعات، یہ سب کچھ پیش آتے رہتے ہیں، یہ ساری کی ساری چیزیں دراصل اللہ کی ربوبیت وتربیت کے نتیجہ میں پیش آتی رہتی ہیں۔

بعض وقت بعض بیماریاں آجاتی ہیں تو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ مریض کو کھانا بالکل نہ دیا جائے، تو کیا آپ یہ حکم لگادیں گے کہ ڈاکٹر صاحب بڑے ظالم ہیں؟ ڈاکٹر کو ظالم کہتے ہیں یا رحیم کہتے ہیں؟ بلکہ سب رحیم ہی کہتے ہیں۔ بھائیو! کیوں؟ اس لئے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بات جو ڈاکٹر صاحب نے کہی یہ ان کے علم طب کا تقاضا ہے، اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کبھی ہمارا کھانا بند کردیتا ہے، فقر وفاقہ میں مبتلا کردیتا ہے، کبھی کسی اور بیماری وپریشانی میں مبتلا کردیتا ہے تو ہم اللہ کو کیوں رحیم نہ کہیں۔

ہم نہیں جانتے کہ ہمارے لئے کس میں بھلائی ہے، مگر اللہ جانتے ہیں کہ ہمارے لئے کیا مفید ہے، کیا غیر مفید ہے، اللہ ہی مصلحتوں کو جاننے والے ہیں، وہ حکیم ہیں، ان کا ہر کام کسی حکمت پر مبنی ہوتا ہے، کبھی وہ ہمیں دنیوی پریشانی دیکر

ہماری آخرت بنانا چاہتے ہیں۔جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشادفرمایا: "ما یصیبُ المسلمُ من نصب ولا وصب ولا هم ولا حزن ولا أذى ولا غم حتى الشوكة يشاكها إلا كفر الله بها من خطاياه"(مسلمان کوکوئی کانٹا لگے بیماری ہو جائے، یا کوئی پریشانی پہنچے، یا کوئی غم، یا کوئی تکلیف واذیت حتی کہ کوئی کانٹا چبھے تو اللہ اس سے اس کی خطاؤں کا کفارہ کردیتے ہیں)

(صحیح بخاری:۵۳۱۸،صحیح ابن حبان:۲۹۰۵،الادب المفرد: حدیث:۴۹۲)

اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اس سے ایک نیکی بھی لکھی جاتی ہے۔(مسلم: ۶۷۳۲،مسند احمد:۱۶۶۰۹)

یعنی تمہیں ایک کانٹا چبھتا ہے تو تمہارا ایک گناہ مٹایا جاتا ہے اور ایک نیکی لکھی جاتی ہے، ٹھوکر لگتی ہے، ایک گناہ مٹایا جاتا ہے اور ایک نیکی لکھی جاتی ہے ۔غرض جو بھی تکلیف دہ بات پیش آئے، اس پر ایک نیکی لکھی جاتی ہے، اور ایک ایک گناہ مٹایا جاتا ہے۔

ایک دوسری حدیث پاک میں آتا ہے، اللہ کے نبی ﷺ نے ارشادفرمایا کہ ایک رات کا بخار ایک سال کے گناہوں کو دھو دیتا ہے۔(مسند قضاعی:۶۱)

غور کریں کہ جسے ہم تکلیف سمجھتے ہیں، اس میں دراصل ہماری آخرت بن رہی ہے، کتنی بڑی نعمت ہے، اس لئے ہمیں چاہئے کہ اللہ کے ہر فیصلہ پر راضی رہیں، اسی کا نام رضا بالقضا ہے جو بہت بڑی دولت ہے، جس پر حدیث میں بڑی فضیلت بھی آئی ہے۔چنانچہ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشادفرمایا:

ذَاقَ طعْمَ الايْمان مَنْ رَضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْاِسْلاَمِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِياً وَرَسُوْلاً "(وہ آدمی ایمان کا مزا چکھ لیا جو اللہ سے رب ہونے کی حیثیت سے

راضی ہوگیا، اور اسلام سے دین ہونے کی حیثیت سے راضی ہوگیا اور محمد ﷺ سے نبی اور رسول ہونے کی حیثیت سے راضی ہوگیا) (مسلم: ۱/۴۷)

معلوم ہوا کہ معرفت کا ایک اثر رضا بالقضاء بھی ہے۔ یہ سارے آثار جس بندے پر ظاہر ہوں سمجھا جائے گا کہ اس کو اللہ کی معرفت حاصل ہے۔

اب دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی ہم تمام لوگوں کو اپنی معرفت کا ایک حصہ عطا فرمائیں اور اس کے ذریعہ محبت الہی اور خوف الہی وغیرہ آثار معرفت کی دولت سے بھی مالا مال فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

شیطانی حربے

باسمہ تعالیٰ

شیطانی حربے

أعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ، ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ﴾ (آل عمران:۱۴)

(خوشنما بنادی گئی ہے لوگوں کے لئے خواہشوں کی محبت یعنی عورتیں اور بیٹے، اور بڑے بھاری مال سونے کے اور چاندی کے، اور نشان لگائے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتیاں، یہ دنیاوالی زندگی کا فائدہ اٹھانا ہے، اور اللہ کے پاس ہے اچھا ٹھکانہ)

حضرات! ایک آیت آپ کے سامنے تلاوت کی گئی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ حب الشہوات'' یعنی دنیا کی جولذتیں اور خواہشیں اور انسان کے دل کو اپیل کرنے والی چیزیں ہیں، یہ انسان کے لیے مزین کردی گئی ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ''حب الشہوات'' کی تفسیر بیان کی کہ حب الشہوات سے مراد یہ دنیا کی مختلف چیزیں یعنی بیویاں ہیں، بچے ہیں، مال ہے، دولت ہے، سونا ہے، چاندی ہے، پیسہ ہے، یہ ساری چیزیں دنیا کی چیزیں ہیں۔ اللہ نے ان کا لقب رکھا ہے: ''الشہوات''،

اور فرمایا کہ ان خواہشات کی محبت انسان کے لیے مزین کر دی گئی ہے۔

لفظ ''زُیِّنَ'' استعمال کیوں فرمایا؟

یہاں ''زُیِّنَ'' کا لفظ یہ بتا رہا ہے کہ حقیقت میں دنیا کی یہ چیزیں ایسی نہیں ہے، جیسی نظر آتی ہیں، اگر حقیقت میں بھی ایسی ہوتیں تو پھر لفظ مزین لانے کی کوئی ضرورت ہی نہ ہوتی، کیونکہ جو چیز ہو کالی، اسے آپ کچھ رنگ روغن مسالہ لگا کر بنا دیں گوری، تب کہا جائے گا کہ مزین کر دیا گیا ہے، آج کل لوگ ملمع سازی کرتے ہیں، کوٹنگ کرتے ہیں، بہت ساری چیزوں کی کوٹنگ ہوتی ہے، لوہے کی کوٹنگ کی اور سونے کا پانی اس پر چڑھا دیا، دیکھنے میں ایسا لگ رہا ہے، جیسا کہ سونا ہوتا ہے، آج کل عورتوں کے زیورات بھی ایسے آنے لگے ہیں۔ آپ دیکھیں تو ایسے معلوم ہوں جیسے کہ یہ واقعی سونا ہیں، لیکن حقیقت میں یہ سونا نہیں ہے، بلکہ سو جانا ہے، کوئی طاقت نہیں ہے اس کے اندر، لیکن دیکھنے میں بالکل ایسا ہی لگے گا جیسے کہ سونا ہو، اسی طرح مختلف چیزوں پر رنگ و روغن مسالہ لگا کر اس کو مزین کر دیا جاتا ہے، ملمع سازی کرنے کے بعد دیکھنے میں چیزیں اچھی لگتی ہیں، حالانکہ حقیقت میں یہ چیزیں کچھ اور ہوتی ہیں۔

اسی طرح دنیا کی جو چیزیں آپ کو نظر آتی ہیں، چاہے وہ عورتیں ہوں، چاہے تمہاری اولاد ہو، چاہے مال ہو، دولت ہو، سونا ہو، چاندی ہو، یہ سب کی سب چیزیں جو تم کو بہت بھلی اور اچھی لگتی ہیں، پیاری لگتی ہیں، یہ دراصل سب کوٹنگ کی ہوئی چیزیں ہیں، مزین کر دی گئی ہیں، ان کی اصلیت وہ نہیں ہے جو نظر آ رہی ہے۔ اس جانب توجہ دلانے اور اشارہ کرنے کے لئے یہاں لفظ ''مزین'' لایا گیا۔

اگر ان چیزوں کی حقیقت انسان کے سامنے کھل جائے تو خدا کی قسم وہ اِن

چیزوں کو دیکھنا بھی گوارہ نہ کرے۔وہ کہے گا کہ یہ چیزیں دیکھنے کے قابل ہیں؟ دیکھنے کے بھی قابل نہیں ہیں، لیکن اس کے باوجود انسان چوں کہ مزین کردہ چیزوں سے متاثر ہوجاتا ہے، اس لیے ان چیزوں کے اوپر فریفتہ ہوتا رہتا ہے۔ سونا دیکھا منہ میں پانی آ گیا، چاندی دیکھا رال ٹپکنے لگی، روپیہ اور پیسہ سامنے آیا، دل اس کے اوپر رپچھنے لگا، اور مختلف قسم کی چیزیں دیکھیں، دل ان کے اوپر آ گیا۔ لیکن حقیقت میں یہ چیزیں اس قابل نہیں ہیں کہ ان سے دل لگایا جائے اور ان پر فریفتہ ہوا جائے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ دنیا کی چیزیں انسان کے لیے مزین کردی گئی ہیں۔آگے چل کر اللہ تعالیٰ نے خود ہی فرمادیا ہے: ﴿ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا﴾ (یہ تو دنیا کی چیزیں ہیں، دنیا کا ساز وسامان ہے) اور اصل چیز وہ تو اللہ تعالیٰ کے پاس میں رکھی ہوئی ہے جو حقیقت کے اعتبار سے بھی اچھی ہے اور بھلی ہے یہاں تو جو کچھ بھی نظر آتا ہے، یہ صرف دیکھنے میں اچھا معلوم ہوتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے سامنے بھی دنیا کو مزین کر کے پیش کیا گیا تھا

حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب معراج تشریف لے گئے تو اس موقعہ پر ایک واقعہ پیش آیا کہ نبی اکرم ﷺ کے سامنے ایک عورت آئی اور مزین تھی، اپنے آپ کو اس نے آراستہ پیراستہ کیا تھا، زیورات کے ساتھ اور مختلف زیب وزینت کی چیزوں کے ساتھ، نبی اکرم ﷺ کی طرف بڑھتی ہوئی آئی، اللہ کے نبی علیہ السلام نے چہرہ پھیرلیا، پھر دوبارہ بھی آئی، اللہ کے نبی علیہ السلام نے پھر چہرہ پھیرلیا، تیسری دفعہ بھی ایسا ہی ہوا۔جبرئیل امین علیہ السلام نے آگے بڑھنے کے بعد نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا، یارسول اللہ! آپ نے پہچانا کہ یہ عورت کون تھی؟ آپ

نے فرمایا کہ نہیں میں نے نہیں پہچانا، کون تھی یہ عورت؟ جبرئیل امین علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ عورت نہیں بلکہ دراصل دنیا تھی، اور یہ بوڑھی ہو چکی ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو آراستہ پیراستہ، مزین کرکے آپ کو بہکانے کے لیے آئی تھی۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ اس کی طرف نظر بھی نہیں فرمائی، اگر آپ خدانخواستہ اس عورت کو دیکھ لیتے تو آپ کی پوری امت ہلاک ہو جاتی۔ (تفسیر ابن کثیر: ۵/۳)

اس ناپاک دنیا کو اللہ کے نبی علیہ السلام نے دیکھا نہیں اور امت کا یہ حال ہے کہ وہ اس میں ملوث ہے۔ اور اگر اللہ کے نبی دیکھ لیتے تو پھر کیا ہوتا؟ اس سے اندازہ کیجئے کہ آج ہم لوگوں کے اندر کتنا قصور اور فتور پیدا ہو گیا ہے اور ایمانی اعتبار سے کس قدر کمزوری آ گئی ہے کہ ہمارے نبی علیہ السلام نے جس کو دیکھا تک نہیں، آج ہم اسی کے اندر پوری طرح ملوث ہو گئے ہیں، اسی مال کے لیے، پیسے کے لیے، اسی دنیا کے لیے، زیب و زینت کی چیزوں کے لیے، انسان اپنا سب کچھ خرچ کر دیتا ہے، اپنی جوانی لگا دیتا ہے، اپنی ساری طاقت گنوا دیتا ہے، اپنی آنکھوں کی طاقت، کانوں کی طاقت، دل کی طاقت، دماغ کی طاقت، سب اسی کے پیچھے لگایا ہوا ہے، بس ہر وقت اسی فکر میں ہے کہ کس طرح کماؤں، کس طرح جمع کروں، کس طرح کھاؤں، کس طرح گنواؤں؟ پھر اسی اُدھیڑ بن میں پوری زندگی گزر جاتی ہے، جب کہ یہ دنیا اس قابل تھی کہ اللہ کے نبی علیہ السلام نے جس طرح اس کے ساتھ برتاؤ کیا ہمیں بھی اسی طرح برتاؤ کرنا چاہئے تھا کہ ہم اس کی طرف نہ دیکھتے، منہ پھیر لیتے، لیکن اس کے تزین و ملمع کاری نے ہم لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے، اس لیے انسان دنیا کی چیزوں کی طرف لپکتا چلا جاتا ہے۔

''زُيِّنَ'' صیغۂ مجہول لانے کی عجیب حکمت

یہاں ایک اور بات سنتے چلئے، وہ یہ کہ اس آیت کریمہ میں ''زُيِّنَ'' کا جو لفظ آیا ہے، عربی پڑھنے والے جانتے ہیں کہ یہ مجہول کا صیغہ ہے، مجہول میں اصل فعل مجہول نہیں ہوتا، بلکہ فاعل مجہول یعنی نا معلوم ہوتا ہے۔ بظاہر تو کہتے ہیں فعل مجہول، حقیقت میں وہ فاعل مجہول ہے۔ فعل تو نظر آ رہا ہے، معلوم ہو رہا ہے، وہ مجہول کہاں ہے؟ وہ فعل تو یہاں بھی معلوم ہو گیا کہ وہ ''تزین و ملمع کاری'' ہے، تزئین ہے، زیب و زینت ہے۔ یہ تو خود ہی پتہ چل رہا ہے، جس چیز کا پتہ ہو وہ مجہول کہاں ہے وہ تو معروف ہے، ہاں یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ مزین کرنے والا کون ہے، اس کو مجہول رکھا گیا ہے۔ کیوں؟

اس کو سمجھنے سے پہلے ایک بات سمجھ لیں کہ قرآن کریم میں ''تزئین کاری'' کا ذکر اور جگہ بھی آیا ہے، اور بعض جگہ اس کا فاعل بھی بتایا گیا ہے، نیکی کے سلسلہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کو فاعل بتایا ہے، جیسے فرمایا کہ: ﴿ **وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ** ﴾ (اور لیکن اللہ نے ایمان کو تمہارے نزدیک محبوب بنایا اور اس کو تمہارے قلوب میں مزین کر دیا) اور برائی کے موقعہ پر شیطان کو اس کا فاعل کہا ہے، جیسے فرمایا کہ: ''**وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ** '' (اور یاد کرو جبکہ شیطان نے ان کے برے اعمال کو ان کے لئے مزین کیا)

مگر یہاں اس آیت میں اللہ تعالیٰ تزئین کاری کے فاعل کو مجہول کے صیغہ میں چھپا دیا، کیوں؟ اس کی وجہ بندے کے نزدیک یہ معلوم ہوتی ہے کہ دنیا اور دنیا کی چیزیں جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، یہ مطلقا نہ بری ہیں نہ مطلقا اچھی، بلکہ اگر ان کو خدا کے حکم و رسول کی تعلیم کے مطابق استعمال کیا جائے تو اچھی ہیں اور یہی چیزیں

آخرت کا وسیلہ بن جاتی ہیں، اور اگر ان چیزوں کا خدا کے حکم اور رسول کی تعلیم کے مطابق استعمال کیا جائے تو یہ بری اور وبال جان بن جاتی ہیں۔ لہذا ان چیزوں میں ایک پہلو بھلائی کا ہے، لہذا اس پہلو سے ان چیزوں کا مزین ہونا اللہ کی جانب منسوب ہوگا اور ایک پہلو ان میں برائی کا ہے، اور اس لحاظ سے ان کا مزین ہونا شیطان کی جانب منسوب ہوگا۔ اس لئے اللہ تعالی نے اس کام کے فاعل کو مجہول کر دیا، تا کہ دونوں پہلو کی جانب اشارہ ہو سکے۔

اس تقریر سے ایک بہت بڑی حقیقت سامنے آ گئی، وہ یہ کہ دنیا فی نفسہ نہ اچھی ہے نہ بری، بلکہ اگر اللہ کے حکم کے مطابق استعمال ہو تو اچھی ہے ورنہ بری ہے۔ ہاں عام طور پر چونکہ اس کا استعمال لوگ غلط طور پر کرتے ہیں، اور اس کے ذریعہ شیطان بہکاتا ہے اس لئے اس کو برا کہا جاتا ہے۔

عورت شیطان کا ایک حربہ

بہ ہر حال اب اس پر غور کیجئے کہ اللہ تعالی نے یہاں آیت کریمہ میں ''شہوات'' کی تفسیر میں جو چیزیں بیان کی ہیں ان میں سے ایک ''عورتیں'' ہیں، جن کو شیطان ملمع کاری کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ شیطان گمراہ کرنے کے لیے عورت کو اپنا ایجنٹ بناتا ہے۔ ایک بزرگ حسن بن صالح فرماتے ہیں کہ میں نے شیطان کو سنا کہ وہ عورت سے کہہ رہا تھا کہ:

'' أنتِ نصف جندي، أنتِ سهمي الذي أرمي به فلا أخطأ و أنتِ موضع سري، و أنتِ رسولي في حاجتي'' (تو میری آدھی فوج ہے، اور تو میرا وہ تیر ہے جس سے میں شکار کرتا ہوں، میں خطا نہیں کرتا اور تو میری راز دار اور حاجت کے وقت میری قاصد ہے) (مکائد الشیطان، ابن ابی الدنیا: ۵۹)

اورحدیث میں بھی یہ مضمون موجود ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: النساء حبائل الشیطان"(عورتیں شیطان کا شکار کا آلہ ہیں)(جامع الاصول: حدیث:۸۴۸۰)

عورت کے ذریعہ شیطان انسان کو پھانسنے کی، گمراہی میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہےاور بہت حدتک کامیاب ہوجاتا ہے، بڑے بڑے لوگ پھنس جاتے ہیں، کبھی ایمان کھودیتے ہیں، صرف لذت کی وجہ سے، خواہش کی وجہ سے، اور یہ چیز انسان کو کبھی اندھا بنادیتی ہے، کبھی بہرہ بنادیتی ہے، کبھی گونگا بنادیتی ہے۔ جیسے حدیث میں ہے کہ: "حُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِيْ وَيُصِمُّ "(کسی چیز کی محبت انسان کو اندھاو بہرابنادیتی ہے)(شعب الایمان:۱/۳٦۸)

اس لئے انسان بے سوچے سمجھے، اندھا بہرا ہوکر عورت پر فریفتہ ہوجاتا ہے، اس کوخود بھی اس کا عیب نظرنہیں آتا اور دوسرے اس کو سمجھائیں بتائیں تو وہ بہرا بن جاتا ہے۔

دنیا کی عورتوں اور جنت کی حوروں کا فرق

دنیا کی عورتوں کو شیطان ملمع کاری کے ذریعہ حسین دکھاتا ہے، جبکہ انسان کوغور کرنے سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ دنیا کی عورت میں کس قدر کھوٹ وعیب ہے۔ قرآن کریم نے اسی لئے دنیا کی عورتوں کے مقابلہ میں جنت کی حوروں کا تذکرہ کرکے ان کے فرق کو بتایا ہے۔ تاکہ شیطان کی ملمع سازی اور تزیین کاری کو پہچانا جائے۔

اس سلسلہ میں غوروفکر کے لئے قرآن کریم میں بعض جگہ اشارات دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالی نے بعض جگہ جنت کے ذکر میں فرمایا:

﴿لَهُمْ فِيْهَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾[البقرۃ:۲۵،النساء:۵۷]

یعنی جنت میں جنتیوں کو جو بیویاں حوریں ملیں گی وہ مطہر یعنی پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ پاکیزہ بیویاں، جن کے اندر نجاست نہیں، گندگی کا نام ونشان نہیں، بالکل پاک وصاف۔

یہ طہارت دو قسم کی ہے۔ ایک ظاہری طہارت اور ایک باطنی طہارت۔ ظاہری طہارت کیا؟ پاخانہ نہیں ہوگا، پیشاب ان سے نہیں نکلے گا، پسینہ نہیں نکلے گا، اسی طرح اور جو مختلف قسم کے فضلات انسان کے جسم سے نکلتے ہیں جو کبھی نفرت کا باعث بنتے ہیں، ان ساری چیزوں سے جنت کی حوریں پاک ہوں گی اور باطنی اعتبار سے مطہرہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دل کے اعتبار سے بھی بہت پاکیزہ ہوں گی، اخلاق کے اعتبار سے بھی بہت پاکیزہ ہوں گی، ان کے اندر کوئی عیب نہ ہوگا۔ یہ اس کا مطلب ہے۔

سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر اتنا بھی فرما دیے ہوتے: ﴿فِيْهَا اَزْوَاجٌ﴾ (جنت میں بیویاں ملیں گی) تو بات کافی ہوجاتی لیکن ''مطہرۃ'' کہہ کر بتانا یہ چاہتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے غور کرو کہ دنیا کی عورتوں کا کیا حال ہے؟ آدمی عورت کو بہت پسند کرتا ہے، حالانکہ اسے پاخانہ بھی لگتا ہے؟ اس سے پیشاب بھی نکلتا ہے، ماہواری خون بھی جاری ہوتا ہے، اور گندگیاں بھی ہوتی ہیں، اور غسل نہ کرے تو بدن کے اندر بدبو پیدا ہوجاتی ہے، منہ اگر نہ دھوئے تو منہ کے اندر بدبو پیدا ہوجاتی ہے، گویا ساری گندگیوں کا مرکز اور معدن بن جاتی ہے۔ یہ ہے دنیا کی عورت کا حال جس پر تم فریفتہ ہوتے ہو۔

اور رہی اخلاق اور کردار کے اعتبار سے تو وہ معلوم ہی ہے، اسے تو کہنے کی

ضرورت ہی نہیں ہے کہ یہاں کی عورتوں کا کیا حال ہوتا ہے، بداخلاقی ، بدزبانی ، ناشکری، ان کے اندر عیوب ہی عیوب ہوتے ہیں۔

تو دیکھئے بظاہر عورت دیکھنے میں اچھی لگتی ہے، انسان اس کی طرف مائل ہوجاتا ہے، لیکن یہ ملمع سازی ہے، تزئین کاری ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے عورت ساری گندگیوں کا مرکز اور معدن ہے۔

شیطان کا دوسرا حربہ اولاد

اس آیت میں دوسری چیز جو ''شہوات'' کی تفسیر میں آئی ہے وہ ہے: ''البنین'' یعنی اولاد، جس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان اولاد کو مزین کرکے ماں باپ کو دکھاتا ہے اور وہ ان کی محبت میں اس طرح گرفتار ہوجاتے ہیں کہ اندے بہرے بن جاتے ہیں۔اور کبھی حلال وحرام کی تمیز کھو بیٹھتے ہیں اور کبھی احکام شریعت سے لاپرواہی برتتے ہیں ۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اولاد کی وجہ سے آدمی جہنم میں جا گرتا ہے۔اسی لئے قرآن نے اولاد کو بھی مال کی طرح ایک فتنہ قرار دیا ہے ۔فرمایا کہ: " **وَاعْلَمُوْا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ** "[الانفال: ۲۸] (جان لو کہ تمہارے اموال اور اولاد فتنہ ہیں)اور علامہ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ فتنہ کے اصل معنی تو امتحان وآزمائش کے ہیں، لیکن عرف میں امتحان کے برے نتیجہ کو فتنہ کہتے ہیں۔(الاکمال المعلم :۲۹۸/۱)

لہذا اولاد کے سلسلہ میں انسان اللہ کی آزمائش میں عموما برا نتیجہ لاتا ہے یعنی ناکام ہوجاتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:" **اَلْوَلَدُ مَجْبَنَةٌ مَبْخَلَةٌ مَجْهَلَةٌ**'' (اولاد انسان کو بزدل، بخیل اور جاہل بناتی ہے)(اتحاف الخیرۃ:۶۷۶۳، مصنف عبدالرزاق:۲۰۱۴۳)

اور ایک روایت میں " مَحْزَنَةٌ "(غم میں ڈالنے والی) کا اضافہ ہے۔اس حدیث کی شرح میں علامہ مناوی نے لکھا ہے کہ: بخیل بناتی ہے کیونکہ اولاد کی وجہ سے ماں باپ نیکی وقرب کے کاموں میں خرچ کرنے سے سے کنجوسی کرتے ہیں اور بزدل بناتی ہے کیونکہ اولاد کی محبت میں باپ جہاد میں جانے اور اللہ کے لئے ہجرت کرنے سے باز رہتا ہے،اور جاہل بناتی ہے کیونکہ اولاد کی محبت اور اس کے لئے نان نفقہ کی فکر اس کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے سفر سے روکتی ہے،اور وہ جاہل ہی رہ جاتا ہے،اور غم میں ڈالنے والی ہے کیونکہ اولاد کبھی بیمار ہو یا کوئی اور چیز کا مطالبہ کرے جس کو والدین پورا نہ کرسکیں تو وہ اس کی وجہ سے غمگین ہوتے ہیں۔(التیسیر : ۶۱۵/۱،فیض القدیر:۲۶۲/۶)

بہ ہرحال یہ اولاد کا فتنہ بھی بڑا سخت وشدید فتنہ ہوتا ہے،مگر کب؟ اس وقت جب انسان اولاد کی محبت میں اندھا بہرا ہوجاتا ہے۔اس صورت میں یہ اولاد شیطان کا ایک حربہ ہے،جس سے وہ لوگوں کو مات دیتا ہے۔

دنیا کا ساز وسامان تیسرا شیطانی حربہ

اس آیت کریمہ میں تیسری چیز" شہوات" کی تفسیر میں دنیا کے مال ومتاع اور مختلف قسم کے ساز وسامان کو بیان کیا گیا ہے۔فرمایا کہ:

" وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ " (آل عمران)

یہ ساز وسامان،سونا چاندی،گھوڑے،چوپائے اور کھیتیاں بھی انسان کو مزین کرکے دکھائے جاتے ہیں،جس سے وہ دھوکہ میں مبتلا ہوجاتا ہے۔یہ سمجھتا ہے کہ یہ چیزیں بڑی لائق وفائق ہیں،بڑی بہترین وعمدہ ہیں حالانکہ ان کی برائی وقباحت اس

قدر ہے کہ وہ اپنانے کے قابل نہیں۔مگر شیطان ان کو اس طرح مزین کر دیتا ہے کہ انسان خوامخواہ ہی ان کی جانب میلان کرتا ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ یہ مال ومتاع در حقیقت ایسا ہے جیسے پیشاب کے ڈھیلے، کہ ضرورت پر ان کا استعمال لازم ہے مگر ان سے محبت کرنا، ان کو گلے سے لگانا، اور ہر وقت ان ہی کی فکر میں لگا رہنا بڑی کم عقلی و بے وقوفی کی بات ہے۔

متاع کی تفسیر اور صاحب بن عباد کا واقعہ

اسی لئے یہاں قرآن نے دنیا کے ساز وسامان کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ: ’’**ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا**‘‘ (یہ سب دینوی زندگی کا سامان ہے) یہاں سامان کے لئے ’’متاع‘‘ کا لفظ آیا ہے، اور متاع حقیر قسم کی چیز وسامان کو کہتے ہیں۔ صاحب بن عباد ایک بہت بڑے عالم و ادیب گزرے ہیں اپنے وقت میں مؤید الدولہ بن رکن الدولہ کے وزیر بھی تھے، بڑے لغوی اور عربی زبان کے ادیب تھے، ان کا واقعہ ہے کہ ایک بار ان کو اس لفظ کی تحقیق کی ضرورت پڑ گئی۔ انھوں نے سوچا کہ عربی زبان کی اصل کو معلوم کرنے دیہاتوں میں جانا چاہئے، کیونکہ وہاں زبان اپنی اصلیت پر باقی رہتی ہے، برخلاف شہروں کے کہ وہاں مختلف علاقوں کے لوگوں سے میل جول کی وجہ سے عربی زبان اپنی اصلیت پر باقی نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں مختلف گاؤں دیہاتوں میں اس لفظ کے معنے جاننے کے لئے گھومتا رہا، ایک جگہ دیکھا کہ ایک دیہاتی عربی لڑکا بیٹھا ہے، میں اس کے پاس چلا گیا، اور اس کے بازو بیٹھ گیا، اور اس کے قریب ایک کپڑا پڑا ہوا تھا جو زمین وغیرہ پوچھنے اور صاف کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اتنے میں ایک کتا آیا اور وہ پوچھنے کا کپڑا

اٹھا کر لے گیا۔ کچھ دیر بعد اس لڑکے کی ماں آئی تو اس لڑکے نے ماں سے کہا کہ: "جاء الرقيم و أخذ المتاع و تبارك الجبل " (کہ کتا آیا اور متاع اٹھایا اور پہاڑ پر چڑھ گیا) علامہ صاحب بن عباد کہتے ہیں کہ اس سے مجھے سمجھ میں آیا کہ متاع کی کیا حقیقت ہے؟ اس لڑکے نے پوچھنے کے کپڑے کے لئے جو ایک معمولی وحقیر چیز ہوتی ہے اور سجانے کے نہیں بلکہ چھپانے کے قابل ہوتی ہے اس کو متاع کہا۔ لہذا متاع کے معنے یہ ہوئے کہ جو چیز ضرورت کی ہو، مگر حقیر ہو، معمولی درجہ کی ہو، جیسے پوچھنے کا کپڑا، اس کو عربی میں متاع کہتے ہیں۔

اللہ اکبر! قرآن کریم میں دنیا کے ساز وسامان کے لئے یہ لفظ لا کر یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا کا یہ مال و دولت اگر چہ کہ ایک ضرورت کے لئے ہے مگر وہ دل لگانے اور شوکیس میں سجانے اور لوگوں کو دکھانے کے قابل نہیں ہے۔کیا کوئی پوچھنے کے کپڑے کو شوکیس میں سجاتا ہے؟ کیا کوئی اس کو دل سے لگاتا ہے، اس سے محبت کرتا ہے؟ نہیں، اسی طرح دنیا کو بھی سمجھنا چاہئے۔

الغرض یہ دنیا بھی مزین کر کے شیطان لوگوں کو دھوکہ دیتا ہے اور اس کو اپنے ایک حربے کی طرح استعمال کرتا ہے۔

دنیا کے ذریعہ شیطان کس طرح بہکاتا ہے؟

اس پر ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک دفعہ ایک آدمی نے دیکھا کہ ایک جگہ درخت ہے اور لوگ اس درخت کی پوجا کر رہے ہیں، تو اس آدمی کے دل کے اندر ایک عزم ایک حوصلہ پیدا ہوا کہ اس درخت کو اکھاڑ دینا چاہئے، اس لیے کہ یہ درخت لوگوں کو، اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف آنے سے مانع بن رہا ہے اور اس کے بجائے شرک و گمراہی اور کفر میں پھنسنے کا ذریعہ بن رہا ہے۔

چنانچہ وہ شخص کچھ ہتھیار لے کر گیا اور درخت کو اکھاڑنا شروع کیا، شیطان آیا اور کہنے لگا کہ کیا کر رہے ہو؟ تو اس نے کہا کہ میں اس درخت کو اکھاڑنا چاہتا ہوں، اس لیے کہ اس درخت کی وجہ سے بہت سے اللہ کے بندے کفر میں پھنس رہے ہیں، اور شرک کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ شیطان نے کہا کہ نہیں نہیں، تم ایسا مت کرو، اس کو یہاں کے لوگوں نے اب تک پالا اور بڑھایا ہے، اور اس کے پیچھے ہم نے محنت کی ہے۔ مگر اس شخص نے کہا کہ نہیں نہیں، میں تو اللہ کے لیے آیا ہوں اور یہ کام میں کر کے رہوں گا۔ اس نے اپنا پورا عزم بتایا، پورا حوصلہ بتایا،۔ جب شیطان نے اس کا یہ عزم دیکھا تو اس کی ہمت اور طاقت کے مقابلہ میں شیطان مجبور ہو گیا، اس لیے کہ اخلاص کے ساتھ جب عمل ہوتا ہے تو اس کے اندر بڑی قوت ہوتی ہے اور شیطان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو شیطان عاجز آ گیا۔ پھر سوچنے لگا کہ کس طرح اس کو اس نیکی سے روکوں؟ اس کی سمجھ میں ایک بات آ گئی، شیطان نے اس سے عاجزی سے کہا کہ میری ایک درخواست ہے اس کو سن لیں۔

اس نے کہا کیا درخواست ہے؟ شیطان نے کہا کہ درخواست یہ ہے کہ تم اس کام کو چھوڑ دو تو میں روزانہ تمہیں دو درہم دے دیا کروں گا، دو درہم روزانہ بغیر کسی محنت مزدوری گھر بیٹھے مل جائیں گے۔

یہ سنا تو دل میں دنیا کی لالچ آ گئی، اس نے کہا کہ اچھا دو درہم مجھے روزانہ ملیں گے، کون اسکا ذمہ دار ہوگا؟ شیطان نے کہا میں ذمہ دار ہوں، میں تجھے پیش کروں گا اور پیش بھی اس طرح کروں گا کہ روزانہ فجر کی نماز پڑھ کر مصلے سے اٹھیں گے تو تمہارے مصلے کے نیچے مل جائیں گے۔

اس نے کہا ٹھیک ہے دیکھتے ہیں، اب جو عزم لے کر آیا تھا، مال پیسے کی وجہ

سے وہ ختم ہو گیا، اور واپس اپنے گھر چلا گیا، رات سو کر صبح اٹھا، فجر کی نماز پڑھی اور اس کے دل ودماغ میں وہی دو درہم تھے، مصلے کے پاس گیا اور دیکھا تو واقعی مصلے کے پاس دو درہم اس کو مل گئے، اٹھایا اور جیب میں ڈال لیا، اور اس کے بعد دن بھر اپنے کام میں مصروف رہا، پھر دوسرا دن ہوا، اسی طرح فجر کے بعد مصلے کے پاس دو درہم مل گئے۔

اب روزانہ یہی تماشا ہوتا ہے کہ فجر پڑھ کے وہاں جاتا ہے دو درہم مل جاتے ہیں، مہینہ دو مہینہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا، اس کے بعد شیطان نے درہم دینا بند کر دیا۔ اب جب دو درہم نہیں ملے تو یہ شخص پھر اپنے ہتھیار وغیرہ لے کر وہاں پہنچا کہ درخت کو اکھاڑ دوں گا، شیطان بھی وہاں موجود تھا، جب اس نے وہ درخت اکھاڑنا چاہا تو شیطان نے کہا: کیا کر رہے ہو؟ کہا: درخت اکھاڑوں گا، اس لئے کہ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ دو دو درہم دیا کروں گا، کئی دنوں سے تم نے دیا نہیں، اب میں پھر وہی کام کروں گا جو پہلے کرنے آیا تھا۔ شیطان نے کہا کہ کر لے جو کرنا ہے، لیکن تجھے اس پر کوئی قدرت نہ ہوگی۔ اس نے کہا کہ کیوں؟ کہا کہ تو پہلے آیا تھا اللہ کے لیے، اب آیا ہے پیسے کے لیے، وہاں اخلاص موجود تھا اور یہاں اخلاص موجود نہیں ہے، اب تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد وہ آدمی اپنا منہ لیکر رہ گیا۔

بھائیو! اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کس طرح اپنے پھندے میں پھانسنے کے لیے لوگوں کو مال سے، پیسے سے، اپنی طرف مائل کرتا ہے۔

ایک بڑا شیطانی حربہ جہالت ہے

شیطان کا ایک مکر اور سب سے بڑا حربہ جہالت کی راہ سے ہوتا ہے۔ جب شیطان آدمی کو دیکھتا ہے کہ جاہل ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کے پاس صحیح علم نہیں، اور

اسے معلوم نہیں کہ حقیقت کیا ہے؟ اللہ کے بارے میں صحیح نہیں جانتا، رسول کے بارے میں صحیح نہیں جانتا، آخرت کے بارے میں نہیں جانتا، فرشتوں کا علم نہیں ہے، اسی طرح دینی معلومات کے اندر اس کے پاس کمی موجود ہے تو شیطان اس جہالت سے بہت فائدہ اٹھاتا ہے، اور عام طور پر جاہلوں کو ان کی جہالت کی وجہ سے بڑی بڑی قبیح ترین اور انتہائی ناروا باتوں کے اندر پھانس دیتا ہے۔

اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ مکر کے لیے اور فریب کے لیے سب سے بڑا راستہ جہالت ہوتا ہے، اور اگر آدمی کے اندر جہالت کے بجائے علم ہو تو علم کے ذریعے سے وہ شیطان کے مکر کو، کید کو سمجھنے لگتا ہے، اور شیطانی حربہ سے بچ جاتا ہے، اور کامیاب ہو جاتا ہے۔

اسی مضمون کی طرف ایک حدیث کے اندر اشارہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**فقيه واحد أشد على الشيطان من ألف عابد**'' (ایک فقیہ و عالم شیطان پر ایک ہزار عابدوں سے بھاری ہے) (ابن ماجہ: ۲۰، ترمذی: ۲/۹۷)

ایک طرف ایک ہزار عابد ہوں، شیطان کہتا ہے کہ ان سب کو میں ایک داؤ میں نیچا دکھا دوں گا، اس لیے کہ یہ لوگ عبادت تو کر رہے ہیں، لیکن ان کے پاس علم نہیں ہے، ہاں عبادت ہے، ریاضت ہے، مجاہدہ ہے، سب کچھ ہے لیکن علم شریعت نہ ہونے کی وجہ سے ایک داؤ میں ان کو گرا دوں گا۔

لیکن اگر کوئی عالم ہوتا ہے تو وہ عالم سے ڈرتا ہے، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ڈر کر وہ پیچھے رہ جاتا ہے، جی ڈرتا تو ہے لیکن ڈرنے کے ساتھ کوشش یہ کرتا ہے کہ کوئی بڑا مکر ان کے لیے لاؤں۔ دوسروں کو تو چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ہلاک کرتا رہتا ہے، لیکن علماء کو بڑے بڑے مکر سے ہلاک کرتا ہے۔ تو اس لیے علماء بھی بے خبر نہیں رہ سکتے۔

جاہل پر شیطان کا داؤ۔ایک قصہ

ایک بہت بڑے عالم گزرے ہیں،امام ابن عبد البر مالکی ، انہوں نے اپنی کتاب ''جامع بیان العلم'' میں ایک قصہ لکھا ہے کہ شیطان کے چیلوں نے شیطان سے کہا کہ جب کسی عالم کا انتقال ہوتا ہے تو آپ بہت خوش ہوتے ہیں، کسی عابد و زاہد کی موت پر اتنا خوش نہیں ہوتے۔کیا بات ہے؟

شیطان نے کہا کہ آؤ میں تم کو اس کی وجہ بتاتا ہوں۔اس کے بعد شیطان اپنے چیلوں کو لیکر ایک عابد کے پاس گیا جو جاہل تھا ،اور سلام کیا ، خیر خیریت پوچھی ، شیطان نے اس سے کہا کہ آپ بڑے اچھے آدمی لگتے ہیں ،میرے دل میں ایک وسوسہ ہے، خیال ہے، سوال ہے، میں اس کے بارے میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں ۔ عابد نے کہا کہ پوچھئے ، اگر مجھے معلوم ہوگا تو جواب دے دوں گا ،اگر معلوم نہیں تو آپ کسی اور سے پوچھ لیجئے۔

شیطان نے کہا کہ میرے دل میں ایک سوال پیدا ہورہا ہے ،وہ یہ کہ کیا اللہ تعالیٰ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ ایک انڈے میں زمین کو،آسمان کو، چاند کو، سورج کو، پوری کائنات کو داخل کردے؟ اس حالت میں کہ انڈا جتنا ہے اتنا ہی رہے،اس میں اضافہ نہ ہو اور یہ زمین وآسمان جتنی بڑی ہیں،اس میں کوئی کمی نہ ہو۔ یہ ذہن میں ایک سوال آرہا ہے،اس کے بارے میں آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں؟

بھائیو! ذرا اندازہ کیجئے سوال کا، وسوسے کا کہ کس قدر خطرناک ہے۔اب وہ عابد تو جاہل و بے وقوف تھا ہی ،صرف نماز روزے کی باتیں تو جانتا تھا، باقی اتنا بڑا علم تو تھا نہیں ،تو اس نے کچھ دیر سوچا ،اس کے بعد کہنے لگا کہ انڈا اتنا ہی رہے اور زمین بھی اتنی ہی رہے اور آسمان بھی اتنا رہے پھر انڈے میں یہ سب داخل ہو جائیں؟

کیسے ہوسکتا ہے؟ یعنی شک کے لہجے میں، تعجب کے انداز میں اس نے یہ سوال دہرایا، پھر کہنے لگا کہ نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔

شیطان کے چیلے وہیں موجود تھے، شیطان نے ان سے کہا کہ میں نے اس کے دل میں شک کا بیج داخل کر دیا ہے جو اسے کفر تک پہنچا دیگا۔ دیکھا کہ میں نے ایک منٹ میں اس عابد وزاہد کو کافر بنا دیا، یا کفر کی دہلیز پر بٹھا دیا۔ اس طرح کے لوگ زندہ رہیں یا مر جائیں، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس کے بعد شیطان ایک عالم سے ملا، اس سے بھی یہی سوال کیا، اور کہا کہ جناب آپ عالم ہیں، فاضل ہیں، میرے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوگیا ہے، اس کا جواب دریافت کرنے آیا ہوں؟ انھوں نے کہا کہ کیا سوال؟ کہا کہ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک انڈے میں زمین وآسمان کو ڈالدیں؟ تو ان عالم نے کہا کہ اس میں کیا تعجب کی بات ہے کہ انڈا اپنی حالت پر اسی طرح ہو، زمین اور آسمان بھی اسی طرح ہوں، پھر اللہ تعالیٰ انڈے میں ان کو داخل کر دیں؟ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اللہ کی ذات تو وہ ہے کہ جب ارادہ کرتا ہے کسی چیز کا تو ''کُنْ'' فرماتا ہے اور وہ چیز ہوجاتی ہے۔ ﴿وَإِذَا قَضٰى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ (اور جب وہ (اللہ) کسی چیز کا فیصلہ کرتا ہے تو اسے ''کن'' (ہوجا) کہتا ہے تو وہ ہو جاتی ہے) اس لئے مجھے یقین ہے کہ ایسا ہوسکتا ہے، اس میں کوئی بات شک وشبہ کی نہیں۔

شیطان نے اپنے چیلوں کو دیکھ کر کہا کہ دیکھو اس کا علم ایسا ہے کہ یہ ہمارے داؤ میں نہیں پھنس سکتا، اور اس کو بہکانا ہمارے لئے آسان نہیں، اس لئے ان لوگوں کے زندہ رہنے سے مجھے پریشانی ہوتی ہے اور یہ لوگ مرتے ہیں تو میں جشن مناتا ہوں، اور عابد کا حال ایسا کہ اسے جب چاہیں ہم ادھر سے ادھر کر سکتے ہیں، اور اس

کی جہالت کی وجہ سے جب چاہے اس کو صرف معصیت میں نہیں، کفر میں بھی مبتلا کر سکتے ہیں۔(جامع بیان العلم)

اس واقعہ سے اندازہ کیجئے کہ جب آدمی کے اندر جہالت ہوتی ہے، علمِ شرع سے ناواقف ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے جاہ وجلال سے ناواقف ہوتا ہے تو اس کے نتیجے میں انسان کس طرح کفر کے دلدل میں پھنس جاتا ہے؟ اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ جہالت سب سے بڑی بیماری ہے۔

سالک کا سب سے پہلا کام تحصیل علم ہے

یہیں سے میں سالکین سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ علم دین سے کبھی غافل نہ ہوں، کیونکہ سالکین طریقت کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ وہ علم دین حاصل کریں۔ اسی لئے امام مالک نے فرمایا کہ:

”من تصوف و لم یتفقه فقد تزندق ومن تفقه ولم یتصوف فقد تفسق ومن جمع بینهما فقد تحقق “ (جس نے تصوف اختیار کیا اور علم نہیں حاصل کیا وہ زندیق ہوگیا اور جس نے علم سیکھا مگر تصوف اختیار نہیں کیا وہ فاسق ہوگیا اور جس نے دونوں کو جمع کیا وہ محقق ہوگیا)(ایقاظ الهمم:۲)

حضرت سیدنا امام جنید بغدادیؒ جو ایک طرف حدیث کے امام بھی تھے تو ایک طرف تصوف کے بھی امام تھے، وہ فرماتے ہیں کہ تصوف کی راہ قرآن اور حدیث پر قائم ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس راہِ تصوف وسلوک کے اندر سب سے بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ علم شرع سے واقفیت ہو، لیکن علم شرع کا مطلب یہ نہیں کہ آپ پورے عالم و فاضل ہوجائیں، یہ کوئی ضروری نہیں، لیکن اتنا علم آدمی کے پاس ہونا چاہئے جس

سے کہ وہ حق و باطل میں تمیز کر سکے، اچھے اور برے کی پہچان اس کے اندر آ جائے، کھوٹ کیا ہے اور اصل کیا ہے اسکو سمجھ میں آ جائے، اتنا علم اگر اس کے پاس موجود ہے تو اس علم کے ذریعے وہ راہ کو طے کر سکتا ہے۔

لہٰذا علماء کی خدمت میں جانا، شریعت سے واقف ہونا، ضروری امور سے واقف ہونا، عقائد سے واقف ہونا، انتہائی ضروری ہے، ان کے بغیر آدمی کا اس راہ میں چلنا دشوار ہے، ورنہ کہیں نہ کہیں آدمی کو شیطان دھوکہ دے دیتا ہے۔

ایک جاہل کی گمراہی کا قصہ

حضرت مولانا تھانویؒ نے ایک جگہ بیان کیا ہے کہ ان کے گاؤں میں ایک آدمی تھا، بڑا عابد تھا، لیکن علمِ دین سے واقف نہیں تھا۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہاں کے کچھ لڑکوں نے اس کا مذاق بنانا چاہا اور سوچا کہ اس آدمی کی بے وقوفی ظاہر کی جائے، ایک دن وہ اپنے گھر میں سو رہا تھا، رات کا وقت تھا تو محلے کے دو چار لڑکے اس کی چھت پر چڑھ گئے اور بناوٹی آواز میں اس کا نام لے کر ایک خاص لب ولہجہ میں اس کو پکارا۔ وہ چونکا، اور پوچھنے لگا کہ کون ہے؟ ایک لڑکے نے آواز بنائی اور کہا کہ میں تمہارا خدا بول رہا ہوں۔ یہ سنتے ہی وہ جاہل اٹھ کر بیٹھ گیا، اس کے بعد کہنے لگا کہ اے باری تعالیٰ! کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ تو اس نے کہا کہ تیری عبادت مجھے بہت پسند آ گئی، اس لیے آج سے ہم نے تیرے سے نماز معاف کر دی ہے۔ یہ کہہ کر وہ لڑکے تو غائب ہو گئے۔

اب یہ جاہل عابد سمجھا کہ واقعی یہ اللہ تعالی ہی کی آواز ہے، اس لئے اس کو یقین آ گیا کہ نماز معاف ہو گئی۔ اب اس کے بعد جو تہجد تھی وہ بھی ختم، فرائض تھے وہ بھی ختم، نماز کے لئے مسجد کو آنا بند کر دیا۔ اس طرح دو چار دن ہو گئے اور وہ نماز کو نہیں

آیا تو محلے کے لوگوں نے سوچا کہ بیمار تو نہیں ہوگیا؟ چلو جا کر دریافت کریں، کچھ لوگ وفد کی شکل میں اس کے گھر پہنچے، خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد پوچھا کہ طبیعت تو اچھی ہے؟ کہا کہ ہاں الحمدللہ! بہت اچھا ہوں۔ لوگوں نے پوچھا کہ پھر نماز کو کیوں نہیں آرہے ہو؟ بہت دن ہوگئے آپ نماز کو نہیں آئے، کیا بات ہے؟ تو کہنے لگا کہ آپ کو خبر ہوئی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سے خوش ہوکر میرے سے نماز معاف کر دی۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ!

دیکھئے شیطان جاہل لوگوں کو کس طرح بہکانے لگتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان جہالت سے لوگوں کے اوپر تسلط قائم کر لیتا ہے۔

اللہ نے مجھے بچایا ہے، شیخ عبدالقادر جیلانی کا قصہ

یہ تو جاہلانہ طبیعت کا اثر ونتیجہ ہے، اس کے برخلاف جب علم ہوتا ہے تو کیا حال ہوتا ہے انسان کا؟ اس کو ایک واقعہ سے سمجھئے، کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جیسا کہ ہم جانتے ہیں بہت بڑے عالم تھے، محدث بھی تھے، بہت بڑے صوفی اور بزرگ بھی تھے، ان کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ان کے سامنے ایک ابر چھا گیا اور اس میں سے چمک ظاہر ہوئی، انہوں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے اندر سے ایک آواز آنے لگی، آواز کی طرف متوجہ ہوئے تو اس آواز میں ان سے کہا گیا کہ آپ کی عبادت آپ کا زہد، ریاضت، آپ کے مجاہدات سے ہم بہت خوش ہوگئے، اس لیے آپ سے نماز معاف کر دی جاتی ہے۔

انہوں نے یہ سنتے ہی سوچا کہ نماز اللہ کے نبی ﷺ سے معاف نہیں ہوئی جبکہ آپ ﷺ کی عبادت وریاضت کا جو حال تھا وہ سب کو معلوم ہے تو میرے سے کیسے معاف ہوسکتی ہے؟ لہذا یہ دراصل شیطان کی آواز ہے، پھر " **لاحول ولا قوہ إلا**

باللّٰہ ''پڑھا۔ یہ پڑھنا تھا کہ وہ ابر جونظر آ رہا تھا اوراس کے اندر سے چمک ظاہر ہو رہی تھی وہ دُھویں کی شکل میں تبدیل ہو کر غائب ہو گئے، حضرت سمجھ گئے کہ دراصل شیطان کی آواز تھی، پھر کچھ دیر بعد اسی طرح ہوا اوراس کے اندر کہا گیا کہ آپ کو آپ کے علم نے بچالیا۔ حضرت نے فوراً اس کے جواب میں فرمایا کہ میرے علم نے نہیں، میرے خدا نے مجھے بچالیا۔

دیکھا آپ نے کہ علم انسان کی رہنمائی کرتا ہے، لیکن بچانے والی ذات تو اللہ ہی کی ہوتی ہے، اگر خدا بچانا نہ چاہے تو وہ عالموں کو بھی گمراہ کر دے، جیسے بہت سے ہو جاتے ہیں۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ساتھ ایک اور واقعہ بھی پیش آیا، کہ آپ ایک مرتبہ بڑی شدت سے پیاس محسوس کر رہے تھے، حضرتؒ نے جنگلات میں کئی سالوں تک زندگی گزاری ہے، ریاضت کے لیے، مجاہدات کے لیے، تو اس زمانہ میں پانی ایک دفعہ نہیں ملا، بڑی شدت کی پیاس لگ رہی تھی، دور دور تک پانی کا نام و نشان نہیں تھا۔ اسی وقت ایک ہاتھ ظاہر ہوا اوراس ہاتھ میں ایک گلاس تھا جو سونے یا چاندی کا تھا اوراس کے اندر پانی بھی تھا اور آواز آ رہی تھی کہ آپ کے لیے یہ جنت سے بھیجا جا رہا ہے، آپ اس کو لیجئے استعمال کیجئے۔ حضرت نے سمجھ لیا کہ یہ شیطان کی مکاری ہے، لہٰذا'' **لاحول ولا قوّۃ الا باللّٰہ** ''پڑھا، حضرت کو یہ بات کیسے سمجھ میں آئی کہ یہ شیطان کی مکاری وعیاری ہے؟ یہ بات سمجھ میں آئی شریعت کے علم سے، کیونکہ یہ سونے اور چاندی کا گلاس تھا اور سونے اور چاندی کا استعمال اللہ کے نبی علیہ السلام کی شریعت میں ممنوع ہے، حرام ہے، ناجائز ہے۔ دنیا میں رہتے ہوئے جنت سے وہ چیز دی جائے جو خود شریعت کے اندر حرام ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

شیطان نے بہکانے کی کوشش کی ،لیکن حضرت سمجھ گئے ،لاحول ولاقوۃ پڑھا تو شیطان کہنے لگا آپ کے علم نے آپ کو بچالیا۔حضرت نے فرمایا کہ علم نے نہیں بلکہ میرے خدانے مجھ کو بچالیا۔تواس طرح علم رہنمائی کرتا ہے جس کی وجہ سے شیطان کے مکر کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

شیطان کی حضرت عیسی علیہ السلام کو بہکانے کی کوشش

یادرکھو کہ شیطان کی عیاری ومکاری بڑی خطرناک ہوتی ہے،وہ کسی کو بھی نہیں چھوڑتا،حتی کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو بھی نہیں چھوڑتا۔

ایک دفعہ شیطان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آیااور آکر کہنے لگا: آپ تو وہ ہیں کہ اپنی ربوبیت سے شیرخوارگی میں آپ نے کلام کیا ، جبکہ کوئی اور ایسا نہیں کرسکتا۔حضرت عیسی علیہ السلام نے فرمایا کہ ربوبیت والوہیت تواس اللہ کے لئے ہے جس نے مجھے قوت گویائی دی۔

پھر وہ کہنے لگا کہ اے وہ ذات کہ جس نے اپنی الوہیت سے مردوں کوزندہ کیاہے،اے وہ ذات جس نے اپنی الوہیت سے مختلف پرندوں کو بنا کرزندہ چھوڑا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہنے لگے "لاحول ولاقوۃالاباللّٰہ"میں کہاں کا خدا، میرے اندرکہاں الوہیت؟الوہیت تواس اللہ کے اندر ہے جو مجھے بھی زندگی اورموت دیتاہے۔(مکائدالشیطان ابن ابی الدنیا:۶۷)

دراصل شیطان ان باتوں سے ان کو بہکانے کے لیے آیا تھا تا کہ ان کے ذہن میں یہ ڈال دے کہ جیسے لوگ سمجھتے ہیں،اسی طرح یہ الوہیت کے حامل ہیں۔یعنی خدائی صفات ان کے اندر ہیں،تو خدائی صفات کا حامل بتایااوران کے ذہن میں یہ بات ڈالنی چاہی تا کہ نعوذ باللہ حضرت عیسی گمراہ ہوجائیں،لیکن اللہ تو انبیاء کرام علیہم

الصلوۃ والسلام کی حفاظت کرتا ہے، اور اپنی عصمت سے ان کو نوازتا ہے، اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فوراً یہ جواب دیا۔

معلوم ہوا کہ شیطان بڑا مکار ہے، عیار ہے، اور اسی لیے وہ چیزوں کو مزین کرتا ہے اور باتوں کو اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ انسان بہک جاتا ہے۔

حضرت جنید بغدادی سے شیطان کا عجیب سوال

حضرت جنید بغدادیؒ کا نام کون نہیں جانتا! آپ کا واقعہ ہے کہ حضرت جنیدؒ بغدادیؒ نے ایک مرتبہ دل میں خیال کیا کہ اگر شیطان سے ملاقات ہو جائے تو ایک سوال کروں گا، اور انہوں نے ایک دن اللہ سے دعاء بھی کر دی کہ اے اللہ! کبھی شیطان سے ملاقات کرادے تاکہ اس سے سوال کرلوں۔ ایک دن نماز پڑھ کر مسجد کے باہر نکلے تو ایک بوڑھا آدمی جھک کر سلام کرنے لگا۔ حضرت جنیدؒ نے اس کو دیکھ کر کہا کہ کون ہو تم؟ کہنے لگا کہ میں وہی ہوں جس سے ملنے کی آپ کو آرزو اور تمنا تھی۔

حضرت سمجھ گئے کہ یہ اصل میں شیطان ہے۔ شیطان نے کہا کہ آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟ حضرت جنیدؒ نے کہا کہ میرے ذہن میں تیرے متعلق ایک سوال ہے، سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تجھے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تجھے کس چیز نے اللہ کے حکم کی تعمیل سے منع کیا؟ کیوں تو نے سجدہ نہیں کیا، کیا اللہ کی عظمت کو نہیں جانتا تھا؟ ارے تجھے اللہ کی معرفت حاصل تھی، اللہ تعالیٰ کی عظمتوں اور جلالتوں سے تو واقف تھا، اس قدر اللہ کی قربت رکھنے کے باوجود جب اللہ نے تجھے حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کر۔ تو تو نے آخر کیوں سجدہ نہیں کیا؟

اس پر شیطان کا جواب کیا تھا، وہ سننے کے قابل ہے، اس کے جواب نے کچھ دیر کے لئے حضرت جنید کے ہوش اُڑا دیے۔ اس نے کہا کہ جنید! آپ جیسا توحید پرست آدمی اور یہ مشرکانہ سوال؟ آپ جیسا توحید پرست ایک اللہ کو ماننے والا، ایک اللہ کی پوجا کرنے والا اور آپ کے ذہن میں سوال آرہا ہے مشرکانہ سوال کہ میں نے غیر اللہ کو سجدہ کیوں نہیں کیا؟ کہنے لگا کہ آدم تو غیر خدا تھے، خدا تو نہیں تھے، میں غیر اللہ کو کیوں سجدہ کر لیتا۔ آپ جیسا توحید پرست آدمی ایسا مشرکانہ سوال میرے سے کر رہا ہے، بڑے افسوس کی بات ہے۔

حضرت جنیدؒ کہتے ہیں کہ جب اس نے یہ بات میرے سے کہی تو مجھے لگا کہ ہاں! یہ تو ٹھیک کہہ رہا ہے، اور پھر تھوڑی دیر کے لیے مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرا ایمان سلب ہو رہا ہے، اس لیے میں سناٹے میں پڑ گیا، ہوش وحواس باقی نہ رہے، میں سوچنے لگا کہ اس کو کیا جواب دے سکتا ہوں۔ اس لیے کہ جب وہ کہہ رہا ہے کہ تم ایک اللہ کو ماننے والے ہو اور مجھے پوچھتے ہو کہ آدم کو سجدہ کیوں نہیں کیا؟ حضرت جنید کہتے ہیں کہ میرے ذہن میں جواب نہیں آیا۔ فوراً اللہ کی طرف سے الہام ہوا اور مجھ سے کہا گیا کہ اس سے یہ پوچھو کہ حکم دینے والا کون تھا؟ حکم دینے والا جب خود کہہ رہا ہے کہ فلاں چیز کو سجدہ کرو تو توحید اسی کا نام ہے کہ اس کی بات کو مان لیا جائے۔ حضرت جنید کہتے ہیں کہ اس الہام کے بعد میرا ایمان برقرار ہوا اور نہ تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے ایمان میں تزلزل پیدا ہو گیا ہے۔

بھائیو! یہ ہے شیطان کی مکاری اور عیاری، نہ ولیوں کو چھوڑا، نہ غوث وقطب وابدال کو چھوڑا، نہ انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کو چھوڑا۔ غور کرو کہ شیطان باتوں کو اور چیزوں کو کس طرح مزین کرتا ہے اور گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس کا ذرا اندازہ اس واقعہ سے آپ کر لیجئے، اس لیے کبھی بھی شیطان سے بے فکر نہیں ہونا چاہئے، شیطان کی عیاری اور مکاری سے بسا اوقات انسان بے ایمان بھی ہو جاتا ہے، لیکن اسے خبر نہیں رہتی کہ میں بے ایمان ہو گیا ہوں۔ شیطان کفر کو مزین کر دیتا ہے۔

مجھ سے کونسا گناہ ہو گیا؟

بعض لوگوں کی زبان پر کبھی کبھی ایسے الفاظ سنے جاتے ہیں جیسے مثلاً کبھی کوئی مصیبت آ گئی، پریشانی آ گئی، اللہ کی طرف سے بیماری میں مبتلا کر دیا گیا یا کھانے کی پینے کی اور کسی قسم کی پریشانی پیش آ گئی تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے سے کیا گناہ ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ہم کو یہ مصیبت دے رہا ہے۔ اس جملہ پر غور کیجئے! نفسانی کید اور شیطانی مکر پر غور کیجئے کہ اس جملے کے اندر کس قدر نفسانی کید اور شیطانی مکر پوشیدہ ہے، گویا کہ اس جملے میں وہ دعوی کر رہا ہے کہ میں گناہ نہیں کرتا، میں گناہوں سے بالکل معصوم اور پاک ہوں، اس لئے کہتا ہے کہ مجھ سے کون سا گناہ ہو گیا؟ یعنی بالکل نہیں ہوا، قطعاً نہیں ہوا، پھر اللہ تعالیٰ مصیبت میں مجھے کیوں ڈال رہا ہے؟ اس میں دعویٰ ہو گیا اپنے آپ کے پاکباز ہونے کا، جس کا دعویٰ انبیاء کرام علیہ الصلوۃ والسلام نے بھی کبھی نہیں کیا تھا، لیکن یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ میرے سے کوئی گناہ نہیں ہوا، اور جب گناہ ہی نہ ہونے کا یہ دعویدار ہو گیا تو اس کا مطلب یہ ہو گیا کہ نعوذ باللہ یہ انبیاء جیسا معصوم ہو گیا۔

اب بتاؤ کہ اس جملے میں شیطانی مکر پوشیدہ ہے کہ نہیں ہے؟ نفسانی کید پوشیدہ ہے کہ نہیں ہے؟ لیکن یہ جملہ کتنی آسانی و سادگی کے ساتھ زبان سے نکل جاتا ہے، اور کس قدر لوگ اس کے اندر ملوث ہیں، لیکن کبھی ان کو دھیان تک نہیں جاتا کہ ہم

نے اس جملہ کے اندر کتنا بڑا دعوی کیا ہے، اس دعویٰ کی وجہ سے ان کی ساری عبادت بھی رائیگاں چلی جاتی ہے۔

حضرت آدم اور شیطان کی خطاؤں میں فرق

یہاں ایک نکتہ عرض کرتا ہوں، وہ یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام سے بھی خطا ہوئی اور شیطان نے بھی خدا کی نافرمانی کی، مگران دونوں کی نافرمانیوں میں ایک زبردست اور بڑا عظیم فرق ہے، وہ یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام سے جب ایک خطا کا صدور ہوا تو فوراً اللہ تعالیٰ کے سامنے انہوں نے اپنے گناہ کا اعتراف کرلیا، اور شیطان سے جب گناہ ہوا تو وہ اڑ گیا کہ مجھ سے گناہ نہیں ہوا ہے، بلکہ میں نے تو آدم کو سجدہ نہ کر کے توحید کا مظاہرہ کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ بندہ کا اللہ کی جناب میں عجز و نیاز اور اپنی خطاؤں و گناہوں کا اعتراف ہی اس کو اللہ کے یہاں مقام دلاتا ہے۔

اس لئے یوں کہنا کہ میں نے کونسا گناہ کیا یہ بہت نازیبا بات ہے اور اس میں دعوی ہے۔ لہذا ایسے قبیح جملوں کے استعمال کرنے سے بچنا چاہئے، شیطان ایسے جملے ہماری زبانوں سے نکلوا کر ہمارا ایمان برباد کرنا چاہتا ہے۔

عبادات پر ناز-ایک عظیم شیطانی حربہ

شیطانی حربوں کا ذکر چل رہا ہے تو ایک اور اہم بات کی طرف توجہ کیجئے، خاص طور پر میں سالکین کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ شیطان انسانوں کو گمراہ کرنے ایک حربہ یہ بھی استعمال کرتا ہے جو زیادہ خطرناک اور قابل توجہ ہے، وہ کیا؟ وہ یہ کہ بسا اوقات شیطان عبادات وریاضات کے ذریعہ، نماز روزہ کے ذریعہ، وظائف کے ذریعہ انسان کو بہکاتا ہے، اور دل میں یہ بات ڈالتا ہے کہ تو

بڑا عابد و بزرگ ہو گیا ہے، تیرا بہت اونچا مقام ہے، اس طرح عبادات پر ناز و فخر میں مبتلا کر کے انسان کو خدا کی نظروں سے گرا دیتا ہے۔

بعض لوگ ہوتے ہیں کہ دو چار رکعات پڑھ کر ڈینگیں مارنے لگتے ہیں، اور خود کو سب سے افضل اور دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ یہ عبادات و ریاضات پر ناز و فخر دل کی نجاستوں و گندگیوں میں سے ایک ہے۔ معلوم نہیں کتنی گندگیاں ایسی ہمارے اندر ہیں، کتنی خباثتیں اور رذائل ہمارے اندر جمی ہوئی ہیں اور ہم اس کے باوجود بڑے مطمئن ہیں کہ ہم تو ماشاء اللہ ذاکر ہیں، شاکر ہیں، سالک ہیں اور فلاں اور فلاں قسم کی عبادتوں میں لگے ہوئے ہیں، حالانکہ یہ عبادت نہیں، بلکہ عبادت کے لباس میں گناہ ہیں جن کو شیطان نے اس طرح مزین کر دیا ہے اور نیکی کا پردہ ڈال دیا ہے کہ اس کے اصلی چہرہ کو دیکھنے اور اس کی اصلیت کو پہچاننے سے ہماری آنکھیں قاصر ہیں۔

اسی لئے شیخ کی ضرورت پڑتی ہے کہ وہ شیطان کے مکر و فریب سے واقف ہوتا ہے، نیکی اور بدی کی پہچان رکھتا ہے، وہ شیطان کی چالوں کو سمجھتا ہے، وہ بتاتا ہے کہ شیطان کہاں چکما دے رہا ہے، کس طرح گمراہ کر رہا ہے، اسی لئے ہمارے بزرگان دین فرماتے ہیں کہ کسی اللہ والے سے تعلق رکھنا اور اس کی رہبری میں دین پر چلنا ضروری ہے ورنہ شیطان ایسا مکار اور چالباز ہے کہ اس نے نہ ولیوں کا چھوڑا، نہ غوث و قطب کو چھوڑا، نہ انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کو چھوڑا، نہ کسی اور کو چھوڑا تو ہمارے اور آپ کے ساتھ اس کا کیا معاملہ ہوتا ہوگا؟

شیطان کا اللہ کے سامنے دعوی

بھائیو! ہم سب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے،

قرآن کریم میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے: ﴿اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ﴾ (بے شک شیطان کھلا دشمن ہے) (القصص:۱۵)

اور ایک جگہ قرآنِ کریم کے اندر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ شیطان نے اللہ کے سامنے اس بات کا دعوی کیا کہ وہ انسانوں کو ہر طریقہ سے اور ہر طرف سے گمراہ کرنے کی کوشش کرے گا، اللہ تعالی شیطان کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ:

﴿قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ﴾ (الأعراف:۱٦)

(اے اللہ! آپ نے چونکہ مجھے گمراہ کیا؛ اس لئے میں لوگوں کو بہکانے تیرے سیدھے راستے پر بیٹھوں گا پھر میں ان کے سامنے سے، پیچھے سے، ان کے داہنی طرف سے اور بائیں طرف سے بہکانے آؤں گا، پھر آپ ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہیں پائیں گے)

ان آیتوں میں شیطان کے اسی دعوی کا ذکر کیا گیا ہے، شیطان کے یہ الفاظ قابل غور ہیں، اور یہ بات بھی کہ اس نے اتنا بڑا یہ دعوی خود اللہ تعالی کے سامنے کھڑے ہو کر کیا تھا۔ شیطان کہتا ہے کہ اے اللہ! چوں کہ آپ نے مجھے گمراہ قرار دیا ہے، اس لیے میں صراط مستقیم پر آ کر میں بیٹھوں گا تا کہ میں ان کو گمراہ کرتا رہوں، دائیں سے بائیں سے، آگے سے پیچھے سے چہار طرف سے آ کر ان کو بہکانے کی کوشش کروں گا۔ تو وہ اپنے اس دعوی کو حقیقت بنانے کیا کچھ نہ کرتا ہوگا اور اس کے لئے کس قدر قوت و طاقت سے، اور اپنی عقل و تجربے سے کام لیتا ہوگا؟ اس کا اندازہ کرنا کوئی مشکل نہیں۔

شیطان صرف چار طرفوں سے بہکاتا ہے، کیوں؟

یہاں اس آیت میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ شیطان نے بہکانے کے لئے صرف چار طرفوں کا ذکر کیا ہے: آگے، پیچھے، داہنے اور بائیں کا، جبکہ جہات چھ ہیں، ان میں اوپر اور نیچے کا ذکر شیطان نے نہیں کیا، کیوں؟

اس کی وجہ علماء لکھتے ہیں کہ شیطان نے نیچے کی جہت کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ وہ نیچے سے آنا نہیں چاہتا، کیونکہ اس کے اندر کا تکبر اسے نیچے سے آنے میں مانع بنتا ہے، اس لیے کہ نیچے سے آنے میں جھکنا پڑتا ہے، اور جس میں تکبر ہوتا ہے وہ کبھی جھکنے کو گوارہ نہیں کرتا، اور اس نے اوپر کی جہت کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ شیطان کو اوپر سے آنے کی اللہ نے قدرت نہیں دی ہے، اس لیے کہ اوپر سے فرشتوں کے آنے کا مقام ہے، اللہ تعالیٰ نے اس راہ کو شیطان کے لیے مسدود کردیا ہے۔

شیطان صراط مستقیم پر؟ ایک عجیب نکتہ

اب اس آیت کے مضمون پر غور کرو کہ شیطان نے یہ کہا کہ میں صراط مستقیم پر بیٹھوں گا، ''لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ''

سوال یہ ہے کہ کیا شیطان بھی صراط مستقیم پر بیٹھتا ہے؟ جی ہاں! بیٹھتا ہے، مگر ایک ہے صراط مستقیم پر قائم ہونا کھڑا ہونا اور ایک ہے صراط مستقیم پر بیٹھنا، دونوں میں بڑا فرق ہے، ہر مسلمان، نیک آدمی، اللہ والا صراط مستقیم پر کھڑا ہوتا ہے، اور محاورے میں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صراط مستقیم پر چلنے کی غرض سے وہ اس پر کھڑا ہے اور چل رہا ہے، لیکن صراط مستقیم پر بیٹھنا الگ چیز ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ چلنے کے لئے نہیں، اس کو پار کرنے کے لئے نہیں، بلکہ کسی بری غرض و نیت سے اس پر ہی

بیٹھ گیا ہے۔ جیسے ڈاکو لوگ شاہ راہوں پر بیٹھ جاتے ہیں اور گزرنے والے قافلوں کو لوٹ لیتے ہیں بالکل شیطان کا صراط مستقیم پر بیٹھنا بھی اسی طرح کا بیٹھنا ہے کہ وہ اس پر بیٹھ کر لوگوں کے ایمانوں اور نیکیوں کو لوٹ لینا چاہتا ہے۔

یہیں سے ایک نکتہ کی بات بھی سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ کہ شیطان لوگوں کو بہکانے کے لئے صراط مستقیم پر آتا ہے، یعنی ان لوگوں کے پاس آتا ہے جو صراط مستقیم پر چل رہے ہیں، اسے تو انہی کو بہکانا ہے اور وہ لوگ جو پہلے ہی سے بہکے ہوئے اور گمراہ ہیں ان کو بہکانے کی اسے ضرورت کیا ہے؟ وہ تو بہکے ہوئے ہیں، لہذا صراط مستقیم پر آکر بہکانے کا حاصل یہ ہوا کہ وہ صراط مستقیم پر چلنے والوں کی تلاش و جستجو میں وہاں آتا اور وہاں بیٹھ کر ان کو بہکاتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر وہ کفر و معصیت اور جہالت و بغاوت کے راستے پر جا کر بیٹھے گا تو اس کو بہکانے کے لئے کون ملے گا؟ وہاں تو کافر ہوں گے، شرابی ہوں گے، زانی ہوں گے، لٹیرے ہوں گے، یہ سب لوگ پہلے سے بھٹکے و بہکے ہوئے ہیں، شیطان اتنا بے وقوف نہیں کہ وہ اپنی محنت ان کے پیچھے ضائع کر دے، لہذا وہ صراط مستقیم پر آتا ہے کہ یہیں اس کو مومنین ملتے ہیں، مسلمین ملتے ہیں، ذاکرین ملتے ہیں، نمازی ملتے ہیں، حاجی ملتے ہیں، اللہ والے ملتے ہیں۔

ایک عالم کا قصہ

مجھے ایک عالم کا قصہ یاد آیا کہ ان سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت! ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ اہل سنت میں سے ہوتے ہیں، اور وہ بہک جاتے اور شیعہ فرقے میں داخل ہو جاتے ہیں، کوئی قادیانی بن جاتا ہے، کوئی اور کسی گمراہ فرقوں و لوگوں میں داخل و شامل جاتا ہے، مگر ہم نے کبھی نہیں سنا کہ ان گمراہ فرقوں کے لوگ مسلمان

ہو گئے اور اہل سنت میں داخل ہو گئے ،اس کی کیا وجہ ہے؟ تو ان عالم نے بڑا عمدہ جواب دیا ،انھوں نے کہا کہ دیکھو! شیطان انہی لوگوں کو بہکا تا ہے اور ان ہی کے دلوں میں وسوسہ وشبہات ڈالتا ہے جو حق پر ہوتے ہیں ،اور جو پہلے ہی سے بہکے ہوئے ہوں ان کو شیطان ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے ۔لہذا بہکاوا اگر ہوگا تو اہل سنت ہی کو ہوگا ، نہ کہ اہل باطل کو۔اس لئے شیطان اہل حق کو بہکا تا ہے اور انہی میں سے کچھ لوگ بہک جاتے ہیں۔

سالکین کو شیطان کس طرح بہکا تا ہے؟

اب آیئے اصل بات کی طرف ،علماء نے بیان کیا ہے کہ صراط مستقیم پر بیٹھنے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ شیطان نیکیوں کے ذریعہ بھی انسانوں کو تباہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ اس طرح پر کہ جب نیک لوگ نیکی کرتے ہیں تو ان کے دل ودماغ کے اندران کی بڑائی کا تصور ڈالدیتا ہے،اور وہ نیکی کے کام کر کے اپنے کو بڑا سمجھتے اور ناز وفخر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ایک دفعہ حضرت سیدنا موسی علیہ السلام کے پاس شیطان پہنچا ،حضرت موسی علیہ السلام نے اسے دیکھا تو فرمایا کیا تو شیطان نہیں ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں میں شیطان ہوں۔حضرت موسی علیہ السلام نے کہا کہ مجھے یہ بتا کہ تو اب تک لوگوں کو گمراہ کرتا آیا ہے، گمراہ کرنے کے لیے سب سے بڑا کونسا حربہ اختیار کرتا ہے؟

اس نے کہا کہ میں اس طرح گمراہ کرتا ہوں کہ انسان کو اس کی نیکیوں پر تفاخر میں مبتلا کر دیتا ہوں۔نیکی کرتا ہے تو سمجھتا ہے کہ میں بہت بڑا آدمی ہو گیا ہوں، میں نے تو بہت کچھ کر دیا ہے، اپنی نیکیوں کو اچھا سمجھنا، اپنے آپ کو اچھا سمجھنا، اپنی عبادت ریاضت ومجاہدہ کو قابل فخر چیز سمجھنا، اپنے آپ کو اونچا اور سب سے اعلی سمجھنا، یہ عجب

وتکبر ہے۔اس عجب وتکبر کے راستے سے میں ان کو بہکایا کرتا ہوں۔(تنبیہ الغافلین)

معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک حربہ ہے شیطان کا، اور بہت بڑا حربہ ہے۔ چنانچہ بہت سارے لوگ عبادت کرتے ہیں، ریاضت کرتے ہیں، مجاہدات کرتے ہیں، علم کے میدان میں آگے بڑھتے ہیں اور مختلف قسم کی خدمات کرتے رہتے ہیں، اللہ کے دین کی اشاعت میں، اللہ کے دین کی دعوت میں، اللہ کے دین کو پھیلانے میں لگتے ہیں اور اسی کے ساتھ اس تکبر غرور اور فخر میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ ''ہم چوں ماڈنگرے نیست''، ہم تو بہت آگے بڑھ گئے ہیں، اب ہمارا کوئی مقابل نہیں، اور اسی کے ساتھ ساتھ پھر دوسروں کی توہین اور تضلیل اور دوسروں کے بارے میں بدگمانی، دوسروں کے بارے میں ایک قسم کے برے خیالات بھی دل میں جمالیتے ہیں، جس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ آدمی جتنا عبادت کرتا ہے اتنا نیچے آجاتا ہے، اس سے اللہ کی نظر میں وہ انتہائی ناقص ہوجاتا ہے اور آخری منزل میں اس کو گرا کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

ایک بزرگ کی قیمتی نصیحت

اس لئے سالک کو ہمیشہ اپنے آپ کو حقیر سمجھنا چاہئے، اسی عاجزی وانکساری سے ترقی ہوتی ہے۔ایک بزرگ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے کہا کہ حضرت کوئی نصیحت فرمائیے! انہوں نے ایک دومنٹ سوچنے کے بعد کہا کہ بھائی! کبھی پہاڑ پر چڑھے ہو، اس نے سوچا، اس کے بعد کہا کہ ہاں چڑھا ہوں، فرمایا کہ جب پہاڑ پر چڑھے تھے تو کس طرح چڑھے تھے؟ جھک کر چڑھے تھے یا اکڑ کے، اس نے کہا کہ جب چڑھنے کا موقع آیا تو جھک کے چڑھا تھا۔

آپ بھی سوچ کر دیکھ لیجئے کہ جب پہاڑ یا کسی بھی بلندی پر چڑھنے کا موقع آتا ہے تو انسان کیسا چڑھتا ہے؟ جھک جاتا ہے، جھک کر اوپر چڑھتا ہے۔اس نے

کہا کہ حضرت چڑھنے کے لیے جھک کر چڑھتا رہا، فرمایا کہ اچھا، جب چڑھے تھے تو اترے بھی ہوں گے، اترے تو کس طرح اُترے تھے؟ جھک کر یا اکڑ کر؟ اس نے کہا کہ اکڑ کے اترا تھا۔

اس لیے کہ اگر جھک کے اتریں گے تو لڑھک کر نیچے آ جائیں گے، اوپر سے نیچے کی طرف آتے وقت جھکنا نہیں چاہئے، بلکہ اکڑ کے آنا چاہئے، اس نے کہا کہ حضرت اکڑ کے آیا تھا۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ اس کے اندر بڑی عبرت ہے، وہ یہ کہ جو جھکتا ہے، اللہ اسے بلندی پر لے جاتا ہے، جو اکڑتا ہے، اسے اوپر سے نیچے لاتا ہے۔

کیسی اچھی مثال دی ہے، کیا بہترین نصیحت فرمائی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جھکنا اللہ کو پسند ہے، اگر ظاہری طور پر بھی آپ کسی بلندی پر پہنچنا چاہتے ہیں، حسی طور پر بھی کسی بلندی پر پہنچنا چاہتے ہیں تو وہاں بھی جھکنا ضروری ہو جاتا ہے اور جب آدمی اکڑتا ہے تو اوپر سے نیچے کی طرف آ جاتا ہے۔

اسی طریقے پر روحانی و باطنی طور پر جو بلندیوں پر پہنچنا چاہتا ہے تو اسے بھی جھکنا پڑتا ہے، جھکے گا، چڑھے گا، اکڑے گا تو نیچے آ کر مرے گا، یا نہیں تو کم از کم گرے گا؛ اس لیے یہ فرمایا گیا ہے کہ شیطان کا ایک راستہ یہ بھی ہے کہ عبادت، ریاضت، مجاہدہ، نیکی، دینی خدمات یہ سب کچھ کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کو اس طرح کے خیالات میں مبتلا کرتا ہے، جس کی وجہ سے وہ اللہ کی نگاہ میں گر جاتا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کا شیطان سے ایک سوال

بہ ہر حال شیطان کے مختلف حربے ہیں جن سے وہ بہکاتا ہے، یہاں یاد آیا کہ

حضرت سیدنا نوح علیہ السلام طوفان کے موقعہ پر جب سفینہ میں سوار تھے تو وہاں پر اچانک ان کو شیطان نظر آیا، انہوں نے کہا کہ تو یہاں بھی پہنچ گیا؟ اب میں تجھے نہیں چھوڑوں گا، جب تک کہ تیرا راز نہ معلوم کرلوں۔ اس کو حضرت نوح علیہ السلام نے پکڑ لیا اور فرمایا کہ تیرا راز مجھ کو بتا کہ تو گمراہ جو کرتا ہے وہ کس راستے سے کرتا ہے؟

تو اس نے کہا کہ پانچ باتیں ہیں، لیکن پانچ میں سے میں آپ کو تین بتاتا ہوں، دو نہیں بتاتا۔ حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے وحی آئی کہ اس مردود سے کہو کہ ہمیں ان تین کی ضرورت نہیں ہے، وہ دو ہی ہم کو بتادے؛ اس لیے کہ اصل تو وہی ہے راز۔ تو حضرت سیدنا نوح علیہ السلام نے کہا کہ مجھے ان تین حربوں کی ضرورت نہیں ہے، وہ دو بتا جو تو نہیں بتانا چاہتا۔ تو اب مجبور ہو گیا اور کہنے لگا کہ وہ دو باتیں جس سے میں لوگوں کو گمراہ کرتا ہوں، اور آپ کو بتانا نہیں چاہتا تھا وہ آپ سن لیجئے! ایک حسد اور ایک حرص۔ پھر شیطان کہنے لگا کہ حسد سے میں گرا اور حرص سے حضرت آدم گر گئے۔

اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو بنایا اور ان کو علم عطا فرمایا اور ان کی شان وشوکت کو فرشتوں کے سامنے ظاہر فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔ تو فرشتے تو سجدے میں گر گئے، ابلیس کو تکبر نے روکا، تکبر کے بعد حسد پیدا ہوا، حسد اس لیے پیدا ہوا کہ ان کی وجہ سے میں اللہ کی نگاہ میں گر گیا ہوں، اب کسی نہ کسی طرح ان کو بھی گرانا ہے، یہ ہے حسد۔ جب کسی کے پاس کوئی کمال دیکھے، جب کسی کے پاس حسن وجمال دیکھے، جب کسی کا عطا ونوال دیکھے، جب کسی کے اندر بڑائی دیکھے، جب کسی کے اندر علم دیکھے، جب کسی کے اندر مال ودولت کی فراوانی دیکھے، اس وقت دل کے اندر یہ خواہش کا ہونا کہ اس سے ساری

چیزیں چھن جائیں، چاہے مجھے ملیں کہ نہ ملیں، اس کے پاس بھی نہ رہیں، یہ ہے حسد کی بیماری، یہ حسد اللہ کی نگاہ میں بہت بری چیز ہے۔

شیطان نے سوچا کہ اللہ نے اُن کو اتنا اونچا بنایا ہے، ان کو بھی گراؤں گا، میں جیسے گر گیا ان کو بھی گراؤں گا، اس کے بعد اس حسد میں مبتلا ہو کر وہ فکر میں رہا کہ کس طرح ان کو میں ذلیل وخوار کرنے میں کامیاب ہو جاؤں؟ یہ ہے حسد جس کی وجہ سے شیطان گمراہ ہوا۔

اور حضرت آدم کو جس درخت سے منع کیا گیا تھا، جا کر اس کو کھالیا تھا، اس لئے کہ شیطان نے قسم کھا کھا کر ان سے کہا تھا کہ میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ اس درخت کو کھانے کا اتنا بڑا فائدہ ہے، اور فائدہ یہ ہے کہ آپ اس کو کھالیں گے تو کبھی نہیں مریں گے، ہمیشہ زندہ رہیں گے، انہوں نے کہا کہ بہت اچھا، کھالیں گے تو حرص میں آ کر کھا گئے، اس کو شیطان نے کہا کہ حسد نے مجھے تباہ کیا اور حرص کی بیماری نے حضرت آدم علیہ السلام کو گرا کر رکھ دیا۔

عبرت وموعظت

میرے بھائیو اور دوستو! شیطان کے یہ سارے راز ہم کو اللہ کے کلام کے ذریعے ملے، انبیاء کرام سے ملے، بزرگوں کے کلام کے ذریعے ہم کو ملے، ان ساری چیزوں سے ہم کو معلوم ہوا کہ شیطان کس کس طریقے پر انسان کو بہکاتا ہے، اور ہمیں گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور پھر اللہ سے دوری میں مبتلا کرتا ہے، جب ہمیں یہ سب چیزیں معلوم ہو گئیں تو اب ہم ان ساری چیزوں سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو چوکنا رکھیں۔

قرآن کریم نے ہم کو بتادیا ہے ﴿اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ﴾ (شیطان

کھلا ہوا دشمن ہے)(القصص:۱۵)

اگر کوئی آپ کا باپ یا استاذ، یا آپ کا دوست، آپ کو بتا دے کہ فلاں آدمی سے چوکنا رہو، اس لیے کہ وہ تمہارا دشمن ہے، تو آپ کو یقین آتا ہے اور آپ بچتے ہیں کہ نہیں بچتے؟ باپ کی بات پر یقین، استاذ کی بات پر یقین، شیخ کی بات پر یقین، دوست کی بات پر یقین، لیکن اللہ کہہ رہا ہے کہ شیطان ہمارا کھلا دشمن ہے، مگر افسوس کہ اس پر یقین نہیں۔ اور وہ چیزیں جو شیطان ہم کو گمراہی میں پھنسانے کے لیے اختیار کرتا ہے، ان چیزوں کو بڑی آسانی سے ہم اختیار کرتے چلے جاتے ہیں، بہت بڑی ہمارے لیے عبرت کی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مکائد شیطان کو سمجھنے کی ہمیں توفیق دے، اور اس سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ ہمیں بھرپور توفیق وہمت عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰه رب العالمین

اللہ تعالیٰ ہی کو مقصود بنائیے

باسمہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ ہی کو مقصود بنایئے

اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ﴾ (الانشراح:۷-۸)

حضرات!

آپ کے سامنے قرآن کریم کی ایک مشہور سورت کی آخری آیتیں تلاوت کی گئی ہیں، جس کو ''سورۂ الم نشرح'' یا ''سورۂ انشراح'' کہا جاتا ہے، اور ان آیات میں ایک نہایت اہم مضمون ارشاد فرمایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ﴾

(اے ہمارے نبی! جب آپ فارغ ہو جائیں تو محنت کیجئے اور اپنے رب ہی کی طرف رغبت کیجئے)

اس میں نبی اکرم ﷺ سے خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اے نبی ﷺ! آپ فارغ ہو جائیں، کس کام سے؟ اپنے دعوتی اور تبلیغی اور علمی و اصلاحی، جہادی اور مختلف قسم کے جو کام آپ کے سپرد ہیں، ان سے فارغ ہو جائیں تو پھر عبادت کے لیے تیار ہو جایئے اور اس میں خوب محنت کیجئے اور پھر اپنے ہی رب کی طرف پورے پورے طور پر متوجہ ہو جایئے۔

یہ آیتیں بڑی قابل غور آیتیں ہیں، اگرچہ خطاب ہے نبی اکرم ﷺ کو، لیکن

آپ کے واسطے سے تمام لوگوں کو ہے اور بالخصوص امتیوں کو، اور پھر بالاخص سالکین کو جو اللہ کے راستے میں چلنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

آیت زیر بحث کی تفسیر

اب آیئے ان آیات کے معنی پر غور کریں۔ اس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ﴾ (اے ہمارے نبی! جب آپ فارغ ہوجائیں تو محنت کیجئے اور اپنے رب ہی کی طرف رغبت کیجئے)

اس میں جو یہ فرمایا کہ ''جب آپ فارغ ہوجائیں'' اس سے مراد یہ ہے کہ جب آپ اپنے دنیوی امور سے اور اپنی دینی و نبوی ذمہ داریوں سے فارغ ہوجائیں، ''فَانْصَبْ'' تو آپ عبادت میں اپنے کو لگا دیجئے۔ چنانچہ مفسرین کرام نے فارغ ہونے کے معنی میں دنیوی امور و دینی امور دونوں کو مراد لیا ہے۔ اسی لئے بعض نے فرمایا کہ ''جب آپ دنیوی کاموں سے فارغ ہوجائیں''، بعض نے کہا کہ ''جب آپ جہاد سے فارغ ہوجائیں'' اور بعض نے کہا کہ ''جب آپ تبلیغ وحی سے فارغ ہوجائیں''۔ (دیکھو تفسیر ابن کثیر و روح المعانی)

لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ آپ جب اپنے دنیوی و دینی کاموں و ذمہ داریوں سے فارغ ہوجائیں تو اب آپ خالص اللہ کی عبادت میں اپنے کو لگا دیجئے، اب کوئی اور مشغولیت نہ ہو، کسی کی جانب دھیان نہ ہو، بلکہ صرف اور صرف عبادت الٰہی میں مصروف ہوجائیں۔ اور ''وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَب'' (اپنے رب ہی کی جانب رغبت کیجئے) کیا مطلب؟ مطلب یہ کہ اب آپ کو کسی اور کام سے کوئی مطلب نہ ہو، حتیٰ کہ دعوت و تبلیغ، تعلیم و تفہیم وغیرہ سے بھی کوئی مطلب نہ ہو، بلکہ صرف اپنے رب کی جانب توجہ و رغبت کیجئے۔

بلاغت کا ایک قاعدہ

اس آیت میں ایک بات طالب علموں کو سمجھنے کی ہے، یہاں طلبہ بھی موجود ہیں وہ غور کریں، وہ یہ کہ عربی میں اصل یہ ہے کہ پہلے فعل آتا ہے پھر فاعل ومفعول آتے ہیں، پھر اس فعل کے متعلقات آتے ہیں، جیسے ہم کہتے ہیں: " **تَكَلَّمَ زَيْدٌ خَالِداً فِيْ التَّارِيْخِ** "(زید نے خالد سے تاریخ کے بارے میں گفتگو کی) اس میں دیکھو پہلے " **تکلم** " ہے جو کہ فعل ہے، پھر " زید " جو کہ فاعل ہے، اس کے بعد " خالد " آیا ہے، وہ مفعول ہے، اس کے بعد " **في التاريخ** " ہے جو اس فعل کا متعلق ہے۔ لیکن کبھی کسی مصلحت سے ایسا بھی ہوتا ہے کہ متعلقات فعل کو پہلے اور فعل کو بعد میں لاتے ہیں، جیسا کہ اس آیت میں ہے: " **وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ** " اس میں " فارغب " فعل ہے اور " اِلی ربک " اس فعل کا متعلق ہے، اس لئے اصل تو یوں کہا جاتا کہ: " فارغب اِلی ربک " لیکن اس میں فعل کو بعد میں اور اس کے متعلق کو پہلے لائے، اس میں ایک مصلحت ہے، وہ یہ ہے کہ اس سے کلام میں حصر پیدا کرنا مقصود ہے۔ لہذا اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ": آپ اپنے رب ہی کی جانب رغبت کیجئے، اور کسی دوسری طرف رغبت نہ کیجئے " ۔ اس بات کے پیدا کرنے کے لئے یہ تقدیم و تاخیر کی گئی ۔ یہ بھی ایک قاعدہ ہے عربی زبان کا، بلاغت کا، جس کو علماء عربیت و بلاغت یوں تعبیر کرتے ہیں: " تقديم ما حقه التأخير يفيد الحصر " (اس چیز کو مقدم کرنا جس کا حق مؤخر ہونے کا ہے یہ حصر کا فائدہ دیتا ہے) لہذا اس آیت سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ اللہ تعالیٰ کو مطلوب یہ ہے کہ آدمی اپنے تمام دنیوی و دینی کاموں سے جلد سے جلد فارغ ہو اور صرف وصرف اللہ کی جانب متوجہ ہو، اسی کی عبادت میں لگ جائے، اور اس وقت کسی اور چیز کی جانب اس کی توجہ و رغبت نہ ہو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس کو واضح فرما دیا ہے کہ مسلمان کی شان کیا ہونی چاہئے ، دعوت وتبلیغ والوں کی شان کیا ہونی چاہئے ، درس وتدریس والوں کی شان کیا ہونی چاہئے ، محققین اور فقہاء کی شان کیا ہونی چاہئے اور مجتہدین کی شان کیا ہونی چاہئے ۔

ایک علمی نکتہ

اس آیت میں غور کرنے سے ایک نکتہ یہ بھی سمجھ میں آئے گا کہ آپ ﷺ کا کوئی کام دنیوی نہیں ہوتا تھا، آپ کی ساری مصروفیات دینی ہوتی تھیں، آپ کی صبح بھی دینی ، شام بھی دینی ، چلنا پھرنا، کہیں آنا جانا ، سفر کرنا سب دینی کاموں کے لئے ہوتا تھا، پھر بھی اللہ تعالی نے محمد الرسول اللہ ﷺ کو یہ حکم دیا کہ آپ اپنے ان دینی کاموں سے جو کہ عبادت غیر مقصودہ کی قبیل سے ہیں، جلدی فارغ ہو کر اللہ ہی کی طرف رغبت کیجئے اور عبادت مقصودہ یعنی نماز ، ذکر وغیرہ میں لگ جائیے ۔

جب دینی کاموں ہی سے جلدی فارغ ہو کر عبادت مقصودہ میں لگنے کا حکم ہے تو آپ اندازہ کر لیجئے کہ جو لوگ دنیوی کاموں میں لگے ہوئے ہیں تو ان کے بارے میں کیا حکم ہوگا۔ ارے بھائی! جو دینی چیزیں ہیں انہی میں نہیں ، جیسے تدریس ہے، تالیف ہے، تصنیف ہے، تحقیق ہے، مطالعہ ہے،، دعوت ہے، تبلیغ ہے، جب انہیں چیزوں میں مگن نہیں رہنا ہے تو اب سوچ لیجئے جو دین سے تعلق رکھنے والی ہی نہیں ہیں، وہ محض دنیا ہے، ان کے اندر کیسے دماغ لگایا جا سکتا ہے ۔

دنیوی چیزیں تین قسم کی ہیں

اب یہ سمجھئے کہ اس کے اندر جو مضمون آیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کو مقصود بنا کر زندگی

گزاری جائے ، دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں، بہت سے حالات ہیں، بہت سے مسائل ہیں، بہت سی ضرورتیں ہیں، بہت سی حاجتیں ہیں،لیکن ان سب میں مقصودِ اعظم انسان کے لیے اللہ کی ذات ہے، باقی سب چیزیں ضمنی ہیں۔ یاد رکھئے کہ دنیا میں چیزیں تین قسم کی ہوتی ہیں: ایک وہ چیزیں جو اللہ کو پانے کے راستے میں کام آنے والی اور مفید و معین ہیں، جیسے تعلیم ہے، تعلم ہے، پھر اس سے آگے بڑھیں تو تدریس اور وعظ ہے، نصیحت ہے، دعوت و تبلیغ ہے۔ دوسرے وہ چیزیں جو اللہ کے راستے میں حارج اور مانع بننے والی اور اس کے لے مضر و نقصان دہ ہیں، جیسے گناہ کے کام، اور تیسری وہ چیز ہیں جو اس میں نہ مفید و معین ہیں اور نہ مانع و حارج، جیسے انسان بہت سارے کام کرتا ہے اور اسے کرنے کی ضرورت بھی ہوتی ہے، کھانے کی ضرورت ہے، پینے کی ضرورت ہے، کمانے کی ضرورت ہے اور بیوی بچوں کے ساتھ رہنے کی ضرورت ہے اور مختلف لوگوں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے، تعلقات وابستہ کرنا پڑتا ہے، اور رشتہ داریوں کو نباہنا پڑتا ہے، دوستوں کے ساتھ بھی اٹھنا اور بیٹھنا پڑتا ہے۔

تو ان میں سے جو چیزیں کہ اس راستے میں مانع بننے والی ہیں، حارج بننے والی ہیں، ان سے دور رہنے کا حکم دیا گیا ہے، کیونکہ ان کاموں سے اللہ نہیں ملے گا اور جو چیزیں ایسی ہیں کہ مانع بھی نہیں اور حارج بھی نہیں وہ فضول اور بیکار ہیں، ان کو اپنی دنیوی ضرورت کے لئے اختیار کرے تو ٹھیک ہے، اور جو چیزیں اللہ کے راستے میں مفید ہیں، معین ہیں، مددگار ہیں، ان کو اختیار کرنے کا حکم ہے۔

لیکن ان میں بھی اس بات کا خیال و دھیان چاہئے کہ اصل مقصود اللہ کی ذات ہے، اور یہ دیگر چیزیں اگر چہ کہ اللہ کے راستے میں مفید و معین ہیں مگر ان کا درجہ ثانوی درجہ ہے، ان کو اولین درجہ دینا صحیح نہیں ہے۔

حضرت نبی ﷺ کی ذمہ داریاں

دیکھئے ،حضرت نبی اکرم ﷺ پر بہت ساری دینی و نبوی ذمہ داریاں تھیں: دعوت الی اللہ کی ذمہ داری، تبلیغ احکام کی ذمہ داری، لوگوں کو سمجھانے وافہام وتفہیم کی ذمہ داری، قرآن پڑھانے کی ذمہ داری، جہاد کی ذمہ داری، تعلیم کی ذمہ داری، اصلاح احوال کی ذمہ داری، وغیرہ۔ان میں بھی سب سے اہم ذمہ داری جس کے لیے نبوت دے کر نبی کو دنیا میں بھیجا جاتا ہے، وہ ہے دعوت الی اللہ ،لوگوں کو اللہ کا پیغام کو پہنچانا۔ یہ سب سے اہم ذمہ داری ہوتی ہے نبی کی اور یہ بالکل واضح وظاہر ہے کہ یہ سب اعمال دراصل اللہ کی جانب سے آپ پر عائد تھیں اوران کوادا کرنے پر ضرور بالضرور قرب خداوندی بھی نصیب ہوتا ہے ،مگر ان تمام ذمہ داریوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آپ سے کہا ہے کہ اے نبی! جب آپ ان کاموں سے، ان ذمہ داریوں سے فارغ ہوجائیں تو پھر عبادت کے لیے تیار ہوجایئے اور پھر اپنے ہی رب کو دیکھئے، کسی اور کو نہ دیکھئے، اپنے رب ہی کی طرف توجہ کیجئے ، کسی اور کو دھیان میں نہ لایئے، اپنے پروردگار ہی کی جانب رغبت کیجئے، کسی اور طرف رغبت والتفات ہی نہ کیجئے ۔تو اس میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سبجیکٹ {Subject} کیا ہے؟ اس آیت کا، اس آیت کی تھیم {Theme} کیا ہے؟ اس آیت کا مقصود اعظم کیا ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ اصل مقصود اس کا یہی ہے کہ اللہ کی ذات کو مقصود بنایا جائے اور دیگر چیزوں کو ثانوی درجہ دیا جائے۔

دینی اعمال کی دو قسمیں

دنیا کے کام تو بہ ہر حال دنیا کے کام ہیں، ان کا تو کیا ذکر! میں کہتا ہوں کہ جو دینی کام واعمال ہیں، ان کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں: ایک دینی عمل وہ ہے جو مقصود

بالذات ہوتا ہے، دوسرا وہ دینی عمل ہے جو مقصود بالعرض ہوتا ہے، یعنی خود مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ جیسے علماء نے عبادت کی دو قسمیں بتائی ہیں: ایک عبادت مقصودہ، جیسے نماز، روزہ، حج وزکاۃ، اور دوسری عبادت غیر مقصودہ، جیسے وضو، غسل، مسجد میں داخل ہونا، قرآن پاک کو چھونا، وغیرہ، یہ دونوں قسم کے اعمال عبادتیں تو ہیں، لیکن ان کے اندر ایک بڑا فرق ہے کہ ان میں سے ایک عبادتِ مقصودہ ہے، اور دوسری عبادتِ غیر مقصودہ ہے۔

مقصودہ عبادات کی مثال جیسے نماز، روزہ، حج، زکوۃ، قربانی، تلاوت، ذکر، یہ سب عبادتیں وہ ہیں جو شریعت میں مقصود بالذات ہیں یعنی بذات خود وہی مقصود ہیں اور کچھ عبادتیں ایسی ہوتی ہیں جو بذات خود مقصود نہیں ہوتیں، بلکہ وہ کسی عبادت مقصودہ کا ذریعہ یا وسیلہ ہونے کی وجہ سے مقصود ہوتی ہیں۔

جیسے مثال کے طور پر وضو عبادت ہے، بہت بڑی عبادت ہے، بہت بڑا ثواب ہے اس کا، لیکن اس کے باوجود علماء نے لکھا ہے کہ یہ عبادت غیر مقصود عبادت ہے، یعنی خود وضو کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ وضو کا مقصود یہ ہے کہ وضو کرنے کے بعد نماز پڑھ لیں، وضو کرنے کے بعد ذکر کرلیں، وضو کرنے کے بعد تلاوت کرلیں، وضو کرنے کے بعد کوئی اور عبادت کرلیں۔ دیگر عبادات مقصودہ کے لیے اس کو وسیلہ اور ذریعہ قرار دیا گیا ہے، وضو بالذات کوئی عبادت نہیں ہے، بلکہ بالتبع وبالعرض عبادت ہے۔

اسی طریقے سے ہمارے اعمال کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک اعمال مقصودہ، ایک اعمال غیر مقصودہ۔ اعمال مقصودہ میں عبادات نماز روزہ، زکاۃ وحج، اوراذکار وغیرہ ہیں، یہ سب اعمال اسلام میں بذات خود مقصود ہیں۔

اور کچھ اعمال ایسے ہیں جو بذات خود مقصود نہیں ہیں، جیسے درس وتدریس خود مقصود نہیں ہے، تصنیف وتالیف خود مقصود نہیں ہے، دعوت وتبلیغ خود مقصود نہیں ہے،

بلکہ یہ سب ایک مقصود کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں، مقصود کیا ہے؟ دین وعلم دین کی حفاظت اور دوسرے لوگوں کو دین پر جما دینا وغیرہ ہے، اس کے لیے یہ درس وتدریس ووعظ و نصیحت، تقریر وتحریر، تصنیف وتالیف وغیرہ واسطہ ہیں، ذریعہ ہیں، وسیلہ ہیں۔

غیر مقصود کو مقصود کا درجہ دینا بدعت ہے

بھائیو! جب آپ نے اعمال مقصودہ اور غیر مقصودہ کو سمجھ لیا تو اب ان کے بارے میں ایک اصول سمجھ لیجئے۔ وہ یہ کہ غیر مقصود عبادت کو مقصود عبادت کا درجہ دے دینا بدعت اور مکروہ ہے۔ آپ کہیں گے دلیل کیا ہے؟ ہمارے لیے بہت بڑی دلیل حضرات فقہاء کا کلام ہے، اس لیے کہ حضرات فقہاء دین کو زیادہ سمجھتے ہیں، حضرات فقہاء کو اللہ تعالیٰ تفقہ فی الدین سے نوازتا ہے، اس وجہ سے ان کی بات ہمارے لیے کافی ہے۔

چنانچہ فقہاء نے مسئلہ لکھا ہے کہ وضو کرنے کے بعد کسی عبادت مقصودہ کے انجام دیئے بغیر دوبارہ وضو کرنا بدعت اور مکروہ ہے۔ آپ وضو کر کے آئے، نماز نہیں پڑھی، ذکر بھی نہیں کیا، تلاوت بھی نہیں کیا، کوئی عبادت نہیں کی، پھر چلے گئے وضو کرنے کے لیے، پھر جی چاہا کہ چلو ایک دفعہ اور وضو کریں، بہت بڑا ثواب ہے، اس سے گناہ بھی جھڑ جاتے ہیں، اس لیے ایک دفعہ اور کرلو تو فقہاء لکھتے ہیں کہ یہ مکروہ ہے، بدعت ہے؛ کیوں؟ اس لیے کہ وضو مقصودہ عبادت نہیں ہے، اور غیر مقصود عبادت کو مقصود عبادت کا درجہ دے دینا بدعت ہے۔

حاشیہ: (قال الإمام البغوی ناقلا عن الإمام أحمد في شرح السنة : " و تجديد الوضو مستحب إذا كان قد صلى بالوضوء الأول صلاة و كرهه قوم إذا لم يكن قد صلى بالوضوء الأول صلاة فرضا أو نفلا " (شرح السنة: ٤٤٩/١، مرقاة المفاتيح: ٢٢٥/٢، رد المحتار شامی: ١/ ١٢٩)

اب یہاں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جس طرح عبادت غیر مقصودہ کو عبادت مقصودہ کا درجہ دینا بدعت ومکروہ ہے، اسی طرح اعمال غیر مقصودہ کو اعمال مقصودہ کا درجہ دے دینا بھی بدعت ہے، اوراس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی اعمال غیر مقصودہ ہی کے پیچھے پڑ جائے کہ اسی کو بار بار کرنے لگے اور اعمال غیر مقصودہ میں اس قدر مصروف ہوجائے کہ اسے اعمال مقصودہ کو انجام دینے کا موقعہ ہی نہ ملتا ہو یا وہ خود ان کو اس اہتمام سے نہ ادا کرتا ہو، اور غیر مقصود اعمال کو ہی سب کچھ سمجھتا ہو تو یہ بھی ایک بدعت ہے، بلکہ شیطان کا بہت بڑا دھوکہ ہے کیونکہ شیطان یہ چاہتا ہے کہ آدمی اگر گناہ میں نہیں تو کم از کم اعمال غیر مقصودہ ہی میں لگا رہے، اور اعمال مقصودہ کو ادا نہ کر سکے۔

اس آدمی کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی صرف وضو ہی کرتا رہے، اور نماز نہ پڑھتا ہو، ذکر نہ کرتا ہو، تلاوت نہ کرتا ہو۔ اسی طرح جو لوگ اعمال غیر مقصودہ جیسے درس وتدریس، وعظ و بیان، تصنیف وتالیف اور دعوت وتبلیغ میں لگے رہتے ہیں اور نماز وذکر وغیرہ کی طرف دھیان نہیں دیتے یا ان کو اچھی طرح ادا نہیں کرتے وہ بھی یوں سمجھیں کہ صرف وضو پر وضو کر رہے ہیں، اور نماز ہی نہیں پڑھتے۔

مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ اسی فرق کو اور اسی نکتہ کو بتانا چاہتے ہیں کہ اعمال غیر مقصودہ کو ان کے درجہ پر رکھا جائے اور اعمال مقصودہ کو ان کا درجہ دیا جائے۔

اعمال مقصودہ کا درجہ بدلنے کا انجام

آج افسوس ہے کہ امت کا ایک طبقہ جہالت کی وجہ سے اعمال مقصودہ اور غیر مقصودہ میں فرق نہیں کر پاتا، اور ایک دوسرا طبقہ ہے جو اس کو جاننے کے باوجود اس کی طرف توجہ نہیں کرتا اور شیطانی دھوکہ میں پھنس جاتا ہے۔

اس صورت حال کا انجام ونتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اعمال مقصودہ کو نہ صحیح طریقے پر ادا

کرتا ہے اور نہ اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے؛ کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ جب آدمی کسی چیز کو مقصود بناتا و سمجھتا ہے تو اس کا ایک اثر ہوتا ہے دماغ پر، دل پر اور اسی کے ساتھ جذبات اور خیالات پر کہ آدمی اس کام کو عمدہ طریقہ پر، پوری دلجمعی کے ساتھ ادا کرتا ہے، اور اس کام کو ادا کرنے کے لیے کوشش کرتا ہے کہ دوسرے تمام کاموں سے جلدی جلدی فارغ ہو جائے اور پھر اس اصل و مقصود کام میں لگ جائے۔

اور اگر خدانخواستہ معاملہ الٹا ہو کہ مقصود کام کو غیر مقصود سمجھ لیا مثلاً مقصود ہے اللہ کو پانا، ایک آدمی نے اس کے خلاف درس وتدریس کو اپنی زندگی کا مقصود بنالیا، تو اب وہ کیا کرے گا؟ نماز جلدی جلدی سے پڑھے گا، اور درس وتدریس کے لیے تیاری کرے گا، ایک آدمی تصنیف وتالیف کو مقصود بنالیا کہ میری زندگی کا مقصود ہے تصنیف وتالیف، تو اب اسے نماز میں مزہ نہیں آئے گا، توجہ نہیں رہے گی، دل اس میں نہیں لگے گا، دل کہے گا جلدی جلدی نماز پڑھو، یہ کہاں کی مصیبت ہے، جلدی یہاں سے نمٹو اور جا کر اپنا وہ کام کرو، اور پھر لکھنے پڑھنے میں مشغول ہو جائے گا، کیوں؟ یہ سب دراصل اسی خیال کا اثر ہے۔ معلوم ہوا کہ اصل کو اصل اور غیر اصل کو غیر اصل سمجھنا چاہئے، اگر اس کا الٹا ہوا تو نتائج غلط سامنے آئیں گے۔

خواص بھی غلطی میں مبتلا

مگر افسوس کہ اس مسئلہ میں عوام تو عوام خواص بھی غلطی میں مبتلا ہیں، اور عام طور پر اس میں غلطی ہو رہی ہے اور مقصود کو غیر مقصود، غیر مقصود کو مقصود بنا لینے کی وجہ سے جو مقصود چیز ہے، اس کو تو جلدی جلدی نمٹاتے ہیں اور اپنے دوسرے کاموں کے اندر مشغول ہو جاتے ہیں۔ جو عوام ہیں وہ تو مقصود حیات نماز وغیرہ کو ٹال کر دنیا کے کاموں میں لگ جاتے ہیں، تجارت میں، بیوی بچوں میں وغیرہ، اور جو حضرات

خواص علماء وطلبہ ہیں وہ بھی مقصود عبادات کو جلدی جلدی ادا کر کے درس وتدریس و تقریر وتحریر، دعوت وتبلیغ وغیرہ میں لگ جاتے ہیں۔

چند مثالیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں:

مثلاً ایک صاحب کسی جامعہ ومدرسہ میں استاذ ومدرس ہیں، وہ سمجھ رہے ہیں کہ مجھے درس بڑا شاندار دینا ہے، اس کے لیے بہت مطالعہ کرنا ہے اور اس میں یہ رموز اور اسرار منکشف کرنا ہے، یا عجیب وغریب تحقیقات سامنے لانا ہے، محیر العقول باتیں پیش کرنا ہے اور یہی میری زندگی کا اصل کام ہے، مقصود حیات ہے۔ جب ان کے دماغ میں یہ سما گیا تو اب ان کو کہاں مزہ آئے گا نماز پڑھنے میں، ان کا دل کہے گا نماز جلدی سے پڑھو، الٹی سیدھی نمٹاؤ، سجدہ کرو جلدی سے، رکوع کرو جلدی سے، تلاوت کرو جلدی سے، تمام ارکان کو جلدی سے ادا کرو، اور پھر اپنے اصل کام ومقصود کام کے اندر لگ جاؤ۔ کیوں ایسا ہوا؟ اس لیے ہوا کہ انھوں نے اسکو مقصود سمجھا جس کو غیر مقصود سمجھنا چاہئے۔

دوسری مثال لیجئے کہ ایک طالب علم نماز کو جلدی جلدی نمٹا تا ہے، رکوع اور سجدے تو بس مرغی کی ٹھونگ کی طرح ادا ہور ہے ہیں؛ کیوں؟ اس لئے کہ اس کے دماغ میں سمایا ہے کہ اصل کام اس کا یہ ہے کہ اسے تکرار کرنا ہے، سبق یاد کرنا ہے، بڑا عالم بننا ہے، اور عربی ادب میں مہارت پیدا کرنا ہے، فقہ وحدیث کا ماہر بننا ہے، اور یہی زندگی کا مقصود ہے۔ اس خیال کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ اس کو نماز میں ذکر میں ،تلاوت میں، کوئی لطف نہیں آتا، بلکہ وہ نماز کو بھی بس سر سے ٹلانے پڑھتا ہے، دل سے نہیں پڑھتا۔

حالانکہ غور کیجئے کہ مدرسہ اس لئے کھولا گیا تھا تا کہ طلبہ خشوع خضوع والی نماز سیکھیں، عالم اس لئے بنایا جارہا تھا کہ وہ ذاکر بنے، ورنہ تو لغت کا عالم بنانا مقصود

نہیں تھا، بالفاظ دیگر اسے عارف بنانا مقصود تھا، اس لئے عالم بنایا جارہا تھا، اور یہ طالب علم ہے کہ اسی علم میں اٹک کر رہ گیا، آگے جو مقصود تھا وہاں تک پہونچا ہی نہیں اس کی وجہ بھی وہی ہے کہ مقصود اور غیر مقصود کی تمیز نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور مثال عوام کے اعتبار سے سن لیجئے کہ آج کل عموما اور اہل بنگلور میں خصوصا ایک بہت بڑی بیماری یہ چل رہی ہے کہ لوگ صرف بیانات سننے لگے ہیں، آج کسی کا بیان ہے تو کل کسی کا بیان ہے، صبح کسی کا بیان ہے تو شام میں کسی کا بیان ہے اور لوگوں کو بیان سننے کے علاوہ آگے کچھ عملی اقدام کرنا ہی نہیں ہے۔

اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ بیان جو کہ غیر مقصود عبادت ہے، اسے مقصودہ کا درجہ دے دیا گیا اور اس میں ایسا لگ گئے کہ مقصودہ اعمال فوت ہو رہے ہیں، رات دیر تک جلسوں میں مشغول ہو کر فجر کی نماز ترک ہو رہی ہے، مگر اس کا کوئی احساس بھی نہیں، بتاؤ کہ یہ شیطانی دھوکہ نہیں تو اور کیا ہے؟

الغرض اس طرح آپ غور کرتے چلے جائیں تو آپ کو ایسے بہت سے دیندار ملیں گے جو دین کے ان کاموں کو جن کا درجہ اعمال مقصودہ کا نہیں تھا ان میں ایسے منہمک ہو گئے ہیں کہ اعمال مقصودہ کو بھول گئے ہیں۔

یہ ایک عظیم غلطی ہے جو آج کے ماحول میں ہو رہی ہے۔ بڑوں سے، چھوٹوں سے اور علماء سے، مفتیوں سے، حدیث پڑھانے والوں سے۔ اللہ حفاظت فرمائے۔

امام اعظم ابو حنیفہ نے اللہ کو مقصود بنایا

ہمارے اکابرین ایسے تھے درس بھی، تدریس بھی، تبلیغ بھی، دعوت بھی، اور تصنیف بھی، تالیف بھی، تحقیق بھی، مطالعہ بھی اور اسی کے ساتھ ساتھ اللہ کے لیے اتنا بڑا حصہ کہ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

امام اعظم ابوحنیفہ دن بھر درس وتدریس، مسائل کا استنباط اور استخراج، قرآن میں حدیث میں غور وفکر، تدبر وتفکر، فقہ کی ترتیب وغیرہ میں مصروف رہتے اور جب شام ہوتی، عشاء کا وقت ہوتا، لوگ عشاء پڑھ کر چلے جاتے تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نماز کے لئے رکعت باندھ کر کھڑے ہو جاتے اور یہ رکعتوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا، یہاں تک کہ فجر کا وقت ہو جاتا تھا۔

شروع شروع میں سو رکعت نماز پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن کہیں جا رہے تھے، راستہ میں ایک شخص نے ایک اپنے ساتھی سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کو دکھا کر آہستہ سے کہا کہ یہ جو بزرگ جا رہے ہیں، یہ روزانہ پانچ سو رکعت پڑھا کرتے ہیں۔ وہ تو آہستہ سے کہہ رہا تھا لیکن امام صاحب کے کانوں میں اس کی آواز پہنچ گئی۔ امام صاحب نے کہا کہ اللہ اکبر! یہ میرے بارے میں یہ خیال رکھتا ہے کہ میں پانچ سو رکعت روزانہ پڑھتا ہوں جب کہ میں صرف سو ہی رکعت پڑھتا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ میں قرآن کی اس آیت کا مصداق بن جاؤں: ﴿وَيُحِبُّوْنَ أَنْ يُحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا﴾ (اور وہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے ایسی بات پر جو انھوں نے نہیں کی)

اگر میں اس کا مصداق بن جاؤں تو کیا ہوگا؟ جہنم کی سزا ہوگی۔ امام صاحب نے کہا کہ لوگ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ میں پانچ سو رکعت پڑھا کرتا ہوں تو میں آج سے پانچ سو رکعت پڑھا کروں گا۔ اور اس کے بعد سے آپ کا یہی معمول ہو گیا۔

پھر اس کے بعد ایسا ہی واقعہ ہوا کہ ایک دفعہ جا رہے تھے تو کسی آدمی نے امام ابوحنیفہ کو دکھا کر کہا کہ یہ بزرگ روزانہ ہزار رکعت نماز پڑھا کرتے ہیں، حالانکہ اس وقت پانچ سو رکعت پڑھتے تھے۔ امام صاحب نے اس کی یہ بات سن لی، اور کہا کہ

اگر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں ہزار رکعات پڑھتا ہوں حالانکہ میں صرف پانچ سو پڑھتا ہوں تو مجھے اللہ کے سامنے جواب دینا ہوگا، اس لیے میں آج سے ہزار رکعت نماز پڑھوں گا۔اور زندگی بھر یہی معمول رہا، کتابوں کے اندر لکھا ہے کہ چالیس برس تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کی ،آپ کی پوری پوری رات عبادت کے اندر گزر جاتی تھی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگوں کا عجیب حال تھا۔دیکھئے کس طرح اللہ کو مقصود بنا کر زندگی گذاری جاتی ہے۔لہذا پڑھو، لکھو، تحقیق کرو، مطالعہ کرو، اور لوگوں کے لیے نیک کام کرو، ہمدردی اور غمخواری کے کام بھی کرو، دعوت وتبلیغ کے کام بھی کرو، لوگوں کو نصیحت کرو، عبرت کی باتیں بتاؤ، اللہ کی طرف ان کو متوجہ کرو، لیکن ان ساری چیزوں کے ساتھ کبھی اس کو نہ بھولو کہ میں پیدا ہی ہوا ہوں اپنے رب کے لیے۔وہی مقصود ہے، وہی مطلوب۔

امام اوزاعی کی عبادت کا تذکرہ

حضرت امام اوزاعی بہت بڑے عالم تھے، مجتہد تھے اور ان کا بھی مسلک بہت زمانے تک دنیا میں چلتا رہا تھا، جیسے امام ابوحنیفہ کا، امام شافعی کا، امام مالک کا، امام احمد بن حنبل کا مسلک آج چل رہا ہے۔اسی طرح امام اوزاعی رحمۃ اللہ کا بھی مسلک چلتا تھا، لیکن جب ائمہ اربعہ کا مسلک بہت آگے بڑھ گیا، لوگوں کے اندر اس کو مقبولیت ہوگئی تو پھر دوسرے ائمہ کے ماننے والے ختم ہوگئے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی بہت بڑے مجتہد وامام تھے۔

ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ فجر کے بعد ان کے گھر پر پڑوس کی ایک

عورت آئی، امام اوزاعی گھر میں موجود نہیں تھے، چھوٹا سا گھر تھا، ایک طرف مصلی بچھا ہوا تھا، ایک طرف حضرت کی اہلیہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ عورت آکر ان کے بازو بیٹھ گئی اور کچھ باتیں کرنے لگی، اتنے میں اس کی نظر مصلی پر پڑی تو وہ عورت حضرت کی اہلیہ سے کہنے لگی: اماں جان! یہ دیکھئے، مصلی بھیگا ہوا ہے، اس پر کسی بچے نے پیشاب کر دیا ہوگا۔

حضرت کی اہلیہ نے کہا کہ ہمارے یہاں تو کوئی بچہ ہے نہیں، ہم بوڑھا بوڑھی دو ہی آدمی یہاں رہتے ہیں، ہمارے یہاں کوئی بچہ نہیں ہے۔ اس عورت نے کہا کہ: اگر بچہ نہیں ہے تو پھر پانی پڑ گیا ہوگا، یہ دیکھئے مصلی بھیگا ہوا ہے، تو حضرت کی اہلیہ نے مصلی پر اپنا ہاتھ پھیرا تو اس کے اوپر نمی تھی، یہ دیکھ کر کہا کہ یہ نہ پیشاب کی نمی ہے نہ ہی پانی کی نمی ہے، بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے حضرت پوری رات اس مصلی پر روتے رہتے ہیں، وہ تری ان کے آنسوؤں کی وجہ سے ہے جو تم کو نظر آرہی ہے۔

حضرت مرۃ ہمدانی کی عبادت

اسی طرح حضرت مرہ بن شرحبیل ہمدانی بہت بڑے عالم گزرے ہیں، تابعی ہیں، قرآن کی تفسیر میں ان کا ذکر کثرت کے ساتھ آتا ہے، ان کی عبادت و ریاضت کے بارے میں بہت سے عجیب باتیں منقول ہیں، حضرت حارث الغنوی کہتے ہیں کہ انھوں نے ایسا سجدہ کیا کہ زمین کی مٹی ان کی پیشانی کو کھا گئی۔ روزانہ چھ سو یا ایک ہزار رکعات پڑھا کرتے تھے، حضرت علاء بن عبد الکریم کہتے ہیں کہ ہم ان کی خدمت میں آتے تو ان کے چہرے اور ہاتھ پیر پر سجدے کا اثر نظر آتا، وہ کچھ دیر ہمارے ساتھ بیٹھتے پھر کھڑے ہو جاتے اور بس نماز پڑھتے رہتے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۴/۷۵، حلیۃ الاولیاء: ۴/۱۶۵)

محمد بن کعب قرظی کا ذکر خیر

ایک بزرگ محمد بن کعب القرظی کا ذکر بھی سنتے چلئے ، وہ بھی بہت بڑے عالم تھے، تابعی تھے، بہت سے صحابہ سے علم حاصل کیا تھا، بہت متقی واللہ والے تھے، انکی عبادت وآہ وبکا کا حال یہ تھا کہ رات بھر عبادت وریاضت کے ساتھ روتے رہتے تھے، بڑے بے چین ومضطرب نظر آتے تھے، ان کی والدہ نے ایک باران سے کہا کہ بیٹا! اگر میں نے بچپن سے اب تک تجھے نیک وپرہیزگار نہ دیکھتی تو تیرا یہ رونا دھونا دیکھ کر کہتی کہ کوئی بڑا گناہ تجھ سے ہوگیا ہے، اس لئے تو ایسا روتا ہے۔ اس پر حضرت محمد بن کعب نے کہا کہ اے اماں! ہوسکتا ہے کہ اللہ نے مجھے اس وقت دیکھ لیا ہو جبکہ میں کسی گناہ میں مبتلا تھا اور وہ مجھ سے یوں کہہ سکتا ہے کہ جا میں تیری مغفرت نہیں کروں گا۔ (صفۃ الصفوۃ:۱۳۲/۲، سیر اعلام النبلاء:۶۵/۵)

بھائیو! یہ تھے ہمارے اسلاف، جو ایک طرف علم کا پہاڑ وسمندر تھے اور علم کی نشر واشاعت ودعوت وتبلیغ، درس وتدریس میں لگے ہوئے تھے تو دوسری جانب ان کی راتیں ایسی ہوتی تھیں، عبادت وریاضت کا یہ حال تھا۔ اسی لئے امام شافعی کا قول کئی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ میں علماء کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ ایک وقت اپنا محض اللہ کے لیے خاص کر کے رکھیں: ''والی ربك فارغب'' والا معاملہ ہے۔

عالم کا کردار حضرت ابن مسعود کی نظر میں

اسی لیے حضرت سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ نے عالم کا کردار کیا ہونا چاہئے اس کے بارے میں فرمایا تھا:

'' ينبغي لقارئ القرآن أن يعرف بليله إذا الناس نائمون ، وبنهاره إذاالناس مستيقظون ، وببكائه إذا الناس يضحكون ، وبصمته إذا الناس

یخوضون ، وبخضوعه إذا الناس یختالون ، وبحزنه إذا الناس یفرحون“
(قاری یعنی عالم قرآن کے لئے مناسب ہے کہ وہ اپنی رات سے پہچانا جائے جب کہ لوگ سوئے ہوئے ہوں، اور اپنے دن سے پہچانا جائے جب کہ لوگ بیدار ہوں، اور اپنے رونے سے پہچانا جائے جب کہ لوگ ہنس رہے ہوں اور اپنی خاموشی سے پہچانا جائے جب کہ لوگ بحثا بحثی کرر ہے ہوں اور اپنی تواضع سے پہچانا جائے جب کہ لوگ ڈینگیں مارر ہے ہوں اور اپنے غم سے پہچانا جائے جب کہ لوگ خوشیاں منا رہے ہوں)(مقدمہ تفسیر قرطبی)

اس میں حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا ہے کہ قاریٔ قرآن کے لیے، عالم دین کے لیے، دین کو سمجھنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ رات اس طرح گزارے کہ رات سے اس کی پہچان ہو، جب ساری دنیا سورہی ہو تو یہ اٹھ کر پڑھ رہا ہو، بیدار رہ کر اللہ کو پکار رہا ہو، نماز پڑھ رہا ہو، دعا مانگ رہا ہو، اللہ کے سامنے گڑگڑا رہا ہو۔

یہ اس کی ادا ہونی چاہئے۔ آج لوگ اسکو بھول گئے، اس سے بالکل غافل ہو گئے، عوام بھی بھول گئے، علماء بھی بھول گئے، طلبہ بھی بھول گئے، مدرسین بھی بھول گئے، ان کو یاد ہی نہیں رہا کہ یہ بھی کوئی سبجکٹ Subject ہے ہماری زندگی کا، جو ہمارے لیے انتہائی ضروری ہے، بلکہ سب سے زیادہ ضروری ہے۔

کوشش کر کے تو دیکھو

آج لوگ کہتے ہیں کہ بڑوں کی اتباع کرنا اور ان کے نقش قدم پر چلنا، اللہ کو مقصود بنا کر زندگی گذارنا مشکل ہے، نماز کو پوری توجہ سے پڑھنا مشکل ہے۔

ہم صرف کہتے ہیں، کوشش نہیں کرتے، کوشش کریں تو ضرور ہو سکتا ہے۔
دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ جو حضرت تھانویؒ کے

استاذ ہیں اور دار العلوم دیوبند کے سب سے پہلے ناظم تعلیمات تھے، صدر المدرس بھی تھے۔ وہ درس دے رہے تھے، دوران درس جب یہ حدیث آئی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ''**من توضأ وضوئي هذا ثم يصلي ركعتين لا يحدث فيهما بشيء إلا غفر له ما تقدم من ذنبه**'' (جو آدمی میرے وضو کی طرح وضو کرے پھر ایسی دو رکعتیں پڑھے جس کے اندر کوئی وسوسہ، کوئی خیال نہ آئے تو اس کے پچھلے گناہ بخش دیے جاتے ہیں) (بخاری: ۱۹۳۴، مسلم: مشکاۃ: ۲۸۷)

حضرت مولانا یعقوب صاحب نے اس کی تشریح فرماتے ہوئے کہا کہ ایسی نماز پڑھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ تو ایک طالب علم نے اٹھ کر پوچھا کہ حضرت! ایسا ہو بھی سکتا ہے کہ ہم بغیر وسوسے کے نماز پڑھیں؟ تو اس پر حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ نے فرمایا کہ پوچھتے ہی رہو گے یا کبھی کرو گے بھی۔

اس کے بعد کہا کہ کر کے دیکھو کیوں نہیں ہوتا، اگر نہ ہونے والی بات ہوتی تو اللہ کے نبی ﷺ کیوں کہتے، کیا اللہ کے نبی ﷺ نہ کی جانے والی بات بتانے کے لیے آئے تھے؟ معلوم ہوا کہ انسان میں اسکی طاقت ہے، اسی لیے اللہ کے نبی نے فرمایا۔

لہذا کوشش کرنا ہمارے ذمہ ہے، محنت کرنا ہمارے ذمہ ہے، جب مجاہدہ کریں گے تو اللہ تعالی راہیں کھولیں گے۔ آج ہمارا حال یہ ہو گیا کہ ہم دنیا کے لئے تو بہت مجاہدہ کرتے ہیں، لیکن اللہ کو مقصود زندگی بنانے کے لئے مجاہدہ نہیں کرتے۔

کیا دنیا مقصود زندگی ہے کہ جس کے لئے ہم مجاہدہ کریں، کیا اللہ کی ذات غیر مقصود ہے؟ کیا بیوی بچے مقصودِ زندگی ہیں؟ کیا کھانا پینا مقصودِ زندگی ہے؟ کیا تجارت اور منڈیاں مقصودِ زندگی ہیں؟ کیا درس وتدریس مقصودِ زندگی ہے؟ تصنیف وتالیف مقصود زندگی ہے؟ نہیں ہرگز نہیں، مومن کا مقصود زندگی اللہ کی ذات ہے۔

یہی ہے آیت کا مقصود اور مطلوب جس کو میں سمجھانا چاہتا ہوں کہ اپنے تمام کاموں میں تفریق کریں، تقسیم کریں کہ کون سا کام محض دنیا کا ہے اور کون سا کام مقصود بالغیر ہے اور کونسا کام مقصود بالذات ہے، ان کے بارے میں اسی کے جیسا معاملہ کریں جیسے کہ ان کے ساتھ معاملہ ہونا چاہئے۔ اگر معاملہ ایسا نہیں ہو رہا ہے تو بھائی! ہم غلطی میں ہیں، اللہ کی اس آیت کی خلاف ورزی میں مبتلا ہیں۔

اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالی ہم سب کو اللہ ہی کو مقصود زندگی بنا کر زندگی گذارنے کی توفیق عطاء فرمائے۔

نماز کو نماز کیسے بنائیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نماز کو نماز کیسے بنائیں

نشانِ سجود تیری جبیں پر ہوا تو کیا
کوئی ایسا سجدہ کر کہ زمیں پر نشاں رہے

الحمد للّٰہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ . أما بعد

فقد قال اللّٰہ تعالی فی القرآن الکریم

أعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم ، بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿إِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ أَکْبَر﴾

(العنکبوت:۴۵)

محترم دینی بھائیو!

عبادتوں میں سب سے اہم ترین عبادت نماز ہے، مگر آج اس کے اندر بڑی کمی وکوتاہی آ گئی ہے، حالانکہ نماز ہی کے لئے ہم پیدا کئے گئے ہیں، اور ہم نماز کے علاوہ سارے کام کر رہے ہیں، تو اس کی مثال ایسی ہوئی کہ کسی آدمی کو ایک اسکول میں ٹیچر واستاذ کے عہدے پر مقرر کیا گیا لیکن وہ سارے اپنے دھندے کرتا ہے، سوائے ٹیچری کے۔ آپ بتائیے کہ اسے تنخواہ ملے گی؟ اور اسکو برداشت کیا جائے گا؟ اسی طرح ایک آدمی کو ایک فیکٹری میں اس لئے لیا گیا کہ فیکٹری میں کچھ چیزیں بنانے کی

ہوتی ہیں تو اس سلسلے میں کام کرے اور وہ آدمی ہے کہ سب کچھ کرتا ہے لیکن وہ کام نہیں کرتا جس کے لئے اسے مقرر کیا گیا ہے۔

آج ہم لوگوں کا ایسا ہی حال ہو گیا ہے کہ ہم پیدا ہی کئے گئے اس لئے کہ ہم اللہ کی عبادت کریں اور عبادت میں سب سے اہم ترین عبادت نماز ہے، لیکن ہم وہی عمل کرنا نہیں چاہتے۔ ہم کھانا چاہتے ہیں، پینا چاہتے ہیں، رہنا چاہتے ہیں، آرام و آسائش چاہتے ہیں، دنیا کی سب چیزیں کرنے کے لئے تیار ہیں، لیکن جس کے لئے پیدا کئے گئے اسی کے لئے تیار نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ہم سب بڑی غفلت میں مبتلا ہیں۔

بدترین چور

نماز کے بارے میں ایک تو وہ لوگ ہیں جو نماز ہی نہیں پڑھتے۔ دوسرے وہ جو نماز تو پڑھتے ہیں لیکن نماز کو نماز کے جیسا نہیں پڑھتے، حالانکہ نماز کو نماز کے جیسا پڑھنا چاہئے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:" أسرق الناس سرقاً الذی یسرق من صلاته " (لوگوں میں بدترین قسم کا چور وہ ہے جو نماز میں چوری کرتا ہے) صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! یہ نماز میں چوری کیسے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ نماز میں چوری یہ ہے کہ اس کا رکوع وسجدہ ٹھیک نہ ہو۔(المعجم الکبیر للطبرانی :۳۵۲۳، مجمع الزوائد :۲۷۲۲)

ایک حدیث میں فرمایا مرغی جیسا ٹھونگ مارتی ہے ایسا سجدہ نہ کرو یہ اللہ کو اور اللہ کے نبی ﷺ کو سخت ناپسند ہے۔(معجم الأوسط للطبرانی:۶۱۶۰)

ایک آدمی ایک کام کرے لیکن اس طرح نہ کرے جیسے کہ کرنا چاہئے تو اس کام کا

کوئی اعتبار نہیں ہوا کرتا، دنیا کا کوئی بھی کام ہو جب اس کے اصول وقوانین، اس کے قواعد وضوابط اور اس کے لوازمات اور اسکے طور وطریقے اور مالہ وماعلیہ کے ساتھ اس کام کو کیا جاتا ہے تو تب سمجھا جاتا ہے کہ وہ کام ادا ہو گیا اور اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو سمجھا جاتا ہے کہ وہ کام نہیں ہوا۔

اسی سے آپ سمجھ لیجئے کہ نماز کو نماز کے اصول وقوانین کے مطابق نہ پڑھے تو وہ نماز نماز نہیں ہے۔ قرآن کریم کے اندر اللہ تعالی نے نماز کے کچھ آثار اور نماز پر مرتب ہونے والے ثمرات کو بیان کیا ہے، اسی طرح قرآن وحدیث میں غور کرنے سے ہمیں نماز کو نماز بنانے اور نماز میں خشوع خضوع پیدا کرنے کے طریقے معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے میں نے ارداہ کیا کہ آپ کے سامنے نماز کے بارے میں کچھ اہم اہم چیزیں بیان کی جائیں جس سے کہ ہم اپنی نماز کو نماز بنانے میں کامیاب ہوسکیں اور اگر کامیاب نہ بھی ہوئے تو کوشش ضرور کریں اور کوشش کرنا ہی دراصل کامیابی ہے۔

لیکن اس وقت میرا مقصود نماز کے فقہی مسائل اور نماز کے سنن ومستحبات اور فرائض وواجبات کو ذکر کرنا نہیں ہے، بلکہ نماز کی کیفیات اور احوال کو بیان کرنا ہے۔

معروف اور منکر کے معنی

میں نے آپ کے سامنے یہ آیت پڑھی ہے: ﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَر﴾ (بلاشبہ نماز روکتی ہے، فحش وبے حیائی کے کاموں سے اور منکر یعنی غلط چیز سے)

شریعت میں منکر ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو غلط ہو اور شریعت کے اندر اس کا کوئی جواز نہ ہو، ایسی چیز کا نام شریعت میں منکر ہے اور جو چیز شریعت میں جائز ہے اور

شریعت نے اس کو مشروع کیا ہے، اس کا نام شریعت میں معروف ہے۔

منکر اور معروف کے لغوی معنی دیکھنے کے بعد پھر قرآن میں اسے جس معنی کے لئے استعمال کیا ہے، اس پر غور کرینگے تو واقعی قرآن کریم کی بلاغت کا اندازہ ہوگا۔

عربی زبان میں معروف کے معنی آتے ہیں مشہور کے، جیسے کہتے ہیں کہ فلاں صاحب بڑے معروف ہیں، تو جو جانا جائے، پہچانا جائے، سب لوگ جانتے ہوں، اس کو کہتے ہیں معروف۔ تو شریعت نے نیکی کا نام معروف رکھ کر یہ بتایا ہے کہ اسلامی معاشرے کے اندر نیکی جانی و پہچانی چیز ہوا کرتی ہے، انجانی کوئی چیز نہیں ہوا کرتی۔ اسی لئے اسلامی معاشرے میں نیکی معروف ہوتی ہے، مشہور ہوتی ہے۔

لیکن آج ہمارے معاشرے میں نیکی، معروف اور جانی پہچانی چیز ہونے کے بجائے انجانی چیز ہوگئی ہے، کہیں کوئی نماز پڑھنے کھڑا ہو جائے تو لوگ اس کو عجیب نظر سے دیکھیں گے، گویا کہ نہ کرنے کی کوئی چیز کر رہا ہو، اور اگر سگریٹ پھونک رہا ہے تو کوئی نہیں دیکھے گا، ننگا پھر رہا ہے، اسے کوئی نہیں دیکھے گا، اس لئے کہ کوئی تعجب کی بات نہیں، کوئی اسے معیوب نہیں سمجھے گا۔

لیکن اگر آپ اسٹیشن میں نماز پڑھنے لگیں تو غیر تو غیر اپنے بھی کچھ انجانی نگاہوں سے دیکھیں گے، کیا مطلب ہوا؟ آج ہمارے معاشرے کے اندر معروف چیز معروف نہ رہی حالانکہ وہ تو جانی و پہچانی چیز ہے۔

اور منکر کے معنی آتے ہیں انجانی، جس کو پہچانا نہ جاتا ہو، پتہ نہ ہو کہ کیا چیز ہے؟ اسکا نام ہے اصطلاح شریعت میں منکر۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ برائی مسلمان معاشرے میں ایک انجانی چیز ہوتی ہے، اس کو کوئی پہچانتا نہیں کہ کیا ہے؟ شراب کو مسلمان نہیں جانتا کہ یہ کیا ہے؟ جھوٹ وغیبت کو مسلمان سمجھتا ہی نہیں کہ یہ کیا ہے؟

اس لئے کہ اسلامی معاشرے میں اس کا رواج نہیں ہوتا۔

اس میں اللہ نے بتا دیا ہے کہ اسلامی معاشرے میں نیکی تو معروف ہوتی ہے اس لئے اس کا چلن اسلامی معاشرے میں ضرور ہونا چاہئے اور جو چیز غلط و حرام و ناجائز ہے وہ منکر ہے اس لئے اسلامی معاشرے میں یہ انجانی ہونی چاہئے اور لازمی طور پر اس کا چلن بھی معاشرے میں نہ ہونا چاہئے۔

نماز ہمیں برائیوں سے کیوں نہیں روکتی ؟

مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: ﴿اِنَّ الصّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَاءِ وَالۡمُنۡکَرِ﴾ (بلاشبہ نماز روکتی ہے، فحش و بے حیائی کے کاموں سے اور منکر یعنی غلط چیز سے) اس سے معلوم ہوا کہ نماز پڑھنے کے بعد نماز کا یہ اثر مرتب ہونا چاہئے کہ نماز نمازی کو برائیوں سے روکے، ورنہ وہ نماز جب بے حیائی و منکر سے نہیں روکتی تو اللہ تعالیٰ نے یہ کیسے فرما دیا کہ نماز ان سے روکتی ہے؟

یہاں پر ایک سوال علماء نے کھڑا کیا ہے کہ جب نماز ہر فحش و برائی سے روکتی ہے، زنا سے، چوری سے، ڈکیتی سے، جھوٹ سے، دھوکہ بازی سے، غیبت سے، چغلی سے، ظلم زبردستی سے، تو اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ نماز پڑھ رہے ہیں، لیکن جھوٹ بھی بول رہے ہیں، غیبت بھی ان سے جاری ہے، دوسروں کا مال بھی لوٹ رہے ہیں، غصب بھی کر رہے ہیں، حرام کاموں میں بھی مبتلا ہیں، یہ سب ناجائز کام کر رہے ہیں، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب بعض حضرات نے یہ دیا ہے کہ نماز روکتی تو ہے، لیکن لوگ رکتے نہیں، تو اس سے آیت پر کیا اشکال؟ اللہ نے یہ تو نہیں کہا کہ تم رک بھی جاؤ گے۔ نماز ایسی چیز ہے جو روکتی ہے، جیسے مولانا حضرات بہت سے برے کاموں سے روکتے

ہیں، کہ برائی نہ کرو، حرام نہ کرو، لیکن لوگ سن کر نہ مانیں اور الٹا سیدھا کرتے رہیں تو مولانا پر کیا اشکال واعتراض؟

دوسرا جواب جو بہت عمدہ وحقیقت کشا ہے، یہ ہے کہ آیت کا منشأ یہ بتانا ہے کہ نماز اگر واقعی نماز ہو تو بیشک اس کا اثر یہ مرتب ہوگا کہ آدمی واقعی گناہ سے بچنا شروع کر دے گا، لیکن نماز کو پہلے نماز تو بنانا چاہئے، نماز حقیقت میں نماز ہو، اس کے اندر وہ کمال، وہ خشوع، وہ خضوع ہو، اور اخلاص ہو، جب اس طرح نماز پڑھی جائے گی تو اس کا اثر یہی ہوگا کہ جب آدمی برائی کی طرف جانا چاہے گا تو اس کے سامنے نماز آئے گی کہ ابھی تو نماز پڑھ کے آیا ہے، کیا حرکت کرنے جارہا ہے؟ تو یہ آدمی فوراً برائی سے رک جائے گا۔ اس تقریر سے اس سوال کا جواب سامنے آ گیا کہ ہماری نماز ہمیں کیوں برائی سے باز نہیں رکھتی؟ معلوم ہوا کہ دراصل ہماری نماز نماز ہی نہیں ہوئی ہے، اگر نماز نماز ہو جائے تو اس کا یہ اثر ضرور مرتب وظاہر ہوگا۔

ایک عبرت ناک حدیث

اور نماز کا یہ اثر مرتب ہونا نماز کے نماز ہونے کی علامت ہے، اور اگر یہ اثر اس کا نہ مرتب ہو تو اس پر حدیث میں وعید آئی ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

"مَنْ لَمْ تَنْهَهُ صَلَاتُهُ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْفَحْشَاءِ لَمْ يَزْدَدْ مِنَ اللّٰهِ إِلَّا بُعْداً"

(جس آدمی کی نماز اسے برائی وبے حیائی سے نہ روکے تو اس کی یہ نماز اللہ سے دوری میں اضافہ کا ذریعہ ہوگی) (المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۰۸۶۲)

معلوم ہوا کہ نماز کے نماز ہونے کی پہچان اور علامت یہی ہے کہ وہ برائیوں سے روکتی ہے، اگر نماز برائیوں سے نہ روکے تو وہ نماز نہیں بلکہ اللہ سے بعد ودوری کا

ذریعہ ہے، جب آدمی واقعی نیکیوں پر چلنے لگتا ہے اور نماز کو واقعی طور پر پڑھتا ہے، اس میں اخلاص وللّٰہیت کا، خشوع وخضوع کا اور دلجمعی کا لحاظ رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کی حالت پلٹ دیتے ہیں، برا انسان بھی اچھا ہوجاتا ہے، اس کی برائیاں چھوٹنے لگتی ہیں، اس میں روز بروز سدھار ونکھار آتا جاتا ہے۔

نماز برائیوں سے کیسے روکتی ہے، ایک چور کا واقعہ

میرے شیخ ومرشد حضرت مسیح الامتؒ نے ایک واقعہ سنایا تھا کہ کسی زمانے میں ایک چور تھا، وہ ایک بادشاہ کے محل میں چوری کرنے کے ارادے سے گیا، رات کا وقت تھا اور محل کے ایک کمرے سے بادشاہ اور اس کی بیوی کی گفتگو کی آواز آرہی تھی، وہ کھڑے ہوکر سننے لگا، اگرچہ ایسا سننا ناجائز ہے، حرام ہے، چوری ہے، لیکن چور چوری ہی کرنے آیا تھا تو اسے سننے میں کیا چیز مانع ہوتی؟ آخر کو وہ چور ہی تو تھا۔ تو اس نے سنا کہ بادشاہ اپنی بیوی سے کہہ رہا ہے اور اس کی بیوی ہاں میں ہاں ملا رہی ہے کہ میں اپنی بیٹی کی شادی ایسے آدمی سے کرونگا جو نہایت متقی وپرہیزگار ہو، جو بہت بڑا اللہ والا ہو، میں میری بچی کی کسی اور سے شادی نہیں کرونگا۔

جب چور یہ بات سن رہا تھا کہ تو اس کے دل میں آیا کہ کیوں نہ میں ہی کچھ ایسا بن کر دکھاؤں کہ میرے ہی ساتھ شاہزادی کی شادی بادشاہ کردے۔ دل میں ایک حرص پیدا ہوگئی، اب وہ چوری کو تو بھول گیا، لیکن دھوکہ پر اتر آیا اور گھر میں جاکر بہت دیر تک سوچنے لگا کہ کس طرح میں اس بات میں کامیاب ہوسکتا ہوں؟ تو ایک تدبیر اس کی سمجھ میں آئی کہ بادشاہ کے محل کے قریب ایک مسجد ہے، اس مسجد میں جاکر بزرگانہ لباس پہن کر اور ان کی وضع قطع اختیار کرکے وہاں دن رات عبادت میں مشغول ہوکر بیٹھ جاؤں، تو شدہ شدہ بادشاہ تک بات پہونچے گی کہ کوئی آدمی

یہاں ایسا متقی پرہیزگار ہے جو دن رات اللہ کی عبادت میں مصروف ہے، تو ہوسکتا ہے کہ بادشاہ کی نگاہِ انتخاب میرے اوپر پڑ جائے اور میں چن لیا جاؤں اور شاہزادی سے میری شادی ہوجائے۔

بھائیو! یہ اس کا ایک نہایت حقیر اور ذلیل دنیوی مقصد تھا، جس کے لئے اس نے یہ ارادہ کیا، اور اس نے اپنے پروگرام کے مطابق بزرگانہ لباس و پوشاک، وضع قطع اختیار کر کے اس مسجد میں جا کر نمازوں پر نمازیں، ذکر و تلاوت، مراقبہ سب شروع کرلیا۔ اب زمانہ چلتا رہا، لوگوں میں شہرت ہوتی گئی کہ کوئی اللہ کے بہت بڑے ولی یہاں آگئے ہیں، جو دن رات عبادت کرتے ہیں۔ اب اس کی وجہ سے لوگوں کی آمد و رفت کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہاں تک کہ بادشاہ تک خبر پہونچ گئی کہ یہاں کوئی اللہ والے آکر بیٹھے ہیں، ہیں تو جوان لیکن زہد و عبادت میں لاجواب وتقوی وطہارت میں بے نظیر، جب بادشاہ کو یہ بات معلوم ہوئی تو اپنے ارادے کے مطابق غور وفکر شروع کردیا کہ شاہزادی کے متعلق جو سوچا تھا، اس کے لئے اسی کا انتخاب کرلیا جائے۔

بادشاہ نے اس سلسلہ میں گفتگو کے لئے اپنے وزیر کو بھیجا، وزیر اس شخص کے پاس مسجد میں پہنچا اور اس نے باادب اس سے کہا کہ میں آپ کی خدمت عالیہ میں بادشاہ جہاں پناہ کی طرف سے آیا ہوں ایک پیغام لیکر۔ اس نے کہا کہ کیا پیغام ہے؟ وزیر نے بتایا کہ بادشاہ نے کئی سال پہلے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اپنی لڑکی کا نکاح ایک ایسے شخص سے کریں گے جو بڑا ہی متقی و پرہیزگار ہو، اللہ والا ہو، اور وہ اس کی تلاش میں تھے، اب جو نظر گئی تو نظر انتخاب آپ پر آکر رک گئی ہے، لہذا بادشاہ نے مجھے بھیجا ہے کہ اس سلسلے میں آپ سے گفتگو کروں، اگر آپ اس کے لئے تیار ہوں تو فرمایئے، اگلی نشست کے اندر اس سلسلے کی کوئی کاروائی آگے بڑھائی جائے گی۔

یہ شخص جو دراصل اسی تمنا و آرزو میں یہاں آکر بیٹھا تھا، وہ بہت دیر تک یہ وزیر کی گفتگو سنتا رہا، اس کے بعد اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، وزیر نے پوچھا کہ کیا بات ہوگئی؟ تو کہنے لگا کہ آج جو پیغام لیکر آپ آئے ہیں، یہ پیغام مجھے منظور نہیں ہے۔ وزیر نے کہا کہ کیوں منظور نہیں؟ اس نے کہا کہ دیکھئے میں صاف صاف بات آپ کو بتاتا ہوں کہ میں اصل میں ایک چور تھا اور میں بادشاہ کے محل میں چوری کے ارادے سے ایک مرتبہ گیا تھا، پھر جو کچھ بھی ہوا اس کو سنایا اور اس کے بعد اس چور نے کہا کہ میں نے تو یہ وضع قطع اسی حرص کی وجہ سے اختیار کی تھی، لیکن جب میں یہاں آکر بیٹھا تو خدا نے مجھے اپنا بنالیا، اب بس اس کے بعد مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔

اللہ اکبر! جب عبادت عبادت ہوجائے، نماز نماز ہوجائے اور ذکر ذکر ہوجائے اور ہماری دیگر عبادتیں واقعی عبادتیں ہوجائیں تو بے شک یہ نمازیں اور عبادتیں انسان کو برائیوں سے روکتی ہیں۔

اللہ کے عظیم دربار کا تصور کریں

بہ ہر حال مجھے یہ کہنا ہے کہ آج ہمیں ہماری نمازوں کو نماز بنانے کی ضرورت ہے، لہذا میں اس سلسلہ میں چند اہم امور کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جس سے ان شاء اللہ نماز کو نماز بنانا آسان ہوجائے گا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جب ہم نماز کا ارادہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہم وضو کرتے ہیں، تو وضو کے وقت ہی اس کا تصور جمانا شروع کردیں کہ میں وضو کرنے کے بعد اللہ کے عظیم شاہی دربار میں جانے والا ہوں، عظیم خالق کے دربار، احکم الحاکمین کے دربار کے اندر حاضری کے لئے مجھے جانا ہے۔

حضرت زین العابدین علی ابن الحسنؓ کے واقعات میں ہے کہ آپ جب وضو کرنے بیٹھتے تھے تو آپ کے چہرے پر تغیر آ جاتا تھا، ایک رنگ آتا ایک جاتا تھا، چہرے کے تغیر کو دیکھ کر لوگ پوچھا کرتے تھے کہ حضرت! آپ وضو کرتے ہیں تو آپ کی حالت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے، چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ کیا تمہیں یہ نہیں معلوم کہ وضو کرنے کے بعد کس کے دربار میں جانا ہے؟ یعنی جب اللہ کے دربار عالی میں جانا ہے تو اس کی ہیبت کی وجہ سے یہ اثرات ہوتے ہیں۔

اس طرح جب اللہ کے دربار میں جانے کا تصور قائم ہو جائیگا اور پھر اللہ کی عظمت و بڑائی اور اس کی جلالت و کبریائی کا تصور بھی کیا جائیگا اور سوچا جائیگا کہ اگر ہم دنیا کے کسی بادشاہ کے دربار میں جائینگے تو ہماری کیا حالت ہوتی ہے؟ کیا کسی شاہی دربار میں آدمی ایسے ہی چلا جاتا ہے؟ بے خبری اور غفلت کے ساتھ اندر چلا جاتا ہے؟ نہیں، بلکہ جب وہاں جاتا ہے تو اسے پورا احساس ہوتا ہے کہ میں ایک بڑے آدمی کے دربار میں جا رہا ہوں، بادشاہ کے عظیم دربار میں جا رہا ہوں۔ لہذا جب یہ سوچتا ہوا جاتا ہے تو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس پر رعب وجلال کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔

لیکن ہم خدا کے دربار میں جاتے ہیں تو سوچے سمجھے بغیر چلے جاتے ہیں، اس لئے مسجد کو جاتے ہوئے اللہ کے رعب وجلال کا کوئی اثر ہم پر نمایاں نہیں ہوتا۔ اس لئے جب نماز کیلئے جائیں تو سوچ کر سمجھ کر اللہ کے دربار کی عظمت کا تصور کرتے ہوئے جائیں، اور پورے وقار کے ساتھ جائیں، ایسے طریقے سے نہ جائیں جو وقار کے خلاف ہو۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضورﷺ نے مسجد میں دوڑ کر جانے سے منع فرمایا ہے اور حکم دیا ہے کہ اطمینان کے ساتھ جاؤ، وقار کے ساتھ اللہ کے دربار میں جاؤ، اگر تم کو پوری نماز مل گئی تو الحمد للہ، نہ ملی تو بقیہ نماز اپنے طور پر مکمل کرو، نماز کو پانے کے لئے مسجد میں دوڑتے ہوئے جانا، یہ اللہ کے دربار کے آداب کے خلاف ہے۔

چنانچہ رسول اللہﷺ نے فرمایا کہ: "إذا أقيمت الصلاة فلا تأتوها تسعون ائتوها تمشون ، عليكم السكينة ، فما أدركتم فصلوا وما فاتكم فاقضوا" (جب نماز کھڑی ہو جائے تو تم دوڑ کر نماز کو نہ آؤ، بلکہ چل کر آؤ، اس طرح کہ تم پر وقار ہو، پس جو نماز مل جائے اس کو پڑھ لو اور جو نہ ملے تو قضا کر لو)

(بخاری: ۱/۱۲۴، مسلم: ۱/۲۲۰، صحیح ابن خزیمہ: ۲/۱۷۷)

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ جب نماز کے لئے جاتے تھے تو اس قدر آہستہ آہستہ چلتے تھے جیسے چیونٹی چلتی ہے، حتی کہ ان کے ایک شاگرد کہتے ہیں کہ اگر ان کے ساتھ چیونٹی بھی چلتی تو وہ اس سے بھی آگے نہ ہوتے۔ (حیاۃ الصحابہ: ۱۲/۷)

الغرض اسی تصور کے ساتھ اگر مسجد میں جائینگے تو نماز کے اندر بھی وہی تصور رہیگا اور اس تصور کو باقی رکھنا آسان ہو جائیگا اور جو آدمی کہ باہر کے خیالات کے ساتھ اور ادھر ادھر کے تصورات کے ساتھ اللہ کے دربار میں کھڑا ہوگا تو اسے کوئی احساس نہیں ہوگا کہ میں اللہ کے دربار میں کھڑا ہوا ہوں، بلکہ دنیا ہی اس کے ذہن میں آتی رہے گی۔ اس لئے یہ سب سے پہلا اصول و ادب اور طریقہ ہے کہ نماز کو جانے سے پہلے ہی اللہ کے دربار کا جلال اور اس کی عظمت و بڑائی کا تصور قائم کر لیا جائے۔

مسجد میں داخل ہونے کی نیت ودعا

دوسری بات یہ ہے کہ جب ہم مسجد جائیں تو مسجد میں داخل ہونے کی نیت بھی کریں اور دعاء بھی پڑھیں ،سب گھروں میں آپ بغیر نیت کے جائیں،کوئی مضائقہ نہیں،لیکن اللہ کے گھر میں جاؤ تو نیت کرکے جاؤ کہ میں اعتکاف کی نیت کرتا ہوں۔

اس لئے کہ جب نیت اعتکاف کے ساتھ مسجد میں جائینگے تو جب تک مسجد میں رہیں گے اور وہاں نماز پڑھیں گے،ذکر کریں گے،تلاوت کریں گے اور کوئی نیک کام کریں گے تو ہر ایک کے ثواب کے ساتھ آپ کو اعتکاف کا بھی ثواب مل جائیگا،اوراگر کسی وقت کوئی اور عبادت نہ کر سکیں تب بھی اعتکاف کا ثواب جاری رہے گا،اس لئے اعتکاف کی نیت کر کے جاؤ،نیت کے ساتھ دعاء پڑھو،دعاء کیا ہے؟

" بِسْمِ اللّٰهِ ، اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ ، اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ "(عمل الیوم واللیلۃ:۱۶۷،الاذکار للنووی:۴۴)

ایک بات یاد رکھیں کہ دعاء کی جاتی ہے، پڑھی نہیں جاتی ،آج ہمارا حال یہ ہے کہ دعاء کرتے نہیں ہیں،دعاء پڑھ لیتے ہیں،یہ بات صحیح نہیں۔دعاء پر غور کرو کہ ہم کیا پڑھ رہے ہیں؟ اس دعاء کا مطلب یہ ہے کہ ''اے اللہ! اپنی رحمت کے دروازے میرے لئے کھولدے''۔معلوم ہوا کہ مسجد میں آنے پر اللہ کی طرف سے رحمت کے دروازے کھولے جاتے ہیں،ورنہ اس موقعہ پر یہ دعاء کیوں تجویز کی جاتی، یہ مسجد میں داخلے کا وقت رحمت کے دروازے کھلنے وقت ہے،اس لئے اس موقعہ پر یہ دعاء تلقین کی گئی ہے۔اگر اللہ کے دربار میں حاضر ہوتے ہوئے یہ دعاء دل کی گہرائیوں سے کرینگے اور دعاء کو دعاء بنا کر کریں گے اور اللہ سے التجاء کی جائے گی تو

رحمت کے دروازے کھل جائیں گے، پھر بتاؤ کہ ہمارا کونسا مسئلہ اٹکا ہوا ہوگا؟ صحت کا، یا کھانے پینے کا یا تجارت کا، ملازمت کا، یا شادی کا، یا کوئی اور مسئلہ؟ اسی طرح دین وآخرت کا کوئی مسئلہ ہو، نجات کا، فلاح کا، کامیابی کا، حساب وکتاب کا، الغرض دین و دنیا کے جو بھی مسئلے حل ہوتے ہیں وہ اللہ کی رحمت سے حل ہوتے ہیں، اگر خدا کی رحمت رک جائے تو پھر انسان زندہ بھی نہیں رہ سکتا۔ اس لئے اس وقت خوب توجہ سے دعاء کرتے ہوئے مسجد میں داخل ہونا چاہئے۔

مسجد میں داخلے کا ادب اور حضرت گنگوہیؒ

جب ہم مسجد جائیں تو سب سے پہلے ہم اپنے جوتے سے بایاں پیر نکالیں اور داہنے پیر سے مسجد میں داخل ہوں، اس لئے کہ یہاں ایک تو جوتے نکالنے کا ادب بھی ہے اور ایک مسجد میں داخل ہونے کا ادب بھی، جوتے نکالنے کا ادب یہ ہے کہ پہلے بایاں پیر نکالو اور مسجد میں داخل ہونے کا ادب یہ ہے کہ پہلے سیدھا پیر داخل کرو۔

ایک عالم صاحب حضرت گنگوہیؒ کے مرید تھے، وہ کہتے ہیں کہ جب میں کتابوں میں یہ پڑھتا تھا کہ مسجد میں جاتے ہوئے پہلے بائیں پیر سے جوتا نکالو اور مسجد میں داہنا پیر داخل کرو تو مجھے اشکال ہوتا تھا کہ یہ دونوں باتیں کیسے جمع ہوسکتی ہیں؟ نکالنا ہے بایاں پیر سے جوتا، داخل کرنا ہے سیدھا پیر، تو وہ کہتے ہیں کہ میں حضرت گنگوہیؒ کے پاس گیا، اور جانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ میں یہ دیکھوں کہ حضرتؒ اس سنت پر کیسے عمل کرتے ہیں؟ جب نماز کا وقت آیا تو حضرت کے ساتھ ساتھ نماز کو گیا اور جب مسجد میں داخل ہوئے تو وہاں دیکھتا رہا کہ حضرت مسجد میں کیسے داخل ہوتے ہیں؟

وہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت گنگوہیؒ کو دیکھ رہا تھا کہ حضرتؒ نے پہلے اپنا بایاں

پیر جوتے سے نکال کر جوتے ہی پر رکھ لیا، پھر اپنا داہنا پیر جوتے سے نکال کر سیدھے مسجد کے اندر رکھا۔اب مجھے سمجھ میں آ گیا کہ اس طریقہ پر دونوں باتوں دونوں سنتوں پر عمل ہوسکتا ہے۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت پر عمل سیکھنے سے آتا ہے اور وہ سیکھنا اللہ والوں کی صحبت سے میسر ہوتا ہے۔

ادب مسجد اور سفیان ثوری کا واقعہ

بہ ہر حال مسجد میں بھی اسی تصور کے ساتھ ادب کا لحاظ رکھتے ہوئے جانا چاہئے کہ میں اللہ کے دربار میں داخل ہو رہا ہوں۔واقعہ سنا ہوگا حضرت سفیان ثوریؒ کا کہ ایک مرتبہ مسجد میں بے خیالی کے ساتھ چلے گئے،اور مسجد میں اپنا داہنا پیر پہلے داخل کرنے کے بجائے بائیں پیر سے داخل ہو گئے تو فوراً الہام ہوا اور اس الہام میں ان سے کہا گیا کہ اے ثور! یعنی (اے بیل) کیا ہمارے دربار میں آنے کا یہی ادب و طریقہ ہے؟ اللہ نے ان کو بیل کہا،اس لئے کہ یہ جو بیل و گدھے ہوتے ہیں،ان کے لئے کوئی اصول نہیں ہوتا،جو چاہے پہلے رکھو اور جو چاہے بعد میں رکھو۔لیکن انسان ہو کر بھی یہی بے اصولی کرے تو یہ بات قابل گرفت ہوتی ہے،بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت سفیان ثوری کو ثوری اسی واقعہ کی وجہ سے کہتے ہیں،مگر اس میں اشکال ہے؛ کیونکہ ثوری میں یائے نسبت لگی ہوئی ہے،اس لئے اس کا معنی تو یہ ہوگا کہ ''بیل والا'' حالانکہ اللہ نے ان کو خود بیل کہا ہے نہ کہ بیل والا،اس لئے صحیح بات یہ ہے کہ ثوری ان کو ایک قبیلہ کی طرف نسبت کی وجہ سے کہتے ہیں،الغرض جب یہ الہام ہوا تو فوراً اللہ کے سامنے سجدے میں پڑ گئے،رونے اور گڑگڑانے لگے اور معافی مانگنے لگے۔ لہذا مسجد میں داخل ہوتے ہوئے اس ادب کا لحاظ و دھیان ہونا چاہئے۔

نماز ایسی پڑھو جیسے زندگی کی آخری نماز ہو

اب آپ مسجد میں داخل ہو گئے اور نماز پڑھنا چاہتے ہیں، تو نماز شروع کرنے سے پہلے کیا تصور ہونا چاہئے؟ اس سلسلہ میں ایک بات حدیث میں آتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:" إِذَا صَلّٰى أَحَدُكُمْ فَلْيُصَلِّ صَلَاةَ مُوَدِّعٍ ، صَلَاةَ مَنْ لَا يَظُنُّ أَنَّهُ يَرْجِعُ إِلَيْهَا أَبَداً"(کنز العمال:۲۰۰۷۷)

اس حدیث کا مطلب یہ ہیکہ جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو اس کو چاہئے کہ اس طرح نماز پڑھے جیسے کوئی رخصت ہونے والا نماز پڑھتا ہے یعنی جیسے وہ شخص جس کو یہ یقین نہ ہو کہ پھر دوبارہ نماز پڑھ سکے گا۔

یہی بات ایک اور حدیث میں آئی ہے کہ ایک صحابی نے آکر آپ ﷺ سے درخواست کی۔ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! مجھ کو نصیحت فرمائیے، لیکن مختصر فرمائیے۔ صحابہ کی بھی عجیب بے تکلفی تھی، تو ان کی درخواست پر اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:" إِذَا قُمْتَ فِيْ صَلَاتِكَ فَصَلِّ صَلَاةَ مُوَدِّعٍ"(جب تم نماز پڑھو تو ایسی نماز پڑھو جیسا کہ رخصت ہونے والا پڑھتا ہے۔(ابن ماجہ:۴۱۷۱، مسند احمد:۲۳۴۸۹، معجم کبیر طبرانی:۱۲۸/۴)

اس حدیث میں ہمیں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ہم جب نماز پڑھیں تو اس طرح پڑھیں جیسے رخصت ہونے والا نماز پڑھتا ہے ، رخصت ہونے والے سے کیا مراد ہے؟ شارحین حدیث نے اس کا ایک مطلب یہ بیان فرمایا کہ اس سے مراد وہ ہے جو لوگوں کو رخصت کرنے والا ہو، تو جس طرح لوگوں کو رخصت کرنے والا رخصت کر کے اپنے کاموں میں پوری طرح منہمک و مشغول ہو جاتا ہے اسی طرح نماز پڑھنے والے کو بھی چاہئے کہ وہ سب کو رخصت کر دے اور دل سے نکال دے

اور اللہ کی جانب پوری طرح متوجہ ہو جائے۔ علامہ مناوی نے ایک مطلب یہی لکھا ہے۔ (دیکھو: فیض القدیر: ۶/۴۸۹)

اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس سے مراد مرنے والا اور سب کو چھوڑ کر اللہ کے دربار میں حاضر ہونے والا ہے، گویا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نماز اس طرح پڑھو جیسے یہ تمہاری آخری نماز ہو اور اس کے بعد پھر تم کو اس کا موقعہ نہ ملے گا، اور اس کی تائید خود حدیث کے ان جملوں سے ہوتی ہے جیسے اوپر کی حدیث میں فرمایا کہ: ”صَلَاةَ مَنْ لَا يَظُنُّ أَنَّهُ يَرْجِعُ إِلَيْهَا أَبَداً“ (یعنی اس شخص کی سی نماز جس کو دوبارہ نماز پڑھنے کا یقین نہ ہو) اور ایک حدیث میں اس طرح فرمایا کہ: ” صلاة مودع كأنك لا تصلى بعدها“ (مسند الشھاب: ۲/۹۳)

اس سے معلوم ہوا کہ نماز ایسی پڑھنا چاہئے کہ یہ یقین ہو کہ یہ میری زندگی کی آخری نماز ہے اور یہ سمجھو جیسے تمہاری موت آ رہی ہو اور جو نماز تم پڑھنے جا رہے ہو وہ تمہاری آخری نماز ہے۔

اللہ اکبر! کیا عجیب نصیحت کی اللہ کے نبی ﷺ نے، لہذا جب نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوں تو اللہ کے نبی ﷺ کے اس ارشاد مبارک کو بھی ذہن میں لے آؤ کہ ہوسکتا ہے کہ اس کے بعد مجھے موقعہ نہ ملے، یہی میری آخری نماز ہو، یہی رکوع وسجدہ میرا آخری رکوع وسجدہ ہے، یہ میرا اللہ اکبر کہنا آخری ہے، جب آدمی یہ سوچ کر نماز پڑھے گا تو آپ اندازہ کر لیجئے کہ اس کی نماز کیسی شاندار ہوگی۔

گویا کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو

پھر جب نماز شروع کرو کہ یہ سمجھو کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں یا کم از کم اللہ تو مجھے ضرور دیکھ رہے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ جب حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ ﷺ سے

سوال کیا کہ احسان کیا ہے؟ تو اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا ''أن تعبد اللّٰه کانك تراه فان لم تکن تراه فانه یراك'' (نماز اس طرح پڑھ، عبادت اس طرح کر گویا تو اللہ کو دیکھ رہا ہے، اگر اتنی طاقت تیرے اندر نہیں ہے تو یہ خیال کر کہ اللہ تجھ کو دیکھ رہا ہے)(بخاری:۱۲/۱، مسلم:۲۷/۱)

اس حدیث میں نمازی کے دو حال بتائے ہیں ،ان دو میں سے ایک حال ضرور ہوگا، ایک یہ کہ نمازی یہ خیال کرے کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں، یہ تو بہت مشکل ہے، اسی لئے حدیث میں یہ کہا کہ ''کانك تراه'' (گویا کہ تو اللہ کو دیکھ رہا ہے) ''گویا کہ'' کیوں فرمایا؟ اس لئے کہ حقیقت میں دیکھ تو نہیں رہا ہے، صرف تصور کرنا ہے، اس لئے دیکھنے والے کی طرح ہو گیا ہے، اور اگر اتنا خیال جمانا مشکل ہو تو دوسرا حال یہ ہے کہ خیال کرے کہ اللہ مجھے دیکھ رہے ہیں، میرے عمل کو، میرے سکون کو، میری ہر ادا کو، اٹھنے اور بیٹھنے کو سب کو دیکھ رہے ہیں۔

جیسے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ سے فرمایا ہے ﴿ وَنَرَاكَ حِیْنَ تَقُوْمُ وَتَقَلُّبَكَ فِی السَّاجِدِیْنَ ﴾[الشعراء:۲۱۹]

اللہ تعالی اپنے نبی ﷺ سے فرمارہے ہیں کہ ہم آپ کو دیکھ رہے ہیں جبکہ آپ نماز میں کھڑے ہوتے ہیں اور ساجدین میں یعنی نماز پڑھنے والوں میں جو آپ کا تقلب ہو رہا ہے، رکوع، سجدہ، جھکنا اور اٹھنا یہ سب ہم دیکھ رہے ہیں۔

کیا عجیب جملہ ہے، حضور ﷺ سے خطاب ہے کہ اے نبی ﷺ آپ کا اٹھنا اور آپ کا بیٹھنا اور آپ کا رکوع وسجدہ جو نمازیوں کے درمیان ہو رہا ہے۔ یہ اللہ دیکھ رہے ہیں اور اللہ کے علم میں موجود ہے۔ یہ سن کر حضور ﷺ کو کیا مزہ آیا ہوگا؟ جب معشوق ومحبوب دیکھ رہا ہو اور عاشق اس تصور کے ساتھ ہو کہ وہ میرا محبوب مجھ کو دیکھ رہا ہے تو اسوقت

آپ کی نماز میں جو لطف اور مزہ اور کیف پیدا ہو رہا ہوگا، اس کا تو کوئی تصور ہی نہیں کر سکتا۔

الغرض اس طریقے پر اللہ تعالیٰ کے دیکھنے کا اور اس کے جاننے کا یقین ہمارے دلوں میں ہونا چاہئے ،جب نماز شروع کرنے سے پہلے ہم اتنے مراحل سے گزریں گے تو بھائیو نماز میں وہ کیفیتیں پیدا ہونگی جو مطلوب ہیں۔

حاتم اصمؒ کی نماز کی کیفیت

ایک بزرگ تھے حاتم اصمؒ،ان کے پاس ایک آدمی آیا اور آ کر کہنے لگا کہ حضرت! آپ ماشاءاللہ بہت اچھی نماز پڑھتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ میں بھی آپ سے نماز پڑھنا سیکھوں، مجھے آپ بتایئے کہ آپ نماز کیسے پڑھتے ہیں؟اس کی کیفیت بیان کیجئے ؟ تو اس کے جواب میں حضرت حاتم اصمؒ نے کہا کہ جب میں نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہوں تو اللہ کو حاضر و ناظر جانتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اللہ میرے سامنے ہے اور یہ سمجھتا ہوں کہ میرے داہنی طرف جنت رکھی ہوئی ہے اور میرے بائیں طرف دوزخ رکھی ہوئی ہے اور یہ سمجھتا ہوں کہ میرے پیچھے شیطان مجھے بہکانے کے لئے کھڑا ہے۔اور کہتے ہیں کہ جب نماز شروع کرتا ہوں تو یہ سمجھ کر شروع کرتا ہوں کہ یہ میری آخری نماز ہے،اس کے بعد شاید مجھے موقعہ نہ ملے۔اس طرح میں نماز پڑھتا ہوں۔

اس تصور کے ساتھ نماز پڑھیں گے تو بتایئے کہ نماز میں کچھ مزا اور لطف آئیگا کہ نہیں آئیگا؟ ضرور آئے گا۔

وہی نہیں ہے جس کے لئے نماز ہے

بھائیو!اب تو ہماری نماز کا حال ایسا ہے کہ دماغ میں ساری گندگی بھری ہوئی

ہے، ساری دنیا کی گندگی اس میں ہے،دنیا کی ناپائدار چیزوں کی محبت ،الفت ، ساری گندگی وغلاظت کولیکراللہ کے دربار میں آکرکھڑے ہوگئے ہیں، دوردورتک خدا کا کوئی تصورنہیں، جونماز اللہ ہی کے لئے ہے،اس نماز میں اللہ کے علاوہ سب کچھ ہے، وہی نہیں ہے جس کے لئے نماز پڑھی جارہی ہے۔

جیسا کہ علامہ اقبال نے فرمایا:

جومیں سربسجدہ ہوا کبھی توزمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

آج ہماری نماز کا حال توایسا ہوگیا جیسے کہ نکاح کی مجلس میں نوشاہ نہ ہو، سارے باراتی جمع ہوگئے ، وکیل ،گواہ ،باپ، بھائی ، رشتہ دار سب ہیں اور قاضی صاحب بھی تشریف لاچکے ہیں،لیکن قاضی صاحب کس کا نکاح پڑھائیں نوشاہ ہی نہیں ہے۔

بھائیو! ہماری نماز کا نوشاہ تو خدا ہے وہی خدا جس کے لئے نماز ہے،اگر وہی نہ ہو، باقی سب چیزیں موجود ہوں،تو اندازہ کرلیجئے کہ اس نماز کی اللہ کے یہاں کیا حیثیت ہوگی؟اس وجہ سے سب چیزوں کو باہر نکالو پھراس کے بعد پاکیزہ دل کے ساتھ اللہ سامنے کھڑے ہوجاؤ۔

دینار دھورہی ہوں،حضرت عائشہ کا واقعہ

حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ایک بات یاد آگئی ، میں نے حدیث کی کتابوں میں تو کہیں نہیں دیکھا،لیکن بعض بزرگوں کے ملفوظات میں پڑھا کہ ایک دفعہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کچھ درہم ودینار دھورہی تھیں،تو نبی اکرم ﷺ تشریف لائے،تو خلاف معمول درہم ودینار کو دھوتا ہوا دیکھا،تو پوچھا کہ اے عائشہ! یہ کیا ہے؟ یہ درہم ودینار

کوتم کیوں دھورہی ہو؟ حضرت عائشہ صدیقہ نے کہا: یارسول اللہ ﷺ آپ سے میں نے سنا تھا کہ جب ہم کسی غریب سائل کواللہ کے لئے کچھ دیتے ہیں تو ہم سائل کونہیں بلکہ اللہ کودیتے ہیں، بظاہر تو سائل کو دیتے ہیں، لیکن وہ حقیقت میں خدا کو دیتے ہیں، تو میں نے سوچا کہ جو چیز خدا کودی جارہی ہے، اس میں میل ہوتو اچھا نہیں لگتا، اس لئے میں اس کودھورہی ہوں۔

اس سے ہم کو اندازہ کرنا چاہئے کہ درہم ودینار ظاہراً تو سائل کودیئے جاتے ہیں، باطناً اللہ کودیئے جاتے ہیں، لیکن نماز تو ظاہراً وباطناً دونوں اللہ کوپہونچتی ہے، تو یہ کتنی پاک ہونی چاہئے ؟ اسی لئے نماز کے لئے طہارت عظیم الشان شرط ہے، بغیر طہارت کے نماز کا تصور ہی نہیں، سب سے بڑی نماز کی شرط، جسے شرط اعظم کہہ لیجئے وہ ہے طہارت ، ظاہری طہارت بھی اور ظاہری طہارت کے ساتھ باطنی طہارت بھی، صرف ظاہری طہارت مرادنہیں، ظاہری طہارت کے ساتھ ساتھ باطنی بھی مراد ہے، جب دونوں طہارتوں کے ساتھ بندہ اللہ کے سامنے کھڑا ہوتو وہ ہے اصلی نماز ، اس لئے اپنے دماغ سے ساری گندی چیزوں کوباہر نکالو اور غلاظت کوباہر نکالواور بزبان حال اللہ سے یہ کہوکہ:

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

تکبیر تحریمہ کی حقیقت

بزرگو، دوستو!

جب نماز شروع کرتے ہیں تو سب سے پہلے تکبیر تحریمہ یعنی " اَللّٰهُ أَكْبَر" کہا جاتا ہے۔ تکبیر تحریمہ شرط نماز ہے، اور خاص " اَللّٰهُ أَكْبَر" کا لفظ کہنا

سنت مؤکدہ ہے،اوراس کے ساتھ ہاتھ کانوں تک یا کندھوں تک اٹھانا بھی سنت ہے۔سوچئے کہ یہ سب کیا ہے اور کیوں؟ یہ بات بہت واضح ہے کہ شریعت میں کوئی بات فضول یونہی مشروع نہیں ہوگئی، بلکہ اس کا کوئی مطلب ہوگا۔علماء نے لکھا ہے کہ اس " اَللّٰہُ أَکْبَر " کے کہنے اور اس کے ساتھ ہاتھ اٹھانے میں ایک رمز واشارہ ہے۔وہ کیا؟ وہ یہ کہ جب ہم ہاتھ اٹھاتے ہیں تو غیر اللہ سے بڑائی کی نفی وانکار کی جانب اشارہ ہوتا ہے کہ کوئی بڑا نہیں، پھر ہم زبان سے " اَللّٰہُ أَکْبَر " کہکر اللہ کی بڑائی و کبریائی کا اقرار کرتے ہیں۔تو اس کا حاصل یہ ہوا کہ یہ تکبیر تحریمہ دراصل دو چیزوں سے بنتی ہے،ایک لفظ " اَللّٰہُ أَکْبَر " سے اور ایک ہاتھ اٹھانے سے،اور دونوں کو ملائیں تو یہ مطلب ہوتا ہے کہ کوئی بڑا نہیں، بلکہ صرف اللہ بڑا ہے۔لہذا ہم اسی ایک بڑی وعظیم ذات کے سامنے نماز پڑھتے ہیں، اسی کی عبادت کرتے ہیں، اسی سے مدد مانگتے ہیں، اسی کو حاجت روا ومشکل کشا سمجھتے ہیں، وہی عبادت کے لائق ہے، وہی سجدے کے قابل ہے، وہی ہمارا خالق و مالک ہے۔اگر اس احساس کے ساتھ تکبیر ہورہی ہے تو یہ حقیقی تکبیر ہے ورنہ صرف زبانی تکبیر ہے۔

علامہ ابن القیم بڑے عالم ومحدث گزرے ہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ:
اگر بندہ " اَللّٰہُ أَکْبَر " کہتے ہوئے اللہ کی جلالت وکبریائی کا تصور کرے اور اس کی زبان کے ساتھ اس کا دل بھی یہ کہے تو اس کے دل میں اللہ ہر چیز سے بڑا ہوگا، لہذا اس کو اللہ کے سوا کوئی اور چیز نماز کے اندر اپنے میں مشغول نہیں کرے گی۔اور اگر اس کو کوئی اور چیز اللہ کی جانب سے توجہ ہٹا کر اپنے میں مشغول کررہی ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے نزدیک اللہ سے بھی بڑی کوئی چیز ہے، اور اس کا

" اَللّٰهُ أَكْبَر" کہنا صرف زبانی زبانی ہے ،دل کے ساتھ نہیں ہے ۔ (اسرار الصلاۃ:۹)

بعض صوفیاء نے فرمایا کہ یہ ہاتھ اٹھانا اس بات کی جانب اشارہ کے لئے مشروع ہے کہ آدمی نماز کے وقت سب کو اپنے پس پشت ڈال رہا ہے، اور اللہ کی جانب متوجہ ہورہا ہے، گویا یہ بتارہا ہے کہ اب میرا کسی سے کوئی تعلق نہیں، سب کو میں نے چھوڑ دیا ہے۔بس جب " اَللّٰهُ أَكْبَر "کہیں تو اس کا دھیان جمائیں کہ اللہ بڑا ہے، اس کے سوا کوئی چیز بڑی نہیں، اور سب چیزیں لات مارنے کے قابل ہیں لہذا مجھے اسی کی جانب توجہ کرکے نماز پڑھنا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ سورۂ فاتحہ کا جواب دیتے ہیں

جب نماز میں کھڑے ہوں اور آپ نے یہ تصور باندھ لیا ہو کہ اللہ دیکھ رہے ہیں تو اب یہ بھی خیال کرو کہ میں جو پڑھ رہا ہوں اللہ اس کو سن رہے ہیں اور میرا جواب بھی دے رہے ہیں ۔حدیث میں آتا ہے کہ جب بندہ نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ ہر آیت کا جوب دیتے ہیں، جب بندہ کہتا ہے:

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو تمام عالموں کا پالنہار ہے) تو اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں کہتے ہیں" حمدني عبدي " (میرے بندے نے میری حمد بیان کی)

اور جب بندہ کہتا ہے ﴿ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ (نہایت رحم کرنے والا، بڑا مہربان) تو اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں کہتے ہیں "أثنىٰ عليّ عبدي" (میرے بندے نے میری ستائش کی)

اور جب بندہ کہتا ہے ﴿ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْن ﴾ (یوم جزاء کا مالک ہے)
تو اللہ فرماتے ہیں "مجّدنی عبدی "(میرے بندے نے میری عظمت و بڑائی اور بزرگی بیان کی ہے)

پھر جب بندہ کہتا ہے ﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْن ﴾ (اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں)

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کہتے ہیں "فھذہ بینی و بین عبدی ولعبدی ماسأل "(یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے، اور بندے کے لئے وہ ہے جو اس نے مانگا) اس لئے کہ عبادت میرا حصہ ہے اور مدد جو میں کرونگا وہ میرے بندے کا حصہ ہے۔ پہلے تو اللہ کی حمد، اللہ کی تعریف و بزرگی بیان کرنے کے لئے کہا گیا ہے، پھر اس کے بعد اپنی عاجزی، تواضع اور اپنی ناتوانی کا اظہار کرنے کے لئے کہا گیا ہے اے اللہ! میں بندہ ہوں، تیرا غلام اور تیرا ہی محتاج ہوں، اس لیے اے اللہ! بندہ ہونے کی وجہ سے تیری ہی عبادت کرتا ہوں اور محتاج ہونے کے اعتبار سے تجھ ہی سے مدد طلب کرتا ہوں۔ یہ اللہ کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار ہے۔

پھر آگے بندہ کہتا ہے: ﴿اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَاالضَّآلِّیْنَ ﴾
(اے اللہ! ہم کو سیدھے راستے پر چلا، ان لوگوں کے راستے پر چلا جن لوگوں پر کہ تونے انعام کیا ہے، ان لوگوں کے راستے پر نہ چلا جن پر کہ غضب کیا گیا ہے اور جو گمراہ قرار دیئے گئے ہیں)

تو اس کے جواب میں اللہ کہتے ہیں "فھو لاء لعبدی ولعبدی ما سأل " یہ میرے بندے کے لئے ہے، اور بندہ نے جو مانگا اس کو وہ ملے گا۔(مسلم:

۹۰۴، السنن الکبری نسائی: ۱/۱۹۷، ابوداؤد: ۱۱۹، ترمذی: ۲۹۵۳، ابن ماجہ: ۳۷۸۴)

اب اندازہ کیجئے کہ ہم نماز میں کھڑے ہوکر یہ تصور باندھ کر نماز پڑھیں گے تو ادھر ادھر خیال جانے کا کیا مطلب؟ کوئی خیال اِدھر اُدھر نہیں جائیگا، غیر اختیاری طور پر جائیگا، لیکن قصداً آپ کی پوری توجہ اس جواب کی طرف ہو اور اس وقت آپ یہ سوچ سوچ کر نماز پڑھیں کہ میں یہ کہہ رہا ہوں، اللہ مجھے جواب میں یہ کہہ رہے ہیں، تو پھر اس نماز کی کیفیت وحلاوت ہی کچھ اور ہوگی۔

نماز مناجات کا نام ہے

لہذا یوں سمجھئے کہ نماز درحقیقت اللہ سے مناجات وسرگوشی کا نام ہے، اور حدیث میں یہ بات صراحت کے ساتھ وارد ہوئی ہے۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: "إن أحدكم إذا صلى يناجي ربه" (تم میں سے کوئی جب نماز پڑھتا ہے تو وہ اپنے رب سے مناجات کرتا ہے) (بخاری: ۵۳۱)

ایک اور حدیث میں ہے کہ وہ شخص کامل مومن نہیں جو نماز میں نہ ہونے کی حالت میں غم میں نہ ہو، صحابہ نے پوچھا کہ یہ کس طرح یارسول اللہ! تو فرمایا کہ: "لِأَنَّ الْمُصَلِّيْ يُنَاجِيْ رَبَّهُ وَإِذَا كَانَ فِيْ غَيْرِ صَلَاةٍ إِنَّمَا يُنَاجِي ابْنَ آدَمَ" (کیونکہ نماز پڑھنے والا اپنے رب سے مناجات کرتا ہے اور جب وہ نماز میں نہیں ہوتا تو آدمیوں سے بات چیت کرتا ہے) (معجم کبیر طبرانی: ۳۲/۱۱)

الغرض نماز اللہ تعالی سے مناجات کا نام ہے، اور اللہ تعالی سے راز و نیاز کا موقعہ ہے، لہذا اس کا بہت خیال رکھنا چاہئے کہ ہم نماز میں اللہ سے مناجات میں مشغول ہیں، اس کے خلاف کوئی حرکت ہم سے صادر نہ ہو۔

صحابہ کا ایک واقعہ اور حضور ﷺ کی تنبیہ

ایک دفعہ یہ واقعہ پیش آیا کہ رمضان مبارک میں حضرات صحابہ الگ الگ جماعتیں بنا کر مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے اور رسول اللہ ﷺ ایک کونے میں مسجد کے اعتکاف میں تھے، صحابہ جو قرأت کررہے تھے اس میں ان کی آواز ایک دوسرے پر بلند ہوگئی، آپ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ: مصلی تو اللہ سے مناجات کرتا ہے، لہذا ایک دوسرے پر آواز بلند نہ کرو۔ (اتحاف الخیرۃ:۲/۳۷)

دیکھئے اس واقعہ میں عبرت ہے کہ نماز میں کس طرح اس کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ مناجات کے خلاف کوئی بات نہ ہو۔

اللہ کی آواز سنائی نہیں دیتی؟ حضرت مدنی کا واقعہ

ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ اللہ کا یہ جواب ہمیں تو سنائی نہیں دیتا، پھر جواب دینے کا فائدہ کیا ہوا؟

میں کہتا ہوں کہ کیوں سنائی نہیں دیتا؟ ارے سنائی تو دے رہا ہے، ابھی آپ نے سنا کہ نہیں سنا کہ اللہ کہتے ہیں "حمدنی عبدی" یہ سنانے والے محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور ان کو سنانے والے جبرئیل علیہ السلام ہیں اور جبرئیل علیہ السلام کو سنانے والے اللہ رب العزت ہیں، جب اللہ تعالی نے جبرئیل علیہ السلام کو سنایا اور جبرئیل علیہ السلام نے محمد ﷺ کو سنایا اور محمد ﷺ کی یہ حدیث ہم آپ کو سنارہے ہیں، یہ اللہ ہی کی تو آواز ہے، تو پھر کیوں کہتے ہیں کہ آواز نہیں آرہی ہے؟ آواز تو آرہی ہے، ہاں اتنی بات ہے کہ بلا واسطہ نہیں، بلکہ بالواسطہ آرہی ہے۔

مجھے اس پر ایک قصہ یاد آ گیا، ایک دفعہ دارالعلوم دیوبند میں حضرت شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ کا درس حدیث ہورہا تھا، آپ مسند درس پر بیٹھے ہوئے ہیں، ایک طالب علم نے حدیث پڑھی، جس کے اندر آتا ہے کہ اللہ کے نبی

ﷺ نے ارشادفرمایا کہ آخری زمانے میں حضرت عیسی علیہ السلام تشریف لائیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے، اور فلاں فلاں کام کرینگے، کئی کام ان کے اس حدیث میں بتائے گئے ہیں، اس میں یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ جس وقت وہ تشریف لائیں گے تو "**یضع الجزیة**" (جزیہ جس کو ٹیکس tax کہتے ہیں، اسے وہ ختم کردیں گے)۔

(بخاری: ۱/۲۹۶، مسلم: ۱/۸۷)

دیکھئے اس حدیث کے اندر آیا ہے کہ حضرت عیسی جزیہ کو ختم کردیں گے، جب یہ حدیث پڑھی گئی تو حضرت شیخ الاسلام نے اسے بیان فرمایا اور تشریح کی، تو ایک طالب علم کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت! یہ حدیث میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے، اس لئے کہ حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ جزیہ کو منسوخ کردیں گے تو حضور ﷺ کی شریعت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیسے منسوخ کردیں گے؟

تو حضرت شیخ الاسلام کہنے لگے کون کہتا ہے؟ طالب علم کہنے لگے کہ حضرت جو حدیث پڑھی گئی اسی میں تو آیا ہے، حضرت پھر کہنے لگے کہ ارے کون کہتا ہے وہ منسوخ کردیں گے؟ وہ طالب علم پھر کہنے لگے، حضرت! حدیث میں تو ہے، پھر کہنے لگے ارے کون کہتا ہے؟ محمد ﷺ ہی تو کہتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ محمد ﷺ خود منسوخ کرنے والے ہیں، عیسیٰ علیہ السلام کہاں منسوخ کرنے والے ہیں؟ عیسیٰ علیہ السلام کا جب وقت آئیگا، ان کا زمانہ آئیگا، تب ان کے زمانے میں منسوخ ہوگا، لیکن منسوخ کرنے والے محمد ﷺ ہی ہیں۔

تو بھائی اسی طریقے پر میں نے کہا کہ آپ کو کیوں سنائی نہیں دیتا؟ ہاں البتہ اللہ کی آواز ڈائریکٹ ہم تک، آپ تک نہیں پہونچے گی، بلکہ محمد ﷺ کی آواز میں ہم تک اور آپ تک یہ پہونچے گی، اور پہنچ رہی ہے، اس لئے کہ اللہ کی آواز براہ راست سننے کے لئے ہمارے اور آپ کے پاس وہ کان ہی کہاں ہیں؟ اگر ہم کو براہِ راست

خدا کی آواز آتی تو سینہ پھٹ جاتا۔

اس لئے اللہ نے ایسا کیا کہ اللہ کے نبی علیہ السلام کے سینے میں اُتار کر اس آواز کو پھر ہم تک پہونچایا، اس پہونچانے میں جمال پیدا ہو گیا، تو خدا کے جلال کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال میں ڈھال کر ہم تک پہونچایا تو ہم کو سہارا مل گیا۔

نماز میں قرآن کا حق اداء کریں

اس کے بعد نماز میں جب قرآن کریم پڑھیں تو آیتوں کو غور سے سنیں اور ان کے معانی پر غور کرتے رہیں اور ان آیات کے جوابات کا تصور کرتے ہوئے نماز پڑھیں، یہ ہے قرأت کا حق۔

ایک تابعی حضرت مسلم بن مخراق کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ ہمارے یہاں کچھ لوگ ہیں جو ایک رات میں دو دو تین تین مرتبہ قرآن پاک ختم کر لیتے ہیں۔ تو حضرت عائشہ نے فرمایا کہ ان لوگوں نے پڑھا تو ہے مگر حقیقت میں نہیں پڑھا ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رات بھر نماز پڑھی ہے آپ کسی بھی امید والی آیت سے گزرتے تو اللہ سے سوال کرتے اور مانگتے اور کسی بھی خوف کی آیت سے گزرتے تو اپنے رب سے اس سے پناہ مانگتے۔ (اتحاف الخیرۃ:۱۶۹۲)

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت نماز کے لئے کھڑے ہوئے، میں بھی جا کر کھڑا ہو گیا، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ البقرۃ پڑھی پھر سورۂ آل عمران پھر سورۂ نساء پڑھی، آپ پڑھتے جاتے تھے اور جہاں آیت رحمت آتی تھی، وہاں رک جاتے تھے اور اللہ سے سوال کرتے تھے، اے اللہ! مجھے بھی تیری رحمت عطا کر دے، اور جہاں پر کوئی عذاب کا ذکر آجاتا تھا، وہاں اللہ سے پناہ مانگتے اور التجاء کرتے کہ اے اللہ! مجھے تیرے عذاب سے بچالے۔ (سنن

کبری نسائی:۱۰/۳، ۱سنن نسائی مجتبی:۱۰۰۹، ابوداؤد:۱۲۷، صحیح ابن خزیمہ:۶۸۴)

اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے حبیب ﷺ ایک دفعہ تشریف لائے حضرات صحابہؓ بیٹھے ہوئے تھے، حضور ﷺ نے ان کے سامنے سورۃ الرحمٰن کی تلاوت فرمائی، وہ سورۃ الرحمٰن جس کے اندر بار بار یہ آیت دہرائی گئی ہے ﴿ فبایّ آلاء ربکما تکذبان ﴾ (اے جن وانس! تم اللہ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟)

اللہ تعالی نے اپنی نعمتوں کا ذکر کیا ہے اور یہ آیت دہرائی ہے، تو حضور ﷺ نے اس سورت کی تلاوت فرمائی اور حضرات صحابہؓ خاموش بیٹھے ہوئے تھے، تلاوت کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا کہ "لیلۃ الجن" میں میں نے جنات کے گروہ میں بھی یہی سورت پڑھ کر سنائی تھی تو "فَكَانُوا أَحْسَنَ مَرْدُوداً مِنكُمْ" (قرآن کو سمجھ کر قرآن کا جواب دینے میں وہ تم سے اچھے تھے)۔ اس کے بعد فرمایا: جب میں یہ آیت پڑھتا تھا، تو وہ جواب میں کہا کرتے تھے: "لَا بِشَيْءٍ مِنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ" (اے ہمارے پروردگار! ہم تیری کسی نعمت کو نہیں جھٹلائیں گے، تیرے ہی لئے تعریف ہے)۔ (ترمذی: ۱۶۴/۲، حدیث: ۳۲۹۱)

حضور ﷺ نے فرمایا جواب ایسا ہونا چاہئے، یہ ہے قرأت کا حق، جب قرأت کا حق ادا کرتے ہوئے نماز پڑھیں گے، تو انشاء اللہ نماز کے اندر لطف و مزہ بھی آئیگا اور اسی کے ساتھ اس کے اندر جان وروح بھی پڑ جائیگی۔ لیکن قرأت کا حق وہ ادا کرسکتا ہے جو قرأت کرنے پر سمجھتا بھی ہو کہ کیا پڑھا جا رہا ہے؟ لیکن بہت سارے لوگ وہ ہیں جو عربی زبان نہیں جانتے، یہ زبان ہماری اخروی زبان ہے، اللہ اور اس کے فرشتوں کی زبان ہے، اس لئے ہم سب لوگوں کو چاہئے کہ عربی زبان سیکھنے کی کوشش کریں یا کم از کم ترجمہ جان لیں۔

رکوع میں کیا تصور ہونا چاہئے؟

بھائیو! نماز میں آگے بڑھتے ہوئے ہم رکوع کی طرف جاتے ہیں، اللہ کے سامنے جھکنا بہت بڑی عبادت ہے، اللہ کو بہت پسند ہے کہ بندہ بندہ بن کر رہے، اگر بندہ بندہ نہیں بنتا تو خدا کی نظر میں بہت گندہ ہوتا ہے، رکوع میں جا کر یہ تصور کرے کہ میں جھک رہا ہوں، میں ذلیل ہوں، اور میرا رب بلند ہے، میں اس کے سامنے پست ہوں، ذلیل ہوں۔

اور یہاں ایک بات خاص طور سے قابل غور یہ ہے کہ جب رکوع سے اٹھتے ہیں تو "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" (اللہ نے سن لی اس بندے کی جس نے اس کی تعریف کی) کہتے ہیں، اب جب اٹھتے ہوئے آپ کی زبان پر یہ الفاظ ہوں تو سوچیں کہ اس میں کیا کہا جا رہا ہے؟ اللہ کہہ رہے ہیں کہ میں نے سن لی بندے کی، تو میری بھی سن لی ہے، میری آواز کتنی گھٹیا، کیسے گنہگار کی آواز ہے، مجھ جیسے حقیر وفقیر کی آواز اتنے بڑے خالق و مالک کے دربار میں پہنچ گئی ہے؟

اگر کسی کو یہ کہا جائے کہ بھائی! تمہارا جو پیغام ہے، وہ آج وزیر اعظم تک پہونچ چکا ہے اور انہوں نے اسے پڑھ لیا ہے۔ اب بتاؤ کہ سننے والے کو کس قدر اپنی بڑائی کا بھی احساس ہوگا اور اسے مزہ ولطف بھی آئیگا، یہاں بھی یہی کہا جا رہا ہے کہ اے بندے! تو نے جو بھی وظائف نماز کی حالت میں پڑھے تھے، وہ سب اللہ نے سن لیا ہے۔

جب یہ سوچیں گے تو مزہ آئیگا کہ نہیں آئیگا؟ اگر اب بھی نہ آئے تو کب آئیگا؟ اور یہ تو بہت ہی مزے کی بات ہے، اس سے زیادہ مزہ اور لطف کی بات کیا ہوسکتی ہے کہ ہم کو بتایا جا رہا ہے کہ تیری یہ آواز خدا کے دربار میں پہونچائی جا رہی ہے۔

بندہ خدا کے قدموں میں

رکوع کے بعد سجدہ ہوتا ہے، اور سجدہ سب سے بڑی عبادت ہے، اور مسجد اسی لفظ سے ماخوذ ہے۔ مسجد کے معنی ہیں سجدہ گاہ، حالانکہ نماز میں رکوع اور قیام، قرأت، جلسہ وغیرہ بھی ہوتے ہیں، اس لئے مسجد کو ''مرکع'' (رکوع کی جگہ) یا ''مقام'' (قیام کی جگہ) یا ''مقرأ'' (پڑھنے کی جگہ) بھی کہا جا سکتا تھا، لیکن اس کے باوجود اس کے لئے لفظ ''مسجد'' استعمال کیا جاتا ہے، یعنی سجدہ گاہ، اس لئے کہ سجدہ سب سے بڑی عبادت ہے۔

سب سے بڑی عبادت بجالاتے ہوئے آدمی جب سجدہ میں جاتا ہے تو حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:

"أقرب ما يكون العبد من ربه وهو ساجد فأكثروا الدعاء" (بندہ جب سجدہ میں ہوتا ہے تو اس وقت اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے، لہذا تم سجدے میں کثرت سے دعا مانگو) (مسلم: ۱/۱۹۱، ابوداؤد: ۱۲۷)

اور ایک روایت کے اندر آتا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:

" الساجد يسجد علىٰ قدمى اللّٰه تعالىٰ فليسئل واليرغب" (بندہ جب سجدہ کرتا ہے تو دراصل وہ سجدہ اللہ کے قدموں پر کرتا ہے، لہذا جو بھی حاجتیں ہوں، اس کا اللہ سے سوال کرے اور اللہ کی طرف رغبت پیدا کرے) (مسلم: ۴۸۲، مسند ابویعلی: ٦٦٥٨، مسند ابوعوانہ: ۱۴۷۱، مسند احمد: ۹۴۴۲)

سوچنے کی بات ہے کہ سجدہ کس قدر عظیم عبادت ہے کہ آدمی اس میں اللہ کے قدموں پر ہوتا ہے، اگر سجدہ میں جا کر اللہ کے قدموں میں سر رکھ کر پھر بھی اس کا دل دنیا میں لگا ہوا ہو تو بتاؤ اس سے زیادہ محروم کون ہوگا؟ پہونچ گیا وہ خدا کے دربار میں،

لیکن پھر بھی دل دنیا میں اٹکا ہوا ہو،اس سے بڑا محروم کوئی نہیں، ایسا سجدہ کریں گویا کہ والہانہ اور عاشقانہ سجدہ ہو،اللہ کے دربار میں سر رکھتے ہوئے یہ سمجھے کہ بس میں تو اللہ سے مل گیا ہوں۔

سجدے کی ایک ظاہری برکت

یہ تو سجدے کی روحانی برکت ہے،ایک برکت اس کی ظاہری سنتے چلئے کہ حضرت اقدس مولانا ذوالفقار صاحب نقشبندی دامت برکاتہم نے لکھا ہے کہ جب حضرت آدم نے ایک خطا کا ارتکاب کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں بھیج دیا تو حضرت آدم سجدہ میں پڑ گئے،اور روتے رہے روتے رہے،اللہ تعالیٰ کو وہ سجدہ بڑا محبوب و پسند آیا، بھوکے بھی تھے کئی دن سے، جنت میں تو لذیذ لذیذ غذائیں ملا کرتی تھیں،لیکن یہاں دنیا میں آئے تو اللہ کے دربار میں روتے پڑے ہیں،کھانے تک کا احساس نہیں، اللہ تعالیٰ نے کئی دن کے بعد ان کو اُٹھایا اور کھانا ان کے منھ میں ڈالا گیا کہ اے آدم! تم نے سر جھکایا تو ہم تمہارے لئے کھانا اوپر اٹھاتے ہیں۔

حضرت فرماتے ہیں کہ اسی لئے انسان کے کھانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کا سر سیدھا ہوتا ہے، کھانا نیچے سے اٹھا کر اوپر کو لاتا ہے،لیکن جتنے جانور ہیں وہ سب سر نیچے کر کے کھانے کی طرف منھ لے جا کر کھانا کھاتے ہیں،اس لئے کہ اللہ کہتے ہیں کہ اے میرے بندے! تو نے میرے لئے سر جھکایا تو میں کھانے کے لئے تیرا سر جھکنے نہیں دیتا، کھانا تیرے پاس آئیگا تو کھانے کے پاس نہیں جائیگا۔

یہ اللہ کی عنایت ہے اور بندگی کا ثمرہ ہے۔ بہر حال یہ ہے وہ سجدہ جسکی وجہ سے انسان اللہ کے انتہائی قریب ہو جاتا ہے۔

اللہ نے پیار کرلیا

سجدے کی لذت کا حال عاشقوں سے پوچھو، ہمارے بزرگوں میں حضرت مولانا فضل رحمان گنج مرادابادیؒ نقشبندی سلسلہ کے بڑے اولیاء اللہ میں سے گزرے ہیں، ایک بار حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اپنی جوانی میں ان کی خدمت میں ملاقات کے لئے گئے، تو حضرت مولانا فضل رحمان صاحب نے ان سے فرمایا کہ ''بیٹا! تم سے ایک بات کہتا ہوں کہ میں جب سجدہ میں جاتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ میاں نے گود اٹھا کر پیار کرلیا''۔

اس میں گود سے مراد یہ عرفی گود نہیں، اور نہ پیار سے مراد بوسہ ہے، بلکہ اس سے مراد اللہ کا قرب ہے اور اس کی محبت وشفقت، اور اس میں انھوں نے اس حالت کی لذت ومستی اور کیف کا ذکر کیا ہے۔ اب اندازہ کیجئے کہ جس شخص کو سجدے میں یہ کیف محسوس ہوتا ہے اس کے سجدے کی کیا کیفیت ہوگی، جب سجدہ ایسا تو اس کا کیف بھی ایسا۔

سجدے سے سر کیسے اٹھاؤں؟

ایک بزرگ سے پوچھا گیا کہ آپ بہت لمبا سجدہ کرتے ہیں، کیا بات ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ میں اس لئے لمبا لمبا سجدہ کرتا ہوں کہ حدیث میں آیا ہے کہ بندہ جب سجدہ میں گرتا ہے تو وہ خدا کے قدموں پر سر رکھتا ہے، اب بتاؤ کہ خدا کے قدموں پر سر رکھ کر پھر سر کیسے اٹھالوں؟ کیا یہ سر اٹھانا مناسب ہے؟ ظاہر بات ہے اللہ کے دربار میں سر رکھ دیا، اور قرب کی آخری منزل میسر آگئی تو اب سر کیسے اٹھاؤں؟

الغرض ہمارا سجدہ بھی اس احساس وجذبے کے ساتھ ہونا چاہئے کہ ہم اللہ کے

قریب ہو چکے ہیں، اور اس کے قدموں پر سر رکھے ہوئے ہیں۔

خلوص و خشوع حقیقت نماز

اب آخر میں ایک اور اہم پہلو کی جانب توجہ کیجئے، وہ یہ کہ نماز میں بھی اور دیگر عبادات میں بھی خلوص و للّٰہیت اور خشوع بہت ضروری ہے اور یوں کہا جائے تو بالکل صحیح کہ یہی درحقیقت نماز کی روح و جان ہیں۔لہذا ان کا بہت اہتمام کرنا چاہئے۔ جہاں تک خلوص و للّٰہیت کی بات ہے یہ سب جانتے ہیں کہ یہ کس قدر اہم وضروری ہے؟ بڑی معروف حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:" إنما الأعمال بالنيات"(اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے)

اور رہا خشوع کا مسئلہ تو ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ نبی ﷺ نے ارشادفرمایا کہ جو آدمی اس طرح نماز پڑھتا ہے کہ اس میں خشوع کا، خضوع کا مکمل دھیان رکھتا ہے ،رکوع وسجدہ نہایت اطمنان سے ادا کرتا ہے،تو یہ نماز اللہ کے دربار میں نہایت روشن وسفید ہو کر جاتی ہے اور جب اللہ کے دربار میں جاتی ہے تو اس کو یوں دعاء دیتے ہوئے جاتی ہے کہ:" حفظك الله كما حفظتني "(اللہ تیری حفاظت کرے جیسے کہ تو نے میری حفاظت کی)اور اگرکوئی بندہ نماز کو بے ڈھنگے طریقے پر ادا کرے،اور خشوع وخضوع کو ضائع کرتا ہے، اور رکوع وسجدہ کو ٹھیک ادا نہیں کرتا تو وہ نماز بندہ کے پاس سے کالی شکل میں جاتی ہے اور یہ کہتی ہے"ضيّعك الله كماضيّعتني"(تجھے بھی اللہ غارت کرے جیسے تو نے مجھے ضائع کیا) پھر اس نماز کو ایک پرانے کپڑے میں لپیٹ کر اس کے منہ پر ماردی جاتی ہے۔(معجم کبیر طبرانی:۳۲۱۳،شعب الایمان:۱۴۱/۷، کنز العمال:۱۹۰۵۲)

اس حدیث کے بارے میں محدثین نے لکھا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے اور یہ کئی

الفاظ کے ساتھ حدیث کی کتابوں میں درج کی گئی ہے۔

ان سب احادیث میں نبی کریم ﷺ نے امت کو یہی تعلیم دی ہے کہ نماز کو نماز بنائیں، کیونکہ کچھ اُٹھک بیٹھک کر لینے کا نام نماز نہیں ہے، نماز تو ایک اہم ترین عبادت ہے جس کو صحیح طریقے پر ادا کرنا چاہئے۔

کیا اللہ کو ہماری نماز کی حالت کا علم نہیں؟

کیونکہ اللہ ہماری نماز کو، نماز کے ہر رکن وعمل کو دیکھتے ہیں، ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک صحابیؓ آخری صف میں نماز پڑھ رہے تھے، جب نماز ختم ہوئی تو آپ ﷺ نے ان صحابی کو بلا کر بڑے تیز وتند لہجے میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "ألاتتّقی اللّٰہ ؟ ألا تریٰ کیف تصلیّ؟(کیا تجھے اللہ کا ڈر نہیں ہے؟ کیا دیکھتا نہیں کہ تو نماز کیسے پڑھ رہا تھا؟) پھر فرمایا کہ یہ نہ سمجھو کہ مجھے تم لوگوں کے حالات کا علم نہیں ہوتا، تمہاری ہر ہر چیز میرے سامنے آشکارا ہوتی ہے۔(مسند احمد:۱۰۰۴۹)

اور یہ مضمون ایک نہیں کئی حدیثوں سے ثابت ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ میرے پیچھے جو نماز پڑھتے ہیں، ان کی ساری کیفیت میرے سامنے آشکارا ہوتی ہے، کوئی چیز مخفی نہیں ہوتی، حضور ﷺ پیچھے والوں کو بھی سامنے والوں کی طرح دیکھ لیتے تھے۔اس میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ پیچھے نماز پڑھنے والوں کی نماز کی کیفیات اور حالات کا علم جب آپ ﷺ کو ہو رہا ہے، تو بھائیو! کیا اللہ کو علم نہیں ہوگا؟ جبکہ وہ خدا تو علام الغیوب ہے، دلوں میں چھپے اسرار کو جاننے والا ہے، کیا اسے ہماری نماز کی خبر نہیں ہوگی؟ ضرور ہوگی۔اگر یہ ایک بات ہماری سمجھ میں آجائے تو ہماری نمازیں درست ہوجائیں۔

یہ چند اہم اشارات ارکان واعمال نماز کے بارے میں ہیں جن کی جانب اگر توجہ دی جائے تو ممکن ہے کہ ہماری نماز میں نکھار وسدھار پیدا ہو جائے اور نماز نماز بن جائے۔ کسی نے بہت خوب کہا ہے کہ:

نشانِ سجود تیری جبیں پر ہوا تو کیا

کوئی ایسا سجدہ کر کہ زمیں پر نشاں رہے

دعا ہے کہ اللہ تعالی ہماری نمازوں کو واقعی نماز بنا دے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

بیعت کیا اور کیوں؟

باسمہ تعالیٰ

بیعت کیا اور کیوں؟

الحمد للّٰہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ . أما بعد

فقد قال اللّٰہ تعالی فی القرآن الکریم

أعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم ، بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَؤُوْفٌ بِالْعِبَادِ﴾ (لوگوں میں بعض وہ ہیں جو اپنے آپ کو بیچ دیتے ہیں اللہ کی رضا تلاش کرتے ہوئے، اور اللہ کی ذات بندوں پر بڑی رحیم کریم ہے)[البقرۃ:۲۰۷]

محترم بھائیو! آج ایک بات دیکھنے کو ملتی ہے، وہ یہ کہ انسان نے اپنی ذات کو دنیا کی ہر چیز کی لئے بیچنا شروع کردیا، اور ذات ہی کو نہیں، اپنے ایمان بھی بیچنا شروع کردیا ہے۔ دنیا حالانکہ بہت حقیر وذلیل ہے مگر انسان اس حقیر وذلیل دنیا کے لئے خود اپنی ذات کو بھی بیچ دیتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنے ایمان کو بھی بیچ دیتا ہے۔

بے ایمانی کا فتنہ

اور آج کے دور میں وہ حدیث پورے طور پر نہ سہی، ایک حد تک تو ابھی صادق آتی دکھائی دیتی ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشادفرمایا:" **يُصْبِحُ الرَّجُلُ مُؤْمِناً وَّ يُمْسِيْ كَافِراً وَّ يُمْسِيْ مُؤْمِناً وَّ يُصْبِحُ كَافِراً** "یعنی ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ

آدمی صبح مومن ہوگا تو شام کو کافر اور شام میں مومن ہوگا تو صبح کافر، اس کے بعد فرمایا ایسا کیوں ہوگا؟ فرماتے ہیں کہ ’’ یَبِیْعُ دِیْنَهٗ بِعَرَضٍ مِنَ الدُّنْیَا قَلِیْلٍ ‘‘ (یہ اپنے دین و ایمان کو دنیا کے معمولی وحقیر سامان کے عوض بیچ دیگا) اس طرح صبح کا مومن شام کو کافر اور شام کا مومن صبح کو کافر ہو جائیگا۔ (مسلم: ۱/۷۵)

جان کے لئے ڈاڑھی دیدی

ایک صاحب میرے پاس آیا کرتے تھے، اور ان کے ماشاء اللہ اچھی خاصی ڈاڑھی بھی تھی، وہ ایک نیم سماجی و نیم سیاسی جماعت سے وابستہ ہو گئے، ایک بار میرے پاس آئے تو ان کی ڈاڑھی چھوٹی ہوگئی تھی، میں نے پوچھا کہ ڈاڑھی کو کیا ہوا؟ تو کہنے لگے کہ ہمیں اس جماعت کی جانب سے مختلف جگہ جانا آنا پڑتا ہے اور غیر قوموں سے بھی واسطہ پڑتا ہے، لہذا کچھ جان کا خطرہ رہتا ہے اس لئے ڈاڑھی کو چھوٹا کر لیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کی جماعت میں اور ہم میں یہی فرق ہے کہ آپ جان کی خاطر ڈاڑھی دیدیتے ہیں اور ہم ڈاڑھی کی خاطر جان دیدیتے ہیں۔ یہ ہے آج کا حال۔

خود کو اللہ کے لئے بیچ دو

ان حالات میں جبکہ لوگ جان کی خاطر ایمان و خدا کی مرضیات کو بیچ رہے ہیں، ہمارے سامنے قرآن نے ایک دعوت رکھی ہے، وہ یہ کہ تم اللہ کی مرضیات پر اپنے نفس و جان کو بیچ ڈالو، یہ نہیں کہ اللہ کی مرضی کو اپنی جان کی خاطر بیچو۔ اس وقت جو آیت میں نے آپ کے سامنے پڑھی ہے اس میں یہی بات بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ

وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ﴾ لوگوں میں بعض وہ ہیں جو اپنے آپ کو بیچ دیتے ہیں اللہ کی رضا تلاش کرتے ہوئے، اور اللہ کی ذات بندوں پر بڑی رحیم کریم ہے)

خبر میں پیغام ودعوت

بظاہر اس آیت کے اندر ایک خبر دی گئی ہے کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اللہ تعالی کی مرضی تلاش کرتے ہوئے اپنے نفس کو بیچ ڈالتے ہیں۔ یہ ایک خبر ہے، لیکن قرآن کا ایک عجیب اصول وطریقہ ہے، وہ یہ کہ وہ خبر تو پیش کرتا ہے، لیکن خود خبر مقصود نہیں ہوتی بلکہ وہ خبر کے ذریعہ ایک دعوت دینا چاہتا ہے، ایک پیغام دینا چاہتا ہے، ایک حکم دینا چاہتا ہے۔ اس لئے علماء نے لکھا ہے کہ ہر خبر کے پیچھے ایک انشاء ضرور ہوتی ہے اور یہ صرف قرآن کے ساتھ خاص نہیں، یہ بلاغت کا قاعدہ ہے، جس کا بھی کلام بلیغ ہو اور وہ بلاغت کا حامل انسان جب کوئی خبر پیش کرتا ہے تو اس کے پیچھے ضرور کوئی انشاء اور دعوت موجود ہوتی ہے۔

اور قرآن تو سب سے زیادہ بلیغ کلام ہے، لہذا قرآن مجید میں بھی جو خبر [Report] آئے گی اس کے پیچھے کوئی دعوت و پیغام [Message] مقصود ہوگا، لہذا اس آیت میں بھی ایک خبر ہے تو اس کے پیچھے بھی اللہ کا یہ منشاء ہے کہ بندوں کو وہ یہ دعوت دینا چاہتے ہیں کہ اے میرے بندو! تم کو بھی اپنے آپ کو ان لوگوں کی طرح بنانا چاہئے جن کی خبر میں تم کو سنا رہا ہوں، لہذا تم بھی اللہ کے لئے اپنے نفسوں کو بیچ دو۔

آیت کا شان نزول

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت بعض صحابہؓ کے بارے میں نازل ہوئی

ہے،ان میں متعدد صحابہؓ کے نام ذکر کئے گئے ہیں،حضرت صہیب بن سنان رومی رضی اللہ عنہ کا ذکر بھی آتا ہے کہ جب انہوں نے ہجرت کا ارادہ کیا اور اس ارادے سے نکلے تو کافروں نے ان کو ایک جگہ پر گھراؤ میں لے لیا، کہنے لگے :صہیب ! تم روم کے آدمی ہو،مکہ کے نہیں،تم مکہ میں آئے تھے تو تمہارے جسم پر کپڑا بھی نہیں تھا، جیب میں ایک پائی بھی نہیں تھی،تم مکہ آئے ، یہاں آ کر تم نے کمایا اور جمع کیا۔اب اس کو پونجی بنا کر یہاں سے لے جانا چاہتے ہو؟ یہاں کی ایک پائی ہم باہر جانے نہیں دینگے،اگر تم کو جانا ہو تو تم تنہا جاؤ گے،تمہارے ساتھ کوئی چیز نہیں جائیگی۔

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے پہلے ان کو دھمکی دی اور کہا: میرے ترکش میں تیر بھرے ہوئے ہیں اور میں بہت بڑا تیرانداز ہوں،تم لوگ مجھے جانتے ہو،اگر تم لوگ میرے قریب آئے تو تیروں کی بوچھار کردونگا اور اتنے تیر برساؤنگا کہ تم میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا،اس پر وہ لوگ سہم گئے،اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ یہ بہت بڑے تیرانداز ہیں،لیکن دور ہی کھڑے رہے، جانے کا راستہ نہیں دے رہے تھے۔

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے کہا: میرا بہت سا مال میں اپنے ساتھ نہیں لے جا رہا ہوں، جو مکہ میں چھوڑ دیا ہے، فلاں فلاں جگہ پر میں نے جمع کر کے رکھ دیا ہے ، میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم سب وہ سارا مال لے لو،بس یہ سن کر سارے کافر وہاں سے چلے گئے ، اور واقعتاً انہوں نے مال چھوڑا بھی تھا۔چنانچہ کفار و مشرکین اسے لینے چلے گئے اور حضرت صہیب رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ طیبہ پہونچ گئے،اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔(تفسیر قرطبی:۲۰/۳)

بعض روایات میں کچھ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے نام ہیں کہ ان کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی،مختلف نام ذکر کئے گئے ہیں، بہر حال مختلف صحابہؓ کے حالات پر اللہ تعالیٰ

نے یہ آیت نازل کی، اور نقشہ کھینچا کہ یہ لوگ ایسے لوگ ہیں، جنہوں نے اللہ کے نام پر اپنی جان و مال کو بیچ دیا اور اپنے مال و جان کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

لفظ ''شَرٰی'' کی تحقیق اور آیت کا خلاصہ

اس آیت میں ایک لفظ ''یَشْرِیْ'' آیا ہے، یہ ''شَریٰ یشری '' سے بنایا گیا ہے، اس کے عربی میں دو معنی آتے ہیں: بیچنے کے بھی آتے ہیں، خریدنے کے بھی آتے ہیں، بعض لوگوں نے یہاں خریدنے اور بعض لوگوں نے بیچنے کے معنی لئے ہیں، جمہور نے اسے بیچنے کے معنی میں لیا ہے، اور خریدنے کے معنی میں بھی آنے کی تائید ایک آیت سے ہوتی ہے۔

چنانچہ اللہ تعالی فرماتے ہیں ''**اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ** ''(بیشک اللہ نے مسلمانوں کے جانوں اور مالوں کو ان سے خرید لیا، اس بات کے عوض میں کہ انہیں جنت دیگا) (التوبۃ:۱۱۱)

اس آیت میں ''اشتری'' خریدنے کے معنی میں لیا گیا ہے، اور اس آیت میں بھی وہی مضمون ہے جو پہلی آیت میں ہے، لہذا دونوں آیتوں کا خلاصہ اور مطلب یہ ہوا کہ بندہ اللہ کی مرضی تلاش کرتے ہوئے اپنے نفس کو بیچ دیتا ہے، اور اللہ تعالی اس کو بندہ سے خرید لیتے ہیں۔

علماء نے لکھا ہے کہ یہ اللہ کیلئے اپنے نفس کو بیچ دینا کیا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ نفس ہماری ملکیت نہیں، نفس کو پیدا کرنے والا، یعنی ہماری ذات کو بنانے والا اللہ ہے، اللہ خود اس کا مالک ہے، ہمارے پاس تو محض امانت کے طور ہے، لیکن اس کے باوجود اللہ کی رحمت پر قربان جایئے کہ اللہ تعالیٰ یہ نفس بنا کر ہمیں گویا مالک بنا دیا ہے کہ تم اب اس کے مالک ہو اور تم اس میں تصرف کرنے کے مجاز ہو۔ پھر اس کے

بعد کہا کہ تمہاری یہ چیز مجھے بیچ دو، میں اس کا خریدار ہوں، اور میں اس کے بدلہ میں تمہیں جنت عطا کرونگا۔ اندازہ کیجئے کہ کتنی بڑی اللہ کی رحمت ہے، کہ اپنی مملوک چیز کو اولاً ہماری کہہ کر ہماری نفسیاتی الجھن کو دور کردیا، حالانکہ ہم اس کے مالک نہیں، بلکہ خود اللہ ہی اس کے مالک ہیں، پھر اس کو ہم سے خرید کر اس کے بدلہ میں جنت کا وعدہ فرمایا، اپنی ہی چیز ہم سے لیکر اس پر جنت عطا کرنا کیا عین رحمت وکرم نہیں ہے؟

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک باپ اپنے بچے کو دو روپیہ دیتا ہے، اس کے بعد دوسرے دن اس کو کہتا ہے کہ بیٹا! تمہارے وہ دو روپے تم ہم کو دیدو، تو دس روپے ہم تم کو دیتے ہیں۔ اب وہ دو روپے جو پہلے سے بیٹے کے پاس تھے وہ کس کے ہیں؟ باپ ہی کے تو ہیں، اب وہی باپ مزید دینا چاہتا ہے تو یوں کہتا ہے کہ وہ دو روپے ہم کو دیدو، اس کے بدلہ میں ہم دس روپے دیں گے، اب بچہ خوشی سے دو روپے دیکر دس روپے لے لیتا ہے، حالانکہ وہ دو روپے اور یہ دس روپے دونوں ہی باپ کے ہیں۔

اسی طرح یہ جان بھی اللہ کی اور جنت بھی اللہ کی ہے، لیکن اللہ نے جان دیکر کہا کہ تم اپنی سمجھ لو اور مجھے دیدو، میں جنت تمہیں دیدونگا۔

نفس کو بیچنے کا حاصل

اب یہ سمجھنا ہے کہ اللہ کو نفس بیچنے کا مطلب کیا ہے؟ اللہ کو نفس وجان بیچنے کے متعدد مطالب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ جہاد میں اپنی جان ونفس کی قربانی دی جائے، اور ایک یہ ہے کہ ہمارے تمام کام واعمال، ہمارے اخلاق، ہماری خواہشات ولذات، یہ ساری چیزیں اللہ کی مرضی کے مطابق ہوتی رہیں، ہماری مرضی کے مطابق نہیں؛ بلکہ غور کریں تو جہاد بھی اسی لئے قابل لحاظ وقابل تعریف عمل ہے کہ اس

میں اللہ کی مرضی پر اپنی جان دیدی، اگر اللہ کی مرضی پر جان نہ دی جائے بلکہ اس میں اپنے نفس کی کسی خواہش کا دخل ہو تو وہ جہاد بھی قابل تعریف نہیں رہتا اور اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ لہذا خلاصہ یہ ہوا کہ اپنی ہر چیز اللہ کی مرضی پر استعمال کی جائے اور اس کی مرضی پر اپنی مرضی کو قربان کر دیا جائے، یہ ہے اللہ کے نام اپنے کو بیچ دینا۔

کیونکہ قاعدہ ہے کہ جب ایک چیز آپ دوسرے آدمی کو بیچ دیتے ہیں تو وہ چیز اس کی ہوجاتی ہے، اس کی ہوجانے کے بعد آپ اپنی مرضی اس میں نہیں چلا سکتے، اسی طرح جب ہم نے اپنی جان و مال اللہ کو بیچ دیا اس میں ہم اپنی مرضی نہیں چلا سکتے بلکہ اللہ کی مرضی اس کے اندر چلنی چاہئے۔

ایک گھر آپ نے بنایا، بنانے کے بعد آپ نے [sale] کا آفر [Offer] دیا، لوگ خریدنے کے لئے آئے، آپ نے ایک صاحب کو وہ مکان بیچ دیا، اور مکان آپ نے اس کے حوالہ کر دیا۔ اب بتایئے کہ اس مکان میں آپ کی مرضی چلے گی یا اس کی جس نے اسے خریدا ہے؟ اسی طرح جب ہم نے اپنے نفس کو اللہ کے نام بیچ دیا ہے، اور اللہ نے اس کو خرید لیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ہماری مرضی نہیں چلے گی، بلکہ اللہ کی مرضی کے مطابق اس کو استعمال کرنا ہوگا۔

لہذا ہم اپنی مرضی سے آنکھ استعمال نہیں کر سکتے، اپنی مرضی سے کان استعمال نہیں کر سکتے، اپنی مرضی سے دل استعمال نہیں کر سکتے، ہر عضو کے استعمال کرنے سے پہلے اللہ تعالی سے پوچھنا پڑے گا کہ کیا میں اس جگہ استعمال کر سکتا ہوں؟ اگر اجازت ملے تو کر سکتے ہیں، ورنہ نہیں کیونکہ یہ ساری چیزیں اب آپ کی نہیں، بلکہ اللہ کی ہیں۔

جدھر میرا مولیٰ ادھر شاہ دولہ

ایک بزرگ کی حکایت یاد آئی کہ شاہ دولہ ایک بزرگ تھے، ان کا قصہ ہے کہ شاہ دولہ کے وطن میں ایک مرتبہ طوفان برپا ہوا، اوران کے وطن کے قریب ایک بہت بڑی نہر بہتی تھی ،طوفان کی وجہ سے اس نہر کا رخ شہر کی طرف ہونے لگا، تو سارے لوگ گھبرا گئے ،اور کہنے لگے کہ اگر ایسا ہوا تو پھر سارا شہر ڈوب جائے گا، اس لئے چلو کسی اللہ والے سے دعا کروالیں ، وہاں شاہ دولہ بزرگ موجود تھے، لوگ ان کی خدمت میں آکر کہنے لگے کہ حضرت! اس وقت نہر کا رخ شہر کی طرف ہے اور خطرے کی یہ صورت ہے، اگر ایسا ہوا تو پھر سارا شہر ڈوب جائیگا، اللہ تعالیٰ سے آپ دعا کردیجئے کہ وہ ہم سب کو بچالے۔

توانہوں نے آنے والوں سے کہا کہ تمہارے پاس پھاوڑے ہیں؟ تو کچھ لوگوں نے کہا کہ ہاں ہیں، کہا کہ جاؤ پھاوڑے اٹھالاؤ، لوگ پھاوڑے لیکر وہاں پہونچے ، اور شاہ صاحب کے ہاتھ میں تھما دئے ،شاہ دولہ ان کو لیکر نہر کے اس کنارے پہونچ گئے جہاں سے پانی آنے کا اندیشہ تھا اور کہنے لگے کہ یہ جو مینڈ لگی ہوئی ہے، اس کو کھودو تا کہ پانی ادھر کو آجائے ۔لوگ کہنے لگے کہ حضرت! یہ کیا ہورہا ہے ؟ ہم تو یہ کہنے کیلئے آئے تھے کہ اس سے بچیں، یہ تو ہم سے وہ کام کروارہے ہیں جس سے کہ شہر ڈوب جائے گا، کہا کہ حضرت یہ کیا؟ اس سے تو شہر ڈوب جائیگا۔

اس پران بزرگ نے ایک جملہ کہا کہ ''جدھر میرا مولیٰ ادھر شاہ دولہ'' یعنی جو میرے مالک کی مرضی ہے وہی شاہ دولہ کی مرضی ہے، میں کوئی کام میرے رب کی مرضی کے خلاف نہیں کرونگا۔ دیکھئے کس طرح اللہ والے اپنی مرضیات کو اللہ کی مرضی

کے تابع کر دیتے ہیں؟ یہ ہے اپنے نفس کو اللہ کے نام پر بیچ دینا۔

بڑا نفع بخش کاروبار

بھائیو! یہ کاروبار جو اللہ سے بندہ کرتا ہے یہ بہت بڑا کاروبار ہے، معمولی کاروبار نہیں ہے، اس میں ایک جانب بندہ اپنی جان و مال پیش کرتا ہے اور دوسری جانب اللہ ایک تو جنت پیش کرتا ہے، اور دوسرے جہنم سے نجات کا وعدہ کرتا ہے۔ جنت کا وعدہ تو اوپر کی آیت میں آپ نے سن لیا، اور جہنم سے نجات کا وعدہ اس آیت میں ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ (کیا میں تمہیں ایسی تجارت کا پتہ نہ دوں جو تجارت کہ تمہیں جہنم کے عذاب سے بچانے والی ہے) (الصّف:۱۰)

جہنم کے دردناک عذاب سے بچانے والی، یہ ہے وہ تجارت جس میں آدمی اپنے خواہشات کو اپنے اندر کے جذبات وخیالات کو اپنے تصورات تک کو اللہ کے نام بیچ دیتا ہے، کتنی عظیم تجارت ہے۔

بیعت کی حقیقت

اس کے بعد مجھے اس وقت یہیں سے ایک مضمون سمجھانا ہے، آیت کی تفسیر میں نہیں لیکن اس کی تفسیر سے نکالا ہوا ایک مضمون۔ وہ یہ کہ جب اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ خود کو اللہ کے نام بیچنے کی تعلیم فرمائی گئی ہے تو صوفیہ اور بزرگوں کے یہاں جو ایک سلسلہ چل رہا ہے، جس کا نام ہے ''بیعت''، اس سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے۔ وہ کس طرح؟ میں اس وقت اسی کو سمجھانا چاہتا ہوں۔

پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ بیعت کا معنی کیا ہے؟ یہ لفظ ''بیعت'' ''بَاعَ یَبِیْعُ'' کا ماخذ

ہے، جس کے معنی ہیں ''بیچنا'' جو معنی ''شریٰ یشری'' کے ہیں، وہی اس کے بھی ہیں، لفظ کا فرق ہے، لیکن معنی وہی ہے، تو بیعت کے معنی ہیں بیچنا۔

جب آدمی کسی شیخ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شیخ کو واسطہ بنا کر اللہ تعالی سے خرید وفروخت کا ایک معاملہ کرتا ہے، یعنی اپنی نفس کو اللہ کے ہاتھ بیچتا ہے اور اللہ تعالی اس کو جنت عطا کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ یہ ہے ''بیعت'' جو مشائخ کے یہاں جاری ساری ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بیعت میں اصل اللہ سے معاملہ ہوتا ہے اور شیخ صرف درمیان میں واسطہ ہوتا ہے، لہذا بیعت بھی دراصل اللہ کے نام اپنی جان ونفس کو بیچنا ہی ہے، اور اس کا حکم اور اس کی ترغیب پہلے معلوم ہو چکی، لہذا بیعت بھی اسی سے ثابت ہوگئی، کیونکہ اس حکم ہی کی ایک صورت وشکل یہ بھی ہے۔

شیخ کی حیثیت

اب رہا یہ سوال کہ پھر شیخ کی کیا ضرورت ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اصل تو اللہ ہی سے یہ معاملہ ہے مگر جیسے دنیوی کاروبار میں بھی ماہر لوگ ''کاروباری ایجنٹ'' ہوتے ہیں جو آپسی معاملہ طے کراتے اور اس کی باریکیاں سمجھاتے ہیں اور اس میں رہبری ورہنمائی کرتے ہیں، اسی طرح بیعت یہ ہے کہ جو معاملہ بندہ اور اللہ کے مابین ''بیعت''، یعنی نفس کو بیچنے وخریدنے کا ہو رہا ہے، اس میں شیخ ایک واسطہ ہوتا ہے، بندے اور اللہ کے درمیان ہونے والی عظیم تجارت کا۔ یوں سمجھئے کہ شیخ گویا ایجنٹ [Ajent] ہوتا ہے، اس لئے کہ شیخ کو اس میں مہارت ہوتی ہے، وہ اللہ تعالی کی مرضیات ونامرضیات سے بخوبی واقف ہوتا ہے، اس راہ کی باریکیوں سے واقف ہوتا ہے۔

اب اس تجارت کے درمیان جو کچھ معاملے ہوتے ہیں، شیخ کو اس کی اطلاع دیتے رہنا ہے کہ جناب میں نے بیچ تو دیا ہے، لیکن اب جی نہیں چاہ رہا ہے، وہ کہے گا بے وقوف! بیچ تو دیا، اب جی نہیں چاہ رہا ہے، یہ معاملہ فسخ نہیں ہوگا، اس کو ٹھیک کر کے چلاؤ۔ تم نے بیچ تو دیا پیسے تو لے لئے یعنی جنت اس لئے کسی طرح نبھاؤ۔ اب وہ سکھاتا رہیگا، بتاتا رہیگا، وقت وقت پر مشورے دیتا رہیگا تا کہ معاملہ ٹھیک چلتا رہے۔

میں نے جو کہا کہ شیخ صرف واسطہ ہے اور اصل معاملہ تو اللہ سے ہے اس کی دلیل بھی سن لیجئے، اللہ تعالی نے قرآن پاک میں بیعت کا ذکر کیا ہے اور اس میں اللہ کے نبی ﷺ جو لوگوں کو بیعت لیا کرتے تھے اس کا ذکر کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا ہے کہ جو لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں وہ دراصل اللہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ ، یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ﴾

(اے محمد ﷺ جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں یہ حقیقت میں اللہ سے بیعت کرتے ہیں، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے) (الفتح:۱۰)

عربی پڑھنے والے جانتے ہیں کہ "اِنَّمَا" حصر کا مفہوم دیتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اے نبی ﷺ آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں وہ صرف اور صرف اللہ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں کسی اور سے نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی نے بیعت کو اپنی جانب منسوب کیا ہے، حالانکہ ظاہراوہ نبی ﷺ کے ہاتھ پر ہو رہی تھی۔ اسی طرح اس سلسلہ میں جو لوگ شیخ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں تو سمجھنا چاہئے کہ وہ اللہ سے بیعت ہو رہے ہیں، معاملہ اللہ سے ہو رہا ہے۔ گویا بندہ کہہ رہا ہے کہ اے اللہ! میں بیچتا ہوں تو خریدتا ہے اے اللہ! اب یہ جان میری نہیں، مال

میرا نہیں، اس لئے اے اللہ ! اس میں اب میری نہیں، آپ کی مرضی چلے گی، میں اپنی آنکھ کو تیری مرضی کے خلاف نہیں استعمال کرونگا، نہ ہاتھ پیر کو، نہ میرے کسی عضو کو، تیری مرضی کے خلاف کوئی عمل نہیں کرونگا۔ یہ ہے حقیقت بیعت کی۔

شیخ کی ضرورت

اس سے شیخ کی ضرورت بھی سمجھ میں آ گئی، کہ شیخ اس راہ کا ماہر ہونے کی وجہ سے ہماری رہبری کرتا ہے۔ ورنہ بہت سے لوگ اللہ سے معاملہ کو توڑ دیتے اور اس کے تقاضوں کے خلاف چل کر اس کو فاسد کر لیتے ہیں۔ نیز شیخ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ہمیں ہمارے ان اعضاء کو کس طرح اللہ کی مرضی کے مطابق استعمال کرنا چاہئے جنھیں ہم نے اللہ کے نام پر بیچ دیا ہے، اور چونکہ شیطان ہمارے پیچھے لگا ہوا ہے اور وہ ہمیں غلط مشورے دیتا ہے اور ہماری بیعت و معاملہ کو توڑنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اس لئے بھی شیخ کی ضرورت پڑتی ہے کہ وہ ہمیں وقتاً فوقتاً رہبری کرتا رہے۔

بیعت کی برکت اور حضرت گنگوہی کا واقعہ

اور دوسری بات یہ ہے کہ بیعت ہونے سے بزرگوں کے سلسلہ کی برکات بھی نصیب ہوتی ہیں ، اور انسان کے لئے مجاہدہ و عمل آسان ہو جاتا ہے ۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلیفہ تھے اور ان کو خلافت صرف چالیس دن میں ملی، صرف چالیس دن میں وہ منزلیں طے کرتے کرتے نسبت مع اللہ کی دولت سے مشرف ہو گئے تھے، ان کا قصہ عجیب ہے، حضرت حاجی صاحبؒ تھانہ بھون کی خانقاہ میں رہتے تھے، رشید احمد گنگوہیؒ جوان آدمی تھے، جوانی کا بڑا جوش وجذبہ تھا، تھانہ بھون میں ایک بہت بڑے عالم شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ رہتے تھے،

کسی مسئلہ میں ان بزرگ سے مولانا کو اختلاف تھا، تو ان سے مناظرہ کرنے کی نیت سے وہ تھانہ بھون گئے، راستے میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی خانقاہ نظر آئی، تو سوچنے لگے کہ حاجی صاحب یہاں رہتے ہیں، بزرگ آدمی ہیں، ملاقات کرلینا چاہئے، تو ملاقات کرنے چلے گئے، حاجی صاحب نے پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو؟ کہا کہ گنگوہ سے آیا ہوں، پوچھا کیوں آئے؟ کہا کہ حضرت مولانا شیخ محمد صاحب سے فلاں مسئلہ میں مناظرہ ومباحثہ کرنے کیلئے آیا ہوں۔

حاجی صاحب نے کہا کہ بھائی! وہ تو تمہارے سے بڑے عالم ہیں، مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ تم ان سے مناظرہ کرو، لہذا یہ خیال ترک کردو۔ حضرت حاجی صاحب کی بات ان کے دل میں آ گئی تو کہا کہ ٹھیک ہے، جب ایک بزرگ کہہ رہے ہیں تو مان لیتا ہوں، کہ ان سے مناظرہ نہیں کروں گا۔ پھر وہیں خانقاہ میں رات میں ٹھیر گئے۔ جب صبح سحری کا وقت ہوا تو دیکھا کہ حاجی صاحب کے مریدین اور بہت سارے ذاکرین، شاغلین، طالبین موجود ہیں اور ذکر و دعاء، نماز وتلاوت وغیرہ عبادات میں مشغول ہیں، اور ایک عجیب کیفیت وسماں نظر آنے لگا، جب یہ دیکھا تو دل میں یہ خیال آیا کہ مجھے بھی بیعت ہوجانا چاہئے، پھر حاجی صاحب سے بیعت کی درخواست کی کہ حضرت مجھے بیعت کرلیجئے۔ حضرت نے کہا کہ بہت اچھا اور بیعت کرانے تیار ہوگئے۔ اس لئے کہ حاجی صاحب سے جو بھی بیعت کی درخواست کرتا تو اسے فوراً قبول کرلیتے تھے۔

پھرنے اور پھر جانے والے نہیں چاہئیں

بزرگوں کے الگ الگ معاملات واصول ہیں، بعض ایسے ہیں جو بہت پھراتے ہیں، پھراتے کیوں ہیں؟ اس لئے کہ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ پھرنے والا یا پھر

جانے والا تو نہیں؟ پھرنے والا وہ ہے جو ایک جگہ اطمینان سے یکسوئی سے نہیں رہتا، بلکہ شیخ بدلتا رہتا ہے، آج یہاں اور کل وہاں، اور پھر جانے والا وہ ہے جو پھر آتا ہی نہیں، بس ذرا سا جزبہ ابھرتا ہے اور پھر ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا مشائخ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ پھرنے یا پھر جانے والا تو نہیں، بلکہ یہاں تو پھر آنے والا ہونا چاہئے، پھر جانے والا نہیں، اس لئے اسے پھراتے ہیں۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ بیعت کی درخواست کی تو فوراً قبول کرلیا، حاجی صاحب کا بھی یہی معاملہ تھا۔ کسی کے پوچھنے پر کہ حضرت! آپ ہر ایک کو فوراً کیوں بیعت کر لیتے ہیں؟ فرمایا کہ ہاں! اس لئے کر لیتا ہوں کہ معلوم نہیں کون سا اللہ کا بندہ نیک اور مقبول ہوگا، اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیگا تو میری مغفرت ہو جائے گی۔ اللہ اکبر! کیا عاجزی، کیا سادگی ہے۔

الغرض حاجی صاحب نے بیعت کی، اب بیعت کے وقت بزرگوں کا معمول ہے کہ وہ کچھ معمولات بتاتے ہیں، حاجی صاحب بتانے جا رہے تھے کہ مولانا رشید احمد صاحب نے عرض کیا کہ حضرت! میری ایک درخواست ہے، وہ یہ کہ مجھے صبح تہجد کے لئے اٹھا نہیں جاتا، اس لئے وہ ایک کام چھوڑ کر دوسرا جو چاہے حکم کیجئے۔ حضرت نے کہا ٹھیک ہے جو تم کر سکتے ہو کر لینا، لیکن میں نے تمہاری ایک شرط مان لی، تم بھی میری ایک شرط مان لو، وہ یہ کہ میرے پاس چالیس دن قیام کرو۔ مولانا رشید احمد صاحب نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ اب چالیس دن کی نیت کر کے خانقاہ میں رہ گئے، جب دوسرے دن صبح ہوئی تو سالکین ذکر وفکر میں اور رونے دھونے میں مشغول ہیں، کوئی نماز پڑھ رہا ہے، کوئی ذکر کر رہا ہے، کوئی دعاء میں ہے کوئی تلاوت کر رہا ہے۔ اب ان کو نیند کہاں آئیگی؟ دو چار منٹ بستر پر پڑے کروٹیں بدلتے رہے، پھر ان کو بھی شرم آنے لگی کہ سب تو ذکر وعبادت میں ہوں اور تو پڑا

رہے! تو خود ہی اٹھکر تہجد پڑھنے لگے اور ذکر میں مشغول ہو گئے، اب روز ایسا ہی ہونے لگا، اور دو چار دن بعد خود ہی طبیعت کے اندر داعیہ پیدا ہونے لگا کہ صبح اٹھو اور عبادت کا چسکہ پاؤ۔ لہذا سب سے پہلے اٹھنا شروع کر دیا، حالانکہ بیعت کے وقت تو یہ شرط لگائی تھی کہ صبح کو نہیں اٹھونگا، لیکن صحبت اولیاء کی برکت سے سب سے پہلے اٹھنا شروع کر دیا، پہلے تو جبراً اٹھتے تھے، لیکن پھر قصداً اٹھنا شروع کر دیا، جب اسی طرح چالیس دن گزر گئے تو حاجی صاحب نے خلافت عطا کر دی۔

جب تھانہ بھون سے رخصت ہوئے اور اپنے وطن گنگوہ پہنچ گئے تو کئی مہینے ہو گئے، اور حاجی صاحب کو ان کے حالات کا کچھ پتہ ہی نہ چلا، نہ خیر نہ خیریت، نہ حال واحوال، تو حاجی صاحب نے مولانا کے نام ایک خط بھیجا، اس میں لکھا کہ تمہاری کوئی خبر نہیں معلوم ہوئی، بندہ کو تشویش ہوئی، اس لئے اپنے حالات سے مطلع کیجئے، یہ خط پہونچا تو اس کو پڑھا اور جواب لکھا کہ حضرت! میں نے اپنے حالات اس لئے نہیں لکھے کہ بندہ کا کوئی حال ہے ہی نہیں تو کیا لکھوں؟ اس کے بعد لکھا کہ بس اتنا میں اپنے اندر محسوس کرتا ہوں کہ کسی کی کوئی مدح وذم کا کوئی اثر بندہ پر نہیں ہوتا، دوسری بات یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں آئی ہوئی تعلیمات میں کسی جگہ کسی قسم کا شک نہیں ہوتا۔

بھائیو! بیعت کی برکت اور اہمیت وضرورت کا اندازہ کرو کہ بزرگوں کی نظر انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔

مرید کی تعریف، حضرت گنگوہی کا قصہ

مگر ایک بات یاد رکھئے کہ شیخ کی باتوں کو بغیر چوں وچرا مان کر چلیں گے تو فائدہ ہوگا، اور اگر شیخ کی چلانے کے بجائے خود اپنی چلانے لگے اور شیخ کے

مشوروں کو عمل میں نہ لائے تو اس کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

اسی لئے مرید کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اپنی رائے نہ چلائے، اس پر ایک واقعہ یاد آ گیا کہ ایک طالب علم سید الطائفہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں آ کر کہنے لگا کہ حضرت! میں آپ سے مرید ہونا چاہتا ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ مرید ہونے آئے ہو؟ اچھا یہ بتاؤ کہ مرید کے معنی کیا ہے؟ طالب علم تھا، عربی صرف پڑھا ہوا تھا، اس نے گردان شروع کردی، ''أَرَادَ ، يُرِيْدُ ، اِرَادَةً فھو مُرِيْدٌ'' اس نے کہا کہ حضرت! کسی کام کے ارداہ کرنے والے کو مرید کہتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ غلط ہے، صحیح نہیں، اب بیچارہ سوچنے لگا کہ اس میں کیا غلط ہے، ہمارے اساتذہ نے یہی پڑھایا ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ'' فصول اکبری'' بھی پڑھی ہے؟ فصول اکبری عربی صرف کی ایک کتاب ہے، اس کے اندر بہت سے مضامین کے ساتھ خاصیات ابواب کا بیان بہت تفصیل کے ساتھ آیا ہے، تو اس طالب علم نے جواب دیا، جی ہاں پڑھی ہے، فرمایا کہ ''باب افعال'' کی خصوصیات کیا ہیں؟ اب اس نے گنانا شروع کیا، اس میں ایک خصوصیت یہ گنائی کہ'' سلب ماخذ''۔ حضرت نے کہا کہ کیا مطلب ہے؟ کہا کہ ماخذ کو سلب کر لینا اور ماخذ کی نفی کر دینا، کہا کہ ٹھیک ہے، اب اس خصوصیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مرید کا معنی یہ ہوتا ہے ارادہ کو سلب کر لینا یعنی ارادہ نہیں کرنا۔ تو مرید کے معنی ہوئے ارادہ نہیں کرنے والا۔ حضرت نے کہا کہ مرید کون ہوتا ہے؟ جو ارادہ نہیں کرتا یعنی اپنی مرضی و ارادہ سے کوئی کام نہیں کرتا، اس لئے کہ اس نے اللہ کی مرضی پر سب کچھ چھوڑ دیا ہے، جس نے بیعت کرتے ہوئے سب کچھ اللہ کی مرضی پر چھوڑ دیا، اس نے گویا یہ کہہ دیا کہ اے میرے

مالک وخالق میں نے اپنی جان ومال کو تیرے حوالہ کردیا اور تجھے بیچ دیا، اب اس میں میری مرضی نہیں چلے گی جو چلے گا وہ تیرا ارادہ اور تیری مشیت چلے گی۔

فرمایا کہ یہ معنی سمجھ کر جو بیعت کرتا ہے کہ مجھے کسی کام کا ارادہ نہیں کرنا ہے، بلکہ شیخ کی جانب سے اس راہ کے بارے میں جو کہا جائے اس پر عمل کرتے رہنا ہے، وہ ہوتا ہے حقیقی مرید، اور جو ارادے پر ارادے کرتا ہے، شیخ ایک کہتا ہے اور اس کا ارادہ الگ ہوتا ہے، قرآن وحدیث ایک کہتی ہے، اس کا ارادہ الگ۔ تو بھائی یہ مرید نہیں ہے یہ تو مراد ہوگیا۔

الغرض جو شخص کسی سے بیعت ہوکر اپنی اصلاح کرانا چاہتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ اپنے شیخ کی اتباع کرے اور اس کے مشورے پر قائم رہے۔

نفس کو بیچ دینے کے بعد تین باتیں ضروری ہیں

اب آخر میں ایک بات اور سن لیں کہ جب اللہ کے نام ہم اپنے آپ کو بیچ دیں تو اس میں تین باتیں ضروری ہوتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ جب ہم نے نفس کو اللہ کے ہاتھ بیچ دیا ہے تو اب اگر اللہ حکم دے کہ نماز پڑھو تو پڑھنا پڑے گا، اگر ہم نے ایسا نہیں کیا تو پھر اللہ تعالیٰ ہم سے پوچھے گا کہ تمہاری مرضی تم نے کیوں چلائی؟ ہماری مرضی کیوں نہ چلائی؟ اگر اللہ روزہ رکھنے کا حکم دے تو اسے ماننا ضروری ہوگا۔ اسی طرح جتنے احکامات ہیں سب کے بارے میں یہی حکم ہے، زکوۃ ہے، حج ہے، ذکر وتلاوت ہے وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کہے گا کہ یہ میری مشین ہے جسے تم نے بیچ دیا ہے، اب اس میں میرا تصرف چلے گا تمہارا نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن جن باتوں سے دور رہنے اور پرہیز کرنے کو کہہ دیا ہے ان سے پرہیز کرنا بھی ضروری ہے، اس نے کہہ دیا کہ شراب

نہیں پینا، زنا نہیں کرنا، جھوٹ نہیں بولنا، دھوکہ نہیں دینا، جھوٹ وغیبت میں یہ زبان جس کا میں مالک ہوں، اس میں اس کو استعمال نہیں کرنا، ہاتھ کو چوری کیلئے اور پیروں کو غلط جگہ جانے کیلئے استعمال نہیں کرنا، یہ اللہ نے قانون بنا کر ہم کو بتا دیا کہ یہ ہے قانون۔ اگر قانون کی خلاف ورزی ہوئی تو بیع کے وعدے کے خلاف عمل ہونے کی وجہ سے بیع ٹوٹ جائے گی، فسخ ہوجائے گی، اب بغیر سزا جنت کیسے ملے گی؟ جنت کا تو مدار اسی پر تھا کہ جو تم نے دیدیا ہے وہ دیدو اس میں اپنا کچھ تصرف نہ کرو، اگر تم نے تصرف کر دیا تو پھر جنت کا کیا سوال؟ لہذا ممنوعات سے اجتناب ضروری ہے۔

تیسری بات بڑی اہم ہے وہ یہ کہ یہ نفس ہم نے بیچ دیا، مالک اللہ ہے، وہ اگر اس میں کچھ تصرف کرنے لگے۔ مثلاً بخار داخل کر دی، پیٹ و سر میں درد ہونے لگا یا اور کوئی بات پیش آ گئی، جس کو حوادث و پریشانیاں آفتیں ومصائب کہتے ہیں، یہ سب کا سب وہیں اوپر سے ہوتا ہے۔ اور ہم کہنے لگیں کہ اللہ نے مجھے کیوں بخار دیدی، یا اللہ نے ہمارے کسی رشتہ دار کو موت دیدی، انتقال ہوگیا، تو اس میں ہمیں کوئی حق نہیں کہ کچھ بولیں، بلکہ سب کچھ اس کا ہے اور اسی کا چلتا ہے۔

یہ تین چیزیں "یشری نفسه" میں داخل ہیں، جب بندہ یہ تینوں کام کرے گا تو سمجھو کہ اس نے اپنے نفس کو بیچ دیا، جب بیچا تو عوض میں اللہ اسے جنت دیگا۔

اللہ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان مقربین میں شامل کرلے جنھوں نے اللہ کے لئے اپنے نفسوں کو بیچ کر اس کے عوض جنت خرید لی۔ آمین یارب العالمین۔

اطاعت مومن کی حیات ہے

باسمہ تعالیٰ

اطاعت مومن کی حیات ہے

الحمدللّٰہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ . امابعد
فقد قال اللّٰہ تعالی فی القرآن الکریم
أعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم ، بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم
﴿یاأَیُّھَاالَّذِیْنَ آمَنُوْااسْتَجِیْبُوْالِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَایُحْیِیْکُمْ﴾
دینی بھائیو!

یہ سورہ انفال کی ایک آیت ہے ،جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشادفرماتے ہیں کہ:

''اے ایمان والو! جب اللہ اوراس کارسول تمہیں دعوت دے اور بلائے اس چیز کی طرف جوتمہیں زندگی بخشنے والی ہےتوتم اللہ اوراللہ کے رسول کی دعوت پر لبیک کہو''اورآج کل چونکہ انگریزی زبان رائج ہےتو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کاReply دواورResponseدو۔

مذکورہ آیت میں ایک خاص قسم کامضمون ہے،سب سے پہلی بات جو یہاں قابل غور ہے،وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ''جب اللہ اوراللہ کارسول دعوت دےتوتم اسکی دعوت کوقبول کرو''،ظاہر بات ہے کہ جب کوئی دوسرا آدمی ہم کودعوت دےتوحکم ہے کہ ہم اس کی دعوت کوقبول کریں۔

حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ ایک مومن کے دوسرے مومن پر پانچ حق ہیں، ان میں سے ایک حق یہ ہے کہ وہ دعوت دے تو اس کی دعوت کو قبول کرے۔(مسلم:۴۰۲۳)

جب ایک عام مومن کی دعوت قبول کرنے کا حکم ہے تو کیا خیال ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ہم کو دعوت دے اور ہم اس کو ٹھکرا دیں؟ کیسے ہوسکتا ہے؟ دوسری بات یہ قابل غور ہے کہ دعوت کئی قسم کی ہوتی ہے، کوئی کھانے کی دعوت پر بلاتا ہے، کوئی چائے کی دعوت دیتا ہے اور کوئی جلسہ کی دعوت دیتا ہے، اس طرح لوگ دنیا میں مختلف قسم کی دعوتیں دیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اللہ اور اس کا رسول کس بات کی دعوت دیتے ہیں؟ اس آیت میں اس کا جواب دیا گیا، فرمایا کہ ''**لِمَا يُحْيِيكُمْ**'' کہ اللہ اور اس کا رسول تمہیں اس چیز کی دعوت دیتے ہیں جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ دین دراصل مومن کی حیات و زندگی کا سامان ہے، لہذا دعوتِ دین کو، اور پیغامِ الٰہی و پیغام نبوی کو قبول کرنے ہی میں ہماری زندگی ہے اور اگر اس دعوت دین و پیغام الٰہی کو قبول نہیں کریں گے تو زندگی نہیں ملے گی۔

دین ہے تو انسان زندہ ہے

اسی وجہ سے قرآن کریم نے کافر کو مردہ کہا ہے، چنانچہ ایک جگہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿أَوَمَنْ كَانَ مَيْتاً فَأَحْيَيْنَاهُ﴾ (کیا وہ جو مردہ تھا، پھر ہم نے اس کو زندہ کیا)(الأنعام:۱۲۳)

علماء لکھتے ہیں کہ اس آیت میں مردہ سے مراد کافر ہے اور زندہ کرنے سے مراد ایمان عطا کرنا ہے، معلوم ہوا کہ ایمان دراصل زندگی ہے اور کفر دراصل موت

ہے،اسی بات کو پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے دوسرے الفاظ میں کہا کہ جو چیز کہ تم کو زندگی دینے والی ہے، اس چیز کو تم قبول کرلو، اگر تم اس کو قبول نہیں کروگے تو مردہ رہوگے، زندہ نہیں رہوگے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو اور اپنے احکامات کو اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کو" لِمَا يُحْيِيْكُمْ" سے تعبیر کیا۔

اس سے معلوم ہوگیا کہ زندگی دراصل دین کے اندر ہے، اگر دین ہے تو انسان زندہ ہے اگر دین نہیں ہے تو انسان مردہ ہے۔ اس لئے ہم یوں کہہ سکتے ہیں" اَلدِّيْنُ هُوَ الْحَيَاةُ " (دین تو حیات کا نام ہے) یا یوں کہہ سکتے ہیں" اَلدِّيْنُ هُوَ رُوْحُ الْاِنْسَانِ" (دین انسان کی روح ہے) جب انسان کے اندر وہ روح یعنی دین آئیگا تب ہی وہ زندہ رہیگا اور اگر وہ روح نکل گئی تو سمجھو کہ وہ مردہ ہوگیا۔

مردہ کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی

بھائیو! آج ہم لوگ بہت ساری شکایتوں کی باتیں کرتے رہتے ہیں کہ دنیا میں ہماری کوئی بات نہیں چلتی اور لوگوں کی نگاہوں میں ہمارا کوئی مقام نہیں، ہماری کوئی شان وشوکت نہیں، لیکن کبھی اس پر بھی غور کیا کہ مردہ کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟ کیا مردہ کو اسٹیج پر لاکر بٹھایا جاتا ہے یا قبر میں دفن کیا جاتا ہے؟ انسان کی حیثیت اسی وقت تک ہے جب تک کہ وہ زندہ ہے، ظاہری زندگی میں بھی یہی ہے کہ جب تک ظاہر میں زندہ ہے، لوگ اس کی حیثیت کو مانتے ہیں، اگر اس کے اندر سے روح نکل جائے، تو وہ اینٹ پتھر اور مٹی کی طرح بے حیثیت ہوجاتا ہے، لیکن جب تک اس کے اندر روح ہوتی ہے اور وہ کام کرتا ہے، دیکھتا ہے، بولتا ہے اور سنتا ہے اور دیگر کام انجام دیتا ہے تو اس کی ایک پوزیشن ہوتی ہے، اسکی ایک حیثیت ہوتی ہے، اس کی بات مانی جاتی ہے، اس کو اسٹیجوں پر بٹھایا جاتا ہے، اس کی خدمت کی جاتی ہے، لیکن

جن انسان مرجاتا ہے اور مردوں میں شامل ہوجاتا ہے تو وہ بڑے سے بڑا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو، اس کے مرنے کے بعد کوئی اسے بادشاہ نہیں کہے گا اور اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی، اس کا حکم نہیں چلے گا، اس کی بات مانی نہیں جائے گی۔ اور مرنے کے بعد جو حیثیت اس کی سمجھی جاتی ہے وہ بھی دراصل دنیا کی زندگی کی وجہ سے ہے، جیسے کوئی بڑا آدمی مرجاتا ہے تو تین دن رکھ کر شوبازی کی جاتی ہے، بینڈ بجار ہے ہیں، ناچ رہے ہیں اور اسے سلامیاں دی جارہی ہیں، جیسے کسی وزیراعظم کا انتقال ہوجائے، یا کوئی چیف منسٹر چل بسے تو یہ سب کچھ ہوتا ہے، لیکن اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ مرگیا ہے، بلکہ اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اس سے پہلے زندہ تھا، تو اس کی زندگی کی حیثیت اور نسبت کی وجہ سے یہ سب کیا جاتا ہے، اب جب مرگیا ہے تو وہی سلوک اس کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے جو دوسروں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

باطنی زندگی اور باطنی موت

یاد رکھیں کہ جیسے ایک انسان کی ظاہری زندگی اور موت ہوتی ہے، اسی طریقہ پر اسلامی نقطۂ نظر سے انسان کی ایک باطنی زندگی اور باطنی موت بھی ہوتی ہے اور یہ ایک اتنا بنیادی و اساسی مسئلہ ہے کہ جگہ جگہ قرآن کریم میں اور محمد رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں اس کا ذکر ملتا ہے، جیسا کہ میں نے ابھی آپ کو قرآن کے حوالہ سے بتایا کہ قرآن میں کافر کو مردہ کہا ہے۔

پھر جیسے ظاہری زندگی بعض وجوہات کے سبب ہوتی ہے کہ کھانا، پینا، وغیرہ کہ کھانے، پینے سے یہ ظاہری حیات وابستہ ہے، اسی طرح کی اور کئی قسم کی چیزوں سے استفادہ کرتا ہوا انسان زندہ رہتا ہے، اور جب موت کا وقت آتا ہے تو انسان ختم کردیا جاتا ہے، اسی طرح باطنی موت وحیات کا تعلق بھی کچھ باطنی چیزوں پر ہے، وہ

کیا چیزیں ہیں؟ وہ دین ودینی امور ہیں، کہ جب انسان دین قبول کریگا اور اس کے مطابق اپنی زندگی میں چلے گا تو انسان کو باطنی زندگی ملے گی اور اگر دین کو قبول نہیں کرے گا یا اس کے مطابق اپنی زندگی میں نہیں رہیگا تو انسان ظاہری اعتبار سے زندہ رہنے کے باوجود بھی مردوں میں شامل ہوجاتا ہے۔ یہی ہے وہ حقیقت جسے قرآن کریم نے'' **لِمَا یُحۡیِیۡکُمۡ**'' میں بتایا ہے۔

صحابہ زندہ تھے اور آج ہم مردہ ہیں

حضرات صحابہ میں اور آج کے دور کے مسلمانوں میں یہی فرق ہے کہ حضرات صحابۂ کرام، اللہ اور رسول کی دعوت کو قبول کرنے کی وجہ سے ظاہراً و باطناً زندہ تھے، اور ہم لوگ، اللہ اور اس کے رسول کی دعوت کو قبول نہ کرنے یا قبول کرنے کے بعد اس کے مطابق نہ چلنے کی وجہ سے ظاہراً زندہ ہونے کے باوجود باطنی طور پر مردہ ہیں۔

جس کی وجہ سے آج ہماری کوئی حیثیت نہیں ہے، کوئی مقام نہیں ہے، کوئی پوزیشن نہیں ہے، اس لئے کہ مردہ کا کوئی مقام نہیں ہوتا، آج ہمارا حال اتنا برا ہوگیا ہے کہ ہرا یرا غیرا، گھٹیا کمزور اور ضعیف تر انسان بھی مسلمانوں کے خلاف زبان چلاتا ہے، اور رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرتا ہے، قرآن کے خلاف لب کشائی کرتا ہے، اسلامی قوانین میں دخل اندازی کرتا ہے، لیکن مسلمان آج کروڑوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے؛ کیوں؟ اس لئے کہ ہماری باطنی روح یعنی حب الٰہی، اطاعت رسول، سنتوں سے محبت نکل چکی ہے، اور ہمارا باطن مر چکا ہے۔ یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ مردے لاکھوں ہوں یا کروڑوں ہوں، وہ نہ ہونے کے برابر ہیں، کیا ایک لاکھ مردے کوئی معمولی سا کام بھی کر سکتے ہیں؟ کیا ان سب کو ملا کر کھڑا کر دینے سے کوئی مضبوط طاقت وجود میں آسکتی ہے؟ ہم کو معلوم ہے

کہ لاکھوں مردے مل کر ایک مکھی کو بھی نہیں مار سکتے۔ اس لئے اگر ہماری بات میں کوئی اثر نہیں اور ہماری جمعیت میں کوئی طاقت نہیں تو کوئی تعجب نہ ہونا چاہئے، کہ یہ عین سنت الٰہی کے مطابق ہے کہ مردے میں کوئی طاقت نہیں ہوتی۔ لہذا ہم میں بھی روحانی اعتبار سے کوئی طاقت نہیں ہے۔

اس کے برخلاف صحابۂ کرام کی زندگیوں کا مطالعہ کیجئے، معلوم ہوگا کہ روحانی زندہ انسان کیسا طاقتور ہوتا ہے، اس کی کیا پوزیشن ہوتی ہے، اس کا کیا مقام ہوتا ہے۔ صحابہ کے نعروں میں وہ طاقت تھی کہ شاہی محلات میں زلزلہ بپا ہو جاتا تھا، اور ساٹھ صحابہ ساٹھ ہزار کو شکست فاش دینے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔

بدر کے معرکہ میں تین سو تیرہ صحابہ کے سامنے جن کے پاس اسلحہ تک موجود نہ تھا، کافر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے اور میدان جنگ سے ناکام و نامراد راہِ فرار اختیار پر مجبور ہوئے، یہ صحابہ وہ تھے کہ دریا میں بے خوف وخطر گھوڑے ڈالدیتے تھے، اور سمندر پار کر جاتے تھے، جنگل میں جاکر اعلان کرتے تو سارے جانور جنگل خالی کر دیتے تھے۔ (دیکھو حضرت جی حضرت مولانا یوسف صاحب کاندھلوی کی عجیب وعظیم کتاب: حیاۃ الصحابہ)

صحابہ کا یہ مقام اور پوزیشن، رعب ودبدبہ صرف اور صرف اطاعت رسول کی وجہ سے تھا، اگر وہ حیثیت وپوزیشن اپنے اندر لانا ہے تو پھر ضروری ہے کہ اللہ کے دین کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، اللہ سے تعلق قائم کیا جائے، سنتوں کو گلے سے لگایا جائے۔

کیا ہم مسلمان نہیں؟ ایک سوال کا جواب

یہاں پر ہوسکتا ہے کہ کوئی سوال کرنے لگے کہ ہم سب تو ماشاء اللہ مسلمان

ہیں، دین کو مانتے ہیں، اللہ کو مانتے ہیں، رسول اللہ کو مانتے ہیں، ہمارا قرآن پر ایمان ہے، اس سے زیادہ ہم کیا کریں؟ اور پھر بھی آپ ہم کو مردہ کیوں کہہ رہے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جی ہاں! ہم الحمدللہ مسلمان ہیں، ہمارا ماشاءاللہ قرآن پر ایمان ہے، ہم دین کو مانتے ہیں، اللہ کو مانتے ہیں، رسول اللہ کو مانتے ہیں، لیکن جیسا کہ میں نے اشارہ کیا کہ شریعت کے بہت سے اجزاء ہیں، ہم نے کچھ اجزاء کو مانا اور کچھ کو چھوڑ دیا ہے، ہر آدمی اپنے اعتبار سے غور کرے کہ وہ شریعت کی کتنی چیزوں کی اتباع کرتا ہے اور کتنی چیزوں کو چھوڑ دیتا ہے؟ کچھ لوگوں کو کچھ چیزیں شریعت کی پسند آتی ہیں تو وہ ان کو لے لیتے ہیں اور کچھ چیزیں پسند نہیں آتیں تو ان کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔

یہ ہے وہ صورت جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہودیوں کی صفت میں بیان فرمایا ہے: ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ (کیا تم اللہ کی کتاب کے بعض حصہ کو مانتے ہو اور بعض کا انکار کر دیتے ہو) (البقرۃ:۵۸)

اسی آیت کے آگے ایک اور جگہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ: " اَفَکُلَّمَا جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَھْوٰی اَنْفُسُکُمُ اسْتَکْبَرْتُمْ " (کیا جب کبھی تمہارے پاس کوئی پیغمبر وہ چیز لیکر آیا جو تمہارے نفسوں کو پسند نہیں تھی تو تم نے اس کے ماننے سے تکبر کیا) (البقرۃ:۸۷)

اسی طرح ہم نے بھی بعض وہ حصہ لے لیا جو اپنے نفس کو پسند آیا، جس کے اندر آسانی نظر آئی، جس میں مفاد سمجھ میں آ گیا اور جو اپنے مزاج و نفس کے خلاف ہوا، جو اپنے مفاد کے خلاف تھا؛ اور جو مشکل نظر آیا، اس کو ٹھکرا دیا۔

بھائیو! یاد رکھو کہ اللہ کے دین کے بہت سے اجزاء ہیں، عقائد ایک جزء ہے،

عبادات ایک جزء ہے، اخلاقیات ایک جزء ہے، معاشرت ایک جزء ہے، معاملات ایک جزء ہے، اسی طرح سیاست بھی ایک جزء ہے، ان سارے ہی اجزاء کو مذکورہ آیت میں اللہ تعالی نے'' لِمَا یُحْیِیْکُمْ'' کے اندر رکھ دیا ہے، اس لئے یہاں کسی خاص چیز کا نام نہیں لیا گیا، ''ما'' عربی میں عموم کے لئے آتا ہے، جس کی طرف بھی اللہ وراس کا رسول دعوت دے، اس میں ہماری حیات ہے، چاہے وہ شریعت کے ظاہری اجزاء ہوں یا باطنی اجزاء، اسی طرح وہ عقیدہ وعبادات سے تعلق رکھنے والے ہوں یا معاملات سے متعلق ہوں، تعلیم وتہذیب سے ان کا تعلق ہو یا اخلاق سے ہو، یا کچھ اور، تمام قسم کی تعلیمات'' لِمَا یُحْیِیْکُمْ'' کے اندر پوشیدہ ہیں لہذا ان سب میں ہماری حیات ہے۔

ایک منافق کے متعلق حضرت عمرؓ کا فیصلہ

ہم میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو نماز روزہ و دیگر عبادات میں تو قرآن و حدیث پر عمل کرتے ہیں، لیکن جب مسئلہ مال و دولت کا اور اپنے ذاتی یا خاندانی مفادات کا آتا ہے تو وہاں نہ اللہ یاد آتا ہے، نہ رسول کی پرواہ ہوتی ہے، نہ لوگوں ہی سے کوئی شرم وحیاء ہوتی ہے، بلکہ سب سے بالاتر ہوکر وہ اپنے مفاد کے لئے کوشش کرتے ہیں، چاہے اللہ راضی ہو یا نہ ہو، اللہ کا رسول خوش ہو یا ناخوش ہو۔ یہاں مجھے وہ واقعہ یاد آتا ہے جو ایک منافق و یہودی کے درمیان پیش آیا تھا، اس میں بھی وہی ہوا تھا کہ منافق نے اپنے مفاد کے لئے خدا کو دیکھا نہ رسول اللہ کو، بس اسے تو اپنا مفاد پیارا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک منافق اور یہودی کے درمیان ایک زمین کے مسئلہ میں اختلاف وجھگڑا ہوگیا، یہودی کا کہنا تھا کہ یہ زمین میری ہے اور منافق کا دعوی تھا کہ

میری ہے، یہودی نے کہا کہ تم مسلمان ہوتو چلوتمہارے نبی کے پاس ہی فیصلہ کرا لیتے ہیں،اب دونوں یہ مسئلہ لیکرآپ ﷺ کی خدمت میں آئے ،اوراپنے مابین اس زمین کے متعلق فیصلہ طلب کرنے لگے تو آپ ﷺ نے دونوں کی گفتگو سننے اور دونوں کے دلائل کا جائزہ لینے کے بعد یہودی کے حق میں فیصلہ کیا کہ یہ زمین یہودی کی ہے،اس مسلمان کی نہیں۔

آپ ﷺ کا یہ فیصلہ منافق کو پسند نہیں آیا۔وہ یہودی سے کہنے لگا کہ یہ فیصلہ صحیح نہیں ہوا،لہذا ہم حضرت عمرؓ کے پاس اس کا دوبارہ فیصلہ کرائیں گے،اس پر بھی یہودی تیار ہوگیا۔منافق دراصل یہ سمجھ رہا تھا کہ حضرت عمر چونکہ کافروں، یہودیوں کے متعلق سخت ہیں،وہ اس یہودی کو برداشت نہیں کریں گے اور معاملہ سنتے ہی میرے حق میں فیصلہ کریں گے۔

چنانچہ دونوں حضرت عمرؓ کی خدمت میں پہنچے اوراپنے مسئلے کی تفصیل سنائی اور فیصلہ چاہا،اور یہودی نے یہ بھی کہہ دیا کہ حضرت!اس کا فیصلہ آپ کے نبی ﷺ میرے حق میں کر چکے ہیں،مگر پھر بھی یہ مسلمان (منافق) ماننے کو تیار نہیں،اوراس نے دوبارہ آپ سے فیصلہ کرانے کے لئے مجھے یہاں آپ کے پاس لایا ہے۔

حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کیا حضور علیہ السلام نے فیصلہ کر دیا ہے؟ جواب دیا گیا کہ ہاں! حضرت عمرؓ نے فرمایا: تم لوگ یہیں بیٹھے رہو، میں ابھی آتا ہوں۔یہ کہہ کر حضرت عمر اندر گئے اور تلوار لاکر اس منافق کی گردن اڑادی،اور فرمایا کہ جو آپ ﷺ کے فیصلہ سے راضی نہ ہو،اس کے حق میں عمر کا فیصلہ یہی ہے۔

اس کے بعد منافقوں نے شور مچایا کہ حضرت عمرؓ نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا، حضور کی خدمت میں شکایت لیکر آئے ،اسی واقعہ کے متعلق اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ:

﴿ فَلاَ وَرَبِّکَ لاَیُؤْ مِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِی أَنْفُسِھِمْ حَرَجاً مِمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْماً ﴾

(پس آپ کے رب کی قسم ہے کہ وہ لوگ مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ اپنے جھگڑوں میں حکم نہ مانیں اور آپ کے فیصلہ سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور بلا چوں وچرا قبول نہ کرلیں) (تفسیر ابن کثیر: ۱/۵۲۱)

معلوم ہوا کہ دین کی بعض باتوں کو ماننا اور بعض کا انکار کرنا منافقوں کی علامت ہے۔

حضور کے زمانے میں پیدا ہوتے تو!

آج ہم شریعت کی کتنی باتوں کو نہیں مانتے پھر بھی مسلمان کہلاتے ہیں، یہ اللہ کا احسان ہے کہ ہمیں اس زمانہ میں پیدا کیا، اگر صحابہ کے زمانے میں ہوتے تو منافقوں میں شمار ہوتے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ کاش ہم بھی حضور ﷺ زمانے میں ہوتے تو کتنا اچھا تھا۔ حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ لوگ بے خبری میں یہ جملہ کہہ دیتے ہیں، لیکن میں اس کو سنتا ہوں تو کانپ جاتا ہوں، اس لئے کہ اگر ہم لوگ اُس زمانے میں ہوتے تو ہمارا حال بھی ابوجہل، ابولہب جیسا ہوتا، یہ اللہ نے بڑا کرم کیا کہ اس زمانے میں ہم کو رکھ دیا، لیکن اُس زمانے میں ہوتے تو کوئی بات ہم نہ مانتے، ایک بھی بات نہ مانتے تو سوچو کیا حال ہوتا؟ کتنی باتیں آج ہم رد کرتے ہیں ظاہر میں باطن میں، حلال وحرام کے مسائل میں، تو پھر اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔

اللہ ورسول کا ہر حکم ماننا ضروری، حضرت زینبؓ کا قصہ

الغرض دین کے تمام اجزاء کو ماننا ضروری ہے خواہ وہ کسی بھی معاملہ سے متعلق

ہو، حتی کہ شادی بیاہ میں بھی موت وغمی کے مسائل میں بھی۔

قرآن میں حضرت زینب بنت جحش وحضرت زید بن حارثہ کا ایک قصہ آیا ہے جو اس سلسلہ میں ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے۔ایک آیت ہے: ﴿مَاکَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَامُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ أَمْراً أَنْ یَّکُوْنَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ مِنْ اَمْرِھِمْ﴾ (کسی مومن مرد وعورت کے لئے اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کا فیصلہ آجانے کے بعد اپنا اختیار استعمال کرے) (الأحزاب:۳۶)

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جبکہ اللہ کے نبی ﷺ کی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحشؓ کے نکاح کا مسئلہ درپیش تھا، حضرت زینبؓ اپنے علاقہ میں انتہائی خوبصورت مانی جاتی تھیں، خاندان بھی اعلی وارفع یعنی قریش کا، اللہ کے نبی ﷺ کا خاندان عرب میں سب سے اونچا خاندان تھا، اسی اثناء میں اللہ کے نبی ﷺ نے ایک رشتہ بھیجا، وہ رشتہ کیا تھا؟ حضور ﷺ کے ایک منھ بولے بیٹے تھے، جن کا نام حضرت زید ابن حارثہؓ تھا، یہی وہ زید ہیں جن کا قرآن میں نام آیا ہے، ان کے سوا کسی اور صحابی کا نام قرآن میں نہیں ہے، اگر چہ کہ ان سے بڑے بڑے صحابہ ہیں ،حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی وغیرہ، مگر کسی کا نام قرآن میں نہیں ہے، صرف حضرت زید کا نام قرآن میں آیا ہے، تو حضور ﷺ نے حضرت زینب کے لئے ان کا رشتہ بھیجا اور ان کے بھائیوں کو اس سلسلہ میں متوجہ کیا۔

لیکن ان کے گھر والوں کو یہ رشتہ پسند نہیں آیا، اس لئے کہ حضرت زید ایک تو تھے غلام، جن کو حضور ﷺ نے آزاد کردیا تھا، دوسرے یہ کہ ان کا کوئی خاص نسب نہیں تھا اور عرب میں نسب کا بہت اعتبار ہوتا تھا اور تیسرے یہ کہ وہ کوئی بہت

خوبصورت حسین وجمیل بھی نہیں تھے، ان تینوں اعتبار سے حضرت زینبؓ ان سے بہت ہی اعلیٰ وارفع تھیں، اس لئے ان کے خاندان والوں کو یہ رشتہ پسند نہ آیا، اور تذبذب میں پڑ گئے کہ مانیں کہ نہ مانیں؟

اس وقت اللہ نے قرآن میں یہ آیت نازل فرمائی کہ کسی بھی معاملہ میں چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی چاہے وہ تمہاری عبادت سے متعلق ہو یا معاملات میں سے ہو، کسی بھی قسم کا معاملہ ہو، دین کا معاملہ ہو یا دنیا کا کوئی مسئلہ ہو، جب اس میں اللہ اور اللہ کے نبی کا کوئی حکم آجائے تو کسی کو کوئی اختیار نہیں کہ اپنا بس چلائیں اور اپنی مرضی پر چلیں۔

دیکھئے یہاں شادی کا مسئلہ تھا، پسند ناپسند کا مسئلہ تھا، رسول اللہ نے کہہ دیا کہ یہ رشتہ ہے، اس کو قبول کرو، دوسری جانب سے کچھ تذبذب کا معاملہ آگیا تو قرآن میں آیت نازل ہوگئی کہ اللہ کے رسول کی طرف سے ایک بات تجویز ہوا اور ان کی تجویز کو تم ٹھکرا دو اور اپنی مرضی پر تم چلنا چاہو تو اس کا مومن کو بالکل اختیار نہیں ہے۔

شادی میں دین کو مقدم رکھو

ہوسکتا ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ سوال آئے کہ جب اللہ کے رسول موجود تھے، اور آپ نے کوئی بات رشتہ کی کہی، تو اس کو نہ ماننا تو واقعی جرم ہے مگر جب آج اللہ کے رسول ہم میں نہیں ہیں تو ہم پر کیا ذمے داری ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی شریعت میں جو احکام ہیں ان کو ماننا ہمارے لئے ضروری خواہ وہ کسی بھی باب سے متعلق ہوں، شادی کے متعلق ہوں یا کاروبار کے متعلق ہوں یا کسی اور چیز کے بارے میں ہوں۔ مثلاً حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا انتخاب حسب ونسب، مال وزر اور حسن وجمال کی بنا پر نہیں، بلکہ دین کی بنیاد پر ہونا چاہئے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "تنکح المرأة لأربع :لمالها ولحسبها و لجمالها و لدینها ، فاظفر بذات الدین"' (عورت سے چار وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے اس کے مال، اس کے نسب، اس کے جمال اور اس کے دین کی وجہ سے، تو دین والی کو اختیار کر کے کامیاب ہو جا) (مشکاۃ:۲۶۷)

اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "عورت سے اس کے حسن کی بنا پر نکاح نہ کرو کہ ممکن ہے کہ اس کا حسن اس کو ہلاک کر دے اور اس کے مال کے لیے بھی اس سے نکاح نہ کرو، کہیں اس کا مال اس کو سرکشی پر نہ ابھار دے اور اس کے دین کی بنا پر اس سے نکاح کرو، پس ایک دیندار کالی کلوٹی باندی بے دین حسین و جمیل عورت سے بہتر ہے۔ (سنن سعید:۱۲۵/۳)

غور کیجئے ان احادیث میں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا انتخاب مال و دولت، حسب و نسب، حُسن و جمال کی بنیاد پر نہیں کرنا چاہئے، بلکہ دین و دیانت، تقویٰ و پرہیزگاری، ایمان و اسلام، اعمال و اخلاق کی بنیاد پر ہونا چاہئے اور یہ حکم جس طرح مردوں کو ہے، اسی طرح عورتوں کو بھی ہے کہ وہ اپنے لیے دیندار شوہر پسند کریں۔ اسی طرح مرد و عورت کے ذمہ دار و سرپرستوں کو بھی اس کا حکم ہے کہ وہ اپنے لڑکے یا لڑکی کے لیے دیندار بیوی یا شوہر کا انتخاب کریں۔ اب اگر کوئی اس کے خلاف جمال کو یا مال کو نکاح میں معیار بناتا ہے تو کیا وہ رسول اللہ کے خلاف چلنے والا نہیں؟

جوڑا جہیز کا مطالبہ

اسی طرح اور بھی چیزیں ہیں، میں یہاں نکاح میں ہونے والے تمام خرافات

پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔ دیکھئے، یہ حدیث تو بتا رہی ہے کہ نکاح کا مقصد مال و دولت نہیں، بلکہ یہ ہونا چاہئے کہ عفت وعصمت حاصل ہو، اور اس لئے رشتوں کے انتخاب میں دینداری کو مقدم رکھنا چاہئے، مگر کیا ہو رہا ہے؟ لوگ مال دولت سے اپنی حرص ولالچ کے پیٹ کو بھرنے کے لیے نکاح کرتے ہیں، مگر اس سے بھی ان کا یہ پیٹ بھرتا نہیں، بلکہ حرص ولالچ کی آگ اور بھڑک جاتی ہے اور کبھی کبھی کیا بلکہ بہت دفعہ یہ آگ بہت سی معصوم لڑکیوں کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ مگر اس پر بھی اس حریص ولالچی کو قرار نہیں آتا، بلکہ وہ دوسرے شکار کے لیے بے چین ہو کر تلاش شروع کر دیتا ہے۔ اللہ کے نبی نے سچ فرمایا: ''اگر آدمی کے پاس مال سے بھرے ہوئے دو جنگل ہوں تب بھی وہ تیسرے کی تلاش کرے گا اور آدمی کے پیٹ کو سوائے (قبر کی) مٹی کے کوئی چیز نہیں بھرتی'' (مشکوۃ:۴۵۰)

کیا اس سے بھی بڑا کوئی ظلم انسانیت پر ہو سکتا ہے؟ یہ سب کون ہیں جو کرتے ہیں، ہم مسلمان ہی تو یہ سب کر رہے ہیں۔

یہ تو ایک دو باتیں مثال کے طور پر میں نے عرض کر دی ہیں، ورنہ تو شادی کا مسئلہ اس وقت قیامت بنا ہوا ہے، اس لئے شادی کو آج ہم قیامت صغری کہیں تو بجا ہے۔

ہماری معاشرت کی تباہیاں

اسی طرح ہماری معاشرت کی جو حالت ہے وہ بھی سب کو معلوم ہے، کہ انتہائی بری وتباہ کن ہو چکی ہے۔ کسی کا کوئی لحاظ وادب تو ایک جانب، ہم تو لوگوں کے حقوق بھی نہیں جانتے۔ ماں باپ کا حق کیا ہے، رشتوں کے کیا حقوق ہیں، پڑوسیوں کا کیا حق بنتا ہے؟

افسوس کہ آج ہماری معاشرت ایسی ہے کہ کسی کو کسی سے اطمینان وسکون

میسر نہیں، اگر میاں، بیوی کے حقوق ادا کرتا ہے تو بیوی اس کے حقوق ادا نہیں کرتی، اور اگر بیوی ادا کرتی ہے تو شوہر ادا نہیں کرتا، پھر ہر ایک صرف اپنا حق مانگتا ہے، دوسرے کے حقوق کی کمی کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔ ایسی صورت حال میں آپسی جھگڑے و نزاعات کی فضاء قائم نہ ہوگی تو اور کیا ہوگا؟ اسی لیے آج طلاقوں کی بھرمار ہے، خلع کی بھرمار ہے، اگر زوجین میں سے ہر ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کی فکر کرے تو سرے سے جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔

اسلامی معاشرت میں بڑوں کا ادب

اب ذرا یہ بھی تو دیکھئے کہ اسلام نے کس طرح کی حسن معاشرت کی تعلیم دی ہے؟ اس کی چند جھلکیاں بھی دیکھتے چلئے۔ اسلامی معاشرت میں ایک چیز بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت بھی ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی تعظیم و توقیر نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں۔ (الادب المفرد: ۵۷)

بڑوں کے ادب کا معاملہ خود اللہ کے رسول ﷺ کس طرح کرتے تھے؟ اس کے بارے میں صحابیِ رسول حضرت ابوطفیلؓ فرماتے ہیں کہ میں نے مقام جوانہ میں رسول اللہ ﷺ کو گوشت تقسیم کرتے ہوئے دیکھا، ناگہاں ایک عورت آئی اور آپ علیہ السلام کے قریب ہوگئی، آپ نے اپنی چادر اس عورت کے لیے بچھائی اور وہ اس پر بیٹھ گئی، حضرت ابوطفیلؓ فرماتے ہیں کہ میں نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون عورت ہے، لوگوں نے بتایا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی وہ ماں ہیں، جنہوں نے آپ کو دودھ پلایا تھا۔ (مشکوۃ: ۴۲۰)

اسی طرح آپ نے دوسروں کو بھی اپنے بڑوں کا لحاظ کرنے کی تعلیم دی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے والد حضرت ابوقحافہؓ فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے تھے،

اور کافی بڑی عمر کے آدمی تھے، ان کے ایمان لانے کا واقعہ کتب سیرت میں تفصیل سے آیا ہے، اس میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے والد کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور بتایا کہ یہ میرے والد ہیں اور ایمان قبول کرنے کے لیے آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے اس موقع پر فرمایا کہ ابوبکر! آپ نے ان کو کیوں تکلیف دی، میں خود ان کے پاس چلا جاتا۔ (سیرت ابن ہشام:۴۰۶/۲)

یہ ہے بڑوں کے بارے میں اسلام کی تعلیم اور ہمارا حال اس کے برعکس یہ ہے کہ بڑوں کے نام سے چڑ ہے، ان کی نافرمانی ہے، ان کے ساتھ گستاخیاں ہیں۔

پڑوسیوں سے حسن معاشرت

اسی طرح اسلام نے حسن معاشرت کی تعلیم دی تو اس میں پڑوسیوں کے ساتھ سلوک وبرتاؤ کا حکم دیا ہے، کیونکہ پڑوس سے رابطہ وتعلق ہر آن ولحہ برقرار رہتا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے ان سے سابقہ پڑتا ہے۔ لہٰذا معاشرت میں لطف وحسن پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پڑوسیوں کے ساتھ تعلقات کو بہتر سے بہتر بنایا جائے۔ قرآن پاک میں حکم دیا گیا ہے کہ پڑوسیوں کے ساتھ احسان کرو اور لفظ احسان میں ہر بھلائی وخوبی نظر آجاتی ہے اور احادیث میں تو اس سلسلہ میں نہایت سخت تاکیدی احکامات آئے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ خدا کی قسم وہ مومن نہیں۔ خدا کی قسم وہ مومن نہیں۔ آپ سے پوچھا گیا کہ کون یارسول اللہ؟ فرمایا کہ وہ جس کی ایذاؤں اور تکلیفوں سے اس کا پڑوسی محفوظ نہیں ہے۔ (بخاری:۸۹/۲)

اسی طرح آپ نے پڑوسی کی خبر گیری کرنے اور اس کا تعاون کرنے کا حکم

دیا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ وہ مومن (کامل) نہیں ہوسکتا جو خود پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔ (الادب المفرد: ۲۹)

غور کریں اس کا کیا مطلب ہے؟ مطلب یہ ہے کہ پڑوسی کی خبر گیری کرنا چاہئے اور اگر وہ بھوکا ہو تو اپنے کھانے میں سے اس کو بھی دینا چاہئے، اگر کوئی ایسا نہیں کرتا اور خود سیراب ہوتا ہے تو فرمایا کہ وہ کامل ایمان والا نہیں ہوسکتا۔

اسی لیے آپ نے صحابہ کو تعلیم دی ہے کہ اپنے سالن میں ذرا پانی زیادہ کرو اور اپنے پڑوسیوں کو اس میں سے حصہ دو۔ (بخاری، ریاض الصالحین: ۱۴۵)

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پڑوسیوں کے ساتھ حسن معاشرت کا تاکیدی حکم شریعت نے دیا ہے کہ ان سے سلوک اچھا ہو، ایذا و تکلیف نہ پہنچائی جائے ان کی خبر گیری کی جائے، اپنے کھانے میں سے ان کا بھی حصہ نکالا جائے، ضرورت پر اپنا دروازہ ان کے لیے بند نہ کرے۔

میں نے معاشرت کا ذکر ذرا وضاحت سے اس لئے کیا کہ لوگ اس کو اسلام کا جزء ہی نہیں سمجھتے، بلکہ لوگوں نے اس کو اسلام سے ہی خارج کر دیا ہے۔ جب اسلام سے ہی خارج کر دیا تو اس پر عمل کیا خاک کریں گے؟ اس لئے اس میں بڑی ہی کوتاہی ہے۔

معاملات کی دنیا کی ابتری

اس کے بعد ذرا اس پر بھی نظر ڈال لو کہ ہمارے معاملات کا کیا حال ہے؟ لوگ اس کو بھی اسلام سے خارج سمجھتے ہیں حالانکہ یہ دین کا بہت اہم شعبہ ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک بزرگ حضرت یوسف بن اسباطؒ کہتے ہیں کہ جب کوئی جوان عبادت میں لگتا ہے تو ابلیس (اپنی ذریت سے) کہتا ہے کہ دیکھو اس کا کھانا کیا

ہے؟ اگر اس کا کھانا حرام ہوتا ہے تو شیطان کہتا ہے کہ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو، اس کو نہ چھیڑو، تا کہ وہ مجاہدہ کرتا رہے اور تکلیف اُٹھاتا رہے، کیونکہ وہ حرام کھانے کی وجہ سے خود ہی اپنی ہلاکت کے لیے کافی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حرام وحلال کی تمیز نہیں ہوتی تو اس کی نیکیاں وعبادتیں بھی بیکار ہیں، اس لئے شیطان بھی اس کی عبادت کو کوئی قابل ذکر چیز نہیں سمجھتا تو اللہ کے یہاں اس کا کیا اعتبار ہوگا؟

ایک اور بزرگ حضرت اسحاق الانصاری کہتے ہیں کہ حضرت حذیفہ مرعشی نے لوگوں کو صف اول کے لیے دوڑتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ مناسب ہوتا کہ یہ لوگ حلال کے حاصل کرنے کی طرف ایسا ہی دوڑتے۔

اور حضرت فضیل بن عیاض کہتے ہیں کہ حضرت سفیان ثوری سے پوچھا گیا کہ صف اول کی فضیلت کیا ہے؟ فرمایا کہ تیری روٹی کا وہ ٹکڑا جو تو کھاتا ہے اس کو دیکھ کہ یہ کہاں سے آیا ہے؟ پھر آخری صف ہی میں کھڑا ہو جانا۔

لہٰذا دین والے کو معاملات کی دنیا بھی صحیح کرنا چاہئے، مگر لوگوں نے اس کو دین سے خارج کر دیا اور اس وجہ سے اس میں من مانیاں کرتے ہیں، نہ حلال وحرام کی تمیز باقی رہی، نہ اچھے وبرے کا کوئی فرق، نہ معاملات کی صفائی کا کوئی لحاظ رہا۔

حالانکہ حرام سے پرہیز کرنا بھی اللہ ورسول اللہ کی تعلیم ہے، ہم اس سے پرہیز کئے بغیر دین والے کیسے ہو سکتے ہیں۔ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''جو شخص حرام مال حاصل کرے گا اور اس سے صدقہ دے گا تو وہ صدقہ قبول نہیں کیا جائے گا، اور جو اس سے (اپنی ضرورت) میں خرچ کرے گا، اس میں برکت نہ ہوگی اور ترکہ میں اس کو چھوڑ کر مرے گا تو وہ اس کے لیے جہنم کا توشہ ہوگا''۔ (مشکوۃ:۲۴۲)

یہ حدیث حرام مال کی دنیوی واخروی نحوست کو صاف وصریح انداز میں بتا رہی ہے۔ اخروی نحوست تو یہ ہے کہ صدقہ قبول نہ ہوگا اور یہ حرام مال اس کا توشہ جہنم بنے گا اور دنیوی نحوست یہ ہے کہ اس مال کو خرچ کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس میں برکت نہ دے گا۔

چنانچہ مشاہدہ بھی ہے کہ حرام مال میں برکت نہیں ہوتی، وہ مقدار میں زیادہ ہونے کے باوجود وہ نفع نہیں دیتا جو حلال مال دیتا ہے۔ چنانچہ آج لوگوں کے پاس مال تو بے حد ہے، مگر مال سے جو مقصود ہے یعنی راحت وسکون وہ حاصل نہیں، بلکہ مال میں اضافہ کے ساتھ ساتھ بے چینی میں بھی اضافہ ہوجاتا ہے، یہی سب سے بڑی بے برکتی ہے۔ نیز ایک بے برکتی یہ بھی ہے کہ اس مال سے جو کام کرنا چاہتے ہیں وہ ہوتے ہوتے رک جاتا ہے اور کام ادھورا رہ جاتا ہے۔ نیز مال حرام استعمال کرنے والے کی دعائیں قبول نہیں کی جاتیں۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

''ایسا شخص جو دور دراز سے سفر کرکے (کسی متبرک جگہ) آئے اس طرح کہ اس کے بال بکھرے ہوئے ہوں اور سر سے پاؤں تک وہ غبار میں اٹا ہوا ہو، اور وہ خوب گڑگڑا کر دعا کرے اور کہے: اے میرے رب! اے میرے رب! لیکن اس کا کھانا پینا حرام مال سے ہو، اس کا لباس حرام ہو، اور اس کی پرورش حرام سے ہوئی ہو، تو اس حالت میں اس کی یہ دعا کیونکر قبول ہوگی؟ (مسلم ۱۶۸۶، ترمذی ۲۹۱۵)

حضرات صحابہ کی حرام سے احتیاط

ہمارے اسلاف کی زندگیوں میں حرام وحلال کی تمیز، اور حرام سے بچنے کا کیا حال تھا؟ تاریخ وسیرت کی کتابیں دیکھنے سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ

حضراتِ صحابہ اور سلف صالحین حرام چیزوں سے نہایت درجہ احتیاط کرتے تھے۔ میرا لکھا ہوا ایک رسالہ ''تلاش حلال'' میں اس سلسلہ میں تفصیلات موجود ہیں۔

مثلاً حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا واقعہ سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت کا ایک غلام تھا، وہ ایک دن کچھ کھانا لایا، حضرت نے اس میں سے ایک لقمہ کھالیا، پھر آپ کو معلوم ہوا کہ یہ کھانا حرام ہے، کیونکہ غلام نے بتایا کہ وہ جاہلیت میں لوگوں کو غیب کی باتیں بتاتا تھا، یہ کھانا اسی کے عوض میں ملا ہے۔ حضرت صدیق اکبر نے فرمایا کہ تجھ پر تف ہے؛ تو نے مجھے ہلاک کردیا۔ پھر آپ نے منہ میں ہاتھ ڈال کر قے کرنا چاہا، مگر قے نہ ہوئی۔ لوگوں نے کہا پانی پینے سے قے ہوگی۔ آپ نے پانی منگوایا اور آپ پانی پیتے جاتے اور قے کرتے جاتے، یہاں تک کہ پورا کھانا نکل آیا۔

لوگوں نے کہا کہ اس ایک لقمہ کے لیے آپ نے اتنی مشکل اٹھائی؟ فرمایا کہ اگر اس کے لیے میری جان بھی چلی جاتی تو بھی میں ضرور اس کو نکالتا، کیونکہ میں نے اللہ کے نبی ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ جو جسم حرام سے پلا ہو وہ دوزخ کے زیادہ لائق ہے۔

اسی طرح ایک دفعہ حضرت عمر بن الخطابؓ کی خدمت میں بحرین سے مشک و عنبر آیا، آپ نے کہا کہ واللہ میں چاہتا ہوں کہ کوئی اچھی طرح تولنے والی عورت ہو جو اس مشک وعنبر کو تولے، تاکہ میں اس کو مسلمانوں کے درمیان تقسیم کروں، یہ سن کر آپ کی زوجہ حضرت عاتکہ بنت زید نے عرض کیا کہ مجھے اچھی طرح تولنا آتا ہے، دیجئے میں تول دوں، آپ نے فرمایا کہ نہیں، انہوں نے پوچھا کہ کیوں؟ فرمایا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس سے تم کچھ لے لو، اس طرح کہ تم اپنی گردن پوچھو اور اس کو یہ لگ جائے۔

ایک اور واقعہ سنئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کبھی کبھی اپنی بیوی کو بیت المال کا

عطر (مشک وعنبر) دیتے، وہ اس کو فروخت کرتی تھیں، ضرورت پر اس کو اپنے دانتوں سے توڑتی تھیں، اور اس میں سے کچھ ہاتھوں پر لگ جاتا، ایک دفعہ ایسا ہی ہوا تو انھوں نے اپنے دوپٹہ سے پوچھ لیا، حضرت عمر گھر آئے تو فرمایا کہ یہ کیا خوشبو ہے؟ ان کی زوجہ نے واقعہ بتایا، تو فرمایا کہ مسلمانوں کا عطر اور تم نے اس کو استعمال کر لیا؟ پھر ان کا دوپٹہ اتارا اور پانی سے دھوتے جاتے اور سونگتے جاتے تھے، جب تک وہ خوشبو رہی، برابر اس کو دھوتے رہے۔

ہماری دعا کیوں قبول نہیں ہوتی؟ ایک واقعہ

بعض بلکہ اکثر لوگ سوال کرتے ہیں کہ ہم بڑی دعائیں کرتے ہیں، مگر برسہا برس ہوگئے، قبول نہیں ہوتیں، آخر ہماری دعا قبول کیوں نہیں ہوتی؟ حدیث نے اس کا جواب دے دیا کہ حرام غذا اور حرام لباس اختیار کرنے والوں کی دعا قبول نہیں کی جاتی، آج بہت سے مسلمان بلکہ نمازی، حاجی اور بڑی بڑی دینی خدمات میں لگے ہوئے لوگ حرام سے بچنے کا اہتمام نہیں کرتے، پھر کیوں کر دعا قبول ہوگی؟

ایک بزرگ کہیں جارہے تھے، راستہ میں ایک شخص نے نہایت اصرار سے ان سے عرض کیا کہ میرے ساتھ بیٹھ کر آپ کھانا کھائیں، بزرگ نے اس کی درخواست پر اس کے ساتھ کھانا کھالیا پھر آگے چل پڑے، کچھ دور جانے کے بعد وہ اپنے راستہ سے بھٹک گئے اور باوجود کوشش کے ان کو راستہ کا علم نہ ہوسکا۔ بار بار اللہ سے دعا کی مگر دعا قبول نہ ہوئی، بڑے پریشان ہوئے جنگل کا بیابان راستہ، رات کا تاریک ماحول، وحشت ناک سناٹا، مگر راہیں بند ہیں، آخر کار ایک اور بزرگ کا ادھر سے گذر ہوا اور انہوں نے بتایا کہ تم نے جو کھانا فلاں آدمی کے ساتھ کھایا تھا وہ حرام تھا، اس لیے تمہاری دعا قبول نہیں ہو رہی ہے، پہلے اس کی تلافی استغفار کے ذریعہ

کرو، تو پھر راستہ کھول دیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ الغرض دعا کی قبولیت کے لیے حرام سے بچنا لازم ہے۔ ورنہ دعا قبول نہیں ہوتی۔

میراث میں خیانت

بات آئی ہے تو یہ بھی عرض کر دوں کہ بہت سے نمازی و حاجی لوگ بھی اپنے والدین کی میراث میں صحیح تقسیم نہیں کرتے، اور بعض لوگ اپنی بہنوں کا یا بھائیوں کا حصہ دبا لیتے ہیں۔ یہ بھی حرام ہے کہ میراث سے کسی وارث کو محروم کر دیا جائے، اور اس کا حصہ نہ دیا جائے، اور اس پر خود قابض ہو جائے، آجکل یہ وبا بھی عام ہوتی جارہی ہے کہ ایک وارث سب مال میراث پر قابض ہو جاتا ہے اور دوسروں کو محروم کر دیتا ہے، اور بعض لوگ وارث بھی نہیں ہوتے اور وہ دوسروں کی جائیداد پر قبضہ کر لیتے ہیں اور وارثین کو محروم کر دیتے ہیں، اور بعض جگہ یہ رواج ہے کہ بھائی لوگ میراث کا کل مال لے لیتے ہیں اور اپنی بہنوں کو اس سے محروم کر دیتے ہیں۔ یہ سب دین و دنیا دونوں کی ہلاکت کا سامان ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "مَنْ قَطَعَ مِيْرَاثًا فَرَضَهُ اللّٰهُ قَطَعَ اللّٰهُ مِيْرَاثَهُ مِنَ الْجَنَّةِ" (جس نے اللہ کے فرض کردہ کسی کی میراث کا حصہ کاٹ لیا اللہ تعالے جنت کی میراث سے اس کا حصہ کاٹ دیں گے) (شعب الایمان: ۶/۲۲۴، سنن سعید: ۱/۹۶)

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: "مَنْ أَبْطَلَ مِيْرَاثًا فَرَضَهُ اللّٰهُ فِيْ كِتَابِهِ أَبْطَلَ مِيْرَاثَهُ مِنَ الْجَنَّةِ" (جس نے کسی کی میراث جو اللہ نے اپنی کتاب میں فرض کی ہے اس کو باطل کرے گا تو اللہ اس کی جنت کی میراث کو باطل کر دے گا) (مصنف ابن ابی شیبہ: ۶/۲۴۰)

الغرض میراث پر خود قابض ہو جانا اور وارثین کو اس سے محروم کر دینا اور اس میں اللہ کے مقرر کردہ حصوں میں وارثین کی رضا کے بغیر کمی بیشی کرنا سب حرام و ناجائز ہے۔ بہ ہر حال دین سب شعبوں کا نام ہے اس لئے ہمیں سب امور دین پر عمل کرنا چاہئے، صرف نماز پڑھ لینے کا نام دین نہیں، صرف حج پر حج کر لینے کا نام دین نہیں۔ آخر سوچئے کہ ان سب تعلیمات پر ہم عمل نہیں کریں گے تو کون ان پر عمل کرے گا؟ اور اللہ و رسول کا کس سے مطالبہ ہے کہ ان پر عمل کرو، ہم بندوں ہی سے تو ہے اور بالخصوص ان بندوں سے جو اس کے دین کو ماننے کا دعوے کرتے ہیں، لہذا اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

عبرت و نصیحت

دوستو! ایک بات یاد رکھو کہ جب اللہ کے نبی ﷺ کی کسی بات کو ٹھکراؤ گے تو ضرور کہیں نہ کہیں ٹھوکر کھاؤ گے، ٹھکرانے والے کو ٹھوکر ضرور لگے گی، اس لئے یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارا ہر طرز عمل اللہ اور اس کے رسول کے موافق ہو۔ آج ہماری قوم قومی اعتبار سے مردہ قوم ہے، اگر زندہ قوم کو دیکھنا چاہو تو دیکھو حضرات صحابہؓ کو، وہ تھے دراصل زندہ۔

حیاۃ الصحابہ میں یہ واقعہ موجود ہے کہ ایک مرتبہ جہاد میں حضرات صحابہ جا رہے تھے، ایک علاقہ میں اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہیں تو وہاں کے بادشاہ کے محل میں زلزلہ آ جاتا ہے، صرف ''اللہ اکبر'' کی صدا میں بادشاہ کے محل میں زلزلہ آ گیا۔ آج کی اذان میں وہ طاقت نہیں، کیوں؟ وجہ وہی ہے کہ مردہ آواز میں طاقت نہیں ہوتی۔

اطباء لکھتے ہیں کہ جو انگور کی بیل قبرستان کی ہو اور اس سے شراب بنائی جائے تو اس میں نشہ نہیں ہوتا؛ کیوں؟ اس لئے کہ مردہ زمین سے آئی ہے، جب مردہ زمین

میں بوئے جانے والے ایک پھل کا یہ اثر ہو تو جب ہم خود مردہ ہو جائیں تو ہمارے اندر کیا طاقت ہوگی۔

اس لئے آج اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے آپ کو زندہ بنانے کی فکر کریں، اور ہماری زندگی اطاعت الٰہی اور اطاعت رسول میں پوشیدہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اطاعت الٰہی اور اطاعت رسول کی دولت عطاء فرمائے۔